

# سارا اور جنوں

نگہت سیما



# انتساب

اپنی بھیجیوں لبّی جاوید، صائمہ جمیل  
عمیرہ اشفاق اور ماہم اشفاق کے نام۔



”آخر اس میں حرج کیا ہے اماں“ ماہور نے ماں کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے التجائی-

”ہی زندگی اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے اگر میں تو کڑی کرنا چاہ رہی ہوں تو آپ کیوں اجازت نہیں دے

رہیں۔“

طیبہ خاتون نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، رخاموشی سے سبزی کاٹی رہیں۔

”اماں پلیز۔“

ماہور نے ان کے ہاتھ سے چھری پکڑ لی۔

”صحت تنگ کرو مات۔“

انہوں نے پھر اڑی سے کہا اور چھری اس کے ہاتھ سے لے لی۔

”ایک بار چھریں کہہ تو دیا ہے کہ مجھے پسند نہیں ہے لڑکیوں کا تو کڑی کرنا اور پھر خاتون اور برادری والے

ڈھروں باتیں بتائیں گے۔“

”کون سا خانہ ان“

نہ چاہتے ہوئے بھی ماہور کا ہجڑہ طغیہ ہو گیا۔

”ایک ماموں جان ہی تو ہیں اور وہ بھی سوتیلے۔ کبھی خیرلی آپ کی۔ کبھی حال پوچھا آپ کا؟! یا کا حاشہ ہوا تو بس

ذرا کی ذرا کھڑے کھڑے ہاسپٹل آئے وہ بھی ہفتہ بھر اور پھر مرکز پر تک نہ ملی۔“

”وہ بہت مصروف ہیں۔ بڑا بزنس ہے ان کا۔ اور اکیلے سنبھالنے والے وہ خود بچے تو ابھی چھوٹے ہیں پڑھ

رہے ہیں۔“

”بھوٹے لہاں رشتے ناٹے مصروفیات سے ختم نہیں ہوتے افضل ماموں کیا مصروف نہیں ہوتے۔ ان کا

بزنس بھی تو بہت وسیع ہے۔ پھر بھی کتنا خیال رکھا انہوں نے ہم سب کا! یا کا۔ حالانکہ وہ آپ کے کزن ہیں۔ جبکہ

ماموں جان۔ اور کیا ان کا فرض نہیں تھا کہ لہا کے حاشے کے بعد کبھی کبھاری سہی ہماری خیر خیر لیتے رہتے۔“

”بیٹا اتنی دور دروز کماں کیا جاسکتا ہے۔“

طیبہ خاتون نے نرم لہجے میں ماہور کو سمجھایا۔





”آخر اس میں حرج کیا ہے اماں“ ماہ نور نے ماں کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے التجائی۔  
 ”مہنی زندگی اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے اگر میں نوکری کرنا چاہ رہی ہوں تو آپ کیوں اجازت نہیں دے  
 رہیں۔“

طیبہ خاتون نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، خاموشی سے سبزی کاٹی رہیں۔  
 ”اماں پلیز۔“

ماہ نور نے ان کے ہاتھ سے چھری پکڑ لی۔  
 ”صمت تنگ کرو ماہ۔“

انہوں نے بزاری سے کہا اور چھری اس کے ہاتھ سے لے لی۔  
 ”ایک بار تمہیں کہہ تو دیا ہے کہ مجھے پسند نہیں ہے لڑکیوں کا نوکری کرنا اور پھر خاندان اور برادری والے  
 ڈھیروں باتیں بتائیں گے۔“  
 ”کون سا خاندان۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی ماہ نور کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔  
 ”ایک ماموں جان ہی تو ہیں اور وہ بھی سوتیلے۔ کبھی خبر لی آپ کی۔ کبھی حال پوچھا آپ کا؟ ایسا کا حادثہ ہوا تو بس  
 ذرا کی ذرا کھڑے کھڑے ہاسپٹل آئے وہ بھی ہفتہ بھر بعد اور پھر مڑ کر خبر تک نہ لی۔“  
 ”دوست مصروف ہیں۔ بڑا بزنس ہے ان کا۔ اور اکیلے سنبھالنے والے وہ خود بچے تو ابھی چھوٹے ہیں پڑھ  
 رہے ہیں۔“

”چھوڑیے اماں رشتے ناتے مصروفیات سے ختم نہیں ہوتے افضال ماموں کیا مصروف نہیں ہوتے ان کا  
 بزنس بھی تو بہت وسیع ہے۔ پھر بھی کتنا خیال رکھا انہوں نے ہم سب کا؟ ابا کا۔ حالانکہ وہ آپ کے کزن ہیں۔ جبکہ  
 ماموں جان۔ اور کیا ان کا فرض نہیں تھا کہ ابا کے حادثے کے بعد کبھی کبھار ہی سہی ہماری خیر خبر لیتے رہتے۔“

”بیٹا اتنی دور روز روز کہاں آیا جاسکتا ہے۔“  
 طیبہ خاتون نے نرم لہجے میں ماہ نور کو سمجھایا۔



”تھکری ہو گئی دیکھئے آگئے کی بڑی بات ہے اصل میں بی بی مال نے بھائی جان کو کبھی میرے قریب آنے ہی نہیں دیا بلکہ میں لغت ہی پیدا کی۔ اسنو کو مایاں تو حضور تجر تجلے رہتا اس کسل میں جب میرے لیے نہ تم سب کے لیے“

”ہم بھائی! وہ بھی تو مایاں جان کے بیٹے ہیں تاہم ان کی طرح بے حس۔“  
 ماہ نور با میں کیوں آتی تھی مرغ دہی بھی دہن نہ گھوٹے کرنا بھی اس کی عادت نہ رہی تھی۔  
 ”میں آتے تو بھاگ بھاگ کر آتے تھے اور پھوپھو جان کے ٹھنڈوں سے لگ کر بیٹھ جاتے تھے لاہور گئے تو محو کر فرنگستانہ افضال مایاں نہ ہوتے تو ہمارا کوئی پرسان حال ہی نہ تھا۔“

”سب سے بڑا پرسان حال تو اللہ ہی ہے اسی پر محسوس رہنا چاہیے۔“  
 طیبہ خاتون نے سبزی گٹ کر کو گڑی ایک طرف کی۔  
 ”لیکن اللہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے کو نہیں کتا وہ بھی اسی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔“  
 ماہ نور نے بحث کی۔

”ماہ فاضل! بحث نہ کرو میرے سر میں پسلیں درد ہے۔“  
 افضال مایاں ہوتے ہیماں تو وہ ضرور میری سایہ لیگتے، نہیں میں ابھی امریکہ کا ہاتھ تھا۔“  
 ماہ نور بدبالی۔

کوئی کچا اور چھوٹی بی بی ہوتی تھی۔  
 ”ماہ نور! میاںات تنگ کر دیاں کو کیوں بحث کرتی ہو جس رپ نے پیدا کیا ہے وہ کوئی جبین بناوے گا۔“ داوی نے جو بڑی دیر سے صوبہ پیش اس کی بحث نہ رہی تھیں اسے مخاطب کیا۔  
 ”داوی! میں آپ سمجھا میں نا ایاں کو بیٹھے اجازت دے ویں۔“  
 ماہ نور ایاں کیساں سے اٹھ کر داوی کیساں آگئی۔

”وہ کھانا ہی خود اہم خود کر رہی ہے۔“  
 طیبہ خاتون کی پیشانی پر غلٹیں پڑ گئیں۔  
 ”تپ سمجھا میں اسے پکار کر خدمت کرے۔ ہمارے خاندان میں بھلا کبھی کسی لڑکی نے نوکری کی۔ بلکہ بھائی صاحب کو لڑکیوں کے لیے تعلیم بھی ضروری نہیں سمجھتے انہوں نے انعم کو میرک کے بعد گھر بٹھالیا۔ اور ماہ کے کالج بھی ایشیائی پیش کاس کر کتنا راض ہوتے تھے وہ اب سے آپ کو لاہور سے خاص طور پر فون کیا تھا کہ مجھے اپنی روایات کو نہیں بھولنا چاہیے۔ غیر خاندان میں شادی کی مطلب ہرگز نہیں کہ میں یہ بھول جاؤں کہ میں مایاں صلاح الدین کی بیوی ہوں یہ تو بپا کے ابا کو خیر تھا کہ بیٹیاں بہت سارا دھیں ورنہ بھائی صاحب کی ناراضی۔“  
 ”جسمہ ماہ نور کے دادا بھی کوئی معمولی خاندان کے نہ تھے تو بے اپنے خاندان کے تھے پر نام تھا ان کے والد کا اور نصیب کے ماہ نور مایاں کو کہاں نہیں جات۔“

داوی کو مو کی بات سہری گئی تھی۔ ان کے لیے میں تارا ختمی محسوس کر کے طیبہ خاتون شرمندہ ہو گئیں۔  
 ”ماں! میں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو بھائی صاحب کی بات کر رہی تھی کہ ماہ نور کتنی کا تئیں کے قربت تارا راض ہوں گے آپ کو کیا تو بے قصے کے کہتے تھے بڑے۔“

”خود وہاں ہوتے ہیں ہماری زندگی میں دخل دینے والے۔“ ماہ نور کو غصہ آ گیا۔  
 ”کیا کیا ہے انہوں نے ہمارے لیے ہٹائی کتنی بڑی جائیدادیں کیا آپ کا کوئی حصہ نہیں ہے کچھ نہیں ہے آپ کا سب دار کر بیٹھ گئے ہیں۔ اتنا نہ ہوا کہ پوچھ میں بھی کہ ابا کی مفدوری کے لئے لڑا ہوا ہے۔ اپنی معنی دانی کیسے خریدی جاتی ہیں۔ ابا کی نوکری بھوٹ کی ہے مفدور ہو گئے ہیں وہاں ہمیں ہماری دوا نہیں تو ہم کیوں ان کی پراد کریں۔ ان سے تو اتنا بھی نہیں ہوا کہ اخلاقی مدد ہی کریں۔ سوئیٹے سی لیکن بھائی تو ہیں۔ سائیک

ہی شخص کا خون دھڑباہے دونوں کی رگوں میں یہ تو افضال مایاں تھے جنہوں نے ابا کے بھتیجا جاتے لیے میں مدد کی اور اسی تک یہ دیکھ سکے کہ ماہ نور سے ہیں اور آپ کے بھائی صاحب۔“

”وہ طرے آئی۔“  
 ”میں تو صرف یہ جتنیں تھا کتا لاہور کا ایلا میں پوچھا کہ قرض تھا کتا چاہا۔ آپ ان کی پروا مت کریں اور پھر کراں ساہو مال کراچی میں بیٹھے ہیں آپ میں کتنی بہت ہے اماں۔ کب تک صرف سلائی سے ان کو نفوس کا جیت بھرے جگہ اس مگرگلی میں تو کبھی جیس کے بل ہی پورے نہیں بدلتے نزل اور مول کی بدبھائی آپ ختم بھی کر دیا میں لیکن منوں زلفی اور دانی کے لیے تو بدبھائی ضروری ہے۔ اس سال کرا میں نے اچھے نمبر لیے تو اسے کسی پویش کا رخ میں جانا ہوا اور پویش کا بجز کے خرچے جاتی ہیں آپ؟“

ماہ نور کی آواز بھرا گئی۔  
 ”اور آپ کو پتا ہے داوی جان کی دوا کیاں آپ کی ختم ہو چکی ہیں۔ ساری رات جاگتی ہیں وہ۔ رات بھی وہ یاد ان کا سانس اکڑا لیا کو بیٹھتے وہ بھنوں سے ٹھٹھکی کے لیے نہیں لے جایا جا سکا اور ان کی دوائیاں بھی ختم ہو چکی ہیں۔ کل جب آپ سرجمیدی طرف کی تھیں تو ان کا بی بی رست ہائی ہو گیا تھا اور بی بی نائل کر نے والی دوائی سی ہی نہیں کھیں۔“

”میں اس لیے گئی تھی سرجمیدی طرف کہ چھ سوئوں کی سلائی باقی ہے۔ لیکن تا نہیں کیوں پیسے دینے سے جان بھگتی ہے ان کے۔ حالانکہ پیسے کی فراوانی ہے مایاں پر ماہ صودی عرب سے بزاروں روپے کے ڈرافٹ بھیجتے ہیں۔ میں نے منوں کو پیسے دیے تھے۔ کالج سے واپسی پر دوائی لینا آئے گا اور کل پھر بھی کر کے تمہارے ابا کو بھی لے جائے گا تمہاری کے لیے۔“

انہوں نے ماہ نور کی بات کاٹ کر کہا۔  
 ”اور آپ کو پتا ہے مولی کا یونیفارم کتا پرانا ہو چکا ہے۔ تین بار میں نے اس کا فرما کیا ہے لیکن وہ اتنا گھس چکا ہے کہ اب تو سینے کی محتاج بھی نہیں رہی۔ زلی کی کٹی سائٹو ویک ہو چکی ہے تین بار اس کے اسکول سے Written آچکا ہے کہ اس کی نظر چیک کروائیں۔“

”بس کون۔ بس کروا۔“  
 طیبہ خاتون جھوٹ جھوٹ کر روئے لگیں۔  
 ”اماں! مالینز۔“

ماہ نور نے اقتدار سے لپٹ گئی۔  
 ”یہاں مقصد یہ کہ آپ کو تکلف نہ رہا میں تھا۔ میں صرف آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ کتنی ساری ضروریات ہیں جو ہم جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں اور آپ تیار نہیں کر سکتیں۔“  
 ”عاقبتی ہوں۔ لیکن کیا کروں۔ دان راہ تو مشین کے سامنے بیٹھی رہتی ہوں۔ پھر بھی تمہاری خواہشات پوری نہیں کر سکتی۔“

انہوں نے اسے خود سے الگ کیا۔  
 ”اماں! اب آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ یہاں مقصد گڑ یا شکوہ نہیں ہے۔ میں تو آپ کا ہاتھ بتانا چاہتی ہوں۔ آپ تمہارے کریں کی سبب۔ میں نے تو بہت پہلے چار سال پہلے جب ابا کا حادثہ ہوا تھا تو بھوج لیا تھا کہ ابھی سی کرتے ہی جاہ کر لیں گی اماں بیٹھتے غلط نہ سمجھیں میں آپ کا ہاتھ بتانا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ جاہ کرنے دیں۔ حسانے مجھے بتایا ہے کہ اس کی باپائی کے اسکول میں وہ کھسی ہے۔ میں سائنس چھٹی کی انشد ضرورت ہے۔ زیادہ میں تو کچھ تو سمجھتا ہوں جو جائے کی داوی جان اور ابا کی دوائیاں ہی آجایا کریں گی۔ آپ تھک جائیں گی تمہاری سب کرتے۔“

”یہاں مجھے پریشان مت کرو۔“

”طیبرہ خاتون نے انھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔“

”میں پہلے ہی تمہارے بالی وجہ سے پریشان ہوں روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ صحیح علاج بھی تو نہیں ہو رہا۔“

”اس لیے تو میں کہتی ہوں ماں! پیر مجھے جاب کی اجازت دے دیں۔“

”یہاں تو بے چارہ کی۔“

”تو کتنے بددعا کی صاحب۔“

”طیبرہ خاتون کچھ ہنسی۔“

”ماں! میں جان۔“

”یہاں تو بے چارہ کی ہے غصے پر قابو پاتے ہوئے آواز کو نرم کیا۔“

”جیسے ہم نے ہوش سنبھالا۔ جہد میں ہمارے زیادہ ماں! میں کو نہیں دیکھا۔ وہ بھی اپنے کسی کام سے کراچی آئے تو ازراہ کو کم آپ سے ملنے چلے آئے۔ ہمیں تو یہ تک جانیں کہ ان کے بچے کتنے ہیں۔ بچے ہیں۔ کبھی ہم ان کے گھر نہیں گئے اور کبھی وہ ہمارے گھر نہیں آئے۔ بس ایک بار ہانا جان کی وفات پر آپ جی نہیں وہاں۔ تب سب چھوٹی سی مٹی آپ کی کوہوش آپ نے بتایا تھا۔ صرف اسنو بھائی ہیں جنہیں ہم نے دیکھ رکھا ہے وہ بھی اس لیے کہ وہ میاں رہتے تھے افضل! ماں! میں کہیں اور کمال جان بھی کراچی آئیں۔ کبھی اور ہم سے ملے نہیں آئیں۔“

”میں خیر خدا بھائی تو طبیعت کی بہت اچھی ہیں۔ شادی کے بعد وہ کہیں آئیں کراچی۔ بھائی صاحب زیادہ پسند نہیں کرتے ان کا سیکے کانا۔ چھوٹا جان اور وحید بھائی کی وفات پر وہ آئیں۔ پھر کبھی بھی جان کی وفات پر ایسے میں وہ کیا دھر آئیں۔ میں اور عدنا روز بروز اٹھنے سے بہت جا رہا تھا۔ میں۔“

”طیبرہ خاتون کے ہونٹوں پر ہنس مئی سکڑا ہوا۔ بھری شاید بھائی کی کوئی یاد دل میں چبکی تھی۔“

”ماں! میں جان کی بات تو آپ رہے ہی یاد کریں۔“

”یہاں تو بے چارہ کی ہے کما۔“

”خدا! خواہ غصہ آتا ہے مجھے بس آپ مجھے اجازت دے دیں۔ میں نے حنا سے کہا تھا وہ آج مجھے لینے آئے گی پھر ہم اس کی بجائی کے اسکول جائیں گے۔“

”میں! اجازت دے ہی ہوں تو تمہارے ابا کب! میں گے۔“

”طیبرہ خاتون نے کسی قدر آٹا کی ہے کما۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں انہیں میں مٹاؤں گی۔ بس آپ مجھے اجازت دے دیں۔ میں کوئی کام آپ کی مرضی کے خلاف نہیں کرنا چاہتی آپ کی مرضی اور اجازت میرے لیے سب سے مقدم ہے۔ ماں! مجھے اپنے پروا نہیں ہے بالکل بھی نہیں۔ میں فاقے کا کٹی گئی ہوں۔ ایک حرف شکایت بھی زبان پر لائے بغیر پھرا پانا نہیں سکتی ہوں لیکن ماں! بس سب روادی نہیں! بابائی۔“

”اس کی آواز بھرا کر اٹھ اور انکھوں میں پانی چھلکنے لگا۔“

”میں! ابا کے خواب پر سے کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے نہیں ہے اگر آپ اجازت دے دیں گی تو اب بالکل منع نہیں کریں گے۔“

”یہاں مجھے تو کسی بات سے منع نہیں کرتے۔ لائی جو ہو میں ان کی۔“

”طیبرہ خاتون ہنسا۔“

”وہ تو ہے لیکن میں ابا سے کوئی غلط بات کہتی نہیں ہوں اور یہ بات ابا جانتے ہیں۔“

”یہاں تو بے چارہ کی ہے کما۔“

”میں! اجازت دے ہی ہوں تو تمہارے ابا کب! میں گے۔“

”اس نے رواد کی طرف دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ رواد کی بھی بے حد لائق تھی اور نصیر احمد خان کے حادثے سے پہلے رواد سے خد کر کے رہا تو رواد جانتا تھا کہ رواد کی کتنی تھی۔“

”یہ بات سنہ نہیں! میں! میں! یہ خیال وہاں سے نکلا۔ یہاں تھا بھائی چاہتی ہو تو رواد کی میں میری مدد کروا کر۔“

”طیبرہ خاتون نے اس کی طرف دیکھا۔“

”وہ تو خیر میں کہتی ہوں اور پھر بھی کہیں رواد کی لیکن اس سے ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ جاب تو میں ضرور کروں گی۔“

”وہاں گھر کھڑی ہوئی۔“

”میں! ذرا ابا سے بات کرتی ہوں اور رواد کی جان۔“

”اس نے جھک کر رواد کی کی پیشانی چومی۔“

”اگر سفارش کی ضرورت پڑی تو کہہ دیجئے۔“

”یہاں تو بے چارہ کی ہے غصے پر قابو پاتے ہوئے آواز کو نرم کیا۔“

”جیسے ہم نے ہوش سنبھالا۔ جہد میں ہمارے زیادہ ماں! میں کو نہیں دیکھا۔ وہ بھی اپنے کسی کام سے کراچی آئے تو ازراہ کو کم آپ سے ملنے چلے آئے۔ ہمیں تو یہ تک جانیں کہ ان کے بچے کتنے ہیں۔ بچے ہیں۔ کبھی ہم ان کے گھر نہیں گئے اور کبھی وہ ہمارے گھر نہیں آئے۔ بس ایک بار ہانا جان کی وفات پر آپ جی نہیں وہاں۔ تب سب چھوٹی سی مٹی آپ کی کوہوش آپ نے بتایا تھا۔ صرف اسنو بھائی ہیں جنہیں ہم نے دیکھ رکھا ہے وہ بھی اس لیے کہ وہ میاں رہتے تھے افضل! ماں! میں کہیں اور کمال جان بھی کراچی آئیں۔ کبھی اور ہم سے ملے نہیں آئیں۔“

”میں خیر خدا بھائی تو طبیعت کی بہت اچھی ہیں۔ شادی کے بعد وہ کہیں آئیں کراچی۔ بھائی صاحب زیادہ پسند نہیں کرتے ان کا سیکے کانا۔ چھوٹا جان اور وحید بھائی کی وفات پر وہ آئیں۔ پھر کبھی بھی جان کی وفات پر ایسے میں وہ کیا دھر آئیں۔ میں اور عدنا روز بروز اٹھنے سے بہت جا رہا تھا۔ میں۔“

”طیبرہ خاتون کے ہونٹوں پر ہنس مئی سکڑا ہوا۔ بھری شاید بھائی کی کوئی یاد دل میں چبکی تھی۔“

”ماں! میں جان کی بات تو آپ رہے ہی یاد کریں۔“

”یہاں تو بے چارہ کی ہے کما۔“

”خدا! خواہ غصہ آتا ہے مجھے بس آپ مجھے اجازت دے دیں۔ میں نے حنا سے کہا تھا وہ آج مجھے لینے آئے گی پھر ہم اس کی بجائی کے اسکول جائیں گے۔“

”میں! اجازت دے ہی ہوں تو تمہارے ابا کب! میں گے۔“

”طیبرہ خاتون نے کسی قدر آٹا کی ہے کما۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں انہیں میں مٹاؤں گی۔ بس آپ مجھے اجازت دے دیں۔ میں کوئی کام آپ کی مرضی کے خلاف نہیں کرنا چاہتی آپ کی مرضی اور اجازت میرے لیے سب سے مقدم ہے۔ ماں! مجھے اپنے پروا نہیں ہے بالکل بھی نہیں۔ میں فاقے کا کٹی گئی ہوں۔ ایک حرف شکایت بھی زبان پر لائے بغیر پھرا پانا نہیں سکتی ہوں لیکن ماں! بس سب روادی نہیں! بابائی۔“

”اس کی آواز بھرا کر اٹھ اور انکھوں میں پانی چھلکنے لگا۔“

”میں! ابا کے خواب پر سے کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے نہیں ہے اگر آپ اجازت دے دیں گی تو اب بالکل منع نہیں کریں گے۔“

”یہاں مجھے تو کسی بات سے منع نہیں کرتے۔ لائی جو ہو میں ان کی۔“

”طیبرہ خاتون ہنسا۔“

”وہ تو ہے لیکن میں ابا سے کوئی غلط بات کہتی نہیں ہوں اور یہ بات ابا جانتے ہیں۔“

کے بعد جب وہ باہر جاتا رہا تو وہ اپنی رائے مانگ رہا تو حرکت نہیں دے سکتے تھے شاید بالاد پر اتنے دن پلاسٹر چا رہا ہے اس لیے لیکن ٹانگہ انہوں نے خود ہی سوچ لیا۔

وہ بارہ صبح شروع ہوا لیٹ ہوئے تو ڈاکٹر نے انہیں کسی کی کہ غائب اس وقت جب وہ مکان کے لیے تھے دینے پر قانع کا ٹیکہ بھی ہو گیا تھا۔ جب لیے سے نکلا اس لیے ہر حال جو بھی تھا وہ چاہا کہ اسے ہو کر رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ مسلسل ایسٹریڈ اور علاج سے وہ ٹھیک ہو جائیں گے لیکن چار سالوں میں کچھ بہت زیادہ فائدہ نہیں ہوا تھا۔ بس اتنا تھا کہ اب وہ ہاتھ کو حرکت دے سکتے تھے لیکن ٹانگہ ابھی اس طرح چھڑکی اگرچہ طبعی خاتون ہر روز زنجیروں کے نیچے کی بالیں کرتی۔ علاج بھی کسی نہ کسی طرح جاری تھا تو کوری ٹیجھوٹ بھی کچھ ہو چکا تھا وہ ان چار سالوں میں جسم ہو چکا تھا اور اس میں کچھ بے نصیر خان کا لٹہ پر پھر مسلسل پانی رہنے لگا تھا۔

بہ فور ان دنوں فرسٹ ایر میں تھی۔ وہ سال تو بیسے تھے گزارا چلا رہا لیکن اب وہ سال بعد طبعی خاتون نے مہینے رکھ کر کھینچے بھری سلاخی شروع کر دی تو باہر سے چاہا کہ ان کا تھکا جائے لیکن طبعی خاتون نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ اپنی پردھانی جاری رکھے لیکن باہر نور جاتی تھی کہ ان حالات میں یہ سب ناممکن تھا جندہ نعل جلتا اس کی کاسیانی کی سہارا دینے لگی اور اس کا کٹے کا ارادہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہیں لے سکی۔

حتاس کی بچپن کی دوست بھی اور پھر قریبی رہتی تھی ان کے حالات اس لیے سن کر وہ بھی غصے سے بھر پڑی۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیانی سے اسکول میں ایک سائنس ٹیچر کی اسامی ہے اگر اس کا ارادہ ہو جاوے گا تو وہ بالی سے بات کرے گی۔ حنا سے تو اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ بالی سے کہے کہ وہ اپنے پر پھل سے بات کر لیں۔ لیکن یہاں اہل نہیں کہ اسے اجازت ہی نہیں دے رہی تھیں۔

غیر شکر ہے نہ خرمندہ تو وہ بھی ہیں۔ بس ایسا ہی جا رہی تھی۔ اس نے چائے بنا کر کپ میں ڈالی اور کپ اٹھا کر نصیر خان کے کمرے میں آگئی۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ٹولی انا میگزین دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے میگزین الٹ کر تکیے کی اس رکھ دیا اور چائے کا کپ تھاتے ہوئے اسے بیٹھے کا اشارہ کیا۔

”ایہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ تاہم صبح اپنے ناشتا نہیں کیا۔“

ان کے قریبی چاہا کہ بیٹھے ہوئے باہر سے پوچھا۔

”ہاں۔ بس رات ٹھیک سے نیند نہیں آتی تو صبح بھی وہی جمل ہو رہا تھا تو ایڈمیشن کب ہو رہا ہے یونیورسٹی میں۔“

”جہ نہیں آیا میرا ارادہ نہیں ہے مزید پردھانی کا۔“

”لیکن میں تمہارے تو بیٹھے آئے تھے کہیں۔“

اس نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

”ہاں میں چاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایسا بیڑی نہ سہت بیٹھے گا۔“ اس نے اٹھا کر۔

نصیر خان یکدم چپ سے ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ باہر کیوں چاہ کرنا چاہتی ہے۔ انہیں اس کے خوابوں کا بھی پتہ تھا اور اس کی آنرز ڈوں کے راز اور بھی تھے۔

”مگر اتنا تو بہت سارا بار اڑنا چاہتی تھیں۔ سب سڑنا کرنا تھیں۔“

ان کی آواز زخمی تھی جیسے وہ جانتے تھیں کہ وہ کہہ رہے ہیں وہ وہاں سے۔

”ہاں میں بھی آسان نہیں ہیں۔ پلاسٹک ایم اسے کر لیں لیکن بیڑی چاہ کرنا چاہتی تھیں۔“

”اور تمہاری اہل۔“

انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں اگر اجازت دے دوں تو میں دیر کی۔“

”ہاں میں تقریباً اجازت دے دوں گی۔“

”کمال ہے! میں اپنے بھائی صاحب سے ڈر نہیں لگتا۔“

انہوں نے مصروفی کھینچ کر کہا۔

”تمہارے کانچ میں ایڈمیشن کے وقت تو پورا ڈولا ڈالا تھا انہوں نے۔“

”ہاں ڈولا یا تھا انہوں نے اپنے بھائی صاحب کے غصے سے لیکن مبادرت نہیں دیتے کسی سے۔“

وہ مہر گئے۔

”جی تو چار اجازت ہے۔ تاہم۔“

”چھا۔“

انہوں نے مہر کی سانس لی اور کچھ دیر سے یوں ہی دیکھتے رہے۔ باہر سے انہیں سب سے زیادہ یاد تھا وہ ان کی بولی اور لہجہ۔ اپنی تیاری اپنی خوبصورت جبہ پہن کر آئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک ایک حیرت نما خوشی سے اپنے بیٹھے رہے۔

”ہمارے کہہ تو چاہانی تاہم آئی ہے۔ تاہم۔“

”ہاں۔“

ان کی والدہ بھی خوش خوش ہوئی کہ وہ میں نے بیٹھی تھیں۔

”میں اس کا کام باہر نور رکھوں گی۔“

انہوں نے اس کا نام بھی رکھ دیا۔ باہر نور ان کے لیے ایک ایسی خوش قسمتی تھی جو اس سے قبل انہوں نے محسوس نہیں کی تھی۔ وہ گھر آئے تو اس کے پکڑنے سے کپاس کڑے اسے دیکھتے رہتے تھے وہ سوتے میں مضیاں بھیجتے منہ بناتی تو وہ طبعی خاتون کو مخاطب کرتے۔

”تو کیوں نہ آیا کر رہی ہے۔“

اور دیکھتا تھی تاکہ سب کا کچھ نہ گزرا۔

اہل اور طبعی کو ان کی باتوں پر ہنسی آئی۔

”بھوئے بچے ایسی ہی ہوتے ہیں نصیر۔“

ماں کی مسکرا آہ۔

وہ ساری کی ساری اپنی راوی پر تھی۔ وہ کسی بھلائی رنگت انجی تھی ہوئی تاکہ خوبصورت نہایت انہیں لمبی پلکیں اور بال راوی کی طرح انہیں رخسار پر چھوٹا سا سیاہ مل۔

”ہاں بالکل ماں کی ہنسی ہے۔“ طبعی خاتون اکثر تھیں۔

اور یہ سچ تھی تھا جنوں حنا وہ بھی ہوئی تھی ماں کی کی حوالی کی تصویر لگنے لگی۔

”ایہ کیا کر رہے ہیں آپ۔“

انہیں مسلسل اپنی طرف دیکھا کہ باہر نور نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بیٹا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا چاہ کرنا کہیں اگر وہاں آج کل چاہ ملتا تھا آسمان کہاں ہے۔“

”وہاں اتنا کی باقی ایک۔ براہ راست اسکول میں پردھانی ہیں۔ وہاں ایک بچہ کے لیے نہ کسی ہے۔“

”لیکن بیٹا میں نے سنا ہے کہ براہ راست اسکول میں تو بہت کم تھا ہیں مگر میں ہی ہیں سات سو سے زیادہ نہیں۔“

اپنی ہی خواہ کے لیے اب تم خواہ اپنی پردھانی کا حرج کر گئی۔ کچھ بھرتی کر کے گامیں سوچ رہا ہوں کچھ ایسا

کام کرنے کو جو کچھ چاہے کر لیا جاسکے۔ آج منوں کے تواسے بھیجتے رہا اور اپنی صاحب کی طرف کہ لہا ہمارے ہیں۔  
 ”جی ہا! لیکن جاکر باپ کی جس اسکول میں پڑھائی ہیں وہاں ابھی تنخواہ ہے اور اس میں سائنس پتھر کی ضرورت  
 ہے جو ہزار سے اشارت کریں گے۔“  
 ”خاکہ ہے بیٹا جسے تمہاری مرضی۔“  
 ان کے لیے میں یکدم ممکن اثر آئی تھی۔

ماہور اس میں بے حد پارسی کی اس کے لیے انہوں نے میرے سامنے خواب کھینچے تھے خود اعلیٰ تعلیم حاصل  
 نہیں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے سوچ رکھا تھا اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے اگر ان میں ان کی طرح زندگی  
 میں اتنی محنت نہ کرنا پڑے سو وہ اپنے بچوں کو چھوڑ دیتا اور میرے مستقبل دینے کے لیے تنہا کر دیتے۔ خود وہ  
 جگہ جاب کرتے تھے ایک دو ماہ کی تنگنی میں شام بچے سے رات کو بچے تک تمام جاب کرتے تھے۔ اس  
 جاب سے چار بجے فارغ ہوتے تو چند بھر آرام کر کے پھر دوسری جاب کے لیے روانہ ہوجاتے تھے۔ اس جاب  
 کے دو ہزار مل جاتے تھے تو کسی ضرورت میں پوری ہوجاتی تھی۔ طبع خاتون بہت کفایت شعاری سے گھر کا داری نہیں  
 چھوٹی مٹی پٹیاں ڈال رکھی تھیں۔ چلتا تھا تو کسی کاسٹیشن پر یا کسی کو رکھائی پر کوئی بھی کھاراضائی نہ کی  
 ہوجاتی تھی مگر خوش اسلوبی سے دل بہا تھا۔ سب کچھ اچھے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ نصیر خان مطمئن تھے  
 وقت بہت حال کر گزر ہی جاتا ہے۔ ان کا نظریہ تھا۔

انہیں اپنے والد کے متعلق چھ یاد تھیں قادیاب جب ہوش سنہلا تو خود نکلا کہ گھریلا تھا۔ ٹانا ٹانی ان پر جان  
 دیتے تھے۔ ٹانا ٹانا اور ایک سبز کھانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ذرا پی خوش کار بن کر تھا۔ پشاور کے علاوہ لاہور  
 اور راجپوتی میں بھی ان کی ٹکانا تھیں جہاں ان کے ماموں کام سنبھالتے تھے۔ پشاور میں چھوٹے ماموں ہوتے اور لاہور  
 میں چھ ماموں تھے۔ بڑے ماموں اور ٹانا خود کراچی میں کام سنبھالتے تھے۔ والد کے ساتھ وہ بھی کراچی میں ہی ٹانا  
 کے گھر رہتے تھے۔ ٹانا شہباز خان جب تک زندہ رہے انہوں نے نصیر خان کو باپ کی محسوس نہ ہونے دی۔ ان  
 کی خرچہ ایش پوری کرتے۔ ان کا نام بھی انہوں نے ہی نصیر خان رکھا تھا۔ ایک طویل عرصہ تک تو وہ یہی سمجھتے  
 رہے کہ ٹانا ان کے والد ہیں۔ وہ بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو بتایا کرتے تھے کہ ان کے والد کا نام شہباز خان  
 ہے۔ لیکن ٹانا کی وفات کے بعد جیسے اس گھر میں اس کے لیے جگہ ہی نہ رہی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے  
 لیے ترسے گئے تھے۔ تب انہیں چاہا تھا کہ وہ اور ان کی والدہ میاں رہے۔ اس لیے مجبور ہو کر ان کے والدہ نہیں  
 ہیں بلکہ ان کا انتقال تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی ہو گیا تھا، وہ میاں بن کر شادی کوئی نہیں تھا کہ ماں نے بھی اپنے  
 سوال کا ذکر نہیں کیا تھا۔

اسکول کی فیس کئی مہینوں کا کرنا سب سے پہلے ہوتے۔ بڑے ماموں اور میراں تاک چڑھائیں۔ ٹانی نے لفظوں  
 میں بڑے ماموں کو احوال دیا کہ گھر کوئی غیر نہیں ان کی اکوڑی میں کاٹھا ہے جسے مقدردے ان کے دروازے  
 دیا ہے۔ لیکن میراں تو انہیں ایک ٹیکہ کھینچنے کی بھی روادار نہ تھیں۔ ٹانی کی موت میں انہیں روادار نہ کر دی تھیں  
 سو ٹانی کی وفات کے بعد یہ موت بھی قسم ہو گئی جب میرٹھ کے بعد انہوں نے مزید پڑھنا چاہا تو میراں نے صاف  
 صاف کہہ دیا کہ ان کے پاس اس کی تعلیم کے خرچات کے لیے فالتویر نہیں ہے۔

”لیکن بایا جان۔“ گنا تھا کہ انہوں نے دکان میں میرا اور نصیر کا گھر رکھا ہے۔ ہمارے حصے میں  
 خرچہ دیا کریں۔ ہم الگ کھانا کھیں گے۔  
 جب ان کی والدہ نے کہا تو میراں کی بارہ چڑھ گیا۔

”جتنے سالوں سے کھانا پڑا ہے میں۔ ایک تو میں کا بوہہ اٹھائیں۔ اور بے بھانجے کی ذمہ داریاں بھی ہم ہی  
 سنبھالیں۔ سسلی خانم آخراں کے باپ کا کوئی خاندان تو ہو گا۔ کوئی آٹا تو ہو گا۔ بھجوا دے اس کی عزیز رشتہ  
 داروں میں۔ ہم بچہ کھائے اس ذمہ داری سے۔ کما چکا ہاں جان سے۔ کہ نکاح پڑھا مولاں سسلی خانم کا میاں خاں سے

لیکن اب بھی کر کے نکاح سسلی کو۔“

سسلی خانم کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ماموں چپ بیٹھے رہے اور نصیر خان کی غیور نفرت نے ماموں کے گھر مزید  
 رہتا تو راہ نہ کیا اور ماں کو ساتھ لے کر گھر چھوڑ دیا۔ ایک دوست کی وساطت سے ایک کمرے کا قفل کر کے پرے  
 لیا۔ ماں کے پاس اپنا زیور تھا۔ چھوڑا دست فروخت کر کے کچھ استعمال کی اشیاء خریدیں اور پھر اس دوست کی  
 کوشش سے ایک آئین میں کلرک کی جاب مل گئی۔ یوں زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔ ہر مشکل وقت میں ان کے  
 دوست و افعال نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ افعال کو اس بات کا خیال تھا کہ سسلی خانم کا تانہا ہونا اور میرٹھ میں اسے تنہا دوا کر  
 لینے والا لڑکا کتنی تعلیم عمل نہیں کر سکا تھا۔ افعال کو اس کے لیے کمرے پر انہیں بھی تعلیم جاری رکھیں۔  
 لیکن پتا نہیں چلے نصیر خان کا دل یکدم ہی پڑھائی سے اچھا ہو گیا تھا۔ ٹانا ٹانی کی موت ماموں کا رویہ ان سب نے  
 ان کے ذہن پر بہت اثر کیا تھا۔ والدہ سے ہی پڑھا تھا کہ ان کے والد کا کوئی خیر عزم نہ تھا۔ ٹانا کی دکان پر اگر  
 لازم ہوئے تو پھر چند سال کے تھے۔ ٹانا نے انہیں اپنا بیٹا بنایا تھا اور جوں ہوں نے ان کی شادی اپنی بیٹی سسلی  
 سے کر دی تھی لیکن چار سال بعد ہی والدہ کی حادہ نے سب کچھ ہلاک ہو گئے حادہ کے وقت ان کی دکان سے مال  
 بیٹی بھی کچھ حادہ نے میں ہلاک ہو گئی تھی۔

افعال کی والدہ بہت خوش اخلاق اور نرم مزاج تھیں۔ انہوں نے سسلی خانم کو بہت خوش دودیا اور بالکل بہنوں  
 کی طرح سمجھا۔ ایک واحد گھر افعال کا تھا جہاں نصیر خان اور ان کی والدہ آ جاتے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔  
 افعال نے اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے والد کا کاویا سنبھال لیا۔ اس کی شادی ہو گئی۔ نصیر خان کلرک سے ترقی  
 کر کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ افعال کو شادی بھی شادی پر آنا۔  
 ”بھئی مجھے غریب کلرک کو کون رشہ دو گا۔“  
 نصیر خان تانتے۔

”تمہاں تو گورکھ کیوں کی کیا کی ہے۔“

سسلی خانم بھی چاقو تھیں کہ بیٹے کا گھر بس جائے اور یہ مسئلہ بھی افعال اور ان کی والدہ نے حل کر دیا۔  
 ”میری بیٹی ہے۔ طبیعت بھی بھلائی کی وفات کے بعد زیادہ تر تفصیلات میں رہی ہے۔“  
 ایک روز انہوں نے سسلی خانم کو بتایا۔

”سو ٹی والدہ کا سلوک آنا تھا جس سے اس کے ساتھ۔ گھر جاتی بھی ہے کبھی تو میری بڑی بھانجی اچھا سلوک  
 نہیں کرتیں۔ دراصل میرے بھائی نے طبیعت کے والدہ کے ساتھ دوسری شادی کی تھی وہ داریکری عزیز میں۔ باپ کی  
 وفات کے بعد ایک قریبی شادی شدہ بہن کے ساتھ کوئی عزیز نہ تھا۔ بھائی بڑی میں سہارا دے بیٹھے لیکن بڑی بھانجی  
 نے انہیں گھر نہ بیٹھے۔ وہ شادی کے بعد سات سال خود زندہ رہے۔ اس کے گھر ہی رہیں۔ البتہ شادی کو فرغ  
 دیتے تھے اور مینے دو مینے بعد بھی جاتے۔ بڑے بھر لے آئے اور ان کی وفات کے بعد انہوں نے چاہا کہ بیٹی کو گھر  
 لے آئیں لیکن میری بھانجی کو گوارا نہ ہوا۔ حالانکہ اپنی لڑکی تھی۔ نہ کبھی بیٹا ہی تھا۔ جب تک بھائی صاحب  
 زندہ رہے۔ طبیعت کو بھی کبھی گھر نہ جاتے تو تین ماہہ کر پھر وہ خالہ کے پاس چلی جاتی۔ آنا جانا کبھی رہتا لیکن  
 بھائی صاحب کی وفات کے بعد وہ ایک بار سو تھیں بھائی نے رہا۔ بلایا اور اب تو عرصے سے پوچھا کہ نہیں۔ بس  
 ایک بیمار ہے۔ بیٹی گھر آئے۔ میری بھانجی سبھی آئی ہے۔ غدار کی شادی کے بعد میں نے غدار سے کہا بھی تھا کہ  
 نندہ بھوہ تمہاری اور تمہارے سر کے بعد تمہیں میاں بیوی کی ذمہ داری لیکن وہ بے چاری بھی میاں اور ساس کے  
 سامنے نہیں بول سکتی۔ میری بھانجی مزاج کی بہت خست ہیں۔ لیکن جب بھائی نے رشتہ مانگا تو انکار نہ کر سکی  
 اکبر نے سمجھے کہ پھر کر دیتے ہیں عزیز ہو سکا تھا۔ حالانکہ افعال کے والد اس رشتے کے خت خلاف تھے۔  
 افعال انہیں کبھی اور دوا دے نہ جاتے تھے کہ غدار مختلف ماحول کی رو رو رہے۔ جبکہ ماموں کے گھر کا ماحول خست ہے۔  
 لیکن مقدر رجب بھائی نے بھولی پڑائی تو سمجھ سے انکار نہ ہو سکا۔“

افضل کی والدہ نے تفصیل بتائی۔

”اگر تم کو تو مجس طبع سے ملو اور افضل نے اپنی پسند کی شادی کر لی وہ میری تو شروع سے ہی آرزو تھی کہ اسے اپنی بیویاؤں کی اور ودید تو بہت چھوٹا ہے طبع سے۔ جتنی جتنی ہوں تین چار سال کا فرق ہو تا تو پروا نہ کرتی۔ لیکن آٹھ نو سال کا فرق ہے۔“

”مگر عمار تو آپ کو بتا ہے کہ انیسویں کی تعلیم اس کی تو کی۔“

”آپ کی خاندانی شرافت کو میں جانتی کیا یہ اپنی طبع کا قصہ ردا قصہ کو بہت لگائے گا دواصل مجھے ذرا ہے کہ اس کی خالہ جو مسلسل بیمار رہنے لگی ہے پوچھ کر اسے خبر سے کہتا ہے کہ اس کا تھو نہ تھا۔ وہ جب میں کیچل بار طبع کو چھوڑنے لگی تھی تو اس نے دو تین راتوں کا بتایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے کہہ دیا تو کن ہو گا اس کا بتایا میں اپنی اولاد کو تو آپ سنبھال لے گا لیکن اسے تو ایک دن بھی کر میں رکھنے کا اور داد نہ ہو گا۔ ہر وقت ملنے جاتا رہتا ہے پر اپنی اولاد پالنے کے سو سو ہیں کہ کوئی بددست ہو جائے اس کا میں نے افضل سے کہا تو فرما اس نے تیرے کا نام لے دیا۔“

”میں براہ ہو تا شاید کچھ خیال کر لیتا اس کا۔“

اور میں طبع خاتون ان کی زندگی میں پہلی آئیں۔ ایک لمحے کو وہ ہوں سے رہ گئے۔ ماں نے اس کے سینے اور حسن بےیت کی تعریف تو کی تھی لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس قدر حسین ہوں کہ انہیں دلمان تک نہ تھا بلکہ وہ دھو میں ان کے نام شروع تھا کہ افضل کے ماں اچھے کھاتے ہیں ان کے چھوٹے دوست کو طبع کا مارشڈ دیا جا رہا ہے تو وہ یقیناً شکل و صورت کا عمر کے میزان میں نہیں نہ کہیں ان سے اتنا تھا تو ہوگی۔ افضل نے واقعی حق دہتی اور کہا کہ تھا اور ان کی والدہ نے بھی ساتھ بھجایا تھا وہ خود کو طبع کے قابل مرکز نہ سمجھتے تھے۔ ان کے پاس کیا تھا وہاں سے خاندانی شرافت اور اچھی شکل و صورت کے انہیں اپنی کم ہانگی کا شہرت سے احساس ہو اور انہوں نے نہ صرف سوچا بلکہ طبع سے کہہ دی کہ وہ تو مخلوق میں رہنے کے لیے پیدا ہوئی تھیں یہ ان کے بھوپڑے میں کھان چر اٹھا کر آئیں۔“

”آج کے بعد ایسی بات مت کہو کہ گاضیہ مجھے یہاں ہی آتا تھا یہ فیصلہ اور ہوا ہے اور یہاں ہی چراغاں کرنا تھا۔ آپ کو بھی مجھ سے شکایت نہ ہوگی۔ بھائی صاحب ضرور پوچھ والے ہیں لیکن میں جس شخص کو میں دیتی تھی وہ اس گھر سے ذرا ہی بڑا تھا اور کی بڑا پایا ہو کہ خالہ کے چھ بچوں کے بعد میرے لیے کھانے کو کچھ نہ بچا۔ شہید خواجہ جس کے باوجود میں ملے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ میرے لیے اتنی ہی بہت تھا کہ خالہ نے ہاناہ سے رکھی ہے مگر بے۔“

اور وقت نے ثابت کر دیا کہ طبع نے ان کے گھر میں چراغاں ہی کر دیا تھا زندگی کے مشکل سے مشکل لمحے میں انہوں نے انہیں اکیلے نہ چھوڑا تھا۔ صلاح الدین کہیں کی شادی پر تیار تھا کہ وہ آئے تھے چھوٹی ہے کہ اس کراس پر رضامند کر لیا تھا کہ وہ چیز کے نام پر طبع کو ایک چھوٹا سا گھر دے دیں۔ کیراٹا زور گما تو بن کر جاتا ہے کہ اگر انا کھڑو تو نہ دے لے لفظوں میں انہوں نے داکو دیا بھی سنایا تھا کہ ”شرعاً“ پاپ کی جائیداد میں طبع کا حصہ بھی ہے سو صلاح الدین نے جسے کے نام پر گھر خرید کر دے دیا۔“

افضل کو ان خیال کی ذانت اور غصہ دہر پر غصہ ہو سوا جیغی نصیر کے لیے کہ کھانا بہت ضروری تھا۔ زندگی بہت مست کن اور اطمینان سے گزرتی تھی۔ نصیر اور طبع دو دلوں پر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنے والوں میں سے تھے۔ خدا نے اولاد سے نوازا تھا اور دونوں ان کی بہترین تربیت کر رہے تھے بلاشبہ طبع ایک بہترین ریشہ جات تھیں اور مشکل کی ان گڑھوں میں ان کے گھر انہیں سنبھالنے کی شہزادہ تھی۔ اسی کو میں ہا ہوئی ہوں گی۔ مسلسل گھری اور علاج ہو رہا تھا۔ طبع خاتون نے ان کے علاج پر دیکھ پائی کی طرح بتایا تھا۔ ایک امید تھی کہ شاید کسی روز وہ اچھے کر چلے گئیں۔ بچوں کو سدا دہائیں۔ نصیر خان کا حوصلہ بڑھا تھا۔ ملتی خاتم کے

آنسو ہو چھتیں جو بنے ہوئے حالات میں دیکھ کر خود بھی جا رہا پانی پر پڑ گئی تھیں۔ دے کی تکلیف شروع ہو گئی تھی حالانکہ نصیر خان کے مادے سے بے پناہ طبی خاصیتیں۔ طبع خاتون نے سلامتی شروع کر دی تھی۔ اس شخص میں طاق تھیں بچوں کے کپڑے خود ہی سارکتی تھیں۔ سو اب بھی ہر کام آرا تھا۔ منصور نے انہیں سلامتی کرتے دیکھا تو کہا۔

”میں اس کا بچہوں کو دیکھتا ہوں گا لیکن تو کڑی دعویدار ہوں۔“

بلکہ وہ ان سے پالا۔ بلاشبہ نصیر خان کے اس میں جا کر تو کڑی کی بات بھی کر آیا۔

”ہرگز نہیں۔“

طبع خاتون بڑپا تھیں۔

”مجس پر ہنا ہے کہ ضروری ہے کہ باپ اگر کلرک تھا تو بیٹا بھی کلرک ہی ہے۔ ممنوں تم نہیں جانتے کہ میں نے اور تمہارے اپنے تمہارے لیے کیا کیا خواہ یہ رکھے ہیں۔“

”میں ان آپ خانا کی کرکس کی۔ میں اس گھر کا بیٹا ہوں۔ مرہو مجھے یہ ابائی نہ داریاں سنبھالنا ہوں گی اور ایک کے آٹھ والوں نے مجھے ان کی جگہ کلرک رکھنے پر ابائی ظاہر کر دی ہے میں کل سے جو ان کر لیں گا۔“

”اگر تم نے اسے اپنا کیا میں بھی تم سے بات نہیں کر دوں گی۔“

طبع خاتون کی آنکھوں سے آنسو دیاؤں کی طرح بہ نکلے تو منصور نے انہیں اپنی ہانوں میں لے کر ان کے آنسو پونچھے۔

”اباں اباں ایسا مت کریں۔ آپ کو کہیں کی بھی بیوی کر لیں گا۔“

”ہاں نہیں کیا حق ہے منوں کہ تم ہمارے سارے خواہوں کو کھلیا میٹ کر دو۔“

انہوں نے آنسو پونچھے ہوئے نصیر خان کو دیکھا اور نصیر خان نے اپنے آنسو اپنے اندر اتارتے ہوئے منکرانے کی کوشش کی۔

”اباں اباں باکل منوں کو برحق نہیں ہے کہ وہ ہمارے خواہوں کو کھلیا میٹ کرے۔“

”اباں نصیر گھر کا ہوں کہ میں آپ کو ایک دن آپ کے خواہوں کی نصیر ضروروں کا اٹھا۔“

اور یوں اس نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا تھا لیکن نوٹس کر کے اپنا خرچ جو نکال لیتا تھا۔ ہا نور بھی محلے کے چند بچوں کو بیٹن برعالتی تھی۔ نزل بھی انہی کے انہی کے چند بچوں کو بیٹن برعالتی تھی۔ یوں ان کی بڑائی میں مل رہی تھی۔ پھر بھی کسی بھی بچہ سے تنگ ہو جاتا تھا۔ جسے اب کئی بچوں سے خواہش کے باوجود طبع خاتون ملاں کی کی اور نصیر کو دیا میں نہیں سنوا سکتی تھیں۔ چار طریقوں پر اس کی تیار کی حالت میں کر رہے تھے۔ منصور اب ایف ایس سی میں تھا اور فوٹو ایڈیٹر ایس کی کچھ تھی۔

نصیر خان کو مسلسل خاموش دیکھ کر ہا نور بہ چین ہو گئی۔

”آپ کیا سوچنے لگا۔ کیا آپ میری جا ب کرنے سے ناخوش ہیں۔“

”ضرورتوں کے پڑنے میں تو ناخوشی کے باٹ نہیں رکھے جاتے۔“

ان کے سب کے یہ کھن ہا نور کو تیرا کیا۔

”ابا۔“

اس نے ان کا ہاتھ چھامایا۔

زندگی کے حائق کو قبول کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ ہتھیار تیار دینے سے زندگی کسی سہل نہیں ہوتی آپ نے یہ تو بتایا تھا کہ زندگی خود درد اور تنگ دوا کام ہے۔ آپ نے اور دوا دے کی بتایا ہے ہمیں کہ آپ بتانا کے گھر سے باکل خالی تھا۔ کھن نصیر خان اللہ کے بھروسے پر نکل آئے تھے۔

انہوں نے سکرانے کی کوشش کی لیکن ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔  
 ”ہر سارے امتحان میرے لیے کیوں؟ میں تو بہت محنت کر رہا ہوں۔“  
 ”انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں“

”اپ! اس نے کہا تھا میں نے ان کے ہاتھ کو دبایا۔“

”آپ پریشان ہو رہے ہیں، بالترتیب انہوں نے زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرنا ہرگز باعث شرم نہیں ہے بلکہ یہ تو اچھی بات ہے آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کے بچے زندگی کی مشکلات سے سہاڑے والے نہیں ہیں۔ وہ جنگ کرنا جانتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ مونی ہم سب میں اہل کا ہاتھ پاتا جانتی ہوں۔ چار سالوں سے تمام سب کا ہاتھ پاتا ہے۔ کوئی سب اپنے اپنے طور پر کچھ کر رہے ہیں لیکن اگلے میں تنگ کے برابر۔ باپا میں اور اہل لک کر ان کی خواہش کی تعمیر کرنے کی کوشش کریں گے جو آپ نے اور اہل نے دیکھے۔ چار یا پانچ سال تک منوں بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جائے گا پھر باقی کی تعمیریں تلاش کرنا مشکل نہیں رہے گا۔ پہلے ہی دو چار سال کر رہے ہیں۔ پھر یہ چار سال بھی گزر جائیں گے۔“

”نصیر خان سکرانے“

”میں اب پریشان نہیں ہوں بیٹا اور مجھے اپنے بچوں کے حوصلے پر فخر ہے۔“  
 ”یہ ہوئی بات۔“

”ماہور نے ان کا ہاتھ دیا کچھ چھوڑ دیا۔“  
 ”اور اب اس بات پر فخر نہ لگائے اور پھینڈو۔“

”ایسے ہی بلا وجہ ہے نہں دول۔“  
 ”وہ شراوت سے ماہور کو دیکھتے کھلے۔“

”چھا! میرے بچے آپ کو ایک لطف سنائی ہوں۔“  
 ”تمہارے لطف سے کیا مجھے بدلے میں یا نہں آئی ہے۔“

”انہوں نے انتہائی معصومیت سے پوچھا۔“  
 ”اپ!۔“

”ماہور نے منہ بسوا۔“  
 ”چھا تو کچھ سناؤ۔ کوشش کروں گا کہ مجھے نہں آجائے۔“

بچوں کے ساتھ ان کا وہ پیشہ سے دوستانہ تھا۔ اس معاملہ سے پہلے وہ چھٹی والے دن بچوں کو پورا نام دیتے تھے اس روز لطف کی سناے جاتے تھے یہ تباہی بھی ہوئی تھی۔ لٹو اور کرم بھی کھلا جاتا تھا۔ وہ دونی اور گھوڑے بے اعلیٰ کرنے پر مجبور تھے بڑے لک کے ساتھ لک کچھ بھی سمجھ کر تے اور طیبہ خاتون سکرانے ہوئے سب کو کھینچتی رہتی تھیں۔ وہ زندگی سے بہت مطمئن اور پرسکون تھے جیلا ہوا تھا۔ زیادہ تھا اور جو نہیں تھا اس کی انہوں نے بھی تنہا نہیں کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے بچوں کی شخصیت میں کس کوئی کی نہ وہ جانے کہیں کوئی محفل نہ ہو وہ انہیں ہر لحاظ سے عمل کر رہا تھا۔ چاہے تھے یہ دوران کا دور نہیں تھا۔ یہ پیوٹر اور کیبل کا دور تھا۔ بچوں میں بھی خواہشات پیدا ہو گئی تھیں جنہیں پورا کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا اس لیے وہ چاہتے تھے کہ بچوں کو کھربا ہی اتنی مکمل خوشی دیں کہ وہ کیا ہر ہنر جائیں۔ دنیا میں صرف ایک انفعال ہی تھا جس سے ان کے سارے رشتے تھے عزت و دست ہونے کے علاوہ وہی کا چھوٹی زاد بھی تھا وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ان

کی زندگی کا سرمایہ انھیں بچے کے گھر وہ اس کے گھر بھی کہی جاتے تھے۔ حالانکہ وہ گھر کرتا رہا تو ”نوقرا“ دعوت دے ڈالتا لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ بچے وہاں جا کر کسی احساس کمتری کا شکار ہو جائیں۔ وہ اپنے کی خواہش کر رہے تھیں جو ان کے پاس نہیں ہے۔ حالانکہ انھیں ان کے بچے بھی بہت مذہب اور سچے ہوتے تھے۔ وہ بیٹے اور بیٹیاں سب سے بڑے خضر سے بڑے پھر ولید۔ ولید کے بعد علیہ اور امیرج۔ انھیں نے بیٹہ انہیں کے بھائی کا بیان دیا تھا۔ بچوں سے وہ ہمیشہ کہتے تھے۔

”میں تمہارا ماں بھی ہوں اور چچا بھی۔“

ان کی والدہ بھی جب تک زندہ رہیں انہیں بیٹوں کی طرح ہی جاتا۔ بیٹہ دادا کہہ کر دوسروں سے متعارف کرواتی تھیں۔ گا دادا تو دور تھا۔ جو طیبہ خاتون کے بھائی تھے مہمان صاحبہ الدین۔ اگرچہ سو پہلے تھے لیکن بھائی تو تھے۔ دنیا دکھاوے کوئی کسی ہر خوشی کے سونے وہاں سے بلاوا ضرور آتا تھا اور اس میں بھی زیادہ ہاتھ بندھا کر رکھا تھا۔ جو انھیں ان کی سہیلی تھیں اور انہیں اپنی ماموں زاد بہن طیبہ سے بے حد محبت تھی اور نصیر خان کو بھی سنے بھائیوں کی طرح ہی سمجھتی تھیں۔ وہ ضرور ہر سونے پر فخر کر لیں لیکن وہ بیٹہ نکل جاتے تھے دوری کا بہانہ کاتی تھا ان کے پاس۔ میاں صلاح الدین نے بھی اصرار نہیں کیا یا نہیں مہن سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ لیکن عذر دینا کہ بات یہ کہ وہ ٹال ہی جاتے تھے کہ میں نے ماموں زاد بہن بھائیوں کی آسائش اور سونوں والی زندگی دیکھ کر دوست اشتقاق سے محروم نہ ہو جائیں۔ کہنے کو تو ان کے اپنے کسمو کو بھی اس شرمیں مقیم تھے لیکن جب ایک سال وہ ان کے گھر سے نکل آئے تو پھر دوبارہ نہیں گئے۔ سہیلی خاتون نے بھی بھائیوں سے ملنے کی بھی خواہش نہیں کی۔ حالانکہ ایک دو بار انہوں نے پوچھا بھی تھا کہ اگر ان کا دل چاہتا ہے بھائیوں سے ملنے کو تو وہ اس میں ہولالتے ہیں لیکن سہیلی خاتون نے انکار کر دیا تھا۔

”سہیل یہ پیدا ہوا ہے آپ! آہ آپ کو میرے سناے گئے لطیفوں پر ہنسی کیوں نہیں آتی۔“

”مجھ سے ہونے کی ایک شجہ کرتے ہوئے کہی سوچ میں ڈوبے نصیر احمد خان کو ماہور نے بخور دیکھا کتابت یا ہر سے طیبہ خاتون کی آواز آئی۔“  
 ”اپ! جیسا آئی ہے۔“  
 ”او۔“

”وہ یکدم ہاتھ کھڑی ہوئی۔“

”خدا ہے! اپا چل جائوں۔“

”کمال۔“

نصیر خان نے بے درجائی سے پوچھا۔

”اپ! یہ بتایا ہے خاتون کی بانی کے اسکول جاتا ہے۔ خاتون اپنا تھا ساڑھے گیارہ بجے لینے کچھ اترو دیا وہ بوگا تھا۔“

”ہاں۔ جاتی اہل اللہ۔“

”آپ آتے تھو نہیں ہیں نہ۔“

”اس سے کچھ کہتے ہوئے نہ ان کو کھلا۔“

”میں۔“

انہوں نے فحش میں سر ہلایا۔ لیکن اندری اندر کہیں آنسو گرنے لگے تھے۔ ٹھنڈی چائے ایک ہی گھونٹ میں

پی کر انہوں نے آنکھیں موند کر رکھیں۔ ٹیک لگائی۔

ماہور کچھ بھر دیا ہی انہیں دیکھ کر رہی اور پھر ہر نکل آئی۔



کل شب دیکھا میں نے چاند بھوکے میں  
اس کو کیا سلام تمہارے دھوکے میں  
اسے لگتا ہوا میرا چہرے کمرے سے نکلا تو میاں صلاح الدین کو برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھتے دیکھ کر ٹھک کر رہ گیا۔

”السلام علیکم ایہی۔“  
اخبار سے نظر ہٹا کر انہوں نے بے حد مہر کی نظروں سے اسے دیکھا۔  
”یہ تمہیں صبح سویرے کماں جارے ہو صبح چاروے۔“  
”ہی۔ وہ یوں ہی ذرا ایک دوست کی طرف جارہا تھا پتھری جان جاتی تھی میاں صلاح الدین سے۔“  
”وہ اصل مل کر اسٹڈی کرنے کا پروگرام ہے۔“  
”جہا۔“

انہوں نے دوبارہ سر تپا اس کا چارہ لایا۔

”یہیں بہنوں کا ٹاپی پر قیمتی گرمی اور خوشبوؤں میں رہا بشر صلاح الدین۔ اپنی بے تحاشا خوبصورتی اور حسن کی وجہ سے انہیں باقی اولادوں کی نسبت زیادہ پارتا تھا۔ لیکن اس بے تحاشا بارے میں یاد دہانی پر لڑی نگاہ رکھتے تھے۔ وہ نہیں یاد دے سکتے تھے انہیں یہ نظر کیا کرتے؟ نہیں تو کیا ممکن تھا جو ان بچوں پر اتنی سختی بھی نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی اپنی سوچ اور اپنے نظریات تھے ان کا خیال تھا کہ کھلاؤ سونے کا ڈالو اور دھوکو شکر کی نظر سے ہی وجہ تھی کہ سب بچے ان سے خوش ہو رہے تھے اور بشر کی توجہ بھی تھی۔ کچھ ایسا ہی رعب تھا ان کو۔ کالی بات بھی ان سے کرنا ہوئی وہ عذرا بہت کم کے ذریعے کھانا لے کر براہ راست کھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔“

اسکیاں صلاح الدین کے بھی تھیں بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں سب سے بڑے اسقرے، انجینئرنگ پونیوئی لانا اور سے اپنی اہلیہ پر مشتمل گھر رکھتے تھے اور اب ہزار کوشش کے لیے جا رہا تھا چاہے جسے جبکہ میاں صلاح الدین چاہتے تھے کہ اسقرے میں ان کا ہاتھ ڈالے اور امریکہ کا مرکز بننے کا خیال چھوڑے۔ جبکہ اسقرے میں ہی تحصیل میں رہتے ہیں ان میں میاں صلاح الدین کا زیادہ اثر نہ تھا اور نہ ہی اپنی زندگی کے بارے میں وہ ان کا رائے نہ اہمیت دیتے تھے اس لیے مسلسل باہر جانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے وہ میاں صلاح الدین کا احترام ضرور کرتے تھے لیکن باہر بیٹے کے درمیان جو فاصلے پیدا ہو گئے تھے وہ درود پڑھتے جارہے تھے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک با جعفر انہوں نے تحصیل میں گزارا تھا۔ جہاں کا محول یہاں کے محول سے بہت مختلف تھا۔ بڑے ماموں افضل احمد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ باپا لے کر ملک سے آئے انہوں نے گھر میں بہت دوستانہ محول رکھا ہوا تھا۔ افضل کے بعد ان کی والدہ عذرا بیگم تھیں جن کی شادی ایف اے کے بعد ہوئی تھی پھر تنہی تھیں جو ان کو بھی اور جب بھی اپنے شیکے کراچی آتے تو ان سے بہت سلاؤ اخلاقی تھیں۔ وہ کم عمری میں ہی کافی ساتھ کراچی آ گئے تھے۔ تقریباً چار سال کے تھے جب ان کے چھوٹے ماموں وجہ احمد اور نانکی ایک حادثے میں فٹھ ہو گئی تھی اور اس حادثے سے نانکی کے ذہن پر اثر ڈالا تھا۔ بیٹے کی شادی ہوئی والی تھی کہ حادثہ ہو گیا۔ وجہ خود ہی گاؤں ڈرا کر رہ گئے کہ سانسے کے آؤ گریز پر قاتل ہو کر ان کی گاڑی سے گر گیا۔ وہ واٹوں کو وجہ وجہ پکارتے ہوئے اٹھ جاتیں۔ بچے کی گردن میں بت عذرا بیگم جو باپ اور بھائی کے حادثے کی خبر سن کر کراچی آئی ہوئی تھیں وہاں ہی پر انہیں ساتھ ہی لے آئیں۔

وقت سب سے بڑا سمجھا ہے وہ بھی ہوئے بولے سنبھل کر آئیں۔ عذرا بیگم کے بچوں میں ان کا دل بہل گیا۔ جس نے انہیں افضل انہیں لینے آئے تو پاپس جاتے جاتے ہوئے عذر کے اسٹرو کی ساتھ لے گئیں۔ ان کی ہمتی حالت کے پیش نظر میاں صلاح الدین انکار نہ کر سکے۔ بعد میں جب ان کی سہیل عذرا ہو گئی تو انہوں نے اسقرے کو لے لیا۔ کچھ اسقرے میں وجہ کی شہادت بھی تھی اور کچھ وہ انہیں یاد رہی تھی۔ وہ بول گیا تھا بت ہی صلاح

الدین کے سامنے چھوٹی چھلائی۔

”اگر مجھے خود وہ صلاح الدین میں سمجھوں گی میرا وجہ زیادہ ہو گیا ہے۔“  
اور صلاح الدین خاموش ہو گئے کہ وہ شے میں ان کی سانس ہی نہیں چھو بھی تھیں۔  
وہ چھو بھی جنہوں نے شوہر اور بیٹوں کی مخالفت کے باوجود انہیں عذرا بیگم کا رشتہ ہوا تھا۔

یوں عذرا بیگم ان کی زندگی میں شامل ہو گئیں۔ ان کے والد کی بات سچ جاہت ہوئی کہ وہ ایک اچھی لڑکی بالکل مہر ایک جس سامنے شے عذرا بنا چاہا ہو کہ ڈھل جائے گی اور یوں ہی ہوا تھا۔ عذرا بیگم نے بھی ان کی سکی بات سے انحراف نہیں کیا تھا اور وہ باوجود اختلافات و نظریات کے چھو بھی کا احترام مل کی طرح ہی کرتے تھے۔ سو وہ اسقرے واپس نہ لائے۔ تھے اور یوں اسقرے نے ایف ایس کی تک کراچی میں ہی پائی کیس اس قدر کہ تعلیم حاصل کیے۔ کچھ افضل ماموں تھے ان کے بیٹے تھے۔ بڑا دوستانہ ماحول تھا۔ ماموں دو بیٹوں کی طرح جی ٹرٹ کرتے تھے۔ ایف ایس کی کے بعد لاہور میں ان کا ٹیوشن انجینئرنگ پونیوئی میں ہو گیا تو وہ لاہور چلے آئے۔ قائم باہل میں ہی تھا۔ دیک ایڈیٹر مگر آئے تو عذرا بیگم نہال ہو جائیں لیکن چند ماہ بعد ہی نانکی کا انتقال ہو گیا۔ میاں صلاح الدین چاہتے تھے کہ اس کے مستقل طور پر عمری کر جائیں۔ لیکن اسقرے کے لیے تیار نہ تھے ان کا دل یہاں نہیں لگتا تھا۔ عجیب مٹھن کی محسوس ہوئی تھی۔ یہیں بھائیوں سے نہ ٹکھتی نہ تھی۔ والدین انجینی لگتے تھے اس نے نانکی کی وفات کے بعد بھی وہ وہاں تک کراچی میں رہے۔ چھپاں لٹے ہی کراچی چلے جاتے ماموں انہیں بہت چاہتے تھے۔ خسرے بہت سی تھیں لیکن انہوں نے عموں کا تھا کہ نانکی کی وفات کے بعد مملتی کا رویہ خاصا بدل گیا ہے۔ اور انہیں اسقرے پر رہنا پسند نہیں ہے۔ چاہے جتنے جتنے ماموں سانی رہتی تھیں کہ اب ان کے یہاں رہنے کی کوئی تک نہیں ہیں۔ جبکہ ان کے بھائی کا یہاں رہنے کا یہاں ماموں نے واضح نقطوں میں عذرا بیگم سے کہہ دیا کہ وہ اب سرگرمیاں لائیں۔ اسقرے سے گھر کے دیوایں کو نہ وصولی کو نہ بچانے سواموں کے اصرار کے باوجود وجہ کے لیے لاہور آ گئے۔ ان کی واپسی پر عذرا بیگم خوش تھیں میاں صلاح الدین بھی بہت خوش اور مطمئن تھے۔ جہاں ان کے موجودگی سے انہیں اندری اندر بڑی تقویت محسوس ہوئی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اسقرے پر چلائی چھوڑ کر انہیں وہاں رہنے دے۔ بھائی دو غیر موافق تھیں اور اب جہاں بیٹے کو لیکر کر انہیں سمجھنا کہ احساس ہو گیا۔ لیکن ان کا یہاں رہنے کا انکار کر دیا تھا۔ انہیں بڑے شیعہ اپنی مرضی سے منتخب کیا تھا۔ بہترین مہسوں کے ساتھ پاکستان میں اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے اور باہر اسٹڈی کے لیے جا رہا تھا چاہے تھے۔ لیکن میاں صلاح الدین ایسا نہیں چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ اسقرے کو امریکہ بھیجے کا مطلب ہے اسے ہاتھ سے گنونا۔

ان سے چھوٹی انم تھی۔ صورت بہت شکل سب میں یکساں۔ بے حد ذہین بہت حساس اور بہت محنت کرنے والی۔ میاں صلاح الدین ان سے میٹرک کے بعد مزید پڑھنے سے منع کر دیا تھا سو وہ خاموشی سے گھر بیٹھ گئی تھی۔ حالانکہ اس نے اپنے اسکول میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کی نیچر اس کی فرینڈز سب کو ہی اذدھد تھا کہ وہ کالج میں اپنی شہرت نہیں لے رہی۔ اس کی کلاس نیچرس جوتے نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ لے تو اس کے فائدے سے بات کریں۔ لیکن اس نے منع کر دیا تھا کہ وہ نہ جاتی تھی کہ میاں صلاح الدین بھی نہیں ماموں کے ان کے فاسلوں میں اپنی کچھ نہیں ہوئی تھی۔

”مگر تم آج اپنی جینز پہن رہی ہو اور اسے اچھے نہیں آئے۔“

”بہت سی لڑکیاں بہت ذہین ہیں جن میں میڈم اور وہ نہیں پڑھ سکتیں میرے والد بہت تھیں ہیں اور وہ لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے خلاف ہیں۔“  
”جیسی تمہاری مرضی ہمیشہ خاموش ہو گئی تھیں۔“  
اور وہ منہوں پر چھپے چھپ کر رو رہی تھی۔ اسے اذکر بننے کا بے حد شوق تھا بلکہ بچپن سے ہی وہ اذکر بننے

ذہاب کب رہی تھی جب سے اس نے مس حشر کی ہوئی، مگر کوئی کھانا تھا تو کھانے کا کچھ نہیں اس نے بدل دی دل میں سوچا تھا کہ وہ بھی ڈالنے کی کج حالہ تھو جلدی اسے احساس ہوا تھا کہ میاں صلاح الدین لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں لیکن انھوں کو خواب دیکھنے سے کون روک سکتا ہے۔ سو اب اس خواب کے پورا نہ ہو سکے گا کھانے سے رونا تھا اور کس جتنی تھی۔

”آخر آپ ابائی سے بات کیوں نہیں کرتیں۔“

”کیا فائدہ ہوئی جس جاتی ہوں ابائی میں یا میں گے۔“

”خیر تو خوش کر لینے میں کیا حاجت ہے کہ ان کے حشر تو نہیں رہے گی کہ خوش نہیں کی تھی۔“

سمان اس سے تقریباً ”بڑھ سال پھلتی تھی لیکن اس میں ہلا کا کھانا تھا وہ کچھ ہندی بھی تھی اور اکثر خد کر کے عذرا تیکے سے اپنی بات منواتی تھی۔ بچپن میں جس بات پر اڑ جاتی تھی اس سے کبھی نہیں بھی اس کو میں ہونے والی تمام خبر رسائی سرگرمیوں میں بہت ذوق شوق سے حصہ لیتی تھی کوئی مباحثہ کوئی کھیل کوئی گفتگو میں مناسب میں آتی ہوں وہ انعام فراغ کر لیتی تھی غالباً اس وجہ سے اس میں اتنا اعتماد ہوا ہو گا تھا۔ اسے اس بات کا درج تھا کہ اس کا اہم ترین ذہن سے اس نے اتنے اچھے داس لے لیے ہیں پھر بھی ابائی اسے بہت نہیں دے رہے اس لیے وہ انعام کو اس کی تھی کہ ایک بار وہ میاں صلاح الدین سے بات تو کر لے گا کیونکہ اجازت دے دیں۔ لیکن جب انھوں نے میاں صلاح الدین سے بات نہ کی تو ایک روز کھانے کے لیے اس سے خبر اس نے خودی اس میں غائب کیا۔ ”مولیٰ نے اتنے زیادہ کمر لیا ہے کہ وہ تو اس میں کالج میں داخلہ لینے کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔“

میاں صلاح الدین نے اذ حد جبران ہو کر کس کی طرف دیکھا تھا اس وقت ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی اور بڑے اعتماد سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”میں لڑکیوں کے لیے اتنی ہی تعلیم کافی سمجھتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد انہوں نے جواب دیا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ سمجھ اور کچھ پاس بیٹھی انھوں نے اس کا ہاتھ دبا کر خاموش کر دیا تھا۔

”مولیٰ! آپ نے کیوں منع کیا مجھے میں جتنی بات بھی تو کہہ کر سکتی۔ مجھ سے سمجھ میں نہ آتا تھا۔“

وہ ابھی کم عمر تھی اور خوش قسمتی سے لیکن انھیں جاتی تھی کہ کائنات میں ہزاروں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں لیکن ابائی کی فیصلہ نہیں بدل سکتا لیکن اس نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”میرا خواب مولیٰ میں بار بار دیکھتا ہوں۔“

”تو سمجھتے ہو دل رہی ہیں مولیٰ مجھے ابائی سے ایک بار پھر بات کرنے دیں۔ میرے پاس بہت دلائل ہیں۔“

”اسے سنو دلائل اس نے اپنے لیے سنبھال کر رکھ لو۔“

”ہاں میں سنو تو ضرور پڑھوں گی اور آپ دیکھا ابائی مجھے نہیں روک سکیں گے۔“

”انشاء اللہ تو ضرور پڑھا۔“

اس نے سمجھ کو ہدایت کی اور خود حالات سے سمجھو کہ کیا تھا کہ کھانے میں پیسے کی فراوانی تھی۔ کام کاج کے لیے ملازم موجود تھے پھر بھی عذرا تیکے سے بے کام میں طاق کیا تھا۔ سلامتی لڑکھائی سے لے کر کھانا پکانے تک۔

یوں وہ بھی آپ کو مصروف رکھتی تھی۔ جس کی بات میں ملازموں کے ساتھ کئی رہتی، کبھی اوروں اور مددگار پڑھانے بیٹھ جاتی۔ دل میں کبھی بھی ہوا کہ اس کی۔

تو سمجھ نے ان دنوں بڑبڑک اٹھا تو ان سے دیکھا اور دلت کی خیر تھی۔ وہ انھیں کھانے میں پڑھاتی تھی بہت آگے

تو سمجھ نے لیکن تالا پانی بھی نہیں کھاتے تھیں انھوں سے پاس ہو جاتی تھی۔

مولیٰ کوئی دلکش آنکھیں ہندی رنگ ڈالا تھا نازک سا رونا دلکش قسمت قد وہ انھوں سے کچھ بڑی تھی۔ وہ انھیں کئی طرح سمجھتے تھے۔ لیکن اس میں ان کی باتیں بہت تھیں۔ اس کی آنکھیں دو بیتی تھیں اور کد م رنگ

رخساروں پر عشق پھرتی تھی۔

سمجھ سے پوچھا تو تھا جسے شبی سمجھ کہہ کر دیتے تھے۔ وہ سمجھ سے صرف ایک سال چھوٹا تھا لیکن پڑھائی میں ایک سال آگے تھے۔ سمجھ بچپن میں بہت بیمار رہی تھی۔ مسلسل دو تین سال تک جس کی وجہ سے اس کا

ایلیفینٹ و ہوا تھا۔ یوں وہ ہفتے سے ایک سال پیچھے تھی جس پر اسے جڑا تھا۔

بڑے سے چھوٹے تر تھا۔ ابھی انھوں نے جماعت میں تھا لیکن ابھی سے بہت پڑھا تو تھا۔ سرنوٹ۔ کج کا

پر کھش لڑا تھا اور سب سے چھوٹا رونا تھا جو بچوں کلاس میں پڑھتی تھی اور گھر بھری کلاسی کا۔

”ابائی! میں صاحب!۔“

”میں سوچ میں ڈوبنے لگے کہ ہفتے پر پوچھا۔“

”اس بات۔“

میاں صلاح الدین نے جو نہ جانے کیا سوچ رہے تھے پوچھ کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں دوست ہے۔“

انہوں نے جانے جاتے پھر دیا۔

”کئی بار متانا۔“

بھرتے دیکھتے ہوئے کما۔

”اماں رتا ہے۔“

انہوں نے کئی نظروں سے اسے دیکھا۔

”کرشن عمر میں ہے اس کا گھر۔“

میاں صلاح الدین نے پر اسات بنا دیا اور اسے جانے کا اشارہ کیا اور نظروں سے ہٹا دیا اور اخبار پر جمادی لیکن ذہن کچھ

ایکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ کر کرسی کی پشت سے سر کھینچے ہوئے آنکھیں موندیں۔

”کیا بیات ہے میاں صاحب! طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“

عذرا بیگم ملازم کو دیکھ کر کھانے کے متعلق دیا بات۔ دے کر بچکے سے باہر نکلیں تو میاں صلاح الدین کو

آنکھیں موندنے سے خبردار دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ وہ دیکھتا تھا چل پڑا ہوا اور فریض رہتے تھے کہ آج کچھ کھان کا دن تھا

لیکن کچھ کھانے کا دن بھی وہ جب معمول نماز سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کرتے اور فارغ ہو کر ناستا کر کے

اخبار دیکھتے اور پھر اپنی فائیلز اور درجہ کے کارڈ دیکھتے۔

\*\*\*

”مجلس الدین کی کرسی پر میرے میں وہ بڑی کچڑ۔“

اور کچھ عرصہ پہلے انہوں نے شیخوہ کے قریب ایک ہوٹری ٹیکسٹری بھی چلاو حالت میں خریدی تھی۔ خوشحال

تھی کلاوہ روز روز ترقی کر رہا تھا لیکن ابھی کتبہ سمجھ کیا دوالے پرانے کھڑے ہی منجم تھے جس کا منجم وسیع

تھا پر ان کے کٹاؤں تھے اور جس میں بے شمار کمرے تھے۔ کچھ ڈی بہت زمانے کے مطابق یہ عین کڑوا سے رہتے

تھے۔ کچھ کچھ ڈکری پوٹھ علاقے میں جانے کا ان کا جی نہ چاہتا تھا۔ یہاں لوگ برسوں سے انہیں جانتے تھے، عزت کرتے تھے۔ والد کے زمانے کا بنایا ہوا مکان تقریباً ”قرنیا“ ہو گیا تھا۔

سورنٹ کا رواد اور کیراج بھی ساتھ تھا۔ لیکن اس میں ملک وقت دو گایاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ راج بھی خاصا

کشاوت تھا اگرچہ احباب کے لئے پرانے کھانے میں ایک کمال کی کو بھی خرید لی تھی لیکن وہاں محل

ہوئے ان کا کئی کچھ چاہتا تھا۔ وہ سونے کا مچھلی کے اتنا شاندار ڈھیل اسٹوری کر لیا گیا ہے جسے محل ہو جاتا اور

لیکن ان کا منہ تھا کہ ان کے محل کچھ تیس چار پاس بیٹوں میں کیے لوگ رہتے ہیں۔ اور طبقہ کی آوازیں آنے

نکلیں جوتا پتا کہ یہاں بازار حسن کی منظور قاصد روز تیری ملی رہتی ہیں۔ آج کل یہ لوگ اپنے ملازم سے کچھ

”بشا اللہ وماراشی تو بہت شریف ہے کہ کوئی بری عادت نہیں ہے اس میں۔ بس ذرا پسندے اور مجھے کاشقہ ہے۔“

”ہر ماں کو اپنا بچہ شریف ہی لگتا ہے۔“

”میاں صلاح الدین سرگرا۔“

”بہر حال آپ میشر کے لیے لڑی دیکھیں۔ زمانہ بہت خراب ہے، ہا پروری ترغیبات ہیں۔ تم گھر میں بیٹھنا والی کیا جانو کہ آج کل کی لڑکیاں کیسے کیے لگائی ہیں لوگوں کو اور کیسے اپنی اداؤں میں اسیر کر رہی ہیں اور بھی جیسا لڑکا جو خوبصورت بھی ہو اور دولت مند بھی اور بقل تمہارے معصوم بھی۔ اس سے بیٹھنے کے امکانات زیادہ ہیں۔“

”پر میاں صاحب! اپنا بھی دیکھ۔“

”غدا اب تک آپ نہیں جاتیں زمانے کو اور یہ کام جلد ہو جانا چاہیے۔“

انہوں نے اپنے اصرار کو بحث نہ کر دی۔ جب وہ اس طرح بات کرتے تھے تو ان کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ اب اس پر مزید بات نہ کی جائے اور پھر کوئی بات کرنا فضول ہی ہوتا تھا۔ گویا وہ یہ طے کر چکے تھے کہ میشر کی شادی کرنا ہے اب انہیں روکا نہیں جا سکتا تھا۔

”وہ اخبار دیکھ کر کہتے ہیں کہ آج کل کے کمرے ہوئے۔“

”زمنان کے ہاتھ چائے بھجوا دیتے ہیں۔ اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔“

تیکر نے اشدت میں سر ہلایا لیکن کچھ دور ہو کر بھی شکر کی تکی رہیں۔ یہ میاں صاحب نے ایسی بات کیوں سوئی تھی تو بھی بالکل بچہ ہے کہ اس سال اس نے فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لیا تھا لیکن حریف بالکل بچوں جیسی تھیں۔ سناؤ سے ان کی کوشش سرورک کر لیٹ جاتا۔ اس معاملہ اور داتا سے بچے کو جس طرح لڑا اور ان سے چھین کر پھینک دیا۔ میاں صلاح الدین گھر پر ہونے تو تینوں چاروں مل کر اودھم چائے رکھتے۔ کین، اردو اور میشر تو ایک بل بھی نہیں سے تھیں بیٹھتے تھے۔ کین کے ساتھ اس کی پوتی بیٹھنے چھین چھاڑتی رہتی تھی اور دونوں ایک دوسرے پر جان بھی دیتے تھے۔ البتہ دھڑک چھ سچیدہ مزاج تھا۔ اسے پڑیشن لینے کا کرہ تھا لیکن

شبی قاوروی مزاج کا تھا۔ کھانڈرا سا پھر بھی۔ وہ بڑا کراٹھ تھیں۔

”یہ کوئی اس کی شادی کی عمر تو نہیں پھر اس کی بڑھالی کا کیا ہو گا اور یہ تو اس کے ٹھیکے کو نہ کین میں اور اس کی کیا سوچ کا۔“

”زمنان کو چاہئے کہ کدوہ صلاح الدین کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ کچھ حساب

کتاب میں اچھے ہوئے تھے۔ وہ وہ میاں صاحب۔“

وہ کچھ جھجک کر گئیں۔

”شبی کی بڑھالی کا کیا ہو گا۔“

”بڑھالی کا شادی سے کیا تعلق ہے؟ پڑھتا رہے گا۔“

انہوں نے رنر سے نگاہیں اٹھا کر تھیرا۔

”لیکن غدا اب تک آپ کا خاص دھیان رکھیے گا لڑکی کو بہت خوب صورت۔“

”بہر میاں کی۔“

”آپ سے چاہئے کہ لے لے لے لے۔“

انہوں نے غدا اب تک کی بات کاٹ دی۔

”دیکھو یہ زمرضان لاربا ہو گا۔“

غدا اب تک وہاں ہی کمرے میں ایک کرسی پر ٹک گئیں۔ ان کے دل کو کسی بل چھین نہیں آ رہا تھا۔ وہ چادر ہی تھیں کہ میاں کی طرح میشر کی شادی کا خیال چھوڑیں لیکن وہ پوری طرح اپنے کام میں متنبہ ہو گئے تھے۔ غدا اب تک بے چینی سے پہلو بول رہی تھیں۔ کچھ اخبار اٹھا لیں، کچھ سائیڈ ٹیبل پر پڑے کہانات اور دوسرے کر لیں۔

بہت جلد قون میں آگئے ہیں اور کسی کے ہاتھ پر تو لکھا تھیں کہ کیا ہے کہ آدھماں سب کو پھٹوں سے ہم جانتے ہیں۔ جوان بچوں کو ساتھ سے بھی کوئی رنگ نہیں لگتا۔ کئی وجہ تھی کہ وہ اب تک کین کی یاد دلائے گھر میں موجود تھے۔ یوں بھی یہ کہ بہت کشادہ تھا۔ کریں، سرپلوں کے لیے موزوں۔ سرپلوں میں دھوپ سارا دن صحن اور برآمدے میں رہتی اور گرمیوں میں جب کین کچھ پڑھا کرتا یا گانا پاتا تو آواز اور غریب ہوا میں بیٹھنا میاں صلاح الدین کو بہت اچھا لگتا تھا۔

”میر پرستہ سے ملنے تو ٹھیک ہے نا۔“

قریب کار کاغذ راہیگر نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک۔“

میاں صلاح الدین نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”اصل میں سوچ رہا تھا کہ میشر کی شادی کریں۔“

”بہر میاں صاحب! اپنا بھی دیکھ۔“

اس سے بہت ہی ناگوار اور کین میں۔

”بہر میاں صاحب! اپنا بھی دیکھ۔“

”بہر میاں صاحب! اپنا بھی دیکھ۔“

”بہر میاں صاحب! اپنا بھی دیکھ۔“

”بہر میاں صاحب! اپنا بھی دیکھ۔“

”بہر میاں صاحب! اپنا بھی دیکھ۔“

”بہر میاں صاحب! اپنا بھی دیکھ۔“

”بہر میاں صاحب! اپنا بھی دیکھ۔“

انہوں نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔  
 ”کوئی خاص بات ہے کیا۔“

”بھئی۔۔۔“  
 وہ بیٹھا کھڑا۔  
 ”شعبی کے متعلق اب کوئی بات نہ ہوگی۔ آپ سب اب اس کے لیے لڑی تلاش کریں۔“  
 ”گوایشی کے سلسلے میں اب وہ کم از کم اس وقت کوئی بات نہیں سنیں گے۔“  
 عذرا بیکم نے دل کر فتنی سے سوچا اور ان کی طرف دیکھا۔  
 ”وہ دیکھتے ہیں کہ شعلی بات کرنا سکتی۔“  
 ”کیوں کیا ہو سکتی؟“

انہوں نے چونک کر بیکم پر دھڑکا۔  
 ”کچھ نہیں سنا وہ اس کا راز نہ آئے۔ وہ اب کچھ دنوں تک اور وہ پڑھنا چاہتی ہے۔“  
 ”اے! انہوں نے میزک کے بعد مزید پڑھا ہے تو پڑھنا چاہتی ہے۔“  
 ”انہوں نے نہیں پڑھا لیکن بہت شہ پر غافل رہ گئی ہے۔“  
 ”اے! ہو گیا ہے آپ کو عذرا بیکم کیا آپ میں جانتیں کہ میں تو کیوں کے لیے میزک تک تعلیم کافی سمجھتا ہوں۔“  
 ”زادہ نہیں تو ایف اے ہی کر لیں۔ آج کل میزک کو کوئی نہیں پڑھتا۔ رشہ لانے والیاں بھی پہلے لڑی کی تعلیم پڑھتی ہیں۔“

عذرا بیکم نے دے دے پہنچے لیکن میاں صلاح الدین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے فیصلوں میں عذرا بیکم کی رائے کو قطعی کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ عذرا بیکم کچھ روز خاموشی بھی کر رہیں کہ شاید میاں صلاح الدین کو کہیں لیکن وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے وہ غصہ بھی ہو گیا کہ انہیں۔ انہیں میاں صلاح الدین کا ہمیشہ کی شادی کے سلسلے میں فیصلہ پسند نہیں آیا تھا لیکن وہ بھی جانتی تھیں کہ انہیں کا کل کرنا بہت مشکل ہے اور وہ بھی سمجھتی تھیں کہ ان کی پڑھائی کے سلسلے میں اس کی بات نہیں کہیں کہیں کے کہیں کی پڑھائی کا مسئلہ تو خیر اتنا اہم نہیں تھا۔ ان کی طرف وہ کسی دو چار روز دور ہو کر خاموش ہو جائے لیکن ہمیشہ کی شادی اور پھر اس کا مسئلہ تو خیر اتنا گئے کہ ان سے پہلے اس کے لیے ان کا دل بہت کڑوا تھا۔ وہ بچے سے ایک ہتھکڑی رہتے تھے۔ بہن بھائیوں سے بھی بے لگائی نہ تھی۔ کھر ہوئے تو زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتے تھے۔ میاں صلاح الدین کو اس کی ہر بات پر اعتراض نہ تھا۔ وہ ٹائی کیسے پلا پڑھا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ خود انہوں نے ہی اسے ٹائی کی کوڈ میں ڈالا تھا۔ حالانکہ انہوں نے لیٹنر کا تھا۔ تڑپی تھیں۔ مگر وہ ان کی ماں تھیں لیکن انہیں اس کے جانی کو وارنہ بھی اور پھر جب وہاں سمجھتے مند ہو گئیں تب بھی انہوں نے چاہا تھا کہ وہ اس کے آگے۔ جب بھی کراہی جاتی اس کے انہیں جیوں کی طرح سلام کر کے چلا جاتا تو بہت کڑی تھی۔ ان کا بھی چاہتا تھا کہ وہ ان کے پاس بیٹھے۔ ان۔۔۔ اس کے انہیں کسے اور وہ اسے بے تحاشا پڑ کر سن لیکن۔ اور اب جب وہ یہاں آیا تھا تو اس کے لیے تو وہ اپنے طور پر بات نہ کر سکتا تھا۔ اس کی ہر ضرورت کا لیکن بتا نہیں کیوں وہ تم سم اور خاموش رہتا تھا۔ شاید پہلے ہی روز میاں صاحب سے پڑھائی کے سلسلے میں اس کی جو بحث تھی اس نے اسے بدل کر دیا تھا اور پھر میاں صلاح الدین نے بھی حدی کر ڈالی۔ افضل اور ان کے گھر کے ماحول کے حوالے سے بیٹکوں کا بھی کر ڈالی تھیں۔ وہ اپنی ٹائی کا بے حد پیار کرتا تھا۔ اسے ٹائی کی تربیت پر فخر تھا۔ اسوں سے دوستی تھی۔ باپ کے منہ سے ٹائی اور ماموں کے خلاف سنا تھا کہ اس کا دل بہت برا ہو تھا۔

”کیا بات ہے امی جان! آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔“  
 اس نے سناں کے چہرے کو بغور دیکھا۔ یوں بھی شاید بڑی بچی ہونے کے باطن وہاں سے بہت قریب تھی۔  
 ”اے! وہ ہمارے امی کی شادی کے لیے۔“  
 ”کیا۔۔۔“

”انہیں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔“  
 ”آپ کا مطلب ہے شعبی کی شادی۔“

”ہاں۔“  
 عذرا بیکم نے ہر اندازہ نہیں۔  
 ”لیکن شعبی تو ابھی بچہ ہے۔“

”انہیں اچھے کرنا کی طرف دیکھا۔“  
 ”اور پھر اس نے بھائی ہوئے ہیں۔“

”لیکن تمہارے ابا کا خیال ہے کہ اس کی چونکہ باہر جانا ہے اس لیے پہلے شعبی کی شادی کر دی جائے کہ اس کے بچنے کے امکانات نہیں رہیں گے اگر ابھی سے اسے پابند کر دیا گیا تو، ورنہ اپنی بے تحاشا خوبصورتی اسے دکھائے گی۔“  
 ”یہ کیا بات ہوئی۔ کیا خوبصورت لوگ بھگت جاتے ہیں اور بد صورت نہیں۔“  
 ”انہیں چھوٹا لگی۔“

”امی جان! آپ ابھی سے بات کریں“ انہیں سمجھا نہیں کہ شعبی ابھی بہت چھوٹا ہے۔ ابھی کچھ ور پہلے وہ اور بہن بچوں کی طرح لڑ رہے تھے کہ اس نے پوری بیٹھی خالی کر دی ہے اور اس کی پڑھائی، امی جان وہ بھی تو سناڑ ہوئی۔ فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ اور شادی کی قدر مستحق نہ رہا ہے۔  
 ”تمہارے ابا بیٹے پہلے کب کسی کی سہ سے جواب سن لیں گے۔ عذرا بیکم کے لیے میں ایک تھکن اثر آئی تھی۔ انہیں کہیں بھی خودی کو اسرار سے بڑے تھے لیکن چونکہ وہ گھر نہیں رہتے تھے اس لیے انہیں بڑی تھی مگر میں اور شعبی بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی بھی ہر بات اس سے ہی کرتے تھے بہت دوستی تھی ان کی اس سے۔  
 ”اور کہاں۔۔۔ کس سے شعبی کی شادی ہوگی۔“

”ماں کے لیے کسی تھکن نے اسے بتایا تھا کہ ابھی سے اب کسی کو اس کے متناقص نہیں ہے۔“  
 ”لو! دیکھتے ہو کوسا ہے۔“

”ممنی۔۔۔“  
 ”ممنی بھائی کی بھائی تو ابھی اور آئی۔ اس کے رخسار سرخ ہوئے تھے اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔“  
 ”ابا۔۔۔“

عذرا بیکم اور انہیں ایک ساتھ پوچھا۔  
 ”ممنی! اس کوئی ہوں۔ سات سو بائیس تیرے سہی ممی! اچھے یقین نہیں کرنا۔“

”لیکن تمہارا راز نہ تو وہاں تھا۔“  
 ”ہاں۔۔۔ ممی کا فون آیا ہے اس کے بھائی پہلے ہی بتا کر آیا ہے۔ ممی نے پورے اور بھی دیا ہوا تھا۔ ممی کے اپنے بہن سارے سارے ہیں۔ مجھ سے چندہ نہ لیا ہے لیکن وہ تو اپنی چھوٹا سی اور میں نے تو صرف آخری دو تین سو روپے لگا کر پڑھا تھا۔“  
 ”انشاء اللہ تم بہت ذہین ہو۔“ انہوں نے بے اختیار اٹھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے اس کے رخساروں پر بوسہ دیا۔

”مبارک ہو بیٹا۔“  
 عذرا بیگم نے بھی مبارک دی لیکن وہ بدستور اور اس سی تھیں۔ سمن کی کامیابی نے بھی دل کی اداسی کم نہیں کی تھی۔

”یہ بات اسے کیسے معلوم ہو سکتی ہے شاہ جی! وہ تو۔۔۔“  
”کیا۔۔۔“

”میں شاہی لہو ہمارا پنا ہے ہمارا خون۔ وہ قائم چاہو کیا ہے۔“

سید عظیم علی شاہ کی آنکھوں میں ایک لمحہ کو جیت اترتی تھی لیکن سر سے لے کر ہاتھوں تک وہ سب کچھ کھڑے ہو گئے۔  
”یہ تم نہیں جانتے کہ سید قائم علی شاہ سے ہر شے ختم کر چکے ہو۔ تم ہی ہر جہاں چلے کہ کوئی قائم علی شاہ بھی تھے جو ہمارے بھائی تھے جن کے سنگ ہم کھیل کر دیوے ہوئے اس نے ہمارا مان۔ نہیں رکھا تو میں بھی یاد نہیں رہا کہ قائم علی شاہ کون ہے۔ آئندہ ہمارے سامنے ان کا نام تھے لیکن شاہ خورشاد اور اس ایس بی پی پیغام بھجوایا کہ اپنی کھال میں رہے۔“

وہ ایک تک حویلی کے لشکر پر گھر سے کھڑے تھے۔

”اور تمہیں اس سے کیل بھول اور ریڑھ منڈیڑھانے کی ضرورت نہیں اور کب سے جانتے ہو انہیں۔“

”آج۔ شاہی باغ سے پہلے مجھے ترک۔ نہ بھی کہ چاہو کا چاہو کیا۔“

”غیر۔ خوشخوار کو کیا ہو گا اس نے کہہ کون ہے۔“

انہوں نے ایک نظر شاہ رخ پر ڈالی اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیا۔ بغیر تیز حیرت قدم اٹھاتے حویلی کے اندرونی حصے میں چلے گئے اور شاہ رخ وہیں حویلی کے برآمدے سے حیران سے کھڑے رہ گئے۔ انہیں شاہی سے اس دور کی طرح نہ بھی بلکہ وہ تو سوچ رہے تھے کہ شاہی یہ سننے ہی کہ وہ قائم علی شاہ کا بیٹا ہے اس سے ملنے کو بیتاب ہو جائیں گے اور وہ تو حویلی آتے ہی شاید انہیں خیر سے جانتے ہیں اس لئے انہیں روک لیا تھا۔

”بھائی شاہی کا مژدہ دیکھ کر بات کیجئے گا اس وقت تو بہت غصے میں ہیں۔“

اور اسامہ کے کہنے پر ہی وہ ان کی طرف جاتے جاتے ٹھہر گئے تھے شاید سیدہ امان کے مزاج کو ان سے بہتر سمجھتی تھیں لیکن پھر سید عظیم شاہ نے انہیں خودی بلوا دیتا تھا اور اس واقعے کی پوری تفصیل پوچھی تھی۔ بات واقعی اتنی بڑی نہ تھی۔ مگر میں شاہ زبیب کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اگرچہ شاہ زبیب ان سے بچو نہ تھے لیکن انہوں نے اپنی الحاح شادی سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ مزید تعلیم کے لیے جا رہا جاتا ہے تھے۔ سید عظیم شاہ نے شاہ زبیب کی شادی اپنے بڑے بھائی سید اظہار علی شاہ کی بیٹی سے ٹھہرائی تھی۔ سید اظہار علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے بیوی بچے ہوئے تھے۔ دوسری حویلی پر بچے تھے جو ان کی حویلی کے نام سے بچائی جاتی تھی کیونکہ وہ ذرا اور چلی تھی۔ سید پور چاڑی علاقہ تھا جہاں کہ سید عظیم علی شاہ کی بیٹی حویلی کے نام سے بچائی جاتی تھی۔ سید اظہار علی شاہ کی بیٹی اور ایک بیٹی تھی۔ دو بڑے بیٹے شادی شدہ تھے۔ شاہ زبیب کو اس شادی سے کوئی انکار نہ تھا۔ سیدہ زارا شاہ نہ صرف یہ کہ بے حد حسین اور طرمدار ایک بلکہ بڑی کھسی بھی تھی۔ شاہ زبیب کے ایک سال بعد اس نے بھی لے لے لیا تھا۔ ہمیں وہ شادی صرف یہ صرف کیا رہا۔ بھولی تھی۔ شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں بی بی بی کو ضروری شایگ کرنا بھی اور ان کی دونوں بھینیں بھیں سیدہ امان شاہ اور سیدہ بھی شاہی بی بی جان کے ساتھ یہ جاری تھیں۔ سید عظیم شاہ نے صدمہ اٹھا تھا کہ وہ بھی ساتھ جائیں۔ مخدوم چاچا ہانڈا اور غلام احمد بھی وہ سید پور کی حدود سے نکل کر بی سڑک کی طرف آئے تھے کہ پولیس لیا ایک مہاراجہ نے گاڑی روک لی۔ انہوں نے آگے سڑک پر بند کر دی۔ سر بھی اٹھا۔ بااشارت مہاراجہ پولیس آفیسر مہاراجہ سے اتر کر معذرت کرنے لگے۔

”دراصل میں کچھ جرموں کی تلاش ہے جن کے متعلق باوقوف ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ سید پور کی پاباد میں سچھلے کی دونوں سے بھیجے ہوئے ہیں اور ان کی تاہم اپنی پناہ چھوڑ دیں گے۔“

”یہ گاڑی سید پور کے شاہ عظیم علی شاہ کی گاڑی ہے اور گاڑی میں ان کے گھر کی خواتین ہیں۔“ مخدوم حسین

گاڑی سے اتر آیا تھا۔ اس کا ہاتھ دھو رہا تھا۔

پولیس آفیسر ایک دو قدم پیچھے بٹھ گیا۔ اسی اثناء میں شاہ رخ بھی دوسری طرف سے اتر کر پولیس آفیسر کے سامنے آکر کھڑے ہوئے تھے۔

”آفیسر میں شاہ رخ علی شاہ ہوں اور میرے سید پور کے سجاد نشین ہیں عیدہ نعیم علی شاہ۔“

انہوں نے چٹوان کی جیب سے اپنا والٹ نکالا۔

”میں سید شاستی کا بیٹا ہے۔“

”نہیں، میں اس کی ضرورت نہیں۔ بھلا سید پور کے سجاد نشینوں کو کون نہیں جانتا۔ میں معذرت خواہ ہوں۔“

اس نے وضاحت کی کہ وہ کیوں اور کس وجہ سے یہاں تاکہ بندی کیے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ

چمک اور ہوش و بخت پر دلچسپ مسکراہٹ اور وہ بے حد اشتیاق سے پوری آنکھیں کھولے۔ انہیں دیکھ رہا تھا۔

عجیب کی جاذبیت تھی اس میں۔ شاہ رخ نے ایک ستارہ بھی نظر اس پر ڈالی۔ باشبہ وہ ایک خزانہ کثیر قیمت کا مالک تھا۔

”میں آفیسر! آپ اپنا فرض ادا کریں۔ اگر کہیں تو میں خواتین سے کہتا ہوں کہ گاڑی سے اتر آئیں۔ آپ اپنی

تکلی کر لیں۔ میرے ساتھ میری والدہ اور میں ہیں۔“

”میں پہلے نہیں لے کر آتا اس کی ضرورت نہیں۔“

اس کی نظریں اب بھی ان کے چہرے پر تھیں اور ان میں عجیب وار عقل تھی۔

”آپ کی یہ شاہ پٹشال یہ دو دن آگے نہیں ملے گا۔ آپ انہیں اپنے ساتھ لے کر آئیں۔“ ان کے اشارے پر مخدوم

حسین واپس گاڑی کی طرف بڑھ گیا تو اس نے آہستگی سے کہا۔

”میرے آپ سے ملنے کا میں بڑے گراں قدر مہربان بن گیا کیونکہ یہ وہاں ہوئی ہوئی۔“

”مجھے سے ملے۔“

اب کے شاہ رخ نے از حد حیرت سے اے دیکھا۔ جو اپنا اثبات میں سرھلاتے ہوئے مسکرایا۔

”میرے والد آکر آپ کا ذکر کرتے ہیں اور انہوں نے یہ بتایا تھا کہ شاہ رخ جی بیٹا شاہی اور آگے نہیں پائیں ان کے

بھائی ہیں۔“

”آپ کے والد کیا نام ہے ان کا اور مجھے کیسے جانتے ہیں اور پھر میری آنکھوں اور پٹشال کا ان کی آنکھوں

اور پٹشال سے کیا تعلق۔“

ان کے ذہن میں یہ دو رنگ نہیں تھا لیکن جب پولیس آفیسر نے آہستگی سے کہا۔

”میرے والد کا نام سید قائم علی شاہ ہے۔“

تو وہ گئے کے چاروں حصے میں دو پیرے ہاتھی میں بیٹھے گئے اور سید قائم علی شاہ ان کے بہت پار سے چاروں

کے سامنے آکر کھڑے ہوئے تھے۔

جسے ان کی آنکھیں تھیں وہ گھوٹے اور بھی ان کے پیٹ میں گود کی کرتے اور کبھی کامیابیاں سناتے

تھے یہ منظر ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے تھے۔ یہ ان کے آخری منظر بددلی سے ان کے گھر سے نکل دیا

تھا اور وہ دوتے ہوئے ان کے پیچھے لپکتے تھے لیکن شاہی نے انکار انہیں کسی کام کے حوالے کر دیا تھا اور یہ منظر

دونوں ان کی آنکھوں میں گھرا رہا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ لیکن تھیں بھینوں

انہیں بخار پر تھا اور میٹروں وہ اڑنوں کو چاہو چاہو کہہ کر جاگ اٹھتے تھے اور پھر ان کے اٹھنے کی انہیں خاموش

کر دینا مشکل ہو جاتا تھا پھر وہ بولے وہ بھولے۔ بظاہر انہوں نے چاہو کا نام لینا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ

سارے منظر ان حرم گزرنے کے بعد بھی ان کے دل کے دواڑے پر دستک ضرورت ہے لیکن وہ بھی نہ جان

سکے تھے کہ چاہو نے ایسا کیا کیا تھا کہ اچھا کہہ دیا۔ اچھے نے انہیں معاف نہیں کیا تھا۔ یہ بھی گھر میں ان کا ذکر

ہو تھا۔ ہوتے سنبھلے ہی انہیں باہل بھیج دیا گیا تھا اور انہوں نے اب تک کی عمر کا بیشتر گھر سے باہر ہی

گزارا تھا اور بھی انہیں خیال نہیں آیا تھا کہ وہ بی بی جان یا کسی اور سے ان کے متعلق پوچھیں۔ اس کی یاد وہ



یونی ملارا ارادہ شاہی سے پوچھ بیٹھے تھے تو انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی کہ قائم علی شاہ ہمارے لیے مرچے اور آپ ہیں جو پولیس آفیسران کے سامنے کھڑا تھا۔ قائم علی شاہ کی باری ساری شبابت چرائے تب ہی انہیں اس میں اتنی جانیت اور شش محسوس ہوئی تھی۔  
وہی بڑی بڑی خواب کا آنکھیں دسکی ہو گوری رنگت، صحت کی سرخی لیے بھرے بھرے رخسار، تھکی موچیں، محسوس و خوبصورتی میں سید پور کے سیدوں کے کھرانے کا ہر زرد بے محل تھا۔  
"ایس بی سید شجاع علی شاہ۔"

پولیس آفیسر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہرے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اختیار انہوں نے دونوں بازو چمکایا۔ پولیس اور کسی ایسی دیر تک اسے دونوں بازوؤں میں بیٹھے کھڑے رہے۔ یہ ان کے بہت پیارے چاچے کے بیٹے تھے جن سے وہ اس بڑی جوتی میں سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ انہوں نے بار بار انہیں پاس بٹھا کر بتایا تھا کہ تمہارا ایک بھائی بھی ہے جسے چاہا یا رادار مت جلد اسے تم سے ملو گے اور وہ بھائی جس سے کہنے کا بچپن میں انہیں بہت اشتیاق رہا تھا اور وہ کہہ کر یہ کہہ کر چلا چلا اس کے متعلق پوچھا کہ "آج اتنے سالوں بعد وہ اسے ملے گا۔" تب انہیں ان کی سی خوشی محسوس کر رہے تھے۔  
"یار بڑا انتظار کر لیا۔"

"اسنے سے الگ کرے ہوئے انہوں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔  
"نہیں بچپن سے ہی تمہارا اختر باہو ہوں۔"  
"بالکل یہی بات میں بھی آپ سے کہہ سکتا ہوں۔ پاپا نے ہمیشہ مجھ سے کہا کہ تمہارا ایک اور بھائی بھی ہے جو بڑی خوشی میں رہتا ہے۔ میں کی ان تمہیں اس کیسپاں کے چاولں گا۔" اور وہ درمیانی درے کے لیے خاموش ہو گیا۔  
آنکھوں میں کسی اضطراب نے نہ کر دی۔  
"پاپا بھوش آپ سب کا ذکر کرتے ہیں اور میں آپ سب کو لوں اس طرح جاننا ہوں جیسے ہمیشہ آپ سے ملتا رہا ہوں۔ آپ "شاہ زب" سیدہ اسماء اور سیدہ عظمیٰ اور شاہ مسرب کا ذکر کرتے ہیں پاپا۔" حالانکہ وہ خوشی سے گلے تھے تو صرف شاہ رخ اور شاہ زب ہی تھے انہیں پاپا سب کا کیسے پتا چلا۔  
"پاپا آپ لوگوں کی خبر کتنے ہی ہمیشہ۔"

اور اپنا نام سن کر کوئی پر جھک کر شجاع اور شاہ رخ کی طرف دیکھتی سیدہ اسماء میں ہاتھ سے اپنی چادر سنبھالتی جرات کی سوچ رہی تھی۔ بھلا شاہ رخ بھائی اس سے کیوں مل رہے تھے۔ کیا یہ پولیس آفیسران کا جاننے والا ہے۔ ان کی گفتگو نہ نہیں کسی بھی کہ وہ گاڑی سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔  
وہ ہوئی جس سے باہر دیکھ رہی تھی کہ شاہ رخ نے مڑ کر دیکھا اور گھبراہٹ میں چادر کا کونا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایک کچھ کو گویا جانبداری کی آواز سے نکل اپنی تھانہ میں اسی لیے شجاع کی نظریں اس کی تھیں اور پھر اسی ہی سے نکلیں۔ چادر کھینچ کر لی وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی اس کا سر ہڑھڑکا رہا تھا۔ شاہ رخ کے مزاج کی نرمی سے وہ واقف تھی وہ اسی پھلتی مٹی پاؤں کی پروا نہیں کرتے تھے پھر کسی اس کی پوچھنا عرق مرق ہو رہی تھی۔ شاہ رخ کے بچے۔ شاہ زب۔ وہ ناؤ غصے میں جانے لگا کر بیٹھتا۔ تب ہی شاہ رخ چند قدم پیچھے ہٹ کر گاڑی کے پاس آئے اور کھڑکی میں جھک کر بی بی جان کو مخاطب کیا۔  
"بی جان۔ یہ ایس بی آپ جانتی ہیں کون ہے۔"

"بی جان کی نظریوں نے کچھ فاصلے پر کھڑے ایس بی کو دیکھا جو گاڑیوں میں دنیا جہان کا اشتیاق جیسے اور دھری دیکھ رہا تھا اور انہیں کوئی ارادہ سا ہوا تھا۔ خوشی شاہ رخ کے چہرے سے پھول پڑی تھی۔ کسی انسانی کسی بات ہوئی تھی کہ اتنے وہ سال کے بعد وہ اچانک سرور اپنے اس کمزور سے مل رہے تھے جسے انہوں نے بھی دیکھا تھا۔  
"شاہ رخ۔"

بی بی جان کی آواز میں لرزش تھی۔  
"گاڑی میں بیٹھو۔ میں ہر دیر ہوتی ہے۔"

"بی جان۔"  
شاہ رخ نے کچھ کہنا چاہا تھا جہاں کہ وہ ایس بی کوئی غیر نہیں لیکن بی بی جان نے اسے ٹوک دیا۔  
"شاہ رخ گاڑی میں بیٹھو اور مت بھولو کہ تمہارے ساتھ تمہاری آنکھیں بھی ہیں۔"

"ایس بی جان۔"  
انہوں نے پھر کچھ کہنا چاہا تھا بی بی جان نے پھر انہیں ٹوک دیا۔  
"شاہ رخ گاڑی سے دور رہ کر ہم تمہارے اوپ اوپ اور سرور جان بھول گئے۔ جو تعلق ٹوٹ چکے وہ دوبارہ نہیں جوڑے جاسکتے۔"  
ان کا کھڑکھڑو لیکن بہت آہستہ تھا۔ انہوں نے ایک نظروں پر ایک بیٹھ رہے تھے۔ حسین کو دیکھا اور پھر کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے اور بی بی جان کی بات کی بات پر از حد حیران ہوتے ہوئے وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر شجاع علی شاہ کے پاس آئے اور معذرت طلب نظریوں سے انہیں دیکھا۔  
"اوکے۔"

سید شجاع علی شاہ کے ہونٹوں پر دھم سی مکرہاٹ تھی۔ شاید وہ ان سے زیادہ خبر تھے کہ اپنی جگہ سے ایک قدم اٹھ کر نہیں بڑھے تھے۔ حالانکہ گاڑی کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا بھی تھا "کو، کو تمہیں عقلی کی سی ملو اوکے۔"

"I hope we will meet again." (مجھے امید ہے کہ دوبارہ ملیں گے)  
شجاع کی آنکھیں اوپر رہی تھیں۔  
"Yaa I will see you soon."

شاہ رخ اس سے معافی کر کے گاڑی میں بیٹھے اور پھر وہ سارا وقت بی بی جان کے رویے کے متعلق سوچتے رہے۔ یقیناً انہوں نے شجاع کو بچپان اپنا تھا۔ چاچے سے ان کی مشابہت بھی قوت سے لیکن خدوم حسین کے سامنے انہوں نے بی بی جان سے اس سلسلے میں بات کرنا مناسب نہ سمجھا مگر کھرتے ہی وہ بی بی جان سے گلہ کر بیٹھے۔

"بی بی جان وہ ایس بی قائم چاچا کا بیٹا تھا۔"  
"ہاں نہیں کچھ ہی تھی۔"

"بی جان اور دیا جان اب نہیں رہے۔ ان کے فیصلے ان کے ساتھ ختم ہو گئے۔ وہ ہمارا سا گچھا زاد تھا۔ آپ نے اس سے بات نہ نہ نہ۔ عقلی "کو" کو نہیں ملے گی۔"  
"یہ بات تو تم اپنے والد سے پوچھنا چاہتے ہیں؟"  
بی بی جان پھر نے کچھ سے اس کی بات کو جواب دیتے۔ بڑے اپنے کمرے میں طے گئیں اور وہ لاؤنچ میں اسماء اور عظمیٰ کے ساتھ اکیسے رہ گئے۔

"میں شاہ کی کویتا ہوں وہ یقیناً بہت خوش ہوں گے۔"  
"لیکن شاہ رخ بھائی۔"

سیدہ اسماء شاہ نے انہیں روک لیا۔  
"میں شاہی سے سید شجاع علی شاہ کی بات مت کیجئے گا۔ ابھی تو وہ بہت غصے میں ہوں گے کہ گاڑی کو روکا گیا کیوں کیا؟"  
شاہ رخ نے از حد حیرت نہ پوچھا۔  
"خدوم حسین گاڑی پر سرج میں کھڑی کر کے سیدہ جان کی طرف گیا ہے۔"



”میں کسی روز اسکول سے پھرتی کر کے اس کے ساتھ بیوٹو خرید کر جاؤں گی۔“

”ہاں تو عاتون! تم بہت اداستانی صاحبہ بن گئی ہیں اور میں تمہارا تک نہیں لیہ تو آج میں اس کو تو اگلے سے پتا چلا۔“ اس کے لیے میں شگہ محسوس کرتے ہوئے ماہ نور نے فوراً ”معدرت کی۔“

”سوری خضر بھائی اصل میں چاکلی کی بس چاہت تھی۔ میری دوست ہے نہ اس کی کیا ہی جس اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ وہاں سائنس ٹیچر کی وہ کسی بھی کی۔ پوری معدرت تھی انہیں۔ میں نے سوچا اچھا موقع ہے۔ پورے دن میں میں ملان کی تپ تپ کیں جا کر اجازت لی۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ کمال تو ہیں نہیں آپ سے کہوں! مالہا! آپ سے سفارش کر دیں۔ میں پھر اپنا سے اجازت دے دی۔ مالہا! خود بھی تک کچھ خراب سا ہے۔“

”کہہ مالہا! مجھے اجازت دے دیتیں چاہے کرنے کی تو چھوڑا مالہا! چاہے نہیں کرنی پڑتی۔“ منصور نے نقشہ لپیٹ کر خضر کی طرف بھلا کر خیر خان کے اس معاملے کے بعد وہ بے حد شیدہ ہو گیا تھا۔ ”تمہیں تو خیر ملاں سے اجازت نہ دے کر بہت اچھا کیا ہے۔“ ماہ نور نے منصور کی طرف دیکھا۔

”تمہارا مالہا کا جواب ہونوں۔“

”منصور اس کی بات کا جواب دے بغیر کھڑا ہو گیا۔“

”وہ کسے خضر بھائی۔ مجھے اب جانا ہے بیوٹو نہ پڑھانے کے لیے۔ ڈھائی بج رہے ہیں اور چار بجے مجھے وہاں پہنچنا ہو تا ہے۔“

”تم کس روز تک یہ کوئی بیوٹو کیوں نہیں دھو بیٹے لیتے۔“

”ایک دو روز تک یہ بھی ہیں۔ وہاں تو میں کا بجے سے آتی تھی چلا جاتا ہوں۔ یہ دور کی تو ہے لیکن نشوونہ فیس بہت

مناسب ہے۔“

”منصور نے بتایا۔“

”اگر تم چاہو! لیکن اتوار کو ادھر آنا گھر۔ پھر ڈسکس کر س گے۔“

خضر نے اس کو جانے کی اجازت دے کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔

”اوپ! او! بی بی۔“

”خضر بھائی! بلین۔“ ماہ نور نے برا سامنا بتایا۔

”ماہ! عام ماہ نور ہے۔“

”اچھا۔“ خضر نے خیرات سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے سمجھا شاید چاہے کے ساتھ نام بھی بدل گیا ہے۔“

”جی! میں میں ماہ نور ہوں اور ہمیشہ ماہ نور ہی رہوں گی۔“ وہ ہنسی کی۔

”یکہ وہ روز اور زندگی میں اس روز سے مسلسل مجھے استانی ہی کر رہے ہیں۔ کم از کم آپ تو نہ کہیں۔“

”چاہیں کتنا لیکن تمہیں چاہے کرنے کی یا سوچنے کی یا چاہے۔“

”چاہے چاہے نہیں خضر بھائی۔ میرا بہت پہلے سے ارادہ تھا۔ اب کا یاد دہا تھا بہت ہے لیکن میں اس وقت

چاہ میں کر سکتی تھی۔ ایک تو مالہا! اجازت نہ دیتی۔ وہ سراسر میں جاتی تھی فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ کو چاہے کمال

مل سکتی ہے۔ اگر مل بھی نہیں تو کتنی بے گل جائے گی۔ چند سو روپے۔“

”میرت سے ڈنکل اور آئی۔“ میں نے اجازت لے کر دے دی۔“

”کیوں کیا نہیں دیتا چاہے بھی۔“ ماہ نور نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیا آپ کو بھی اچھا نہیں لگے خضر بھائی میرا چاہ کرنا۔ کیا اپنے حالات بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرنا بری

بات ہے۔“

”میں تو بات کرتا اچھا کیا تم نے مجھے خوش ہوئی تھی۔ سن کر کہ تم نے چاہ کر لی ہے اور پھر اسکول کی چاہ تو

بڑی سیف ہوتی ہے تو خیر اس کے لیے تمہارے اسکول کا کاحول کیسا ہے۔ کتنی ہے؟“

”جاؤں تو اچھا نہیں ہے خضر بھائی۔“ ماہ نور خوش ہو گئی۔

”چھوڑنا حتمی کیا ہی نہیں ہے۔ ان کی وجہ سے بڑی دھار میں رہتی ہے لیکن وہ چور نہیں ہیں! ڈاک صاحبہ بہت چمک رہے ہیں۔ وہ وہیں چکر لگاتے ہیں۔ ویسے! مجھے میں پتہ تو صرف کر رہی تھیں۔ بہت اچھا روپہ ہے ان کا بیجڑ کے ساتھ اور یہ بھی سب کو اچھی دیتے ہیں۔ بی بی! بی بی! اسٹوڈنٹ اسکولوں کے مقابلے میں سائنس بیجڑ ہونے کی وجہ سے شگہ بھیجے بڑا رہتے ہیں کیسے ہیں۔“

”بے جوڑ! بی بی! اسٹوڈنٹ اسکول کی چاہ ہو گئی ہے۔ دن میں چاہ اس میں ظاہر ہے ایک آدمی کے اندر کام ہوتا ہے۔ برواشت کرنا بڑا ہے اور پھر بہت مناسب ہے۔“ خضر نے زہی سے سمجھایا۔

”بھی! بلادہ! بی بی! برواشت! وہ کتنی ہے۔ لیکن اب ہت کی ہے تو جو مسئلے سے برواشت کرنا۔ ہم سب ہیں! تمہارے ساتھ بھی کسی کوئی مشکل ہو تو مجھ سے کہنے میں جھجکتا نہیں۔ حالانکہ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ میں خود ہی بتا ہوا چاہے تھا۔“

”میں جانتی ہوں خضر بھائی آپ کے سوا اہل اور کون ہے آپ لوگ بھی نہ ہوتے تو۔“ اس کی آواز بھر گئی۔

”اچھا! آؤ میں یہاں شروع ہو جاتا۔ ان چار سالوں میں تم نے اتنے آؤس ہائے ہیں کہ میں تو حیران ہوں

کہ اب تک کراچی میں سلاپ کیوں نہیں آیا۔“

”میں کہہ رہی ہوں خضر بھائی۔“

”میں آپ تو بالکل نہیں رومش۔ یہ بات اس سے کہیں جو آپ کو نہ جانتا ہو۔ ویسے! آپ کی بات ہے۔“ خضر

تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔

”ہاں! اسکول میں کتنی بار روٹی ہو۔“ ماہ نور نے نظریں جھکا لیں۔

”صرف ایک بار۔“ اس نے بونے نظریں جھکا لے کر جواب دیا۔

وہ بھینچنے سے ہی ایسی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے بہت روتا تھا۔ داوی اور اپا کی بے حد لاڈلی تھی۔ منصور تو بے حد ایزو پر کما کر اٹھا۔ زار مالہا نے اونچی آواز میں کچھ کہہ کر داویہ وہاں بھار روٹی ہوئی داوی کی طرف بھاگی تھیں۔ لیکن اب تو وہ خود بھی کوشش کرتی تھیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر یوں بچوں کی طرح آؤس ہائے نہ بیٹھ جایا کرے۔ لیکن باوجود کوشش کے آؤس لٹے آئے تھے اور اب اس روز اسکول میں آیا ہوا تھا کہ میں چھوٹی سی بات تھی۔ ڈاک صاحبہ کلاس میں آئے تھے۔ وہ بچوں کی کاپیاں چیک کر رہی تھی اور کلاس میں شور تھا۔

”مس ماہ نور! ڈاک صاحبہ کالج بہت تھکا۔ وہ ایک دم کھرا کر کھڑی ہو گئی۔“

”میں سر۔“

”کلاس میں! بچان کا خاص خیال رکھا کریں۔“

وہ کمرے کو لے کر بیٹھ گئی تھیں لیکن ان کے جاتے ہی جانے کمال سے آؤس ہائے پڑے تھے اور باوجود کوشش کے وہ ان آؤسوں کو نہ روک سکی تھی اور بچے حیران ہو کر آئے دیکھنے گئے تھے یہ اس کا کلاس میں تیرا دن تھا۔ بعد میں وہ

کتنی ہی دن چھٹی چھٹی چھٹی کر دی۔

خضر تو جی سے اس کے جڑے کے دلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

”مالہ! بہت جو زندگی ہے! اس میں بہت جگہ برواشت کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ تم عملی زندگی میں قدم رکھ چکی ہو تو اپنے آپ کو تبدیل کر۔“ بعض اوقات بڑے سخت مقام آجاتے ہیں۔ کمزوروں کو تو لوگ پاؤں تلے چل دیتے ہیں۔ خود کو مشہور اور نامیں منصور کے کچھ بیٹے تک نہیں لیتی جدوجہد کرنی ہے۔“

بیشک کی طرح خضر کا لہجہ نرم اور انداز سمجھانے والا تھا۔ ماہ نور نے سر ہلاتے ہوئے منتظر نظروں سے اسے دیکھا۔

”السلام علیکم۔“ نزل لے لائے تو میں داخل ہوتے ہوئے دوڑوں کی طرف دیکھا۔

”مالہ! کہہ رہی ہیں کھانا لگ گیا ہے آپ آجائیں۔“

”رواگیا کسی ہو اور کب آئی ہو کالج سے“ حضرت نے اس کی طرف دیکھا۔

”مے دن اور کچھ دیر پہلے سے آئی تھی جب آپ استانی صاحب کو سبق پڑھا رہے تھے۔“ ماہ نور نے گھور کر اسے دیکھا۔

”استانی کو استانی ہی کہا جائے گا۔ تب صوبہ دار بھی تو نہیں آ سکتا تھا حضرت بھائی۔“

”نزل شہر میں آگے موڈ میں آگے ماہ نور سے گھر کر رہی تھی۔“

”کھانا لایا کسے کرے میں ہی لگایا ہے۔“ اس نے ماہ نور کی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے بتایا۔

جب سے نصیر احمد خان بنیاد پر سے آئے تھے کھانا ان کے کمرے میں ہی لایا جا تھا اور نہ عام طور پر پہلے کھانا پی وی لاؤنگ میں ہی لایا جاتا تھا۔ جوئی وی لاؤنگ کم ڈرائنگ روم تھا۔ صوف اور ایک سستانا کارپٹ اس میں ڈال دیا گیا تھا۔ کھانے کے وقت کارپٹ پر ہی چادر بچھا کر سو خان لگایا جا۔ ایک سائیز پر رائٹنگ ٹیبل اور ایک چیر پری ہوئی تھی۔ یعنی وی لاؤنگ ڈائنگ روم اور ڈرائنگ روم کے علاوہ یہ اسٹڈی کا کام بھی دیتا تھا اور وقت ضرورت اسے لیٹ روم میں بھی تبدیل کر دیا جاتا تھا۔

”پیش کھانا کھا لیں۔“

ماہ نور حضری طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں جی میں جب آتا تھا تو کل سو رہے تھے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔“ حضرت بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟“ نزل نے دہل کے ہوئے نقشے کی طرف اشارہ کیا۔

”نقشہ ہے۔“ حضرت نے بتایا۔

”دراصل وہ تو ایک پلاٹ ہے تاہم اداویٹس کی طرف ابوجان اس پر کچھ فٹنس بنوا چاہ رہے ہیں۔ وہی نقشہ

ہے ذرا مٹوں سے ڈسٹیکس کر دیا تھا۔“

”مٹوں سے“ نزل نے بے اختیار دہس پڑی۔

”بھلا اسے کیا پتا۔“

”مستحق کا کچھ بڑے بھی۔“ حضرت بھی مسکرایا۔

”انشاء اللہ وہ انجینئر ضرور بنے گا۔“ ماہ نور نے شہیدگی سے کہا۔

”حقیقت یہ ہے کہ فٹنس بنوانے کا مشورہ میں نے ہی ابوی کو دیا تھا۔“

”ماہوں گاہ کے تک واپس آجائیں گے“ نصیر احمد خان کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے نزل نے پوچھا۔

”شاید اگلے ماہ تک کل ہی بات ہوئی تھی۔ کہہ رہے تھے کہ اگلے ماہ تک آجائیں گے۔“

”جیسے میں ان کے لیے بہت اداس ہو گئی ہوں۔“ نزل نے بتایا تو حضرت نے مسکرا کر اس کا سر تھپتھپایا۔

”یقیناً وہ بھی تمہارے لیے اداس ہوں گے۔“

”جی۔“

نزل کی آنکھیں جپکنے لگیں۔ خوبصورتی میں وہ بھی ماہ نور سے کچھ کم نہ تھی۔ بہت کھل ہوا رنگ، خوب صورت آنکھیں۔ دلکش رلیا۔ ایک سے دو آنکھیں۔ کچھ سے کچھ شہری جاتی تھیں۔ چہرے پر ہلکا سا مصویمہ تھی اور آواز میں عجیب نوعتی کھینچ پکڑا۔ افضال احمد تو اسے جتنی گویا کہتے تھے اور وہ ان سے لاڈ بھی بہت کرتی تھی طیبہ احمد تو ان کی شہزادی اور شہزادوں پر اسے ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو شہید نہ بنا جائے۔ لیکن ان کی ڈانٹ نہ کچھ بڑھو وہ بھی جتنی دہاتی تھی اور افضال حیدر کے گھر کا کڑواں کا آنے کو ہی نہ چاہتا۔ اس طرح کے ساتھ مل کر وہ خود شہر میں گئی تھی اور وہ سب ایسا بچوانے کرتے تھے تو بچوں بچوں افضال احمد کے دو دوں گھروں کی روٹی تھی۔

”قریب آئیں اور فل آج کیا کھلا رہی ہے؟“ حضرت نے نصیر احمد خان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میں فل نہیں آئی۔ فل بچا کوئی کھل بتایا نہیں سکا۔“

”ہاں خود جو سب کو فل بتا رہی ہو۔“ ماہ نور نے اس کی طرف دیکھا۔

”خود فل بتنے سے بہتر نہیں ہے کہ دو مٹوں کو فل بتایا جائے۔“ نزل ہنسی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی۔

”اسلام سلیم انکل۔“ حضرت نے آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔

”و سلیم اسلام بیٹا کو کیسے ہو۔“ نصیر احمد نے اپنے بندے سے آٹھیں جھاک کر اس کے پیٹھ کے لیے گلے بنائی۔

”افضل کی کوئی خبر ہے۔“

”ابوجان بالکل ٹھیک ہیں اور مرے میں ہیں۔ رات بھی ان سے بات ہوئی تھی آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔“

حضران کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”بہت دنوں بعد آئے ہیں۔“

”بہت مصروف تھی انکل۔“

”کھانا کھنڈا ہو جائے گا شروع کریں۔“ طیبہ خاتون نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ نصیر احمد خان کے

بندے کے ساتھ ہی ٹیبل پر کھانا رکھا تھا۔

”ماں اور بچے کہاں ہیں۔“ نصیر احمد خان نے طیبہ خاتون سے پوچھا۔

”ماں ہاں تو کھانا کھا لیں گی۔ نپل کے اسٹول میں شکستیں سے دوہرے آئے گا مٹوں کھا کر ٹوشن پر چلا

گیا۔ موی اور رائی نے بھی منوں کے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔“ طیبہ خاتون نے تفصیل بتاتے ہوئے پلیٹ حضری

طرف بڑھائی۔

”بھائی! کسی ہیں۔“ طیبہ خاتون نے حضرت سے پوچھا۔

”اے جی جان ٹھیک ہیں لیکن کچھ مصروف ہیں آج کل۔ وہ خالہ جان آئی ہوئی ہیں کینیڈا سے سوچو شام ادھر کے

چکر لگتے رہتے ہیں ان سے۔“

”کلی آئی ہیں یا بچے بھی ساتھ ہیں۔“

”سوائے خاتون کے سب ہی آئے ہیں۔ تین بیٹیاں اور بیٹا بہت عرصے بعد آئے ہیں اس بار دراصل جو

لوگ باہر مہمل ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے کپڑے پوچھیں سے لکنا مشکل ہی ہو جائے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ طیبہ خاتون نے اس کی تائید کی۔

”واپس جو سوئیں ہیں وہ یہاں نہیں۔“

”پھر بھی اپنا ملک تو اپنا ملک ہو ہے۔“ نصیر احمد خان نے بھی بحث میں حصہ لیا۔

”میں انگریزوں سے ہوں اور جرنل ہوں۔ ان کو لوگ بے حد سے ممالک میں جا کر سیٹ ہو جاتے ہیں۔“

”ظاہر ہے دولت ہے۔“ مسٹر تلیس۔ بچوں کی تعلیم بہت سی انگریز کر کے والی چیزیں ہیں اور وہ لوگ غادی ہو

جاتے ہیں ان سوسلوں کے۔“ حضرت نے نصیر احمد خان کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ والی نے تھوڑا سا روڑا کھول کر اندر بھاگا۔

”نیکس والی آئی کہہ رہی ہیں آپ کا کون سے کنکس۔“

”میں ابھی آئی ہوں۔“ نصیر احمد خان نے کہا کھانا کھا کر جائے گا۔ میں شاید آپ کے ساتھ ہی چلوں علیحدہ سے

ملے۔“ ماہ نور حضرت سے کہہ کر نکل گئی۔

اسرا نے بھی کی طرف جاتے جاتے کہ وہ کہہ رہے تھے۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ یقیناً ”سمن“ تھی اور برآمدے میں کچھی ڈانٹنگ ٹیبل پر سرگٹھے شاید دور تھی۔ برآمدے میں چھین ڈال کر ایک ڈانٹنگ ٹیبل اور چیئر رکھ دی گئی تھیں اور انگریزوں میں وہ سب یہاں ہی کھانا کھایا کرتے تھے اگرچہ ڈانٹنگ ٹیبل ٹائمنگ وہ

پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اسفر خاموش کھڑے رہ سوچ انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔  
 ”آپ اسفر جہاں! آپ اباجی سے کہیں نا وہ مجھے کالج میں ایڈمیشن کی اجازت دے دیں۔“ اس کے آنسو اور  
 روانی سے بنے لگے۔

”اچھا اچھا میں بات کروں گا اباجی ہے۔“ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔  
 ”دوئی لیوں ہے پگلی۔ یہ کیا بات ہوئی رونے کی اور اباجی بھلا کیوں منع کریں گے اتنے اچھے نمبر ہیں ہماری۔“

”کوئینس! اسٹیج پر آئی، لایو ٹی وی کی زیادہ تعلیم پسند نہیں کرتے۔ لیکن مجھے ضرور پڑھنا ہے۔ چاہے بابا جی کو کچھ بھی کہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ہیکلے کے رخسار پر ٹپے گاؤں سفر کر دیے۔

”ضرور پڑھنا اور اب رونا ہاتھ لگائیں۔“ بڑی روئے تھیں اور تم بہت ہمارا لڑی ہو۔ تم ضرور ایجابی کو قائل کر لو گے۔“

”وہ نہیں ہوتے، کل رات ایک شخص نے ہمارا منگلی سے کہا تو اس پر: ”بے حد دلچسپی سے اسے دیکھا۔ یہ ان کی سبکیاں بھی تھیں لیکن تعجبی عجیبات تھے کہ وہ اس کی بہت سی باتوں سے متاثر تھے حالانکہ انہیں اس شخص سے ”تقریباً“ ایک سال ہوئے تھے۔ لیکن اجنبیت سی تھی۔ ایک دوسری انہوں نے اپنے دل میں اس کے لیے بے تحاشا محبت اور اپنا بیانیہ محسوس کی اور انہوں نے سوچا کہ وہ خود میاں صلاح الدین سے اس کی بڑی کھالی کے سلسلے میں بات کرے گا۔“

[illegible]

”ہاں تو یہ شہزادہ ہی ہے میرا۔“  
 نانوکیا لائی تھیں سبھی شہزادگی ختم ہو گئی تھی۔ عذرا بیگم اور میاں صلاح الدین جب نانوک کے دسویں کے بعد  
 ایش لہور آنے لگے تھے تو انہیں بھی ساتھ چلے گئے کہ انھوں نے اشد حیران ہو کر انہیں دیکھا تھا۔

”مصلحتاً میں اور جو کرنا کہوں گا یہ کر لوں گا۔ یہ تو کیا ہو سکتا ہے۔ نا تو یہ نہیں ہو سکتا اور ہاں میں جان اور سب کو تو یہ۔“  
 ”نو، وہ ہمیشہ جی، جی، ہاں کرتے تھے۔ نا تو اب یہاں آکر کسٹا شروع کیا تھا۔ سب پریشان سا ہو کر افضال جیور کی طرف دیکھنے لگے تھے اور افضال ہاموں نے اپنے ہاتھوں کے کندھوں پر رکھتے ہوئے میں مصلح الدین کی طرف دیکھا تھا۔“

”ارے نہیں بھائی صاحب اسنی ہمیشہ یہاں ہی رہے گا۔ ہم اسے جدا نہیں کر سکتے۔ اسنی ماں جی کا بیٹا ہے اور یہ گھر اتنا ہی اس کا ہے جتنا میرا۔ بھول جائیں آپ اسے اور پھر یہاں اس کی پڑھائی ہے اسخول کی جگہ کی تبدیلی سے اس کی پڑھائی متاثر ہوگی۔“

میاں صلاح الدین کچھ کہتے کہتے چپ کر گئے تھے لیکن عذرا بیگم چپ نہ رہ سکی تھیں۔  
 ”ماں جی کے بعد اب اسفی کا میاں رہنا۔“

”تیا۔“ افضل حیدر نے انہیں ٹوک دیا۔ اسنی ماں جی سے بہت اٹھ چمکا تھا۔ وہ ان کی وفات سے بہت پریشان اور اپ سیٹ ہے یہاں سب سے ٹھٹھا ملا ہوا ہے۔ وہاں جا کر او اس ہو جائے گا۔ فی الحال یہاں ہی رہنے دس بعد

مہمانوں کی آمد پر ہی استعمال ہوا تھا اور ہر آدمے میں بھیجی دیا ننگ نعلی بہت سارے کلاہوں میں استعمال ہوتی تھی۔ سو فلوں میں یہی بیٹہ کر ہوسم درک کر لیا گیا تھا۔ قادی صاحب آتے تو چوں کوہل ہی قرآن پڑھا دیتے تھے سب انہی آج بھی رکھائی میں مصروف رہتے تھے اور وقت سے وقت گھر آیا کرتے تھے سو صرف چھٹی والے دن ہی سب انٹھے کھانا کھایا کرتے تھے باقی بھار دات کاکھانا انٹھے کھایا کرتے تھے۔

اسروہوئے سے اسلام آباد پر کسی کام کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ ان کی کوکوش جی، جی جلدی مگر ہوا کے وہیہ فہم کے لیے باہر گئے۔ ان میں اور اس سلسلے میں انہوں نے دو کلن کی یونیورسٹیوں میں ایل جی کر رکھا تھا۔ ان کی سال ہوا۔ ان کا ٹھکانا بھی یہاں تھا۔ اور اس کے بعد انہوں نے اس میں اسلام آباد کے لیے بھی ایل جی نہیں کیا تھا۔ جبکہ وہ خود سب سے پہلے تھے کہ انہوں نے جیورنل سے اس میں اسلام آباد کے لیے بھی صاحب نے لکھے کے لیے کہ انہوں نے اس کے مل کر خاصے پر آمید ہوئے تھے کہ انہوں نے جیورنل سے دوست سے اس میں صاحب نے لکھے کے لیے کہ انہوں نے اس کے مل کر خاصے پر آمید ہوئے تھے کہ انہوں نے جیورنل سے دوست سے

[illegible]

”سمن“ سمن نے چونک کر سر اٹھایا۔

”کیا ہوا کیوں رو رہی ہو اس طرح۔“

”جیانی۔“ سمن کھڑی ہو گئی اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ ہوا تھا اور آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

”اوپر ٹھیک ہے نا۔“ نہیں ایک دم اچھا خیال آ گیا وہ اکثر بیمار اور تھکی تھکی لگتی تھیں۔

”ہاں ٹھیک ہیں۔“ سمن نے آہستگی سے کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”پھر کیا موبل سے لڑائی ہو گئی۔“ اسفرز اسامہ مسکرائے۔

”ہیں۔“ سمن نے پھر لمبی میں سر ہلا دیا۔

”پھر لیا بات ہے کیا اہم سے ناراضی ہوئی ہے۔“

”وہودہ اسلمی بھائی میرا میٹرک کارڈ لٹ آئی ہے اور۔“

اُس نے فرمایا: ”اچھا، تم سب کو مل کر اس شخص کو پکارتے ہو، لیکن اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا۔“

۱۱۔ یہاں کو خودیاری سوادوں کا۔ بے اختیار اسوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ ایک دم ہی ہمیں سمن پر بہت

پیارا ایا۔  
”ستارہ کمر، مضمون، طبع“ ۲۲

”تسلی نہ ہو، تمہارے پاس تو سات سو اٹھارہ نمبر ہیں۔“ سمجھنے والے نے جاری کر کے کہا۔

”آرے تو پھر کس لئے خوشی کے آنسو ہو۔“

”نہیں بھائی! میں مڑھنا چاہتی ہوں۔ بہت زیادہ۔ کلچرل انڈسٹری لینا چاہتی ہوں۔“

”تو...“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اباجی کہتے ہیں بس بہت پڑھ لیا۔ انہوں نے آئی کو بھی اجازت نہیں دی تھی بڑھنے کی حالانکہ آئی اپنے

اسکول میں فرسٹ آئی تھیں ان کے نمبر مجھ سے زیادہ تھے اور آئی کوڈا کٹر بننے کا بہت شوق تھا۔ ”سمن کی آنکھیں

میں اگر اس نے جانا تھا تو چلا جائے گا۔"

لیکن انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ بعد میں بھی لاہور نہیں جائیں گے۔ ہاں بی جلی بھی تھیں کیا وہ اپنا گھر چھوڑ دیں۔ انہیں تو اپنے کمرے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ انہیں اتنی کمی۔  
انہیں سمجھنے چاہئے کہ کتنا بڑا خانہ کیا تھا ان کی زندگی میں لیکن پھر بھی گھر انہیں اچھا لگتا تھا۔ انفعال ماموں نے انہیں محبت تھی۔ خضر اور ولید سے دوستی تھی۔ علیحدہ اور اربن۔

"علینہ! یہاں کسی ہوگی۔" دل کی دھڑکنیں بے ترتیب رہیں۔ وہ سال سے وہ کراچی نہیں گئے تھے۔  
"اور یہاں کسی وہ سب مجھے یاد بھی کرتے ہوں گے۔" ان کا انتظار تھا جتنا تھا سب سے لڑکے لیکن، ہوں گے خود کو روکا ہوا تھا۔ وہ سال پہلے بیکہ اور کراچی تھے تو اپنی کاویہ آنا تنگ کر دیا تھا۔ وہ ایک ہفتے کا تیار کرتے تھے۔ وہ دن بعد ہی واپس آئے تھے۔ خضر بھی کوئی کسی کام سے کیا ہوا تھا اور انفعال ماموں بھی۔ ورنہ شاید وہ رک ہی جاتے اور علینہ بھی قتل ہی بدل ہی گئی ہوتی۔ خفاوش اور تنبیہ۔ کتنی کہانی تھی اس کے ان کے ساتھ ہاں ولید اور اربن تھے۔ جو انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے اور جنہوں نے بہت اصرار بھی کیا تھا کہ وہ اپنے عرصے بعد آئے ہیں تو فہم نہ رہیں۔  
کیا علینہ خوش نہیں ہوئی۔

کیا اسے بھی مملائی کی طرح میرا آنا اچھا نہیں لگا وہ دن وہی سوچ رہے لیکن علینہ سے بوجھ نہ آیا۔  
غذا یا تیکم سے خاص طور پر اسے آئی کی بھی کہ وہ طیبہ بیکہ کی طرف ضرور جائیں وہ خود بھی جانا چاہتے تھے۔ باہ نور نرمل طیبہ بیکہ وہ سب ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ نصیر احمد خان کو بھی ان سے بہت لگاؤ تھا۔ طیبہ بیکہ کہ تو وہ جیتے تھے۔ لیکن نصیر احمد خان بوٹا انہیں بہت محبت سے ملتے تھے۔ آئے براہِ اصرار کرتے تھے لیکن ایک دم ہی بدل آتا اور اس ہو گیا تھا کہ وہ ان سے بھی ملے بغیر آگئے حالانکہ ولید نے انہیں بتایا تھا کہ انکی نصیر احمد کی تک ٹھیک نہیں ہوتے۔

"اس سنی بھائی آپ کیا سوچتے گئے کیا ابی آپ کی بات بھی نہیں مانیں گے۔"  
"میں بالکل باتیں۔" وہ چونک پڑا۔  
"لیکن مجھے یہ فکر ہو رہی ہے کہ میں اجازت دوں گا۔"  
"جی آپ کو چین ہے ابی ابی آپ کی بات مانیں گے۔"  
"ہاں مجھے یقین ہے۔" انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں ایک دم چمکنے لگیں۔  
"اس نے ابی ابی تک کہے ہیں بھائی آپ جیتے جا رہے ہیں اور آپ تو اسلام آباد گئے ہوئے تھے ابی ابی آئے ہیں۔ آپ کے لیے چاہئے لاؤں؟"

چاہئے کی تو واقعی انہیں بہت سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔  
"ہاں بیکہ اس کے لیے کہ میں ہوں ابی ابی چاہئے مجھ کو ڈو۔" وہ جانتے جا رہے۔  
"میں جن کی طرف بڑھ گئی ریشہ بد رفتار۔" وہ دھڑکتے ہوئے رمضان سے باتیں کر رہی تھی۔  
"رمضان اسنی بھائی کے لیے دو کپ چاہئے بناؤ۔"  
"اسنی بھائی دو کپ چاہئے نہیں گئے۔"

"ایک میں ہیں۔"  
"تو ابی ابی تاکہ آپ کے لیے ایک اسنی بھائی کے لیے۔"  
"رمضان اسنی بھائی سے میں نے کہ میری بات مت چلا کر ڈو۔" خفاوت چاہئے بنا کر اسنی بھائی کے کمرے میں لے آؤ اور ساتھ ہی کتاب بھی گرم کر لیتا۔  
"اسنی بھائی کے لیے آپ کے لیے۔" "میر۔"

میں نے بہت غصے سے اسے دیکھا وہ رات نکالنا ہوا چاہئے بنائے لگا۔ میں کو بھوک لگ رہی تھی اس نے دن کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ لیکن اب اسنی بھائی سے بات کر کے کچلی چمکی ہو گئی تھی اور وہ بھی ٹھیک ہو گیا تو بھوک چمکا اٹھی۔

اسے یقین نہ ہوا گیا تھا کہ وہ میاں صلاح الدین سے اپنی بات منوالیں گے سوا سفر کے کمرے میں چائے بھجوا کر دیا جانا چاہئے گا کہ اور کہاں کی کیٹ تھا اگر انہیں کمرے میں نہ آئی۔  
"اسنی بھائی کہہ رہے ہیں کہ وہ ابی سے میری بڑھائی کے مسئلے میں بات کریں گے۔"  
"اسنی بھائی آگئے۔" انہیں تو اپنے پڑے دار و روبہ میں ترتیب سے رکھ رہی تھی مگر اسے دیکھا۔  
میں نے چائے کا کپ میرا رکھا اور ولید ہاتھ میں لے کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی اور کباب کھاتے ہوئے بڑے مطمئن انداز میں انکی طرف دیکھا۔  
"ہے گئے ہیں ابی ابی انہوں نے مجھ سے وعدہ بھی کر لیا ہے کہ وہ ابی سے بات کر لیں گے اور مجھے یقین ہے وہ ابی ابی کو قائل بھی کر لیں گے۔"

"انہم دار و روبہ میں ہی کھانا چھوڑ کر اس کے پاس آگئی۔" پھر میں ان سے کوئی بات ابی سے منوالی کی بات بھی کر رہی۔

"کیوں کیا ہو امولی کو۔" میں سوال نظر اس کی طرف اٹھیں۔  
"ابی جان سچ سے بہت پریشان ہیں۔" انہم کی آواز گھرائی۔  
"تھک گئیں آئی آخر میں کیا مسئلہ کیا ہے؟" میں نے غالی غالی سنبھل پر رکھی اور چائے کا کپ اٹھالیا۔  
"ابی ابی میں کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔"  
"میں ابی کی شادی۔" میں کا نہ حیرت سے کھلا اور پھر ہوا۔  
"لیکن کس اور کس سے؟"

"کب اور کس سے؟" میں نے کہا کہ وہ فوراً اس کے لیے لڑکی دیکھیں وہ وہ تین ماہ تک اس کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔

"لیکن آئی بڑے تو اسنی بھائی ہیں ابی ابی کی پہلے ان کی شادی کرنا چاہئے۔"  
"لیکن وہ تو باہر جاتے ہیں پھر میں اور ابی ابی کا خیال ہے کہ وہ ابی سے ہی کسی کم کو کیا ابی کے اور جو تو یہ کہ میں انہیں اسنی بھائی کے معاملات میں زیادہ نہیں مگر میں ہے۔" انہم اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔  
"چاہئے میں سنی سے انکو سوچی ہوں کہ اگر اسنی بھائی نا تو کس پاس رہے ہیں وہاں پہلے بڑے ہیں تو اس میں ان کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ ابی ابی سے خودی تو انہیں نا تو کوئے سے تھا۔ یہ ہیں وہ ابی ابی کے بیٹے یا۔" پھر وہ شرکی طرح ان کا ہنسنا اس گھر جن سے انہیں بھی وہاں سے حقوق حاصل ہیں خود پھر شر اور بیٹھ گئیں۔  
"لیکن ابی ابی ان کے ساتھ بالکل انہیں اور انہوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔" بانو کے کھانا کو ہمارے گھر کے ماحول سے بہت مختلف ہے تو ظاہر ہے کہ میں ماحول میں لے ہیں ان کی سوچ اور خیال ابی ماحول کے مطابق ہیں۔  
ان کے اندر اس کے وہ اسرا کر ابی ابی سے بات کر سکتے ہیں۔ ان کی غلط بات پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ اس ای بوجھ سے ابی ابی نہیں پسند نہیں کرتے۔

انہوں نے جب ابی ابی سے کہا تھا کہ وہ اپنی انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کریں گے کیا انہیں اس سے پہلے ہی سے تب ابی ابی نے شاید انہیں مل سے نکال دیا تھا کہ انہوں نے ان کی بات پر اعتراض کیا۔ ان کا حکم کیوں نہیں مانا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تب ابی ابی ایسے کیوں ہیں ان کے اصولوں میں چمک کیوں نہیں ہے۔ اسنی بھائی کہتے جیتے ہیں۔ ان کا وہ جوتے نا دور رخت کی طرح لگتا ہے مجھے ان کے ہونے سے خوفناک اسنا ہوتا ہے۔ یہ یوں







مرتبہ سارے دن ہی گزر گئے۔ ایک روز وہ کیا تو بہت خوش تھا۔  
 ”جھوٹی کیا میں نے حمنہ سے شادی کر لی ہے کل ایک دوست کے ہاں میرا اس سے نکاح ہو گیا ہے۔“ میں  
 حیران رہا اسے سمجھتی رہی۔  
 ”قادی! تم نے کیا کام اتنا انتظار کر سکتے تھے شاید یہ شادی دیرانی میں مل جاتے۔“  
 ”میں جانتا ہوں جھوٹی کیا وہ بھی کبھی نہ مانے اور میں نے حمنہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں بیٹھ اس کے ساتھ ہو۔  
 میں شاید کچھ اور انتظار کر لیتا۔ کم از کم اپنے باؤس جاب مکمل کرنے تک لیکن حمنہ کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔  
 اس کے والد اور جھوٹے بھائی کا اچھا جگہ حادثے میں انتقال ہو گیا اور والدہ کا ذہن اس حادثے سے بہت متاثر ہوا  
 اور ایسی ذہنی کیفیت میں اس کا اصرار تھا کہ وہ حمنہ کی جلد از جلد شادی کرنا چاہتی ہیں۔ ایک دوست سے جانتے  
 والوں میں اور والدہ کا اصرار تھا کہ وہ کسی ایک دوست کے بے ہوشی میں حمنہ سے بھرچنے حمنہ کے بڑے بھائی  
 سے ملنا چاہے۔ وہ بڑے بھائی کے دل کے اور براؤنڈ ہو چکے تھے۔ اس صورت حال سے جاننے کے بعد انہوں نے والدہ سے بات  
 کر لی۔ میں نے سوچا تھا کیا یہ کہ لالہ لالہ سے بات کروں اور۔۔۔ میرے ساتھ چلیں حمنہ کے گھر لیکن بڑے لالہ لالہ  
 کے بھتیجے براؤنڈ انڈین تھے۔ وہ بڑے شادی داری اور جھوٹے شادی کی ناراض نہیں کر سکتے۔ سو ایک دوست کی  
 فیملی کے ساتھ دیا اور یوں میں حمنہ کو یہاں لایا ہوں۔“  
 ”حمنہ! اور میں کی اور قادی بھی کیا نہا ہو۔ میں رہتا تھا اور مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیسے اپنی  
 اور بڑے شادی کو قادی کی شادی کے متعلق جانوں۔ وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ قادی ایک بچے کا بچہ بھی بن گیا۔  
 باؤس جاب کے بعد اس نے ہوائی کی لالہ اور میں میں جاب کر لی اور بڑے شادی کی اچھا کھانا کھاتے تھے۔ اس کی شادی  
 جو رک کی تھی ان کی بری کے بعد پھر اس کی تیار ہوا۔ لیکن اب قادی کو پتا چلا کہ وہ حمنہ سے شادی کر چکا ہے  
 اور وہی نے اس سے ہر شے پر غلطی کر لیا۔“  
 ”وادی! بلیز میری بات تو سنیں۔“ اس نے منت کی لیکن وادی نے اس کی کوئی بات نہیں سنی۔ تب اس نے شام  
 کی سیاما کہا۔  
 ”بھائی! آپ یہی سفارش کریں۔“  
 لیکن شادی تو خود بہت غصے میں تھے جب سے لی بی جان کو قادی کی شادی کا پتا چلا تھا۔ انہوں نے دو دو کر پنا  
 حال برا کر لیا تھا۔  
 ”تم اسے طلاق دے دو تو میں وادی سے ہماری سفارش کر سکتا ہوں۔“ شادی نے بلا کر کہا۔  
 لیکن قادی نے انکار کر دیا۔  
 ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھائی صاحب وہ میرے بیٹے کی ماں ہے۔“  
 ”بیٹے کو لے آؤ۔ لی جائے گا یہاں اور اسے طلاق دے کر حفصہ سے شادی کر لو۔ ہم تمہاری غلطی بھول  
 جائیں گے۔“  
 ”میل جائے گا لیکن کیسے کیا مقام ہو گا اس کام میں۔ میں۔۔۔ اس نے شادی کی طرف کھنکھلا  
 ”وادی! تب تو شادی کا کچھ نہیں سمجھے اس کو خلی میں ایک اور شادی کا اضافہ نہیں کرنا۔“ اور یوں قادی اس  
 حویلی سے چلا گیا اور پھر چلی گئی۔ انہیں قریب کی قادی سے کہنے کو چاہیے۔ کو شادی کے جانے کے اس  
 کے پاس ایک بار صرف ایک بار مجھے قادی سے ملو اور اس کے شادی کے پتا چلا پھر پھر گیا ہے لیکن میں نہیں بول سکتا  
 کال سے میرے اندر شادی۔“  
 ”نہت فاطمہ کے آئے۔ اسے انتظار ہو کر ان کے رخساروں پر برہنہ نظر  
 ”بلیز پچھو دو میں مست وعدہ مدت جلد آپ کو چاہو گے۔ طلاق دے دینا چاہیے۔“  
 ”اور وضعی! شادی کیسے کیا یہاں سے میرے پورے حقانے ہیں۔“ انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو  
 صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”ضعی! شادی۔“ شادی پریشان سے ہو گئے۔  
 ”وہ کیا میں نہیں سوچتا ہوں یہ ہر ملا تھا شاید پورے قصبے میں قیام ہے اس کا۔“  
 ”میر پریشان کیوں ہو گئے۔“ نہت فاطمہ نے بغور انہیں دیکھا۔  
 ”وہ اصل شادی نے کمالے اور فضل داد کو بھیجا تھا وضعی کی طرف۔“  
 ”کیوں کیوں۔“  
 نہت فاطمہ نے اچھڑ کر انہوں کی طرف دیکھا۔ تب شاہ رخ نے ساری بات بتادی اور وہ بے حد  
 متعجب رہی ہو کر کچھ دم کھڑی ہو گئیں۔  
 ”تم۔۔۔ تو کیا شادی نے ملوایا اسے میں نہیں۔“ ان کی آواز زخمی اور آنکھیں ایک بار پھر میرے لگیں۔  
 ”آپ پریشان مت ہوں پچھو۔“ شاہ رخ نے کھڑے ہو کر اور انہیں کھنکھناتے ہوئے پوچھا۔  
 ”شادی کی طرف سے انہوں نے صرف معمولی ڈانٹ پیش کرتے کیا کہا۔“  
 ”اور شادی کی معمولی ڈانٹ نہت۔“ نہت فاطمہ ہر باتوں ہی ہر باتوں میں شادی سے اور اس کے آنسو اور بھی  
 روانی سے بچنے کے اندر ہی اندر بھی کئی زخموں کے ٹانگے اور کچھ تھے۔ ان کا کلیہ جینج ہمارا کر دئے کو چاہا اور  
 انہوں نے تجزی سے بننے آنکھوں کو انہوں کی پشت سے پوچھنے کو پیش کرتے ہوئے اٹھائی۔  
 ”شاہ رخ! میں سے شادی کا کیا کمال اور فضل داد کو انہوں نے کیا۔“ ان کی آواز کھینچ۔  
 ”ان سے پوچھو جا کر کیا کیا انہوں نے میرے وضعی کے ساتھ۔“  
 ”اگے آؤ گے پچھو جان میں نہ کرنا ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ شادی  
 نے کمالے اور فضل داد کو صرف اور تنگ دینے کے لیے بھیجا ہے۔ تاکہ آئندہ وہی حویلی والوں کی گاڑی نہ روکی  
 جائے۔“ انہوں نے ہاتھوں سے سر لایا۔ بھلا وہ شادی کو نہیں جانتی تھیں۔  
 شاہ رخ انہیں کھلی دے کر کہا پھر ملے اور وہ بھی ہم جہاں ہی ہو کر بہتر ڈھکے گئیں۔ ان کے لب مسلسل  
 دھاکیں لگ رہے تھے۔ کھانچ کے لیے تھے انہوں نے ایک بار بہت جھوٹی عرش دیکھا تھا اور اندر بھی جیسے قتل  
 ہوا جا رہا تھا۔  
 کمال اور فضل داد شادی اور عباد مرزا۔ عباد مرزا کا نام ایک سسکی کی صورت ان کے لبوں سے نکلا اور انہوں  
 نے نکلا ہوئے راتوں سے تیار کیا۔ اسے جتنی سے کہ ہو توں سے خانہ سے نکلا وہ عباد مرزا نہ جانے کون تھا اور  
 سید اظہار شاہ سے ملے لیکن حویلی کیا تھا۔ شاید سید اظہار شاہ کا کوئی دوست یا جانے والا۔ سید اظہار شاہ زمینوں  
 کے ایک مقدمہ کے سلسلے میں داخل ہوئے تھے اور وہ ان سے ملے کیا تھا اور انہیں پوچھنا کہ وہاں کیسے  
 ہوئے تو کبھی حویلی کے گیٹ میں داخل ہوئی نہت فاطمہ کی طرف اٹھ گیا اس کی نظر کبھی بھی اور پھر اس کی وہ  
 گئی تھی اور نہت فاطمہ کو گیٹ میں داخل ہوتے ہی چرے سے نقاب اٹھا چکی تھیں۔ ان کی فٹنس بھی ایک لمحہ  
 کو اس نے اپنے پتلے سناٹے رنگ کے اوپے جے عباد مرزا کی نظروں سے ملی تھیں اور پھر یکدم بیٹھے جنگ کی تھیں  
 انہوں نے تجزی سے نقاب بیٹھے سر کیا تھا۔  
 وہ ایک غیر ارادی نظر شاہید نکلتا تھا۔ یہاں تھی اور وہ کتنی تھیں لیکن گیٹ سے باہر نکلے نکلے نہ جانے کس جذبے  
 کے تحت عباد مرزا نے مرکز پیچھے دوڑا تھا اور بے ہوشی میں پچھو۔ وہ بلیز اندر لڑائی کی طرف جاتی نہت فاطمہ  
 کو دیکھا ہوا تھا اور مروانے کی طرف جاتے رہتے پھر کچھ سید مقدمہ علی شاہ کا خون رگوں میں کھول اٹھا تھا اور انہوں  
 نے دل کی بل میں چنچ و کھنکھاتے ہوئے سوچا تھا کہ اس ایک غیر ارادی نظر کے بعد وہ دیا مرزا رتی رتی جنگ  
 بیٹھے رہا پھر کتنی جانی نہیں ہے بھلے ہی شخص لالہ لالہ کی گادوت میں کیوں نہ ہو اور بیٹھے نہت فاطمہ کا رخ اس  
 کی طرف نہ ہو۔  
 نہت فاطمہ نے انہیں سرخ چہرے کے ساتھ دیکھا تھا لیکن انہیں گمان تک نہیں ہوا تھا کہ ان کی

آہٹیں اُتتی خون رنگ کیوں ہو رہی تھیں لیکن شام کو بڑی چولی میں وہ ایسے آنے کے بعد بدبو بڑے شادی کو دوا دینے کی باتیں تو سید علی شاہ بڑے شادی کو بتا رہے تھے۔  
 ”میں نے کمالے اور فضل راہو اس کی کست کی میرا بیٹا جیسا تھا۔ امید ہے کہ میں کسکے پنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکے گا۔“

”مگر سید علی شاہ اور افسار شاہ کا سامان تھا کسی کمالے اور فضل راہو نے۔“  
 ”میں شادی میں نے بس معمولی ڈانٹ فریٹ کے لیے کہا تھا۔ آخر اسے جرات کیسے ہوئی کہ وہ مرکز دیکھے۔“  
 اور زینت خاطر کے ساتھ بے دوا کی بولی بچے کر گئی۔

وہ ایک بڑے شوق نواز جوان کی طرف اس کی اور اندر جا کر بڑی بھائی کسکے پنے کر بھی اس ایک نظری حدت نے کئی ہی دور تک ان کے وجود میں الجھ جائے رکھی تھی۔ اور جب کہ کئی ہوئی بول کی کرچیں پھٹتے ہوئے انہوں نے سنا۔

”بھری بھی مقیم علی شاہ تمہیں نظر انداز کر دیتا چاہے تھا۔ کمالا اور فضل راہو بدبخت تھے ہیں تو انہیں کچھ دکھنا نہیں۔ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ بے۔“  
 ”کچھ نہیں ہو گا شادی۔“ مقیم علی شاہ کے اندر اشارے پر بولی تھی۔

”تم مزاجی“ اور عابدی سارے کے سارے تھے ہو گئے ہو۔ میں بھی تمہاری عمر میں ایسا ہی تھا بدبختی۔ بہت جلد غصے میں آتا تھا کہ تمہارا باپ بھلے محلے مزاج ہے سوچ کچھ کر فیلے کرے۔“  
 ”ہاں ہاں بہت دیر سے مجھے مزاج کے ہیں اور لالہ بھی اس میں ہو گئے ہیں اور قادی تو کھل ہی گئے۔“ مقیم علی شاہ کھل کر کہتے تھے۔

”شادی میں ہی کسی چیز دلائی کی شیشی ٹوٹ جائے تو عرض کا مرض جاننا رہتا ہے۔“  
 زینت خاطر نے سید ہاوتے ہوئے کہا تھا۔ یوں جیسے وہ مقیم شادی کی بات کو کچھ بھی نہ پائی تھیں۔  
 ”لیکن عمار عرض کیا تو لالہ انہیں زینت خاطر۔“

شاہ کی اس کی طرف توجہ ہو گئے تھے اور وہ بڑے شادی کے لیے مزید دلائی لینے پر نکل آئی تھیں اور وہ رات ان کے لیے بڑی سے چن اور دلائی تھی۔ پوری رات کو سید ہاوتے کے لئے زینت خاطر جان میں لیا رہی تھیں کہ اس رات میں آتی ہے چینی اور افسار غریب ہیں اور میں نے یہاں سے ملنا دیا۔ کیا کیوں لا تری ہے۔

بڑے شادی نے کچھ کہا تھا کہ سید مقیم علی شاہ مزاجی“ ان ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے سب انہیں چھوٹے شادی کا مکر تھے اور گھریں کمالا“ بھی کا دل دھل گیا تھا۔ حالانکہ لالہ افسار شاہ بڑے تھے اور پھر بھی ان کو ان کے والد داجی بھی تھے۔ افسار شاہ کو بڑھائی سے بچی تھے۔ وہ بڑے مختلف مزاج کے تھے۔ سب انہیں لالہ ہی کہتے تھے اور اور تو خوش سے ہی خاموش طبع تھے اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کوئی اور نہ بھائی نہیں تھا سوائے ایک

سوئے بھائی کے اور لالہ جان نے انہیں بہت لانا دیا ہے لالہ افسار شاہ نے سب ہمہ آگیا تھا۔  
 ایک بار زینت خاطر نے سوچا کہ وہ کراچی کو تھیں کہ سید مقیم علی شاہ نے افسار لالہ کے سامان کو پڑانے کے لیے بندے بھیجے ہیں لیکن پھر سوچا کہ کراچی کو لائے پوچھ لیا کہ تمہیں افسار شاہ کے سامان سے کیا دیکھی ہے تو وہ کیا کہیں۔ سو وہ بڑی بڑی رہیں۔ سچ فخری مزاج نہ کہ وہ ہماری کسکاس الان میں آئیں گھیں اور وہیں بیٹھے ہوئے انہوں نے گلاب بی بی کوں کی سے کہتے سنا تھا۔

”بڑا گھو جوان تھا۔ جانے کون تھا اور کون تھا میں نے۔“ ان کی بڑی بڑی آنکھیں پھٹ سی گئیں اور وہ ساکت بیٹھی گلاب بی بی کوں کی تھیں۔ مانی سے گلاب بی بی کالایا ہوا پانی دم کرتے ہوئے سوائے نظروں سے اُتر دیکھا۔

”وہی ادھر سید پور سے باہر جانے والی سڑک کے کنارے یہ رات پاسپاس میں سرنگوں کے قریب اس کا اسکوڑا

کوڑا تھا۔ شہر سے آ رہا تھا شاید جا رہا تھا۔ لگتا ہے کسی نے لوٹا اور مار کر پیسہ نکال دیا۔ ادھر چھپے کی چٹائیوں میں ڈاکو بھی تو بچھ جاتے ہیں۔“

”پتا نہیں کون تھا بے چارہ۔“ مانی نے ہنسنی سانس لی۔  
 اور تب ہی سید افسار گھنٹن شاہ تیر تیر قدموں سے چلتے ہوئے اندر آئے۔  
 ”اچھی خبر۔ لالہ کی ایک دم گھڑی ہو گئیں۔“  
 ”سے سوئے تیر تو بے چارہ۔“

”وہاں ہی کل شام میں سر ایک ایک دوست آ رہا تھا مجھے سے چولی پہاڑی جاتے ہوئے کسی نے اس کا دیا۔ اس کی لاش سڑک کے کنارے پڑی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے داجی نے بندہ بھیجا تھا میری طرف کہ جس کو جوان کی لاش سید پور سے باہر سڑک کے کنارے پڑی ہے اسے کل شام خاقانی ٹالی نے لٹی چولی کی طرف جاتے دیکھا تھا میں کوئی میرا سامان تو نہ تھا اور وہاں ہی جب میں گیا خالق کے ساتھ تھو۔ تو میرا ہی دوست تھا۔ مجھ سے ہی لئے آیا تھا۔

بڑے اور کچھ خاندان کا تھا۔ چھ بھائیوں کا کلو اور وارث تھا۔ اس کے کچھ بچا چچا میں سے کسی کی اولاد نہیں۔ مانی ہی وہاں تو کراہ چکے تھے۔ گافتمت آجائے۔“

اور زینت خاطر نے کوں لالہ تھا جسے ان کی انکھوں میں سے جان نکلی تھی۔ سید افسار علی شادی کا آواز بھری ہوئی تھی اور انکھیں سڑک پر کی کو کشش میں سر ہو رہی تھیں۔

”مانی میں تمہارے والدین کو کیا بوجھ دوں گا وہ مجھ سے لئے آیا تھا۔ کیسے خبر دوں گا۔ کو۔“ سید افسار علی شاہ وہیں تخت پر بڑھال سے بیٹھے تھے۔

”عمار مزاج“ بولی کا وہ نام زینت خاطر کے ہونٹوں پر سرگوشی کی طرح ابھر اور وہ ایک نظروں مشتاق بھری پر شوق نظر سے دل میں تازہ ہوئی تھی اور وہ بھرے بھرے ہونٹوں پر بے اختیار ابھرنے والی ولکش سر اُٹھ۔  
 ”عمار مزاج اس جرم کی یاد میں مارا گیا۔ وہ ایک عمار کی نظر“ انہوں نے ایک بھری بھری سی بولی تھی۔

جب چولی کے چمن میں اس کی سیت لا کر کھینچی گئی اور گلاب بی بی نے بتایا اس کے کپاؤں کو تو چائی سے نیچے لٹک رہے ہیں۔ ایک کچھ بوقت کو جوان تھا اور ان کا کتا بھی آ رہا تھا کچھ کچھ کراہیں اور گھنٹیں۔ کئی شدت سے دل سے خوش کی گئی تھی۔ انکھیں ایک بار پھر ان کی طرف اشارے میں وہی اشتیاق ہو گئیں وہ یوں بھی رہی تھیں چپ چاپ ساکت اور اندر سے سو ملا دہا بارش ہو رہی تھی۔ سلاب آیا ہوا تھا۔

”کیا ہے مجھے زینت خاطر۔ یہ تو اچھا ہے۔“ مانی نے انہیں یوں چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر پوچھا تھا۔  
 ”پتا نہیں سرمت بھاری ہو رہا ہے اور دل پر بہت بوجھ سا ہے۔“ انہوں نے بے بسی سے مانی کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا تین کی دل پر کس راز کا بوجھ آ رہا ہے۔ کون سا بیچتا تو دل کو پیسے جاتا ہے۔ کاش وہ اونچی چولی نہ جاتیں اور اگر وہی تھیں تو وہ عمار مزاج اس سید افسار علی شاہ سے ملنے نہ آیا ہوتا۔“

”سچ فخری تو ان کی ہی ہے۔ شاہو سے کہ کر سر میں تیل ڈالو لے اور پھر نہالے۔“ اور وہ انہاں میں سر ہلاتی خاموشی سے اٹھ کر گئے مانی کی آئی تھیں اور جب شہر سے اتر گئیں آئی اور سید افسار علی شاہ سے ملنے دوست کی سیت کو پھولوں میں لاد کر لے چلے تھے تو انہوں نے بے اختیار کھڑی ہو جگ کر گھٹ سے لکٹی ایسپر دوسرے کو دیکھا تھا اور وہ انہوں نے سچ سے اندر اور دھڑکے گا تھا تو انکھوں سے اٹل پڑے تھے اور اس رات بڑے شادی کی کسک میں بیٹھ کر سید مقیم علی شاہ نے عام سے کچھ میں کہا تھا۔

”میں نے تو بس معمولی سیس کھانے کے لیے کہا تھا مجھے کیا تو بھی کہ وہ دھڑکی مارنے سمجھ گئے۔“ اور مانی کی کمرے کے کی طرف جاتی زینت خاطر ایک کچھ کو ٹھٹھ کر گئی تھیں۔  
 ”کیا ایک انسان کی زندگی کی قیمت چند لفظ ہو سکتے ہیں۔ چند عزامت کے لفظ اسے واپس لا سکتے ہیں۔“ وہ جو چھ

گھروں کا ٹھکانہ چارواغ تھا اور پھر کتنی ہی راجن زینت فاطمہ نے جاگ کر کڑا رہی تھیں۔ یوں سے سرگوشی کی طرح عباد مرزا کا نام لگھٹا اور انھیں برستے لگتیں۔ اور وہ ایک نظر اپنی طرف اٹھی ہوئی اشتیاق بھری ایک نظر ان کے وجود کو چھوئے نہ لگتی تھی۔

کتنے سالوں سے وہ فاطمہ علی شاہ کے سامنے نہیں آئی تھی انہیں کہتے ہی ان کے اندر سمندر ابل پڑتے تھے اور اگر وہ غصے زندہ رہتا تو اب تک اسے بھول بھی چکی ہوتی لیکن وہ مارا گیا تھا ایک ایسے جرم کی یادداشت میں جو جرم تھا ہی نہیں۔ سو آج بھی اسے نہیں بھول سکی تھیں جو تیس سالوں بعد بھی نہیں آج بھی رات کو سونے کے لیے لگتیں تو عباد مرزا کا نام سرگوشی کی طرح ان کے یوں پر آتا اور وہ ایک نظر وہ ایک اشتیاق بھری نظر اندر داخل چلا جاتی۔

ایک جب برس شادی نہیں رہے تھے۔ اب بھی نہیں تھے اور سید اظہار علی شاہ بھی چند سال پہلے رخصت ہو چکے تھے اور وہ علی بنی مرف سید علی شاہ تھے جو شاہی اہل کلا تھے اور جنہوں نے چوبیس برس پہلے کالے اور فضل کو اس کے معمولی ڈانٹ ڈنٹ کے لیے بھیجا تھا کہ فضل کو دلا کر اس کے لیے جیسے جو ان میں رہے تھے۔ مگر پھر یہ وہ برس بنے کہ اسے اور طاقتور تھے۔ وہ ایک انجمنی تھا۔

جیسے نظروں نے بس لکھ دیکھا تھا اور اب ان کا ناخون تھا۔ ان کے اسے نلا ڈالے پارے بھائی کا جگر گوشہ۔  
”نہیں۔“ وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھیں۔ چہرے کو وہ دونوں ہاتھوں سے پوچھا اور سر پر ہونڈہ درست کرتے جا کر نکل گئیں۔



”کس کا فون تھا۔“

خضر ہا ہر رات کے میں دیو کی تخت پر بیٹھا تھا۔

”اگر صاحب کا۔“ ماہور نے اس کی طرف دیکھا۔

”اور کیا یہ ہر کیوں تھے۔ کیا کھانا کھایا۔“

”اں کھانا کھایا نہیں تمہارا انتظار رہا تھا۔ اور یہ اگر صاحب کو ان ہیں؟ کیوں فون کیا تھا؟“ خضر نے پوچھا۔

”اس اسکول کے چرچل ہیں جہاں میں نے جا چکی ہے۔“

”راہ اصل انہوں نے فون کر کے معذرت کی ہے کہ انھیں اس ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہم آپ کی خدمات سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ لہذا اگلے اسکول مت آئیے گا۔“ نرمل کر کے بڑن اٹھا لے کر نکل گئی اور اس بار وہ گھر کے پیچھے کھڑی شرر نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”وہ۔“ ماہور نے مڑ کر اسے گھورا۔

”یہ بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے۔ تم پریشان لگ رہی ہو کچھ۔“

اس کے خضر کا انداز سرسری نہ تھا بلکہ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کوئی ایسی خاص بات نہیں خضر بھائی۔“ جمع پر چل صاحب نے مجھے ساری کھا سڑی نیچر سے کوں نہج پہر جمع کر کے دراز میں رہنے کے لیے دے تھے۔ میں نے ان کی نیچر دراز میں رکھ دیے تھے لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ دراز میں کوں نہج پہر ڈالنا فائل نہیں ہے جبکہ وہ ہندو مس سے پہرے پر پٹ کرے تھے وہ اس وقت اس میں موجود ہے اور پہرے آج نہج پہرے کے زمانہ از بعد ضروری نہیں ہے جبکہ وہ چاروں بعد سیکڑ نرم کے پہرے پہرے میں ہو رہے ہیں۔ بچوں کو پٹ شیت میں جا چکی ہے۔“ ماہور نے تفصیل بتائی۔

”دہش نے ان کی تھلی کی دراز میں ہی رکھے تھے معلوم نہیں کیوں سرگوشی میں رہے۔“

”چلو نرمل جاسے تم پریشان مت ہو اور بتا دو کیا پروگرام ہے تم نے میرے ساتھ کھیلنے کو کہا تھا۔“ خضر

نے دیو کی کا پاندن کھول کر چھائیے تلاش کی۔

جانتا تھا بہت دن ہو گئے تھے علیحدہ اور ایرج سے ملے یعنی فون پر بہت ناراض ہو رہی تھی۔ وہ ایک لمحہ کو جھپکی۔

”وہ اگر صاحب کہہ رہے تھے کہ پہرے آج ہی چھپنے کے لیے نہ ضروری نہیں۔ لہذا میں ابھی جا کر انہیں پہرے لانا فائل تلاش کر کے وہ میرا انتظار کر رہے ہیں اس میں۔ کل چھٹی ہے۔“

خضر چونکا۔ ”نہوں نے تمہیں اس وقت اسکول پایا ہے۔“

”ہوں۔“ ماہور نے سر ہلایا۔

”اور اصل یہ بھی خیر تھا کہ مجھے پہرے نہج روٹھ کر کے ان پر عذاب ڈالنے کا طریقہ ہے۔“ یہ حضرت کس طرح کے انسان ہیں۔“

”جو چاہنے کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ اور نیچر کے ساتھ بھی ان کا رویہ کافی سخت ہے۔ لیکن حنا کی باجی کہہ رہی تھیں کہ دیکھتے ہی میں نہیں جانتا۔“ اچھے اچھے ان ہیں۔ خضر کے سلسلے میں عام پر ہیوٹ اسکول کی طرح تنگ نہیں کرتے پہرے کی اچھی کارکردگی کو سراہتے ہیں۔ مگر یہ بھی بڑا حدیث ہے۔

”ہوں۔“ خضر نے سر ہلایا۔ ”مگر وہ سوچا ہے۔“

”تو تیار ہو جاؤ تمہارے میں تمہارے ڈاکر صاحب سے بھی بیٹھیں گے۔“

”اے۔“ خضر نے تھک کر کہا۔ ”ماہور کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔“

”چلو اب تمہیں مت لگاؤ اور تیار ہو جاؤ۔“

”مگر ابھی امان سے تو پوچھا ہی نہیں وہاں سے ہی پھر آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“

”وہ کچھ لو بھی کیا پتہ دو میں کی نہیں ہمارے کچھ جانتے۔“

”میں تو امان نے بھی نہیں روکا۔“

”یعنی تم خود ہی اپنی سیدھی باتیں سوچ رہی ہو۔ زیادہ اچھا چاہتیں۔“ آئی کیا سوچیں گی۔ علیحدہ اور ایرج۔“

اس نے آواز دیکر ایک کھل آئی تو وہ دیو بن گئے۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے مل اٹھے تھے اور رخسار میں بھی مجھے بخور بن کر دیکھنے لگی۔ خضر ایک لمحہ کو کھو گیا۔ اور وہ جی ہولی اندر کرے میں نصیر احمد خان اور امان سے اجازت لینے لگی۔ اور حسب معمول امان نے دیکھ کر کہ وہ رات کھانا کھائے جاتے حالانکہ اس کا اور تھا کہ رات علیحدہ کی اس کی آپ خضر بھائی سے کہہ دیں پھر چائیں کر گئے۔

”خبر ہے امان انھوں کی آپ خضر بھائی سے کہہ دیں پھر چائیں کر گئے۔“

کردادی کو بار کر کے اور اسے مل کر وہ پر آئی تو خضر ایک تنگ سخت پر بیٹھا تھا اور نرم نرمل ہوا نیل سب اس کے گرد بیٹھے تھے اور وہ خانا اس میں لیٹے شاہناشا تھے۔ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تھوڑی دیر تو بیٹھیں خضر بھائی۔“

”نہ۔“ یہ بے روکا۔

”میرے پاس لیٹوں کی ایک بڑی اچھی کتاب ہے۔“

”پھر ان کو کیا اور تمہاری کتاب بھی لکھوں گا۔“ اس کے گل تھپتھا کہ سب کو فدا حافظ کہہ کر ہا پر نکلا۔

ماہور اس کے پیچھے کھڑی ہو کر اس کے گلے سے جھپٹے میدان میں مار کر کی تھی۔ جہاں کتنے کس کا کام ہو رہا تھا۔ اس نے گلے کو ہونڈی طرف دیکھا اس نے گاڑی کے پیچھے روزانہ پر ہاتھ رکھا۔

”میرے خیال میں ہر بار یہ جانا ضروری نہیں ہو۔ تاکہ کہ میں تمہارا راکو نہیں ہوں۔“ وہ خفیف ہو کر اور چکر کٹ کر فرزٹ بیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ زرب مسکرایا۔

”اب گاڑی مجھے ختم کر کے طرف جاتا ہے۔“ اس کی طرف دیکھ کر دھمکے سے مسکرایا۔

”جہاں میں آج خضر بھائی ایسے عجیب کیوں لگے۔“ وہ بے کچھ شخ سے۔ ”ماہور نے سوچا اور اسے اسکول کے حلقہ تباہ کی۔“

”عمارت تو شاندار ہے۔“ اس کول کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے خضر نے تبصرہ کیا۔

”یہ پرائیویٹ اسکولوں کا برنس بھی خوب ترقی پر ہے۔“ گاڑی روک کے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے

پوچھا۔

”ایسا ہیال کینڈ شفٹ بھی ہوتی ہے۔“

”میں لیکن سر کر رہے تھے کہ وہ بہت جلد کینڈ شفٹ بھی شروع کریں گے۔“ ہانور نے جاکر چوکیداری

طرف دیکھا۔

”سریا جان چلے گئے ہیں۔“

”جی آپ اس میں ہیں۔ آپ انتظار کر رہے ہیں۔“ چوکیدار نے کہا۔

”جی جی نہیں کے پیچھے ڈاکر صاحب تقریباً“ چھپے ہوئے تھے۔

”سے آئی کمان سر۔“

”میں سسٹمز مس خان میں آپ کا تبیہ خضر تھا۔“ ان کی آواز میں چکار تھی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک سا

نور ہے ہوتی ہوئی ان کی نظر خضر پر پڑی اور یہی بجائے کے انداز میں انہوں نے ہونٹ سکڑے اور اٹھتے اٹھتے

بیٹھ گئے۔

”سریہ سر کن میں خضر افضل حیدر۔ اتفاق سے گھر پر تھے تو ان کے ساتھ چلی آئی دروازہ انتہا بہت

مشکل تھا میرے لیے۔“

”اوس ہاں آپ کو زہمت ہوئی مس خان لیکن یہ بہت ضروری تھا۔“ خضر افضل حیدر صاحب۔

”نیل کے پیچھے سے بیٹھ بیٹھے انہوں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ پڑھا دیا۔“

”اور مس خان پلیز آپ ہمیں کہاں رکھی گئی کونسی چیز زوالی فائل۔“ پیچھے آہان صاحب ابھی گئے

ہیں۔ میں نے انہیں کھینچے پھر آئے تو کہا۔“

”میراں تو میں سے سر۔“ ہانور اور ڈاکو نے کھڑی تھی جس میں دو چار فائلیں پڑی تھیں۔ ”سر میں تو اسی

دراڑ میں رکھی تھی۔“ ان فائلوں کے اوپر فائل رکھی تھی۔

ہانور دیکھ کر ہنسی ہوئی۔

”ہانور وہاں الماری میں دیکھ لو۔“ خضر نے زری سے کہا اور کمرے کے دائیں کونے میں پڑی الماری کی طرف

اشارہ کیا۔ اس ہانور نے سوالیہ نظروں سے ڈاکر صاحب کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہاں دیکھ لیکن شاید آپ نے اوپر دھر رکھے ہوں۔“ ہانور نے ہینڈل گھمایا۔ سامنے ہی اوپر والے خالے

میں وہ گرین فائل پڑی تھی جس میں گلاس کے کونسی چیز چڑھے

”سر میری فائل۔“ ہانور نے فائل نکال کر نیل پر رکھی۔

”یہ غیر ذمہ داری ہے مس خان جب میں نے آپ کو دراڑ میں رکھنے کے لیے کہتے تھے تو آپ نے کپ بورڈ میں

کیوں رکھے۔“

”میں سر میں نے دراڑ میں رکھے تھے کیا غیر غلام علی نے رکھ دیے ہوں۔“

”غلام علی دیں سالوں سے یہاں بیٹوں سے وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔“ ڈاکر صاحب کی پیشانی پر ناگواری سے

لیکرس کی پڑائی تھی۔

”آپ جانتی ہیں بچہ نے کتنی محنت سے انہیں تیار کیا۔ کتنا وقت ضائع ہوا اپنی کلاس پڑھوڑیں اور۔“

”سوئی سر میں نہیں ہے۔“

”اوسکہ۔“ علی ہوجاتی ہے انسان سے آئندہ وہ جان رکھنا۔“ خضر کھڑا ہو گیا۔

”اوسے پیچھے۔“ آپ تو کھڑے ہو گئے ہیں چائے نہ منگوا انہوں۔“

”نہیں۔“ شکر یہ ڈاکر صاحب۔“ خضر نے مصافحہ کے لیے ہاتھ پڑھا اور انہوں نے پہلی کی طرح ہیر کے

پیچھے سے بیٹھ بیٹھا۔ ”آگے بھاگنا۔“ جب لپکا سا ہاتھ تھا۔ خضر نے فوراً ”آگے ہاتھ پھوڑ دیا۔“

”اور میں تب خضر بھائی بھی مجھے ہی فریڈم دار سمجھ رہے ہوں گے۔“ گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہانور نے سوچا۔

”آپ لیکن کریں خضر بھائی میں نے فائل دراڑ میں ہی رکھی تھی۔“

”اوسکہ۔“ بابا ب روئے تبہ جانہ آئی تو نم نے دراڑ میں ہی رکھے ہوں گے۔“ خضر نے گاڑی میں روڈ پر

لائے ہوئے ہانور کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

”اور فائل الماری میں سر نے رکھی ہے یہ بھی جان کیا ہوں۔ لیکن ہمیں اگر چاہ کرنا ہے تو اسے اندر

جو صلہ اور امتحان دیا کرو۔ چاہ کرنا خواہ وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں لیجنٹ ہی کیوں نہ ہو۔ تم جیسی لڑکی کے

لیے بہت مشکل ہے۔ لیکن جب ارادہ کیا ہے تو ٹھوڑی سی بہت بڑا کرلو۔ یہ شخص مجھے بہت شاعرانہ رہا ہے۔

آئندہ اہل بات کا خیال رکھنا اگر پھر کبھی یہ آؤ تو ہرگز مت جانا۔ اور چاہیے کہ نہ کہ پھوٹ جائے

گی جب انسان کوئی ارادہ کر لیتا ہے تو راستے خود بخود بن جاتے ہیں۔ کیا خراس سے بہت چاہ کرنا ہے۔“ اور

باکھوں کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ مسکرائی۔ اسے خضر کی بات بہت پسند تھی کہ اس نے بھی بے

جو صلہ نہیں کیا تھا۔ ہوش وصلہ پڑھا تھا۔ اور ساتھ اس کی سوچ ثابت تھی اور اس نے بات کر کے

اسے کبھی اپنی پہلی جگہ کا احساس نہیں ہوا تھا۔

”کیسے خاتون اب آپ چاہ کر رہی ہیں ان جیسی موتیوں کو لونا یا مت کیجئے۔“ خضر اس کی طرف ہی دیکھ رہا

تھا۔ وہ چھپ کر کہتا تھا۔ ”میں نہیں کیوں اسے آنسوؤں پر اعتبار نہیں تھا۔ حالانکہ وہ بڑے بڑے کام کرنا جانتی تھی۔“

اس کے ارادے سے بلند نہ کرتے اسے صراحتاً خراس کے خواہوں کو پورا کرنا تھا۔ اس نے سوچا تھا اسے جتنی جی محنت

کرنا پڑے گی کہ اس کی اور سب کو اعلیٰ تعلیم دلوائے گی۔

”زندگی گزارنا آسان نہیں ہے۔ ہاں۔ یہاں قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں۔ کمزور لوگوں کو دنیا بہت دینی ہے۔ پس ذاتی

ہے۔ کبھی کی کو اس بات سے ہونے والی کمزوریوں کو ختم کر دو۔ خود ہو۔ مجبور ہو۔ لوگ مجبور ہیں سے فائدہ اٹھاتے

ہیں۔ اپنے اندر اٹھنا اور وصلہ پیدا کرو۔ اپنی بات اور وصلہ کر اپنی طرف اٹھتے ہوئے ہاتھ جو روک سکے۔“

بابا کر کے خضر نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ وہ جیسے اس کے دل میں جھانک رہا تھا اور شاید اس

نے ان کی سوچ پڑھ لی تھی۔ اور یہ آج سے نہیں بیٹھ سے تھا۔ جانے خضر کو اس کی پور سوچیں بھی کیسے پتا چل

جاتی تھیں۔ وہ بیٹھ اس کے دل میں جھانک لیا کرتا تھا۔

”اور ہاں۔“ زندگی کبھی کوئی مشکل مرحلہ آئے تو جھانکنا بہت۔ جس پر قدم ہر تمارے ساتھ ہوں۔ اور میں

ہی نہیں سمجھتا ہمارے ساتھ ہیں۔ مجھے یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر کبھی کبھی مجھے لگتا ہے

مجھے ہم سب کی اپنی اپنی باتیں ملنے کے باوجود تم خود کو ایک خالص فرائڈ کے گلف میں جلا رہی ہو۔

اب یہ چاہ کا مسئلہ ہی لو تم مجھ سے کہہ سکتی تھیں کہ تم چاہ کرنا چاہتی ہو تو میں دیکھتا ہمارے لیے کوئی بہتر

جایا۔“

اس کے لیے میں بلکا سا گھر دو کیا تو ہانور نے فوراً ”سے روک دیا۔“

”میں ایسا بالکل نہیں سے خضر بھائی۔ ہمارا سوائے آپ کے اور ہے ہی کون۔ ہم ہر مشکل میں آپ ہی کی

طرف سے جیتے ہیں۔“ چاہ تو اس کا خاکہ ہی آپ کو بتا تو چلی ہوں ساری تفصیل۔“

”اوسکہ۔“ خضر سامنے سر رک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یہ شخص ڈاکر اسے بہت مکار سا لگا تھا۔ اس کی پہلوئی پھوٹی آنکھوں بڑی شیطانی سی چمک ہوئی تھی

اسے اور ایک لمحے میں جان لیا تھا اس نے کہ وہ کھوٹا بول رہا ہے۔ ہانور نے فائل دراڑ میں ہی رکھی تھی وہ چاہتا

تو ہانور کو منع کر دیتا چاہ کر کے سے وہ ان کی ضروریات کو پورا کر سکتا تھا۔ لیکن وہ ان کی خودداری یا ناانجام کو



نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ماہ نور یا کوئی اور اس کی اس طرح کی پیش کش قبول نہیں کرے گا۔ منصور نے جب بڑھائی چھوڑ کر جاب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو اس نے منصور سے کہا تھا کہ اسے جاب کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے تعلیمی اخراجات وہ برداشت کر لے گا لیکن اس نے سمولت سے منع کر دیا تھا۔ اور تب وہ خود ہی نہ آیا تھا۔ کیونکہ وہ اس سیرینڈ اور براہمنڈ کو چاہتا تھا۔ واکر کی تنگدستی اس نے اپنے پیٹھے پر بٹھلے قابو کیا تھا اس کے اقتدار میں ہو گا وہ اپنے دوستوں کی غلط نظروں سے ماہ نور کو روکنا چاہتا تھا۔

”توبہ کیا سوچنے لگے خضر بھائی۔“ ماہ نور نے پوچھا اور چونک کر پڑا۔  
”کچھ خاص نہیں۔“

وہ اپنے اس جذبے سے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا لیکن ماہ نور نے اسے ایک خاص انیدیت تھی۔ باتوں کی نسبت کچھ زیادہ اون طبع پر چھو کر کھڑے ہر فرد سے اسے محبت تھی۔  
خضر کا دل کچھ عجیب طرح سے دھڑکا اور وہ ایران سانس کے چرچے سے نظر ہٹا کر سامنے دیکھنے لگا۔ یہ آج دن کیوں اس طرح دھڑک رہا ہے۔ یہ کیا لڑا کھا سا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ میں اس سے پہلے تھا۔ اس نے کن انجیوں سے ماہ نور کی طرف دیکھا اور وہ اسے انداز میں باہر دیکھ رہی تھی۔  
یک دم اس کا جی چلا اٹھا وہ ماہ نور کو لے کر سمندر کی طرف نکل جائے۔ اور پھر اس کے ساتھ رت پر شلنے ہوئے بہت ساری باتیں کرے۔

”یہ سب کیا ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”میں بھی کس قدر احتیاج باتیں سوچنے لگا ہوں۔ اور یہ ماہ نور ہی تو ہے جسے اس سے پہلے میں تنگدستی بارہ کیچہ دیا تھا۔ اور تنگدستی بڑھ کر نہیں کی ہیں۔ ماہ نور بہت خوبصورت ہے بہت پرکشش ہے۔ یہ بات تو اسے پہلے بھی بتا ہے پھر کیا کیا ہے؟ شاید یہ جذبہ ہے جو ذرا صاحب کی آنکھوں میں وہ شیطانی چمک۔ کیونکہ یہ اندر نہیں اور بیٹے کا تھا۔“  
اس نے خود کو پھر دیکھ لیا۔ ”ماہ نور اس قدر سادہ اور معمول ہے کہ اس کا جاب میں آتا ہے۔ آج شنب کر رہا ہے۔ دراصل میں اس کے لیے گھر مندر ہوا ہوں اور شاید اسے تنگدستی نہ چاہتا ہوں تو میں اس طرح سوچنے لگا ہوں۔“  
اس نے اس کے سامنے ”میں نے اسے کھانا دیا اور اس نے یکدم اس پر بڑھادی۔“  
”خضر بھائی آپ مجھے کھری لے جا رہے ہیں یا ماہ نور سے کہا۔“ ماہ نور نے غصہ کر کہا تو اس نے اپنے پیٹہ آہستہ کر دی اور کھڑے کٹ پر آکر بیٹھا۔

”مجھے خاتون آپ کو کچھ پتہ نہیں۔“  
”یہ آپ مجھے کچھ آج۔“ خاتون خاتون کہہ کر یوں بارے ہیں۔ سیدھی طرح ”ہاں۔“ کہہ کر یوں نہیں بلاتے۔ گھڑی سے اترتے ہوئے ماہ نور نے کہا اور جواب کا اظہار کے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی گاڑی لاک کر کے مسکرا ہوا خضر بھی اس کے پیچھے آئی وہ لاؤنج میں ممالی اور امیر جی بھی تھیں۔

”اے ہلہبائی۔“

امیر نے خوشی سے نکل دیا۔

”اور کون سے آپ کے ساتھ زلی بھی ہے۔“

”نہیں میں خضر بھائی کے ساتھ نکلی ہوں۔“ وہ امیر کو بیا کر کے ممانی کے پاس آئی۔

”السلام علیکم آئی۔“

”وعلیکم السلام طبع یہ کسی اور بھائی صاحب کا کیا حال ہے۔“

”ماں تو ٹھیک ہیں اب اس لیے ہی ہیں۔“ کچھ ٹھنکے تو بلی بہت بائی رہنے لگا تھا۔ ”کچھ بھر کو ماہ نور اور اس ہوئی۔“

اور پھر مکران کی طرح دیکھا۔

”بھئی کہاں ہے؟“

”بھوئے کمرے میں ہی ہیں۔ میں بتاتی ہوں انہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔ بلکہ ہم سوچ رہے تھے کل چھٹی ہے تو آپ کی طرف آئیں گے۔“

”اس نے کمرے کے کمرے بتایا اور امیر کے کمرے کی طرف مڑی۔ یہ سی خضر کی رنگ انگلی میں گھما تا اور سی گاہنے کے بل ٹھٹھکا۔ وہ بولی وہ لاؤنج میں داخل ہوا۔ ممانے اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پھر مکران میں سی بیٹھی باہر نکلی۔“

”تم اگر اور چارے تھے چھپو کی طرف تو تیار جاتے میں بھی مل آتی سب سے جب سے تمہارے بیڈی گئے ہیں چاہا ہی نہیں ہو سکا۔“

”مسوری ممانا چاکلی ہی پروگرام بنا۔ منصور سے کچھ خاص تھا۔ اس سے اٹھا دھر چلا گیا۔“

”جب آپ سے جانا ہو جانتے گالے جاؤں گا اور یہ وکیلہ ہو تا ہے آج کل نظری نہیں آتا۔ آپ اس کے ساتھ بھی تو جاسکتے ہیں۔ کچھ تو ان دنوں آفس میں اکثر ہو جاتی ہے۔ سہ حال کل بھی ہے۔ یہ چلیں گے۔“  
”ہاں وکیلہ کے ساتھ بھی جاسکتی ہوں اور میں امیر کے ساتھ بھی۔ وہ تو میں نے کہا کہ تم چارے تھے تو نے ملے۔“ انہوں نے کچھ تیزی سے خضر کو دیکھا اور پھر دوسرے مطمئن ہو کر ماہ نور کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اور منصور زلی مول مل ڈھکیو تیرے بعد ریاضت کرنے لگیں۔

”یہ تیرا رستہ دنوں بعد چلے گا۔“ علیلہ نے آتے ہی اسے دھمو کا لگا۔

”نہیں اسی وجہ سے میں نہیں آئی تھی۔“ ماہ نور مسکرائی۔ ”تمہارے ان دھمو کوں کے خوف سے اور تمہارے کیا کلاں میں مندی کی تھی۔“ ماہ نور نے غصہ کیا۔

”ایک بار خانی مصوفی دہی کیا تاؤں۔ ابھی تک تو ایک تو جیسٹ ہی نہیں ہو پاری۔ تمہارے بغیر ذرا جی نہیں لگتا۔“

ایک بھی نہ کلام کام کا میں نے پناہ نہ منٹ میں۔“

”کیا کیا وہ سٹول میں سے کوئی نہیں۔“ ماہ نور نے اس کی بات کا لی۔

”میں تیرے پناہ نہ منٹ میں کوئی نہیں۔“ اس نے مندر ہوا۔

”اس بھی کیا بات ہے۔ بولے ہو۔ سب کچھ لگے لگیں گی۔ اجنبیت ختم ہو تو کوئی غای نہیں دیکھے گی۔“

”اور تم نے نہیں لایا یا نہیں۔“

اس نے ہاتھ کا اظہار کیا۔ وہ ابھی تک کھڑی تھی ماہ نور نے اسے اس کا طرف دیکھا۔ آسانی رنگ کی

پنک کی ہاف سلیوڈ شرٹ پہنا کر ایک سارا گلابی رنگت اور ڈکٹس براؤن آنکھیں خوبصورت قد میں ان تک

لے بل براؤن آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی۔ ”ابھی سو کر اٹھی تھی۔“ چرے کے رنگوں میں نے بازی اور استغنا

کے رنگ کرتے تھے۔ زندگی میں کی بڑی کوئی کچھ نہ تھی۔ خاندان سے ہر طرح سے اسے فائدہ تھا۔ حسن دولت بھی

چاہو تو تھا پھر بھلا وہ اس کے کرب کو کیسے محسوس کر سکتی تھی۔

”یہ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو مجھے کیا نظر لگتا ہے کا ارادہ ہے۔“ علیلہ بھی تو اس کے ہونٹوں پر چٹکی سی

مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”میں سوچ رہی تھی کہ تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ میرے لیے ایڈمیشن ہال ممکن نہ تھا۔ ویسے تم

کے پیار کی گری ہو۔“

”اتھاب کچھ منٹ کا چلو کمرے میں چل کر بیٹھے ہیں۔“

علیلہ نے اس کا ہاتھ پکڑا کر اٹھا۔

اور وہ اسی طرح ہاتھ پکڑے اسے کمرے میں لے گئی۔

”تم نے اپنے مین میں لیا تو کیا کرتی رہی ہو سارا دن۔“

”میں نے جاب کر لی ہے۔ ایک اسکول میں۔“



اعتراض ہوتا ہے انہیں۔ لیکن اس نے سوچا تھا انہیں یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ اباجی اسٹیج بھائی کی بات نہ انہیں۔ لیکن انہیں نے سچ کہا تھا۔ رات کھانے کی میز پر اسٹیج بھائی نے اس کے متعلق بات کی۔ ”سوئی نے بہت اچھے نمبر لیے ہیں۔“

”جسے میں اس سے بڑی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ کالکوں میں جا کر لڑکیوں کی حیا ختم ہو جاتی ہے باپ دادا کے عزت کا نام، نسب، متاعِ منہر، مسافر میاں صلاح الدین سے بحث نہ کریں۔“

”اے کرے میں ملے چلے تھے۔ تمہارے آنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی کو نمناپنے کو خوشی کی۔ لیکن بابا جی۔ انہوں نے“ العزکی آواز بھرا کئی۔ ”جست ہے عزکی کی اور جست تخت تخت الفاظ استعمال کئے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ کہاں ہے کسی کی کیا بات نہیں کسی عید ایسی متوالی ہے تو ہے کہ کارے ضد اور جست کا کافہہ لیکن اسے بھائی تو نہیں جانتے تھے تاہم نے خواہواہیں کیا۔“

”گاماں۔“ انھیں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”اسفریحائی کے پاس۔ میں سواری کرنے جا رہی ہوں۔“ غم کو بتا کر کہاں  
میں چل رہی ہوں، ابھی وہ اسفریحے کے رومے میں آئی۔ انھیں صوفے پر بیٹھ کر ٹیک لگاتے تھیں وہ کامیوج رہے  
تھے ان کی پہچانی پر لیکچر کا حال سامنا تھا اور ہونٹوں میں کمریٹ سلگ رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اس نے اسفریحائی کو  
بے حد محبت کی کہ اسے بے حد نہایت محسوس ہوئی۔

اسفر نے چنگ کر کر عین کھول دیں۔ اور وہ نونل میں دے کر کٹ کر کایل زے میں چھینک دیا۔  
 "سوری! اسی بھائی بی بی سے ہے۔" اور اس کے قتل میں بھی اس کی اور آکسو خراہدیں چھل آئے  
 "کیا؟" اسفر نے اٹھ کر ایک دم اسے اپنے ساتھ چلا آیا اور اپنے کھول سے اس کے آستر پوچھے  
 "ابا کیوں سوئی ہو تمہاری دیس؟ کچھ نہیں ہوا اور اباجی تو مجھے اس سے بھی۔" اور بات ادھوری چھوڑ  
 کر مسکرائے

”حق پریشان نہ ہو۔ میں نے پرامس کیا تھا تا تم سے میں پھر بات کروں گا ان سے۔ اس وقت تو وہ مزید بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔“

”نہیں بلکہ اسلی بھائی نہیں آپ ان سے بات نہ کرتا۔“

”کیوں ارادہ بدل گیا۔ ہمت ہار دی۔“ انہوں نے اس کا مودہ تحمیک کرنے کے لیے خوش مزاجی سے کہا۔ ”چلو جیٹھو اور خبردار اب روٹا نہیں پائکل۔“ وہ بیٹھ گئی۔

اب تم جا کر سوا جوں اور فضول باتیں مت سوچنا انشاء اللہ کچھ کروں گا۔ ہو جائے گا کچھ۔<sup>۱۹</sup> سفر شاید ابھی بھی

فائو کی شیشی مٹھی میں داسبل۔ وہ جانتی تھی کہ کبھی کبھار عذرا بیگم والہم استعمال کرتی ہیں۔  
 ”کیا ہے سو۔“ سلام پھیر کر انہوں نے نرم کر اسے دیکھا۔

”سورہی ہی جان۔“  
”اگر آؤ تو ہم بلا کر کہہ دیں۔“

وہ خاموشی سے ان کے پاس آکر کابٹ پر بیٹھ گئی اپنی پشتانی پر ان کی انگلیوں کا لمس اسے بہت پر سکون سا لگا۔  
 س کاجی صاحبزادے نے بھی اپنی نرم انگلیوں سے اس کا سر دبا دیا۔  
 ”وودھ بھی ملی لیسا اور سوچا جانتا ہی مت رہتا۔“

اس کی پیشانی پر پھونکتے ہوئے انہوں نے تاکید کی۔

60

”جی اچھا۔“ دل بھرا آیا تھا لیکن وہ ضبط کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”اسٹیج بھی دیکھ لیتا۔ رمضان سے گناہ و گنہگار ضرور دے آئے۔ اسے کھانا بھی تو کچھ نہیں کھایا تھا اس نے  
 بیانے کس جرم کی سزا مل رہی ہے اسے۔“ ان کی آواز بھرپور تھی۔ وہ اس پر ہونے والی زیادتیوں پر بہت کڑھتی

تھی کہ وہ اس گھر میں اجنبی ہو کر رہ گئے تھے۔  
 ”جی ہمت نہ“ وہ کہے باہر نکلی تو اس نے میاں صلاح الدین کو فاطمیں بغل میں دبائے ادھر آتے دیکھا۔ ان

یادداشت کی کہ وہ نماز و عبادت اپنے بھٹے پڑھنے والے کمرے میں ہی پڑھتے تھے اور اپنا کام بھی وہاں ہی کرتے تھے۔  
 یلین آج وہ رجسٹر اور فائلیں اٹھائے ادھر آ رہے تھے۔ وہ سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ میاں صلاح  
 الدین نے بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ اپنے کمرے کے دروازے پر رگ کر اس نے میاں صلاح الدین کی

”آپ کو کبھی بھی اپنی زیادتی کا احساس نہیں ہوتا لیکن اب شاید ہو جائے“

پہلے میں آئی۔  
 اردو ناس کے بیڑے سوری تھی۔ اردو ناسی تو اس کے پاس اور کبھی انعم کے پاس سوجاتی تھی۔ انعم اور سمن ایک  
 د لڑے میں سوئی تھیں۔

۱۰ اور شاید تم جب میٹرک کر لو تو تابانی کو یاد آجائے سب حوصلے کرنے جا رہی ہوں تو وہ شاید تیسریس مزید پڑھنے نہ روکیں اس نے جب کراؤ مانی پر بوسہ دیا۔ اور مضمیں مچھنی واہم مفاہو کی بول تیکے کے نیچے رکھ دی۔ یہ بیڑہ بیٹھ گئی سندر او ایگم کو اکثر نہیں آتی تھی اور وہ لکڑی اجازت سے وہ کبھی گھار آدھی ٹیبلٹ سونے

”اور خدا کرے آج امی جان کو اس کی ضرورت نہ پڑے۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا کی اور سوچا۔  
 ”یہ دنیا کتنی خوبصورت اور رہنے کے قابل جگہ ہے۔ یہاں اس دنیا میں جہاں امی جان ہیں ان کی شفقت و

”یہ حرام موت ہے۔“ لیکن کسی نے تنبیہ کی لیکن اس نے اس آواز پر کان نہ دھرے۔ اس کے اندر

ہمیں سے کسی جب مرضی کی صدی - عذر ابراہیم حیاں عاکہ چین میں نوویارک میں سے کو سایدی کی ہے ایسی ہے

۱۰۔ یوں کاساراکام سمیٹ کر آئی تھی۔ رات کے برتن رات ہی دھوا کر خشک کر کے سنبھال دیتی تھی پھر دُراور لے کر لے میں ڈوڑھ رکھتی۔ اسفرے پوچھتی کہ وہ کیا نہیں کئے انہیں ڈوڑھ پسند نہیں تھا۔ یہاں کبھی کبھار ملائی لیتے تھے۔ یہاں صلاح الدین، اور غزرائیکہ کروڑوں کے گھاس دے کر بٹ وہ کمرے میں آتا اور اکثر

اور یہی سبب ہے کہ ان لوگوں نے ان کو بھلا کر دیا۔ لیکن اس نے نیچے کے نیچے سے شیشی

۱۰۔ لڑھ کر لیٹ گئی آخری بات جو اس کے ذہن میں آئی وہ یہ تھی۔ کاتس اپنی جلدی فارع ہو کر آجائے اور وہ



مضبوط اور پایدار تھانے کوئی نہیں تو رکتا تھا انعم کے آنسو پونچھتے ہوئے بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔  
 ”انعم بٹھاو صلب“

وہ ان کے بس بھائی تھے عرشِ بہت زیادہ فوق حق نہیں تھا پر بھی انہیں لوگ چاہتے تھے وہ ان سے بہت جیسے ہوں لیکن ان کے چوں کی طرف نہیں صلاح الدین ایک نئی سی پہل میں آئے تھے حالانکہ انہوں نے بیٹوں میں سے کمن کے لئے اٹھائے تھے شاید بیچپن میں اس کی بیماری کی وجہ سے اور بیٹوں میں سے ہجر کے اس کی بے نیلہ خصوصیات اور وہ جانتے کی وجہ سے اس کو حریت بھی کی گئی اس میں پر بہت غصہ تھا یا اس نے سمجھنا نہ تھا کہ وہ دیکھنے آئے تھے۔

”سوا بیٹے انھیں کھولو۔“ عذرا بیگم نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو بند آنکھوں کے پیچھے بھر سمندر اہل پرے سفر اسے دیکھ رہے تھے۔

”تم کہیں گرا یا ب رہ گئیں، وہی ہو گا جو تم چاہو گی۔“ وہ کنبیوں کو سترہ دیکھتے ہوئے انھی سفر نے اس کے پیچھے کھیر کر دیا۔

”اور تمزاد آپ کو رزلٹ بھی آگیا ہے۔“ میسٹر آنکھوں کی نمی چھپا تا عذرا بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی طرف ہنسا۔

”وہ ارسل کی بات پہ ہے کہ مترجم کی عجیب سوجھی بوجھی ہیں۔“  
 ”مترجم نہیں ہیں کیا؟“ سات سو اٹھارہ کلیمز پر، ”مترجم“ بھی شرارت سے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ ”بھرتے نہیں۔“ سرسراہا۔ ”اچھی رزلٹ ہے کہ ریکارڈوں میں ان کتاب نگار اکٹھوں سے دیکھا  
 ہے پورے سات سو اٹھارہ کلیمز پر، ”وہ“ کوئی غلط ہے نہ کیسی عجیب اس کے نہیں ہے بلکہ ایک سچے سچے  
 محض لکچر پچھو سوجھا تھا۔ جو بھی وہ سمجھے کیا اس کے سات سو اٹھارہ بتانے کے لیے اختیار کر سکا۔

”اور ہم غلابا تھے اسے اٹھائی لے کر آتا تھی۔“ اس فرجی اہل کو خوشگوار بنانے کے لیے میسرے کو جو کھنکھوتے انہوں نے سب کو منع کر دیا تھا کہ اس موضوع پر کچھ نہ کہنا سنا جسے اس کی خواہش کی شدت اور پھر باپ کی رائے سے ایسا کر کے مجبور کیا ہو گا۔ یہ حال اب کوہ ہریانہ جاتے ہوئے ادھر اور پھر واپس کرپے تھے تاکہ اس کا رشتہ نامے میٹرز سے کسی بڑے بیٹے کی یاد اور اسے لطیف بنانے لگا۔ اسٹراٹھم کہنے ہوئے ”میں جیسا کر کے آتا ہوں یہ کتنے چاہتا کروں گے“ غدار بیٹہ تمام گتہ کرانے کے پیچھے آئیں۔

”ارے ہیس ای جان۔ میں نے بتایا تو تھا میرے دوست کا لیکنک ہے۔ ڈاکٹر شان بہت اچھے دوست ہیں میرے۔ پریشانی والی کوئی بات نہیں۔“ وہ ان کے ہاتھ تھپتھا کر باہر چلے گئے۔

سول ہاسپٹل کے کروہ ۱۳ کے سامنے ایک کمرے کے لیے شہزاد شاہ کھڑے ہو گئے۔ اندر جاوے جاتے ایک عجیب سی جھجکا باغ آگئی۔ یہاں نہ جاہیں۔ لیکن دوسرے کمرے میں دو دروازے ہوئے۔ دیکھ دے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ سامنے بی بیہر سید شجاع علی شاہ آگئیں۔ موندے لگنا تھا اس کے اور اور تھے۔ یہاں ہندو بھی تھیں۔ اور ایک بی بیہر سید پلار شری چاٹھا۔ چہرے پر نسل کے نشان تھے۔ بندھے کپاس اس کی طرف پیچھے نہ کوئی کڑا تھا۔ دوسرے کمرے میں شہزادہ کرم چاند اور کئی اور اہل زیارت شرمندگی اور دھوکے کے احساس سے بوجھ دل کے کھڑے رہے۔ پھر اچانک بی بیہر کے کپاس کھڑا ہوا۔ انہیں سزا دینا تھا۔ یہاں بی بیہر شری چاٹھا آگئیں۔ اس کی نگاہیں سید شہزاد شاہ کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ پھر وہ جتنا ایک قدم آگے بڑھا۔

”چاہو۔“ شاہ رخ شاہ کو انہیں پہچاننے میں دیر نہیں لگی تھی۔ وہ بلاشبہ سید قائم علی شاہ تھے سید قائم علی شاہ

کی آنکھوں میں ایک کہ کو جبریت اتری دوسرے ہی منہ شاہد رخان کہ بازوؤں میں قہار۔  
 کہیے وہ جان مگر "سے بازوؤں میں لیے انہوں نے پوچھا شاہد رخان میں نیست پیچھا خاص میں پہنچ گئے۔ کبھی  
 کبھی سید قائم علی شاہ مدام میں ہوتے تو یہی کہ اسے جان مگر کہہ کر لایا کرتے تھے۔ کئی ہی دیر تک وہ اسے پوچھی  
 بازوؤں میں جسے اسے اندر وجہ کرتے رہے۔

”تکے“ سے، دونوں کشتی طویل راتوں اور کئے، ماہ سال کے بعد جہیں دیکھ رہا ہوں۔“ اپنے سے الگ کرتے ہوئے انہوں نے دونوں بائیں کمرے میں اس کے چہرے کو تھام لیا۔

”بہت انتظار کروایا تم نے شام، بہت انتظار بہت تڑپا ہوں تمہارے لیے۔“ ان کی بعد خوبصورت آنکھوں میں نمی لا رہی تھی۔

”ایسا دھڑک رہی تھی۔“ بیکار کے لیے حجام نے ان کی طرف دیکھے ہوئے لہاسا سی انھوں میں سے کسی نے غصا  
چبک کی اور موزوں پر مسکان  
”جان بابا۔“ بیکار نے توجہ کیلئے ہلو۔ انھوں میں سولوں ہل میں انارلوں۔ کتنی راتیں میں نے اس کی یاد میں  
جنگ کر گزار دی ہیں۔ اور تو مجھے یہ ستارے راؤن کی خاموشی میں میری انھوں سے ٹوٹ کر گرے ہیں۔ میری  
راتیں گلوں میں میری یہ پیٹیوں کی اور میرے آنسوؤں کی۔“

”میں نے بھی آپ کو بہت یاد کیا۔ بہت سیر کیا۔“ شاہور علی شاہی یاد دہانی کرتے ہوئے  
 ”مگر جو میرا دل نہیں چاہتا تھا وہ نہیں“۔ وہ جب ہفتار غمگین کر بیٹھ تو وہ دوسرے ہو گئے۔ ہاں وہ اسی نے سب  
 نہیں دھوڑا دکھا تھا۔ جب میرک کے بعد وہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا تھا تو اسی دھوڑی مسکاتی  
 تھیں۔ ان کا چہرہ نہ مسکاتا تھا۔ لیکن ان کے بھی ایسے ہی نہیں تھے۔ وہ ان کی بیات لکھی نہیں تھی کہ وہ نہیں  
 دھوڑی تھیں۔ ان کا بھی ایسا چلنا تھا۔ اگر وہ بیات نہیں لکھتے تھے تو شاید ان میں سے کسی سے کچھ تو انچال  
 جاتا۔ کوئی کہتا تھا ان کے حلقوں۔ اور کوئی کہتا تھا ان کو تھوڑی سی منت فاصلہ تو کچھ تھا۔

”او کے میری جان۔“ انہوں نے اس کے چہرے پر بلحیرے ندامت کے رنگ دیکھے تو اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مسکرائے۔

”سب لوگ کہیں ہیں۔ شاہجی۔ بی بی جان اوبہ زنجی“ زینت فاطمہ سے انہیں سخت محبت تھی مگر وہ کسی جی وہ برہان ان سے کسی کارکنے تھے جب خنزہ انہیں اچھی لگی تھی جب انہوں نے اس سے شادی کا فیصلہ کیا تو فاطمہ سے پہلے انہیں یہ بتایا تھا۔ جب شجاع یہاں اوقاتِ بزم بھی دیکھ رہا تھا تو اس نے کہا کہ ”اے خزانہ کی نفی شریعہ کا بھی کہہ دینا زینت فاطمہ کو اپنے سینہ پہ لٹا دینا“ انہیں جلد شادی کی ضرورت تھی اور وہ جلد ہی محل اور خوبصورت زندگی گزار رہی تھی طرح سینہ پہ ہونے کے بعد ایک بار انہوں نے انہیں پیغام بھی بھیجا تھا کہ اگر وہ پسند کر لیں گے اس کا ساتھ رہنا تو وہ انہیں ان کے پاس۔ لیکن انہوں نے منع کر دیا تھا۔

کاش وہ اپنی اسی والدی بیوی کے لیے بھی رخصت نہ جاتے کی بات میں اور ایک اور ایسی شہکار ایک دور سے جو کچھ کہنا شروع کرتے نہایت سے انکار کر دیا۔ حالانکہ شہزادہ پروید اس کے سید اور ایک ایسی شہکار کا بیٹا ہے جو مولوں کے تھا۔ اور انھوں نے اپنا بیٹا بیٹا تھیں انھوں نے دور کو برا کہا۔ ایک ایک صاحب میں رخصت کی بات میں کہی کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ اور اپنی بیوی بھی رخصت لی لی کی طرح کوٹاری رہے گی۔ والی نے انہیں سمجھا گیا تھا۔ رخصت لی لی کے لیے مسئلہ یہ تھا۔ اور وہ بیوی کے لیے اور وہ بیوی کے لیے تھا۔ انھیں سمجھا گیا تھا۔ شہزادہ پروید اس کے بیویوں کے قریب اور وہ بیوی کے لیے تھا۔ انھیں سمجھا گیا تھا۔ رخصت لی لی کے لیے مسئلہ یہ تھا۔ اور وہ بیوی کے لیے اور وہ بیوی کے لیے تھا۔ انھیں سمجھا گیا تھا۔

”زیست فاطمہ پاک سبلی ہیں۔ ان کو یہاں نہیں چاہیے۔“

65

لیلی جان نے دے بغیر انھوں میں کما لیں داجی نے انہیں ڈانٹا تھا۔

”یہ جرات ہے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے کہ بیٹوں کی شادیاں کر دو۔ میں کم از کم اپنے خاندان میں ایسی جالانداز باؤں کا اطلاق نہیں کروں گا۔“

لیکن پھر تا نہیں کیا ہوا تھا زینت فاطمہ نے بھی کسی سے منع کر دیا تھا لیلی جان نے روک دیا تھا وہ تو بڑی حویلی چھوڑ کر چلے آئے تھے لیکن انہیں کھانا نہ تھا کہ زینت فاطمہ کی شادی نہیں ہوئی اور وہ بڑی حویلی میں ہی رہتی ہیں۔

”چھوڑا بھی ہیں آپ کو یاد کرتی ہیں بلکہ جب سے شجاع سے ملاقات ہوئی ہے وہ بہت سے چین رہتے ہی ہیں بہت روتی ہیں بات بہت ہے۔“

”شجاع نے بتایا تو وہ چوڑے“

”شجاع سے ملاقات ۳۳ انہوں نے شجاع کی طرف کیا۔“

”یہ ایمان پارنہ۔ کب سے ملاقات ہے اکیلے اکیلے لیے اور ہمیں بتایا تک نہیں۔“

”بے ایمان تھا کی سبب سراسر باز ہے میرے پاس آپ کے لیے کوئی سزا نہیں تھا۔“

”کب ملاقات ہوئی۔“

”۳۳ جارت سے پہلے صرف ایک مختصر ملاقات۔“ شجاع مسکرایا تو شاہد کو پھر زینت ام سے گھیر لیا وہ میر

تاج علی شاہ کے ہاتھوں سے ہاتھ چھڑا کر اس کے بید کے قریب آئے۔

”کیسے ہیں آپ شجاع۔“

”خدا کا شکر ہے کہ بہت بہتر ہوں۔“ لینے لینے اس نے لیلیاں ہاتھ مصلحے کے لیے آگے بڑھایا جو بیٹوں اور

پلاشتہ آزاد تھا۔ ”دوری شجاع۔“

محبت سے اس کے ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لیے ہوئے شاہد نے نہ راستہ سے کہا۔

”ایک لفظ بھی نہیں۔“ شجاع کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور انہیں جیسے مزہ دینے لگیں۔

”تم نے فراموش کر دیا کہ میں تو دونوں سے تمہارا اختراع تھا۔“ ۳۳ نے بے لطفی کا مظاہرہ کیا۔

”آپ کو امید کی کہ میں آؤں گا۔“ شاہد خاموشی سے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں تھا کہ کھانا پھر ہو لے اس

کا ہاتھ دیکھ کر بھوکھوڑا۔

وہ در سے تھے خوفزدہ ہو رہے تھے کہ پتا نہیں شجاع کو ان کا پابند بھی آئے گا یا نہیں۔ یہ نہیں وہ ان سے بات

کرنا پند بھی کرے گا یا نہیں۔ نہ زینت اس کی آنکھوں اور چہرے سے نمایاں تھی اسے حق تعالیٰ نے کرتے میں ایک

لہر بھی نہیں لگے گا۔ اسے یہ جان لینا پڑا مشکل نہیں ہو گا کہ اس پر حملہ کرنے والے اور اسے سبق سکھانے

والے کون ہیں۔ زینت فاطمہ کے کمرے سے نکل کر وہ سیدھا کمالے اور فضل واؤ کی طرف گئے تھے۔ دونوں بڑی

حویلی کے چھوڑا دے ہوئے کوراز نما کھروں میں رہتے تھے۔ ان کھروں میں رہنے والے حویلی کے ملازمین ہی

تھے کمالے کی بڑی مدت ہوئی تھی۔ اولاد بھی نہیں اور فضل واؤ نے تو شادی ہی نہیں کی تھی دونوں اس

ی کوراز میں رہتے تھے شاہد وہ کچھ روپے کی شادی کور پور بندے کے لوہے تھے کمالا چاہا لی لینا تھا اور فضل

واؤ زمین پر بیٹھا تھے کہ شکر اگھا رہا تھا۔ ”میں دیکھ کر دونوں ہی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔“

”آپ بھونے شادی آپ یہاں۔ خیرت میں بلوا لیا ہوا۔“ دونوں نے بیک وقت کماہو لہر بھرونی انہیں

دیکھتے رہے۔

”کیا کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟“ جب وہ بولے تو ان کی آواز جھرجھری تھی۔

”آپ کا مطلب ہے وہ اس کی بی۔“ کمالے نے پوچھا اور پھر جواب کا انتظار ہی بغیر ہوا۔

”ہاں سبک رہا ہو گا۔“

”میرا خیال ہے ایک سو ڈیڑاں تو تھی ہی ہوں گی۔“ فضل واؤ نے تجو کیا۔

”ہاتھ ہولا رہا تھا ہی ورنہ۔“ کمالے نے بہت کچھ بڑھایا۔

تو زندہ تھا۔ جان سے نہیں مارا تھا انہوں نے۔ ان کے تھے ہوئے اصاب دھیلے ہوئے تو انہوں نے

استائی نرفت سے ان کی طرف کیا۔

”تھے گناہوں کا خون ہے تمہاری گردنوں پر۔“ فضل واؤ بولتے بولتے رک کر ہونٹوں کی طرح انہیں

دیکھنے لگا۔

”دیکھا کہ انہوں سے بچ جاتے ہو لیکن یاد رکھنا کچھ ادا رت اور بھی ہے جس سے نہ جمع ہو سکے۔“

انہیں حیران چھوڑ کر وہ تیزی سے باہر نکل آئے تھے۔

”دور کیا سوچتا ہو گا وہ کئی کئی اور شیعہ جو جس کئی ہوں گی اسے۔“ ان کا چہا چاہو ابھی اسی وقت شہر چلے

جائیں اور اسے دیکھ کر آئیں۔ لیکن امت نہ دہی اسے سوچنا تھا عیاشی کا شعلہ تو نہ تھا۔ اس بھونے سے شہر

میں دس ایس بی تو نہ ہوں گے پھر بے چین ہو کر کھانے کا ٹھہرا لیا۔ ”۳۳ میں ہی شجاع شاہ۔“

”وہ تو باسیٹل میں ہیں۔ راستہ کا کہ لے لکھتے تھے کسی نے پیچھے سے ملا نہیں سے حملہ کر دیا۔ سر پر چوٹ

آئی ہے خون کا لیل لیل کیا ہے بازو میں بھی فکھچھوڑا ہے۔“

فون پر ریو کرنے والے نے تفصیل سے بتایا۔ اس سے باسیٹل اور کرے کا نمبر پوچھ کر انہوں نے فون بند

کر دیا۔ بڑی سے چین رات تھی زینت فاطمہ نے دوبارہ آکر پوچھا۔

”کچھ پتا چلا۔“

”نہیں۔“ وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”نہیں۔“ لیکن ایسی ہی ہیں۔ فون کیا تھا پتہ تو لگ رہے ہوئے تھے۔ پتا نہیں زینت فاطمہ مطمئن ہوئی تھی یا

نہیں۔ لیکن وہ خود اذہ سے چین تھے۔ وہ شجاع سے ملنا چاہتے تھے اس سے معذرت کرنا چاہتے تھے اسے بتانا

چاہتے تھے کہ شادی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے ورنہ وہ کمالے اور فضل واؤ کو نہ سمجھنے اس کی طرف۔ لیکن

خوف زدہ تھے کہ کس شجاع ان سے منہ ہی نہ پھیرے پھر بھی نہ نہیں کھاتے اور آنا چلے آئے تھے اور یہاں

شجاع انھوں میں خلوص و محبت کی وجہ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”۳۳ آپ ابھی تک کھڑے ہیں۔ ٹھہریے۔“ سوری میں اسٹنڈ میں مسکائی میری بیک پر بھی کچھ چوٹ لگی ہے

بہت درد ہے۔“

وہ نام نہاد سے بیڑ کس اسٹنڈ پر بیٹھ گئے۔

”ہاں آپ شاعر کو نظر رکھتے ہیں۔“

شجاع نے قائم علی شادی طرف دیکھا جو ابھی تہہ میں کھڑی ہے۔ ٹھیک لگے کھڑے شاہد کو یوں دیکھ کر بے

تھے جیسے نظروں ہی نظروں میں مل گیا۔ نار بے ہوں۔ سید قائم علی شادی جو کھڑے اور شجاع کے بیڑ پر بیٹھ گئے۔

”میں میں دیکھ رہا تھا کہ شادی سے تھے سارے سالوں میں کتنا تبدیل ہو ہے۔ اتنا چھوٹا سا تھا جب میں بڑی

دوبلی سے نکلا تھا اور اب کیا بار پھر میں سے نکلا تھا۔“

”کب کمال۔“ کئی عرصہ۔“

شاہد نے خیرت سے پوچھا۔

”کب کہاں؟“ سید قائم علی شادی کو سہ گئے۔ وہ حویلی سے چلے تو گئے تھے لیکن ان کا دل جیسے وہاں ہی رہ گیا تھا

تبی انہوں نے شادی سے رابطہ کر کے کئی کئی مہینے طلب کی تھی لیکن باقی یاد اور شادی نے ان کی

بات سننے سے انکار کر دیا تھا پھر بھی ان کا دل تھا کہ چھٹا رہتا تھا۔ انہیں تو سید کو یہاں بھی یاد آئیں تو بے چین

ہو جاتے تھے۔ اب انہیں دنوں کیڑا کے لیے کچھ چاہی ہو۔ حسد اور انہوں نے اپنا لیلیاں کیل اور حسد نے

اپنا زانہ میل دے کر کاغذ لکھا۔ لیکن ان کا کتاں سے چلے گا کیلہ کر لیا۔ کر حویلی اور حویلی کے کینٹینوں سے دور

رہنا ان کے بس میں کہاں تھا۔ وہ حسد کے ساتھ بھی بے چین رہتے تھے۔ حاجی کی وفات کی خبر انہیں کیڑا میں

فی تھی۔ وہ زہر کمرے گئے تھے وہاں کے لادائے تھے جبکہ اظہارِ شاہ اور مقیم شاہ بڑے شہادت کے پیار سے  
 کتنا ہی چاہا تھا ان کا کہ وہ اگر حویلی پہنچ جائیں وہاں کو ایک نظروں سے گزریں لیکن ان دونوں حسنہ بھیل میں اٹھ  
 حصوں اور ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر زینا وہر امید نہ تھے اس لیے شاید ایک دو پچایا جاسکے۔ لیکن پھر  
 عدائے کرم کیا اس اور بچے دونوں کو اوائف نے زندگی دی۔ حسنہ بھیل سے آج وہ ان کی گود میں سر رکھ کر زہر  
 زہر پورے انہوں نے حیدر کو پایا تھا لیکن کئی بہت ساری بھیتوں سے خرم ہوئے تھے۔ مگر مہربان  
 اظہار علی شاہ کا انتقال ہوا وہ اس روز پاکستان میں تھے اپنے دوست محسن جعفری کے گھر بیٹھے ہوئے وہ انہیں اس  
 سیمینار کی تفصیل بتا رہے تھے جس میں حرکت کے لیے وہ حیدر کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے پاکستان آئے تھے اور  
 سیمینار کے اختتام پر وہ جس سے ملنے اور ملائی تھے آئے تھے وہ ان کے قیام گھام کا انتظام اسلام آباد میں  
 میں خدایت چاکھی محسن کے فون کی بھینچ گئی تھی۔ اور فون کیٹل پر رہنے کے بعد وہ کئی کئی دیگر یک چپ  
 چاہ انہیں دیکھنے سے تھے۔

”اُس کا فون تھا محسن خیریت تو نہ۔“

انہیں یوں اپنی طرف مڑتے دیکھ کر اصرار ہو گئے تھے۔

”سید پور سے ابراہار شاہ کا فون تھا ابراہار شاہ سید اظہار علی شاہ کے بڑے بیٹے تھے اور محسن جعفری کے چھوٹے  
 بھائی کے دوست تھے۔ اور یہ محسن جعفری ہی تھے جن سے انہیں سید پور کی خبریں ملی رہتی تھیں۔ میں ان کا بہت انا  
 جانا تھا وہ۔“

”شائبہ“ محسن جعفری نے ابھی جگہ سے اٹھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”سید اظہار علی شاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”لاہور کا۔“ انتہائی ضبط کی روشنی میں انہوں نے اپنے ہونٹ چاڑھ لے کر تھکے تھکے متاعِ بیت کہا تھا انہیں  
 دیکھ کر وہ جب حویلی سے نکلے تھے تو سید اظہار علی شاہ ان میں مہجرت میں شام میں پہنچے تھے شروع سے ان کا  
 مزاج مختلف تھا۔ وہ سید پور میں کم رہے تھے۔ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سمجھے ہوئے تھے۔ اس میں ان کا  
 بار جب بدلتوں میں پڑتے ہیں تو وہ بچوں سمیت سید پور میں چٹائیں گزارتے اور ان کا زیادہ تر وقت انہیں  
 حویلی کی شاندار لائبریری میں کتابوں کے مطالعے میں گزر جاتا۔ جو کہ وہ زیادہ تر بار پڑھتے تھے مگر سب سے بڑے  
 تھے اور قائم علی شاہ سے عہد میں تقریباً ”بندرہ سولہ سال پڑے تھے اس لیے وہ ان سے زیادہ بے تکلف تھے تاہم  
 وہ ان سے متاثر ضرور تھے گو وہ مختلف نظریات رکھتے تھے لیکن بڑے شاہی یا دانی کے فیصلوں میں انہوں نے کبھی  
 دخل نہیں لیا تھا آج کل یہ سن کر محسن جعفری کے حیدر سے پوچھنا بڑے بے گدھے سید پور میں ہی تھے اور زمینوں  
 کے کام میں دلچسپی لینے لگے تھے اور بہت سی خبریں کو آباد کیا تھا۔ ابراہار علی شاہ کے تعاون سے جنہوں نے ذری  
 پور کو نئی سے بائز کیا تھا۔ سید قائم علی شاہ نے جو چاہا کہ وہ حویلی سے نکل کر ملتان چلے جائیں گے لیکن جب  
 انہوں نے لاہور سے فون کر کے سید اظہار علی شاہ کو ساری صورت حال بتائی تھی تو انہوں نے بھی وہی مشورہ  
 دیا تھا کہ وہ دکان کی بیات بات لے کر حیدر کو ملتان دے دے۔ جہاں تک بچے کی بیات ہے ہر جی میں نہ سہی ان  
 کے پاس لی جائے گا۔ اور سید اظہار علی شاہ کی بیات ہے وہ اتنے باؤں اور دلگرفتہ ہوئے تھے کہ پھر وہاں انہوں  
 نے ان سے رابطہ ہی نہیں کیا۔ انہیں یقین تھا کہ سید اظہار علی شاہ جو اتنے بڑا وائمنڈز میں ضرور ان کی حمایت  
 کریں گے آئو بے اختیار پلو تو ضبط کے فیصلوں کا بند توڑ کر خرابوں پر آمرا آئے تو محسن جعفری نے بازو  
 پھیلا دیا اور اس وقت انہیں کتنی ضرورت تھی کسی سارے کی وہ ان کے گلے کے ضبط کے سارے بند ٹوٹ  
 گئے۔ کئی ہی دیر وہ ان کے گلے کے روئے رہے۔ تب وہ خود کو ان کے جنازے میں جانے سے روک سکے اور  
 محسن جعفری اور ان کے بھائی احسن جعفری کے ساتھ وہ سید پور آ گئے۔

لوہی حویلی کے باہر سینکڑوں لوگ جنازے میں شرکت کے لیے جمع تھے اس پیاس کے سارے ہی گاؤں اٹھ

نے تھے چاروں میں چہرہ چھپا لے وہ بھی اس جہوم میں کمرے آئو سارے تھے۔ پھر جنازہ حویلی سے باہر آیا۔  
 وہ چوڑے کھٹے ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ بھی جہوم میں راستے میں ہاں بٹھ گئے تھے اور جب کھائی کا چور دیکھا۔  
 آئو رہا تے پیچھے سے ڈشوارس کو دیکھا تھا وہ پہلے سے شاہ رخ جو غالباً میسرک کے اسٹوڈنٹ ہوں گے۔ تب شاہ  
 رخ کے ساتھ کمرے آئو سارے تھے۔ ان کا بھی چاہا تھا کہ وہ سارے ہاں میں لے لیں لیکن وہ شاہ رخ کے باکل  
 ساتھ کمرے تھے۔ چاروں میں چھپا لے پھر اور پیچھے ہو گئے تھے۔ پھر جنازہ اٹھایا گیا۔ شاہ رخ ابراہار شاہ  
 سب ہی باری باری جنازے کو کندھا دیے لگے۔ ان کا بھی جی چاہا جس بھائی نے بچپن میں انہیں کندھوں پر بٹھا کر  
 لٹھیا لیا ہے اس کے جنازے کو کبھی کندھا دیں اور جب شاہ رخ نے جنازے کو کندھا دیا تو چند بات سے مغلوب ہو کر  
 وہ بھی بے اختیار آگے بڑھے اور سچی آنکھوں کے ساتھ اس سے کندھا دینے کی درخواست کر بیٹھے تھے۔ شاہ  
 رخ نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا اور کوئی عقیدت مند جان کر خاموشی سے پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن وہ چند قدم  
 سے زیادہ نہ چل سکے تھے۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کا دل بٹ جائے گا۔ اور شاہ رخ کو یاد آ گیا ہاں ایسا ہو تو کیا لیکن  
 تب انہوں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا ہی کب تھا۔ کتنے لوگ تھے جو باری باری آ رہے تھے کندھا  
 دینے۔

”سر گاڑی آگئی ہے۔“

سید شجاع کے کارپوریٹ اندر آگیا تو سید قائم علی شاہ اٹھ کمرے ہوئے۔

”جی تو میں چاہتا کہ جاؤں ابھی جی بھر کر تمہیں دیکھا بھی نہیں۔ لیکن حیدر پشیمان ہوئی۔ میں فون سنتے ہی  
 اسے کچھ بتا کر بغیر چلا آیا تھا۔“

”ابا آپ جا میں اب شاہ رخ کہیں جانے کے نہیں۔ ہم انہیں چھوڑیں گے نہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں  
 بہت بات انہیں لاہور لے کر آؤں گا۔ ماما کو میرے متعلق تفصیل مت بتائیے گا۔ اور نہ ہی شاہ رخ کو کچھ بتائیے  
 گا۔ وہ دوسرے ہو جائے گا۔“

”شجاع نے نیلے نیلے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سید قائم علی شاہ نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی پیشانی چوی۔

”یار خدائے خود انہوں سے پکارتا کیا کہ وہ یہ ضرور ان ہی کی کارستانی ہے۔“

”شجاع زبیر مسکرایا اور شاہ رخ کی نظر جس تک گئیں۔ سید قائم علی شاہ اس سے گلے لے کر کتنی ہی دیر  
 تک بازوؤں میں پیچھے رہے۔“

”میری جان اس چاہو کہ کھونا نام نہاد تو اب بیٹے کے لیے پاکستان میں آگئے ہیں۔ ملتے رہنا۔“

”دیکھیں میں چاہتا ہوں کہ اسے ساروں بعد آپ کو لیا ہے اب کھوئے نہیں دوں گا۔“

”دینا جی جی تو کوئی لاہور بہت دل چاہتا ہے اس سے ملنے کو اور تم کو لے کر بتایا ہی نہیں کہ کیسے ملے تم  
 کیسے چھپاؤ ایک دوسرے کو۔“

”مگر تمہیں تفصیل بتاؤں گا ابھی دیر ہو رہی ہے آپ کو اور انشاء اللہ شاہ رخ اور میں بہت جلد پیچھو کو لے  
 آئیں گے لاہور۔“

”زنی کو بہت دعا دیا کہ میری طرف سے۔“ جاتے جاتے انہوں نے ایک بار پھر اسے گلے لگایا شجاع کی  
 پیشانی چوی اور ان کے جانے کے بعد شاہ رخ شجاع کی طرف متوجہ ہوئے۔

”شجاع شاہ۔“

”شجاع۔“

”شجاع شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ بہت بھلی لگتی تھی۔  
 ”مگر شجاع کہہ سکتے جو شاہ رخ اور میں۔ میں نے تو خود ہی تکلف کی اور اڑھا دی ہے۔ اسے طویل انتظار  
 کے بعد تو ہم ملے ہیں۔ چاہ بھرا جو خود بہت وقت ہے اسے تکلف کی نذر نہیں کیا جاسکتا۔“ شاہ رخ



مکرا لے وہ معذرت کرنا چاہتے تھے اور بتانا چاہتے تھے اس کے ساتھ ہوا ہے وہ اس کے لیے بہت نامور ہیں اگر ان میں بوقت ضرورت ہوا تو۔

”تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو شاہد سن میں وہ جانتا ہوں۔ تمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شعیب علی کا ذہین تھا۔

”مجھے صرف ایک بات کا افسوس ہے کہ جن مجرموں کے پیچھے میں تھا وہ اس حادثے سے فائدہ اٹھا کر نکل گئے۔

اس نے سر ہٹھکے بیٹھے شاہد غ کو دیکھا۔  
”انہوں نے پیچھے سے حملہ کیا تھا اور پہلی ہی لاشی نے سر ہٹھا ڈیا تھا ورنہ میں اتنا بھی کمزور نہیں ہوں۔“

”میں کیا کوسوں شعیب میرے پاس آئے کے لیے لفظ نہیں ہیں۔“  
”مہم کچھ بھی مت کہو۔ مجھے اپنے متعلق بتاؤ۔“ اور شاہد غ نے ہولے ہولے اپنے متعلق بتانے لگے۔

”ماں اپنی بہ سوال تو سمجھا رہی۔“  
نزل نے ہی کا لٹوٹ میں اپنے ارد گرد کتابیں پھیلانے بیٹھی ماہ نور سے کہا تو ماہ نور نے قہقہہ کر کے بچہ نکلتے ہوئے نزل کی طرف دیکھا۔

”ہاں لکھاؤ مجھ کو بھی ہوں کیا سوال ہے۔“  
”آئی۔“ نزل اس کے قریب ہی کاٹ پر بیٹھ گئی۔

”تو کب کا لکھا رہی ہیں؟“  
”کل سے کچھ کے لیے نوٹس بن رہی تھی۔ ذرا نوٹس بنے ہوں تو آسانی رہتی ہے۔“

اس نے کتابیں میٹ کر ایک طرف رکھیں۔  
”آئی یہ پڑھنا تو بہت مشکل کام ہے۔ پہلے پڑھو پھر پڑھاؤ۔“ میں تو ڈاکٹروں کی کیمیاں ڈاکٹروں کی سکول کی۔

”کیوں نہیں پڑھیں کچھ بھی نا ممکن نہیں ہے۔ محنت کرو گی تو ضرور اسے سب کچھ آجائیں گے کہ میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکے۔“

”صحت تو بڑی چیز ہے کہی رہی ہوں اور نمبر بھی شاید آجائیں لیکن میڈیکل کالج کے اخراجات کہاں سے اور کیسے پورے ہوں گے۔“

”تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ وہ دوسری باتوں کے متعلق مت سوچو۔“  
”کیسے نہ سوچوں آئی بھی کبھی تو پڑھنے سے ہی اچاٹ ہو جاتا ہے کہ کیا فائدہ آئی محنت کا اگر میڈیکل کالج میں داخلہ نہ مل سکی تو۔“

”تم میڈیکل کالج میں داخلہ ضرور لو گی انشاء اللہ دیکھو اور دیکھو تمہارے نمبر لو گی تو ظاہر ہے اس کا رتبہ بھی ملے گا اور بیش بہت سوچ رکھا کرو۔“ ماہ نور نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اس کے ساتھ سے کتاب اور کاپی لے کر اسے سوال سمجھانے لگی۔

”ہاں یاد آئی آئی مجھ آپ کے کالج جانے کے بعد غصہ بھائی آئے تھے کہ رہے تھے ماہ نور کو کتنا شام کو تیار رہے وہ آؤں سے واپسی پر آپ کو لے جا رہے تھے۔“

”میرا مامو نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ آیا جاگ رہے ہیں کیا؟“  
”میں جواب دہر گئی تھی تب تو سورہے تھے۔ منوں بھی یوں مشن بڑھے چلا گیا تھا۔ حالانکہ اس نے اب اسے کوئی ضرورت ہی بات تو سمجھا تھی مگر ان میں نے دکان سے کچھ کر دیا کہ رات بھر جاگ رہے ہیں۔“

”کیا اپنی طبیعت بہت خراب تھی۔ مجھے بتائی نہ چلا۔“  
”ہاں مجھے زیادہ خراب نہیں تھی۔ اس خیند میں آری تھی اس لیے جاگتے رہے۔ کچھ کر میں دوسری شادی

تھا۔ کہ رہے تھے رات بھر کی بڑی کے آخری مہرے میں دروس ہے۔“  
”صبح آرام تو۔“ بچہ کچھ میں نے منوں سے کہا ہے کل پچھلی کر کے آیا کو باہر چلے جائے گا۔“

ماہ نور۔ ”وال علی کر کے کا نزل کو بے دلی۔“  
”تمہاری کمرور پڑ روز مجھ سے ایک گھنٹہ بڑھ گیا کرو۔“

”ہاں۔“ ٹھیک ہے۔“ نزل اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”میں صبح کے لیے اپنے کپڑے اسڑی کرنے جا رہی ہوں۔ آپ غصہ بھائی کے ساتھ جا میں گی تو بتا دیں۔ میں آپ کے کپڑے بھی اسڑی کر دیتی ہوں۔“

”تمہیں میرا مامو میں سے پھر ان کی بیوی والی لڑکیاں بھی آجائیں گی۔“  
”آئی انی ان لڑکیوں کو میں پڑھا دیں گی۔“

”تمیں تمیں خود بھی پڑھنا ہو تا ہے بلکہ میں سوچ رہی ہوں کہ جن لڑکیوں کو تمہارے چھاری ہوں ان کو بھی میں پڑھا دوں گی۔“  
”میں اپنی آپ خود بھی پڑھتی ہوں۔ میں بڑے آرام سے پڑھا رہی ہوں۔“

”اچھا۔“  
ماہ نور نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ یہ اچھا ہے کہ ہم سب اپنا اپنا بار خود اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ سب ادنیٰ ماں اور باپ کی تربیت کا اثر ہے۔

”علیہ السلام! تو اُن کو بھی میرے آئے پر۔“ اس نے سوچا۔  
لیکن موبی نہیں بن رہا تھا۔ حالانکہ اس روز علیہ نے کہا تھا کہ کسی روز وہ اپنے نوٹورسٹی ٹیوٹ کو گھر

انوائٹ کر کے اسے بھی حوائے کی ان سے اور اس نے وعدہ بھی کر لیا تھا آئے کا لیکن یہ نہیں کیوں اس روز آئی کا رویہ عجیب سا لگا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے اس نے ایسا کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس روز جب غصہ اسے چھوڑنے آئے گا تو آئی سے اسے روک لیا۔

”تم کہہ رہے ہو غصہ نہیں چھوڑ آئے گا۔“  
”مگر مجھے تو جانتی تھی کہ ایک دوست کی طرف سب ادا کو بھی ذرا پ کر دوں گا۔ ولید رہا ہے۔ شرب ہو گا۔“

”دہنیں عوام شرب میں سے کہا ہے نا ہی چھوڑ آئے گا۔“ چپ آئی کا کچھ تھا ہی سخت یا اسے محسوس ہوا تھا۔

اس سے پہلے تو کبھی آئی نے غصہ کو اس کے ساتھ جانے سے منع نہیں کیا تھا۔ لیکن آج وہ محسوس کر رہی تھی کہ آئی کو اس کا غصہ کے ساتھ آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اور شاید اس لیے وہ اسے منع کر رہی تھی۔ حالانکہ غصہ تو

چیز ہے ہی ان کے ہاں آ رہا تھا اور آئی کے رویے سے تو کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ غصہ کون ان کے ہاں آتا ہے نہ نہیں کر تھی۔ غصہ بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ ہی آ تھا۔ بلکہ بیش جب افضال ماموں آتے اور ان میں اصرار کے گھیرا پڑے تو آئی بھی انتہائی اصرار کر تھی۔ افضال ماموں ان لڑکیوں کے سامنے ہی انہیں کما کرتے تھے۔

”صدیہ یہ کچھ طیبہ خاتون تھاری بہن ہیں اور نصیر خان بھائی۔ اس طرح ڈبل رشہ داری ہے طیبہ تمہاری ہند میں ہے اور پوری اپنی تھی۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ وہ ہنسنے ہوئے کہتی تھیں۔  
”دونوں رشتوں کے تعلق سے طیبہ مجھے بہت چاری ہے۔“

لیکن اب آئی کا ہنسنا دیکھ کر دھکا دھکا سا تھا بلکہ اس نے غور کیا۔ جب سے افضال ماموں امریکہ گئے تھے وہ یہ ایک باری کئی صفا وہ بھی طیبہ کے بچے سے سولہ تھے تب ہاں غصہ کا قاعدہ کے آ تھا۔

”مگر یہ میرا وہ کم ہو گا۔“ وہ سر جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

شاید آٹنی کو خضر سے کوئی کام ہو گا۔ پہلے تو خضر بھائی اسے اور نزل کو چھوڑنے آتے رہتے تھے اور انہوں نے کبھی کبھی نہیں کیا تھا۔ بس ان کے لیے جس حالت ہے افضال ماموں بھی تو کہتے تھے کہ تمہی ہماری یکم مزاج حال نہ ہے۔ انہیں تو ملک کا وزیر کا نظم ہو چکا ہے تھا۔

موصوف ذیل گئی تھی۔ باہر موسم اچھا تھا۔ وادی اپنے تخت پر آکر بیٹھ گئی تھیں اور مول کو قرآن پڑھا رہی تھیں۔ وادی اور نزل جن کے ایک کو سن کر ٹھٹھکیل رہے تھے وہ وادی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”جاگ گئی ہوئی۔“ وادی نے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں وادی میں تو سوئی ہی نہیں تھی۔“

”جناجھ آرام بھی کر لیا کرو اتار کو بھی جاتی رہتی ہو کبھی میرے لیے کبھی باپ کے لیے۔ اس طرح تو تیار پڑ جاؤ گی۔“

”نہیں بھاری وادی ہاں کل نہیں تھوکن گی۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔ وادی نے حیرت اور دکھ سے اسے دیکھا۔

یہ نوکر کمرہ کی کھڑکی سے زار سا کوئی کام کرنا تو دیکھ جاتی تھی۔

وہ دیکھتا تھا کہ کبھی مشکل سے بچن میں جاتی تھی اور طیبہ خاتون جھنجھلا رہی تھی۔

وہ وادی کی بے حد لڑائی میں کچھ دن اور حالات کتنی تبدیل ہو گئے تھے۔ نصیر خان کے ساتھ ہونے والے معاملے نے اسے کتنا سمجھدار بنا دیا تھا۔ کالج سے آتے ہی بچن میں کسی جاتی تھی جاتی تھی کہ ماں پر کام کرنا بوجھ ہے۔ نصیر خان کی تیار وادی پر مگرانی کا کام وہ پوری کوشش کرتی تھی کہ طیبہ خاتون کو زیادہ سے زیادہ آرام دے سکے۔ خیر خود ہی ساری ذمہ داریاں اس نے سنبھال لی تھیں ان کو کس نہ کھڑے نہ دھونا۔ رات کو سب کے لیے پیغام اس کی آواز سے نکلتا۔ کتنا شہت پختہ چھوٹے بس بھائیوں کو ان کی تیار میں مدد دینا اور اب تو اس نے نوکری بھی کر لی تھی۔ نیشن بھی پڑھا رہی تھی اور اگر آتا تھا جان زندہ ہوتے تو یہ دکھ کن آتے ہی کیوں۔

آج پھر انہیں آتا تھا کیا بدست شدت سے لگی تھی۔

نصیر سے تکیا پڑا تھا۔ اس وقت وہ بیٹھ رہا تھا کہ کتنے کتنے میرا بے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا ہے۔ اسے تو میں اعلا تعلیم دلوں گا۔ کتنی اچھی اسے میں نے وادی کی فوٹ کا پیواریاں میں بنائیں تھیں بہت ہیں فوٹ کے پیواریاں ہے تو بڑا فخر ہے گا۔ انہوں نے ہوش سے اسے دیکھا تھا کہ ان کا تقدیر کا تقدیر کا بھی ہو چکا ہے نصیر کے لپائی کیوں جدا ہوتے۔ بس اچانک ہی جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ تیار کیا تک نہیں کہاں جا رہے ہیں۔

”وہ کبھی جلد ہی ہمارے لیے ایک خوشخبری لے کر آئیں گا۔“

”نہیں یہی تو خوشخبری ہے۔“ انہوں نے پوچھا تھا۔

”میں بھی نہیں آکر بیٹاؤں گا۔“ وہ بہت خوش اور مطمئن لگ رہے تھے۔

”تو بھونک لگ جائیں گے شاید ایک ہفتے سے زیادہ سلی میں تھیں معتبر کروں گا۔“

”میرا اب بھی تاجر نہیں ہوں۔“

اور پھر وہ چلے گئے تھے اور جاتے ہوئے زبیر کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ جو ان کے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگی تھی۔

”میں اب بھی تاجر نہیں ہوں۔“

”میں اب بھی تاجر نہیں ہوں۔“

”میں اب بھی تاجر نہیں ہوں۔“

”میں اب بھی تاجر نہیں ہوں۔“

”میں اب بھی تاجر نہیں ہوں۔“

”میں اب بھی تاجر نہیں ہوں۔“

”میں اب بھی تاجر نہیں ہوں۔“

”کچھ نہیں۔“ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”یوں ہی اپنے کٹا جانے والی بی جان کے متعلق سوچ رہی تھی۔ تم جا کر جانے بناؤ۔ نزل کبڑے استری کر رہی ہے۔ اور تمہاری ماں صبح سے شین پر بیٹھی ہے تمہک کی ہو گی۔“

”جی وادی میں جانے میں تیار ہوں۔ آپ کس پاس بیٹھ گئی تھی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میری بی بی بہت سمجھدار ہوئی ہے۔“ سلی بیگم نے بارے میں اسے دیکھا۔

”سمجھدار ہو نہیں گئی بلکہ بیٹھ سے ہی سمجھدار ہوں۔“ وہ بی بی اور بچن کی طرف بل گئی۔ سلی بیگم نے اسے بات دیکھا اور بے اختیار ان کے لبوں سے اس کے لیے دعا نکلی۔

جانے جانے یہ وہ نصیر احمد خان کے کمرے میں آئی تو طیبہ خاتون شین پر کچل کچلی تھیں اور اب کبڑے سمیٹ رہی تھیں۔ وہ عموماً نصیر احمد خان کے کمرے میں سلائی کا کام کرتی تھیں۔ مگر ایک تو انہیں ختمی کا احساس نہ ہو۔

دور اگر کہ ضرورت پڑ جائے تو وہاں سے ہی سمجھدار ہوں۔“ نصیر احمد خان نے کھنگا گئے خاموشی سے طیبہ خاتون کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نصیر احمد خان کے پاس جانے کو کہہ کر طیبہ خاتون کی جانے کے کران کس پاس بیٹھ گئی۔

”ماں آج آپ نے بہت سہرا کر لیا۔“ نصیر احمد خان نے اسے دیکھا۔

”میں یہ دو سوٹ گل ضروری دینے تھے اس لیے۔“

”بس آپ زیادہ سے زیادہ ایک سوٹ دیا کر لیں۔ سر کر رہے تھے وہ اگلے ماہ سے میری تنخواہ پڑھاویں گے۔“

”جی جلدی۔“ نصیر احمد خان کو حیرت ہوئی۔

”میں تو نہیں کام کرتے ہوئے صرف ایک کھانا ہوا ہے۔“

”ہاں۔“ لیکن اس کا خیال ہے کہ چونکہ میں سائنس پڑھ رہی ہوں اس لیے میری تنخواہ زیادہ ہونا چاہیے۔ دراصل ان کے پاس اور کوئی سائنس پڑھ رہی تو نہیں ہے۔ تاہم وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ ذہانت اور لیاقت کی قدر کرتے ہیں۔ اس لیے تفصیل سے بتاؤ۔

”وہ ایک ماہ میں سوچ رہی ہوں کہ اوپر نوٹورٹی سے لی ایئر کرلوں تو اس کے بعد گورنمنٹ جاب مل سکتی ہے۔ گورنمنٹ جاب میں تنخواہ بھی زیادہ ملے گی اور محفوظ بھی ہے۔ حالانکہ کمرہ کی میری محنت سے آسان پہلی ایئر کرنا آسان تھا۔ پھر خرچ ہو جائے۔“

نصیر احمد خان نے کچھ نہیں کہا تو اس نے طیبہ خاتون کے سلسلے ہوئے کبڑے اور سالانہ سینا اور نصیر احمد خان لپٹا لیا بیٹھ گئی۔

”آپ اب پریشان لگ رہے ہیں کیا بات ہے۔“

”نہیں تو کیا میں کب پریشان ہوں۔“ انہوں نے مسکرائے کی کوشش کی۔

”نہیں اب آپ پریشان ہیں۔ پریشان مت ہو کر۔ وادی بھی ہیں اللہ پر یقین اور بھروسہ ہو تو سارے کام حل ہو جاتے ہیں۔“

”ہاں۔“ کچھ کچھ ٹھیک ہے۔ اس خدا نے بزرگ و بزرگ کا شکر ہے کہ جس نے صالح کو نیک اولاد دی ہے۔ نصیر احمد خان نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

”اچھا اب آپ جانے نہیں۔ تل ہو رہی ہے شاید نیشن والی لڑائیاں لگی ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور ایں آپ جانے کی کراہ کر آئیں۔ میں بچن کا کام دیکھ لوں گی۔“ سلی بیگم نے انہوں کی۔ آپ نے کمرہ کو آرام دیا۔

”نہیں۔“

”نہیں۔“

”نہیں۔“

”نہیں۔“

”نہیں۔“

"علینہ راض ہو جائے گی تم پہلی جاؤ۔ روانہ ہانے لگی میں دوایاں لوں گی ویسے خطر کیا نہیں ابھی تک سنا ہی ہے آئے کو نہ رہا تھا۔"

"گولی کا دم پر لگایا ہو گا۔ لوں بھی مجھے نہیں جانا۔ وہ طہر خاتون کی بات کا جواب دے کر باہر نکل آئی۔ خضر برآمدے میں سداوی کیسیاں لکوان کی خریدت پورہ رہا تھا۔ مزار اس کی طرف دیکھا۔

"تم تیار نہیں ہو گئیں مگر خیز کیسیاں لگ رہی ہیں۔ چلو چلو۔ ایسا کا مود خراب ہو گا۔"

"مگر خضر بھائی میں تو میں جاری آپ کے ساتھ اور آپ کیسے ہیں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" خضر نے فوراً سے دیکھا۔

"کچھ بھی بھی لگ رہی ہو۔"

"نہیں آپ بھیس نہ۔" ہادی کے تحت رہ گئی ایک اور خضر سامنے بڑی کری پر بیٹھا گیا۔

"اور خضر میں سب ہیں۔ سداوی جان کا فون کیا۔"

"سب ہادی میں ابو سے بھی بات ہوئی رہتی ہے لیکن تم نے ابھی کیا کہا تھا کہ تم نہیں جاری ہو۔"

"ہاں میں نہیں جاری۔ ابھی لڑکیاں پر مٹنے بھی نہیں آئیں۔ آج بچہ میری گردی ہے انہوں نے کھانا دانا بھی بیٹا ہے۔ اہاں آج سارا دن سلائی کرتی رہی ہیں اور دو کا میچ بھی ہے۔" اس نے سوچنا تھا۔

"اور اور اپنا بچہ گھر کرے۔" خضر نے کہا۔

"۳ میں میں مٹاؤں گی بلکہ اسکول سے عید بھی دوسری آجواں کیوں بھی ہانڈے ہے نہ۔"

"وادی جان آپ کہاں جاری ہیں۔" ہادی نے سداوی کو جانتے دیکھ کر پوچھا۔

"بیٹا دوسروں کی اور کچھ دیر صبر کیسیاں بیچوں گی۔"

"ہاں اب جاگ گئے تھے اور مت واس انگ رہے تھے۔ آپ سے بائیں کر کے ان کا موڑ اچھا ہو جائے گا۔"

"انکل سوچتے بہت ہیں۔" وادی کے جانے کے بعد خضر نے کہا۔

"ہاں جب سے میں نے جاب کی ہے۔ وہ بہت چپ رہتے گئے ہیں بسکے کی طرح ہٹتے ہوئے نہیں ہیں۔"

"ٹائیڈ سوچتے ہو کہ اگر ان کے ساتھ حاشیہ نہ تو آج نہیں جاب نہ رہا ہوتا۔" خضر نے خیال ظاہر کیا۔

"سوچنے کے لیے اور بھی بہت کچھ ہے ان کیسیاں ایک چٹا بھرا ہروم شخص بستر پر ناگاہ و کر رہا ہے تو نہ تو ان کیسے کے لیے بوجھ ہو جاتی ہو کی جاب اس کے بہت سارے خواب بھی ہوں۔" جی نہیں آیا کیا سوچتے ہیں خضر بھائی بن گئے عید کے لیے انشاء اللہ باکے سارے خواب ضرور پورے کروں گی۔"

"بابا۔" خضر نے ایک گولی نگراں ڈالی۔

"شام کے کھینے سے اندر میرے میں وادی کے تحت رہی بھی تھی بھی ویسے کی طرح بہت اپنی ہی گئی

"میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں باہمی کیسیاں کسی مقام پر تھکنے لگو تو مجھے لکھا لیتا اس یقین کے ساتھ کہ تمہاری ایک آواز بھی مجھے جہاں تیس میں بھی ہو وہاں سے بچھ لائے گی میں تمہاری خودداری اور انا کو بھروسہ نہیں کرنا چاہتا تھا تو نہ انکل کی طرح سیرا جی جی نہیں چاہتا کہ تم جاب کو لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارا جاب کرنا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ تمہارے اندر اعتماد یقین دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے ہادی نور۔ بچپن سے تم سب میرے بہت قریب رہے ہو۔ مجھے یوش لگا کہ تمہارے سامنے کسی میرے مسائل ہیں اور تمہاری خوشنہایت؟ خوشحال۔ کبھی کوئی پر اہم ہو تو مجھ سے کہتے ہوئے بھجکتا تھا۔

"مجھے معلوم ہے اور ہر شکل میں تم آپ ہی کی طرف تو آتے ہیں۔ آپ ہوں یا افسانہ مایوں آپ کے سوا ہمارا ہے ہی کوں۔" ہادی نے کسی قدر حیرت سے خضر کو دیکھا۔

"میں نے سوچا پورا وہاں کی راہوں۔" خضر سر کیا۔

"آپ نے ضرورت کیوں خرچ کی۔" ہادی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم کچھ اجنبی اجنبی گئے تھے لیکن وہاں ہوں اس لیے۔" سب ہی زل کرے سے باہر نکلی اور خضر کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔

"تم آگے خضر بھائی۔"

"ہاں لیکن یہ خاتون جانے کے لیے تیار ہی نہیں اور میں سوچ رہا ہوں مجھے اپنا کے غصے سے کون بچائے گا۔"

"ایسا بند آپ کے اصول پر عمل کرنا چاہیے۔" خضر نے کہا۔

"اور اہاں اسٹور بھائی کی کئی چیز کوئی فون کوئی خط۔" اسے اچھا سی اسٹر کا خیال آیا تھا۔

"پھر لوگوں میں جاگ رہا بھی پھر ہوئے۔" ہادی نے زل کر کے اسٹور سے نکلا۔

"میں وہ سب سے مختلف ہیں۔ بلکہ وہاں سب پھر لیں ہیں۔" ہادی نے پوچھا۔

"اس کی کا فون آنا رہتا ہے۔" اپنا تیار ہی کر کے شاید وہاں تک پھر لے گا ان کا پانی کا اور وہاں ایک خبر اور حسہ پوچھ بھی آئی ہیں پاکستان لاہور میں یہ سبیل ہوئے ہیں وہاں لوگ۔"

"وہ خاندان کی کوئی ڈاکٹر ہیں اور اب ان کے بعد میں ڈاکٹر بنوں گی اور میں سر جری میں اسپیشلائز کروں گی اور ایسا ملک کی مشہور سرجن بنوں گی مشہور سرجن ڈاکٹر زل نصیر خان۔" اس کی آنکھوں میں موجود اس نے خوابوں کا رنگ اس کے چہرے کو بھی حرکت کر رہا تھا۔

"اور جی میں مشہور سرجن ڈاکٹر زل نصیر خان سے ملنے کے لیے ناگہان پڑے گا جب بھی میں اور ہادی نور ملے۔" خضر نے جواب دے گا ڈاکٹر صاحب مصروف ہیں۔"

"جی نہیں آپ وہ فون کے لیے ہمارے دروازے پر بیٹھ کھلے ہیں گے اور یہ آپ آئی کے ساتھ ہی کیوں آئیں گے۔" زل نے خضر کو بھی اور شرم نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں اس کے ساتھ ہی کیوں آئی گلیاں آسکتا ہوں۔"

"میں اور ہادی نور۔" اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔ اور دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سایہ اہوا۔ بے اختیار ی میں اپنی بات سے اندر اپنا چل چلا گئی۔

"جی کیا کیا میں نے۔" میں اور ہادی نور کوں سا جہ ہے۔ کوں سا احساس ہے جو اب تک نہیں تھا اور اب اچھا سی ہادی نور نے کہا۔

"اس نے خود سے پوچھا۔

"اور اگر ایسا ہے بھی تو اس میں پرانی کیا ہے ہادی نور ایک عمل لڑی ہے خوب صورت خوب بہت۔" ایک لاش مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھو لیا۔

"میں یہ ہر موقع پر ہادی نور کو سپورٹ کرنا آ رہا تھا۔ ایک بار جب ان کے ہاں دعوت تھی تو پھر بیٹھتے سے گھاس نکالتے ہوئے ہادی نور کا ہاتھ گھسنے کا۔ ہادی نور نے ہتھی ڈانٹ دیا۔

"نہیں کر کرٹ کی تھی۔ اور اس نے الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ ہادی نور کا رنگ بالکل سفید رہ گیا تھا۔ اس نے لڑا۔" ہادی نور نے بیٹھتے سے گھاس نکالتے ہوئے ہادی نور کا ہاتھ گھسنے کا۔ ہادی نور نے ہتھی ڈانٹ دیا۔

"نہیں بیٹھتے مجھ سے ٹوٹ گئی ہے۔"

"نہیں اسکول کے کسی کشف میں جانا ہو۔ انکل مصروف ہے تو وہ فوراً ہی اپنی خدمات پیش کر دیتا۔"

"نہیں بیٹھتے انکل ہادی نور کشف لکھ کر لے گئے ہیں اس کے کوں گا۔"

"ایسا بارہا ہادی نور میں سوں سے گریزی کی تو ہادی نور سے زیادہ خودی اور تھا۔ جالا کہ وہ اس سے بڑا تھا۔ سب نے اپنی اپنی ڈاکٹر تھا کہ وہ بڑی بڑی کر ڈوڑا ہے۔" حالانکہ وہ خون دیکھ کر تو نہیں ڈرا تھا۔ وہ تو ہادی نور کی اس کے اس کے ہادی نور تھا اور اس کی ہتھی چھوٹی چھوٹی تھیں۔ جب ہادی نور کا بچپن بیت گیا تھا جب وہ ان کے ہم قدم رکھ رہی تھی تب بھی وہ اپنی چھوٹی بڑی بات سے یہ شہر کرتی تھی۔ گویا وہ جذبہ جواب اس کے دل میں رہا تھا۔ اس کی بیٹیاں بچپن میں ہی ان کے دل میں رکھ دی گئی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ کمری ہو گئی۔



اس لیے تو حرام قرار دیا کہ اور نہ تو لوگ معصی باتوں پر زندگی ختم کر دیتے۔ صحابہ دراصل تاامیدی اور سبے یقینی ہے خدا پر بھروسہ اور یقین ہونا سارے کام سہل ہو جاتے ہیں۔ امید کا ایک بڑا پیشہ آدمی کے اندر جتا رہتا ہے اور امید کا بھی بڑا زندہ رہنے کا حوصلہ اور صہاب کو دراست کرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ پورا بچھ جائے تو زندگی کرنے کا حوصلہ دم توڑتا ہے۔ ساری بات یہ تھی کہ تم نے امید کا دیا اپنے اندر بٹھائی نہیں دیا اور یوں ہو کر زندگی ختم کرنے کی کوشش کر بیٹھیں۔

سمن جوت سے منہ کھولے انھم کی باتیں سن رہی تھی کہ سمن کو تم جی اس کی اور میری باتوں پر مسکراتی رہتی تھی۔ ابھی تو کچھ وہ کہہ رہی تھی کہ سمن کے دل کو چھو ہا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ انھم جی اس طرح کی باتیں کرتے تھے۔

”کسی میرے ساتھ وعدہ کر لیا کہ امید کیا دیا اپنے اندر نہیں چلائے رکھوں گی۔ کبھی بچنے نہیں دوں گی۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی تاامیدی نہ کرے گا۔ سمن نے یاد رکھا کہ تاامیدی ہونا ہے۔ جسے خدا پر بھروسہ اور یقین نہیں ہو گیا۔“

”تھی کیا آپ کے اندر بھی امید کا یہ دیا جا رہا ہے کیا ابھی بھی آپ کو امید ہے کہ کسی روز ڈاکٹرین کیس کی۔ آپ ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں۔“ سمن کو شروع سے ہی بحث کی عادت تھی۔ انھم مسکرا دی۔

”دیکھیں۔“ سمن نے کچھ کہا تھا کہ انھم نے اس کی بات نہ کھائی۔

”میری بات سن لو۔“ ان کا کالج جاؤ گی تو کل ادا کر کے لے لے بھی راستہ کھل جائے گا۔

”کیا سوچنے لگی ہو۔“ انھم نے چارے پوچھا۔

”تھی شاید میں اب بھی نہ پڑھ سکوں۔ میرے اندر سے جذبہ ختم ہو گیا ہے۔“ اس نے اپنی کیفیت بتائی۔

”یہ واقعی کیفیت ہے سونے۔ اس حادثے کا اثر ہے۔ جب کالج جانا شروع کر دی تو خود بخود یہ کیفیت ختم ہو جائے گی۔ جو لوگ علم حاصل کرتا چاہتے ہیں۔ علم سے محبت کرتے ہیں وہ زیادہ عرصہ تک خود کو اس سے دور نہیں کر سکتے۔“ انھم نے سمجھایا۔

”چلو اب اٹھو ایک ایک کچھ چائے ہو جائے۔“

”ہی جان کہاں ہیں۔“ سمن نے پوچھا۔

”میں نے کمرے میں ہیں۔“ قرآن پاک پڑھ رہی ہیں۔“

”ان کی طبیعت کیسی ہے اب۔“

”تھک رہی۔“ انھم نے کڑے کڑے ہوئے لہجے میں کہا تو سمن بھی کڑی ہو گئی۔ ابھی تک غصہ محسوس ہو رہی تھی اس نے قدم اٹھا یا تو اسے لگا جیسے ہاتھوں میں ہلکی کر لڑ رہی۔

”اسنی بھائی نے کیا سب کے ساتھ ناشہ کیا۔“ اس نے انھم کے ساتھ چلنے ہوئے پوچھا۔

”نہیں جیسرین یہ ناشہ نہیں کرتے۔ رمضان نے چائے ان کے کمرے میں پھنچا دی تھی۔“

”کیا کیا اسنی بھائی کی مجھ سے خفا ہوئے ہیں۔“

”کیوں وہ بھلا کیوں خفا ہوئے۔“

”میری اس حرکت پر۔“ سمن نے دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کی۔

”نہیں خفا تو نہیں لیکن تمہارے لیے ہوشیارانہ بات تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ اسنی بھائی ہم سے دور رہے ہیں تو شاید انہیں ہم سے محبت نہیں ہے۔ لیکن ہمیں کہہ کر سونے تو وہ دونوں باہر سے بلے تک میں اور ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔“ انھم بچن کے پاس رہی۔

”رمضان دوپ کچھ چائے بنا دو سمن کی۔“

”دوپ آپ کے لیے۔“ حسب عادت اس نے پوچھا۔

”نہیں اب کسی کے لیے۔“

اس نے صاف سے ہاتھ پوچھتے ہوئے بچن سے بار کھڑی سوئی کھلا۔

”سولی بیلی آپ اب بالکل ٹھیک ہیں نا۔“ سمن نے سہلادیا۔

”آپ کو دیکھتے ہو کیا تھا۔ مجھے تو کوئی ناہی نہیں تھا۔ وہ سمن نے دعا کی تھی آپ کے لیے۔“

”بھلا کھیر رمضان اور مجھے کیا ہوا تھا۔ کمال ہے تمہیں سمن کی نے نہیں بتایا۔“

”ہی تم نے سمن کو سنی لے جایا ہو۔“ نیک صاحب نے تو ڈانٹ دیا۔ کئی بیلی کچھ بولی ہی نہ تھیں اور بھی صاحب تو بے سنی ایسے گھور کر دیکھا جسے کیا ہی کھا جائیں گے۔

”راہل وہ سب پریشان تھے میری وجہ سے اور مجھے بھاری شادی کچھ نہیں ہوئی تھی۔ اصل میں۔“ سمن کی انھوں میں شرارت سے بھنڈو کے اندر اس نے نواز آہستہ کرلی۔

”وہ دیکھو والا بھوت تھا کیا غلطی سے۔“ وہ صوفیہ تو وہ جیسے ہی رہا تھا لیکن۔“

”نہی۔ خدا نہ کرے۔“ اس نے کانوں کا ہاتھ کر کے۔

”کئی بیلی تو اپنا بہت مزاح مذاق بھی کرتی رہتی ہیں۔“ وہ ہولے سے بڑبڑایا۔

”بھائی رمضان بھی تمہاری لیتے ہو کبھی بیلی ایک بار فیصلہ کر لیا کیا کرنا ہے۔“ سمن نے اس کی طرف دیکھا۔

”تھک رہی صرف عزت دیتا ہے اور وہ دونوں لفٹوں سے یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اور جہاں میں بیلے کام کرتا تھا وہاں بیلی کتنا شکاری باڈیوں کو اڈھار کیا تو انھم بیلی نے کہا ابھی تک مارا کہ تو بس بھر بھر بھی کیا کر رہو جاتی ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔

”اچھا سنا اب چائے بنا کر لاؤ ناٹ۔“ سمن مسکراتی تھی انھم کو اڈھار اطمینان ہوا پھر وہ دونوں راکے میں آکر بیٹھ گئیں چھٹی ہوئی تھیں اور ابھی ہلکی دھوپ راکے میں آ رہی تھی۔

”سونے تم کیا مضامین رکھو گی۔“

”تا سمن یہ میں نے انکی سوچا نہیں ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ مجھے ڈاکٹر نہیں بننا۔“

”خبر سو تمہارے استے اچھے نہیں۔ تم تو آسانی سے ڈاکٹر بن سکتی ہو۔“

”ہاں شاید لیکن مجھے تو ڈاکٹر بننے سے دلچسپی ہے اور نہ تجربے سے۔“ راصل میں نے کچھ بننے کے متعلق ابھی دھماکی سے تھا ابھی تو سمن صرف یہ سوچتی تھی کہ مجھے بڑے بڑے انکے پڑھنا ہے۔

”یہ تمہیں کہاں بھی ہوا ابھی بات ہے۔“

”سب کچھ بتاؤ پری میڈیکل پڑی یا کچھ نہ گنگ۔“

”نہیں Maths تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔“

”پہچان لکھو رہا ہوں ڈاکٹرین کو غریبوں کو لونڈا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے شہی ابھی مجھے ڈاکٹر بننے سے گے۔ ممکن ہے ایف ایس سی کے بعد مزید نہ پڑھنے دیں۔“

”سمن! تو سب کچھ ہے لیکن سسٹرن ڈیپٹ امید قائم است اور اگر ابھی نے منع کر دیا تو کچھ اولیوم فائیو۔“

”انھم نے تینبھی لفٹوں سے اسے دیکھا تو اس نے فوراً زبان داخون سے نکالی اور فارم سمن کی طرف

”خاکہ کرو۔“

”اُہی کرو۔“ سمن سستی سے ہاتھ گودیں دھرے بیٹھی تھی۔

”تو ایسا کاف کے فارم پر بھی مجھ سے دستخط کرواؤ گی۔“

”اے بیلیوں بھی بیٹیاں اور بیٹوں کی زندگیوں کے فیصلے ابھی ہی کیا کرتے ہیں۔ ان کی باپ کی کوئی مرضی کب

”لے لے ان کی زندگی نہ لے۔“

”سوئی“ ۴۴ نمبر نے پارے اس کی طرف دیکھا۔

”بھوکھی قوت ہے۔“

”میں اس گھر میں بغاوت کے جرم اذبحہ رہا ہوں۔ آئی کوئی انقلاب آنے والا ہے۔ لگتا ہے کل الٹی کا سولہ کردہ ہو گیا ہے کچھ۔“ اس نے ناک سکڑی۔

”مخاض میں انقلاب کی آواز ہے۔“

”کس چیز کی آواز ہے؟“

اسفر تیار ہو کر اس نے کمرے سے نکلے تھے۔ سب کے کمروں کے دروازے پر آدے کے اس حصے میں کھلتے تھے۔ جہاں ڈالٹنگ ٹیبل اور گرہاں پڑی تھیں۔

”انقلاب کی بجائی جان۔ میری آنکھیں آنے والے انقلاب کی سرخ آندھی تیزی سے اوپر بڑھتی دیکھ رہی ہیں۔ ظہن ابلی کی ذہنی شہ کے خلاف کوڑا اٹھائی جائے تو ای ہے۔“

”نفسی کمزوری کے ذرا میں ہیں کیوں میں حصہ لیتے مسافر سزا ہے۔“

”ہائے۔“ مشر نے ایک گہری سانس لی۔

”اس کا اعظم زہن چھوڑا جس کے دوا دروں میں انارکلی کی طرف۔“

”مذاق میں یار ایکٹنگ کچھ کر لیتے ہو۔“

”میرے ساتھ ساتھ کاجی کی خیال تھا اور ایک بار انہوں نے مجھے اسکول کے ایک ڈارے میں رکھا تھا اعلیٰ کو

فرہوئی تو انہوں نے میرے اسکول جا کر میز اسٹریٹ کرنا۔“

”تم معزز لوگ ہیں بھائی میں ہیں کہ آپ ہمارے بچوں سے بھانڈو والا کام لیں۔“

”وہ ہے۔“ مشر نے بے اختیار روٹ سکیڑے اور پھر کمرے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”بھاری کرنا یہی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ کمرے میں مکراری۔

”گڈ۔“

”آپ نہیں جا رہے تھے بھائی۔“ ۴۴ نمبر نے پوچھا۔

”ہاں ہاں جا رہا تھا ایک دوست سے ملنا ہے۔ لاپٹی چلے گئے کیا؟“

”ہاں لیکن انہوں نے کہا تھا کہ اگر آپ کپاس فرسٹ ہو تو ایک چکر دوکان کا لہجے گا۔“

”اس سفر کو ریزت ہوئی۔“

اس نے پہلے تو میاں صلاح الدین سے اس طرح کی کجی کو بات نہیں کی تھی کتنا عرصہ ہو گیا تھا انہیں آس

ہوئے انہوں نے بھی انہیں دوکان کے آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ بلکہ جب وہ شیخوپورہ جاتے تھے بھی میٹر کو

ہی دوکان پر جانے اور دیکھ بھال کرنے کے لیے کہتے تھے۔ گوہر دوکانوں پر ملازم موجود تھے پھر بھی کسی اپنے کو

گھرائی تو کرنا ہی چاہیے۔ یہ ان کا خیال تھا۔ ایک بار میاں صلاح الدین کو دیکھتی جانا تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں

اور میٹر کو بخار تھا۔ تب بھی انہوں نے اس سے ہی کہا تھا کہ ذرا طبیعت کھلے تو مت کر کے دوکانوں پر چکر لگا

والا۔ تاکہ اسفر کا خیال تھا کہ وہ چلا جائے گا اور اسے افسوس ہوا تھا کہ لاپٹی اس پر اعتبار نہیں کرتے اور اسے غیر

بچتے ہیں۔“

”ہاں شاید کوئی کام ہو۔“ ۴۴ نمبر نے انہیں سوچتے دیکھ کر کہا۔

”نہیں کچھ سے بھلا انہیں کیا کام ہو سکتا ہے۔ مجھ سے تو وہ بات بھی نہیں کرتے۔ وہ بیڑا ہے۔“

”لیکن یہی چاہئے۔“ مضافات نے چائے ٹیبل پر رکھی۔

”میں نے تو تیار دیکھ چاہئے بیانی ہے اور میں خیر سے چارے ہیں۔“

”تو وہ تو تم نے زیادہ ہی دم کیا ہو گا۔“ ۴۴ نمبر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تو وہی میں ہیٹ لی چائے والی بھر کے چائے کم کرنا ہوں۔“

”بھوکھ اور بے لگتے آپ نہیں کے نانی بھائی۔“ ۴۴ نمبر نے اسفر کی طرف دیکھا۔

”چائے اور کافی سے تو میں نے بھی انکار ہی نہیں کیا۔ خیر کتا تھا اس کے آگے دیکھ کر وہ تب بھی بیٹ نہیں

بھرتا اس کا چائے سے۔“ اسفر کرسی پیچھے گھسے کمرے کی تیار سے خود بخود ہی گھٹک کی دیوار میں ڈھاری

تھیں۔“

”وہ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ آپ کا کراچی سے خط آیا ہوا ہے۔ شاید بھائی بھائی کا ہی ہو گا سوئی کی میٹیں میں

آپ کو بتا دیا ہی نہیں بابا۔ یہ باسٹل میں بھی تب آتا تھا میں نے اپنے کمرے میں رکھ دیا تھا۔“ بھرتے ٹیبل سے

فارم اٹھائے اور کمرے میں سے خط لے کر واپس آیا۔ اسفر نے خط لے لیا۔ ان کی توقع کے مطابق یہ خط علیحدہ کا

ہی تھا اس کی راز نشکدہ پہنچاتے تھے۔ یہ اختیار مسٹر اسٹریٹ نے ان کے لیوں کو چھوڑا اور انہوں نے خط انہیں

ڈال لیا۔ کچھ بھی وہ علیحدہ کے متعلق سوچ کر مت جبران ہوتے تھے۔ جب کہ کراچی میں تھے تو اس نے بھی کوئی

ایک بات نہ بھی کی تھی جس سے انہیں خیال آتا کہ وہ ان کے لیے اسٹیل ٹیبل میں ایک خاص جذبہ رکھتی ہے۔ لیوں تو

ایک ساتھ چلنے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ خیر علیحدہ و لید اسٹیل اور وہ خود ایک

دوسرے سے بے حد بے گھٹک تھے۔ علیحدہ سین تھی دنگل تھی اور کمرے میں بھی ٹھیک کے دل کی دھڑکن ہو سکتی

تھی۔ جب کہ کراچی میں تھے تو انہوں نے بھی اس کے لیے اسٹیل ٹیبل میں کوئی اور جذبہ محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن

جب یہاں آئے تو کچھ دن بعد ہی علیحدہ کا خط ملا تو کچھ دیر کو ان سے نہ گئے۔ اس نے لکھا تھا۔

”میں سب آپ کو بہت مس کرتے ہیں اسفر آپ کیل چلے گئے۔“ اور علیحدہ کا خط ملنے ہی انہوں نے فون کیا

تھا اور اتفاق سے علیحدہ ہی اٹھایا تھا۔

”کیا تم بھی مجھے مس کرتی ہو ابائی۔“

”ہاں بہت زیادہ اسفر مجھے تو یوں لگتا ہے جیسا میرا کچھ کچھ گیا ہے۔ پھر اگر خالی خالی لگتا ہے۔“

”میں۔“ میں بھی نہیں بہت مس کرتا ہوں ابائی۔“ وہ ایک بے اختیار رسالہ تھا جب وہ اظہار کر بیٹھے تھے۔

علیحدہ کو کچھ خاموشی ہی ہوئی تھی۔ پھر اس نے آگے سے کہا تھا۔

”جانتیں یہ کیا ہے۔ لیکن میں آپ کو بہت سوچنے لگی ہوں۔ بہت زیادہ۔ آپ جب یہاں تھے تو میں نے اس

طرح بھی نہیں سوچا تھا اسفر۔“ اور شاید وہ کمالی جان کے مزاج کی وجہ سے بھی بھی علیحدہ کے متعلق اس طرح نہ

سوچتے لیکن یہ علیحدہ تھی جس نے ان کے دل میں بھی چھو جائے کہ کچھ جاتا تھا انہیں لیے لیے خط لکھتی تھی۔ کچھ لفظ

تینوں کی پھوار میں ڈوبا ہوا اور ہرگز نادان علیحدہ کے لیے ان کے دل میں موجود چیزوں کو گہرائی بخش رہا تھا انہیں

تھوڑا سا تھا۔ اور علیحدہ کیل دوسرے کے لیے ناگزیر ہوا تھا۔ اس کے لیے خیر اور خیر سے اور پناہ مل۔

”اور شاید وہ ایک دوسرے کے لیے تحقیق کیے گئے ہیں۔“ ایک بار علیحدہ نے لکھا تھا۔ کچھ بھی وہ خوفزدہ سی

ہو جاتی تھی۔

”جتنی آپ امریکہ جا کر مجھے بھلا دیں گے۔“

”یہ نامکمل ہے۔ دنیا کی ساری خوب صورتیاں اور رنگینیاں محبت کا کچھ نہیں لگاؤ سکتیں۔ محبت اتنی کمزور

نہیں ہوتی یا میں نے تم سے محبت کی ہے لہذا اور یہ محبت یوں ہی میری زندگی سے آخری سے تک ایسی ہی رہے

گی۔“ اور بتائیں ایاتے نے کیا لکھا ہے۔ جب بھی اس کا خط آتا تھا وہ اس خط کو پچاس بار پڑھتے تھے۔ پھر بھی

یہی نہ ہوتی تھی۔ اسے خط لکھنے کا قریب آتا تھا۔ لفظ پڑھتے سے خیر سے آشنا تھی۔ لفظوں کی شیرازی۔

وہ اسے کہتے ”کہاں کہاں سے لفظ و حوزہ کر لائی ہو۔ علیحدہ۔ میں تو ان کے کمرے میں کجا جاتا ہوں۔“ وہ اس کا

۱۰ ملنے ہی فون کرتے تھے۔

انہیں خدا کا لکھا مناسب نہ لگتا تھا اور انہوں نے اس کی وضاحت علیحدہ سے بھی کر دی تھی۔  
 ”تو کچھ علینہ میں خط لکھتے ہوئے خود کو روک نہ پاؤں گا۔ ہر جذبہ عیاں کرنا جاؤں گا۔ وہ سب جو تمہارے  
 حوالے سے میرے دل میں آتا ہے سچی ہے قزاقیاں اور سب جیسا کہ لکھ دوں گا حرف اور اگر کسی  
 نے بڑھ لیا تو کیا نہایتی ہمارے اور اجازت مجھے اپنی جان سے کیا زیادہ عزیز ہے۔“

”تمہاری جانے لیں نا۔ کیا۔ چنے لگے آپ۔“ اس قسم نے جانے کا کپ ان کی طرف بھرایا اور پھر چپے کھڑے  
 رمضان کی طرف دیکھا۔

”ہی جان سے بھی پوچھ لو۔ کیا خیران کا بھی بی جاہر ہوئے کو۔“

”وہ تو اپنے پیسے سے انکار نہیں کریں گی لیکن پسلی ان کا بیانی ہے اور جانے کو گرم ہوتی ہے۔“

”یہ خوب سے بڑا ڈاکٹر ہے۔“ بشیر اس کی طرف دیکھ کر خفا۔ تب ہی فون کی بیل فون کی انجم کے نزدیک  
 تھا اس نے ریسیور اٹھایا۔

”جی ہاں کی آپ۔“

”مجل تو چلاں تو۔“ سمیش نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو اسے سرگردا دیے۔

”میرا لو پچیس تو کہیں چلا گیا ہے۔“

اس نے آہستہ سے کہا تو اچھے سے سر ہلا دیا وہ فون کی طرف متوجہ تھی۔

”جی سستی ابائی میں بتا دی ہوا می جان لو ابھی کمرے میں ہی ہیں۔“

”شام کو کتنے بج گئے۔“

”جی تیار رہیں گے۔“ اس میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کہاں جاتا ہے۔“ جیسے ہی اس نے ریسیور رکھا اس نے پوچھا۔ انجم نے پیشانی سے پیسے کے قطرے صاف  
 کیے۔

”وہ ابائی کہہ رہے ہیں شام کو شیخو ہو جاتا ہے سب تیار ہیں۔“

”شیخو پورہ مگر کون۔“ سمن نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ طانی عبدالستار ہیں نا ابائی کہتے ہیں ان کی بیٹی سے بات ملے کوئی ہے ابائی نے شبی کی۔“

”نہیں۔“ سمن نے بے اختیار ہنسی کی طرف دیکھا جو ششدر بیٹھا ہوا تھا۔

”انہوں نے کہا ہے آج شام ہی انکو بھی پرانا دینی ہے۔ ان کی بات ہو گئی ہے حاجی صاحب سے متعلق کا  
 فکشن بعد میں ہو نا رہے گا۔ آج صرف انکو بھی پرانا کرنا ہی کر دینی ہے۔“

”لیکن یہ ظلم ہے زیادتی ہے۔“ انجم کو ہنسی کی آواز بہت دور سے آئی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اٹھی اور ہنسی  
 کر کے کہتیے کھڑے ہوئے وہ نے اپنے ہاتھ اس کے بازوؤں پر رکھ کر کہنے لگے۔ ”جی ہر دہ۔“

اور اسے خیران سے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک ہی سمن نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا  
 لیا اور روئے ہوئے غور سے انجم کے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔



”شادو ابھی تک نہیں آیا۔“ سیدہ اساتھ نے کوئی اٹھا رہیوں بار نہنت خاطر سے پوچھا تو سیدہ اساتھ نے حد  
 جران ہو کر نہنت خاطر کی طرف دیکھا۔

”پچھو کیا بات ہے آپ اپنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔“ شاہ رخ بھائی کو بتا کر گئے تھے کہ کسی بے حد ضروری  
 کام سے شہر جا رہے ہیں۔

”ہاں بتایا تو تھا کہ میں نہیں کیوں بل گھبرا رہا ہے۔“ سیدہ اساتھ کے بیٹے پر ہی اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

”وہ ضرور وہ بھی تو ساتھ لے کر نہیں گیا تھا شاید اس لیے۔“ انہوں نے ممانہ بتایا۔ سیدہ اساتھ کو کیا باتیں کہ

دل کو کیا ہے جتنی بھی ہے۔ یہ کیوں اتنی مضطرب ہیں رات ہی تو شاہ رخ نے انہیں بتایا تھا کہ کمالے اور فضل واو  
 نے اسے بتایا ہے کہ انہوں نے شاہ رخ کو مارا ہے لیکن زیادہ نہیں۔ مگر ان کے دل کو تو کچھ لگے ہوئے تھے پتا نہیں  
 کتنا مارا ہو گا انہوں نے اسے پتا نہیں کیا حالت ہو گی اس کی پتا نہیں زیادہ نہیں ہو گا یا نہیں پھر ان کی آنکھوں کے  
 سامنے حوٹلی کا کشادہ منہ۔ آجبا اور اس کے درمیان بڑی چالو پالی پر آنکھیں موندے لیٹا عباس مرزا جس کے کپاٹن  
 چارپائی سے نیچے لنگر ہے بے شمار پھر حوٹلی کے گھٹ سے باہر نکلی امیر نہیں۔

پوری رات انہوں نے بیٹھے بیٹھے گزار دی تھی حالانکہ شاہ رخ نے انہیں بتا دی تھی اور کہا تھا کہ صبح  
 ہوتے ہی وہ صبح کو شجاع کی خیر لے آئے گا اور پھر وہ ناشتہ کرتے ہی نکل بھی گیا تھا لیکن وہ اسے بدل کا کیا کرتی تھیں  
 کی بل جین نہیں تھا۔ انہوں کے آگے سارے منتظر آ رہے تھے۔ بھی قائم علی شاہ آنکھوں کے سامنے آ

کھڑے ہوئے آپ کا بے۔“ بھی حنہ تصور میں آئیں۔ آپ قائم علی شاہ کی گود سے شجاع کو لے کر ان کی  
 گود میں ڈالے ہوئے۔

”اپنی بس روز بھی بڑا ہوا تھا تو قادی نے کہا تھا۔ ہمارا بیٹا نہیں ہے۔ آپ کی کا بے۔ انہوں نے بڑی محروم  
 زندگی گزار دی ہے اور میں نے بدل میں عبد کیا تھا کہ اپنی پہلی اولاد ان کو دی ہے۔“ شجاع کو گود میں لے

کرے تھا شجاع جیسے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

”تمہارے بڑے والدہ کی اور شاہی کے بیٹے بھی میرے ہی ہیں۔“

”لیکن یہ بالکل آپ کا ہوا ہے گا اس کے متعلق ہر فیصلہ آپ کا ہو گا۔“ آپ نے دھانا لکھا تھا جو ہے بنا نا۔ ہم  
 اس سے دستبردار ہو گئے ہیں۔“ اور ان کا دل قائم علی شاہ اور حنہ کی کشادہ دل پر پھر گیا تھا اور وہ آنکھوں میں آنسو  
 آنسو لے آنسوؤں کو بالکل بھی نہ روک سکی تھیں اور تب قائم علی شاہ نے ان کے آنسو پوچھے ہوئے کہا تھا۔

”آپنی بس روز میں حنہ روز بھی کو لے کر حوٹلی کو آں کوں اور روز بھی کو آپ کی گود میں ڈال دوں گا۔ تب تک  
 یہ حنہ کی گود میں آپ کی امانت ہے۔“

اب پھر مظلوم دل کا نا اور عباس مرزا اور حوٹلی کے گھٹ سے باہر جانا نظر آتا۔ سائو لے رنگ کا اور نالیا عباس  
 مرزا جس کی آنکھوں میں عجب متناہمی چمک گئی اور اس کی ان اچانک اٹھ جانے والی نظروں میں عجب رنگ  
 کے سراپے جانے والے ہنر ہے تھے۔

”پچھو آپ کی پریشان ہو رہی ہیں۔“ شاہ رخ بھائی تو اکثر اکیلے ہی چلے جاتے ہیں اور وہ تو بہت محتاط  
 ذرا سوچ کر کہتے ہیں۔

”ہاں بس پتا نہیں کیوں بل گھبرا رہا ہے۔“ وہ ہاتھ کھڑی ہوئیں۔

”پچھو۔“ بیٹس باں آپ کی ہوتی ہیں۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر کہیں بھاڑا۔

”کیسے کرے میں ادھر بھی زیادہ بل گھبرا لے گا۔“

”آجھا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”ارموا۔“

”کیا خبر شادو کو کوئی اور کام بھی ہو۔ ورنہ اتنی پریشان نہ کرتا۔“ بڑھ گھٹنے کا تو رست تھا۔ اور وہ مج سے کیا ہوا تھا اور

اب شام ہونے والی تھی کیا خبر شجاع کی طبیعت زیادہ خراب ہو اور کیا بات۔ نہیں خدا نہ کرے۔ میرے مولا میرے  
 مانی کے بدل کو کھنڈر اٹھنا۔“ انہوں نے زور بک کہا تو اساتھ نے چونک کر کہیں دیکھا۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا پچھو۔“

”نہیں تو۔“ وہ ہنسنے لگی تب ہی بیٹی جان انور آ گئیں۔

”ارے نہنت خاطر میری بیٹی ہیں۔“ میں تمہارے کمرے میں دھیار نوکھ چکی ہوں۔“

”بس تو یہی بل گھبرا رہا تھا تو اس کے کیا سچا بیٹی آپ کو کوئی کام تھا کیا۔“

”میں کام کیا ہوتا تھا۔ بس آج رات اونچی چلی جاتا تھا۔ شاہ زیب کی تاریخ لینے اور شاہ زیب پر تائیں کہاں وہ گیا۔ کہا بھی تھا ملہ آجاتا۔ رات کا لکھا بھی اُدھر سے اور شاہ زیب کا کچھ بتائیں۔“ وہ سادہ سادہ کپڑے پہنے تھے۔  
 ”اور ہاں تمہیں بھی ساتھ چلنا ہے اس لیے تمہاری طرف مئی تھی۔“  
 ”میں نے“ زینت فاطمہ نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں تم شاہ زیب کی اگلی تہہ بود اور پھر کون سا ہم نے جگہ ملنا لکھا تھا۔ مجھے کوئی گھر ہے۔ مٹھائی میں نے مٹھوائی بھی اور بھی سب کچھ تیار ہے۔“ زینت فاطمہ خاموش ہو گئیں وہ جانتی تھیں کہ ان سے کچھ کرنا بیکار ہے۔ خدا کا ہوا راض ہو جائیں گی۔

یوں بھی وہ کتنی تھیں کہ انہیں شاہ زیب سے جا رہیں۔ وہ صرف شاہ زیب سے جا رہی تھیں۔ حالانکہ انہیں تو دونوں ہی پرارے تھے لیکن شاہ زیب خود زیب کی نسبت ان سے زیادہ پرارے تھے اور ان سے زیادہ قرب تھا۔ اور یہ تو ان کا دل ہی جانتا تھا کہ اونچی چلی جا کر کون سے دھڑوں کے ہاتھ لگ جاتے تھے کیسے دروہا لگ جاتے تھے وہ ایک انجی وہ اس کی پر شوق نظر سے۔ اور پھر اس کا بے جان جسم حالانکہ وہ بڑے لالہ زیب سے رطبان کو مستقل طور پر اونچی چلی میں رہنے کے لیے تھوڑا سا پتہ چلا تھا۔ اپنے ساتھ رہنے کی خدمتیں کرتے تھے۔ ان کے پیچھے بہت احترام کرتے تھے زینت فاطمہ کا اور بھائی بھی بہت سے پیش آتے وہ ان کی بہت بہت نرمیوں اور مختلف مزاج کی تھیں لیکن وہ اپنے دل کا کچھ نہیں چاہتے تھے۔ انہیں محاسن مرزا بہت پرارے تھے وہ اس کا مرکز تھا وہ ایک نظروں پر آتے تھے۔ انہیں اس کے جانے کے بعد بہت اہم ہو گئی تھی اور وہ وہ بھی شاہ زیب کے لیے رضامند تھے۔ وہ سب کچھ شایعہ اس وجہ سے شاید انہیں محاسن مرزا سے بہت ہو گئی تھی۔ محاسن مرزا زینت پر انہوں نے ایک غیر ارادی نظر ڈالی اس کی طرف سے انہیں گریہ کر گیا تھا انہیں لگتا تھا جیسے کسی اور کے ساتھ انصاف نہ کر لیں گی وہ بھی کسی سے بہت نہ کر سکیں گی۔

محاسن مرزا جیسے کے لیے ان کے دل ان کی روح میں بس گیا تھا تب ہی انہوں نے دائمی کے پاؤں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے۔  
 ”دائی مجھے اتنے قدموں سے جدا نہ کیجئے۔“ ان دونوں تکیے سے سرال سے سید عبد الغفار شاہ کے چہرہ بھی زار بھائی کا رشتہ کیا ہوا تھا اور سید عبد الغفار شاہ کی طرح وہ بھی تین شادیوں کا رکھتا تھا۔ کئی دونوں جو جان حیات جبکہ تیسری کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ اولاد کی آرزو میں شادیوں پر شادیوں کیے جا تھا۔  
 ”دائی خود بھی کچھ متحذب ہے تھے۔ جو ان بیٹی کی موت کا قلم علی کا شہر سے چلے جانا۔ اندر سے وہ کچھ ڈھسے تھے مگر اس لیے وہ زینت فاطمہ کی بات روز کرتے تھے اور خاموشی سے جھنگ اٹھا کر بھیجا تھا اور زینت فاطمہ نے سکون کا سانس لیا تھا پھر اس کے بعد ان کا کوئی رشتہ نہ کیا تھا حالانکہ وہ بڑے لالہ یعنی اخطار علی شاہ نے وہ ایک بار دہرائی سے کام بھی کیا تھا۔

”دائی زینت فاطمہ کی شادی ہو جاتی تو اچھا تھا۔ لوگ کہتے ہیں ہم جان بوجھ کر لڑکیوں کی شادیوں نہیں کرتے تاکہ گھر کی جائیداد بیاہ نہ جائے۔“  
 ”سید اخطار علی شاہ جانتے ہو ایسا نہیں ہے۔ ہم نے تو سید عبد الغفار کے شادی شدہ ہونے کے باوجود سید ام کلثوم کا رشتہ دے دیا تھا اور اس کے بچے کی جائیداد بھی ان کے حوالے کر دی تھی۔ لیکن ہماری بیٹی سے ہمارا دل نہیں اٹھا اخطار شاہ کہ ہم زینت فاطمہ کو بھی ایسی چشم نہ بھیجیں کہ وہ خود بھی رضامند نہیں تھیں۔ لوگ کیا کہتے ہیں ہمیں اس کی پروا نہیں۔ اگر تمہارے پاس زینت فاطمہ کے جو کوائف ہیں سید رشتہ سے تو لے آؤ۔ ہم انہیں نکاح کر دیے ہیں۔“ اور سید اخطار شاہ خاموش ہو گئے تھے کہ درود نزدیک زینت فاطمہ کے جو کوائف رشتہ تھا۔ اپنے طور پر یہ انہوں نے خوشی کی تھی لیکن شاید زینت فاطمہ کے تعجب میں ہی لکھا تھا۔ وہ انہیں زینت فاطمہ کا بہت خیال رہتا تھا وہ انہیں خد کر کے اونچی چلی لے جاتے تھے۔ لیکن زینت فاطمہ کا دل گہرا تھا وہاں

اور اب بھی بلی جی جان سے اونچی چلی جانے کا سن کر یہاں پریشان ہی ہو گئی تھیں۔  
 ”شاہ زیب نے کچھ بتا دیا نہیں تھا کہ کاماں رہا ہے۔“ بلی جی جان نے سیدہ اس سے پوچھا۔  
 ”یہ تو بتانا تھا انہوں نے بس کہا تھا شہر خارجہ ہے جن شام سے چلے لوٹ آئیں گے۔“

”میرے پاس کچھ کھانے کھانے کی شے کدہم لکھوا دی تھی شین پر دیا تھا۔“ بلی جی نے بھینچتی تھی کہ بات پوری نہیں کی۔ اس لوگ کے تو وہ کھانے کے لیے تھے۔ وہی اپنے چاچا والا انداز ہے۔ وہی طور طریقہ ہے۔ اس کا دلہن شاہ زیب اس کی ہوتا تھی لیکن ایک ہی خد کہ زیب کی لڑکیوں میں ابھی زنجیر میں ڈالنا چاہتا ہوں میں۔ مجھے انکو نہیں کے لیے باہر جانا ہے تمہارے شاہ زیب نے کہا تھا کہ شادی کر کے چلے جاؤ لیکن ایک سبب خد باندھ کر وہاں اگر کروں گا کچھ تو اس کے طور پر اب بھی کچھ نہیں لگتے زینت فاطمہ میں ہاں پر دل لگا رہا تھا۔ چاچا کی طرف سے ”آپ کو بھی وہم کرتی ہیں۔ شاہ زیب واقعی بڑھنے کے لیے جانا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی بھی کیا ہے ایک دو یونیورسٹیوں میں۔“ زینت فاطمہ نے اٹھ کھڑی ہو کر کہا۔

”ہاں اپنی زارا میں لی کیا ہے۔“ اب تو قیامت صورت بڑھی کھسی کچھ تیرے کہ بڑے لالہ بی زندہ تھے تو میں نے شاہ زیب کے لیے بات کی تھی بڑے لالہ کے کہ زارا کو تو میں شاہ زیب کے لیے لالوں کی پر اب ظاہر ہے وہ زارا کو بغاوت میں لگتے تھے اور میری اور شاہ زیب کی بھی شادی کر گئی۔ وہ شاہ زیب نے بھائی جان سے زارا کو شاہ زیب کے لیے مانگ لیا۔ اگر شاہ زیب یوں رہی نہ تو زارا تو زارا اس کی ہی دل میں بٹا تھی۔ ”اور انہوں نے آنا شاہ زیب جان ہی ٹھک کر کہ گیا۔ بلی جی جان کی عادت تھی اس سے بچھوٹے کی بھی اور سیدہ بولے لگتی تو بلی جی بلی جان کہہ کر ایک ایٹھ کہہ کر ہار ڈالنا انہیں کچھ پتا نہ چلتا تھا کون سی بات کرتا ہے۔

”بلی جی جان آپ بھی کسی بات کرتی ہیں۔“ زارا اب شاہ زیب کی منکوحہ ہے۔ یہی بھینچتی کی بات تو بھینچ میں تو ہی بڑا دل بٹا میں سوچتا ہے سب پوری ہو تیں وہ تیں۔ خدا زارا اور شاہ زیب کو زندگی کی ہر خوشی دے۔“ زینت فاطمہ نے کہا۔

”خدا نہ کرے میرا بھی کوئی ایسا مطلب نہ تھا۔ وہ دونوں کی جو جی سلامت رکھے مجھے تو شاہ زیب پر غصہ ہے کہ کہاں گیا کچھ گیا۔ بھائی سے اب اس کے بچا جاتے اچھے لگے۔ اس کی شے میں اپنی فیل کے بچا کی ہوں۔“  
 ”توہانے گئے۔ اسے جاتا ہے۔ آج آج سے ناظرہ رخصتی کی۔ دیر سو تو ہی جاتی ہے۔“ زینت فاطمہ نے جیسے خود اپنے آپ کو لپٹی۔ تب ہی اس کی اٹھارہ شاہ زیب پر پڑی جو وہ لگے دو دو اڑے پڑا ہوا رکھے کھڑا تھا۔  
 پشمالی کی ریشیں ابھی بولی تھیں۔

”شاہ زیب بھائی آپ بھائی یوں کھڑے ہو گئے۔“ سیدہ اس نے سر پر دو ٹاپا کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”السلام علیکم پیچھی جی“ شاہ زیب نے اندر آکر لے زینت فاطمہ اور بھائی جان کو سلام کیا۔  
 ”اور تم کہاں سے آج سے میں نے تمہیں منہ بھی کیا تھا آج نہ جانا شکار کے لیے۔ وہ تینوں کو ٹال دیا میرے دل میں وہم آتے ہیں زینب زارا کی رخصتی تک ہر ہی رات بلی جی جان نے شاہ زیب کو سر پر لپٹی۔  
 ”میں شکار کے لیے نہیں گیا تھا شادی کیسے اس تھا۔“ شاہ زیب نے حد مجیدہ لگ رہا تھا۔  
 ”اور میرے دوست بھی وہاں چلے گئے تھے۔ شہر البتہ مروانے میں مصروف تھے۔ شاہ زیب کیسے اس علاقے سے لوگ آتے ہوئے تھے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ شاہ زیب کی انکسش کے لیے کھڑے ہوں لیکن مانتی نہیں مان رہے تھے۔“

”تو صبح کر رہے ہیں۔ ابھی ایک انکسش نہیں ہو نا وہ سراسر شروع ہو جا اور پھر شادی کی کلائے میں پہلے ہی بڑی عزت ہے۔“



"خیر ابھی شادی نے جتنی فیصلہ نہیں کیا۔ لیکن اگر شادی کھڑے نہ ہو تو میں کھڑا ہوا جاؤں گا۔"  
 "میں تو کسی ہوں چھوٹا یہ انکشن سیاست میں کیا رکھا ہے۔ فیصلہ کی خوار می ہمارے خانوادے کی تو آپ اس  
 کے سارے ہی علاقے میں بڑی عزت و شہرت محکم کیا جاتی ہے۔"  
 "آپ نہیں سمجھ سکتے ہیں لیجان جان آپ سے بحث فیصلہ ہے۔" شاہ زیب کا انداز بیزاری ہے ہوئے تھا۔  
 "میں اس لیے کیا تھا کہ شادی آپ کو ملار ہے ہیں۔ نورون دیور کا سوٹ لایا ہے جڑاؤ کسی معزز زمیندار  
 کا ہے اور وہ بیٹیا چاہتا ہے۔ شادی چارہ ہے ہیں کہ آپ آکر ملے ہیں اگر آپ کینڈا آئے تو لے لیں۔"  
 "بھجے۔" لیجان کا اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 "تمہاری بڑی کی تو ہر چیز تار ہے مزہ رو بات کے لیکن دیکھ لیتی ہوں اگر اچھا ہے تو اس کے لیے لوں گی۔"  
 "بہت خوب صورت بیٹ ہے۔ بہت نہیں ہے لیکن کسی مجبوری کے تحت چننا پڑا ہے۔" شاہ زیب نے

بتایا۔  
 "اگر خوب صورت ہو تو ضرور لے لیجے گا مجھے۔" رائے زمانے کے زیورات بہت اڑیکٹ کرتے ہیں۔  
 "نہ اشتیاق سے کہا۔ لیجان سر ملائی ہوئی پر جی نہیں۔"  
 "سیرہ اسازر کا گلاب لیجان نے لکھے۔ میرے لیے ایک کپ چائے بنا دے۔" شاہ زیب نے اساء سے کہا تو وہ  
 اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 "شاہ زیب بیٹا تجھے سمجھ سے لگ رہا ہے۔ وہ۔" طبیعت تو ٹھیک ہے۔ تا۔" زینت فاطمہ نے نور اور دیکھا۔  
 "جی چھو چھو جان۔"  
 "کچھ اچھے اچھے سے ہو۔"  
 "کوئی خاص وجہ نہیں ہے لیکن چھو چھو جان لیڑ مجھے ایک بات بتائیں گی۔"  
 "سیرہ اساء کے جانے کے بعد انہوں نے زینت فاطمہ سے پوچھا۔  
 "ہاں لیجان میں کیا بات ہے۔"  
 "یہ زار اگر آپ نہیں میں اس کی بات شاہ زیب سے طے تھی۔"  
 "نہ نہ۔" زینت فاطمہ چونک کر رہیں۔

"بات تو کوئی طے نہیں تھی البتہ تمہاری بی بی جان کہہ رہی ہیں کہ بچپن میں انہوں نے بڑے لالچ سے ذکر  
 کیا تھا کہ وہ زار کاوا بی بی سونا نہیں لی شاہ زیب کا مقدور بی بی بات چیت میں اس کی طرف کیا ہو گا۔ لیکن اظہار لالہ  
 تو بہت روشن خیال اور مختلف مزاج کے تھے وہ بچپن کی محنتی زندگی کے قائل نہ تھے کہ نہ جانے بڑے ہو کر کیا  
 رجحان ہو گی کالوں بھی یہ مقدور بی بی بات ہے زار انہماک انصاف بھی اور۔"  
 "ار اگر آپ کی بات سنی لیجان کے میں کسل کوں تو سارا کو محفوظ رہتیں شاہ زیب کے لیے اور۔"  
 اس کے لیے کی جتنی زینت فاطمہ نے بڑی شدت سے محسوس کی۔  
 "میں چننا لیجان نہیں کرتے۔ زار انہماک سے ہی مقدور کا ستارہ تھی سوائے تمہارے آسمان پر ہی جتا تھا۔  
 زار بہت اچھی بہت سلجھی ہوئی اور بخت کرنے والی لڑکی ہے۔" شاہ زیب کی کشادہ پیشانی کی لکیریں اس کے چہرے  
 ہونٹ اس بات کے غماز تھے کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ زینت فاطمہ نے ہی دل میں کانپ لگیں۔ شاہ  
 زیب وہ شادی کی کاٹی قادی ہی غصہ ڈی غصہ۔ زار انہیں بے حد عزیز تھی۔

"خدا ہوں تو کوئی کوشش خوش رکھے انہوں نے بے اختیار دیکھا۔  
 "دعا مانا لیجان جاری ہیں چھو چھو جان۔" شاہ زیب نے اندر قدم رکھے اور مسکرائے۔  
 "شاہ زیب اور زار کے لیے دعا کر رہی تھی۔" انہوں نے سوائے نظروں سے شاہ زیب کی طرف نہ کھل۔ شاہ زیب  
 نے آنکھوں میں آنکھوں میں اس کی دلی اور بھر پور زینت کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"پھر تو زوار آجمن نہا چاہے اور میری طرف سے بھی بہت ساری دعاؤں میں اس شامل کر لیں۔"  
 "کیوں نہیں۔" زینت فاطمہ مسکرائیں۔  
 "میرے تم کہاں رہ گئے تھے تمہاری بی جان پریشان ہو رہی تھیں۔"  
 "بس پچھو دیور ہو گی جس دوست کے پاس کیا تھا اس نے آئے ہی نہیں دیا۔ بہت مشکل سے اجازت لے کر  
 آیا ہوں کہ آج میرے بھائی کی شادی کی تاریخ طے ہو ہے۔" شاہ زیب نے کھڑے تھے  
 شاہ زیب کے چہرے پر پھیلے ایمان کے زینت فاطمہ کو کبھی اطمینان ہوا کہ یقیناً "ب خیریت ہی ہے۔"  
 "ویسے جانا کب ہے؟" انہوں نے زینت فاطمہ سے پوچھا۔  
 "لیجان مغرب کے بعد چائے کو کر رہی تھیں۔"  
 "پھر تو ابناں وہ والی ہے۔ میں جلدی سے کھل کر کے چینگ کر لوں۔"  
 "کیا وہ لالچ بھی چلے گا۔"

"چائے نہیں پیرا خیال سے لیجان نے ایسا کچھ کہا تو نہیں ہے۔" زینت فاطمہ بھی کھڑی ہو گئیں۔  
 "ہمارے ہوئے کھڑیں ہی ہے۔ اگر میری عدم موجودگی میں ہوئی تو مجھے اس میں شریک نہ ہونے کا بہت  
 افسوس ہوئے کھڑیں ہی ہے۔ لیجان کی جان جلد ہی بات کر رہی ہیں۔"  
 "ویسے جانے کا رگڑا کب تک ہے؟" شاہ زیب پہلی بار شاہ زیب سے مخاطب ہوئے۔  
 "میں اچھا ہونے لگ جائیں گے۔" زینت فاطمہ کے ساتھ ساتھ باہر نکلے ہوئے شاہ زیب نے بتایا تو شاہ زیب  
 بھی اٹھ کھڑا اور ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔  
 "زیب۔" شاہ زیب نے محبت سے بھائی کی طرف دیکھا۔  
 "اگر تمہارا دل چاہو باہر جانے کا تو لیجان سے سفارش کروں کیا ضرور اس کی کوئی جھلک کھائی دے جائے۔"  
 شاہ زیب کی پیشانی کے بل کھل گئے اور دونوں پر مسکراہٹ بھر گئی۔ بھرے بھرے ہونٹوں کے اندر سے  
 خوب صورت دانت جھلکنے لگے۔ شاہ زیب کے دانت بہت خوب صورت تھے۔ بالکل ہموار اور درازا فاصلے پر  
 ترتیب سے جیسے کئی کے جیسے پر کئی کے دانے اس کی مسکراہٹ بہت خوب صورت تھی۔  
 "ہاں اگر سفر کر رہی ہیں تو اچھا ہے۔" زینت فاطمہ مضطرب ہی ہوئے ہوئے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی

طرف جاری تھیں۔  
 "چھو چھو جان نماز سے فارغ ہو کر میں حاضر ہو تا ہوں۔" شاہ زیب نے زینت فاطمہ کے اضطراب اور بے چینی  
 کو شدت سے محسوس کر رہے تھے بلند آواز میں کہا۔  
 زینت فاطمہ نے مرکز دیکھا لیکن وہ شاہ زیب کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور اس کے گلے میں بائیں ڈالے  
 ہوئے ہوئے کھڑے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے سے جبکہ شاہ زیب کے ہونٹوں پر بڑی دلچسپی  
 مسکراہٹ تھی۔ زینت فاطمہ نے دل میں جلدی کرنا شروع کیا اور نہ کچھ دیر پہلے اس کی بچیدگی نے انہیں ڈرا دیا  
 جس طرح اور جس انداز میں اس نے شاہ زیب اور زار کی بات طے ہونے کے متعلق پوچھا تھا اس سے وہ پریشان  
 نہ ہو گی تھیں۔ لیجان بھی شاہ زیب کا مزاج اور بھنگ نہالے تھے۔ نماز پڑھ کر دودر تک سب کے لیے دعا مانگتی  
 رہیں۔ نماز پڑھ کر دوا بھی جائے نماز پر ہی بیٹھی تھیں کہ شاہ زیب نماز پڑھ کر اور فریش ہو کر آگئے۔  
 "جی چھو چھو جان۔" وہ ان کیسپاں ہی کیسی بچھے کھانے پیچھے گئے۔  
 "شبابا بالکل ٹھیک ہیں۔" معمولی سے ڈھکی ہوئے تھے اس میں ایک آدھ روڈ اور ہیں گے۔  
 "یار بے اطمینان تیرا لالہ کھ کھ رہا ہے۔" زینت فاطمہ نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا۔  
 "اور میں قائم چاہو سے بھی تھا۔"

"قائم سے؟" انہوں نے یکدم شاہ زیب کو چہرہ دونوں ہاتھوں کے کٹوروں میں قائم کیا۔

”کیا تھا وہ۔“ ان کی آواز میں ہلکی چپکاوٹ تھی۔  
 ”پانچ ٹھیک اور پانچ ایسی ہی جیسے آپ کے قصور میں ہیں جی بچھو وہ تو پانچ بھی بوڑھے نہیں ہوئے  
 شجاع کے بڑے بھائی لگے تھے۔“  
 ”جھما۔“ زینت فاطمہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔  
 ”اور انہوں نے آپ کے لئے ساری نصیحتیں اور دعائیں بھیجی ہیں۔“  
 ”اور حسنہ حزن کی تھی۔ بے گھر تو اس سے۔“ زینت فاطمہ کی آواز بھگ گئی۔ ”آنکھیں غم ہو گئیں۔“  
 ”نہیں جانے تو اسہل میں تھے اور حزن آئی تو ہو رہیں ہیں۔“  
 ”لیکن کمزور رہے تھے وہ شہر میں ہیں۔“  
 ”ہاں میں نے کسی سمجھا تھا کہ ان کا بچا کہ وہ لوگ لاہور میں ہی سہل ہوئے ہیں اگر۔ یہاں شہر میں صرف  
 شجاع ہیں۔“  
 ”بچھو جان۔“

”برا سکون ملتا ہے ان کیسے بیٹہ کر اللہ والے ہو گئے ہیں۔“  
 ”کمالے۔“ شہناز کی آنکھیں پانی سے لگی ہوئی تھیں۔  
 ”وہی تھے لگا ہوں۔“ کمالہ فریاد کیا۔  
 ”جی میں اندر کیا تو نماز کی چوکی کیسے گریزے تھے۔ سدا کا یہاں۔“ نبض دیکھی۔ بے ہوش تھی۔ ابھی  
 تلبا سے ہی بے ہوش پڑے ہیں۔ میں نے اپنی شان ڈالا ہے۔“  
 اور شہناز شہادی کی کشت گاہ کی طرف جاتے جاتے کھٹ پڑے شاہ بابا کی رہائش جلی کے مروانے سے  
 میں کی اور وہ بھی خاصے فاصلے پر بنے مکروں میں تھی۔ یہ حصہ مروانہ سے کالی درخت کی زنا سے میں زینل  
 مراد آکر کھڑا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ گریزے خالی پڑے تھے اور ان سے ملحق مشرق کی طرف درگاہ شریف بھی اور  
 اس کا ایک دروازہ اسی سمت اندر کی طرف کھلا تھا۔ شہناز نے جب سے وہیں پہنچا تھا شاہ بابا کو ان کی مکروں میں  
 سے ایک کمرے میں دیکھا تھا۔ وہ دن بار انہوں نے شاہی سے کہا بھی تھا کہ وہ انہیں جو جلی کے رہائش گھر سے  
 لے آئیں۔ مروانے کی طرف کی کمرے خالی پڑے تھے۔ مہمان خانہ بھی تھا۔ لیکن شہادی نے ان کی بات پر زیادہ  
 غور نہیں کیا تھا۔ وہ جب بھی سید پر آتے تو باقاعدگی سے شاہ بابا کیس جاتے تھے۔ شاہ بابا وہاں ہوتے تو کوئی  
 بات کر بیٹھتے خاموشی سے رہتے۔ اور شہناز کچھ دن ان کی بیٹھ کر بیٹھ جاتے۔ انہیں شاہ بابا سے عجیب  
 لی مقیدت تھی بچپن سے ہی وہ سمجھتے تھے کہ شاہ بابا جو دعا کہیں گے وہ ضرور قبول ہوگی جس روز زلت آتا ہو یا  
 وہ ان کی جان کیسے جا کر دعا کی درخواست کرتے تھے اور اگر شاہ بابا دعا کے لیے اٹھتے تو انہیں یقین ہو جاتا  
 کہ وہ ضرور اچھے نمبر لے کر کامیاب ہوں گے اور انہیں ان کی مطلوب پوزیشن مل جائے گی۔ یہ تیز خیز قدموں سے  
 اٹھ کر ان کی طرف بڑھ رہے تھے جو زیادہ تر تیز سے اور جن کی تعداد انہیں تھی۔ کمالہ ان کے پیچھے پیچھے دروازہ  
 کھلا تھا وہ اندر داخل ہوئے شاہ بابا نماز کی چوکی کیسے ہی سیدھے لیٹے تھے۔ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے شہناز  
 نے بے سے لیٹے ان کی نبض چیک کی ہرمت آہستہ تھی۔

”ہاں نہیں کیسے یو پی پڑے ہیں۔“ انہوں نے سوچا اور کمالے سے پوچھا۔  
 ”ان کا کھانا کھانا ہے۔“  
 ”وہ دن بد روز الدین کی ہی کوئی بات ہے۔“  
 ”اذا داس کو۔“ شہناز نے غصے سے اس کی بات کائی۔ کمالہ لپٹ گیا اور شہناز ہولے ہولے انہیں پکارنے  
 لگا۔  
 ”الہاما۔ شاہ بابا۔“ لیکن وہ ساکت پڑے شہناز نے بغور انہیں دیکھا۔ نورانی چہرہ جو اس وقت چٹا ہو  
 رہا تھا۔ طانی آنکھیں گھوری رہ گئیں۔  
 ”شہناز نے ہوش سنبھالنے کے بعد جب انہیں دیکھا تھا تو بات ان کی واٹھی میں آگے ہال سفید تھے اور  
 کچھ بیابانہ اب تو جلی سے تھا۔ شہادی کے حلق ایک بار زینت فاطمہ نے انہیں بتایا تھا کہ  
 شہادی نے اپنی جوانی میں کئی ٹیڑھی سڑکی سے شادی کر لی تھی اور کچھ عرصہ تک یہ بات چھپی رہی تھی  
 اور وہ تیزی اور بے کھلم کھلے آئے انہوں حضرت شاہ بابا درگاہ شریف میں کوئی چلہ کٹ رہے تھے اور جب وہ  
 مملکت آئے تو انہوں نے شاہی کے سامنے وہ تجاویز رکھیں یا تو جو جلی بچھوڑو اور پوچھنے کے ساتھ لے جایا پھر  
 اہل طاقان سے دو اور بچہ جو جلی میں رکھ لو۔ جو جلی بچھوڑنے کی صورت میں چلی پوری اور بچے سے کوئی حلق  
 اور۔“ شہادی نے پوچھ کر حلقا دے دی اور پھر جو جلی میں لیٹے لگا کہ دونوں تجاویز میں ان کے لیے نقصان ہی  
 تھا۔ دوسری تجویز سامنے کی صورت میں وہ کم نقصان میں رہتے ہیں کہ ان کی پوری ہاتھوں کی طرح  
 لگاؤ۔ یہ پوری کیوں میں چلائی پھرتی تھی۔ یہ پھر جو جلی کے کپڑے پھیلتی رہتی اور جو جلی میں آئے جاتے ہوئے

شاہ رخ نے ان کے ساتھ قمار لے لے  
 ”جیسے ہی مجھے موقع ملے گا میں اسے آپ کو لا دوں گا۔ آپ یہاں مت ہوں۔“  
 ”میں میں پریشان تو نہیں ہوں۔“ انہوں نے آنکھوں کے کونوں میں آنکھیں ہوجانے والے آنسو پھینکے۔  
 ”مجھ اب بتاؤ تفصیل سے ساری بات۔“ اور تب شہناز نے ایک ایک بات انہیں تفصیل سے بتائی تب  
 کہیں جا کر ان کی تسلی ہوئی۔  
 ”شہناز خاں مجھے تو انہوں نے پھر تسلی چاہی۔  
 ”انشاء اللہ وہ تو ڈاکٹر اسے اجازت نہیں دے رہے ورنہ وہ تو ایک دن کیسے شاہ بابا میں رہنے کو تیار نہیں۔“ وہ  
 خوار خواہ زینت فاطمہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے ورنہ ابھی تو کم از کم وہ ایک جہت تک شاہ بابا میں ہی تھا۔ ڈاکٹر  
 سے ان کی تفصیل بات ہوئی تھی۔  
 ”لوگ کچھ نہیں اب جاؤں در شہناز کیسے بیٹھیں گے۔ شاہ بابا کوئی کام ہو۔“  
 ”اے شاہ بابا میں کئی تیار ہو چکا ہوں۔ تمہاری بی بی جان کمرہ سدری میں مجھے بھی ضرور ساتھ چلا جائے۔“  
 ”آپ بھی چلیں گی بچھو۔“ انہوں نے خوش ہو کر پوچھا۔  
 ”اے بی بی تو شاہ زینت سدا راض ہو گا اور تمہاری ماں تو بہت ناراض ہوں گی۔“  
 ”ہاں بچھو اس بات سے ناراض ہو ناں کاچھ بنائے اور پھر آپ تو میں آتی جاتی بھی نہیں ہیں۔ اس روز اعزاز  
 بھائی بھی گھر کر رہے تھے کہ بچھو ان کی طرف تو پانچ آئی ہی نہیں۔“  
 ”کیا کیوں بیٹا۔“ یہی نہیں چاہتا جو جلی سے باہر نکلتے۔ ”وہ اداسی سے مسکرائیں۔“  
 ”خوش رہا کریں بچھو۔“ حسبِ پیرا تا آپ کے اور پیرا سے بچھو میں نے توجہ رکھا ہے میں جہاں بھی رہوں  
 گا آپ کو اپنے ساتھ ہی رکھوں گا۔“  
 ”خدا تمہیں زندگی دے بیٹا۔“ انہوں نے دعا دی اور شہناز نے اسے اجازت لے کر باہر نکلے پھر طویل پر آمد  
 اور کچھ گھنٹے عبور کر کے وہ مروانے کی طرف مڑے ہی تھے کہ انہیں کمالہ بھی ادھر آ کر دکھائی دیا۔ وہ اسے نظر  
 انداز کرتے ہوئے شاہی کی کشت گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ کمالے نے انہیں آواز دی۔ تب سے اب حد  
 ناگوار ہی انہوں نے کمالے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔  
 ”فصد وہی شاہ بابا اپنے کمرے میں بے ہوش پڑے ہیں۔“  
 ”کیا۔“ وہ پوری طرح اس کی طرف مڑ گئے۔  
 ”وہی میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ تو میں نے سوچا کہ شاہ بابا کو سلام کرنا چاہوں۔ کبھی کبھی سلام کو چلا جاتا ہوں جی



علینہ کا سونو ٹھیک ہو گیا تھا اس کا غصہ بس اتنی ہی دیر کا ہو تا تھا بعض اوقات وہ بڑی سے بڑی بات پر دو گزر کر جاتی اور بعض اوقات پچھلی ہی بات پر غصہ آجاتا اور ناراض ہو جاتی حتیٰ لیکن یہ ناراضگی بس سونو کی دیر کی ہوتی تھی۔

”مجھ میں ایسا کیا قابل تعریف ہے“  
اس نے آہستگی سے کہا تو علینہ نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

”تمہیں خوب اس کا احساس نہیں ہے لیکن تم بہت خوب صورت ہو۔“

”خوب صورت تو تم کی ہو۔“

”لیکن تم سے کم۔“

علینہ کی۔

”اور میری بات میں نے سارا سے کسی جتنی کہ تم مجھے خوب صورت کہہ رہی ہو میری کزن کو کھو تو حیران رہ جاؤ۔“

ماہور بھی ہولے سے ہنس دی۔

”اچھا کہ بیٹھو میں کھانا کھانے کو کہہ دو۔ ہم نے بس ابھی تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے کھانا کھایا ہے۔ میں تو بیوروٹی کی نہیں تھی۔“

”اچھا کہ کب سے کھانا کھا رہی ہو؟“

”میں کب سے کھانا کھا رہی ہوں لیکن اس کا کچھ نہیں ہے۔“

”اچھا کہ کب سے کھانا کھا رہی ہو؟“

”میں کب سے کھانا کھا رہی ہوں لیکن اس کا کچھ نہیں ہے۔“

”اچھا کہ کب سے کھانا کھا رہی ہو؟“

”میں کب سے کھانا کھا رہی ہوں لیکن اس کا کچھ نہیں ہے۔“

”اچھا کہ کب سے کھانا کھا رہی ہو؟“

”میں کب سے کھانا کھا رہی ہوں لیکن اس کا کچھ نہیں ہے۔“

”اچھا کہ کب سے کھانا کھا رہی ہو؟“

”میں کب سے کھانا کھا رہی ہوں لیکن اس کا کچھ نہیں ہے۔“

”اچھا کہ کب سے کھانا کھا رہی ہو؟“

”میں کب سے کھانا کھا رہی ہوں لیکن اس کا کچھ نہیں ہے۔“

”اچھا کہ کب سے کھانا کھا رہی ہو؟“

”میں کب سے کھانا کھا رہی ہوں لیکن اس کا کچھ نہیں ہے۔“

”اچھا کہ کب سے کھانا کھا رہی ہو؟“

”میں کب سے کھانا کھا رہی ہوں لیکن اس کا کچھ نہیں ہے۔“

”اچھا کہ کب سے کھانا کھا رہی ہو؟“

”آپ کے کزن کا آپ کے ہی گھر میں رہتے ہیں۔“

”میں تو۔“

وہ غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے جھپٹ کر رکھا۔

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”میں تو۔“

”خیریت پہ خود ہی خود کیوں مسکرایا جا رہا ہے۔“  
 ”کچھ نہیں تمہارے متعلق سوچ رہی تھی۔“ اس نے بات بنائی۔

”میں میں سوچ رہی تھی کہ تم نہیں اور اسف بھائی میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں ہے۔ وہ اتنے دھیمے مزاج کے اور تم لاٹا کلا پی ہو۔ پھر۔۔۔“ اس نے ایک شرارت بھری نظر اس پر ڈالی۔

”یہ سب کیا۔“  
علیہ نے انجان بننے کی ایکٹنگ کی۔

”یہ سب جو تم نہیں جانتیں۔“  
ماہ نور کا مود بھی شرارت کا ہو رہا تھا۔

”پتا نہیں یہ سب کیا ہے ماہ نور لیکن بہت خوب صورت ہے“  
 علینہ اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئی اس کے چہرے پر رنگ سے بکھر گئے تھے۔

”میں جب سفر کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوں جسے اس سفر جیسے فتنے کی محبت حاصل ہے۔ اس سفر سے بہتر کون سا انسان ہیں۔ تم اُن میں سے زیادہ جانتی جاؤ گی۔ لیکن میں نے بہت قریب دیکھا ہے۔ اُن میں بہت نہیں بہت محبت کرنے والے اور سرنگ بننے والے ہیں۔ ان کا خیال اس طرح رکھتے تھے جیسے وہ کوئی نازک اور قیمتی شے ہوں۔ چاہنے بھی ان کا اس میں خیال نہیں رکھا اور پھر سب نے بڑی خوب صورتیوں کی بات میں ”میں نے دیکھی اور میں نے تجھے بہت حیران کیا وہ خود اس کا احترام ہے۔ لیکن کروڑوں نے اس کو جان کر ہر عورت پر عروج کر کے اس کے ساتھ ساتھ ”کسی اور کو نہیں دیکھا۔“

”تم نے پہلے تو سمجھ ان کی ان ساری خوبیوں کے متعلق نہیں جانتا تھا۔“

علینہ نے حسب عادت اس کی پیٹھ پر دھمو کا لگایا۔

”تم ان جذبوں کی نزاکت کو نہیں سمجھ سکتیں اس لیے کہ تمہارا دل ابھی ان سے آشنا نہیں ہوا۔“  
 ”ہاں شاید تم گھرج کتے ہو۔“

ماہ نور نے آہستگی سے کہا اور سوچا۔

اس کے پاس وقت ہی کہاں ہے ایسے جذبوں کے لیے اس کی منزل تو بہت طویل اور کھن ہے اسے اپنے ابا کے دکھتے گئے قابضوں کو تکمیل تک پہنچانے اور تباہی سے اس منزل تک پہنچنے میں کیا کچھ سہاڑے گا۔

”کھانا لگا دیا ہے۔“

یا سمین نے کمزے کے دروازے سے جھانک کر بتایا۔ یا سمین ملازم لڑکی تھی ”اوہ بھئی اس ترو کی کیا ضرورت تھی۔“

ماہ نور نے علیہا کی طرف دیکھا۔

”ایک پلیٹ میں کچھ ڈال کر پیس لے آئیں۔“  
”خضر بھائی! آٹے والے ہوں گے کچھ دیر پہلے ان کا فون آیا تھا، مرنے چلا جا رہا ہے مجھے“۔

”لوہہ آگئے“ اس نے گیسٹ رہوتی بیل

”تم چلو کھانا شروع کرو۔ اتنے میں خضر بھائی ابھی اشا مل رہو جائیں گے۔“

”آجائیں تو بچہ“

”میں تم شروع کر دو۔“

ماہ نور اٹھ کھڑی ہوئی۔

لاؤج میں سے خضر کی آواز آئی۔ وہ غالباً "یا سکین" سے کچھ پیو رہا تھا۔ ماہ نور علیہ السلام کے ساتھ باہر نکلی تو وہ لاؤج سے جا چکا تھا وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی ڈانگٹ روم میں آئیں۔ حسب معمول دو تین طرح کی خوشنہ تھیں۔ ماہ نور نے اپنے لیے تھوڑا سا چمکن بیٹ میں ڈالا۔

”تم تجھی لو نا کچھ۔“

اس نے علیہ سے کہا۔

”یار بتایا تو ہے ہمیں تمہارے آنے سے پہلے کھایا ہے۔ خضر بھائی آرہے ہیں نا تمہارا ساتھ دیتے ہیں۔“  
کچھ دیر بعد خضر منہ ہاتھ دھو کر قیصر کا اسٹین فولڈ کرتا ہوا اندر آیا۔

”السلام علیکم خضر بھائی۔“

اس نے سر کی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالا۔ بہت گہری اندر تک اترتی نظر اور اس کی طرف دیکھتی ماہ نور نے یکدم نظریں جمع کیں۔ یہ پتا نہیں خضر بھائی نکل اس طرح کیوں دیکھتے ہیں۔

”کیسی ہوا۔“

”ٹھیک“ وہ مسکراتی۔

”جی۔“ اس اور پچھو جان ہیگ ہیں۔“ اس نے پلیٹ اپنی طرف لٹھرائی۔

باری باری سب کی خیریت پوچھنے کے بعد خضر نے اپنے لیے پلیٹ میں سالن نکالا۔

”میں نے فرحیہ کو لایا ہے۔“

ماہ نور نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں خضر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”ہماری عادتیں ہمیں بدلیں گی۔ ابھی قسم توڑ بھی

اس کے کوٹہ اس کی پیٹ میں ڈالا۔ وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی عادت تھی بچپن ہی میں پردے سے باہر نہ نکلتی تھی۔ وہ صرف اپنی پسند کا ایک سالن لے لی تھی اور باقی چیزوں کی طرف دیکھتی بچپن ہی میں عادت

”واللہ اعلم بالصواب“

ابن اضر علیہ السلام طرفہ کھڑا تھا۔

علیحدہ بنایا۔ تیسری بائیسویں نے اندر آکر تانا۔

”بمِ صاحبِ کافون آیا ہے۔“

علیہ السلام کھڑی ہوئی۔

یہ مہمانی کی طرف ہی چلی گئی ہیں۔ اور ان کا پروگرام دیر سے آنے کا ہے۔ تب ہی فون کیا ہے۔

۱۰۔ اے جانے کے بعد ماہ نور نے ہجھا۔

۱۳۔ "میں نے خود سیٹ کرنا تھا ہو گیا سیٹ۔"

اس کی آواز بھر گئی۔

"اور آپ باتیں کیا سمجھ رہے ہیں۔"

"اچھا، ہوم ملہا۔ یہی بات کاچھ اور مطلب تھا۔ مجھے تو اچھا لگا تھا تمہارا یہ جذبہ کہ تم جاب کر کے پھینکو اور جانا چاہتی ہو۔ تم بھولی ہو کہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں اور یاد رکھنا میں بھی غلط نہیں سمجھ سکتا۔ میں تو جیسے تم سے زیادہ جانتا ہوں یہ تو فٹ نوکی۔"

خضر نے اسے سر زلفی کی اور سوچا۔

"تم کیا جانو گا تم میرے اندر موجود ہو۔ میں تمہاری گ رگ سے واقف ہوں تم جاب بات کرنے کے لیے اب واکر کی ہو تو مجھے چاہو تا ہے کہ تم کیا کہنے والی ہو۔ میں تو تمہارے چہرے کی شکل کے تمہارے اندر کی کیفیات مجاہدیتا ہوں۔"

"خضر بھائی! میں کا فون تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے گاڑی ولید کو لینے کے لیے بھیج دی ہے لہذا آپ انہیں پک کر لیں۔ وہ شاپنگ کرنے نہیں کیس میں سیدھی خالد جان کی طرف چلی گئیں۔ غالباً انہوں نے مہیج آیا تھا۔"

"لیکن میں تو آفس جا رہا ہوں صرف کھانے کے لیے آیا تھا۔ ایک راجبکٹ کے پیچہ پر سناں کرتے تھے۔"

"آفس سے لوہری چلے جائیے گا۔ مجھے تو ابھی تو آنے کے لیے نہیں کہا۔"

"نہیں ہے۔"

خضر اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی کھانا کھانچا تھی۔

"یا سبین رتن سیٹ لو۔"

علینہ نے یاسمین کو آواز دی۔

چائے بھی بنانے کو کہہ رہا اسے میں چائے کی آفس کے لیے نکلوں گا اور تم۔"

بات کرتے کرتے وہ ماہور سے مخاطب ہوا۔

"تم مجھے جاؤ گی گھر۔ میں بھی کوئے گا تو آؤں گا تو تمہیں بھی ڈاپ کروں گا، پھپھو اور اگل سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"وہ منوں آجائے گا لینے۔"

"نہیں اسے تو پیش پھالے جانا ہوتا ہے۔"

"ہاں! سبین وہ پونڈو کی سے جیڑھا چھری آگے لائے۔"

"اتنی جلدی یعنی اتنی جلدی واپس چلی جاؤ گی۔ اتنے تھوڑے سے وقت کے لیے آنے کی کیا ضرورت تم۔"

علینہ کا مٹو خراب ہونے لگا۔

"تین تو بچ چکے ہیں اور منوں کتنے بچے تک آتے ہیں پونڈو کی سے کبھی ساڑھے تین کبھی تین۔"

"ہاں۔"

ماہور نے اثرات میں سر ہلادیا۔

"منوں کو واپس بیٹھا، بیٹھا عینا میں نے کہا کہ میں پھوڑاؤں گا۔"

اور پھر ایک شکایت کرنی نظر اس پر ڈالیں۔

"اور پھر تمہی ہو کہ تم تکلف نہیں کریں۔ آخر منوں کو کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ خواخوہ وہ اب اتنی دیر لگا کر بل آئے گا بن یا بنکر پر خوار ہو تا میں یا ولید تمہیں چھوڑ کر نہیں لے سکتے تھے کیا؟"

"میں نے سوچا تھا کہ آپ نہ جانے آئیں آفس سے دست برد ہو گئی تو کمال اور ابا پریشان ہو جائیں گے۔"

ایہی کی بڑھائی کا حق ہو گا۔"

"معلوم نہیں۔"

خضر نے کندھے اڑا کئے۔

"تمہارا وہ کوئی پر اہم تو نہیں ہے۔"

"نہیں۔"

"ڈاکر صاحب تو پھر شریف نہیں لاسے تم نے انہیں کہہ دیا تھا کہ ہمارے گھر کا ماحول۔"

"نہیں موقع ہی نہیں ملانہ ہی انہوں نے پھر بھی ابا کا ماحول پر مہیا صبح اس کی صرف ملاقات ہوتی ہے۔ ہاں آؤ وہ بل آئے تھے لیکن مجھے مناسب نہیں لگا جو کہنا۔ یوں ہی یاد دہا ہاں اگر کبھی پھر انہوں نے آنے کا کہا تو کروں گی۔"

"لو کہ اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو یہی ایک حکمت کردی تھی۔"

خضر نے اسے کھانچوڑتے دیکھ کر کہا۔

"تم کھانا کھاؤ اطمینان سے۔ دراصل تم نہیں جانتے ماہ میں تمہارے لیے بہت پریشان رہتا ہوں۔ تم بہت معمول ہو۔ بہت ٹونٹا اور یہ دنیا بہت خالص ہے۔ ابہر کی دنیا میں قدم قدم پر بھڑکے پڑتے ہیں۔ دوڑ لگتا ہے مجھے بہت بری ہے یہ دنیا کا شائے کا ش۔"

اس کی آواز آہستہ ہو گئی۔

"میں تمہارے لیے کچھ ایسا کر سکتا کہ تمہیں گھر سے باہر نہ لگنا پڑا۔"

اس کا انداز خود گا کی کا سا تھا۔ اب نہ چوک کر اسے دیکھا۔

"کیا خضر بھائی۔"

"چکے نہیں۔"

وہ چوکا۔

"تم ایک بامادر لڑکی ہو وہ اور مجھے نہیں ہے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"مجھے کس نے نقصان پہنچاتا ہے خضر بھائی۔" ماہور کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"کسی نے نہیں یا اگل لڑکی ابھی میں نے کیا کہا تھا تم نے سنا۔"

"میں نے سنا تو ہے لیکن سمجھ نہیں پائی۔ خضر بھائی۔ دنیا ابھی ہو یا یہی مجھے اس سے کیا مجھے تو بس کچھ اے۔ سب کے لیے میرا دل چاہتا ہے کہ میں وہ سب کچھ حاصل کروں جس کی میرے گھر کے افراد کو ضرورت۔"

"ان کی وہ ساری خواہشیں پوری کروں تو ان کے دل میں قسم نہیں ہیں۔ اب اسے خوابوں کی تعبیر یوں لیا ٹھیکہ۔"

جائیں۔ ہاں کو یوں دن رات محنت نہ کرنا پڑے۔"

"خدا تمہاری آرزو ضرور پوری کرے گا ماہ لیکن کسی بھی خواہش کے حصول میں حد سے مت بڑھنا۔ کبھی کہ خواہش کو سر پر سوار مت کرنا جنوں مت بنانا۔"

"آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں خضر بھائی۔" اس نے شگہ بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میں تمہیں کیسا سمجھتا ہوں۔ یہ تم ابھی میں جانتا ہوں۔"

خضر کی آواز بھاری ہو گئی۔

"اور ابھی میں تمہیں جانتا ہی نہیں جانتا۔"

اس نے پانی کا گلاس اٹھایا سادہ حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

بھلا خضر بھائی کیسا سمجھتے ہیں اسے اس کی پیشانی پر ٹکٹیں سی نمودار ہوئیں۔

"خضر بھائی آج جانتے ہیں مجھے گھر سے باہر نکل کر جاب کرنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا۔ میں تو بڑھتا جا رہی بہت سارا۔"

”بھائی دیکھا ہے کچھ بدل نہیں گئی۔ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔“

علینہ کو بھی مونہ ملا۔ ماہ نور نے بے بسی سے دونوں کی طرف دیکھا اور خاموشی سے علینہ کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ گھنٹا تھا اس کا گریز اور اسے مٹی کے وسیلے پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ جب سے خالد جان لیڈا سے نکلی تھی۔ مٹی ایک بار بھی طبع پچھو کی طرف نہیں گئی تھیں حالانکہ افضل حیدر نے دو تین بار فون پر بھی بائیکلی گئی تھیں وہ کدو چکر لگائیں۔ لیکن ابھی تک پھر نہیں گئی تھیں اور خضر کو بھی دو ایک بار دے لفظوں میں اور زیادہ جانے سے منع کیا تھا۔ وہ مٹی کے وسیلے کا تجربہ کر رہا تھا اور یقیناً ”ماہ نے بھی اس روز ان کے وسیلے میں کچھ نہ کچھ عیسائیت کا عقائد ورنہ پہلے بھی ماہ یا باپا یا اور سے کوئی بھی آتا تھا تو وہ لوگ انہیں بھجوز آتے تھے۔“

”تو پھر انتظار کرتا یہ انہوں نے ساتھ میں چل پڑنا۔“

انہوں نے علینہ کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف جاتی ماہ نور کو دیکھا جو کچھ پریشان سی لگ رہی تھی۔

”میں جانے دوں گی اسے؟ تھے دونوں احد تو محترمہ تشریف لائی ہیں۔“

ماہ نور کے بجائے علینہ نے جواب دیا۔ تو خضر مطمئن سا ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

علینہ بہت دیر تک اسے نہ ادا حصہ دار سارا کے متعلق بتاتی رہی۔ ”ننارا روز میرے گھر نہیں آئی تھی۔“

اور اصل وہ لوگ بہت کم روز ہیں۔ اسے کسی کے گھر جانے کا اجازت نہیں ہے۔ یونیورسٹی میں بھی عیاں ہیں کہ آتی ہے۔ البتہ حصہ دار سارا کا تعلق جن گھرانوں سے ہے وہ خائے باؤں۔ خاص طور پر سارا کا سارا کا نام

اسپینش ہیں۔ بہت سیوٹ کی ہیں۔ سارا کو ڈراپ کرنے کی تھیں تو ملی تھیں جس میں ان سے۔“

علینہ خاموشی سے اس کی بات نہیں سن رہی تھی۔

”وہ بچے مجھے خداسب سے اچھی لگی ہے۔ لیکن وہ خاصی کم عمری ہے۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ کسی سے بھی

دوستی نہ رکھنا پسند نہیں کرتی۔“

”مجھے چلوں گی تمہارے ساتھ جامدہ تو ملاقات ہو جائے گی۔“

”ہاں لیکن تم آج نہیں اس روز خضر بھائی کے ساتھ تو کتنا اچھا ہوتا۔“

علینہ کو ابھی کہ انفس پر تھا۔

”اسی بھائی کا بچہ کوئی فون آیا۔“

ماہ نور نے ہاتھ بدل دی۔

”ہاں وہ تو تقریباً ہر روز فون کرتے ہیں۔ چاہے صرف ایک منٹ سی بات کیوں نہ کرں۔“

اسفر کے ذکر پر علینہ کے رخساروں پر جو رنگ بگھڑے تھے اور وہ ہنسنوں پر جو مسکراہٹ گل اٹھتی تھی وہ بہت

دلکش ہو گئی تھی۔

”تم بہت لگی ہو عینا۔“

ماہ نور نے بے اعتنا کر کہا۔

”اور خدا کرے کہ خوشیاں ہمیشہ تمہارا مقدر رہیں۔“

”تھیں کسے بوابہ۔“

علینہ مسکرا دی۔ اسگری کی جاہت کا احساس اسے اندر تک خوش کر دیتا تھا۔ پھر بہت دیر تک وہ ماہ نور سے اسگری

باتیں کرتی رہی۔ اپنا ایک ایک احساس اس سے شیئر کیا۔

”میں ساری باتیں کسی اور سے نہیں کر سکتی ہاں تم جانتی ہو۔ اس لیے جب تم میںوں غائب ہو جاتی ہو تو مجھے تم پر غصہ آتا ہے۔“

”خدا کا خوف کرو علینہ ابھی تو کوئی دس دن پہلے میں آئی تھی اور خود تم۔ تم آجیا کرو لیکن تم امیر لوگ بھلا ہم غریبوں کے ہاں۔“

”فصلوں باتیں میں کرو۔“

علینہ نے اس کی بات کھنڈی۔

”تم جانتی ہو ہمارے درمیان ایسا کوئی احساس ابھی پیدا نہیں ہوا۔ ہاں بھائی بچپن سے ہی ہمیں یہ یاد کر دیا ہے

کہ تم ہماری پچھو کی بیٹی ہو۔ اگرچہ وہ پہلی سکی نہیں بلکہ ماموں زاد بہن ہیں لیکن بھائی ہمیں کی بتایا ہے کہ

طبع پچھو خضر کا پچھو اور منہ پچھو میں ان کے لیے ایک جیسی ہیں انہوں نے بھی تینوں میں فرق نہیں کیا تو پھر

ہم کیوں ایسا سوچیں لیکن تم یہ باتیں بائیں بائیں کر کے دل تو زوئی ہو۔“

علینہ نے تفصیل سے بات کی۔

”سوری ڈیڑھ مذاق کر رہی تھی تم میرے ہنس ہو گئیں۔“

ماہ نور نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”تم کو ایسی دل جلا دینا بات کرتی ہو۔“

علینہ کا منہ پھولا ہوا تھا۔ تب باہر گٹ پر تیل ہوئی۔

”شاید منہں ہوگا۔“

ماہ نور نے کہا اور علینہ کی طرف دیکھا اور اٹھنے لگی۔

”میرے اخیال سے مجھے منوں کے ساتھ جلا جانا چاہیے۔“

”ڈیڑھ رو آؤ آرام سے۔“

علینہ نے اس کے کراہوں پر ہاتھ رکھ کر اسے بٹھایا۔

”گرم تو خضر بھائی نے نہ وہ نہیں پھوڑ آئیں گے۔“

”لیکن۔“

”چپٹی چپٹی رہو۔“ علینہ نے اسے گھر کا۔

”ہاں اسے کو چیلے۔“

لاؤنج سے منور کی آواز آئی تو علینہ دروازہ کھول کر باہر نکل۔

”دیکھو منصور۔“

”وہاں کہاں ہے۔“

منصور فائل ہاتھ میں چکرے لاؤنج کے پتوں بچ گھڑا تھا۔

علینہ نے بائیں کو آواز دی۔

”میں پلیر مجھے ہو جائے گی ماہ کو پچھو ذکر مجھے یونٹن کے لیے بھی جانا ہے۔ پہلے ہی لپٹ ہو گیا ہوں۔“

علینہ نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ چہرے پر تھکاوٹ تھی اور سنجیدگی اسے ایک دم اس پر ترس آنے

کا۔ بچپن میں کتنا ہنس کھ اور شرارتی ہوا تھا۔ میں بھائی سے کہوں گی کہ وہ منوں کی تعلیم کے اخراجات دے دیا

تھیں۔

وہ ایسی ہی تھی ایک دم غصہ آتا ایک دم دل ہیچ جاتا تھا۔ ماہ نور بھی باہر نکل آئی تھی۔

”چلیں۔“

منصور نے اس کی طرف دیکھا۔

”خضر بھائی پھوڑ آئیں گے ماہ اونٹنے دوں احد تو ملاقات ہوئی ہے۔“

”ابھی تک کی نہیں بھرا بائیں کر کے۔“

منصور کے سنجیدہ چہرے پر ابھی سی مسکراہٹ بہت بھلی لگی تھی وہ دونوں کی اس گرمی دوستی سے واقف تھا۔

”میں نہیں جی ابھی تو جی ساری باتیں میں کرے دو۔“

علینہ نے معصیت سے کہا اور لاؤ گے کہ صوفے پر اپنی آبی یا تری مار کر بیٹھ گئی۔

”تا نہیں تم لو کہیں کہ اس اپنی باتوں کا ذخیرہ کہاں سے لکھا ہوا ہے۔“

”میری باتیں تم لو کہیں بھی کر نہیں ہو سکتی۔“

علینہ مسکرائی۔ اور ماہ نور کو بھی بیٹھے کا اشارہ کیا۔ یا نہیں بیٹھی ہے آئی تھی۔ منصور بیٹی بی کر فرما رہی تھی

نگل کیا تھا۔ علینہ کے اصرار پر بھی رکائیں تھا۔ علینہ نے لی وی ان کر دیا تھا۔

کوئی بہت اچھی سموی آ رہی تھی وہ دونوں ہی وی دیکھتے ہوئے باتیں کرنے لگیں۔ علینہ کے پاس واقعی بہت

ساری باتیں تھیں۔ اس دوران انہوں نے چائے بھی پی لی تھی وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا جب خضر آئی

کونے کر آیا تو بارہ گھبر کر کلاک پر نظر ڈالی۔

”وہ آٹھ بج گئے۔“

”وہ منٹ بھیسو یا بھی آہوں کہہ بیڑے لوں کہے سے مجھے ابھی پر وہ رزاق صاحب کو پہنچانے ہیں۔“

خضر اسے کٹے کا اشارہ کرنا ہوا اس نے کمرے میں چلا گیا۔

”کب آئی تھیں تم۔“ سعیدہ بیگم نے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ صبح کے قریب۔“

وہ کھڑی ہوئی تھی۔

”خضر کے ساتھ آئی ہو گی۔“

ان کا کلبہ سے حد سہا اور چوسپا تھا۔

ابرج سے گھٹتے ہوئے اس نے چوک کر انہیں دیکھا۔

”نہیں اپنی ایک کو بیگ کے ساتھ آئی تھی۔“

پتا نہیں کیا بات تھی اس نے اس کے سادے سے لباس بھی کٹ محسوس ہوتی تھی۔

”وہ اچھا اچھا کرتے بتایا تو تھا اس روڈ کے تھماری کوئی کو بیگ اور قریب ہی رہتی ہیں اور بال عینا۔“ وہ بات

کرتے کرتے علینہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”ایک خوشخبری ہے۔“

”کیا۔“

علینہ کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔

”بھی تمہارا کہہ رہی تھی کہ ہاشم اللہ خضر اب اپنا کام کر رہا ہے اس کی شادی ہو جانا چاہیے۔ کوئی لڑکی دیکھو میں

نے کہہ دیا مجھے ہر لڑکیاں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ عرض ناش تو ہے۔ میرا جو بہت خوش ہوئی کہ تمہاری اپنی

ہیں۔ میں نے بھی عرض کیے کہہ دیا ہے میرا سے خضر کے ساتھ بہت سوٹ کرے گی اور یوں بھی وہ بیڑی ہے۔

تمہارا بھیا آج میں روایت کی کر دیں گے۔ چادر اور آج میں ماہور کے ہاتھ کو بھر کر کہتے تھے لیکن پھر وہ چادر

اڑھٹے گئی۔ سعیدہ بیگم نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی سیات سا چہرہ کی جذبے کو محسوس نہ کر رہا تھا اور پھر

خضر کو دیکھا جس نے کمرے سے باہر آئے ہوئے ان کی ساری بات سن لی تھی اور اب آنکھوں میں حیرت اور دکھ

لیے ساکت کھڑا تھا اور اس کا چہرہ لہو لہو رنگ بدنگل رہا تھا۔

سعیدہ بیگم نے فوراً اپنی نظر اس کے چہرے سے ہٹائیں اور ماہ نور کو دھانچا کئے گئیں۔

”کیا بچہ جمی ہوئی بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔“

رفضان نے چائے کا کپ اچھے اچھے دیکھتے ہوئے پوچھا تو قریب بیٹھے مشرے نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی۔

”تمہی دھندہ کما ہے مجھے مولیٰ مت مارو۔“

”سوئی۔“ رفضان نے فوراً سوئی کر لیا۔

”میاں بی کہہ رہے تھے کہ اب جلد ہی وہ بھی بھائی کی شادی کریں گے۔ میں نے خود سنا تھا۔“

”کب مت۔“

مشرے حارڈا۔

”نہیں ہوں میں مہلی شہی مشرے میرا نام آئندہ مجھے میرے صحیح نام سے پکارنا مجھے۔“

”جی ہاں۔“

رفضان خوفزدہ ہو گیا۔ انہم نے ایک تاسف بھری نظر اس پر ڈالی۔ وہ ایسا نہیں تھا کہ بھی ایسا نہیں تھا۔ یہ

بہت فتنہ تھا اور فریڈلی سا تھا۔ بھی کسی ملازم تک سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی اس نے لیکن جیسے

ایک ماہ سے وہ ایسا ہی ہو گیا تھا۔ راز رازی بات پر کات کھانے کو ڈھونڈتا تھا۔ میاں صلاح الدین اور عذرا بیگم بچپن

یہ سے اسے بار سے بھی نہ کر لیا کرتے تھے۔ سمن بیٹھ مولیٰ کتنی تھی اور وہ نے جب بولنا شروع کیا تو اسے

شہی بھائی کہہ کر لیا کہ آٹھ گھر میں جس کا جو بھی چاہتا ہے کہہ کر لانا دیتا تھا اس نے بھی برا نہیں منایا تھا۔

”وہ بیٹھے بھائی کہتے تو صبح نہیں ہوتا۔“

رفضان نے سرگوشی کی تو سرگوشی پر گزند تھی۔

”اب کمن نہیں آج میں کی تو ان کے سامنے اچھا تو نہیں لگے گا کہ ہم انہیں شہی بھائی یا مولیٰ بھائی کہیں۔“

اب تو ہم انہیں مشرے بھائی ہی کہا کریں گے۔“

انہم نے ابھٹکی سے اسے کہہ کر۔

”رفضان فضل یا میں مت کیا کرو جاؤ جاؤ جاؤ کہہ کر ڈھکڑاٹھ گیا ہے یا نہیں اور اگر نہیں اٹھا تو اٹھا دو جا کر

قاری صاحب آنے والے ہوں گے۔“

”دیکھ آئی بھائی بھائی کی شادی کب ہو رہی ہے۔“

اس نے جانے جانے پوچھا۔

”بھیا کریں اسے اور اب اپنی شکل مت دھاننا۔“

مشرے غصے سے اٹھوڑا۔

”بہت شوق ہو رہا ہے تا جسیں شادی کا تو خود کر دالو اپنی شادی۔“

”میری شادی۔ آپ بھی مذاق کرتے ہیں مولیٰ بھائی۔“ شہی بھائی۔ میں تو ابھی بچہ ہوں۔“

”اور میں تو جیسے بڑھاپا ہو گیا ہوں نا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”ریٹیکس مشرے۔“ انہم نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”جیسے ریٹیکس ہو جاؤں آئی آپس میں جاکر۔“

”وہ اچھی خوب صورت لڑکی ہے۔“

انہم کا کلبہ سمجھنے والا تھا۔

”کہ بہت خوب صورت ہے۔“

”تو میں کیا کروں خوب صورتی کو۔“ مشرے جھنجھلا ہوا تھا۔

”میاں سناتا نا کھلی اعتبار ہوں آئی۔“ آخر کیا کیا کیا مجھ میں اباجان نے کہ ایک عذاب مجھ پر مسلط کر رہے

ہیں۔“

”بات اعتبار کی نہیں ہے شہی۔ بس اباجان کی اپنی غلطی ہے اپنی سوچ ہے۔“

”مجھ سوچ ہے۔ کیا دنیا میں واحد میں خوب صورت ہوں۔“ میں چاہتا ہے اس خوب صورت چہرے پر تیزاب

پینیکل دوں جس کی بنا پر اباجان نے میرے لیے سزا تجویز کی ہے۔“

”فضل یا میں مت کرو۔“



انغم کانپ گئی۔ اسے یکدم سمن کا خیال آیا تھا۔ اگر خدا نخواست۔ اس نے جھرجھی سی۔  
 ”دعہ کو تم اتنے اندھی غلط بات نہیں سمجھو گے۔ وہ تم کا دلی جان کے سر کی۔ کوئی ایسی حرکت نہیں کرو  
 گے ابھی تو سمن نے جو کچھ کیا ہے اس کے پاس دہشت مل سے کم نہیں ہوئی۔ وعدہ دھڑکی پلینز۔“  
 ”تہی۔“

میشر نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور ہٹ کر کھائے گا۔  
 ”زیکو وضعی ابھی فوراً توشاری نہیں ہو رہی اباجان نے کہا ہے تمہارے انگرام کے بعد رخصتی کرو اس کے  
 ابھی تو صرف غلطی کا فکشن ہو گا۔“

”اور انگریز سمن کو اس صمدیاں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نو سو واحد ہو جائیں گے۔“  
 ”پسے نائے میں بھی تو کم عمری میں شادیوں ہو جایا کرتی تھیں۔ خود اباجان بھی تو کہہ رہے تھے کہ جب ان کی  
 شادی ہوئی تو ان کی عمر۔“

”بات کم عمری کی نہیں ہے۔ تہی۔“  
 ”میشر نے غصے کی بات کاٹ دی۔“  
 ”بات تو اعتبار کی ہے۔ اباجان کا خیال ہے کہ میں جہاؤں گا اس لیے مجھے پہلے ہی پابند کر دیا جائے گا کہ میرے  
 بگڑنے کا امکان نہ رہے ان کا خیال ہے کہ کیل دیکھ کر لڑکے وقت سے پہلے ہی بڑے ہو رہے ہیں لہذا۔“  
 اس کی توجہ اڑا رکھی۔

”کیا میں ایسا لگاؤں آپ کو بھی کم میں۔“  
 وہ بے سبب تھا اور ان کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کیسے اسے تسلی دے اور کیسے سمجھائے کہ اس کے دل پر

چھایا غبار کہہ ہو جائے ”مگر اباجان کہتے کہ انہیں میری شادی کا خوف ہے کہ میں کوئی خوش دیکھا جاتے ہیں تو بخدا  
 میں ہرٹ نہیں ہو سک۔ لیکن اب یہ شادی میں سزا ہے۔ اور میں اگر بگڑا جاؤں تو اس کے بعد بھی بگڑ سکتا ہوں  
 اور کیا شادی کھٹے میں جائے والے چار چار چہرے بچوں کے آپ نہیں ہوتے ہیں۔ کیا شادی شہرہ دیوں والے مرد  
 نہیں بگڑ سکتے بلکہ میرا خیال ہے کہ زیادہ تر ان کی بیویوں جائے والے ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔“  
 احم حیرت سے سرائے اسے اور دیکھ رہی تھی۔ یہ میشر چند ہی دنوں میں قحط پڑی ہوئی باتیں کرنے لگا تھا۔ چند  
 دن پہلے کہ وہ اور سمن سے لڑنا چھوڑ کر شادی میں گرنا۔ معصوم بچوں کی حرکتیں کرنے والا میشر۔ اس وقت  
 پشیمانی پر غصے والے نتیجہ سا بیٹھا تھا کہ آپ کیلے والے میشر سے کتنا مختلف لگ رہا تھا۔  
 احم کا دل بے حد ہلکا۔

اس گھر میں سمن اور میشر کی وجہ سے ہی رونق تھی اور دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔ سمن نے کالج میں  
 ایڈمیشن بھی لے لیا تھا۔ لیکن زیادہ تر خاموش رہتی تھی۔ بہت کم بات کرتی تھی۔ میاں صلاح الدین نے تو اس  
 سے بات کرنا اور کتنا اس کی طرف لگنا کہتے جو زیادہ تھا۔ تھا تھا کہ وہ بولے پہلے ہی بھی اسے مخاطب نہیں کیا۔  
 بھی دیکھا نہیں حالانکہ کچھ سے سمن سے ضرور کوئی نہ کوئی بات کرتے تھے بلکہ سمن خود ہی ان سے باتیں کرتی  
 رہتی تھی۔ ابھی اسکول کی کوئی بات بھی کسی سہیلی کا ذکر بھی نہ ڈور اور دانی کوئی معصوم بات اور وہ پوری توجہ  
 سے اس کی بات سنتے تھے۔

سمن کے ایڈمیشن فارم میں جو ہو گئے تھے اور اس روز پچھنی کا دن تھا اور حسب معمول میاں صلاح الدین  
 برآمدے میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے جب سمن کے کمرے سے نکلی اور ان کی کمری کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اپنے  
 ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔

”ابا بی۔“

بمخصل اس کے لیوں سے نکلا تھا اور پھر آنسوؤں نے اس کا لگا گھونٹ دیا۔

وہ بے حاشا رو رہی تھی۔

”مجھے معاف کریں۔ میں اس طرح ایڈمیشن نہیں لےنا چاہتی تھی۔ آپ کو ناراض کر کے خدا کے میں تو  
 قابل کر کے آپ کی اجازت سے رہنا چاہتی تھی۔“

”یہ قابل کرنے کا اچھا طریقہ سوچا تھا تم نے سارے شرمیں میاں صلاح الدین کی گڑبی اچھلتی وہ تو خدا نے  
 لڑ کیا اور تم نے تو کوئی ٹکڑ نہیں چھوڑی تھی۔“

”مجھے سے غلطی ہو گئی اباجی میں نہیں پڑھوں گی مجھے نہیں پڑھنا اباجی مجھے معاف کر دیجئے۔“  
 انہوں نے اس کے ہاتھ گھٹنوں سے ہٹا دیے تھے اور ہر موڑ لیا جیسے وہ اب مزید اس سے کوئی بات نہیں کرنا  
 چاہتے۔

”اباجی بچوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ وہ شرمندہ ہے تو آپ پلیر سے معاف کریں۔“  
 اس نے جانے کب کر کے سے گل کہا ہر آنے تھے۔

”آپ سے کتنی بار کہا ہے اسٹرمیاں آپ ہر معاملے میں مت بولا کریں۔ میں بہت جانتا ہوں کہ مجھے کیا  
 لڑنا ہے۔“

اس نے کچھ پرے کا رنگ دار سا بڑا تھا پھر ان کی نظروں کی ہوئی کہ پڑی تو انہوں نے اسی دیکھنے اور نرم لہجے میں  
 پھر درخواست کی تھی۔

”تھیک ہے اباجی لیکن یہ بچی ہے بہت سبب ہے۔ آپ ایک بار اسے معاف کریں۔“

انہوں نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی تھی اور اخبار وہاں سے بھینک کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے تب اس نے  
 نے آگے بڑھ کر سمن کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

”چلا اٹھو گریا ہو لے ہو لے اباجی خود ہی معاف کریں گے۔ ابھی انہیں غصہ ہے نا۔“ انہوں نے اسے اپنے  
 ماتھے لگایا۔

”لیکن اسنی بھائی میں اس گھر میں سب سے زیادہ اباجی سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے سے ان کی یہ بے اعتنائی  
 برداشت نہیں ہوئی اباجی۔“ اور اس نے ہلے سے ہٹکے رہے۔

وہ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھی تو پڑی پر امید نظروں سے انہیں دیکھتی تھی کہ شاید آج اباجی اسے مخاطب کریں  
 لیکن شاید انہوں نے اپنا دل پکڑ لیا تھا۔ اور سمن وہ جیسے خود پھر بھی جاری تھی اور ہر چہرے میں اس کے ہاتھ  
 میں بولانی پھرتی تھی اور اب میشر۔

اس روز میاں صلاح الدین کے ساتھ وہ شیخوہہ تھے۔ البتہ سمن نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ حاجی  
 عبد الستار بھی احم کو میاں صلاح الدین کی طرح ہی لگے تھے۔ اور غزالہ ان کی پیش پیش صورت میں بے مشل تھی

لیکن حیات کی لحاظ سے کچھ بھی نہیں۔  
 ”تمہیں جماعت میں پڑھانی چھوڑی تھی اس نے حالانکہ میں تو جانتی تھی کہ کم از کم رو دکھنا پڑھنا ہی کچھ

لے۔ لیکن یہ بتا رہی تھی تو اس کے اباجان نے اٹھا لیا اسکول سے اپنے اباجان کی بہت لاڈلی ہے اور بھائی بھی جان  
 پہنچتے ہیں اس پر۔“ پھر حاجی عبد الستار نے بتایا تھا۔

احم نے محسوس کیا تھا کہ وہ عمر میں میشر سے ایک دو سال بڑی ہی ہو گی لیکن چہرے پر معصومیت اور بچپن تھا  
 بظاہر اسے ابھی بھی کئی کئی عوام حالات میں خوشگوار روئے کے ساتھ سب کی رضامندی سے یہ رشتہ پٹا

تھا وہ وہ سب خوش ہوئے لیکن اس وقت سب کے دلی ہوئے تھے۔ حاجی عبد الستار کے بڑے سے  
 ڈائیننگ روم میں وہ سب چپ چاپ بیٹھے تھے صرف غزالہ کی دادہ وہ رہی تھیں۔ لکھتے ڈرائنگ روم میں مرد

تھے سب مفرک میاں صلاح الدین کے ساتھ لائے تھے مفرک خاتم کے پاس بیٹھا تھا۔  
 ”بشر کو بھی آپ نے آئے تو چھوڑا تھا تب تو طے پا چکی ہے۔“

تیکم عبدالستار نے کہا تو خدا رب تیکم نے ایک نظر اُمس دیکھا۔  
 ”اب آ رہے گا۔ آپ شریف لائے گا۔“  
 ”جی، وہ حاجی صاحب کہہ رہے تھے جہہ کو چلیں گے، ہم سب۔“  
 ”جھا۔“

خدا رب تیکم کو دکھ سا ہوا میاں صلاح الدین نے ان سے کوئی ذکر نہ کیا تھا وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ فی الحال وہ رشتہ بانٹنے جا رہے ہیں۔ لیکن میاں تو سب کچھ مٹا چکا تھا ان کی نسبت حاجی عبدالستار کی تیکم زیادہ خیر تھیں۔  
 ”میں نے تو کہہ دیا ہے حاجی صاحب سے ہماری انگوٹھی جینی ہے ہم تو دھوم دھام سے منگنی کریں گے اپنی بچی کی۔“

خدا رب تیکم اور کیا کہیں۔  
 ”جیسا آپ کہیں گے ویسے ہی کریں گے۔“

”ویسے بن ہشام اللہ آپ کا بیڑا لڑکا بھی بڑا سمجھ اور بڑھا لکھا ہے۔ شکل و صورت کا بھی بھلا پھر آپ نے اس کی بات پینے کیوں نہیں چلائی۔“  
 ”دراصل اس کو ابھی باہر پانا ہے پڑھنے کے لیے ہیں چار سال تو لگ جائیں گے تو میاں صاحب کا خیال ہے کہ کسی دوسرے کی بیٹی کو خواہ مخواہ تیکم نہیں کر سکا ہے۔“  
 ”شاء اللہ بھائی صاحب۔ مت سمجھادیں۔“

کھانے تک تیکم عبدالستار مسلسل بولی رہیں۔ انھیں نے چاہا کہ وہ خدا والد سے بات کرے لیکن وہ مسلسل شرابی رہی اور بہت کم بولی۔ میرا حال انھوں پر ہی نہیں مٹی تھی۔ کھڑے ہی سن نے جو بسلا سوال کیا وہ میاں صلاح الدین کے متعلق تھا۔  
 ”کیا ابائی نے میرا پوچھا تھا کہ میں کیوں نہیں آئی۔“  
 ”نہیں۔“

انھیں نے نظریں چرائی تھیں اس میں سن کا باپوس چہرہ دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔  
 ”کیسا باہر بھی نہیں آئی۔“  
 ”سن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔“

”ابھی آئیں بہت غصہ ہے سوئی۔ تمہوڑا وقت تو لگے گا بڑا۔“  
 ”اور دفعہ۔ کیسی ہے ابائی نے شہسی کے لیے بند کیا ہے۔“  
 اس کا انتہائی چاہ رہا تھا کہ وہ اسے دیکھے کہ وہ کسی سے وہ ہمیشہ ہی میسر سے کہا کرتی تھی۔  
 ”وہ بھی مولیٰ کے بچے تمہاری سن میں نے بند کر دیے۔ اس میں خود بند کر لیتا۔“  
 ”پتلے تو بچ کر نہ۔ مولیٰ نہیں شہسی۔ (اسے مولیٰ بالکل بے بند نہ تھا) وہاں پتھر کھاتے آگے بڑھاؤ۔“  
 ہم نے تمہاری درخواست قبول کی۔“

وہ اس کا ہاتھ بڑھ کر رکھ کر وعدہ کرنا تھا۔  
 اور اب ابائی نے ہالایا اب کچھ کر لیا تھا۔  
 ”جی جی میں بہ بڑکے بچ نہیں ہے۔“  
 میسر نے دور سے میسر مکا داوا تو انھوں کی اور اس نے میسر کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر کراتا تھا۔ اس کو خوف محسوس ہوا۔

”مولیٰ اور ان شہسی۔“  
 ”اور ان میں بھی ایسا ہی کر۔ ایسا جیسا ابائی نے میرے ساتھ کیا ہے۔“

اس نے سرخ آنکھوں سے انھیں کی طرف دیکھا۔  
 ”میں نکاح کے وقت انکار کروں گا مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے تو پھر کیا عزت رہ جائے گی ابائی کی۔“  
 وہ عجیب طرح سے ہنسا۔  
 ”میں نا آئی۔“

”اس وقت کل ابائی کا چہرہ کینے کے قابل ہو گا۔“ وہ پھر ہنسا۔  
 انھم کارنگ زور دیا تھا وہ پریشان اور خوفناک ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔  
 ”میں شہسی تم ابائی نہیں کر سکتے۔ تم ابائی نہیں کرو گے۔ تمہیں بھلا ابائی کی بے عزتی کر کے کیا حاصل ہو گا۔“  
 اس کی آواز آہستہ اور نرم آؤ گئی۔  
 ”شاید کچھ بھی نہیں لیکن میرے دل کو تسکین مل جائے گی کہ میں میں بھی اپنی ذات کے حوالے سے کچھ

دینے کر سکتا ہوں اپنے لیے۔“  
 وہ سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا کر کے جس میں خدا وہ ایسی عمر تھی کہ جس میں جذباتیت پر قابو نہیں لایا جا سکتا۔  
 ”من تو تمہیں اس سے بڑی تھی۔ پھر مجھی اس نے جذباتی ہو کر اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اور مجھ نہ صرف تمہیں اس سے بچھڑا تھا بلکہ وہ لڑکا تھا۔ وہ مجھ بھی کر سکتا تھا۔ انھیں نے تصوریں بھری میں میسر کو نکاح سے انکار کرتے ہیں اور پھر میاں صلاح الدین کا ڈرنا رنگ ان کی شہر سے بھلی نظر میں۔“

”میں۔“  
 انھیں نے سختی سے میسر روکے اس کا ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دیا۔  
 ”میں تمہیں ابائی نہیں کر سکتی شہسی تمہیں ابائی کی کو بہ عزت کا پند نہیں کر سکتے۔“  
 ”ابائی میں ایسا نہیں کر سکتا۔“  
 ”بھری آواز دے گی۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں بڑھل ہوں میں ابائی سے ذرا نہیں یا پھر میں ابائی کا احترام کرتا ہوں اور تم سب سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں چھوڑ کر تم سے الگ ہو کر نہیں سکتا۔ آپ صحیح بھی ہو کئی میں ایسا نہیں کر سکتا۔“  
 ”میں سر رکھ کر روئے لگا۔ وہ نول یا نولوں سے چڑا چھپانے وہ بولے ہوئے سک رہا تھا انھم کا ہاتھ اس کے اندر سے تھا۔“  
 ”شہسی مولیٰ بلینز۔“

وہ بولے ہوئے سے رہا تھا۔ بس بولے ہوئے سک سکیا لے رہا تھا۔  
 ”شہسی شہسی مت کرو ایسا مت پوچھنا چھوڑ دو میں ابائی سے بات کروں گی۔ میں کہوں گی ان سے ابھی تو یہ بات ہی نہ ہوئی ہے۔ تاہم ابھی تو وہ لوگ مارے کھڑے ہیں آئے اور ابھی عقلی کالکشن بھی دہشتہ بعد۔“  
 ”میں وعدہ کر رہی ہوں تاہم میں بات کروں گی ابائی سے۔“ انھم ابائی آواز میں آنسوؤں کی میسر بھی آؤ وہ فخریہ پر قابو پائے کڑی تھی۔ ورنہ اس کا بی چاہ رہا تھا کہ وہ خود بھی دھڑک رہا تھا اس کا ہاتھ ابائی کے تھامنے سے میسر نے کمرے سے باہر نہیں۔ ان کا چہرہ سنا ہوا تھا اور وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھیں قریب آکر انہوں نے میسر کے ہاتھ پر ایک نظر دیکھا اور پھر انھم کو۔

”انھم ابائی تیار ہو جاؤ ابھی ذرا یہ آگے۔ تمہارے ابائی کا فون آیا ہے کہ دس کے لیے ڈریس پند کر کے آؤ۔ آؤ۔ آؤ۔“  
 انھم نے مڑ کر خدا رب تیکم کو دیکھا۔  
 ”اور تمہارے ابائی کہہ رہے تھے گور ختی میسر کے ایڈم کے بعد ہو گی لیکن نکاح منگنی کے ساتھ ہی کر دیا گا۔ اس لیے جو زائنا دار ہو جا رہے۔“

میشرنے ایک جھٹکے سے سرائیا۔  
 "میں ایسا نہیں کر سکتا آئی میں آپ دیکھ لیتا میں ایسا ہی کروں گا میں نکاح کے وقت اور تب جب چاہے گا  
 گل الٹی کو۔"

وایک دم انھا کرسی کو گھبرا اور تین چار دنوں سے پورچی کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں ہاتھ کرسی کی ایک سر رکھے  
 انھیں ہاتھ ٹھکڑی اسے جاتے۔ چلے رہی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا کرنے جا رہا ہے۔ یہ انھیں اسے روک۔ خدا کے لیے اہم کہیں یہ کچھ نہ بیٹھے۔" غمرا  
 حکم دونوں ہاتھ دل پر رکھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ انھیں نے ان کی زبردستی رنگت کو دیکھا اور اسے اچھا پسند کر کے  
 لبوں سے نکلی۔

"نہیں۔ ای۔" اور پورچی کی میڑھیوں سے انزائش برائیں کی چٹن کر کر کر اور پھر یکدم بھاگتا ہوا پس منڈ۔  
 اس نے اہم کو ای ای بکارتے سنا اور اسے لگا جیسے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا میں اور وہ  
 نہیں نہیں کی کرکار کر رہا ہوا پس منڈ تھا گیا۔

"شاہ رخ۔" رات بارہ بجے جب شاہ رخ نے حویلی کے برآمدے میں قدم رکھا تو بی بی جان کو تواز پر ٹھک کر رک گئے وہ  
 برآمدے میں بی بی بڑی پتھر پر بھیٹا غالباً میں کی ہنسنے لگی تھی۔  
 "بی بی بی جان تیرے آپ یہاں اس وقت" وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے چلتے کران کے سامنے آ  
 کھڑے ہوئے۔

بی بی جان نے ایک غصیلی نظارن پر ڈالی۔  
 "میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی شاہ رخ شام۔"  
 "جی۔"

شاہ رخ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔  
 "کہاں تھے تم آپ تک۔"  
 "وہ۔" ایک دم حسی سرکراہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

"آپ میرے کھان چنے کے لیے یہاں بھی ہیں۔ حالانکہ میں نے فضل وادے کا تھا کہ اندر اطلاع بھجوا  
 دے کہ میں شاہ بابا کو لے کر ہسپتال جا رہا ہوں یہاں اس نے اطلاع نہیں بھجوائی۔"  
 "اطلاع مل گئی تھی لیکن شاید تم بھول گئے تھے کہ آج تمہیں یہاں جانا تھا۔"  
 "کہاں جانا تھا۔"

وہ بے حد ہنسنے لگے یہاں سے امن آباد کے ہسپتال تک کارا سے پورے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ پھر  
 شاہ بابا کی حالت کافی خراب تھی۔ وہ تو اتفاق تھا کہ اس میں بھی میں ایک وائف کارڈ انٹرمل کیا تھا۔ جس نے  
 بہت اچھی طرح سے شاہ بابا کو دکھا تھا۔ ان پر شدید کمزوری کا حملہ ہوا تھا۔ کافی دیر کی شفقت کے بعد کہیں جا کر  
 انہوں نے انہیں کھینچ لی تھی اور بے حد اچھی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"شاہ بابا۔"  
 انہیں دھار آکھیں بند کرتے دیکھ کر شاہ رخ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔  
 "کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔"

"تمہارا بول۔"  
 ان کی آنکھوں میں ہنسنی تھی۔  
 "شاہ بابا میں شاہ رخ ہوں آپ نے پہچان نہیں۔"

"جھا۔"

انہوں نے ہنسی سرکرایا۔

"تم شاہ رخ ہو۔"

شاہ رخ کو ان کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی وہ تو انکرا ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ جاتے جانے ان کا احوال  
 پوچھتے تھے اور وہ بھی بہت محنت سے ان کی باتوں کے جواب دیا کرتے تھے۔ ورنہ ان کی تو عادت تھی کہ وہ اکثر  
 خاموش رہتے تھے لیکن شاہ رخ سے تو پوچھنے سے ہی بہت خوش ہو کے بات کیا کرتے تھے اور یہ صحیح تھا کہ جھٹکے  
 بند ہر سولہ دنوں سے شاہ بابا کی طرف نہیں جاسکتے تھے لیکن اسے دنوں میں بھلا وہ انہیں بھول سکتے تھے۔ باطل  
 سے تو وہ جیسے بھول گیا کرتے تھے لیکن شاہ بابا کی آنکھوں میں ایسی اہمیت تو انہوں نے بھی نہیں دیکھی تھی۔

"شاہ بابا جیسے بھول گیا کرتے تھے لیکن شاہ بابا کی آنکھوں میں ایسی اہمیت تو انہوں نے بھی نہیں دیکھی تھی۔"  
 "شاہ رخ تھابت نے ان کے ذہن پر لٹر ڈالا ہے کچھ آپ کرس کہیں انہیں یہاں ایڈٹ کروا جائیں۔ کل  
 ہمارے سینئر ڈاکٹر راج صاحب آئیں گے تو وہ بھی چیک کر لیں گے یوں ہی ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ چار روز  
 ہسپتال میں ہی رہیں۔" انہیں اندر آ کر رویشن کر گئیں گے لیکن انہوں نے عارضی شفقت دی ہے انہیں۔"  
 ڈاکٹر کے مشورے پر انہوں نے شاہ بابا کو وہاں ہی ایڈٹ کروا دیا تھا۔ ان کے لیے کرا لینے اور سارا بندوبست  
 کرنے میں گیارہ دن گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ حویلی سے کسی کو بھیج دیں گے جا کر شاہ بابا کے پاس رہنے کے لیے۔  
 "تو کیا یہ بھی نہیں دلاؤ نا پڑے گا کہ آج ہمیں بڑی حویلی جانا تھا شاہ زب کی آدین نکلتے۔"  
 "وہ۔"

انہوں نے ایک گراساں لیا۔

"سوری بی بی جان لیکن شاہ بابا کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ بڑی دیر بعد انہیں ہوش آیا۔ اس حالت میں  
 انہیں چھوڑ کر کیسے واپس آجائے۔"  
 "ان کے ساتھ کسی کو کر کو بھی بھیجا جاسکتا تھا شاہ رخ۔" بی بی جان انھیں ناراض تھیں۔

"تم جانتے ہو وہاں سب سے تمہارا اکتا ہوا چھوڑا شاہ زب نے کتنا برا محسوس کیا تمہارے نہ ہونے پر۔"  
 "یہ آئی تو تقریب نہ تھی جس میں میرا بہت ضرور تھا۔"  
 "تمہارے لیے شاہ زب نہ ہو لیکن ہمارے لیے بہت اہم تقریب تھی۔"

"کہا ایک انسان کی زندگی سے زیادہ اہم کی بی بی جان۔"  
 ان کے کنبے میں حیرت اور دکھ تھا۔  
 "وہ عمر کے اس حصے میں ہیں جس میں اس طرح کی بیماریاں لگی رہتی ہیں۔"

"بی بی جان۔"  
 شاہ رخ کے لیے کچھ کاھڑ گیا۔  
 "یاد باد والدین کو بڑے ہو جائیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ بیمار ہوں تو یہ کہہ کر دکھایا ہے

انہیں ترستے دیکھتے رہیں۔"  
 "شاہ رخ تم بحث نہ کرتے ہو۔"  
 "میں نے سوچتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔"

"تمہارا کیا رشتہ ہے ان سے وہ تمہارے والد کے سوتیلے بچا ہیں۔" یہی نا کہی رشتہ ہے تمہارا ان سے اور شاہ  
 تمہارا بھائی ہے گا بھائی۔"  
 "ان سے کیا رشتہ ہے بی بی جان میں نے یہ ہرگز نہیں سوچا تھا میرے لیے وہ ایک انسان تھے اور میرے  
 یہ انسانی زندگی کے بعد جیسی ہے اور اسے جانے کی کوشش کرنا میں نے اپنا فرض سمجھا تھا۔"

ان کے لیے جس گلدرد کیا۔

”تم میرے بھائی کو تمہاری اہمیت نظر میں لے کر میرے لیے کیا ہو۔ تم نہیں جان سکتے میری جان تم بہت اہم ہو مت عزت رہو۔ خود کو شاہیالے سے یکسر مت کرو۔ تمہارے لیے تو میں جان میں دے سکتا ہوں زیب بہر حال ایک چھٹی سی قبر میں شرف سے زیادہ اہم ایک انسانی زندگی ہے۔“

”آپ سچ کہتے ہیں۔“  
شاہ زیب کی آواز آہستہ تھی اور چوساٹ لیکن شاہ رخ نے اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اور منکرائے تھے۔

بہر حال زندگی کے نئے سفر میں قدم رکھنے کی تازگی طے ہونے پر بہت مبارک ہو۔“

”فہمکنس۔“  
شاہ زیب نے ایک کمری کو جوتی ہوئی نظراس پر ڈالی۔ وہ ایک خوش سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے گی۔

”خدا تمہیں اور زارا کو ایک ساتھ زندگی کی ساری خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔“

”اور کیا وہی شاہ رخ کو میری شادی زارا کے ساتھ ہوئے گا کوئی دھک نہیں ہے۔“

شاہ زیب نے ایک بار پھر شاہ رخ کا ٹھکر لے کر اسے ہونے سوجا۔ ”تا میں بی بی جان کی بات اس کے ذہن سے یکدم نہیں نکل رہی تھی۔ رات جب شاہ رخ نہیں آئے تو اسے علمان گڑا تھا کہ وہ جان کو تعجب میں شریک نہیں ہونے اس کا مزاج ہی ایسا تھا کہ کوئی بات اس کے ذہن میں پیچھے جاتی تو مشکل ہی لگتی تھی۔ حالانکہ یہ وہ جان ہے اسے سمجھنا ہی تھا کہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور پھر شاہ رخ نے خودی شادی سے منع کیا ہے۔“

”میں ذرا شادی کی شادی شاہ زیب سے ہونے کا دکھ ہو تا تو وہ انکاری کیوں کرتے بھلا۔“

”بھائی۔“  
شاہ زیب میدعاہہ کر بیٹھ گیا۔

”ایک ایک بتائیں گے۔“  
”ایک نہیں بیس یا دس یا بیس پچھو کیا زارا کے سلسلے میں کوئی مشورہ درکار ہے۔ لیکن میری جان میں اس معاملے میں ایک تجربہ کار ہوں۔ نہ بھئی کو دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”نہ دیکھو کارہوں۔ نہ بھئی کو ٹھکر دو۔ اور نہ ہی ان تک نہ کوئی ٹکی اس طرح بھائی ہے۔“

”تم فرض بھارتے رہو اور بھائی کو ناراض کر دو۔“

”وہ میرا بھائی ہے بی بی جان میں اسے مناؤں گا لیکن آپ کی ناراضگی قلعی ہے۔“

”شاہ رخ تم میری ناراضگی کو لے جا کر دے۔ وہ حالانکہ مجھے تو یہ تھا کہ مجھے کچھ پر خرم نہ ہوتے۔“

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا بی بی جان جس پر مجھے شرمندگی ہو اور وہی اونچی ہو جانے کی بات تو میں شاہ زیب سے بھی منع نہ کرتی کہ ان کا اور ابصار اعجاز اور ابراہیمانی وغیرہ سے بھی اور آپ بھی اب جائے آرام کیے بہت رات ہو گئی ہے۔“

شاہ رخ انہیں آرام کرنے کا مشورہ دے کر خود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی طبیعت از حد مکرر ہو گئی انہیں بی بی جان کا رویہ اور گفتگو بالکل پسند نہیں آتی تھی۔ لے کیا شاہیالے انسان نہیں ہیں۔ وہ بہتر لیجئے بچپن سے لے کر اب تک کے سارے واقعات ان کی نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔

شاہیالے کے ساتھ شاہی کا سلوک ان کا اس طرح ہو گیا ہے۔ الگ ہے کموں میں رہنا۔ شاہی بی بی جان کا اس طرح کا احترام نہیں کیا تھا جس طرح اپنے کسی بزرگ کا یا بڑے کا کیا جاتا ہے۔ وہ سوچتے ہی کسی لیکن تھے ان کے بچپائی۔ ان کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا تھا جو ان کے والد کی رگوں میں تھا۔ انہیں یاد آیا کہ جب وہ چھوٹے تھے تو شاہیالہ ظاہر بہت محبت مند تھے بلکہ ذاتی حالت کچھ ٹھیک نہ لگتی تھی۔ کسی رشتے کو بچانے نہ تھے۔

کبھی روتے تو روتے چلے جاتے تھے تو بے تحاشا ہنستے رہتے۔ یا پھر خاموش بیٹھے جانے لیا ہوتے رہتے تھے۔ وہ مشکلوں سے توب کو بچاتے تھے۔ لیکن کسی کے ساتھ ان کا کبھی شادی نہ ہوئی تھی۔ شاہ رخ نے بھی شاہی کی کو ان کے لیے پریشان ہوتے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کسی شاہی نے انہیں کسی ڈاکٹر کو دکھانے کی کوشش کی تھی۔ تاہم ہمیشہ سے ذہنی طور پر اپ سیٹ تھے یا بعد میں بھی ایسا تھا۔

”پچھو۔“

ان کے ذہن میں کوئدا سا راک۔

”پچھو یقیناً اس سلسلے میں ان کی رات بھائی کی رہتی ہیں۔ اگر وہ اپنی شوہر پر ایسے نہیں تھے تو یقیناً اب بھی ان کے علاقے کے سلسلے میں کوشش کی جا سکتی ہے۔“

”میں اس بات سے شرمندگی لے جا سکتے ہیں اور کسی اور سے نہیں۔“

اپنی شلٹ کو کھانکے تھے۔

وہ نہ جانے کس شاہیالے کے متعلق ہی سوچتے ہوئے سوچے۔ صبح ان کی آنکھ کھل کر نماز کا وقت نکل گیا تھا۔

حد پتھان سے ہو کر وہ ان کے تھا نماز پڑھی اور باہر نکلے تو شاہ زیب انہیں صحن میں ایڑی چیت پر نیمہ زار نظر آیا تو وہ

سیدھے اس کی طرف گئے۔

”سورہ یار۔“

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”بی بی جان کہہ رہی تھیں کہ رات میرے شامل نہ ہونے پر بہت ناراض ہو۔ دراصل شامل ہونا ہی حالت اتنی خراب لگی کہ میں نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ سروا میو کا پس لگے یا نہیں۔ وہ زارا سے سلسلے تو میں بھائی لیکن دیر ہو گئی تھی۔“

”نہیں کوئی بات نہیں۔“

شاہ زیب نے آہستگی سے ان کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔

”شاہیالہ شاید مجھ سے زیادہ اہم ہیں آپ کے لیے۔“

”بات اہمیت کی نہیں ہے۔ بات ربات انسانی زندگی کی ہے۔“ وہ چیخے سے ہٹ کر اس کے سامنے پی کر بیٹھ گئے۔

”تم تو سمجھو دار ہو یا رت تو میری بی بی جان کی طرح بات مت کرو۔“

ہے میں ایم ایس کے بعد ایم فل کے لیے اہلی کر دوں اور مجھے دو سال سے زیادہ وقت لگ جائے یا رخصت ہو جائے تو اس کے ساتھ یہ سنی بنا اصرار سے کہ وہ اپنا کوئی اور گھر چھوڑے گی تو ممکن ہے کہ میں وہاں کہیں اٹواؤں ہو جاؤں بشری خامیاں تو تھیں بھی ہیں۔ میں بھی خود کو کنٹرول نہ کر پاؤں تو وہ ہے چاری کس جرم کی سزا پائے؟

شاہ زب بے حد حیا سے ان کی بات سن رہا تھا۔ صبح کمرہ رہے تھے شاید۔

”تو پھر یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں نے صرف زارا کے ساتھ شادی سے انکار کیا ہے۔ بی بی جان نے تو کوئی نام تک نہیں لیا تھا۔ پہلی شادی کی بات ہوئی تھی۔ زارا کے متعلق کوئی وہم تمہارے ذہن میں ہے تو وہ نکال دو۔ وہ ایک مست اچھی اور مکمل لڑکی ہے۔

اس میں وہ ساری صلاحیتیں ہیں جو ایک اچھی لڑکی میں ہو سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ ایک اچھی بیوی ہوگی۔ یہ تو لڑکی بالی راور۔“

وہ اس کی ذہنی کیفیت سے بے خبر اسے سمجھا رہے تھے۔ انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید وہ زارا سے متعلق متعذب ہے۔

”وہ عماری کیا زارہ بے زب ڈیزاس کا بچہ بن کر اس کا بچپن گزارے گی؟ ان کا بچپن جوانی سب کچھ تو ہمارے سامنے ہے۔ وہ ایک معزز لڑکی ہے اور تمہاری بہترین شریک حیات ہوگی۔“

”اور اگر آپ انکار نہ کرتے شادی سے تو یہ خوش قسمت شخص ابھی ہو سکتے تھے۔“

شاہ زب نے سوچا لیکن کام نہیں بدلتا چرسے کی تلخی میں ملکی سی نہایت صحت مندی اور کسی قدر مطمئن ہوتے ہوئے اس نے شاہ بابا کے متعلق پوچھا۔

”شاہ بابا کی طبیعت اب کیسی ہے۔“

”معمولی بات ہوئی تو میں آئیام۔ وہ ابھی ہاسپٹل میں ہی ہیں۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ وہ نہیں کچھ دن اندر آہر و ریح نہ رکھیں گے۔ کچھ ٹیسٹ وغیرہ بھی تجویز کیے ہیں انہوں نے میرا جہاں تک خیال ہے تقابہت کا یہ شدید اور اچھا حکم کم خور کی وجہ سے ہوا ہے۔ سہرا لہ آج جاؤں گا تو چار چلے گا۔“ انہوں نے شاہ زب کو تفصیل بتائی۔

”جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے شاہ بابا کو ایسے ہی دیکھ رہے ہیں۔ ان کے بیوی بچے نہیں غالباً۔ ان کی شادی دیکھو نہیں ہوئی تھی۔“

شاہ زب اب بے حد رشتیکس ہو کر بات کر رہا تھا۔

”میرے خیال میں شاہ بابا پر اب کسی طور پر یہ ذہنی دیکھ ہوں گے۔“

شاہ زب نے خیال ظاہر کیا۔

”ہاں لیکن وہ مجھے کبھی بھی پورا ذہنی معذور نہیں لگے۔ کبھی کبھی تو وہ بڑے بڑے بچے کی بات کر دیتے تھے۔ گو میں بہت کم شاہ بابا کی طرف کیا لیکن بچپن میں ہی کیا باران کی کسی بات نے مجھے حیران کر دیا۔“ شاہ زب بے تپا۔

”انسانی ذہن بہت پیچیدہ ہوتا ہے اسے سمجھنا بہت مشکل ہے لیکن کسی حادثے نے انہیں ایسا کر دیا ہو۔“

شاہ زب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ وہ ڈاکٹر شاہ بابا کی طرف چلے جاتے تھے۔ چلیے ہوئے بھی کیا وہ شاہ بابا کے کمرے میں گھس جاتے تھے اور غالباً گھر میں سب سے زیادہ ماسوش شاہ زب سے ہی تھے۔ جب کبھی وہ بچپنوں میں سید پور آکر انہیں ملنے جاتے تھے تو ان کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں اور ان کی ہار انہوں نے شاہ زب کو اس کے نام سے بلایا تھا۔ راجہ الدین اور کلا دانیہ وغیرہ جتنا تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں وہ ان کے متعلق پوچھتے تھے کہ شاہ زب نہیں آیا۔ کب آئے گا۔

”میں سوچ رہا ہوں زب کہ شاہ بابا کی طبیعت کچھ ٹھیک ہو تو میں لاہور لے جاؤں۔ ایک اچھے بھلے انسان کو ناکارہ کر کے جانوروں کی طرح ہم نے ایک کو غریبی میں بند کر رکھا ہے اور جو شام کھانا دے دیتے ہیں۔“

ابھی شاہ زب نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ اندر سے ایک ملازمہ نے آکر شاہ زب سے کہا۔

”مگر آپ جاگ کے صبح کو تو شادی آپ کو بلا رہے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ میں جاؤں گا ہوں۔ کیوں؟“ شاہ زب وہ سکرانے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”شاہ بی کہاں ہیں۔“

”میرا اندر۔ دو بجے میں ہی بی بی جان کے کمرے میں۔“

”چلو میں آ رہا ہوں۔“

”اُس کے شاہ زب۔“

انہوں نے شاہ زب کی طرف دیکھا۔

”اب راضی مت رہنا اور یاد رکھنا کہ تمہاری خوشیاں میرے لیے زندگی کی ہر بات سے زیادہ اہم ہیں۔“

وہ بات عمل کر کے اندر کی طرف بڑھے۔

سید مقیم علی شاہ کمرے میں اُدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے جبکہ بی بی جان ایک طرف اپنے پیڑ پر بیٹھی تھیں۔

”لگتا ہے شاہ زب غصے میں ہیں۔“

شاہ زب نے انہیں دیکھتے ہوئے سوچا۔ ان کی عادت تھی کہ وہ جب غصے میں ہوتے تھے تو ایک جگہ تک کر نہیں دیتے تھے۔

سلام کر کے وہ بی بی جان کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ سر کے اشارے سے سلام کا جواب دے کر شاہ بی نے ایک تیز نگران پر زور کیا تھی۔

”جی شادی۔“ باؤ میں پکڑی بیچ ایک طرف رکھ کر انہوں نے پوچھا۔

”رات تم کہاں چلے گئے۔“

یہ اتنا بڑا جرم نہیں تھا کہ ہر شخص اس سے باز پرس کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں ہنگامی محسوس کرتے ہوئے شاہ زب نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ شاہ بی کی طرف بتاتے گئے تھے لیکن شاہ بی اپنی نشست گاہ میں نہیں تھے سو وہ باہر لیٹ آئے تھے۔

”بی بی جان نے نہیں بتایا۔“

”نہیں کس سے پوچھ رہا ہوں۔“

”شاہ بابا کو ہاسپٹل لے کر گیا تھا۔“

”شاہ زب نے نگاہیں جھکا لیں۔“

”کیوں۔“

”شاہ بی کی نظریں ان کے چہرے پر تھیں۔“

”ان کی طبیعت خراب بھی ہے حد۔“

”شاہ زب کی آواز دھیمی تھی۔“

”انہو تو یہ کہاں بھی ملنا چاہتا تھا۔“

”یہاں ان کی طبیعت تباہی کی تیرا خیال تھا کہ انہیں ہاسپٹل ایڈمٹ کروانا پڑے گا۔“

”اپنے انجینئرنگ کی ڈگری کیلئے علم نہیں تھا کہ ڈاکٹری میں بھی شدید ہے آپ کہ۔“ ان کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”اور آپ نے انہیں ہاسپٹل ایڈمٹ کروانا ہے۔ تنگ کمانے کا شوق ہے۔ رطارت مزاج ہمارے ہیں آپ۔“

ان کا لہجہ مزید طنزیہ ہو گیا تو شاہ زب نے بے اختیار ان کی طرف دیکھ کر احتجاج کیا۔

”شاہ بی آپ۔“

”ناراض رہو۔“

وگرسے۔

”تم مجھ سے زیادہ دور درو ہوا ان کے“ وہ غصے میں کبھی تم اور کبھی آپ کہہ کر مخاطب کر رہے تھے شاہ رخ کو۔  
 ”میں چاہے تھا کہ تم مجھے اطلاع دیتے بیماری کی اور پھر میں جیسے مناسب سمجھتا کرتا۔ لیکن آپ کو تو نیکی  
 کے لئے کا شوق تھا۔ کتاب کا کیا آپ نے؟“

”شادی کی بلیر آپ اس طرح اور اس لیے جس بات مت کریں۔ ایک انسان مرہا تھا نہ جانے کب سے وہ بے  
 ہوش رہے تھے اور ان کی تو؟“

”آپ نے انہیں بچایا۔“

”شادی نے ان کی بات کاٹ دی۔“

”بجائے والی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ انسان تو صرف وسیلہ بنتا ہے۔“

”شاہ رخ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔“

”بجائے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو کیا اس کی یاد میں خود یا اللہ کوئی دوسرا خدا ہے۔“

ان کا بوجہ ہنوز طنز تھا۔ شاہ رخ غل کھا کر گئے انہیں شاہ رخ کا یہ انداز بے حد تکلیف دے رہا تھا۔

”بہر حال۔“

انہوں نے غصہ بدلا۔

”۳ جنس اسن کی یاد جانے کی ضرورت نہیں ہے میں نے سمجھا ہے فضل واد کو خدوم حسین کے ساتھ اسنیر  
 واپس لائے کہے۔“

”لیکن شادی۔“

شاہ رخ بے چین سے ہو گئے۔ آج انہیں ڈاکٹر راجہ نے چیک کرنا تھا اور مختلف ٹیسٹ ہونے تھے ان کے ماکہ  
 اس اچانک قیامت اور بے ہوشی کی وجہ سمجھ آئے۔

”کب گیا ہے فضل واد میں چلتا ہوں منع کرتا ہوں اسے۔ اگر دو تین روز انہیں ہاسپٹل میں ہی رہتا ہے“

کہلے ہوئے۔

”بیٹھ جاؤ شاہ رخ۔ فضل واد آدھ دس منٹ میں چوٹی پہنچے والا ہے ان کو لے کر۔“

انہوں نے ایک بڑے ٹھمر شاہ رخ پر ایک نظروالی جواز حدیث سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”اور آئندہ کبھی شاہ رخ کو ہاسپٹل میں لے جانے کی حمایت مت کرنا۔“

وہ بات مکمل کرتے ہی تیز چلتے چلے کرے سے باہر نکل گئے اور شاہ رخ حیران کہلے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔

”مٹی بلیر مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔“

خضر نے بے کسی سے سعدیہ بیگم کی طرف دیکھا وہ تین دن کی مکملش کے بعد آج ان کے سامنے بیٹھا تھا ”کیا  
 سمجھنے کی کوشش کریں“

انہوں نے بار بار اسکی سے کہا۔

”کیا یہ کہ جنس والدین سے اختلاف ہے۔“

”کیا یہ بات تو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں مٹی مجھے آپ سے اختلاف نہیں ہے لیکن یہ پوری زندگی کی بات ہے  
 اور آکا انفیسار نے خضر پر عرش پسند نہیں ہے۔“

”خیر خیرانی ہے اس میں۔“

انہیں خضر پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ جب سے ان کی بہن اور چچیاں پاکستان آئی تھیں وہ خضر اور عرش کے  
 متعلق سوچ رہی تھیں۔ گو انہوں نے ابھی حیرا سے اس مسئلے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور خضر ہاؤس اور خضر  
 کے تاثرات جانتے کے لیے انہوں نے خضر اور عرش کا ذکر کیا تھا۔ ورنہ انھیں خیران عدم موجودگی میں وہ ایسی

بات نہ کر سکتی تھیں۔ تاہم انہوں نے دل میں ٹھان رکھا تھا کہ وہ خضر کی شادی عرش یا نازش سے ہی کریں گی حیرا  
 ان کی نہیں اور وہ عرش اور نازش کے لیے بہت پریشان تھیں اور ان کے پاکستان آکر خضر کے کامقصد بھی کسی  
 قمار کو نہیں کے لیے اچھے ہر شے مل جائے گا جس کو انہوں نے زبان سے تو بگڑے نہیں کہا تھا۔ تاہم سعدیہ بیگم کو اندازہ  
 تھا کہ حیرا کی شادی خاں سے کہ عرش یا نازش میں سے کوئی ایک سعدیہ بیگم کی ہو سکتے۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا مگر اس میں کوئی خرابی ہے۔ لیکن میرے ذہن میں اپنے آقا انفیسار نے کچھ تصور ہے  
 وہ ایسی نہیں ہے۔ عملی کی اور کے لیے وہ آئیڈیل لڑکی ہو لیکن۔“

”ہائے! وہ تو ہمساری آئیڈیل لڑکی کیسی ہے؟“

ان کا بوجہ طنز ہو گیا۔

”میں نے اس کے متعلق کچھ نہیں سوچا ابھی میں نے اچھا شادی نہیں کرنا چاہا تھا۔ بلکہ پانچ سال تک میرا کوئی  
 ارادہ نہیں ہے شادی کا مجھے اپنا میرا رہنا ہے۔ اپنے فوج کا سوچتا ہے۔“

”کیا ہے ہمارے فیوچر کو سب کچھ تو یقین ہے یہ بتاؤ کسی اور کو کہ نہ کر بیٹھے ہو کہ ان سے وہ جس کے لیے ان  
 سے بحث کر رہے ہو۔“

انہوں نے خوبتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہتایا تو ہے ممانی اچانک ایسا کیسی۔“

خضر نے نظریں چرائیں۔

وہ ابھی ادا نور کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔ ابھی تو وہ خود اس نے نئے عروس کر رہا تھا۔ اسے سمجھنے کی  
 کوشش کر رہا تھا اور پھر ان تین دنوں میں اس نے بہت کچھ سوچا اور جانا تھا۔ خال جان کے کنیز اسے آنے کے بعد  
 مٹی کا وہی ہاؤس کا میاں آنے سے گریز ”مما کا اس کی مصلحتی اچانک ذکر بغیر اس سے یا گھر میں کسی اور کی رائے  
 کے۔“

اس کی نظر شروع سے ہی بہت گہری تھی۔ وہ مٹی کا نشان اور مقصد کچھ گیا تھا۔ گو وہ اپنی ذات میں بہت مضبوط تھا  
 اور اپنی عقلوں پر عمل کرنے کا جو صلہ رکھتا تھا پھر بھی یہ تین دن اس نے انتہائی پریشانی میں گزارے تھے۔ وہ مٹی  
 کو باواس کر کے گھر کی فضا پر غراہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے مٹی کا قیصلہ بھی منظور نہیں تھا اس روز اس نے  
 فوراً ”اسی اپنی کیفیت پر قابو پایا تھا۔“

”کیا یہ بات نہیں جیسے اس نے ان کی بات سن لی تھی۔ وہ اور ہاؤس کے مخاطب ہوا تھا۔“

”چلو ہاؤس پر وری ہے۔ پیچھو پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

اور ہاؤس پر سے کل کر اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ راستہ بھر دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے کچھ سوچتے

رہے۔

”کیا سوچ رہی ہو ماوا اپنی پریشانی۔“

خضر نے اپنے اندر رائے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں۔“

”سکڑا لی۔“

لیکن خضر کو اس کی مکررات بھی سمجھی ہی تھی۔ لیکن سوچ رہی تھی۔ لیکن سوچ رہی تھی۔ لیکن سوچ رہی تھی۔

ایا ضروری تھا کہ ممانیہ اعلان اس کے سامنے ہی کریں۔ لیکن سوچ رہی تھی۔ لیکن سوچ رہی تھی۔ لیکن سوچ رہی تھی۔

اس کے ذہن میں اچانک کوہ ان کا تھا اور اس نے فوراً ہاؤس کو دیکھا تھا۔ جو اپنے ہاتھوں کی انگلیاں غیر ارادی  
 طور پر جھونکی ہوئی اسے کچھ مضطرب کی تھی۔

”مبارک ہو خضر بھائی۔“

اسے اپنی طرف دیکھ کر ہاؤس نے اس کی سے کہا۔

”کیوں اتنی بے توبہ بات کہی ہے پھر“  
 ”خدا خالق ہے تو بات کی ہے نہ“۔ کون سا عقلی ہو گئی ہے پاگل میں آج جا کر ماگو بتا دوں گا۔“  
 ”مگر وہ بہت ناراض ہوں گی آپ سے۔“  
 ”ماہ نور قلمند ہو رہی تھی۔“  
 ”وہ سمجھیں گی شاید آپ کسی اور سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

اس نے جھجھکتے ہوئے کہا۔  
 ”ہاں ماما بس سوچ کر کہتی ہیں ماہ لیکن میں دیکھ لوں گاؤں نشووری۔“  
 ”گواہ دہوئے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی تھی اس کے متعلق لیکن وہ اسے الجھا الجھا کر رہا تھا۔ شاید وہ کوئی  
 اندازہ نہیں کیا پاری تھی یا اس کے لیے قلعہ بہر حال اسے بات کر کے وہاں کو بتا دے گا۔ کہ ایسا کچھ نہیں ہے  
 اور ماما اس مرضی کے بغیر کچھ نہیں کریں گی۔ اس نے سوچا تھا۔  
 ”پھر عرض میں کیا برائی ہے بی اگلال تمہارے بھائے کے لیے پر عقلی کی تعجب کروں گے۔ شادی جب تم  
 نے کہا تب ہو جائے گی۔“  
 اسے سوچ میں کیا کر سکتا تھا۔ بیگم نے نرمی سے کہا۔

”وہ ماما بیگم۔“  
 ”خیر میرا سرا ہو گیا۔“  
 ”آپ سے یہی بات سمجھ رہی تھی۔ مجھے عرض سے شادی نہیں کرنا۔ اب نہ پھر کہی۔ آپ پلیز اس  
 سلسلے کو ختم کروں اور خالہ جالی سے معذرت کر لیں۔“  
 ”تمہیں۔۔۔ عرض پسند نہیں ہے تو نازش بھی تو ہے عرض سے زیادہ خوب صورت ہے۔“  
 ”پلیز ماما۔ عرض ہو یا نازش کو بھی نہیں سمجھتی۔“  
 ”تو تم اب مجھے میرا کے سامنے خرم نہ کرنا چاہتے ہو خیر۔“

ان کا قصہ بدھ گیا۔  
 ”ابھی بات صرف آپ کے اور خالہ جان کے درمیان ہے۔ اس لیے میرے بچے کے ابھی ختم کر لیں اور پھر غفلت  
 آپ کی ہے۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھئے یا آپ نے خالہ جان سے بات نہیں کی کہ وہ کتنی مجھے ڈراتی تھی۔ نہ کہ آپ کو۔“  
 اس کی آواز آہستہ تھی لیکن اس میں عقلی کا رنگ تھک رہا تھا۔  
 ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم میرے فیصلے سے اختلاف کرو گے۔“  
 ”سعدیہ بیگم نے آنکھوں میں آنسو بھر کر غصہ کو دیکھا۔  
 ”ماما کیلئے اب آپ اس طرح دو کر دیکھ سکتے ہیں کہ آپ اور آپ خالہ جان سے بات مت کریں میں خود کر  
 لوں گا اور وہ آپ سے بہتر حق پر نظر سمجھ سکتی گی۔“

”کوئی ضرورت نہیں تمہیں میرا سے بات کرنے کی۔“ وہ غصے سے کہتی ہوئی گئی۔  
 ”میں خود بہرہ مند ہوں کہ میرا بیٹا میرے کے میں نہیں ہے مجھ سے عقلی ہو گئی ہے مجھے معاف کر دو۔“  
 ”خیر ماما میں دیکھ کر کہہ گیا۔ وہ اب ماما سے مزید بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دو روز بعد آ رہے تھے۔ وہ قہقہہ اس  
 کی بات کو سمجھ سکتے تھے کہ اسے یہ بات ہو جاتی تھی۔ اس لیے انہیں وہاں ہی کھڑا سوچ کر کر کے باہر نکل گیا۔ ماہ نور  
 نے اس کے دل میں محبت کا جذبہ نہ تو تو بھی عرض ایسی لگائیں اسے کچھ پسند نہیں رہی تھیں۔ جو عقلی  
 تہذیب میں رنگی ہوئی تھیں۔ عرض نے انہیں سے لے کر اب تک کا وقت گزرا تھا۔ اس نے ازارا تھا۔ وہ عقلی تہذیب  
 سے از حد متاثر تھی اور شادی کو بھی شخص ایک بندھن سمجھتی تھی۔ عقلی آزادی میں رکاوٹ۔ وہ آزاد ہو اور  
 آزاد رہنے والے فلسفے کا قائل تھی اور اپنی ان غیر ملکی دوستوں کو رشک کی نظر سے دیکھتی تھی جو آزاد زندگی بسر کر

”کس کی ہمارا کہ۔“  
 ”خیر نے انجان ہوتے ہوئے چھا۔  
 ”اتنی کہہ رہی تھی انہوں نے عرض سے آپ کی بات طے کر دی ہے۔“  
 اس کا لہجہ سادہ تھا لیکن صبر کو اس میں آنکھوں کی کسی ہی محسوس ہوئی۔  
 ”ریش۔“

اس نے کندھے اچکائے اور مسکرایا۔  
 ”اور تم نے ماما کی بات کا یقین کر لیا ماہ۔“  
 ”تو اس میں یقین نہ کرنے والی ہوں کی بات ہے۔“  
 ”ماہ نور کی آنکھوں میں حیرت تھی۔  
 ”اور اس میں یقین نہ کروں گی کبھی کوئی بات نہیں ماہ۔“ وہ بولے سے ہنسا۔  
 ”وہ میری بات کی کہنے کی بات کر رہی ہیں اور میں اس سے بے خبر ہوں۔ یہ میری زندگی کا فیصلہ ہے اور  
 میری مرضی کے بغیر میرے طے ہو سکتا ہے۔“  
 ”کیوں کیا آپ کو عرض پسند نہیں آتی خوب صورت اور ماڈی ہیں۔“  
 ”ماہ نور کی حیرت ختم نہیں ہوئی تھی۔  
 ”یقیناً“ عرض ایسی ہی ہو گی جیسا تم نے کہا۔ لیکن زندگی گزارنے کے لیے صرف یہ چیزیں ہی کافی نہیں

ہوتیں۔“  
 ”تو کیا آپ کسی اور کو پسند کرتے ہیں کسی اور سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“  
 اسٹرکٹ پر ہاتھ رکھ کر اس نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی بھی ماہ ایک بھر پور نظروں سے گئی اور اس کا بھی چاہا  
 تھا وہ کہہ دے کہ ہاں میں کسی اور کو پسند کرنا ہوں اور صرف پسند ہی نہیں کرنا بلکہ اسے شریک زندگی کرنے کا فیصلہ  
 کر چکا ہوں اور اس کے علاوہ کسی اور کو ٹھکانا سوچنا پسند کرنا میرے نزدیک خیانت ہے اور ماہ تم جانتی ہو وہ لوہی تم  
 ہو کر ماہ۔“

لیکن وہ سب سے لے کر اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر سامنے مرکب پر دیکھ رہا تھا۔  
 ”میں ان لحاظ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میرے پان میں بی اگلال شادی نہیں ہے ماہ۔ مجھے انتظار کرتا ہے ہو سکتا  
 ہے آپ انتظار طول ہو جائے اور ہو سکتا ہے بہت طویل نہ ہو۔“  
 ”اگر اس کا انتظار طویل ہو جائے۔“  
 ”ماہ نور جانے کہ دھیان میں تھی کہ اس کی بات نہ سمجھ سکی۔  
 ”اگر شادنا کر لیں اور براہ راست بول کر کہ۔“  
 ”لیکن آپ کا کیرور بھی بہت شادنا ہے۔“  
 ”دیکھیں مجھے ابھی اور آگے جانا سہا۔“

اس نے کن آنکھوں سے ماہ نور کے اچھے اچھے چہرے پر نظر ڈالی۔  
 ”وہ ابھی ماہ سے کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس سے وہ جانے اور زندگی اس کے لیے مشکل ہو جائے۔  
 اس کے لیے پہلی ہی چیز کہہ رہا تھا۔ نہ حالہ نہ اس سے اس کے اچھے اچھے چہرے پر نظر جمائے اس کا کتنا بھی  
 چاہا تھا کہ اسے دل میں پیدا ہونے والے نئے نئے جذبے کو اس کے ساتھ شریک کر لے اسے جاتے کہ ماہ میں  
 تمہارے لیے کچھ مختلف سوچنے لگا ہو۔ اب اس کا مختلف جو بہت خوب صورت اور دلکش ہے لیکن اسے اپنے جذبوں  
 پر بہت اختیار تھا۔ وہ سوچ رہے تھے مسکرا رہا تھا۔  
 ”ہاں ماہ میرے ارادے بہت بلند ہیں۔“

پہنچیں۔ خضر اس کے خیالات سے اچھی طرح آگاہ تھا بلکہ دو تین روز میں ان کے درمیان اچھی خاصی بحث ہو چکی تھی۔ پھر چھ مہینے مہاکو اس میں کیا نظر آیا تھا اور ماہ نور پوران کی نظر میں پڑی تھی۔ حالانکہ ماہ نور تو ان کے سامنے ہی چلی ہوئی تھی۔ ماہ نور کے قصور سے ایک ملکی سی مہربانی سے ان کے لبوں کو پھولا۔

”دراصل ساری بات یہی ہے کہ“  
اس نے فوراً ہی یہی کیونٹ کر لیا تھا کہ ممائی نظر میں ماہ نور اس لیے قابل توجہ نہیں تھی کہ وہ میرا خالہ۔ جتنی دولت میں تھی۔ لیکن دولت خضر کے لیے کبھی بھی اہم نہیں رہی تھی۔  
وہ لاؤنج میں تھوڑی دیر کو دروازہ کھلا۔ رات غالباً ”گھڑی کی چابیاں اس نے یہاں پھیل رہی تھیں۔ اس کی نگاہ کو نہ والے صوفے پر دو لپٹا پاؤں رکھے چادر میں لپٹے ولید پر پڑی جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم کچھ سوچ رہی ہو۔ کیا آج کالج میں جانا۔“  
”نہیں ارج! بدولت کی طبیعت کچھ سناڑا ہے۔“  
”کیا ہوا۔“

خضر نے چونک کر پوچھا۔  
”سرفلو نے حملہ کر دیا ہے لیکن خیر ہم نے بھی دفاع کی پوری تیاریاں کر رکھی ہیں۔ امید ہے جلد ہی دشمن کو مجبور کر کے آپ جاسیں آپ کیل سکرار ہتھے کیا سامنے کوئی خوشی کی خبر سے دی ہے۔“  
”کوئی خیر۔“

خضر نے ناکاری سے سوچا اور ولید کی طرف دیکھا۔  
”نی اگلاں مہاکو اس پر سے لیے کوئی خوشی کی خبر نہیں ہے پڑیہ راور۔“  
”وہ ہاں۔“

ولید عید جاہو کر بیٹھ گیا۔  
”عینا کچھ ذکر کر لیا تھا کہ خدا خواست آپ کو بپہ زنجیر کیا جا رہا ہے اور وہ بھی ایسی جیل میں پھینکے جانے کی سازش کی جارہی ہے جہاں رہنے سے ہر عمر جا خوب صورت ہے۔“  
”تمہارا خیال یہ کہ میں ممائی کی بات سے اتفاق کر سکتا ہوں۔“  
”کوئی جھگڑا آوی تو ایسا نہیں کر سکتا۔“

ولید سمجھ گیا۔  
”مجھے نہیں آتی کہ مماکو آخر یہ سوچھی کیا حشر کے مزاج سے کیا وہ بے خبر ہیں۔ اس روز وہ مماکے سامنے ہی تو کہہ دی تھی کہ اسے پاکستان میں رہنا ہرگز پسند نہیں ہے اور یہ دنوں یہاں لڑائی رہی ہے اس کی مجبور ہے۔ گویا ممائے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ آپ کو حشر کے ساتھ رخصت کریں گی کہ۔ اہو نہ بھائی ہرگز نہیں۔ میں اس سلسلے میں مجبوراً احتجاج کر رہا ہوں۔ آپ نے مامے بات کی۔“

اور جہاں تک عینا اور ارج کی بات ہے تو انہیں اپنے ساتھ ہی سمجھنے کہ وہ آپ کو ہرگز نکیزا رخصت کرنے کو تیار نہیں ہوں گی۔ ارج کا تو آپ کو پتا ہے کہ ہمیں سے کوئی ایک دو روز کے لیے بھی نہیں جائے تو دو روز کیرا حال کیسے رہے گا۔ ہاتھ تو وہ یقیناً اکثریت کا ساتھ دیں اور ماما آئی اپو ریشن کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی سو بے فکر ہو جائیں۔“

ولید کی اتنی بھی چوڑی بات پر خضر مسکرایا اور حقیقت میں بھی اسے اپنے دل سے بوجھ جٹا ہوا سامحوس ہوا۔ اسے کیا کیسے ولید کچھ کہہ رہا ہے اسے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ولید ایسا ہی تھا تو ان میں جہاں تک نکل لیتا تھا۔ خضر نے اسے بھی کسی بات پریشان ہونے نہیں دیکھا تھا۔ اسے خرابی کا بل نہیں لگتا۔ اور ہر طور سہا تھا۔

”ہو ناوی ہے جو اللہ چاہے گا۔ سو پریشان ہونے سے فائدہ۔“  
یہ اس کا یقین تھا۔

”ڈاکٹر کی طرف چلتا ہے تو لے چلوں۔“  
خضر نے ایک شفقت بھری نظر اس پر ڈالی۔

”تم۔“ معلوم فلور پر اور مجھے چونک کر اس سے انکڑا واسطہ پڑتا رہتا ہے سو سارے تیرہ ہدف نے زبانی یاد ہیں۔“

”اے کے پھر میں پتل ہوں۔“  
خضر جاننے کے لیے مزاح۔

”بھائی! کیا عیادت کوں۔“  
”ہاں کوہ۔“

خضر نے مز کر اس کی طرف دیکھا۔  
”اے یہ گڈی کی چابیاں تو آپ یہاں ہی پھوٹے جا رہے ہیں۔“

”وہ تھمتھکتی۔“  
خضر نے ولید کی اس بڑی چھوٹی نہیں سے چابیاں اٹھائیں۔

”اے کہو کہو کیا کہنا تھا۔“  
”کچھ خاص نہیں۔ ویسے سوچ رہا تھا ممائی نزدیک کی نظر کچھ کمزور نہیں ہے کیا۔“

”کیا مطلب۔“  
خضر کھنکھنہ سکا۔

”اگلا ہے آپ ابھی تک آپ سیٹ ہیں بھائی سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیجئے انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے میرا ایشادہ ماہ نور آپ کی طرف تھا۔“

ایک لمحے کو خضر کا دل اس کے سینے میں زور سے دھڑکا۔  
”مجھے ماہ نور آپ کی بات پسند ہیں۔ آپ کے ساتھ وہی سوٹ کرتی ہیں نہ کہ حشر۔“

خضر دل کی تیز ہو کر حشوتوں کو محسوس کرتا ہوا ولید کو دیکھ رہا تھا۔  
”میں کچھ کہ رہا ہوں خضر بھائی ماہ نور آپ کی لحاظ سے ایک بہترین لڑکی ہیں۔ حسن صورت۔ حسن سیرت۔“

خضر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ولید کو کیا کہے۔ اسے ولید کی بات سے اتفاق تھا۔ لیکن کم از کم اس اپنے بچے وہاں نور کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔ جانتا تھا کہ کم از کم کچھ سال تک ماہ نور کا لایا کافی ارادہ میں سے شادی کرنے کا اس روز اس نے خضر سے ہر بات ڈھسکتی تھی اپنے عوام اور دیگر مہم۔

”میں کچھ غلط نہیں کہ رہا خضر بھائی آپ کو چاہیے کہ مماکو اللہ کے متعلق بتادیں۔“  
”نہیں بھئی نہیں۔“

”گھر کوں۔“  
ولید کی آنکھوں کی جرت واضح تھی۔

”یہ راتو خیال تھا کہ آپ ماہ نور آپ کی کو پسند کرتے ہیں۔“ ولید کے مشاہدے اور ممائی نظر کا قائل ہو گیا۔  
”میں نے آپ کا کہہ دیکھے پسند نہیں ہے۔ وہ متا بھی لڑکی سے لیکن۔“

”لیکن کیا آپ کسی اور کو پسند کرتے ہیں۔“ ولید کو شک سا لگا تھا۔  
”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

خضر مسکرایا۔  
”نی اگلاں میرا شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ ہاں اگر ایسا ارادہ ہوتا تو تمہاری پسند کوئی ترجیح دوں گا۔“



خضر نے ولید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دیا۔  
”مطمئن رہو۔“

ولید نے ابھی ہوئی نظروں سے خضر کو دیکھا اور پھر جیسے سمجھتے ہوئے مسکرایا۔  
”اتنی سی۔“

”فی الحال عرش سے جان بچ جائے انتہائی کافی ہے۔“  
”خیر وہ تو بچ ہی جائے گی۔ ہم ہیں نا۔“

ولید نے سینے پر ہاتھ رکھ کر خود اس امر تک گیا کہ وہی علیہما اپنے کمرے سے نکلے۔  
خولدر ایک کندھوں پر لٹکا ہوا تھوڑا سا چادر پہن کر وہ غالباً بیخود روشنی جانے کے لیے نکلی تھی۔  
”خیر ایک ہوا ابھی ہیں۔“

اس نے خضر کی طرف دیکھ کر شرمیلی کرنا شروع کیا۔  
”میں سوچ رہی تھی جیسے جاؤں گی۔“

”کیوں تمہاریج کے ساتھ نہیں گئیں۔“ خضر نے پوچھا۔  
”میری آنکھ ڈور سے کھلی تھی اور ایرج کو دور ہو جاتی تھی۔ میں نے سوچا تھا پوائنٹ سے چلی جاؤں گی۔ ڈرائیو کو

ایرج بھی خود کر خالہ جان کی طرف جانا تھا۔ ممانے ان کے پڑنے بھجوا تھے۔ کل ہی وہ بیٹے لائی ہیں۔“  
”میں تمہا کو چاہے کہ اب خالہ جان کو خود کام کرنے دیں۔ ساری ذمہ داریاں انہوں نے ہی اٹھا رکھی ہیں۔“ ولید نے ہنسوا دیا۔

”اباں! کتنا شرمناک تو خالہ جان خود ہی کام کر تھیں۔ یہاں دراصل ابھی اتنا بتا رہی تھیں کہ ممانے خود ہی کہا تھا کہ اپنے گھر سے پڑنے سوازیں کی۔ عرش و میوہ کپاس کوئی خاص یا کستانی نہیں ہیں۔ ایک دو شلوار

فیس ہی ہیں۔“  
علیہما نے بی بی بات کی۔

”میں نے تو یہی کہہ دیا تھا تم کیوں مصلحتی چش کر رہی ہو۔“  
ولید نے اسے چڑایا۔

”خاہر ہے میری خالہ جان ہیں۔“  
”صرف خالہ جان ہی ہیں تو اچھا ہے مستقبل قریب میں کہیں کوئی اور رشتہ نہ جوڑ لیتا۔“

”کیا مطلب۔“  
علیہما کا دل ڈوب سا گیا۔

”اے ممانے! کچھ کہا۔“  
”کہا تو نہیں لیکن ان کے ارادے خاصے خیر ناک ہیں۔“

ولید شاید سب سے زیادہ باخبر تھا۔ یا پھر اس نے اندازے سے میں تیر چلایا تھا۔  
”مضمحل باتیں مت کیا کرو۔ ممانے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ تو عرش اور خضر بھائی کے لیے کہہ رہی تھیں۔“

”اب تمہارا کیا خیال ہے عرش خضر بھائی کے لیے مناسب نہیں۔“  
”میں خیر خیال۔“

علیہما نے اپنی طرف اشارہ کیا۔  
اس نے ممانی کی بات سن کر تو جی لیکن غور نہیں کیا تھا۔ جب سے اس کا دل محبت آشنا ہوا تھا وہ اپنے آپ میں

فی کم رہی تھی۔ خواہوں اور قصورات میں رہنے والی علیہما کے قصورات کو اس کی چاہت اور محبت نے رنگ بخش

دے دیے تھے وہ ان رنگوں میں کوئی لفظ تراجمی رہتی۔  
”اب تمہارا خیال۔“

ولید نے اپنی بات بدل دی۔  
”میرے خیال میں تو عرش تو بھلے بھلے مزاج کی لڑکی ہے اور مجھے نہیں امید کہ وہ ایسے لڑکے سے شادی

کے لیے تیار ہو جائے جو پاکستان میں رہتا ہو۔ میرا اتنی ذاتی خیال ہو سکتا ہے یہ عرش کی مرضی نہیں۔“  
اس نے حسب معمول طوطی بازی کی۔

”اور پھر خضر بھائی اور عرش کا کوئی جوڑ نہیں ممانے نہیں ایسا کہیں سوچا۔“  
ولید کے احساس دلانے پر علیہما نے بھی سوچ کر کہا تو ولید نے خضر کی طرف دیکھا۔

”جیسے، دوٹ بھی کیا ہوا۔“  
خضر نے مسکرا کر ولید کی طرف دیکھا۔

”میرے خیال میں علیہما کو یہ ہو جائے گی۔ تم جیسے سپورٹر کے ہوتے مجھے بے فکر ہو جانا چاہیے۔“  
علیہما نے سوازیں نظروں سے ولید اور پھر خضر کی طرف دیکھا۔

”فی الحال تو تم جانا تو بخیر ہی پھر کر بات ہوگی۔“  
ولید نے علیہما سے امارت پر علیہما سے بری تھی لیکن وہ اس کا نام ہی لیتا تھا جبکہ دافور کو اپنی کہہ کر لیتا تھا

تھا علیہما خضر کے ساتھ ساتھ چلے ہوئے پوچھنے لگی۔  
”خضر بھائی یہ دوٹ کی کیا بات ہے۔“

”یہ تمہیں ولید ہی بتائے گا۔“  
خضر نے دیاں بوجھ کر وضاحت نہ کی۔ لیکن علیہما راست بھر عرش اس کی بات طے کرنے کے ممانے

لیسے پر بھروسہ کر رہی تھی۔ خضر خاموشی سے ڈرائیو کرتے ہوئے اسے متناہی۔  
”تو نے خضر بھائی آپ کا اپنا کیا خیال ہے اس کے متعلق۔“

بات کرتے کرتے علیہما نے پوچھا اور پھر اچانک اس کی نظر اسٹاپ پر پڑی۔  
”پلیز، پلیز خضر بھائی گاڑی روکیے اسٹاپ پر میری فریڈز کھڑی ہیں۔“

خضر نے گاڑی روکی، اس کی علیہما نے شیشہ ہٹا کر سربراہ رکال کر آواز دی۔  
”حفظ۔“

اسٹاپ پر گاڑی روکی نے چونک کر دیکھا۔  
”اے یہ تو علیہما ہے۔“ اس نے ساتھ گاڑی روکی سے کہا۔

”جاؤ۔“  
علیہما نے ہاتھ ہٹایا اور خضر نے لاک کھولا۔ دونوں لڑکیاں دو آٹھ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ایک لڑکی

مابا اور آجیب میں تھی۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جب کہ دوسری نے گھٹے میں صرف دو ہاتھ ڈال رکھا تھا۔  
”یہ تمہارا کیا خیال ہے خضر۔“

علیہما نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔  
”در اصل میرا پوائنٹ نکل گیا تھا۔“

”بے چارہ لڑکی نے تاپا۔“ ممانے انتظار کر رہی تھی کہ ابھی اس کی گاڑی درکشاپ میں تھی۔  
”خضر بھائی یہ حلفاؤ دے رہا ہیں۔ ہم ایک ہی ڈیڑھ منٹ میں ہیں۔“

خضر نے سر ہٹا دیا غیر ارادی طور پر اس کی نظریں میوہ جہزی طرف اٹھی تھیں۔ سیاہ حجاب میں چھپی لڑکی کی

اپنی جگہ والی آنکھوں میں حیرت اور اشتیاق تھا۔ اس نے نظریں ہٹائیں۔ وہ اپنے ذاتی لڑکی مسلسل دھول رہی تھی

جبکہ چاب والی لڑکی بالکل خاموش تھی اور گاہے گاہے جھکی بکس اٹھا کر خضریٰ طرف دیکھتی اور پھر نظریں جھکا لیتی۔ خضریٰ گاڑی پر ایک سائیز پر کھڑی کرتے ہوئے علیحدہ سے بچھا۔  
 ”اچھی کیا یاد ہو اگر تم کو۔“  
 ”وہ تو ذرا سہرا آجائے گا۔“

علیحدہ سے اترتے ہوئے کہا۔ خضریٰ نے لاک کھول دیا تو دونوں لڑکیاں اتر آئیں۔ دوپٹے والی لڑکی نے خضریٰ کو شہر پر ادرا کیا۔

”اس میں شک ہے کہ کیا بات مجھے جامعہ ہی تو آتا تھا۔“ خضریٰ کے بجائے علیحدہ نے جواب دیا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے چل پڑیں جبکہ چاب والی لڑکی نے مرکز خضریٰ طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی۔ یقیناً لڑکی بہت خوب صورت تھی۔  
 خضریٰ نظریں اس کے اٹھوں پر رکھیں۔ لائیو انگلیوں والے اڑک تازک سفید ہاتھ خوب صورتی سے تراشے ناخنوں پر، نم رنگ تیل پاش لگی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ شاید وہ اس سے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ شاید شہریہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ تب ہی علیحدہ نے مرکز پر دیکھ کر دیکھا۔  
 ”اے خدا تم کمال رہی ہو۔“

اور وہ سن موڈ کران کی طرف بڑھتی اور خضریٰ کے ہوشوں پر دم مسمیٰ سرکھار ہوا۔ مگر کچھ مدد ہو گئی۔  
 شاید اس لڑکی میں کافی فٹنٹ کی کمی ہے اپنی دوسری سیکلی بہت۔ حالانکہ شہریہ ادا کرنا کوئی ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔

”ہی جان ای جان پائیز آنکھیں کھولے۔“  
 میٹر گھنٹوں کے بل زمین پر بیٹھا تھا اور اس نے عذرا اب تک کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھے تھے اور اس کی آواز بھائی ہوئی تھی۔ عذرا بیگم نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔  
 ”بھئی۔“

ان کے ہونٹ کانپے۔  
 ”بھئی۔“

انہوں نے کچھ کرنا اور اٹھنے کی کوشش کی۔  
 ”نہیں نہیں پائیز ای جان آپ متا نہیں۔“  
 سمن اور انہوں نے ایک ساتھ کہا تو انہوں نے ڈیڈ پائی آنکھوں سے انہم کی طرف دیکھا۔

”کچھ کیا کرنا چاہتا۔“  
 ”کچھ نہیں کچھ نہیں ای جان۔“

انہم نے فوراً ”جواب دیا۔ بھئی ابھی تک اسی انداز میں بیٹھا تھا۔ عذرا بیگم کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ان کے رخساروں تک بہ آئے۔

”ہی جان پائیز مت روئیں۔“  
 بھئی نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہونٹ بچھ کر آنسو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل بے جا رہے تھے۔ انہم کی جین کمر وہ پلٹا تھا اور پھر اس نے سر آگے میں دم کرتے ہوئے عذرا بیگم کے سر کو کرسی کی پشت پر رکھے گھر کے سانس لیتے دیکھا تھا اور وہیں بیٹھا چپکا گیا تھا۔  
 ”سمن۔“

اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔  
 ”نہیں ای جان کو کچھ نہیں ہو سکتا۔“ انہم مسلسل پکارے جا رہی تھی اور اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ

”نہ اپنے کمر سے بھاگتی ہوئی یا ہر گز تھی۔“  
 ”ایسا ہوا کیا ہوا ای جان کو۔“

”میں ٹھیک ہوں۔ تم بہتر ہو دو۔“  
 عذرا بیگم بار بار آنکھیں بند کرتی اور کھولتی تھیں۔ پھر جیسے بے ہوش ہو کر انہوں نے سر کرسی کی پشت پر رکھا تھا۔

”شہریہ۔“  
 سمن تقریباً بھائی ہوئی اس کے قریب آئی تھی اور اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا۔ ”شہریہ۔ شہریہ۔ شہریہ۔“  
 ایسا ہی جان کیا ہو گیا ہے۔ اس کی آواز بچی ہوئی اور وحشت زدہ سی تھی وہ جیسے چونکا تھا اور پھر بشکل وہ ہڑا ہوا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ناعاں میں جان ہی نہیں ہے پھر تقریباً ”خود کو طعینا ہوا ان تک آیا تھا اور پھر تین نے مل کر انہیں چلا دیے۔ لڑکیاں۔ رمضان بھائی۔ کرن میں کھڑی چاہا ہائی۔ لے آیا تھا۔ عذرا بیگم کہے کہ سانس لے رہی تھیں اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔ دونوں کی طرح انہیں پکار رہا تھا۔ کبھی کبھی دھڑاکی ڈرا آنکھیں کھولتی تھیں پھر ان کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ سب سے پہلے کبھی ڈانڈا کھال آیا تھا۔  
 ”دو کڑوا کڑوا کڑوا۔“

”میں جانا ہوں ڈانڈا صاحب کہنے۔“ رمضان نے فوراً کہا۔  
 ساتھ ہی ایک ہر چھوڑ کر ڈانڈا لڑکیاں رگڑتی تھیں۔ گھر میں ہی کیونکہ کھول رکھا تھا۔ اور عذرا بیگم سے کافی اونچے تعلقات تھے۔

”ہاں کھاتہ کھاؤ۔“ دوٹی ہوئی سمن نے رمضان کی طرف دیکھا تھا اور رمضان کے جانے کے بعد بھئی نے عذرا بیگم کے ہاتھ تھام لیے تھے انہم اور سمن مسلسل رو رہی تھیں۔  
 ”ہی جان پائیز مت روئیں آپ دو جیس کی میں وہی کرلوں گا۔ لیکن خدا کے لیے ایسا مت کریں۔“ بھئی نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”دیکھیں آئی اور سو کتنا رو رہی ہیں۔“  
 عذرا بیگم نے سر موڑ کر دونوں کو دیکھا اور ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی انہم نے سہارا دے کر انہیں اٹھایا۔  
 ہڑ زمین سے اٹھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور بولے بولے ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر سلاتے لگا۔  
 ”شہریہ۔ وعدہ کرو۔ وعدہ کرو مجھ سے تم کچھ نہیں کرو گے۔ سو کی طرح کی تکی حرکت نہیں کرو گے۔“  
 عذرا بیگم نے دیکھ کر رہی تھیں۔

”میں ایسا کچھ نہیں کروں گا ای جان۔“  
 ”میرے سر کی قسم تم کھانسی۔“  
 عذرا بیگم کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہی جان میں قسم کھا رہا ہوں تاکہ کچھ ایسا نہیں کروں گا جیسا سو نے کیا تھا۔“  
 بھئی نے دوای کی آواز میں کہا تو عذرا بیگم نے اسے پیچھ کر کہنے سے لگایا اور اس کے ہتھ پالوں والے سر پر بیار لے گئے تو آنسو مسلسل ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔  
 ”تم مت اچھی ہے۔ بہت خوب صورت ہے جیسے تم ہو۔“ ان کا بھئی تیلی بنے والا تھا۔  
 ”تمہارے ابا جان کا طریقہ اور انداز غلط تھا لیکن بیٹا انہوں نے تمہارے لیے خوب صورت لڑکی وہو عذری بہ اور پھر میں کو کوشش کرلوں گی کہ شادی کچھ دور سے ہو۔“

اور ان کے سینے پر سر رکھے رکھے تھی اور بھئی کے حلق کو نمکین کر گئے۔ بات حسن اور خوب صورتی کی



تے مختلف ہے وہ انہی طرح آپ کے فیصلے پر سرن تھا جسکی اور اپنا حق سمجھ کر اس نے آپ سے مزید تعلیم کی خواہش کا اظہار کیا۔ شاید اسے امید تھی کہ آپ اس کی بات مان لیں گے اور امید لٹی تو یہ حرکت کر بیٹھی۔ ہونا یہ بھی سمجھی ایسا کہ بدل سے بدل فیصلہ بھی ایسی حرکت کر بیٹھا ہے جس کی ہم اس سے توقع نہیں رکھتے تھی ایسے زادے سے چوٹ لگتی ہے کہ سب کر پئی کر پئی ہو جا ہے چاہے چوٹ معمولی ہی کیوں نہ ہو یہ انسانی لذت ہے۔

”تم مجھے انسانی نفسیات مت بتاؤ۔ میں تم سے زیادہ تجزیہ اور عمق رکھتا ہوں۔“ انہوں نے ناگوار سے اس کی رت کا تادی بھی۔ اس پر کہہ گئے کہ غامض ہو گئے وہ جانتے تھے کہ میاں صلاح الدین ان کی بات سمجھ نہ سکیں گے ان سے کچھ کہنا یا رکھنا میں خاموشی دیکھ کر میاں صلاح الدین نے پھر کہا۔

”میں نے آپ کو کہا اس نے لایا ہے کہ آپ اب مشرمیاں کو حق کا سبقت نہ دہائیے گا میں مزید کوئی ایسی بات برداشت نہیں کر سکتا گا۔“

اس پر مشکل خود پر کیا پاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے میاں صلاح الدین ان سے اتنے بدگمان تھے کہ کچھ کہنا یا رکھنا۔

”آپ کا بھی قصور نہیں اسخرا میں مرمود پوچھی جان نے آپ کی تربیت ایسی کی ہے کہ خود انفعال بہت مان ہیں نا۔ یہ بھی کوئی نوک و تردید میں نہ دہارے ہیں اور وہ بے پروا بن کر رہی جاتی ہے کیا نام ہے اس کا علیحدہ اور اسرا بنی ناگوار ہی سمجھائے میں نا کام سے ہو گئے۔“

”پتیر لایا جان! اگلی جی اب اس دن میں نہیں ہیں اور مجھے خبر ہے کہ میری تربیت اگلی جی بھی بہتر ہے نہ کی ہے۔“

اور پھر وہ میاں صلاح الدین کی مزید کوئی بات نہ بنے بغیر تیزی سے ان کے اس انشز نما کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ ”تم آگے ہو یا نا کام ہوا۔“

غدا ریکس پر پوچھا تو وہ چونک کر ان کے ساتھ چلنے والے ہی سوچوں میں گم ہو کر آگے سے نکل آگئے تھے۔ سب کو سلام کر کے انہوں نے تیری باری سب پر ایک نظر ڈالی۔ بشری انھیں سرسبز و سوری تھیں۔ سن خاموش اور اس پر ہی کھڑی تھی وہ ایک کمری سانس لے کر غدا ریکس کے پاس بیٹھ گئے۔

”اسی جان آپ اپنا خیال نہیں رکھتیں۔“

اسخرا نے ان کے ہاتھ اپنے انھوں میں لیے ہوئے کہا۔ ”اگر خدا نخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو یہ سب تو بے موت مر جائیں گے۔“

ان کی تو آواز بھرا تھی تھی۔

”میں یو سی پکر گیا تھا۔“

انہوں نے دلی کیفیت اسخرا سے چھپائی وہ نہیں جانتی تھیں کہ اس پر مشرک معاملے میں میاں صلاح الدین سے انھیں سونامی کے خیالات سے واقف تھیں اسخرا ان کی بات سمجھ کر مسکرائے۔

”یو سی پکر کیوں آیا ہے ویک میں ہے آپ کو؟ میرے ساتھ چلیے گا میں آپ کو کسی اسپیشلسٹ کو دکھانا۔“

”تمہارے کام کا کیا پانا ہے میں بتایا کرتے۔“

انہوں نے رک کر انہیں دیکھا۔

”سب ممکن ہے۔ نہ خیریت ہے نا میں اسی جان۔“

ان کی سوالیہ نظریں انہی طرف نہ ہوتی تھیں۔

”جی ہاں جان سب ممکن ہے آپ پریشان نہ ہوں اسی جان کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ کبھی کبھو اپنا کھلی لی ہو جا ہے نا گا۔“

”پھر اگر کوئی کیا گا۔“

انہوں نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یہ حد تک پیش سے پوچھ رہے تھے۔

انہوں نے حقہ اور انہیں بتایا اور انہوں نے آپ کے جد بے اس محسوس کیا۔ وہ بشرک لے، نہیں کر سکتے تھے جی کہ اباجان سے بات نہ کر سکتے تھے اس روز جب میاں صلاح الدین نے انہیں دیکھا پر لایا تھا تو انہیں اذہ جرت ہوئی تھی۔ ایک لمحہ وہ انہوں نے اسے اندر ایک خوشی کی کوئل کو چلنے محسوس تھا۔ لایا اباجان نے لایا جو انارکلی کے گھر میں میاں صلاح الدین سے بات کر کے یہ کوئل اندر ہی گئی تھی وہ کان سے ملنے اپنے انشز میں وہ ان کے منتظر تھے۔

”آپ کی طبیعت۔“

ان کے لیے یہی اذہ جرت تھی۔ اس پر کا پکڑا چہرہ سمجھ گیا تھا۔

”میں نے بشرک نہ صرف بات کر دی ہے بلکہ اذہ جرت بھی مل گئی ہے۔“

انہوں نے ساری فیصلہ پائی اس پر جھکا کر منتظر رہے۔

”آپ کو میں نے اس لیے زحمت دی ہے اسخرا میں کہ آپ کی عادت ہے ہر بات میں اڑانے کی ہے۔“

انہیں چاہتا کہ آپ مشرک و رولا میں۔

اسخرا نے حد بھرا نہ ہو کر انہیں دیکھا تھا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا اباجان۔“

”مطلب تو میں واضح ہے میاں۔“

اسفر نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور گھبرا کر اٹھالیا۔  
”بہت تیز بخار ہے۔“

”انکار کی کو زندہ دیواوں میں چھوڑا دیا تھا اور اب وہ سلیم کو شہزادہ سلیم کو بھی زندہ دیواوں میں چھوڑا۔ ہندوستان کرے ہے۔ آئیے یہاں سے بھاگ چلیں۔“

اس نے قدیم فاسطی طرف بڑھا دیا جو اس کے کہنے پر تھک کر خود بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

”شہزادہ آؤ اندر کر کے چل کر آرام کرو۔ شہزادہ بڑھ گیا ہے۔ ابھی میڈسن آئی ہے تو اسے لو۔“

اس نے بیٹے کی بات سنیں کسی اور یکدم زمین پر بیٹھے ہوئے ان کے پاؤں پر اپنے ہاتھ رکھے۔

”جس غل اہی کے عتاب سے بچا لیجئے اسٹرو بھائی۔“

”بہتر چلا۔“

عزیز ایلم نے بول کر انعم اور سمن کی طرف دیکھا۔ سمن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور انعم لب لگا راکت کھڑی تھی۔

”بہت مختار کہاں ہے وہ شہزاد سلیم کا دوست ہے اسے بلائیے اسفی بھائی شاید وہاں ہمارا مدد کرے۔“

وہ ان کے سینے سے لگا کر کہنے لگا۔  
 ”ہمیں چاہیے اسٹیج پر اٹھ کر ہر شے کا تجربہ کرنا۔“  
 اور وہ میاں صلاح الدین کی ہر شے پر تجربہ بھول کر آگے بڑھ گئے۔  
 ”ریٹیکس۔ ریٹیکس۔ یہی جی جان میں بات کروں گا میں بات کروں گا ایسا جان سے۔“  
 ”تہیات کریں گے۔“  
 اس نے سرائی خانہ پر امید نظروں سے استغور کیا۔  
 ”نہیں۔۔۔ وہ آپ کی بات نہیں مانیں گے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر ان کے کندھے پر سر رکھ کر  
 غامض سی باتیں کر رہا تھا۔  
 ”میں نے یہ سب سنا ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر ان کے کندھے پر سر رکھ کر

شاہد بنے بچپنی سے جوانی میں اوسرے میں اوسرے تھے۔ جب پدر الدین نے اندر آکر بتایا۔  
 ”شاہد! باپا سو رہے ہیں۔“  
 شاہد نے ایک نظر سے دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ دیر پہلے انہوں نے پدر الدین کو شاہد بابا کی خبر  
 سنائی تھا اور خود یہاں سے روانہ ہوئے۔ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کل سے سو سو سو سو کر تھک گئے تھے۔ لیکن کل

[illegible][illegible]

۱۰۔ یہ سیدنی پڑی ہوئی چلی جس کے ہم کالم کے پیچھے ہیں اور حقیقت ہمارا احسان میں کتاب ہے تو مٹی چلی  
 ۱۱۔ اہل بیت کی مکتب تھی اور پائی تو کسی کو میں اظہارِ ارادہ اور کما چاہے بھی ہے۔ مکتب نے بے کاف  
 ۱۲۔ صاحبہ چلیں اظہارِ ارادہ تو خود ہی اور پائی کو اس کو اس کو چلیں سے انکار کرنا تھا مکتب  
 ۱۳۔ اہل بیت کا قصہ تو یہ ہے کہ وہ کلام کے بیان اور کلام کا علاج ایسا ہی نہیں ہے  
 ۱۴۔ اہل بیت کا قصہ تو یہ ہے کہ وہ کلام کے بیان اور کلام کا علاج ایسا ہی نہیں ہے  
 ۱۵۔ اہل بیت کا قصہ تو یہ ہے کہ وہ کلام کے بیان اور کلام کا علاج ایسا ہی نہیں ہے

”پتھو“

”انہیں خیال کیا۔“

”ہاں پتھو ضرور کچھ نہ کچھ جانتی ہوں گی کچھ مزید جس سے وہ ابھی تک بے خبر ہیں۔ شاہی ابھی تک میرے نہیں لوئے تھے وہ مرنالے سے نکلے اور تیر خیز قدموں سے چلنے ہوئے حویلی کے اندر دلی رہائی کے لیے کسی طرف بڑھے۔“

زینت فاطمہ قرآن پاک پڑھ رہی تھیں انہوں نے شاہ رخ کو اپنے کمرے میں آئے دکھا تو پریشان ہو کر قرقر پاگ کو بند کر دیا۔

”خیر بہت ہے تم پریشان لگ رہے ہو۔“

”ہاں بہت ہے۔“

”شاہ رخ مجھے تم سے ان کے سامنے بیٹھ گئے۔“

”نہیں شاہ رخ پریشان ہو۔ سب ٹھیک ہے ناشی کیا ہے۔“

”ٹھیک ہیں۔“

شاہ رخ نے اپنے گتے ہاں میں انگلیاں الجھا کر زینت فاطمہ کی طرف دیکھا۔

”پتھو جب بارہ سال بعد شاہ بابا کے پاس آ کر بارہ شادی سے ملے تھے تو کیا وہ اس وقت ناراض تھے میرا مطلب ہے ان کی بددی حالت بالکل ٹھیک تھی۔“

”ہاں۔“

زینت فاطمہ نے ایک عرصہ سا سوچا۔ وہ کچھ مٹی تھیں کہ شاہ رخ اتنے اچھے ہوئے اور پریشان کیوں لگ رہے ہیں۔ شاہ رخ نے بس طرح شاہ بابا کو ہاسپٹل لے جانے اور ناراضگی کا اظہار کیا تھا اس نے یقیناً ”شاہ رخ“ کو الجھا دیا تھا۔

”پھر تین سال بعد ان کی یہ حالت کیسے ہو گئی اور یہ تین سال انہوں نے کہاں گزارے۔“

”معلوم نہیں۔“

زینت فاطمہ نے قرآن شریف کو بزدان میں پیٹ کر بند کیا اور اٹھ کر الماری کے اوپر والے خانے میں رکھا۔

”کسی نے معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔“

”بڑے شاہی نے اور دوسرے بہت تپا کر دیا کہ شاید کسی کو معلوم ہو کہ شاہ بابا یہ تین سال کہاں رہے لیکن بہت بڑا چل۔ بس اچانک ہی صبح روز گاہ کے لیے بیٹھے نظر آئے تھے۔“

”کیا آپ کو یقین ہے پتھو کہ جب وہ بارہ سال پہلے آئے تھے تو ایسی ہوا آگئی کہ عالم میں نہ تھے۔“

شاہ رخ تپا نہیں کیا جانتا جا رہے تھے کہ انہوں نے پتھو کی سوال کیا۔

زینت فاطمہ نے وہاں سے ہٹ بیٹھے ہوئے شاہ رخ کو غور دیکھا۔

”اس روز میری برآمد سے میں کھیل رہی تھی جب وہ بڑے شاہی کے کمرے سے باہر نکلے تھے۔ مجھے تو ہوا تو ہوا یاد ہے میں نے چلیے تو بے سرواٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ تو وہ میری طرف دیکھنے لگے تھے اور پھر مجھے دیکھ کر مسکرائے تھے۔ وہ راہی کی طرح نہیں تھے۔ بلکہ وہ مجھے بہت خوب صورت لگتے تھے اور بہت ہی اچھے بھی۔“

”تم کاظم بھائی کی بیٹی ہو۔“

”راہی کی۔“ میں بدستور سراٹھا۔ انہیں کچھ رہی تھی۔

”ہاں تم سب بہن بھائی انہیں راہی کہتے ہو۔ لیکن کیوں۔“

”پتا نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلادیا تھا۔

”قائم جانی ہو میں کون ہوں۔“ انہوں نے پھر دیکھا تھا اور میں نے پھر نفی میں سر ہلادیا تھا۔

”میں تمہارا کچا ہوں۔ کرم علی شاہی بہت نام۔“

مجھے یاد ہے پھر راہی اپنے کمرے سے نکلے تھے اور انہوں نے مرکز پستے ہوئے ان سے کہا تھا۔

”بھائی صاحب یہ گریبا بہت حیران ہو رہی ہے کہ اس کا کچا کما سے آگ کیا ہے اچانک۔“

اور پھر وہ راہی کے ساتھ ہی بائیں کمرے ہوئے حویلی سے باہر چلے گئے تھے۔

”راہی کے ساتھ۔“

شاہ رخ تپا نہیں کیا سوچ رہے تھے۔

”شاہ رخ کیا کیوں الجھا رہے ہو خود کو الٹی باتیں کریدنے سے فائدہ۔“

”ہاں پر الٹی باتیں کریدنے سے کیا فائدہ۔ کین۔ پتھو جان۔“

انہوں نے ناسف سے کہا۔

”مجھے افسوس اس بات پر ہوا ہے کہ آج میری زینت و جانیدار کا مالک اس حویلی کے آدھے حصے کا لکھنوا داروں کی طرح مردوں والی کوٹھی میں اتنے سالوں سے رہا ہے کہ ان آپ میں سے کسی نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اظہار تو بہت زیادہ لیل تھے انہوں نے کبھی شاہ بابا کے سلسلے میں کچھ نہیں کہا اور نہ ہی راہی حالانکہ شاہ بابا راہی کے بھائی تھے مگر نہ کسی سوچنے والی کسی لیکن ان کی رکوں میں دوڑنے والا خون تو ایک ہی تھا۔“

”شاہ رخ میری جان کیوں پریشان کر رہے ہو خود کو جیسا کہاں کسی کی مرضی میں چلتی تھی پہلے راہی اور اب شاہی ہم اگر احتجاج بھی کریں تو کیا۔ کہ ہم تو خواتین ٹھہریں۔“

”لیکن یہ ظلم ہے۔“

شاہ رخ نے زور انداز میں کہا۔

”میں شاہی سے بہت کڑوں گا۔ مجھے غاصب بنانا پسند نہیں ہے۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ قائم چاچو کو بھی ان کا حصہ دیا جائے کچ کر دیا ہوں پتھو میرا دم کھٹ رہا ہے جتنا سوچا ہوں یہ سب سائل اچھے لگتا ہے۔“

”شاہ رخ۔“

دل کے اندر کسی یاد نے چمکی لی اور وہ سسکی لے کر رہ گئیں۔ برسوں انہوں نے بس سوئے جاتے چلتے پھرتے خاموشیوں سے دوہرایا تھا۔

”تو ظلم ہے۔“

اور اندر لوگوں کے دل پر کرتے تھے لیکن وہ تو ایک بار بھی شاہی سے احتجاج نہ کر سکی تھیں۔ ایک بار بھی کسی سے نہ کہہ سکی تھیں کہ اس ابھی تو جوان پرش کا کوئی قصور نہ تھا کہ بڑا ظلم دیکھایا گیا تھا۔

”شاہ رخ۔“

انہوں نے پھر دہرایا ان کی آواز بھرا جی تھی تب ہی موبائل کی کھپ ہوئی تو شاہ رخ نے پاٹ سے موبائل نکالا۔

”میلو شاہ رخ شاہ۔“

”کہاں غائب ہو پھر زور اور پھر مرکز خبری نہیں لی۔“

دوسری طرف شاہی تھا۔

”اوہ شاہ رخ کچھ سوچ رہی ہیں آسکا ان کوں گا۔“

”تم کچھ پریشان ہو شاہ رخ۔“

شاہی کی آواز میں تشویش تھی۔

”نہیں۔“

اسے حجاب کی تشویش پر حیرت ہوئی۔

”تم نے ایسا انداز لگایا۔“

”تم ساری آواز اور سچے سے وہاں میں تو سب خیریت ہے نہ۔“

”ہاں سب ٹھیک ہے اللہ کا شکر ہے اور شاہ بابا کی طبیعت خراب تھی تو انہیں ہاسپٹل کے جانا پڑا اس لیے مسجد و آئینہ نہ کرنا۔ تم جانتے ہو شاہ بابا کو۔“

”جی ہاں مجھے تو جی کے کہہ رہا تھو کہ متعلق رہا ہے اب کیسے ہیں شاہ بابا۔“

”شجاع نے پوچھا۔“

”ٹھیک ہے تم اب ڈاکٹر چارج ہو رہے ہو ہسپٹل سے۔“

”یاد رکھو ڈاکٹر اجازت نہیں دے رہے تھے کہ وہ تمہاری مام میں نہ۔“

”اس نے فقہ لگایا۔“

”جی ہاں فون پر فون کیے جاتی ہیں کہ فوراً لاہور آتا ہوں ورنہ وہ خود آج ہی گئی دیکھتے۔ ڈاکٹر کو بائیک نہیں لیں گی تو تیلی نہیں ہوئی اور ہمارے بابا جان بھی کمال ہیں ممبر نہیں ہو سکا اور بتایا کہ ماما کو۔ اور وہ جو ہمارے باپ کے ہیں شاہرام صاحب انہوں نے بھی فون کر کے کرکے ناک میں دم کر رکھا ہے سو ایک پھٹکی چھٹی لے کر جا رہا ہوں لاہور۔“

”شجاع نے تفصیل بتائی۔“

”تو ٹھیک ہے پھر واپسی پر ملاقات ہوگی انشاء اللہ۔“

”لاہور کا پکڑ نہیں لے گا۔“

”شاہ بابا لگ جائے۔“

”ضغی ہے نہ۔ شاد۔“

”نہنت خاطر سے مہربن ہو سکا۔“

”ہاں کچھ سوچو ضغی ہی ہے ضغی یا پچھو سے بات کرو گے۔“ شاہ رخ نے پوچھا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ شجاع کے لیے میں اشتیاق تھا۔

”کچھ سوچو میں بات کر رہا تھا۔“

”شاہ رخ نے مہربانگی سے ان کی طرف بڑھایا۔ تب ہی ان کی نظر کھلے دروازے سے باہر پڑی۔ شاہ رخ اور ہی آ رہے تھے اس لیے کہ باہر تھوڑے پچھلے شجاع کے کما۔“

”میں ابھی رنگ بیک کر رہا ہوں۔“

”اور مہربانگی سے آف کر کے پاٹ میں رکھا۔ اگرچہ شاہ رخ نے نہنت خاطر کو مہربانگی سے طرف ہاتھ بڑھاتے شاہ رخ کو مہربانگی سے انہیں دیکھتے ہوئے نہ دیکھا تھا پھر بھی شادی کی اچانک آمد سے نہنت خاطر کا رنگ یکدم پیلا پڑ گیا تھا اور شاہ رخ بھی خود ڈاکٹر بن گئے تھے۔“

”تم کہاں ہو شاہ رخ؟“ شجاع ہوا سمجھتے ہی اسے بھی بات کرنا تھی۔“

”اور پھر شاہ رخ کو اجازت دے کر ہوا کیا تھا بیٹے کا اشارہ کرے ہوئے انہوں نے نہنت خاطر کی طرف نکلا۔“

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نہنت خاطر۔“

”جی ہاں شادی ہی ہو گئی ذرا سر میں درود تھا۔“

”خیر کوئی دوائے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ سیدہ انشا اللہ کس پاس ہوگی کوئی ٹیلیٹ سرورڈی۔“

”جی۔“

”نہنت خاطر کی نظریں جھکی تھیں انہوں نے بھی شاہ رخ کی طرف نظر پھری کہ نہیں دیکھا عجیب خوف آتا تھا انہیں کھوئے منظر آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتے تھے۔“

”شاہ رخ شاہ آپ کل صبح مسجد انشا اللہ اور سید شاہ میرے ساتھ لاہور چلے جائیں اور انہیں بائیک میں بیٹ کر دس-کوٹھل کر لیں کہ انہیں الگ دھم مل جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو دیکھ بھال کیجئے گا کہ وہ دم بیٹ اچھے اور خاندانی ہوں۔ دیکھتے تو میرا لاہور خاندانی تھا۔ لیکن کل آج اس کے علاقے سے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ انکس کے سلسلے میں شاہ بابا کی خدمت کے کچھ انکس کے لیے ضرور کھڑا ہونا چاہیے۔“

”دیکھو کل روز میں بھی ایک دو لوگ تو مزید ہوئے ہیں شاہ رخ۔ بائیک میں جبکہ تم ہوتی ہے الگ کمرہ تو مشکل ہے۔“

”شاہ رخ نے کہا۔“

”ٹھیک ہے اچھی طرح دیکھ بھال لیتا تم خود اتنا وعدہ لا رہے ہو۔ جو ضروری بات ہو سمجھنا اور پرنسپل سے بات کر لیتا کہ پندرہ میں ملں تک دونوں کو بند نہ بکری چھٹی اور کار ہوگی شاہ بابا کی شادی کے لیے۔“

”جی ہاں۔“

”سیدہ اس کے سلسلے میں خاص احتیاط کرنا۔ تمہارے دو جانے والے ہوں گے لاہور میں بائیک کے کماؤل کے متعلق تمہارا بیٹا کر لیتا۔ اور ان کو کسی ہے۔ کس کر داری ہے۔“

”جی ہاں۔“

”شاہ رخ نے شادی کی شادی سے فارغ ہو کر میں لاہور کا پکڑ لگاؤں گا وہاں گھر لے لیں گے اور ملا زمین یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”کیوں شادی میں بائیک میں بھی کوئی ڈکریاں نہیں ہے۔“

”لوگوں کی پریشانی میں ہوئی شاہ رخ شاہ بابا میں سیدہ انشا اللہ کے لیے یہ چاہ رہا ہوں اور نہنت خاطر۔“ انہوں نے بات کرتے کرتے نہنت خاطر کی طرف نکلا۔

”تم بھی تمہارا گھر کے ساتھ ہی چلی جانا۔ لوگوں سے مل لینا جنہیں اساع کے کرے میں رہتا ہے اور پھر لاہور سے چھوٹی موٹی شاہ بابا بھی کرتا ہے۔ تمہاری بی بی جان سے لست بنا رہی ہے لے لینا جانے کا پروگرام تو اس کا تھا لیکن رات سے اس کی طبیعت کچھ آپ سیٹ ہے۔“

”کہا ہوا۔“ نہنت خاطر نے پوچھا۔

”وہی وعدہ کا رہا ہے۔“

”انہوں نے لاہور والے جواب دیا اگر وہ اس وقت نہنت خاطر کی طرف دیکھ لیتے تو حیران رہ جاتے کچھ دیر پہلے کا زور چوگالی ہو رہا تھا اور انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اور دل کی کھڑک میں۔“

”نہنت خاطر نے پوچھا تو شاہ رخ نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر لکھی دی اور جیسے مہربانگی سے انہیں دیکھا کہ وہ بائیک سے سید شجاع کی شاہ بابا کے گھر لے گئے۔“

”سلسلے خاتمہ ہر آدمے میں کچھ لکھی کے تحت پڑاؤں لٹکانے کی جھلکی تھیں جبکہ ہوا نورانی کی گود میں سر کے آنکھیں سامنے تھیں۔ کچھ دیر پہلے ہی اس نے ان سے سر میں تپل لگوا یا تھا اور تپل لگوانے کے بعد وہ ان کی گود میں ہی سر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ سر بہت بھل ہو رہا تھا۔ دای سے تپل لگوا کر اسے بڑا سکون ملا تھا۔ اس کا بی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی آنکھیں منہ سے لکھی رہے اور دای اپنے نرم ترما ہوں سے اس کے سر میں مساج کر لیتی۔“

”اگرچہ۔“ سلسلے خاتمہ کی انگلیوں کی پوریں اب بھی اس کے سر میں گردش کر رہی تھیں۔

”اچھی بحث نہیں ہوئی تھی سے ڈیوڑھی سے نوکری جو ٹھیک میں لکھا ہے تو طے گا ہی تو خود کو بھلاں مت

کر۔ کشتوں سے دیکھ رہی ہوں تجھے تنہی تنہی تھکی تھکی لگ رہی ہے۔  
 ”نہیں تو دادی جان! ایسی کوئی بات نہیں مجھے تو پرانا سب سے اچھا لگ رہا ہے۔“  
 اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور مسکرائی۔

”تنتے پارے پارے سچے سچے داؤدی جی اور اتنی پاری باقیں کرتے ہیں۔ جن تو بڑی کلاسز کا پڑھائی ہوئے۔ ایک دوسرا بڑا کتاب چھیڑ چھیڑتے ہیں بھاگ کر سلام کرنے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں: مس! آپ ہماری کلاس میں کیوں نہیں آئیں۔“

”وہ ٹھیک ہے بیٹا! لیکن پھر کیا بات ہے؟“ تنٹوں سے چپ چپ کول کول رہی۔ ”کیا امان ہے کچھ کر دیا“

”میں نے پیار سے اس کی پیشانی تک آئے بال پیچھے کیے  
 ”نہیں بھلا اماں نے کیا کہنا ہے“

”بس کئی دنوں سے سر میں درد ہو رہا تھا۔“

[illegible]

”ہمیں وادی جان اب تو سرحد نہیں ہو رہا۔ آپ نے تیل لگایا ہے نا تو سرسرا لک بکا پھلکا سا ہو گیا ہے۔“  
 ”م بھی تک پچھنا نہیں گیا تمہارا۔“

”اسخونوں سے سرور دیے پھر رہی ہو اور گوئی کا نام سنتے ہی سرور دعائے ہو گیا۔“

”مجھ کو ادنیٰ جان! بالکل درد نہیں ہو رہا اب۔“  
 ماہ نور نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی تو انہوں نے ایک مفلکوں سی نظر اس پر ڈالی جیسے اس کی بات کا یقین نہ ہو۔

۲ چھاٹھیک ہے نیلن اگر پھر دروہو انو گولی کھا لیتا۔  
نور نے تخت کے نیچے سے چلا نکلا کر سہترہ

”چار دن میں کھلا کر رہ گئی ہو تم۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دے یہ نوکری۔ پر دھا۔  
اے بی گنہگار ہو گئے ہو۔“

”مگر اودی جان! اچھے پسند ہے ناز بھانا۔ میں تو بچپن سے ہی سوچتی تھی کہ بڑی ہو کر ٹیچر بنوں گی اور پھر آپ کو لکھوں گی۔“

خدا نظر بد سے بچائے کیا ان کے گھر سے کھاتی ہو جو تمہیں جانچنے لگیں۔ چار انجلی تو کہہ رہے تھیں۔

”اودی! آپ بھی بس۔ اگر واقعی میری کمر ہار اچھ ہوتی تو کس قدر مضحکہ خیز لگتی میں۔“  
اسے مسکراتے دیکھ کر مسلمی خانم کو اطمینان محسوس ہوا۔

”جی اچھا۔“

ماہ نور نے اثبات میں سر ہلادیا۔

سکلی خانم نے جاتے جاتے پھر ایک گہری نظر اس پر ڈالی تھی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر منہ ہی منہ میں کچھ بدبواہر نصیر خان کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

”یہ کیسی بے نام سی ادا سی ہے۔“

داؤی کے جانے کے بعد وہ پورا سے نکلے گا کہ پڑھنے اور سوجانے۔  
 ”آخر کیا ہے مجھے؟ کیا میں اپنے چند دنوں میں تنگ ہیں کہ ہر دو محسوس کر رہا ہے؟ واؤی ہی نہیں،  
 اماں اور نزل بھی پوچھ چکے ہیں کہ واقعی خاموشی اور تنگی کیوں کیوں کر رہی ہے؟“  
 ”کیا اسکول میں کوئی بات ہوئی ہے؟“

”نہیں تو۔“ اس نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”بھلا اسکول میں کیا ہوتا ہے“

”آپ کچھ دنوں سے بہت اداس اداس اور خاموش لگ

ہو کیا ہو۔ ہو مائے نالایا! بھی بھاری ہر آنچیز جزی تو قبول نہیں کرتیں۔“  
 ”ہو تا ہو گا کائنات میں تو سب آنچیز رست اچھی ہیں۔ مسز مرزا اور اوس آئے سے تو ٹھیک ٹھاک دوستی ہو گئی ہے  
 اور حنا کی آئی تو توں ہی بہت خیال رکھتے ہیں۔“

”تو کیا بہت نفجباب ہے مشکل لگ رہا ہے آپ کو پڑھانا؟“  
 نرمل بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”نہیں تو ایسا تو کچھ نہیں ہے رونا! کچھ بھی مشکل نہیں لگ رہا مجھے۔“  
 نزل نے پھر بحث نہیں کی تھی، اسے حسرت ہو رہی تھی کہ بھلا نزل

”تو کیا میں شکل سے بہت کھلی عکسی اور پریشان لگ رہی ہوں جو نرم اور اماں۔“

اور اب! ادنیٰ بھی یہی بات کہہ رہی تھیں۔ بہت زیادہ بولتی تو وہ پہلے بھی نہیں تھی اور

لیکن ایسی چپ اور خاموش توفہ کبھی نہیں رہی تھی۔ نزل سے ہلکی پھلکی بات چیت پڑھائی میں تھوڑی بہت  
نہیب ڈانٹاں اور مول سے بھی اس کی بات چیت ہوتی تھی۔ کبھی چڑھاوا، کبھی لٹو کھیل لی، کبھی کوئی کہانی

خدا کی عبادت میں اس نے ان پر بھی کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بس اپنے آپ میں ہی مگمگاتے کیا سوچ رہی تھی۔

یعنی والی مومن سب کے لیے ایک اچھے اور روشن مستقبل کے لیے جلد جد کرنا ہے ابھی اکیلے اور پھر چھ دنوں تک مہینوں میں میرے ساتھ شامل ہو جائے گا اور ایک دن ایسا آئے گا جب سب اپنی اپنی منزل پائیں گے اس دن کے آنے میں ابھی بہت دیر ہے اور میرے

اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پریشانی کو دیا۔

133



تا معلوم اور اسی کے غبار نے اس خوشی کو روندنا لگا دیا تھا۔  
 نصیر احمد خان کی ٹانگ میں معمولی حرکت پیدا ہو گئی تھی مگر ابلی کا کچھ اثر ہوا تھا اور یہ ایسی بات تھی کہ جس پر وہ  
 جتنا بھی خوش ہوئی، کچھ سہی بہت خوش تھے اس معمولی حرکت نے نصیر احمد خان کی آنکھوں میں امید کے  
 دیے روشن کر دیے تھے ان کی بھی بھی آنکھوں میں چمک دیکھ اندر تک سرشار ہو گئی تھی۔  
 ”ایسا مجھے یقین ہے ایک روز آپ پھر سے ملنے لگیں گے۔“  
 ان الفاظ کا تمام کردہ ہونے کی یادوں کی آنکھوں کی بالوں میں جھلجھلاتے امید کے رنگ کتنے اچھے لگ رہے

تھے۔  
 حیدر کی نماز میں اس نے بہت دیر تک ان کے لیے دعا کی تھی لیکن جب وہ سوئے کے لیے لیٹی تو دل ویسا ہی  
 جو قبل تھا اور اندر پھیلے اور اسی کے سامنے لاتعلقی ہو کر رہے تھے۔  
 اور پھر انفعال مایوسی کی آمد بھی کچھ کم خوشی کا باعث نہ تھی۔

بچپن سے وہ ان کے سامنے قریب سے آکر وہ بھی اس کے لڑائیوں کی طرح ہی اٹھاتے تھے۔  
 لیکن وہ ان کے آنے کا سرخوش نہ ہوئی تھی۔ جب ماں نے اسے بتایا کہ انفعال بھائی آگئے ہیں تو اس نے  
 سرسری انداز میں ”جھا آپ کا اور زمل کے حلق پر پڑ گئے۔“  
 ”زمل اندر ہوئی تمہارے باپ کے کمرے میں۔“  
 ماں بچپن میں تھیں اور وہ کچھ دیر پہلے ہی اسکول سے آئی تھی۔ بیگ اور چادر تخت پر رکھ رکھ ان کے پاس بچپن

میں ہی آئی تھی۔  
 عموما ”اس“ کے آنے سے پہلے زمل کا بچے سے اچھلی ہوتی تھی۔  
 اور دونوں وہ باتیں تھیں۔ اب ان کو چنانچہ ”یہ کچھ اور صریح آئی تھی۔“  
 ”جھا آپ انھیں کس ریل پر لے جاتی ہیں۔“  
 ”میں، تم کبھی ہوئی ہو۔“ میں بتاتی ہوں، تم چل کر مجھ کو اب کے کمرے میں اور زمل کو کوہ پٹیل لگا دو۔  
 دہلی اور وادی آئی ہوئے ہوں گے۔“

ماں نے اس کے اصرار کے باوجود منع کر دیا۔  
 ”انفعال مایوسی کا کس نے بتایا ہے کیا نصیر بھائی آئے تھے؟“  
 اس نے سرسری انداز میں جواب دیا تھا۔  
 ”میں“ انفعال بھائی خود آئے تھے ملنے جن میں بہت یاد کر رہے تھے اور جہاں سے پونہروٹی میں الیہ مشین نہ  
 لینے پر تھا وہ رہے تھے۔ رات کے کھانے پر بلا گئے ہیں سب کو کہہ رہے تھے سب سے ملاقات بھی ہو جائے  
 گی۔“

ماں نے تفصیل بتائی لیکن وہ اب کیسے رہے کا بہانہ نہ کر سکتی تھی۔ حالانکہ وادی نے کتنا ہی کہا تھا۔  
 جاکیں کی گئیں اس نے وادی کو زبردستی بھیج دیا تھا۔  
 ”وادی! آپ جاکیں، میں ہوں تا اب کیسے اس اور پھر مجھے میسٹ چیک کرنے ہیں۔ نئی نئی جاب ہے اور میں  
 نہیں چاہتی کہ ڈاکر صاحب کو شکایت ہو۔“ کچھ منہ پھلی میسٹ کی مارکس شیعہ بنی ہے مجھے۔“  
 وادی سب کو لینے آیا تھا۔ اس نے بھی کہا لیکن وہ نہ مانی۔  
 سب میں اس کے نہ جانے پر حیران تھے۔

”علیحدہ! کیا تو ناراض ہو رہی ہیں آپ سے۔“ ”زمل نے بتایا۔“  
 ”میں اتوار کو جا کر مل لوں گی مایوسی جان سے۔“  
 ماں سکھایا دینے پر کہ انفعال بھائی میسٹ یاد کر رہے تھے اس نے انھیں کہا تھا لیکن پھر۔

وادی اور گزرتے گئے وہ انفعال مایوسی کی طرف نہیں گئی تھی۔  
 ”وادی! تم جی پیر ہر دو سالہ دن ہو گئے ہیں۔“ دونوں بانو لکھنوں کے گرد حائل کرتے ہوئے اس نے مٹھنوں پر  
 ٹھوڑی رکھتے ہوئے سوچا۔

”نصیر بھائی بھی نہیں آئے حالانکہ وہ بیٹھے ہیں ایک پکڑ ضرور لگا دیتے تھے۔ عموما! اتوار کو آتے تھے لیکن  
 اب۔ شاید مصروف ہوں گے یا کفر علی کی شاپنگ کر رہے ہوں محرش کے ساتھ یا جھرمے۔ لیکن وہ تو کہہ رہے  
 تھے کہ نہ خیر مجھے کیا وہ کتنی کرسیدیا نہ کر۔“  
 اس نے اپنے آپ سے کہا اور سامنے دیکھا دھوپ مچن سے ہو کر پورا تک پہنچ چکی تھی۔  
 ”آج بھی نصیر بھائی نہیں آئے۔“

اس نے یوپی سے سوچا اور پھر ایک دم بچہ کی۔  
 ”تو کیا میں نصیر کا انتظار کر رہی ہوں؟“

”آپ کی کیا۔“  
 زمل اسے بھاری ہونٹی کر رہے تھے باہر نکلی۔ ”آپ کو کیا ہے حزن خالہ آری ہیں کل۔“  
 زمل اس کی سٹاپ ہی تخت پر بیٹھی تھی۔  
 ”پتا ہے مجھے بہت شوق ہے ان سے ملنے؟“ میں دیکھنے کا لیکن ضروری نہیں مایوسی بھی تم سے ملنے کا شوق  
 ہو۔“

ماں اور کے لیے کی خجیر کی پر زمل نے غور نہیں کیا۔  
 ”میں بھی ضرور شوق ہو گا، مگر ہلے کے پتا ہے بتا رہی تھیں کہ حزن خالہ اور عذر خالہ ان سے بالکل علی  
 بہنوں سا پار کرتی تھیں اور پتا ہے مجھ سے ان سے ملنے کا لیکن شوق ہے۔“

اس کے لیے جس اشتیاق تھا۔  
 ”ایک تو اس لیے کہ وہ ان کو نہیں اور دوسرے اس لیے کہ وہ بہت خوبصورت ہیں۔“  
 ماں کہہ رہی تھیں۔ حزن خالہ اتنی خوبصورت ہیں کہ ایک بار تو بڑھ بھوت رہا جا ہے اور بے اختیار اللہ کی

مناجا علی کو پڑھ کر آتا ہے۔  
 میں نے تو اس سے کہہ دیا ہے کہ کل ہی جاکیں کہ حزن خالہ سے ملنے انفعال مایوسی کی طرف۔  
 جب میری جہان مجھے بتایا تھا ان کے آنے کا تو میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں ان کو اس کی ماں کے ساتھ۔“  
 ”تم خواہناؤ یا نہ خواہناؤ، میں خود ہی ہو رہا! حزن خالہ کو بتا کہ میں ماں یا وادی ہوں لیکن کیا نہیں۔“  
 ماں اور کے چہرے پر بہت شور خجیر کی تھی۔ زمل نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”وادی! تم لیکن یا نہیں ہوں لیکن ماں یا نہیں۔ ماں بتا رہی تھیں کو حزن ہونے پر تھیں پھر بھی دوستوں جیسی تھیں۔“  
 ”ماں تو عذر خالہ کی صحبتیں کا بھی بہت ذکر کرتی ہیں۔“

ماں اور نے اسے ٹوک دیا۔  
 ”کتنی یاد رکھا ہوا ہے انھوں نے ماں کو؟ کتنی بار آئیں ان سے ملنے؟ کتنی بار خط لکھا؟“  
 ”وادی تو مایوسی جان ہی اتنی سخت مزاح کے ہیں کہ چاہے پورا عذر خالہ ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہ کریں  
 نہیں۔“

زمل نے آہستہ سے کہا۔  
 ”ایک تو عمری میں شادی ہو گئی تھی مایوسی جان نے جیسا چاہا! میں اپنے رنگ میں رنگ لیا۔“  
 ”زمل! کیا تم بہت خوش قسم ہو۔“  
 ماں اور کے لیے جس توجہ کی تھی۔

۴۳ سفر بھائی کے علاوہ تم نے بھی غزرا خالہ کی کسی اولاد کو دکھا ہے یا ملی ہو۔ راجے بھی وہ تمہارے پاس سے گزر جائیں تو تم نہ جان سکو گے کہ تمہارے سامنے کیسے اولاد اور تمہاری اہل کی کتنی بچہ زاد ہیں یا بھی۔

”آہ۔“  
 نزل نے سرافخا پر غور سے دیکھا۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ جی جی خوں ہو رہی ہیں۔“  
 ”ظاہر ہے وہ لوگ باور میں ہیں نہ۔ وہ بھی یہاں آئے نہ ہم لوگ بھی وہاں گئے تو پھر ظاہر یہ بات ہے کیسے

پچھانیں گے؟“  
 باہور خاموش رہی، ذہل ہی دل میں کچھ شرمندہ سی ہو گئی تھی کہ میں بھلا کیوں تجھو رہی ہوں۔

۴۴ ”اے کدو رہی نہیں۔“ اسے خاموش دیکھ کر نزل نے پھر بتائے گی۔  
 ”اگر وہ حنہ خالہ کی دعوت کریں گی۔ اسے عرصہ بعد ویدھو ابس آئی ہیں کینڈا سے۔“

”وہ جو چھ ماہ کی دعوت قبول ہی کریں گی۔“  
 باہور کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”بے وقوف لڑکی! آج کل صرف دولت کے رشتے ہوتے ہیں۔ خون کے رشتے نفی خیر اہم ہوتے ہیں۔ آپ کے پاس دولت ہے تو آپ کے سب رشتہ دار ہیں آپ کے پاس۔ دولت میں ہے تو کوئی بھی آپ کا رشتہ دار نہیں۔“

”خیر ابھی یہی بات نہیں ہے۔“  
 نزل نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔

۴۵ ”فضل ماموں جان نے تو بھی ہمیں اس کا احساس نہیں دلایا کہ ہم غریب ہیں اور یہاں تک حنہ خالہ کی بات ہے تو اہل کدو رہی نہیں کہ حنہ بھی جی کر اپنی آغوش میں ان سے ملنے ضرور آتی تھیں۔“

اور سب کے لیے گفت لاتی تھیں اور جب تہیہ ہوا تو ان تھیں تو اپنی خوش فہمی میں تمہاری بدوائش پر اور جب کراچی آئی تھیں تو پتھنوں میں روز آتی تھیں اہل کی طرف سے۔ لیکن نہ آئے اورادی سے پوچھ لیں۔“ نزل

کہتی ہوئی۔ ”اُٹنی کیا پھینسا خضر بھائی سے آپ کی کیا بات ہو گئی ہے۔“  
 وہ غور سے دیکھ رہی تھی۔

”نہیں تو۔“  
 باہور نے چونک کر کہا۔

”بھلا ان سے میری کیا بات ہو سکتی ہے۔“  
 ”دراصل میں نے غور کیا ہے کہ جب سے آپ اوسر سے ہو کر آئی ہیں تب سے ہی چپ چپ کی ہیں اور مگر

خضر بھائی بھی نہیں آئے تھے دونوں سے اور آپ فضل ماموں سے بھی نہیں ملے تھیں۔“  
 ”خیر خواہ تو اس آرائش سے کہ خضر بھائی اگر نہیں آئے تو انہوں نے تمھیں نہیں لے رکھا یہاں رہنے

پکار لگائے گا اور جی سہولیات ہو سکتی ہیں ان کی۔“  
 نزل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اندر سے اہل نے آواز دی۔

”تم جاؤ! اہل بلارہی ہیں۔ میں ابھی ہاتھ لے کر چاہے بنا دیتی ہوں۔“  
 اس نے شعوری کو پیش سے لیے کو زمرہ کیا۔

”مست تاج میں کل جھنڈا لایا یا خضر بھائی سے خودی پوچھ لوں گی۔“  
 نزل کندھے سے پھٹکے ہوئے کتاب اٹھا کر اٹھا کر کسی کی طرف چلی دی۔

”خیر کیا ہو گیا ہے مجھے نہیں خیر خواہوں یہ بات ہے۔ اسے توک رہی تھی۔ خاموشی سے سن لیتی، تکتے شوق سے حنہ خالہ کا ذکر کر رہی تھی۔“

ماہور کو ذرا مت سی ہوئے گی۔ آج تک اس نے کبھی کسی سے سخت ملے جی بات نہیں کی تھی پھر کیوں۔  
 اس نے بے بسی سے مٹھائیں۔ ”بھئی اور بے اعتبار اٹھ آئے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس نے سر کھنٹوں پر رکھا یا تھا اور انہیں منہ سے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی جو بلاوجہ ہی آئے پلے جا رہے تھے وہ اس طرح خوش گم تھی کہ اسے خضر کی آمد کا پتا ہی نہ چلا۔

”بھئی رتھ نہ سنا۔“  
 اس نے یکدم سرافخا کر اپنے سامنے کھڑے خضر کو دیکھا۔

”آہ۔“  
 اس کے لب کا پلے اندر ایک ساتھ بت سے دیے جل اٹھے تھے۔ وہ پیش کی طرح بھولا نہیں تھا۔ خود تو

اسے باؤسی نہیں تھا کہ آج اس کی رتھ ہے اور اسے تو بھی جی یاد نہیں رہتا تھا۔  
 خضر نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

”بے بہت دلوں بعد آئے۔“  
 وہ کچھ گھبرا گیا۔ حالانکہ پہلے تو وہ اس طرح بھی نہیں گھبرا کر تھی۔

خضر نے پچھلے اسے دیکھا۔  
 ”ابا! میں اظہار قیام ہے۔“

”ہاں۔ وہ۔ آپ پچھلے سڑے کو بھی نہیں آئے تھے۔ اب۔“ اس نے وضاحت کی۔  
 ”اس کا مطلب ہے کہ میرے نہ آئے کو محسوس کیا۔“

خضر کی آنکھوں میں جھلک نہیں آئی۔  
 ”سوری۔ آج بھی کچھ ٹھٹھو ہو گیا۔ دراصل میں اسلام آباد میں تھا۔ چند گھنٹے پہچری ہوا تھا۔

اور پچھلے سڑے کو بھی میں یہاں نہیں تھا۔ ایک بے رنجیت کے سلسلے میں حیدر آباد جا رہا تھا۔“  
 ”میں بھی شاید وہ نکلتی۔“ اس کے لبوں سے تیراوار طور پر نکلا۔

”جتنی۔“  
 خضر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ آپ کی اور عمر کی تھی۔“  
 اس نے کسی قدر احتیاط سے کہا اور پھر فراموشی پکھیں پکھیں جھکائیں تو خضر کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔

”تو یہ بات بھی یاد۔“  
 اس نے آنکھ سے کہتے ہوئے اٹھ بیٹھ پڑے تھیں۔

”اس لیے پریشان نہیں؟“  
 خضر کے ہونٹوں پر ابھی تک مسکراہٹ تھی اور اس کی نظر میں باہور کے چہرے پر تھیں۔

”نہیں تو بھلا میں پریشان ہوتی۔ یہ تو مجھ بابت ہے خوشی کی بات ہے۔ ہماری جگہ میں ابھی تک کسی کی

خیر شادی نہیں ہوئی۔“  
 وہ کچھ گھبرا کر تھی۔

”ابھی۔“  
 خضر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”پھر پوری سچ کہہ رہی تھی تمہارے سے تھک گئی ہو میں نے تو پہلے۔“  
 ”نہیں! میں ابھی کوئی بات نہیں ہے۔ روز ہوا تو کسی کہہ دی ہے۔ دراصل۔“

اس نے خود کو سنبھالا۔  
 ”وہ میری طبیعت ہے۔ تمھیں کبھی نہیں تھی میں بہت روتو تھا۔“

اس نے بمشکل پلکیں اٹھائیں۔  
 ”ابھی تیل لگوا یا تھا داری جان سے۔“  
 ”اوکے“

[illegible]

”اب کیا محسوس کر رہے ہو جیسی؟“  
 انہ نے سرخی سے پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے فری سے کہا تو اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔  
 ”فیکہ ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔“ اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ ”آپ کو کسی کیس کے بڑے کے پاس کوئی  
 اسے دیکھ رہی۔“

پندرہ دنوں میں اس کا دیکھا ہوا رنگ سناہرہ رہا تھا۔  
چرے پر زردی اور گل رسی تھی۔ وہ پورا ایک جنت باہنسل میں رہا تھا۔ اس کا شمار یکدم ہی بہت تیز ہو گیا تھا۔  
اس روز اس نے سزا سے ٹھیک رہے تھے۔ ہمارے تھے۔  
”موصلا میری جان ہے۔ یہ کیا ذرا سے بخار میں بہت مار بیٹھے“  
”نعم انوشہ۔ شہی بہوش ہو گیا ہے۔“  
بعد میں جب کہ انہوں نے انہیں سے کہا تھا تو پھر اسے وہیں چاہائی پر لٹایا۔  
غذا تک نہ کھانے لگیں، ”اور انہیں آکھوں میں آسو بھرے سے دیکھ رہی تھیں۔“  
”نعم شہی۔“

سُن کی آنکھوں میں دشتِ خُشیں اس کو سمجھ نہیں آئی تھا کہ وہ کس کو حوصلہ دے۔ وہ بھی مِشر کے ہاتھ لائے۔ اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے اور بھی بے بسی کے خدرا کی تکیم کی طرف دیکھتے۔  
 ”رفیقان! رمضان!“  
 انھوں کو سب سے پہلے خیال آتا تھا۔  
 ”ایک کرا کر جاؤ اور ڈاکٹر لائے، کوٹ لائے۔“ ڈاکٹر لائے جو ابھی کلینک میں پہنچی ہی تھیں، اُس کی ہوشی ناکس کر اُڑیں۔  
 ”جنگیں۔“

”بہن بیکہ مدھوش کر گیا ہے۔“ انہوں نے آواز نہ اٹھائی۔

”خیال رہے میں نے جب تک ایک سو اسی گنتہ نہ گزری تھی کہ وہ سو جائے۔“

”اور ہاتھ نہیں پٹھان کرے گی؟“ اس پر اس نے سر ہلایا کہ ہاں۔

”اور آج صبح انہیں لوگ کشین، پٹھان اور ان کی سپردی بھی پاش کرنے لگتا اور پھر دیر بعد پھر جلا جھڑ جاتا۔“

”اس سے روز کا لازمیہ کہ مشورہ ہوئی کہ انہوں نے منجر کو ہاسٹل میں ایڈمٹ کر دیا تھا اور وہاں کسی بھی حال

”آغا۔“ ارون کو بخلا رہا تھا اور امید ہوئی کہ اب ٹھیک ہو جائے گا تو رات کو پھر یوں کیفیت ہو جاتی۔ پورا ایک

”بہن! بسن! رات ہو چکی ہے۔“

[illegible]

”مجھے بھی تو میں سے بچھڑ جائیگا!“  
اس نے راز کی آواز میں اٹھائیں اور پھر فراموشی جھانک لیں۔ آنکھوں کی سطح پر پوری تھی۔  
”میں جانتا ہوں کیا ہے۔“  
خضر نے ایک لمحہ کی گمان میں۔

”میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اسے ہرگز نہیں دیکھا تھا۔“

”میں نہیں اس لیے یوشان نہیں ہوں۔ اس کے سر پر نہ لیں۔“  
 ”ہو سکتا ہے تمہارا بھتیجہ ہو گا، لیکن ایسا ہی ہے غمخوار کو تو جس خدو اس کا جواب مل جائے گا۔ بھٹس  
 اوقات میں خدو سے چڑھیں لی خبر نہیں ہو سکتی، اچانک کوئی ہو سکتا ہے جب آپ پر آشرف ہو سکتا ہے  
 آپ کا دل تو اس کا ہو گا اور اسے ایک ہی طرح پر بھی آشرف ہو گا میرے دل کے زندگی کے سفر کے  
 لیے جس سفر میں چاکلی کے بڑے حشر ہرگز نہیں ہے۔“  
 اس کا جواب دیا جس میں لایا ہوا تھا اس نے رات گھر کا ڈھیر طرف لکھا۔ اس سے باور کی طرف بھتیجی  
 اس کی نظروں کا ایک سر دھیں ”اس کے چہرے پر بکوں سے رنگ ہے،“ تھوڑے سے دل کی رشتہ میں یکدم تیز  
 ہو گئیں۔ اس نے تھوڑے خدو سے بھٹس لی یوشان کی دہری سی۔  
 ”ہاں! اس کی کواڑ سر کوئی سے زیادہ بلند نہ تھی۔“

”وہ لڑکے تو ہوا، ہاں!“

”یہ بات میں نے ابھی تم سے نہیں کہنا تھی لیکن صرف اس لیے کہ وہی کہ تم بہر گمان نہ ہو جاؤ۔ تمہاری سہو پریشانی جیسے سب محسوس کر رہے ہیں، ہاں اس نے مجھے بے چین کر دیا۔ یقین کرو ہاں وہاں اسلام آباد میں کچھ کمزور صرف تمہیں ہی سوچنا رہا۔“

آئی اور وہ کہی بات برسان کر لی رہی کہ میں شرمناک ہو چکی ہوں تو اس نے ہنس کر کہا: "ماہ نو رکھیں، تمہیں کچھ نہیں لگتا، لیکن انہی چھ ماہ نو ہوں، میں جیسے ان پر منہ بوجھ کر رہا ہوں۔ رخسارت پر تھے، مگر نے شکل اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا میں۔"

”میرے خیال میں اس کا کافی ہے۔ تاہم اس کا بھی حلقہٴ حائل اور انھوں میں سے کسی  
 ”اب شہزادہ اچھے بہتر اور اندر اگل کے سرے سے ملے، وہاں جا کر کھ کھائے“  
 ”پیش کی طرح وہ لاپا تھا۔ وہ بھی بھی اس کے برتھ ڈے کے لیے لایا گیا نہیں، جو ان تمام اس کی وجہ سے  
 صرف اس کی وجہ سے بن کر رہتا ہوں، ہوا جا تھا، بکے لیے۔  
 ”اب بٹے میں ساتھ کے آئی ہوں۔“

”دودھ لے آؤں۔ پیو گے یا سا گوانہ لے لو تو حواس۔“

”میں کچھ نہیں چاہتی۔“

”مجھ نے آپ کو کھولنے کی فکر نہ کی۔“

”بھئی! کچھ تو حواس لے لو،“ تم نے کچھ نہیں لیا۔ اس طرح تو تم سترے میں اٹھ پاؤ گے کتنو کیک ہو گئے ہو۔“ تم نے منت کی۔

”اُنی پلنگہ کا تار پائی میں چاہ رہا۔“ میشر نے پری سے کہا۔

”جی نہیں چاہا یا بیٹا! ابھی پچھلے لو۔ تو حواس تو حواس کر کے لو۔ دودھ اور سا گوانہ نہیں تو جو تمہارا دل چاہا ہے وہ لو۔“

عذرا تب تک نے اندر آتے ہوئے کہا تو میشر نے انھیں کھول کر ان میں دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

”لے کر بیویا!“

عذرا تب تک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے لے کر رہنے کو کہا لیکن وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیڈ کے کراؤں سے ٹپکے لگے۔ عذرا تب تک اس کے بیڈ پر بیٹھ نہیں۔

انہوں نے ایک شفت بھری نظراس پر ڈالی۔

”اس کی تو جان نکال لی تھی تم نے بیٹا! اُسے بے اللہ کا جس نے جس صحت زندگی دی۔“

میشر خاموش رہا اس کی نظروں میں کھلی ہوئی تھیں اور کیا تھا کر یہ بخار میری جان ہی لے لیتا۔ اس بے اعتباری کی زندگی سے جان بچھوٹی۔ لیکن زندگی جیتنے کا فائدہ جس میں ہر لمحہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ کا قتل انتہا پر ہے۔ آپ کا کردار مشکوک ہے۔ کسی بھی وقت کسی بھی آپ کو تپ کے لیے غلط حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔ اس نے سب کچھ سے سوچا۔

اور بتا نہیں آ گئی زندگی کیسی ہوگی، بدل ہی نہیں احساس مجھ سے آ رہے گا کیا میں مائل زندگی کی پائوں گا۔

”کیوں کیا ہو رہا ہے،“

اسفرند اور کمری نے اور پھر عذرا تب تک کی طرف دیکھ کر اسراراً ”تو حواس سر جھکا۔“

”اسلام علیکم ای جان! کسی ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں بیٹھو کر۔“

انہوں نے ایک شیف نظر ان پر ڈالتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

اسفرند نے کرسی پر بیٹھ کر بیڈ کے قریب کھڑے ہوئے۔

”تم نے تو ذرا ہی بڑا تھا رہا۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

”اب جلدی سے صحت ہو، تمہاری بڑھالی کا بہت حرج ہو رہا ہے۔“

”کیا کرنا کاغذ کر۔“ میشر کے لیے میں، اس کی تھی۔

”علم انسان کو خود دیتا ہے صحت۔“

اسفرند نے ایک محبت بھری نظراس پر ڈالی۔

”جینے کا طریقہ دیتا ہے اور تم سب سے کاغذ نہ سمجھا تا ہے۔“

انہوں نے اس کے ساتھ کہا تھا کہ انھوں میں سے کر دیا۔

”اور تم نے بڑھائے بہت آگے جانا ہے۔“

”مجھے تو لگتا ہے جیسے میں سال ہی رگ گیا ہوں پتھر ہو گیا ہوں۔“ میشر نے سوچا۔

”میں ایک دن اور آرام کرو اور برسوں سے کالج جاؤ۔“

اسرار اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائے اور بولے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔

”میں شش کر رہی ہوں۔“ میشر نے ایک گرمی مائل سانس لے کر اس کا پانیل جیسے جسماری پوچھتے پوچھتے محسوس ہوا۔

”یہ دیرانی تھی اس کی آنکھوں میں، کیسا کرب تھا اس کے چہرے پر اور بتا نہیں ابھی کتنا وقت لگا رہا ہے۔“

”میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے پتھر ڈالتا مسکراتا شرارتیں کرنا موشر گیا۔ جب شروع میں وہ مہال آئے تھے تو ہر ایک کسی سے بے لگتھ نہیں تھے لیکن اس کی اور اس کی ہر جگہ تک اس کی محفوظ ہوتے تھے۔“

”یہ میری درد پوار کیے ابھی تھے ان کے لیے اور ان میں رہنے والے بھی سب ابھی گتے تھے۔ گوان کا ان کے ماتھ خون کا رشتہ تھا۔“

”میں والے واقعہ۔“ اور میاں جی کی تنبیہ کے بعد انہوں نے سوچا تھا کہ وہ خود کو ان کے کسی بھی معاملے میں الٹا نہیں کریں گے۔

لیکن وہ تو زبردست ڈالو ہوئے جا رہے تھے۔ ان میں کچھ عرصہ بعد ملک سے باہر چلے جانا تھا پھر جانے کب واپسی ہوئی اور وہ کسی کو اپنا عادی نہیں بنانا چاہتے تھے اور نہ خود کسی کے ساتھ اتنا بچھوٹا ہوتا چاہتے تھے۔

مذاق تب تک کو پریشان دیکھ کر ان کا کان کاٹی جانا تھا کہ وہ ان کے پاس نہیں آئیں۔ ان میں اس احساس دلا میں کہ وہ ان کے بیٹے ہیں وہ ہر مشکل میں ان کے ساتھ ہیں۔ ان کی خوش سرکھ کرکھ جاتا تھا۔ اپنی باتوں سے ان کی اداس آنکھوں میں ہنس بھیریں لیکن وہ خود کو دیکھ لیتے تھے، جھمکتے تھے کہ ”میں مجھے خود کو کہاں ڈالو لیں کرنا۔“

”مجھے تو یہاں سے چلے جانا ہے۔ میں تو ابھی تک اہل جان کا گھر نہ کر وہ ان کی بھیتیں اور وہ لوگ کسی کو نہیں بھڑا رہا میں ان لوگوں کو کیسے بھلاؤں گا۔“

لیکن ان کے سوچنے سے کیا ہوا تھا۔ پہلے سمن اور اب میشر کی بیماری نے ان میں سب کے قریب ترک کر دیا تھا۔ میشر کی بیماری کے دنوں میں سمن ”انہی تم کے عذرا تب تک بھی ہر لمحہ ان کی طرف دیکھتی تھیں ان سے ہی اپنی پریشانی فہم کر لیتی تھیں۔“

”میں کراچی جانا تھا کتنا عرصہ ہو گیا تھا ان میں کراچی گئے ہوئے اور اب تو ان میں جانا ہی تھا ان میں امریکہ میں ایڈیشن کے لیے رقم کی ضرورت تھی اور قریب میں ان میں سالانہ کسی کا کاؤنٹ میں رقم بھی کرنا تھی۔“

”وہاں صلاح الدین سے کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ افضل مایوں یا انصر سے ذکر کریں گے اور ان میں خود سے عرصہ کے لیے کچھ رقم دور رہا ہے۔“

وہاں جاتے ہی دیارت قائم چاہ کر لیں گے اور ان کی رقم واپس کریں گے۔ وہ جانتے تھے کہ افضل مایوں اب بھی ان کا رشتہ نہیں کریں گے بلکہ وہ خود خوش تھے کہ وہ ایک ایسی سی کرنا چاہتے ہیں اور پھر افضل مایوں کے ایک نئی رقم شری کا تھا کہ وہ ان کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں لیکن جب عذرا تب تک نے کہا۔

”خراہتمارے یہاں ہونے سے بہت سارا ہے مجھے۔“ تو انہوں نے سوچا۔ پھر کسی میشر ٹیک ہو جائے تو وہ اپنی چلے جائیں گے وہ ان سے الگ نہیں تھے ان سب کے کدھ کدھ سے وہ چاہتے ہوئے بھی نظر نہیں چڑھا تھے۔

”من کے آنسو اور میشری وہ بھی، سبکی یا میں ان کا دل چیر گئی تھیں۔ وہ کیسے ان میں ان سب کو یوں پریشانی میں ڈال رہا تھا کہ وہ سمن۔“ وہ چوہا پھیل والی سمن کے میشر کی بیماری میں درد کر رہا حال کر لیا تھا۔

”جلی میں مسکراہٹ نے ان کے لیوں کو بچھا اور انہوں نے خاموش بیٹھے میشر کی طرف دیکھا۔“

”میں سب سے تمہاری بیماری میں سب سے زیادہ عاقل سمن نے کی ہیں اور سب سے زیادہ دہلی بھی ہوئی۔“

”ابھی بیماری سے کیا؟“

”ایہ لیکن آج نہیں تھی۔ میں نے ہی انہم کو جگانے سے منع کر دیا تھا۔ تمہاری صحت کے لیے نظر ہاتھ سے۔“

"اور یہ کیا۔ چائے اور سوکے پائوں روٹی کے ٹکڑوں سے طاقت آئے گی۔ عذرا بیگم! آپ بھی خوب ہیں۔ میں نے کل رات ہی چھوٹی چوڑے ٹکڑے کئے تھے ان کی چٹنی بنوائیں اور اسے دیں۔"  
 "خنی خنی باندی کھی کھیں اس کا می نہیں چاہا ہاتھ! عذرا بیگم نے جواب دیا۔  
 "خیر کچھ دیر بعد سے دیتے گا۔"  
 "ہی۔"

"اور ہاں اسٹریاں۔" انہوں نے اسٹری طرف کھنکھا۔  
 "اپنی والدہ کے ساتھ ذرا چاند میاں کی طرف چلے جائیے گا آج کسی ناظم اور ہاں آپ سیٹ پسند کر لیں جا کر اور لے آئیں۔"

وہ چھ عذرا بیگم کی طرف متوجہ ہو گئے۔  
 "کھلاخ نہ ہی کتنے رہ گئے ہیں اور ابھی تک زیور نہیں آیا یہ آپ کے سوچنے کی باتیں ہیں لیکن آپ۔"  
 انہوں نے ایک طنزیہ نظران پر ڈالا۔

"خیر ایک لاکھ سیٹ کلا ہو گا کیا خیال ہے؟"  
 اور پھر ان کے خواب کا انتخاب کے بغیر ہی بولے۔  
 "چھوڑو! یہ کئی لکھ۔ پھولی ہوئی ہو گئیں تو بعد میں تبدیلی کی جاسکتی ہیں۔ مزید لیتا ہو تو آپ کی مرضی اور چاند میاں سے کہہ دیجئے گاٹل وکان پر جمجھو دے۔" میشر نے آدھا کھلیا سلاخ اور چائے کا کپ ٹرے میں رکھ دیا۔

"دھ۔"  
 عذرا بیگم نے ہونٹوں پر زبان بھری۔  
 "خسی ابھی بہت دیر ہے۔ نکاح کی تاریخ اگر کچھ آگے ہو جائے تو۔"

"کون سا مل جوتا ہے شعی نے جا کر اپنا پیل چھانا ہے اور پھر ابھی چادران ہیں۔ سو ہو جائے گا تب تک۔"  
 اسٹری نے ایک نظر پھری ڈالی جو سات بیٹھا تھا۔ خیر ارادی طور پر بڑے بالکل قریب ہوئے تو انہوں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔  
 "اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے بولے۔

"مختصری قریب ہوئی صرف کر کے افراد ہوں گے لیکن چند قریبی جانے والوں کو بھی کہہ دو اور وہ تمہاری بہن مختصر حنہ بیگم کی میاں ہیں۔ تم انہیں بھی بلانا چاہو گی۔ گوشت نہیں کھتے ان کی شہولت قریب میں ضروری ہے لیکن بہر حال کہنا آئیں گی۔"

"وہ کراچی میں۔"  
 "کراچی قریب ہے، مختصری باہر سے کسی کو نہیں بلوانا۔" انہوں نے حنی انداز میں کہا۔  
 "اور کوئی نہ کسی طبعی تو بہن ہیں آپ کی اور میشر بیگم ہیں ان کے۔"

"دھکے اور ایک طرہ بھری مسکراہٹ ان کے بولوں پر آئی۔ "ہاں سوتیلی بہن لیکن ضرورت نہیں ہوائے کی۔ یہ نہیں پائے گی۔ شوہر چاہائی ہے اور اتنی تفصیل خرمیہ اور فزائیں کر سکتی۔"  
 وہ بے دردی سے ہنسنے باہر نکل گئے۔

"خیر تیرے امیں دھجہ ہاتھ۔ طبعی پچھو کیو احترام اور محبت سے ان کا ذکر کرتی ہیں اور یہ۔"  
 میشر نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔  
 "بھائی۔ بھائی جان۔"

میشر نے ہاتھ ہولے ہوئے کانپ رہے تھے۔  
 "باب۔ باب۔ کیا ہوا خسی! امی۔"

ساری رات جاگ کر بقیہ رہی ہے۔ صبح کی نماز پڑھ کر سو گئی تھی۔  
 اچھے چائے اور سلاخیں ٹرے میں رکھ کر گئی تھی اور بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ٹرے رکھتے ہوئے اس نے اسٹری طرف کھنکھا۔

"آپ حنہ خالہ کی طرف جائیں تو انہیں کئے گا کہ گھر ضرور آئیں۔ ہماری تو ہاسٹل میں ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔"  
 "کیا وہ ہاسٹل آئی تھیں؟" میشر نے چونک کر پوچھا۔  
 "ہاں! دوبارہ۔" میشر نے بتایا۔

"اس روز انہوں نے کھنکھن کیا تھا تو میں نے بتایا کہ ای تو تمہارے پاس ہاسٹل میں ہیں تو وہ ہاسٹل گئی تھیں پہلی بار انکس کے ساتھ چھوڑ دوسری بار اکیلی گئی تھیں۔"  
 میشر نے سر ہلاتے چائے کا کپ اٹھایا۔

"تم نے کب جانا ہے اور۔" عذرا بیگم نے اسٹری سے پوچھا۔  
 "مختصر سالوں بعد ملاقات ہوئی اور۔"  
 انہوں نے ایک گرمی سانس لی اور خاموش ہو گئیں۔ ان کی آمد پر میاں صلاح الدین نے کس قدر ناگواری اظہار کیا تھا، وہ شروع سے ہی حنہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔

"اور اس کی وجہ ان کی پسند کی شادی تھی۔ اب ہاسٹل میں بھی ان کا وہ بہت دور کھنا تھا۔"  
 "اسٹری نے ان کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور بیٹھ کر اس طرح ان کا دل دھکا دیا۔  
 حنہ خالہ ان سے عمر میں سال بھر کی پھولی ہوئی تھیں۔ گو شادی عذرا بیگم کی بہت پہلے ہوئی تھی لیکن حنہ خالہ کے مقابلے میں وہ کتنی فزیش تر، زیادہ اور یک دم رہی تھیں۔

"حنہ خالہ کو آج کل میں کراچی جانا تھا! انصاف! ماموں کی طرف میں آج فن کر رہی۔ یہ اخیال تھا کہ میں ان کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔"  
 "خیر کراچی جا رہے ہو اسٹی۔"  
 عذرا بیگم نے دل کرا نہیں کھنکھا۔ میشر اور بھی ان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"جی ہاں! ان۔"  
 "کب آؤ گے؟" کتنے دلوں کے لیے جا رہے ہو۔"  
 انہوں نے کسی قدر جرت سے عذرا بیگم کی طرف دیکھا جو یک دم پریشان ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اس بارے میں سال ان سے دور کراچی میں گزارے تھے۔ کیا تب بھی ان کی جدائی عذرا بیگم کو ایسے ہی محسوس ہو چکی۔

"وہ کچھ مضطرب ہے ہو گئے اور اندر بے چینی ہی پھیل گئی۔  
 "تم نے بتایا نہیں۔" انہوں نے پوچھنا۔  
 "کب آؤ گے! اب۔"

"میں نے پڑھائی چھٹی تھی، تو انہیں، مکی کرش تھی۔  
 وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میاں صلاح الدین نے اندر داخل ہوئے اور میشر کو مخاطب کیا۔ اسٹری احتراماً کھڑے ہو گئے تھے لیکن وہ میشر کو دیکھ رہے تھے۔  
 "کیسے ہو صاحبزادے۔"

"جی! ٹھیک ہوں۔"  
 اس نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا اور انہوں سے سلاخ کو تھوڑا تھوڑا توڑا ہوا چائے کی چکیاں لیتا رہا۔



”کیا یہاں کسی اور جگہ میری شادی ہوئی تو حالات کیسے ہوتے اس سے بھی پرہے۔“  
گمراہ زندگی میں پہلی بار اس نے برہنہ بعد جب بچے جن ہو رہے تھے اس میں چھپتے کوسا احساس ہو رہا تھا۔

یہ کیسی زندگی گزار رہی تھی اس شخص کے ساتھ۔ سمن کی خود کشی کی کوشش ہمیشہ کے نکاح کا فیصلہ انہیں اندر سے توڑ رہا تھا۔ کتنے اچھے دن تھے جب وہ کراچی میں اسے باپ کے گھر میں، کتنی دھیر خوشیاں تھیں۔  
حضور اور ان کا پیش ہی ختم ہو گیا تھا۔ ان کی طبیعت اور ان کی طبیعت آج بھی گھڑی ہو جاتی۔  
طابق روڈ کے چکر لگ رہے ہیں اس کی کھانے جارہے ہیں سمندر پر چایا جا رہا ہے۔  
کیسی خوبصورت زندگی تھی وہ کتنا اچھی تھی تھیں ان کی یاد اور چھٹی چھٹی باتوں پر۔ فیشن میگزین دیکھ دیکھ کر کپڑے ڈیزائن کے جاتے۔ پسندیدہ موٹر گاڑیوں کا روکھی جاتیں۔  
”تم سمندر دیکھ دیکھ کر رو نہیں ہوئی۔“ طبیعت کے آنے پر جب بھی سمندر پر جانے کا پروگرام بننا افضل ضرور لگتا۔

”میں سمندر ہر بار سنے رنگ میں نظر آتا ہے ہیں“ اور وہ نظم انہوں نے سمندر پر لکھی تھی مگر وہ کتنی پسند آتی تھی اور اس نے لاہور میں اپنی سب سہیلیوں کو سنا دی تھی اور کتنے فخر سے کہتی تھی۔  
”یہ میری بہن انہوں کی یاد شاہ ہے ایک ایسی فلم تھی جسے میں نے براہِ حال جانے ہوں۔“  
اور اب تو مایاں صلاح الدین کے سامنے ایک جملہ برتاؤ ہوئے تھے ابھی گمراہ جاتی تھیں۔ آج پتا نہیں کیوں گمراہ پر پلایا اور آگیا۔ ان کی شدت سے اور وہ نظم۔  
وہ فون اسٹینڈ کے پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ نظم اُٹھاتی ہاں سمندر۔

سمندر دور تک پہنچی ہوئی ایک ٹیکسول وسعت

سمندر زندگی ہے

زندگی کا استعارہ ہے

ہواؤں کو مٹی دیتا

سمندر

ساحلوں کا پسینہ

مٹی پر نیکیوں کا صلہ مگر

مٹی کا تصد فیض ہے

پچھتا ساساحلوں کی ریت پر

اے خیر بادوں کو لانا

لکھو دانا

سمندر استعارہ ہے سخاوت کا۔

بیٹھے بیٹھے انہوں نے کئی مصرعے پڑا دیے اور پھر ہولے سے سر جھٹکا اور ڈیر باب پولیس۔  
”یہ میں بھی کہنا پڑا میں ہوئی ہوں۔“ بیٹھے تو سمندر کو فون کرنا تھا۔ اس روز صبح نے گمراہ کو تھا۔ اچھے سے کہا تھا اس کی فائری پر لکھو۔ ”انہوں نے فائری اٹھائی“ پہلے ہی خط پر کر کے لکھا تھا صبح خال۔  
انہوں نے سیور اٹھا دیا اور صبح کا گمراہ لے گئیں۔

\*\*\*

”شاہ۔“

سیدہ اسامہ کے سامان کو ہاسٹل میں اور خود اسے کالج چھوڑ کر جب وہ گاڑی میں بیٹھے تو زینت طاہر نے انہیں پکارا۔

ان کی آواز میں لرزش تھی۔  
”بیٹا شاہ کب کب میں ملے گا؟“

”میں کبھی نہیں ملے گا۔“

شاہ نے مڑ کر ایک تسلی بھی نظر ان پر ڈالی۔ وہ ان کا اضطراب سمجھ رہے تھے بلکہ جو مٹی کے لے کر اب

نکلا انہوں نے ان کی بے چینی کا اضطراب کو ہر پہل محسوس کیا تھا۔

پچیس سال کی عمر میں وہ ان کے دل پر جو گزری تھی وہ سمجھتے بھی تھے اور محسوس بھی کر رہے

تھے لیکن فاصلوں کو ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ ان کے بس میں ہو تا تو وہ گھنٹوں کا فاصلہ کھول میں طے

کر لیتے۔ مگر چار کے دو دن ہوئے تھے اور سات کے قریب لاہور پہنچے تھے۔ آج سے چند سال

پہلے تو وہ سات گھنٹے گئے جاتے تھے اور پچیس میں۔ جو مٹی سے امن آباد تک زیادہ سڑک بنی تھی اور پھر کھول میں

آگے لاہور تک بھی سڑک بنی تھی۔ ان کی لاہور اب تو مٹی سے امن آباد تک بھی سڑک بنی تھی اور انہوں

نے رفتار بھی معمول سے زیادہ رکھی تھی پھر شہر میں گھنے گئے تھے۔ ہاتھ کے بعد وہ شاہ میر کے ساتھ گئے

تھے۔

گورنمنٹ کالج لاہور ان کے لیے انہیں نہیں تھا۔ انہوں نے خود یہاں سے ایف اے کیا تھا۔ کئی جاتے

پاپا نے چرے نظر آئے تھے۔ پچھو زیادہ مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ ہاسٹل میں کمرالٹا ہو چکا تھا۔ کالج سے فارغ ہو کر

وہ سیدھے ہاسٹل آئے تھے۔ جو گمراہ میر لاہور تھا۔ اس میں وہ لڑکے پہلے سے آچکے تھے اور قبل بننے کے خوف سے

کمرے میں چھپے بیٹھے تھے۔ سرحال وہ دنوں کے انہیں اچھے گئے تھے پہلی بیک گراؤ پر بھی اچھا تھا۔

شاہی نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ ان کی تعلیمی کے متعلق اچھی طرح معلوم کر کے انہاں سوانوں نے

ماری تعلیمات حاصل کیں۔

”آج آرام کر لو کلے کالج چلے جانا۔ کوئی بھی مسئلہ ہو سر ریشہ سے بات کرنا۔“ انہوں نے تاکید کی۔

سر ریشہ ان کے پرہیز تھے۔ انہوں نے شاہ میر کو ان سے متعارف کرا دیا تھا۔ سر ریشہ کے بھوتے بھائی

ان کے کلاس فیلو تھے سوان سے کالج چھوڑنے کے بعد بھی ملاقات رہتی تھی۔

”تم شاہ میر کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ شاہ میر انہیں ہر طرح سے اس کا خیال رکھوں گا۔“

شاہ میر کو پچھو روہ اسامہ کے کالج آئے تھے۔ لیکن نے اسامہ سے چند ایک سوال کیے گاؤں میں ہو چکا تھا۔

ہاسٹل میں بھی اور کالج میں بھی برہنہ صاحبہ نے چند ایک سوال پوچھے تھے۔

”روم نمبر آپ کو سب سے پڑی ہے مل جائے گا؟“ وہ وارڈن ہیں ہاسٹل کی۔“

وہ اسامہ کے ساتھ برہنہ کے کالج کے آفس سے گفت و سنت فاطمہ بی بی ان کے ساتھ تھیں۔

”میرا خیال ہے اب ہاسٹل میں چلیں۔“

انہوں نے زینت فاطمہ کی طرف دیکھا اور اپنے آپ میں گم تھیں۔

”ہاں چلیں۔“

اور پھر زینت فاطمہ سیدہ اسامہ کے ساتھ ہی ہاسٹل گئی تھیں۔ کمرہ کچھ تھا ابھی اس میں صرف ایک لڑکی لگی

”ابھی غلامی لڑکی ہے۔“

واپس آکر انہوں نے بتایا۔

”ابھی ایک لڑکی لگی اور آئے گی۔“ سب بھوتے بھوتے۔“

”ہو شل میں تو ابھی ہو گیا ہے پچھو۔“

شاہ میر مسکرایا تھا۔

”بڑے کمرے میں تو آچکے تھے لڑکیاں ہیں۔“

”ہاں کیونکہ روہ کے لیے شاہی نے کسی سے کہا تھا پتہ نہیں یہ کمرہ ہے۔“

دروازہ لاک نہیں تھا سنا سے ہی سید قائم شاہ بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر کدکھ کھڑے ہوئے زینت فاطمہ چٹلی سے آگے بڑھیں۔

”قاری“

اور پھر جیسے ضبط کے بند فوٹ گئے۔ سید قائم علی شاہ کا ہاتھ جو ان کے سر کی طرف اٹھا تھا، نیچے گر گیا تھا اور انہوں نے یکدم زینت فاطمہ کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

”چھوٹی لالہ“

ان کے لبوں سے نکلا۔

”بہت تڑپا ہوں آپ لوگوں کے لیے بہت یاد کیا ہے سب کو میں نے“ زینت فاطمہ ان سے مگی رو رہی تھیں۔

”کہہ گا احوال ایسا تھا کہ کبھی مہمانوں سے شک و شبہ نہ بھی نہیں کیا تھا۔ بس بھائی سر پر ہاتھ رکھ رہے تھے۔ قائم علی شاہ کو چھوٹے تھے پھر بھی جب زمانے میں آتے تو بڑے مہمانوں کی طرح سر پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ اب وہ ان سے بلی کھڑی تھیں۔ بھی بلی ہاتھ چکڑا آنگھوں سے لگائیں جو جس بھی بازو کا انھوں میں پہنچائیں۔

شاہ رخ سناٹ کھڑے یہ منظور کر رہے تھے۔

”بہت رویا ہوں میں۔ سب سے چھڑ کر کبھی خوش نہیں ہو سکا۔“

بہت دیر بعد شاہ رخ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”مٹاؤ۔ ٹیکس پلےز چارو!“

”ہاں ہاں چھوٹی لالہ بیٹھیں، بیٹھیں اور۔“ اپنے آنسو پونچھے ہوئے انہوں نے زینت فاطمہ کو بازو سے چکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور پھر شاہ رخ نے کھلے۔

”سوریہ کار“

”مٹس اوکے چارو!“

شاہ رخ سرکرائے۔

”کل رات سے۔ جانتے ہو شاہ رخ کل رات سے میں سو نہیں۔ جب سے شجاع نے بتایا کہ زینی چھپو آ رہی ہیں شاہ رخ کے ساتھ تائب سے ایک ایک لمحہ صمدی بن کر گزارا ہے۔ لفظوں میں ان لحاظ کا کرب صوبا نہیں جاسکتا۔ بس یوں سمجھو جیسے جان کی کاغذ ہو اور دل خوش بھی ہو کہ محبوب سے صل نصیب ہوئے ہوں۔ لا ہے اور ابھی کچھ دیر پہلے کہ تم نے بتایا کہ تم میرے کوہ کی طرف آ رہے ہو تو میں نے کتنے ہی چکر لادنے سے گت تلک لگے پھر یہاں پورے بی بی کھڑا ہو گیا۔ جا نہیں لگتی ہی دیر گزرتی۔ مجھے لگا جیسے میرے کمر جاؤں گا۔ میری آنکھوں میں سے جیسے سخت خیم ہو گئی تھی پھر میں اندر آیا۔ یہ وقت کیسے گزرا شاہ رخ نیسے۔

وہ ہوئے ہوئے پھل رہے تھے اور زینت فاطمہ ان کے ہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

پچیس سال یا شاید کچھ زیادہ یا کم۔ یہ قائم علی شاہ جو اس روز جو علی سے رخصت ہوئے تھے ان کے بھتیجے ہاں والے سر پر لٹی ہاں لٹیں بھی سفید نہ تھا اور اب کتنی کے کپڑے سے بال سفید ہو رہے تھے اس قائم علی شاہ کی آنکھوں میں مستقبل کی امیدیں تھیں۔ خوابوں کی جھلک جگمگاتی تھی اور اس قائم علی شاہ کی آنکھوں میں سائنس کی آگے کی انہوں نے کہا تھا۔

”نہ نہ کہنا ہے؟“

پھر دیر بعد زینت فاطمہ نے پوچھا۔

”نہ نہ اور شاہ رخ کراچی کے چرے رہے بھائی کے گھر۔ یہاں ہوتی تو بہت خوش ہوتی اور وہ یہاں ہوتی تو انتظار لے لے لکھتے۔ انھوں کی اننت بی بی مٹھ لیں۔“ زینت فاطمہ کو افسوس ہوا۔

”لیکن وارڈن نوکر رہی تھیں ایک لڑکی سے کہ میٹھ کی بنا پر الاٹ منٹ ہوتی ہے۔“

”سب کتنے کی باتیں ہیں ڈیر سوسائیاں ہر جگہ رہے ہیں مگر کے بے انصافی ہوتی ہے۔“

اسماء شاہ چٹلی پارک سے جا رہی تھی۔ وہ جد گہری لٹی ہوئی تھی۔ زینت فاطمہ سے ملنے ہوئے آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

”گھر آؤ نہیں آئی ہیں آماروں کا ڈیڑھ پڑے پڑ اور ابھی تو بیٹھے پھر بعد تمہیں لے کر ہی جانا ہے اور پھر فون ہے تمہارے پاس“ زوہبات ہو جائے گی۔ ”شاہ رخ آئے سہلی کے لے آگئے تھے۔“

”تو کتنے دن سے اس کا گھر۔“

”ہیں پچھو کچھ زیادہ نہیں۔“

”مجھی طرح کچھ لیا تھا راستہ۔“

”جی چھو!“

تب ہی ان کے سیل فون پر سید قائم علی شاہ کا نمبر جگمگا دیا۔

”اور میری آگئی ہی ہے چٹلی۔“

انہوں نے سکرار زینت فاطمہ کو دیکھا۔

”اسلام علیکم چارو!“

”کب پہنچے رہے ہو شاہ رخ؟ انتظار کر کے تھک گیا ہوں۔“

”ہیں چارو! اب اور میری آ رہا ہوں۔“

”کو کو کورے۔“ کہاں آ جاؤں۔“

”نہیں۔ ہم انشاء اللہ پہنچے جائیں گے گورے سے دائیں طرف مڑنا ہے۔“ اور نمبر 112H ہے۔“

”ہاں ہاں۔“

”اوکے۔“

شاہ رخ نے فون آف کر کے گاڑی آگے بڑھائی۔

”قاری تھا۔“

زینت فاطمہ نے تعین دہانی چائی۔

”جی وی ہے۔“

شاہ رخ سناٹے سرک پر دیکھ رہے تھے۔ وہ لمحہ کیا ہو گا جب اسنے سائل بعد بن بھائی ملیں گے وہ کیفیات کیسی ہوں گی۔ زینت فاطمہ کے جو احساسات اور کیفیات تھیں انھوں نے احساسات کیجیے سے ہو رہے تھے۔

چوٹیں منٹ کی ڈرا تپو کے بعد وہ ایک بڑے سے براؤن لینڈ کے سامنے تھے۔ انہوں نے مرکز زینت فاطمہ کی طرف دیکھا جو کمر صمدی بیٹھی تھیں اور بار بار بھایا۔

گت فوراً ہی کل کیا تھا۔ گاڑی اندر لے گئے اور گاڑی سے اتر کر اور دھر لگا دھو ڈالی۔

”صاحب اندر نہیں لادو گے۔“

چوکیدار نے صوبہ اندر نہیں بتایا۔ ان کا خیال تھا جس طرح سید قائم علی شاہ تائب تھے اور بار بار فون کر رہے تھے۔ گت کے آ کر بیاس ہی نہیں ہوں گے لیکن انہوں نے گاڑی کا کچھلا دروازہ کھولا اور زینت فاطمہ کو سارا دیا۔ ان کے پورے وجود پر ہلکی ہلکی طاری تھی۔

”چھپو پھینک۔“

انہوں نے ہوئے سے زینت فاطمہ کا ہاتھ دیا اور ان کا ہاتھ تھامے تھامے پورے کی میڑھی میں لے کر لے لادو گے گاؤں انھوں کو لے لادو گے۔



”وہ جب بھی آئے گی اس کی آمد کا سننے کی بات ہے بھی بہت کچھ ہو گا لیکن۔“  
 لازم لڑکا جو سن لے آیا تھا۔

وہ ایک لمحہ کو خاموش ہو گئے اور پھر جوں کا توں اٹھائے ہوئے انہوں نے زینت فاطمہ کی طرف دیکھا۔  
 ”میں نے سوچ لیا ہے کہ میں جو خیر کی انوکھی شاہدانی سے مدعا کیا ہوں گا۔ اسے عرصہ کی دوسری نے ان کا دل  
 ضرور نرم کر دیا ہو گا۔ میں اب سب سے دور نہیں رہ سکتا۔ زہنی ایک ملک ہے ہاں تھا تو اور بات بھی ملک میں رہ کر  
 سب سے دور اور الگ رہنا بہت مشکل ہے۔ حجاز آجائے تو ہم اس کے جوہل۔“

”میں قادیان میں۔“  
 ان کو خاموشی سے سختی زینت فاطمہ نے بے اختیار کہا۔

”کیوں کیوں نہیں۔“  
 وہ جیسے بھل کر بولے۔

”بہت حد انیاں سہیل ہیں اب تو سزا فتم ہو جائے عرق کے مجرم کی سزا بھی ایسی ہی نہیں ہوتی۔“  
 ”تم نہیں جانتے قادیان زینت چاندی اور یہ۔“

زینت فاطمہ کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔  
 ”لیکن زینت چاندی اور کسی چیز کا لاج نہیں ہے زہنی! انہوں نے تیرپ کر کہا۔

”مجھے صرف انہوں سے ملنا ہے۔ کچھ نہیں چاہیے مجھے اللہ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے کوئی کی نہیں ہے یہ  
 گھر اعلیٰ عارضی طور پر لیا ہے میں نے پچیس میں ایک گھر لینا کیا میں نے شجاع آئے تو میں نے گھر  
 کو بھی لینا ہے اور یہ گھر بھی ایک نال کا ہے۔ یہاں آئے ہی ایک پانچ سو سہیل میں ہم دونوں کو بہت اچھی  
 جاب بھی آفر ہوئی ہے۔ سیدنا انیس کوئی لاج نہیں ہے۔“  
 ”مجھے علم ہے۔ مجھے پتا ہے تمہارا قادیان لیکن۔“

زینت فاطمہ کچھ کہنے کے لیے چپ ہو گئیں۔ شاہ رخوان کے دور عمل پر کچھ حیران سے انہیں دیکھ رہے تھے انہیں  
 خاموش ہوئے کچھ دیر کے بعد سید قائم علی شاہ کو مخاطب کیا۔  
 ”پچھو کچھ کہہ دیں چاہئے ابھی اتنی جلدی تم کریں۔ میں پہلے شاہدانی سے بات کروں گا پھر آہستہ  
 ان کا دل نرم کروں گا۔“

شجاع کے سلسلے میں ان کا دواہلی جان کا رد عمل ان کی تنبیہ شاہ رخوان دیا دیتی تھی۔  
 ”لیکن کب تک جب تمہارا انتظار کروں شاہ رخ۔“

انہوں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تو شاہ رخ نے اپنے اندر ایک گھر سے دور کو اتارے اور پہلے محسوس  
 کا۔ چاہو نہیں جانتے کہ سید شجاع کو ڈر کرنے کو اتارے تھے اور یہ جان لینے کے بعد سید قائم علی شاہ کا  
 بیٹا ہے انیس اس پر ذمہ داری نہیں ہوتی زہنی گھر بھی نہیں کہ وہ اچانک میں اپنے ہی بھائی کے بیٹے کو تکلیف  
 پہنچا سکتے تھے۔

”میں سمجھتی ہوں نہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”سید تقی علی شاہ اتنے ظالم نہیں ہو سکتے کہ اپنے ہی بھائی کو کوئی نقصان پہنچائیں۔ تم دونوں غلط سوچ رہے ہو  
 بہت غلط۔“

”تج میں انہوں نے غلط سوچا تھا لیکن میں زینت فاطمہ کی آنکھوں کے سامنے مرزا عباس تھا۔ قادیان جو خیر  
 کے متن میں خون میں لت پت چاہا لیکن پر زرا جس کے ایک چاہا لیکن سے بچے لگ رہے تھے اور جس کی بھائی پر  
 جو خیر کے ملاشتہ بھی آئو ہمارے تھے لیکن وہ سید تقی علی شاہ کا کچھ نہیں تھا اور سید قائم علی شاہ تو کچھ بھائی  
 تھے۔ کچھ فرق ہو گا۔

زینت فاطمہ کا چاہا وہ ان کی تائید کر دیں ہاں وہ غلط سوچ رہی ہیں سید قائم علی شاہ عباس مرزا نہیں ہیں۔  
 بولیں وہ ڈنڈے والا خون ایک ہے۔ دونوں نے ایک کمال کا دھوکہ دیا ہے پھر بے چین و مضطرب سے قائم علی شاہ کو  
 دیکھے ہوئے انہوں نے سوچا وہ شاہ رخ سے کس نے اپنے چاہو کو اپنے ساتھ ہی جو خیر لے جائیں۔ برسوں کے  
 چھوڑنے لے جائیں لیکن پھر ان کے کانوں میں جین کو جھنجھٹے۔

عباس مرزا کی باتوں کے جین جو انہوں نے سنے تھے لیکن ان کے کانوں میں ڈنڈے کی آوازیں آتی  
 تھیں۔ میرا کوئی بیٹا یا بیٹا یا بیٹا یا بیٹا۔  
 انہوں نے ایک جھنجھٹ کر دی۔

”میں قادیان میں جاؤ گے۔ میں۔“  
 انہوں نے سختی سے کہا۔

شاہ رخ نے کسی کی طرف نظر نہ ڈالی۔  
 ”چاہو! چھو! اور اپنا کہہ رہی ہیں تو کسی وجہ سے ہی کہہ رہی ہوں گی۔“

شاہ رخ نے انیس کو دیکھا۔  
 ”مجھے تو حالات سازگار ہوں گے۔“

”ہاں شاید۔“

سید قائم علی شاہ نے سر ہلکا اور لازم کو آواز دے کر کھانا لگائے کا کام اور پھر زینت فاطمہ کی طرف متوجہ  
 ہو گئے۔ وہیں بیٹا میں جس کرنے اور سننے والی تھی۔  
 کھانے کی کھل یہاں سے وہاں تک بھری ہوئی تھی لیکن بھوک جیسے سب کی آڑ چکی تھی۔ کھانے کے دوران  
 بھی باتیں ہوتی رہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

شاہ رخ کوئی خیال کیا۔  
 ”بہت دیر ہو گئی ہے پچھو ابھی کچھ شایک بھی کرنا ہے۔“

”آج رات چاہو! اور شاہ رخ کو بھی پھر کھاؤں میں بھی نہیں۔“  
 سید قائم علی شاہ نے کہا تو شاہ رخ سر ہلکا۔

”میں شادی نے کہا تھا رات کو دلیں آتا ہے۔“

”میں خدمت کو بھی ساتھ نہیں لایا تھا۔ قادیان کے بہت کام تھا کہ وہ رہا جاتے تو بہتر ہے کہ خدمت  
 حسین کو ساتھ ہی لے کر جاؤں لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ساتھ آئے میں نے کہہ دیا تھا کہ میں ڈرا کر ہوں گا  
 ڈراؤں گی گھر میں بھی ضرورت پر کتنی سے بی بی جان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے تب کہیں انہوں نے اکیلے  
 آئے دیا لیکن ایک ہی گھر میں کہہ کر پھر بھل گئیں۔“

”آجھا۔“ انہوں نے اصرار کیا۔  
 ”برسوں کی فتنی کھوں میں تو قسم نہیں ہوتی۔ جو بیاس سندھرا ہو گئی وہ قطرے سے کماں بچھتی ہے۔“

”اب تو قادیان میں رہے گی۔ سیدنا سہاوار شاہ میریں یہاں ان سے ملنے کے بدلے پچھو کو بھی لا آئیں  
 اور ان سے۔ ان سے نہیں ملو گے۔“ انہوں نے پوچھا تو شاہ رخ نے زینت فاطمہ کی طرف دیکھا۔ اور

پھر بیٹے ان کے چہرے پر پچھلے آزارات سے جواب دیا۔  
 ”ابھی نہیں۔ لیکن جلد ہی اساتذہ سے جلد ملو اؤں گا۔ اور پھر انہوں نے شاہدانی سے کچھ دن مصروفیت  
 رہے گی۔ شاہد میرا اور سہاوار بھی جتنے تک جو خیر دلیں آجائیں گے۔“  
 سید قائم علی شاہ نے ایک کمری ماسٹر لے کر خود خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔  
 زینت فاطمہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”قاری اپنا خیال رکھنا حسد کو مت یاد اور سلام کما شہادہم اور شجاع کو بھی۔“  
انہوں نے سر ہلاتے ہوئے جب سے اس ہزار روپے نکالے  
”یہ رکھ سنبھال کے گھر کی پادری لائی ہیں۔“  
”تیس قاری۔“

”پلیٹس ہمیں خالی ہاتھ نہیں جاتیں۔ حسد ہوتی تو پتا نہیں کیا کیا خرید لاتی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا  
لو لائی نہ دے خرید میں۔“  
”رکھ لیں پھوپھو۔“

شاہر نے کہا۔  
”لیکن میں کیا کروں گی ان کا۔“  
”شاہر زیب کی شاہی کے لیے شاہراہ سے کپڑے خریدے گا۔“

شاہر نے کہا۔  
”لیکن وہ تو بی بی جان لے آئی تھیں۔“

”جو بھی سمجھ کر رکھ لیں۔ چاچو ڈاکٹر ہیں اور یہ تو ان کی آنکھوں کی کلکتی ہے۔“  
شاہر نے خوشگوار انداز میں کہا وہ اصول کی اداسی دور کرنا چاہتا تھا۔

”نہت فاطمہ نے پیسے لیے اور آنکھوں میں آئے آنسو چھپاتے ہوئے تیزی سے رخ موڑ لیا۔  
”میں بھی تمہارے ساتھ چلا ہوں اور خریدتا ہے۔“

سید قاسم علی شاہ کو خیال آیا کہ کچھ وقت اور ساتھ گزار لیں۔  
”بی بی جان نے سسوی بھی کچھ چیزیں خریدنے کے لیے پھوپھو کے پاس ہے۔“

شاہر نے بتایا تو انہوں نے لسنٹ کے گریس بھی۔  
”یہ جو تپس جی ایکس پلارکٹ ہے مل جائیگی۔“

وہ چوکیدار کو بت نہ کرنے کا کہہ کر شاہر نے غصے کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔  
پھر شاہک کر سنے میں بھی کچھ وقت کیا گیا۔

جب انہوں نے سید قاسم علی شاہ کو ان کے گھر کے  
گیت کے پاس ڈراپ کیا تو سناٹ نہ رہے تھے۔ دور چلی جتنے جتنے سامنے دس ہو گئے تھے لیکن شاہی ابھی  
تک حرا نے میں تھے اور ملائے کے لوگ ان کے پاس آئے تھے۔ غالباً انیش کے سلسلے میں کوئی لاکھ  
عمل تو تسمیہ دیا جا رہا تھا۔

نہت فاطمہ کو اندر پہنچا کر۔ وہ حرا کے طرف بڑھے کہ شاہی کو اپنی آمد کا بتا دیں کہ نیم اندر ہے میں  
انہیں گیت کے چوڑے کے پاس شاہ بابا بیٹھے نظر آئے شاہ بابا اپنے گھر سے اول تو لگتے ہی نہیں تھے اور اگر  
لگتے بھی تھے تو بس باہر نکل کر بیٹھ جاتے تھے۔

”السلام علیکم شاہ بابا۔“  
وہ تیزی سے ان کے قریب پہنچے۔

”آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں عیبت تو ہیں۔“  
”ہاں بیٹھے جاتا ہے۔“

انہوں نے ٹھوکی ٹھوکی نظروں سے شاہر کی طرف دیکھا۔  
”اماں جانا ہے آپ کو شاہ بابا۔“

”آپ نہیں۔“  
انہوں نے بے بسی سے کہا۔ ”لیکن مجھے جانا ہے جلدی جاتا ہے۔ سب پریشان ہوں گے۔“

”لوں سب۔“  
شاہر نے تجسس نظروں سے انہیں دیکھا۔  
”ہا نہیں۔“

ان کے چہرے پر ابھرنے لگی تھی وہ کچھ دیر شاہر سے ڈوکیٹے رہے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔  
”مجھے جانے دو۔“

”لیان اس وقت تورات ہو رہی ہے شاہ بابا صبح چلے جائے گا۔“  
”مجھے جانے دو گے نا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں؟“ کہاں کہاں کہیں گے آپ کو لے جاؤں گا۔ ابھی چل کر آرام کیجئے۔“  
”آپ جانا۔“ انہوں نے سر ہلاتا دیا اور واپس اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ شاہر غور سے کھڑکی کی سوچ میں ڈوب  
گئے۔



”تمہارے گھر میں فون لگا گیا ہے۔ شاہر تو اپنا نمبر لگا دو۔“ کاہیاں چپک کر سنے لگیں۔  
مرا تھا کہ اسے کھاتا تو دور جو Bio کی جماعت میں کتب کھولے جانے کے دو مہینوں میں بھی چوکی۔

”فون ہاں تو لگا گیا ہے مگر آپ کو سہی نہیں ہوں۔“  
”یہ خبر لے آجھا کیا فون لگوا لیا۔ آج کل تو ہر گھر کی ضرورت ہے۔“

انہوں نے ریڈیال میں کوئی کالی میں رکھ کر کالی بند کر دی۔ وہ دونوں اس وقت اسٹاف روم میں تھیں اتفاق  
کہ دونوں کا فون پرانی ایکس پلارکٹ تھا۔ سسرانہ کا پائل چپک کر رہی تھیں جبکہ وہ اگلے پڑے کے لیے لسنٹ دیکھ رہی  
تھی اس کی عادت تھی کہ وہ رات میں ہی پرکاش کو بڑھانے والا سبق اچھی طرح دیکھ کر ضروری پوائنٹس نوٹ  
کر لیتی تھی لیکن رات بہت مصروفیت رہی تھی۔ سندھ خالد اور افضل ماموں سب کی دعوت بھی سوسائز لے لے گئے

ابن کا تھا سب کے جانے کے بعد اس نے اور زہل نے کل کر تین نوٹ دیکھے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی  
کہ ان کے جانے کے بعد اس پر سارا بڑ بڑا جانے جسے خالد کی سوچ کے بالکل برعکس تھیں بالکل  
ایک ہی جیسی اماں نے بتایا تھا وہ بھی اپنی خوب صورت تھیں کہ سفید لباس میں آسمان سے اتاری کوئی خورنگ  
دال تھیں وہ بیسوی یو کو را نہیں دیکھے تھی اور پھر کتنی جلدی وہ سب سے بے تکلف ہو گئی تھیں۔ کتنے  
دال بعد اس کے گھر میں سب لوگ ہل چل مچل کر کھس رہے تھے کہ کتا اور بڑا بڑا بھی وہ اپنے پھونسے بیٹے  
شاہر کے ساتھ آئی تھیں اور شاہر تو ان سے بھی وہاں ہاتھ آگے تھا۔ اس نے انہیں لٹائے تھے کہ وہ سب  
لٹے بیٹے ہونے لگے۔

”آج کل تو فون بھی بغیر شمارش کے کھینچ دے رہے ہیں۔ بی بی سی ایل والے۔“  
”سسرانہ نے ٹھوکیں دے رکھی کاہیاں تھیل پر رکھیں۔“

”ہاں۔“  
شاہر پھر چوکی۔

”اماں کہہ رہی تھی کہ فون لگوا لیا جائے پڑوس میں فون سننے جانا پڑتا تھا۔ کبھی وقت بے وقت کی کا فون آجاتا  
تھا۔“ بیوی کی تکلیف کے خیال سے بیوی نہ ادرست ہوتی تھی۔

”بہت اچھا کیا تم نے اس روز میرا سب دل تھا۔ دل چاہا ہوا تھا کوئی ہو جس سے بات کروں تاکہ یہ بے  
ادبی اور گھبرائے کہ ہو جائے اس رات میں نے بے اختیار سوچا تھا کاش تمہارے گھر فون ہو گا۔“  
”بی بی۔“ وہ چاکر ہمارے گھر فون لگا گیا ہے تو اس لیے کہ آپ نے ایسا سوچا اور وہ کوئی کچھ شیدہ تھا کہ اللہ نے  
اپنی مانت لی۔“

شاہر اب پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔  
”اماں۔“

مسز مراد کچھ اداس لی دکھ رہی تھیں۔

”مسز مراد کو کیا پریشانی اور گھبراہٹ ہو سکتی ہے۔“ ماہ نور نے فوراً نہیں دیکھتے ہوئے سوچا۔ قدرے کم جس کی وہ ابھی خاصی خوش شکل خالوں تھیں۔ رنگت کے حد شفاف۔ آنکھیں بے انتہا خوبصورت، بالک تھوڑی سی چمکی اسٹیمپٹ گئے براؤن بال، دیکھیں جس خوبصورت شہر شہر دار کاؤ گیس کوئی کی نظر نہیں آتی تھی بلکہ

”بڑی عجیب سی بات ہے ماہ نور مجھے اس اسکول میں جاہل کرستے ہوئے تین سال ہو گئے ہیں۔ لیکن کسی سو میری انٹرا اینڈنگ نہیں ہو سکی تھی۔ میں تم میں ایسا کیا ہے ماہ نور کہ تھوڑے ہی دنوں میں تم بہت اپنی اپنی گتے کی ہو۔ اس رات میں بہت بے چین ہوئی۔ تمہارے متعلق سوچا حالانکہ تم عمریں مجھ سے بھولی ہو مگر

از کم چودہ پندرہ سال۔“

”میں سے کیا فرق پڑا۔ مسز مراد میں میں عموں کا تقاضا ہے مگر ہوتا ہے۔“

اس نے پرس سے گھر نکال کر میز پر بیٹھ لی۔ کالی کا آؤٹا سچا چادر کون پر لٹکھا کر نہیں دیا۔

”آپ مجھ سے بہت شہر کر سکتی ہیں۔ نزل کی موبائل سے فون تو لگے گی کہ یہ۔“ ہڈا سا مسکرائی۔

”اس روز خضر کب کے ساتھ افضال مہول کے لائے ہوئے گفٹ بھی لائے تھے۔ افضال مہول بھی جب کسی

باہر جاتے تھے تب کے لیے کچھ نہ کچھ گفٹ ضرور لاتے تھے۔ اس بار بھی سب کے لیے گفٹ لائے تھے نصیر

خان کے لیے بہت سی چیزیں صحت مہیا کی تھیں۔

”لیکن میں اس کا کون سا گفٹ افضال نے بھی فضول چیز۔ خرچ کیا اس پر۔“

”باہم ککھن لے لیتے ہیں۔ سچی کتابت ابھو تو آئے فون نہ ہونے پر۔“

نزل اب اکامپاں ساتھ میں بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

”جی ایسا میں نے دنوں سے سوچ رہی تھی کہ ہم بھی فون لگوالیں۔ اس روز میڈم ڈیری نے پریکٹیکل کے

رو کا ٹوب لکھیں نے کھریں فون لے کر دیے کہ روایت آئیں۔ میں نے بھی غصہ چار بار پوسٹ میں فون کیا تھا

اور سہ کوئی اٹھائی نہیں با تھا مجبوراً ”اگر اور دادی کے پریشان ہو جائے کہ ڈر سے میڈم سے اجازت نہ

گھر آئی۔“

اس نے لمبی بات کی تھی نصیر احمد خان اس دوران خاموشی سے اسے دیکھتے رہے تھے۔

”تھیک ہے خضر یہ تاہم اس کا ککھن لے لو۔“

انہوں نے موبائل میں نزل سے مل کے تھوڑے سے کر خضر کی طرف بڑھایا۔

”جی اگلے میرا خیال ہے فون کے لیے میری درخواست دینا ہوں۔ آج کل یوں بھی آسانی سے ککھن

ہا ہے۔ یوں بھی مٹوں کہ ضرورت پڑتی رہتی ہے انٹرنیٹ کو ککھن کرنے کے لیے تو نیٹ لینے جانا پڑتا

ہے۔“

”تو پھر موبائل کا ککھن مت لو۔“

نصیر احمد خان نے متح کیا لیکن خضر نے نہ صرف فون لگوا تھا بلکہ موبائل کا ککھن لے کر ڈاؤن لوڈ کے

احمد خان کو دے دیا تھا۔

”انکل آپ نے اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے دوستوں سے سب لگایا کریں۔ بلکہ سب سے زیادہ تو بہا کو فائل

آپ کے اس فون سے دے دیں چاہے آپ سے بات کر لیں گے۔“

”تم پھر اپنے مہول کی طرف نہیں گئی۔“

مسز مراد نے پوچھا تو وہ چلی گئی۔

”میں بس ایک بار گئے تھے خضر بھائی۔“ وہ تھوڑا سا چمکی اور بہت محنت کی۔

”خضر بھائی لینے آئے تھے دراصل میری خالہ کی ہوئی ہیں لکڑیا سے تو ہم سب ان سے ملے گئے تھے۔“

”اچھا۔“ مسز مراد ان کچھ عجیبہ اور چپ چپ کی گئیں۔

”تمہاری سہلی خالہ ہیں۔“

”میں ان کی کچھ بڑی زائرین ہیں۔ سہلی میں تو ماں کی کوئی نہیں ہے۔“

”وہ اب سہیل ہیں۔“ مسز مراد نے پوچھا۔

”سہیل تھے لیکن اب پاکستان آ گئے ہیں۔ خالہ ڈاکٹر ہیں اور ان کے سہیل بھی ڈاکٹر ہیں۔ دو بیٹے ہیں ان

کے اور ان کا خیال ہے کہ بہت بار میرے اب اپنے کون سہلی کا قاتل اور مارا جائے۔“ میں نے خودی تفصیل بتا

دی۔

”آپ کے سہیل بھی تو بہا ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”آپ کیوں نہیں گئیں ان کے ساتھ۔“

”میں کیوں نہیں گئی۔“ مسز مراد نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”وہ مجھے لے کر نہیں گئے۔“ وہ عجیب طرح سے نہیں۔

”جب سب ضرورت میں ہی پوری ہو جاتی ہوں تو یہی کام چھلا ساتھ لگانے کی کیا ضرورت ہے پندرہ سال

ہو گئے ہیں میری شادی کو اب میری عمریں سال میں ہیں لیکن اسے کیا تمہارا دماغ کا مارا دہا میں تھا والدین نے

ٹھانی کر دیا۔“ مسز مراد پرانے رشتہ دار تھے شادی کے صرف تین ماہ بعد وہ امریکہ چلے گئے۔ میں نے بہت دوا

کیا۔ وہ میں مانتے بہت سارے وعدے کر کے مجھے جلد بلانے کا کہہ کر گئے پہلے چھ سال تو گریں کارڈ کے پتھر

میں لڑنے کے پھر پوچھی مائے رعبے ابھی جا رہی تھیں کچھ بیٹے انکھے کر دیں۔ اچھا مار کر لے لوں۔ ہم پہلے بھی

ی رہے کھریں میں رہتے تھے سن آباد میں ایک کمال کی کو بھی تھی جو مراد کے والد نے خوانی تھی اور کھریں

صرف بس اور مراد کی والدہ تھیں۔ وہ سات سال بعد آئے اور صرف ایک کسادہ کروا پس چلے گئے۔“

”بہت جلد تمہیں اور ماں کو لالوں گا۔ اب سب ہو گیا ہوں۔“ جاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ لیکن ماہ نور جانی

”ماہ نور جانی! بعد ازاں وہ بھی ان کی بیکاری کا کن کر اور گریں کو کفر کر میں ان کا کچھ کر مہل ڈیٹس میں گھر لے

یا۔ وہاں تو بل گیا تھا لیکن مہل دوم کھتا ہے میرا ایکلے کھریں۔“

”آپ بالکل ایکلے رہتی ہیں۔“ ماہ نور کو حیرت ہوئی۔

”ماہ نور میں چوکیار ہے ایک لڑکی ہے کام دلی۔ لیکن ان سے ایک کام یں تو دور نہیں ہوتا۔ اسی لیے میں نے

مراد کی والدہ کی وفات کے بعد جاہل کر لی ہے مجھے یہ چوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بس دوت کھانے کے لیے جاہل

لی ہے میں نے دور دور تو کھٹ کھٹ جائے میرا اس تو مراد کو کھٹے لایا جا چے تھا لیکن میں بلایا۔ میں نے کہا تھا تم

مجھ آتے تھے لے جائے میں میں بی کے بعد ایکلے کیے ہوں لیکن میں سال ہو گئے ہیں اس کے ہونے بھی بلانے

”میں کیا۔“

”ابا بھی فون نہ ہو بھی نہیں کیا۔“

ماہ نور نے جھجکے ہوئے پوچھا۔

”آپ سے بیٹے میں ایک دو بار پہنچے بھی باقاعدگی سے بھیجتا ہے لیکن یہ سب اس کا فہم اہل تو نہیں ہو سکتے۔“

”مراد کی آواز بھرا کر آئی تو ماہ نور نے ان سے کہا کہ پر اپنے ساتھ رکھ کر کھلی دی۔“

”ہو کھتا ہے ان کے ساتھ کسی مسئلہ ہو۔ آپ ان میں کسی تھی ہیں اپنی خالہ کا احساس دلاتی ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے ماہ نور کہ میں نہیں کسی نسبت بھی فون آئے آپ کی ایک بات تو کہتی ہوں۔ لیکن میرا وہ بھی

ہو گیا ہے کہ کوئی کر رہا ہوں اس میں ہے بلانا۔“

انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں پر پتھر میں مٹی پھینکی جاری تھی۔

”میں نے ہمیں بھی پریشان کر دیا۔“  
 اپنی طرف دکھ اور افسوس سے دیکھتی ہمارے دیکھ کر وہ مسکرائیں۔  
 ”میں تو سمر مراد آپ نے اچھا کیا کسی سے دل کی بات کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ کسی دکن آئیے  
 ہمارے گھر لیاں اور دوا دی سے طوائف کی۔“  
 ”ہاں ضرور۔“ سمر مراد نے خود کو متنبہ کیا تھا۔  
 ”تم بھی جب آؤ اپنے ماسوں کے گھر تو میری طرف ضرور آنا۔“  
 ”جی انوں کی۔“

ہمارے کو سمر مراد کی جھانکی اور اکیلے پن پر دکھ ہوا تھا بظاہر سمر مراد کتنی خوش لگا کرتی تھیں۔ دوسری کو لیکر دوا  
 پر ٹھیک کرتی تھیں کہ کتنی خوش قسمت ہیں میاں والے۔ ڈالر بیچے جاتے ہیں۔ پیش کر رہی ہیں۔“  
 ”جی جی۔“ سمر مراد ہوں کوئی چڑی ہو جانا تو دل ہلکا جاتا۔“ سمر مراد نے پھر کاپی کھول لی تھی اور غلطیوں کو اپنے  
 لائن کر رہی تھیں۔

”آپ کے والدین بھائی بہن۔“  
 ہمارے کو اچھا لگتی سی خال خال تھا۔  
 ”ہاں کوئی نہیں دو بھائی ہیں۔ والدہ کا میری شادی کے چند سال بعد انتقال ہو گیا تھا۔ والد کا دو سال قبل انتقال  
 ہوا۔ جب تک زندہ رہے چار لگتے رہے تھے۔ لیکن مہینہ بھر سے زیادہ نہیں رہا تھے پوتے پوتوں کے  
 اداس ہو جاتے تھے اور اب تو وہ بھی نہیں ہے۔“  
 انہوں نے ایک غصہ کی سانس لی۔

”بھائی دو بھائی ملنا میں ہی ہیں بس۔ کبھی کبھار سال میں دو تین بار فون پر بات ہو جاتی ہے۔ بھائی کسی کام سے  
 لاہور آئیں تو ملنے ضرور آجاتے ہیں۔ چھٹی میں ایک دو دن کے لیے میں بھی چکر لاتی ہوں بس۔“  
 ”سمر مراد آپ نماز پڑھ کر دعا لیا کریں۔ انشاء اللہ ضرور آپ کی سنے گا۔“  
 سمر مراد اور میرے مسکراؤں اور دوسری کاپی چیک کرنے لگیں تب ہی بیون نے اندر جھانکا۔  
 ”سمر خان آپ کو سمر مراد ہے ہیں۔“

”کیا لپ۔“  
 ہمارے کو گھبرا کر لپ۔  
 ”ہاں نہیں کی۔“  
 بیون جواب دے کر چلا گیا تو اس نے سمر مراد کی طرف دیکھا۔  
 ”جہاں شاید کسی بچے کے متعلق بات کرنا ہو۔ پراسیڈنٹ اسکول میں تو اکثر والدین آتے رہے ہیں۔ کوئی نہ کوئی  
 مسئلے کے۔“

”تو۔“  
 اس نے سوالیہ نظروں سے سمر مراد کی طرف دیکھا۔  
 ”کچھ نہیں جواب دے ہوئی اسی حساب سے بات کرنا۔“  
 سمر مراد نے اپنی لپ توڑ دے دے اور سمر مراد کے آغوش میں آئی آتے ہی اس نے اصرار دیا کہ اصرار  
 میں اور کوئی نہیں قاتل ہی بل میں ہوگا۔ اطمینان محسوس کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔  
 ”جی سر آپ نے مجھے بلایا ہے۔“  
 ”جیسے مس خاتون۔“

انہوں نے سر سے ہاتھ نکال کر جاتے دیکھا۔

”اور کسی ہیں آپ۔“  
 ”جی سر ٹھیک ہوں۔“  
 ”کوئی پرائیوٹ نہیں۔“  
 ”تو سر۔“  
 اس نے نفی میں سر ہلایا۔  
 ”آپ کے گھر میں سب کو کب کیسے ہیں خصوصاً“ آپ کے والد۔“  
 ”جی ہاتھ ہیں سب۔“

ہمارے کو توجہ دے رہی تھی کہ کیا انہوں نے یہ سب پوچھنے کے لیے بلایا تھا۔  
 ”اور وہ۔“ کیا نام ہے ان کا وہ آپ کے کزن۔“ انہوں نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ”خیر صاحب ان کا  
 ایسا نام ہے۔“  
 ”جی وہ بھی اچھے ہیں۔“

ہمارے کو کاپی کی یاد سے دھڑکا تھا۔ چند دنوں میں زندگی کا رنگ بدل گیا تھا سوچ بدل گئی تھی۔ کسی کی افواہ  
 دی تھی خیر نے کہ دل کے اندر یہاں ہمارے جگہ پر اچھا ہو گیا تھا۔ دل نے خیر کو جگہ دی تھی اسے تو خیر  
 ہی نہ ہو سکی تھی۔ خیر نے کچھ زیادہ نہیں کیا تھا پھر بھی اسے اہل لگا کر تھا۔ وہ تو کھوں میں امیر ہو گئی تھی۔  
 ”خیر اچھے تو وہ ہیں۔“  
 ڈاکٹر صاحب نے فکدہ لگایا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں کی حیرت واضح تھی۔  
 ”میرا مطلب ہے کہ آپ کے کزن ہیں تو اچھے تو ہوں گے ہی۔“  
 پھر جیسے اپنی بات پر غور ہو کر وہ کچھ سرسرا رہے اور پھر جیسے اچھا کچھ یاد کرتے ہوئے بولے۔  
 ”میں خان میں سے آپ کو اس لیے بلواتا تھا کہ آپ کے گھر سے فون آیا تھا۔“

”جی۔“  
 وہ گھبرا کر لپ۔  
 ”سرب خیر تہ تو ہے یا کیوں فون آیا تھا یا تو ٹھیک ہیں نا۔“  
 ”جی خیر تہ ہے۔“  
 ڈاکٹر صاحب کی نظریں مسلسل اس پر جمی تھیں۔  
 ”آپ کی سسر کا فون تھا۔ عجیب سا نام تھا۔“  
 ”نہ۔“

ہمارے کو کیوں سے نکلا۔  
 ”ہاں کی۔“  
 ”ایا کہہ رہی تھی وہ۔“  
 ہمارے راز حد تک چھین ہو گئی تھی۔  
 ”مجھے مس خاتون۔“ میں نے ایک اصول بتایا ہے کہ کوئی بھی میرا آغوش میں فون انڈین نہیں کر سکتی۔ کسی  
 کی صورت میں مسجیب دیا جا سکتا ہے۔ اب یہ نہیں مانگے یا تھیں کہ کس کا فون ہے اور مجھے اپنے اسکول  
 لایا نہیں ہے۔ حد درجہ میں میں جانتا کہ کوئی ایسی ایسی بات ہو اس کے لیے بیاد بنی لگا رہی ہے میں نے۔  
 ان کا کچھ کچھ تھمت ہو گیا تھا۔

”جی جی ٹھیک ہے سر۔“  
 ہمارے نے کیوں پر زبان چھیڑی۔

”لیکن زلزلے کی ایک سیج چلا تھا۔“  
 ”message“ ہاں آپ کی سسٹر نے کہا تھا کہ وہ سب لوگ اپنے ماموں کے ہاں جا رہے ہیں لہذا آپ  
 چھٹی کے بعد گھر جانے کی بجائے اصرار ہی آجائیں۔“  
 ”اوہ۔“

یاد دہانہ ایک طویل سانس لی۔  
 صبح جب وہ اسکول آ رہی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ شام کو حزنہ خالد سے ملنے جاسی گی کیونکہ انہیں اس  
 روز صبح کی فلائیٹ سے واپس جانا تھا اور زلزلہ کہہ رہی تھی کہ وہ بھی ان کے ساتھ جانے کی یکن یوں اس طرح  
 سب کے جانے کا اور وہ بھی اس وقت کوئی اور نام نہ تھا۔ زلزلہ نے آج پچھلی گرمی کی سی اسے لہان کے ساتھ  
 حزنہ خالد کے لیے سوٹ لینے جانا تھا۔ اگر ذرا صاحب اسے دے دیتے تو وہ زلزلہ سے پوچھ لیتی کہ سب اور کیا کیا  
 داری بھی جا رہے ہیں۔ اچانک سے جیس کے جب سے یہ حادثہ ہوا تھا اور وہ چار پائی پر پڑے تھے صرف ایک سیار  
 زبردستی انہیں لے گیا تھا۔

”مجھے کیا خبر وہ آپ کی سسٹری تھیں یا کوئی اور سسٹر بن کر فون کر رہا تھا۔“  
 ذاکر صاحب نے تجب سے لمحے لمحہ کہا، تو رگ رگ تک دم سچ ہو گیا لیکن وہ صدمہ کہ اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”ہو تا ہے ہو تا ہے، کیا ایسا سچا خان۔ کیا خبر کسی اور نے اس طرح آپ کو بلایا ہو۔“  
 ”سر۔“ لہذا وہ کاغذ جواب دے گیا۔

”میں اس طرح کی لڑکی نہیں ہوں۔“ غصے کی شدت سے اسے اپنا جود کا پتا ہوا محسوس ہوا تھا۔  
 ”جانتا ہوں جانتا ہوں۔“ ذاکر صاحب نے سر ہلایا۔  
 ”میں نے تو یہی آپ کی ایک بات کہی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے دیکھیں تاہم اس خان آپ جب صبح کمرے آئی تھی  
 تو۔“

”سر۔“  
 اسے لگا جیسے وہ ابھی رو دے گی لیکن اسے غصے کی بات یاد آئی۔  
 ”خود بخود کسی کے سامنے رو کر خود کو کمزور مت ظاہر کرو تاہم باہر لوگ ہمیں جینے دیں گے۔“ غصہ  
 بتا دیا کرتے ہی اس نے خود کو بہت پر اعتماد اور مضبوط محسوس کیا۔  
 ”جیس میں صبح کمرے آئی تھی تو وہ گرام شام کو جانے کا اعلان بھی کر چکی تھی وہ تو جانی نہیں واپس جانا تھا  
 ہو سکتا ہے میرے آپ کے بعد پر گرام نہیں لیا ہو۔“  
 ”ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ ذاکر صاحب نے فوراً اپنا بوجھ بدل لیا۔  
 ”میں تو یوں کہہ رہا تھا کہ۔“  
 ”میں میں جانوں۔“

اسے سر داکر سے یکدم میزبانی اور پڑوسی محسوس ہوئی۔  
 ”ہاں ہاں جائیے۔“  
 ”تھوڑا سا دیر۔“

”مس مہربانی۔“  
 ذاکر صاحب نے جیسے ہی سمجھا کہ کیا وہ ہیں کون سے کون سے اس نے رخ پھیر کر انہیں دیکھا۔  
 ”وہ آج صبح آپ کی سروس بک پر دستخط کرنے لگا تو دیکھا آپ کی سالگرہ بھی اسی منہ میں آپ نے ذکر کیا  
 نہیں کیا۔ خبر کچھ ناخیر سے ہی تھی۔“ جیسے بڑھ چکا۔  
 ”یاد ہو رہا ہے لیکن وہ رگ رگ بند ہے ذاکر صاحب کو جرت سے کہہ رہی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔“

الرحاب میرے کچھ سے سب بار آئے اور میرے بچے گلدان میں سے گلاب کا ایک پھول تو ڈکرا سے چٹس کیا۔  
 ”کچھ مس خان میری طرف سے اپنی سالگرہ پر یہ تحفہ قبول کریں۔“ آپ نے بتایا ہوا بروقت تو شاید کچھ مہتر  
 دلور کی سکتے۔“

یاد رہے کہ لکھی ذاکر صاحب کے بڑے ہوئے تھا تو کچھ دیر ہی تھی اور ذاکر صاحب آنکھوں میں اشعیاں کا ایک  
 لہان لیے پھل ہاتھ میں لیے قدم قدم اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”فہمی۔“  
 ”میں نے میٹر کو پراندے سے گزرتے دیکھ کر آواز دی۔“  
 ”ہاں جا رہے ہو کیا۔“  
 ”ہاں۔“

اس نے ذکر اپنے کمرے کی دہلیز پر کھڑی سمن کو دیکھا۔  
 ”اگر۔“

”میں اسے دیکھ رہی تھی۔“  
 ”میں بھی جا رہا تھا کسی خاص جگہ نہیں جا رہا شاید کسی دوست کی طرف چلا جاؤں یا پھر شاید یہی مجھ کو دلائیں  
 لہاں۔“

”تو پھر اصرار آجائے دن ہو گئے ہیں بھی تمہارے پاس آکر نہیں بیٹھے ہم سے باتیں نہیں کیں۔ ہم سے  
 اصرار ہو کیا۔“

”میں کے لیے یہ اداسی کھلی گئی۔“  
 ”میں بھلا تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔“  
 ”ہاں مڑا تو سمن کا چوہا کھل اٹھا۔“  
 ”مڑا ہوئے ہوئے چلا ہوا کمرے میں داخل ہوا، احمہ نے مڑا تو کوئی میگزین دیکھ رہی تھی یکدم سیدی ہو کر بیٹھ  
 گئی اس کا چوہا بھی کھل اٹھا تھا۔“

”اگر آجائے غصے میں۔“  
 ان نے بڑے بڑا دھواں اکیل ایک طرف کیا۔ میٹر واپس بیٹھ پڑ پڑ گیا۔  
 ”میں نے توں بعد سمن اور احمہ کے کمرے میں آ کر تھا۔ زندگی میں یکدم کتنی تبدیلی آگئی تھی سب کچھ دیر  
 تھا یوں اندر کہیں پھر بدل گیا تھا۔ جگہ شاید مت بدل گیا تھا۔ اسے خود اپنی کچھ نہیں آ رہی تھی۔ کبھی کبھی  
 اہمال اسے ناراض کر دیتا کہ ایک لڑکی اس کے کلاچ بھی آگئی تھی۔ وہ دوستوں کے ساتھ مل کر پینے کی طرح ہنستا  
 کھاتا، نا خوب فہمے لگتا لیکن پھر کلاچ اس پر قبضہ ملاتی ہو جاتی دل چاہتا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا  
 جے۔ چہل پھرت کرتے آئے ایسے میں وہ گھر کر رہا ہر گھل جانا لیکن باہر بھی نہیں چھین نہ تھا۔ رات کو بہتر نہ لیتا تو  
 گھر میں بھڑک کر ایک اچھا سا چوہا آجاتا۔ ”خدا۔“ وہ زب دہرا نا۔

”میں کسی بھی ہوگی۔“ کو بھر کو دل بھڑک اٹھا لیکن پھر اس پر بھی بھلا ہر ملاتی ہو جاتی۔  
 ”اپنی آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“

”اگر۔“  
 ”اگر۔“  
 ”اگر۔“

”اگر۔“  
 ”اگر۔“  
 ”اگر۔“

”اگر۔“  
 ”اگر۔“  
 ”اگر۔“

”سامحہ نہیں یا ایک حسین موڑ۔“  
 ”کاش! حسین موڑ اس وقت اس طرح میری زندگی میں نہ آتا۔“  
 اس کے لبے میں ٹپکتی محبت  
 ”مجھے اپنا آپ بہت مایوس بناتے ہو۔“

اس کی آواز بھرا مٹی تھی۔  
 "یوں لگتا ہے جیسے سب مجھے دیکھ رہے ہوں بل بل میں مجھ پر ہنس رہے ہوں کہ دیکھو یہ ہے ہمشیر ہے جس  
 کے کپڑے خوف ہے کہ یہ مڑا جائے گا۔ آواز ہو جائے گا اس لیے احباب نے زنگ لگوا۔"  
 "سب تمہارے اپنے احساسات ہیں ورنہ کیا سب تمہیں جانتے لیا جی کو ان کے مزاج کو ان کی حاکمیت  
 کہ۔"

”ریلیکس کرو۔“  
اسخڑے نے کچھ اور توبہ کر لیا تھا۔  
”تم کہن اندر چلے ہیں۔“  
تب ہی میاں صلاح الدین اپنے کمرے سے نکلے تو آدھے میں یوں دووں کو سرگوشیاں کرتے دیکھ کر چوکنے  
اور ہولے سے کھلا کرے۔

اس نے کچھ کہنا چاہا۔  
 ”تم نہیں جانتے کہ اپنی اپنی اوراموں کے گھر کے طور طریقے فرقیوں جیسے ہیں اور وہ حسد ملی ہیں اپنی مرضی اور پسند سے شادی رچا لی ہے انہوں نے لوکا کیلایا آیا تھا صرف دوستوں کے ساتھ۔“ وہ انکشاف کر کے سطر لائے۔

”کہ جو بے غیبتی کا سبق وہاں سے سیکھا ہے آپ نے یہاں ان بچوں کو سکھا میں۔“  
 مضبوطی کو نشی میں اسفر کا چہرہ سن ہو گیا اور اس جسم کھنے لگا لیکن وہ خاموش کھڑے رہے۔ میاں صلاح الدین  
 شاف کر کے اور زہرا گل کر جا چکے تھے۔

ہر لمحہ اس کے ساتھ رہے تھے حالانکہ اباجی کو کچھ وقت اسفر کا اس کے ساتھ رہنا کچھ پسند نہ تھا۔ اس کے  
سے ایک روز پہلے ہی انہوں نے اسفر کو کتنا ڈانٹا تھا۔ یوں ہی بلا وجہ اس روز سب ہی اس کے کمرے میں  
رمضان مشین کا ڈھکن اٹھایا تھا۔

اور کسی نے اسے روکا نہیں شاید سب ہی اس اداسی کے حصار کو توڑنا چاہتے تھے وہ ممکن بنجا بجا کر گانے لگا دیتا جھوٹا سا لہجہ مورا۔  
انگنائیں گل کی کیلے

ایکھا آج اتوار ہے  
بہما بیتار ہے  
رنگ و روئے کس سے ہے

عذرا! ہم سمیت سب ہی اس کے کمرے میں آئے ہوئے تھے۔  
چھوٹا سا بلوا مورا۔

میرے ہاں کالج کا وس بند۔

رنگدے لگ رہا تھا جیسے ہر شخص اس کا مذاق اڑا رہا ہے حتیٰ کہ رمضان بھی اس فریادی تیزی سے اس کے

اس کے قریب آکر اس کی کمر میں باندھ ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

”ہمارا ایک لڑکا تمہارے ساتھ منسوب ہو رہی ہے۔ یہ بڑا خوش کن تصور ہے۔ اسے آب کو خوش قسم

اس کا اندازہ درخشاں تھا۔ اس پر کدم مسکرا دیے۔



اسے گھمسیں ہی پھیلایں۔ وہ تو ناقادہ نظر کی دعا پڑھ کر پھر کتنی رسی ہیں تیرے۔  
”ہاں تو اور کیا۔“

انہوں نے بھی اس کی تائید کی۔

”اب صاحب جے کے بے مشربہ کی طرح نارمل ہو جائے۔ وہ جو میاں صلاح الدین کے اس اچھا کھیلنے والے شاک مارا ہے اس کیفیت سے نکل آئے۔“

”یہ ایک بات ہے بھی غزالہ بھالی بھی کم خوب صورت نہیں ہیں۔ سچی تم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے رہے خوب صورت لگ رہے تھے بالکل چاند سورج کی جوتی۔“

”تھما۔“

بھڑکے ہوئے پر ایک چٹکی سی مسکراتا بھڑکے۔ جب حاجی صاحب نے میاں صلاح الدین سے درخواست کی کہ کچھ دیر کے لیے بھڑکیاں کو اندر بلا رہے ہیں تو میاں صلاح الدین توڑے سے جزیروں سے پہلو بدل کر حاجی عبدالستار کو دیکھا۔

”کافح تو جو چکا میاں صاحب اب بشریاں عمر ہوئے بیچوں کی خواہش ہے شاید کچھ تصاویر وغیرہ دیکھنا چاہتی ہیں۔“

”میاں صلاح الدین نے اسے جانے کے لیے کہا تو اس نے گھر کر اسٹری طرف دیکھا۔ لیکن حاجی صاحب نے اسے اسٹری طرف دیکھنے کو کہہ کر فوراً وضاحت کی۔

”اس صرف بشریاں چلیں گے اندر۔“

اور اس کا دل جیسے ڈوب سا گیا جس سے اسٹری کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اس کے ڈریس کا انتخاب اس کی تیار ہی سب وہ کر رہے تھے اس کے تو تھک چکے تھے جان سے ہو رہے تھے اور وہ بھی کچھ کر رہا تھا جس طرح اسٹری کمرہ رہے تھے سچی کہ اس کے تیار ہونے کے بعد یہ فہم بھی اسٹری نے ہی اس پر لے لیا تھا۔

”اسے Cigar سے ماہوں میں اس نے کتنی لذت کیا تھا۔ رست باری کو خوشبو سے تو بولیں اور لاڑو کی پندرہ خوشبو ہے اور میرا بھائی کی تو اب سے کہے۔“

وہ بھی ہلکی ہلکی ہنسی بکھیر کر رہے تھے۔

وہ بیگ عبدالستار کے ساتھ اندر آیا تھا۔ حنہ خاں فوراً انہی اس کے سامنے کی پشت پر آگئی وہ بھی تھیں سن بھی ان کے ساتھ تھیں۔ لڑکیوں نے ذوق کیے تھے اس سے جن کا وہاب حنہ خاں نے ہی دیا تھا پھر کوئی غزالہ کو لے لے آیا تھا۔ گھر کو تھیں سن بھی پھر بھی اس کی فریضہ زلے سے دمن کی طرح ہی تیار کیا تھا۔ غزالہ اس کے قریب بیٹھ گئی تھیں لیکن اس کے دل میں کوئی پھل پڑا نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے غزالہ کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ ”فریل تمہارا دل دانا ہو گیا ہے شریلا۔“

کسی نے فقرا اس کا ساتھ دیا۔ لیکن غزالہ بالکل بھی شرمیلی نہیں بہہ کچھ۔ کیسے چوری چوری دیکھ رہی ہے۔ کسی اور نے کہا تھا۔ غزالہ کی کوئی لڑن یا سبکی تصاویر بنا رہی تھیں۔ سن نے انہیں کو یہ سوچے دیا تھا۔ ڈھیروں تصاویر بنا دیا تھیں انہوں نے۔

لیکھا اس کا دل گھبرا نہ لگا۔ جیسو مٹھا ہوا۔ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”اگر تصاویر بن چکی ہوں تو بیٹھ جاؤں۔“

”میرے کچھ دیر تو بیٹھنے سے موم بچ تو قسمت نہ دیا ہے۔“

کسی نے کہا تھا۔

”شریف بچہ ہے بھی نا عمر میں کے جو ہم زیادہ تر تک نہیں بیٹھ سکتا۔ دل دے چارے کو۔“ وہی شروع

ی آواز آئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

سانولے رنگ کی پرکشش سی لڑکی آنکھوں میں بے حاشا جھپک لے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اب کامیاب چارہ ہے تو میں جاؤں۔ جب ہی بھر جائے گا۔ کچھ دیر تو بیٹھیں گے۔“

بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ جس پر ایک تھپ۔ راقاہ لیکن لڑکی بھی بے حد شرم تھی۔

”اب کو بیٹھنے سے تو عمر بھر کی نہ بھرے گا۔ تو ساری عمر بیٹھ رہیں گے۔“

”اب حکم تو کر کے بیٹھیں۔“

ایک لمحہ کو جیسے وہ سب کچھ بھول کر پراکھنڈہ اور شرمین مشرمن کیا تھا۔

لڑکی نے جیسے پراکھنڈہ ہی نہ کیا۔

”تم تو مجھے رہتے تھے۔ وہاں کو گئے لیکن اب پتا چلا تو ابھی ہے۔“

کسی اور لڑکی نے کہا تھا۔ تیرے حکم کے بعد انستار نے آکر کہا۔

”تو کہیں کو کھانا لگا گیا ہے۔ چلو اب آؤ کچھ صاحب جارا رہے ہیں۔“

”بھئی یہ صحیح نہیں ہے۔ Its not fair۔“

اسے پھر بچوں میں کھانے کو کہہ کر سن لے لیا۔

”تم چارے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہو بالکل بھی اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

”میں کی آواز بھر گئی تھی۔“

”پانی کے لیے کہی کہی سزا میں تو نہ دلہیز میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ تم بہت کرتے کو ترس گئی ہوں۔“

”میرا تو میں خود محنت رہا ہوں سو۔“

اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا لیکن بولا نہیں۔ سن کی آنکھوں میں آنسو تھے اس کے دل میں جیسے دھکی

ایلی گری لیکر بن گئی۔

”میں جو اس سے عریض بنی تھی لیکن دونوں میں کتنی بے تکلفی تھی پچھن سے دونوں کی طرح تھے وہ دونوں۔ انہیں کادہ بہت احترام کرنا تھا۔ لیکن سن سے تو اس کی ٹوک بھوک لڑائی کھڑا رہنا تھا وہ دیکھتے اور پھر مل کر خراشیں کرنے لگتے تھے۔ پھر راجہ کتنی تھیں۔ یہ دونوں میرے گھر کی روٹی ہیں۔ وہ دونوں ابانی کے اڑے تھے سن پچھن میں اپنی تیار کی وجہ سے ان میں بہت عزیز ہو گئی تھی اور وہ اپنی بے حد خوب صورتی اور ہات کی وجہ سے اور پھر اس کے چلے جانے سے ان کی ساری توجہ اسی طرف مبذول ہو گئی تھی شاید اس کے لیے کامیابی میں انہوں نے اسے بے حاشا قرار دینے سے خود اس لیے کہ بتایا تھا وہ ان سے ڈرتا بھی بہت قائلین ان کی عدم موجودگی میں ان میں مل لیتی تھیں کہ لڑا اور بھی جوان کی کچھ کا لکھ کر تاؤ سن پر لپان جاتی تھی اسے ابانی سے بے حاشا سمجھت تھی اس کے مقابلے میں وہ ت زیادہ احترام کرتی تھی ان کا شاید بیڑوں کو قدرتی طور پر ہی باپ سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔

”ابو میں ہی تم گھر کو آنا تو خیال رکھنے پر ابانی ہمارا سب سے بہترن لباس ہوتا ہے تمہارا بھی تم نے غور کیا۔ کسی کی بات کی گئی ہوئی نہیں۔“ کو یہ حقیقت ہی تھی اس کی ڈنڈے تک اس کے دوست ہی نہیں نیچڑے ہی حریف کرتے تھے۔

”جس ذرا سامان کا مزاج سخت ہے پرانے اصول ہیں اس کے۔“

سن بیٹھ ان کا قافح کر گئی تھی۔

اور اب اسی سن سے ابانی ناراض تھے اس سے بہت نہیں کرتے تھے اس کی طرف دیکھتے تھے اور اس کے دل پر کیا کرتی ہوئی تھی۔ اسے یہی بہت ضرورت تھی اور سن نے بغور سن کر دیکھا اسے سن کا چہرہ بچھا بچھا سا لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اگیوں کی پوروں سے



رخشاہوں تک بہرہ آفرین اس کے آسروں کو بچھا۔  
 ”کل ہو تم بھلا میں ایسا کیوں کروں گا۔ بس ذرا طبیعت ٹھیک نہ تھی ابھی تک کمزوری ہی محسوس ہوتی ہے۔  
 اچھا! طبیعت تیار ہو جائے گی۔“  
 وہ غصے سے سر ہلایا۔  
 ”تم ساری بھلائی صاحبہ بھیجی کی نہیں ہیں کچھ۔“  
 ”بھئی۔“  
 ”میں نے تو تم کو توں پر بھی سمرناٹ دوڑی۔“  
 ”صرف بھیجی ہی نہیں نکرتی بھی ہے۔“  
 ”واؤ۔“

اس نے تہہ لگایا۔  
 اور باہر سے گزری عذرا بیگم ایک لمحہ کو ٹھٹھ کر رک گئیں۔  
 ”تو میسر ہے۔“  
 ”شکر ہے رب کا آج اس کی بھی خوشی۔“  
 ان کا کئی دن سے یہ سچا بدل مقرر کیا۔



شاہ رخ تیز چلے ہوئے جلی کے اندر ہی گھٹ سے نکل کر صحن عبور کرنے لگے ان کا رخ شاہ بابا کے کمرے کی طرف تھا کہ جیسے خادم نے آواز دی۔  
 ”مسماں آئے ہیں آپ کے۔“  
 ”کون۔“

انہوں نے مڑ کر اس کے عقب میں دیکھا۔  
 ”لاہور سے آپ کے دوست آئے ہیں۔“  
 ”مسماں۔“

وہ اپنی پلٹ پڑے۔  
 ”اسخو! رہنمائی آئے ہوں گے۔“

انہوں نے دونوں کو ہی اذیت کیا تھا اور مست کا یہی کہ جس کی آنکھوں میں شہنشاہ کی آنکھوں سے اچھی خاصی سلام دعا بھی لیکن گرمی دوڑتی صرف اسخو اور بلندہ بخت سے ہی ہو پائی تھی۔ تینوں دھم بیٹھے اسخو کیلے کرائی سے آئے تھے اور بلندہ بخت کا حلقہ اسلام آباد سے تھا۔ بعد میں اسخو اور ہی شفت ہو گئے تھے ان کا دونوں سے رابطہ تھا۔ کل شاہ زیب کی مہندی تھی اور سون سنی انوار کواریات تھی اور سوار کو دلچسپ کا لکھنؤ تھا۔ جو پلٹ پھرتی ہوئی تھی اندر ہی سے سے دو جلی بختی آواز آ رہی تھی۔

گاؤں کی لڑکیاں دو تین دن سے مع سے ہی جلی میں بیچ ہو جاتی تھیں۔ خاص طور پر جب سے اسلام آباد سے آگئی تھی۔ شاہی کی اجازت سے اس نے دو جلی منگوائی تھی۔ شاہی نے اس معاملے میں کوئی باندی نہیں لگائی تھی۔ سہل کھلی کچھ خرچ کر رہے تھے لیکن ان کے سب کے لیے بعد پڑاؤ کے لیے کہنے کوئے تھے۔ جلی میں دو تین سی کی تھی اور وہ خود بعد مصروف تھے۔ شاہی نے کئی کاموں کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ کیونکہ وہ خود ان دنوں الیکشن کے سلسلے میں ارد گرد کے لوگوں سے ملنے میں مصروف تھے انہوں نے صوبائی اسمبلی کی سیٹ کے لیے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ان دنوں اپنے مصروف ہو گئے تھے کہ باوجود کو شش کے شاہ بابا سکڑا نہیں جا سکتے تھے ایک دن بالکل دو شش نکال کر گئے بھی تو شاہ بابا سوسہ تھے ذہن میں ابھرنی سی

پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ بابا کہاں جانا چاہتے ہیں کون ان کا انتظار کر رہا ہے۔ کیا شاہ بابا کی یادداشت پلٹ رہی ہے کیا انیس باسی کا کچھ سارا مل رہا ہے۔ وہ بہت سے جہن تھے ان سے ملنے کو لیکن وقت تھا کہ ان کے ہاتھ سے پھسل کر رہا تھا۔ اسی روز وہ کٹر کھانا ملے سے معاملات طے کرنے کے لیے امین آباد روانہ ہوئے تھے۔ مگر رات کے آس پاس ٹھہرے تھے اور اگلی صبح صبا میں ہی انہیں لاہور اور شاہ میر کو لائے کے لیے بھیج دیا گیا لاہور جا کر وہ قائم علی شاہ سے نہ ملے۔ صبح ہی نہ تھا۔ راستے میں ہی صبا پر انہوں نے سید قائم علی شاہ کو اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ خادم کو شاہ میر کے پاس ہو شل چھوڑ کر وہاں سے دیکھ کر ان میں خود بخود ناگوار پچھے تھے قائم علی شاہ نے بیچہ کی طرح انہیں اپنے انڈوں میں سمیٹ لیا اور ساتھ ہی کچا انڈوں میں سے کھڑے رہے۔

”بھئی وہ میری جان۔“  
 ”ٹھیک ہوں چاہو آپ کیسے ہیں۔“

”کیا وہ سکا ہوں جان بھر۔ تم سب سے دور رہا بہت مشکل ہے۔ بہت سے حاصل رہا ہوں۔ شاہی کی لیجان سیدہ زینت خاطر سب کیسے ہیں۔“

”سب اچھے ہیں۔ چھپوئے آپ کے لیے بہت دعائیں اور سلام بھیجا ہے۔“  
 ”میری طرف سے بھی جا کر آؤ آپ کدوایت۔“

اور تیس دنوں کے کدوایت کو حاصل کیا کہ اندر لائے۔  
 ”صحت کو نہیں شاہ رخ۔“

اور جس نے کل کر شاہ رخ کو بہت خوش ہوئی تھی مگر قائم چاہو حزن کے اسیر ہو گئے تھے تو کچھ غلام بھی نہ تھا۔ وہ ایسی ہی تھیں اور سید قائم علی شاہ کے لیے تو زندگی کا فیصلہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ حزن کو اس بات کا یہ حد تک تھا کہ زینت خاطر سے ان کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ”پھر کے کو تو نا میں روز زینت کا کو۔“ وہ بار بار کہتی رہیں اور پھر شاہ رخ سے بھی وہ پہلی بار ملا تھا۔ پہلی گریٹ آٹھوں والا شاہ رخ بہت حد تک منہ کی شبابت چم لایا تھا۔ اس کے مزاج میں بھی وہی شہنشاہ کی آنکھوں میں سے حد چھک نہا تے۔ بھر پور تھی۔

”وہ پڑھتی ہے غلام۔“

شاہ زیب کی شادی کا دن اس نے مصنوعی سنجیدگی خود بخود طاری کر لی تھی۔

”میرے فرسٹ کزن کی شادی ہو اور میں یہاں صرف چند گھنٹے کی مسافر پر بیٹھا کر ہوتا ہوں۔“

”ایسا نہیں ہو سکا شاہ رخ بھائی کہ میں بھی اس شادی میں شریک ہو سکوں۔“

”نہیں لیکن اکل تو ممکن نہیں۔“

شاہ رخ کو زینت خاطر کا خوف اور انتہا ہوا گیا۔

”وہ بچے میں آجائیں تو کسی کو کیسے پالے گا۔ یہ سید قائم علی شاہ کا بیٹا ہوں۔ سب کہتے ہیں میں سارا کا سارا

پلٹا ہوں۔“

”میں نہیں نا کرا نہیں۔“

شاہ رخ نے اپنے اقرار کیا۔

”تو کل شاہی بہت مصروف ہیں جیسے ذرا فرصت ملتی ہے ان سے بات کروں گا۔“

سید قائم علی شاہی بہت جذباتی ہو رہے تھے۔

”میں شاہیوں کو جلی میں تو بہت وقت ہو چکا ہے۔ تاہم ہمارے شاہی کی شادی کے بعد یہ سرفا لکھنؤ سے

اس طرح کا کچی میرا بھی بہت مل جاتا ہے۔“

انہوں نے یہ کسی سے سر ہٹایا اور تڑپ اٹھیں۔

”بھئی میں بہت کچھ لکھ کر رہی ہوں کہ میری وجہ سے آپ اپنے بچوں سے دور ہو گئے ہیں۔“

”مفضل مت بولا کہ۔“

سید قائم علی شاہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور شاہ رخ سوختے لگا تھا کہ کس طرح شادی اور بی بی جان کا دل نرم کرے کہ وہ سید قائم علی شاہ کو معاف کر دیں۔ پچھو سے کہوں گا کہ وہ کچھ کر بن اس سے سید قائم علی شاہ کی بے قرار دیکھی میں جارجی کی اور واپس آئے ہی انہوں نے کزنیت خاطر سے اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ ”پچھو کیا ایسا میں ہو سکتا کہ شاہ زنب کی شادی پر چاچو کو بھی انوائیٹ کر لیا جائے۔“

اور زینت خاطر کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

”یہ کیسے ممکن ہے شاہ۔“

ان کے لیے میں دکھ تھا۔

”اگر آپ شادی سے بات کریں تو۔“

”نہیں۔“

”شادی نہیں ہائیں گے میں جانتی ہوں۔“

”تو پھر کیا چاچو ساری زندگی بچی کرتے رہیں گے یہ اتنا بڑا جرم تو نہیں ہے کہ انہیں۔ معاف نہ کیا جا سکے۔“

”تم ایسا کہہ سکتے ہو شاہ رخ لیکن شادی نہیں۔“

ان کی آنکھوں کے سامنے وہ پراسٹیاقی نظریں آئیں پتا نہیں یہ نظریں کیوں ہر وقت ان کا حصار کیے رکھتی تھیں۔

”سنو تم شادی سے بات کرنا پلین۔“

خوف ان کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا اور وہ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہی تھیں۔

”اؤکے نہیں کروں گا پلینز بلیکس۔“

انہوں نے آہستہ سے زینت خاطر کا ہاتھ پکڑا۔

”پتا نہیں پچھو اتنی خوف کیوں ہو جاتی ہیں۔“ وہ کتنی ہی دیر تک سوچتے رہے تھے اور ان کا ارادہ فی الحال شاہ جی سے بات کرنے کا پرزہ نہ تھا۔ پھر کئی روز وہ پچھو سے اس خوف کی وجہ پوچھیں گے تو کہیں کریں گے ان سے اس سارے معاملے کو لیکن اس روز جب امین آباد جاوے توئے شاہ رخ نے انہیں کچھ آفیسر کو دلہے کے کارڈ دینے کے لیے کہا تو ڈر پر سے نام پڑتے ہوئے چوڑے تھے سارے کارڈز ان کے ہاتھ میں تھے تقریباً اٹھن آباد کی ساری انتظامیہ کے نام تھے اس میں بی بی ایس بی غلام مرتضیٰ بی بی صاحب سب تھے۔

”کیا آپ نے اس بی بی صاحب کو کارڈ دیا ہے۔“

کارڈ کو الٹ کر دیکھتے ہوئے بے اختیار بی بی ایس کے لبوں سے نکل گیا تھا۔

”لوں شیخ شاہ۔“

شاہ رخ نے کمال پرکھی گئی کہ اماتھا۔

”میں بی بی شیخ شاہ قائم چاچو کے بیٹے“ دلی زبان میں شاہ رخ نے وضاحت کی۔

”آپ اس سے ملتے ہیں شاہ رخ۔“ شاہ رخ نے نظریں چرائیں۔

”آپ نے ساری انتظامیہ کے آفیسر کو کیا ہے اس لیے پوچھا ہے۔“

”انتظامیہ کے آفیسر کو کیا ضروری تھا۔ یہ ہمارا بڑا ہونے ہیں۔ وقت ضرورت کام آتے ہیں۔ آگے الیکشن میں بھی ہو سکتا ہے۔ میں ان پر دھندلا رہا ہوں۔“ خلاف توقع ان کا جوار نال تھا۔

”تو وہ میرا مطلب ہے شیخ شاہ ہی انتظامیہ میں شامل ہے۔“

شاہ رخ بات کرتے ہوئے جھج گئے۔

”ہاں۔“

شاہ رخ کی نظریں ان کے چہرے پر تھیں اور ان کی آنکھوں کی سرخی میں غصہ کو پیش لے رہا تھا۔ لیکن اس لیے اس کا وجود ان کے ہونٹوں پر بھی کی مسکراہٹ ابھری۔

”شامل تھا۔“

”لیکن اس بھتیجا ایس بی جانج لے رہا ہے اس کا زائفر ہو گیا ہے۔“

اس سیدھے سارے کھٹے میں شاہ رخ کو عجیب سی مٹکی ہوئی۔ وہ حیران سے سر اٹھائے شاہ رخ کو دیکھ رہے تھے۔ جن کے لبوں پر بکری مسکراہٹ میں بھی شاہ رخ کو وہی مٹکی ہوئی۔

”ہم قائم علی شاہ اب اس کے خاندان کے کسی فرد کو دیکھنا تک نہیں دینا کہتے چہ جائیکہ اس کا بیٹا یہاں ہمارے ماتھے میں بیٹھ کر ہم پر حکومت کرے۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے چلے گئے تھے جبکہ سید شاہ رخ کتنی ہی دیر تک سارے کھٹے میں تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے سید قائم علی شاہ آ رہے تھے۔ جین اور منظر سے شاہ زنب کے متعلق پوچھتے ہوئے

”کیسا ہے عمارنا“ ”موجا“ ”شکار۔“

”وہ اگلے شادی کی کالی ہے۔“ انہوں نے بتایا تھا۔

”کاش میں اسے دیکھ سکتا۔“ یہی حسرت تھی ان کے لیے میں اور شاہ رخ کیسے تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے اس سے شاہ رخ کا دل بہت برا ہوا تھا لیکن کچھ دیر بعد وہ شجاع کو فون کر رہے تھے۔

”یہ ہے ہویار۔“

”اچھا ہوں۔“

”شجاع کی گفتگو آواز سنائی دی تھی۔“

”آپ نے تو بھلا ہی کیا۔“

”اے نہیں میں بہت مصروف تھا۔ زنب کی شادی کی وجہ سے آج مجھے ایک کام سے امین آباد آنا ہے۔ تم

مے ملاقات ہو سکی ہے۔“

”اوائے کتنے ہی جیل سے عدل کو راہ ہوتی ہے۔“

”شجاع نے بے ساختہ کہا۔“

”میں بھی صبح سے سوچ رہا تھا کہ کوئی ٹیلی ہو جائے ملے کی تو۔“ صبح میں جا رہا تھا اور میری ڈرائنگ روم کی

بہت بھرتی ہو چکی تھی اور میں گزار کر ہر ایک چلا گیا تھا۔

”یعنی میں فون نہ کرنا تو تم چلے جاتے ہو خود بھی تو فون کر سکتے تھے یا میرا مہیا کل نمبر ہے تو سی تمہارے

”ہاں۔“ لیکن میں نے سوچا شاہ رخ کے ہنگاموں میں ہو سکتا ہے تمہارا مہیا کل کہیں اور دھڑ ہو سکی اور کہیں

”اے۔“

اس نے بات اور میری بھڑکی تو شاہ رخ نے دل ہی دل میں نام ہو گئے۔

”اؤکے پھر آج ملاقات ہوتی ہے عصر تک آؤں گا۔“

امین آباد سے رات گئے ہی واپس ہوئی تھی اور پھر کئی اور پچھوئے مولے کاموں میں الجھ گئے تھے کہ شاہ رخ کے

اُس بنانی ہو سکا تھا۔ ”میں نہیں شاہ رخ انتظامیہ کے ہوں میرا۔“ خواہ مخواہ راند بخت سے مل کر شاہ رخ کی طرف

جاواں ہوئی گئی اتنے ہی لمبے فون کے بعد کچھ آرام کر سکتے گے۔

”نہان خانے کو دے دو اسے۔“ وہ کچھ بھر کر دے اور پھر اندر داخل ہو گئے اس فرسائے ہی صوفے پر بیٹھے تھے اور

والہ دم سپائی کرنے کی آواز آ رہی تھی غالباً ”بلند ہوا“ ”اش رو میں تھا۔“

دولت نافذ ہو چکا ہے آگے بڑھ اسے نکل کر وہاں کے سامنے ہی صوفیہ پر بیٹھ گئے۔

”تھینک یو اسٹر تمہاری آمد کا بہت شکر ہے“

”کیا ہمارے تعلقات میں تھینک یو دیجیو کی ضرورت ہے۔ یا پھر چند ماہ کی دوری نے یہ ضرورت پیدا کر دی۔

آہستہ آہستہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ سن دیے۔

”اے نوید! یہ تو یونہی کہہ دیا کہ جیتنا تمہارے آنے کی بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے مجھے بہت تعالیٰ محسوس کر رہا تھا۔ شاد ہو چکا ہے اچھی اور شاد زینب صاحبہ دلہا ہیں جال سے جو کسی کام میں ہاتھ بٹاویں۔ میں نے کارڈز پر نام لکھ کر کاما صاف انکار کر دیا کہ وہ اپنی شادی کے کارڈ کیا آپ خود لکھیں۔“

”بالکل سچے۔“

”شادی زندگی اور بار بار تھوڑی ہوتی ہے ایک یا دہری ہوتی ہے اور وہ کام پورا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی منوائے اور کسی کی نہ مانے اور عمل درست کرے۔“

”مجھے یاد ہے اٹھارہ مہینے لے تو اپنی شادی میں بہت سارے کام خود اپنے ہاتھ سے کر گئے تھے۔ وہ تینوں بھائی اپنے گھر میں مصروف ہیں شادی فراموش ہو گئے ہوں۔“

”چلو خیر اب میں آیا ہوں میں بتاؤ کیا کیا کام باقی ہے۔ کچھ دھڑا دیاں میں اٹھا لیتا ہوں۔“

”سفر نے اسے تسلی دی۔“

”اور اس بلند بخت کو کچھ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ نہ کرو ہفتہ پہلے آجاؤں گا اور اب صبح بات ہے اور اب تقریباً بارہ ہیں ہر حضرت ذرا دواش روم سے باہر نکلے تو پوچھوں۔“

”لیکن بخت تو اب مجھ ہی نہیں آیا۔“

”اسفر نے بتایا۔“

”کیا اور یہ دواش روم میں کون ہے۔“

”شادی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔“

”دراصل بخت کو کچھ کھلے مسئلہ تھا کہ رہا تھا بلکہ میں جیتنے کی کوشش کریں گا اور دواش روم میں میرا کنز ہے میرے ساتھ آیا ہے ہاں اسے آج کل بھٹیاں محسوس کی ہیں تو دوسری میں بور بور رہا تھا۔ میں ساتھ لے گیا کہ جتنی رہے گی اور وہ بھی انجوائے کر لے گا۔“

”اب وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بلند بخت میں ابھی اس پر پوچھتا ہوں کہ آخر کیا کیا مسئلہ ہے۔“

”انہوں نے جواب میں نکال اور تہی دواش روم کاروانہ کھلا۔ تو بے سے باہر کو پوچھتے ہوئے شاہرم کو دیکھ کر وہ یکدم کھڑے ہو گئے۔“

”بہت شہر ہے۔“

شاہرم کے ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی اور اسفر تھی اور اسفر تھی سے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

”ہاں فوراً گیا تمہارے بھائی۔“

علینہ نے چائے نوشی میں بیٹھا ہوا ہے اس کی طرف دیکھا جانے کے برتن ڈالی میں لگائی ہوئی ہاتھ پرچہ لگی۔

”میں سو تو۔“

”جھوٹ مت بولو تم کچھ ابھی ابھی کی لگ رہی ہو۔ جب سے تم آئی ہو میں نوٹ کر رہی ہوں بھائی کا تم نے بارے نام ہی کہا ہے۔“

چائے نوشی علینہ نے ڈالی میں رکھی۔

”دراصل ایک میں سوسے کھائے تھے سو موہک نہیں تھی۔“

”چلو ان کیا۔“

علینہ نے اب کہا یوں کی دواش اس پکڑائی جسے ماہور نے اس کہا تھا سے لے کر ڈالی میں رکھا۔

”لیکن تمہاری بیٹی کی دلچسپی کیا ہے یہ مجھے بتاؤ۔“

”کچھ بھی نہیں پتا۔“

ماہور نے اپنے بہت بھری مسکراہٹ سے علینہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”میں بہت تھک چکی ہوں، ممکن ہے صرف۔“

”وہ دونوں اس وقت بچن میں کوئی جھمبہ اس نے دل میں بدل میں علینہ کی نہیں بیٹھ کر اور ماہور ڈاکر صاحب کے دوسرے کوچے میں جیتنا۔“

”بہت طرح کا جانکا سے پھل چڑی کیا اس سے شش رات گئی۔ وہ میرے پیچھے سے نکل کر بالکل اس کے سامنے اٹھنے ہوئے تھے۔ پھول ہاتھوں میں لے کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے یکدم مبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔“

”اب تو یونہی دارم گئی مس خان! ایسے میں نے پھول نہیں کانٹے پیش کیے ہوں۔“

”وہ اپنی بات پر خوشی ہے۔“

”میں کی گئی۔“

”وہ ابھی تک حیرت میں مبتلا تھی۔“

”بلیز۔“

”وہ ایک قدم اور آگے بڑھ آئے تھے اس کا ہاتھ پر پینے کے قطرے نمودار ہوئے لگے ایک لٹرو اس کی ہڈی چاؤا وہ ان کے پیچھے ہو کھڑے تھے میں پھول کے کران کے منہ پر بارے اور چاب مہمو کو گرہ لگی آئے لیکن باہر کی دنیا تو ایسی ہی تھی۔“

”میں مضبوط بنانا ہے خود کو۔“

”چاب اس کی ضرورت تھی۔ یہاں سے چاب چھوڑ کر وہ آکر کیں اور چاب کرے گی تو کیا خلعت ہے کہ وہاں ڈاکر صاحب جیسے بڑے ناموں کے گھر میں رہا ہے یہ حال کی فوج میں چاب کرنے کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہے سب لینڈ نیچو ہیں۔“

”جیتے ہیں اور چھوڑنے کے تک پہنچی ہو جاتی ہے۔“

”اوپر سے ہاتھوں میں کھڑے کھڑے بچوں میں نے تصاب کی کتاب میں ڈیڑھ ایک ایک کیا یاد آگئی۔“

”No“

You Should be strong enough to say

”ہاں سے ابھی اتنا شوخ ہوں ہے کہ Nou کہہ سکے۔“

”سوری سر۔“

”اس سے فیصلہ کرنے کے بعد اس نے اپنے اندر بے حد اعتماد اور قوت محسوس کی۔“

”میں تازہ سال کا اہتمام کرتی ہوں نا کچھ مصلحتی ہوں۔“

”ہاتھ کر کے یکدم پٹلی تھی اور ڈاکر صاحب کے چہرے کے اثرات دیکھے بغیر باہر آگئی تھی۔“

”گواں کے بعد اس نے تین بیڑے بھی لے لیے لیکن پتا تو ڈاکر صاحب کے لے لایا تھا اور نائی کو کچھ کا کھڑے کچھ کے وقت بھی اور انرا ناز میں سب بچہ کو خدا حافظ لے گئے ہوئے اس کے پاس سے گزرتے تھے۔“

”دو دن بدل میں میں خوش فرما رہا تھا اور ہر لمحہ کھانا کھا رہی تھی۔“

”اوپر کیا کچھ ابھی ابھی کی گئی۔“

”اسی ابچن میں وہ پوری طرح سب کی باتوں کا انجوائے بھی نہیں کر سکتی تھی۔“

”جتنے خالہ نے بعد اصرار سب کو ہاتھ اور انہوں نے کھانا رات کا کھانا ان کی طرف سے ہو گا ہو گا میں اور دن کا کھانا کھڑے۔ سو پر گرام ہتھ لگا رہا تھا۔“

”اگلے دن سے تفصیل بتائی۔“

”چلو جائے بعد کچھ اور آرام لیا تاکہ ہاتھ لے کر فزیش ہو جاؤ۔ نزل تمہارے کپڑے لے آئی تھی۔“  
علیحدے نزلی میں بڑے سالان کوچک کیک۔  
”دراصل حنہ پچھو خود ہی نہیں سب کو لینے اور انہوں نے ہی دماغے کا تھا کہ تمہارے کپڑے لے لیں۔“

”یہ کپڑے بھی تو ٹھیک ہیں۔“  
بادور نے اپنے کپڑوں پر غور کیا۔  
”ہاں ٹھیک ہے لیکن وہ بٹن میں چاہا ہے۔ فزیش ہو کر پڑے تو پیچ کر نای تمہارا لو کہ حنہ پچھو ہر بات کا خیال رکھتی ہیں۔“ چلو نزل لے کو۔“  
اس نے تنگ میں بزن رکھتی ملا دماغے کا اور دو ہول باہر نکل آئیں۔ لوگ دم میں سبھی موجود تھے لیکن اپنے اپنے گروپ بنا کر بیٹھے تھے سب سے اولہ اور شاہزہ میاں کی وہی کے سامنے پر ابھان تھے جبکہ اراج اور نزل ایک کونے میں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ افضل صاحب نصیر احمد خان کے قریب بیٹھے تھے جانے کون سا مسئلہ ڈسکس کر رہے تھے۔ طیبہ خاتون حنہ اور سدرہ کی اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔  
”مجھے سمجھ نہیں آئی کہ آبا کا شہی کے نکاح کی انکی اپنا جلدی کی گئی تھی صاحب کو۔“  
بادور نے طیبہ خاتون کو کہتے ہوئے سنا۔

”بڑے اسٹریٹھ صلاہ اسٹرا نہ کا ہونا چاہیے تھا۔“  
”ہاں میں نے بھی کہا تھا مگر اسے لیکن عذرا کہہ سکتی ہے یہ بھائی صاحب کا فیصلہ ہے۔“  
حنہ نے ایک مسکرائی نظروں پر ڈالی اور تھوڑا کھک کر سونے پر اس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔  
”دوسرے یہاں سر بسر کا بیٹھ جاؤ۔“  
”دراصل بھائی صاحب اپنی مرضی کرتے ہیں عذرا یہ چاہی کہ کسی تھی ہے۔“

طیبہ خاتون نے آہستہ سے کہا۔  
”حق تو یہ ہے کہ انکی بھیجی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے طیبہ! تمہیں یاد ہو گا کتنا انجوائے کرتے تھے ہم تینوں اور عذرا تو اس قدر رشتہ دوستی تھی اور اشعار لکھتے آتے تھے۔ لیکن۔“  
انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”بہت تبدیل گئی ہے میں تو بیزان ہو گئی بہت سخی سخی گئی مجھے حالانکہ جوانی میں کی ماں ہے۔“  
”بھائی صاحب مزاج کے تحت ہیں اور عذرا ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔“  
طیبہ خاتون کی آواز اب پہلے سے بھی آہستہ تھی جیسے اپنے بوسے سوئیے بھائی کے مزاج کے سختی کے لیے قصور وار ہوں۔

”لیکن عذرا تو بالکل ایسی تھی کہ باقی کبھی بھی ایسی عری کیسا ہے۔ لے کے نکاح کر دیا اور غالباً اس کا ایف ایس مکمل ہوئے تو رفتی بھی کو لائیں کہ شہی خاصاً دُشرب لگائے اور جی بات یہ ہے کہ حنہ نے بلاگ تبصرا کیا۔“

”مجھے لگتا ہے جیسے بھائی صاحب اسکی کو بالکل اہمیت نہیں دے بلکہ وہ اسے اہل جان کا بیٹا ہی سمجھتے ہیں اور اسکی بھی وہاں کچھ بیٹ نہیں لگتا مجھے اسے یہاں سے جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ظاہر ہے اتنی چھوٹی عمر میں یہاں آیا تھا۔“  
”لیکن اہل جان کے بعد اس کے یہاں رہنے کی کوئی تک بھی نہیں بنتی تھی۔ ماں باپ کے ہوتے یہاں نہ کر کے رہا تھا اس نے۔“  
سدرہ بیچہ خواہوشی سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ یکدم ہول اٹھیں تو حنہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

بزدلی کبھی رہیں پھر بوسے سے مسکرائیں۔  
”آپ کبھی نہیں ہیں تو بس اس لیے کہ رہی تھی کہ اسکی کچھ چپ سا لگا تھا۔ میں نے سوچا۔ شاید دل نہیں لگ رہا اس کا۔“

”ماں باپ کا گھر ہے، ماں بھائی ہیں۔ حل تو لگ ہی جائے گا۔“  
سدرہ نے جواب دیا تو طیبہ خاتون نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔  
”عذرا سے بھی نہیں تمہارے ساتھ ہی آجانی بہت عرصہ ہو گیا ہے اسے یہاں آئے میرا خیال ہے پھر بھی جان کی فتنہ رکھی گئی۔“

”میں نے کہا تھا عذرا سے کہ چلی چلو۔ اپنی یادیں تازہ کر کے ’غرب گھومیں گے‘ مسند پر جاؤں گے‘ شایکہ کرنے جائیں گے اور بس بیٹے وقت کو بکھڑے کر کے پھرنے کی کوشش کریں گے لیکن عذرا بھی بچہ پریشان کی گئی تھی کہ ان کا نکاح نکاح سے۔“  
”بھئی تمہاری جانے گا کہ ہر گز۔“  
حنہ نے مسکرا کر علیحدگی طرف دیکھا جو نزل اور اراج کے پاس رک گئی تھی اور اراج کی طرف آئی تھی۔  
”چاہے تو تیار تھی نا تھوڑی سی جگہ آہی گئی۔“

اس نے نزل کی کے ساتھ اندر آئی تازو کی طرف دیکھا اور مرکز کسب کو سرو کرنے لگی۔ ”بیچے حنہ پچھو اپنی کبابیں۔“

اس نے کباب ان کی کیلٹ میں رکھا اور خود بھی ان کے سامنے سدرہ بیچکے کے قریب بیٹھ گئی۔  
”اچھ اور سن کیسی ہیں پچھو! میں نے تو بچپن میں انہیں دیکھا تھا جب وادی جان فوت ہوئیں تو پچھو کے ساتھ صرف نہ ڈر اور آئے تھے۔“  
”دو ہول بہت باری اور سلجی ہوئی بچیاں ہیں۔“

حنہ نے جواب دیا۔  
”اچھ نے تو غالباً پر بھائی عجز دی ہے اسٹرا۔“ علیحدہ لے یکدم ابد اسٹراں سے دبایے تو بادور نے ایک شرت بھری نظروں سے ڈالیں۔

”ہاں بھائی صاحب کا تو بتایا ہے کہ ترمب کو“ نہیں ان کیل کی تازہ تعلیم پڑنے میں ہے میٹرک کا ہے اس نے البتہ سمن نے فرمٹ ایر میں ایڈیشن کیا ہے۔ بھائی صاحب نے جانے کیسے اجازت دے دی ہے اسے۔“  
عذرا بتاری کی جگہ سے ڈالنے سے ان کی۔  
”بشرا کا تو نکاح کر دیا بھائی صاحب نے لیکن اچھ کا تو کچھ نہیں سوچا انہوں نے۔“

”میں تو سوچ رہی ہوں اچھ کو اپنی بیویاں مل شہی لا اور آئے تو اس سے بات کروں گی بہت لوگ اور کیرنگ ہے بہت دھمکے مزاج کی جھنجھکی کی طرف۔“  
”یہ تو بہت اچھی بات ہے حنہ۔“  
طیبہ خاتون خوش ہو گئیں۔  
”شیراز نے اذتہ عرصہ ملک سے باہر گزارا ہے اور اچھ تو بہت دوسری لڑکی ہو گئی سیدی سادی شرمیلی سی۔“

سدرہ کے کچھ میں ناگوار سی گئی۔  
”میں! کیا تو نہیں ہے عذرا نے بہت اچھی تربیت کی ہے اس کی بہت اہم اقدام اور دار ہے۔ جہاں تک اچھ کی بات ہے تو ظاہر ہے میں اس سے کچھ بغیر تو بات نہیں کر سکتی۔ زندگی تو اس نے نزل کی سے یہاں مجھے دہشت آ گئی تھی۔ جی بات ہے آج تک کوئی لڑکی نظر نہیں آئی تھی۔ اچھ کو پچھتے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ ہجی سے بات کر عذرا سے بات کرتی ہوں۔“ حنہ نے جی بات کی اور بادور کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے لی۔

”اے بھئی حزن گریا! افسار ہوا سر از کیا ہوا جس کا اعلان کر کے تم نصیر اور اس کی فیملی کو اغوا کر کے لے گا۔“  
 اذکار حیدر نے چائے کی چٹکی لیتے ہوئے حزن کو مخاطب کیا۔  
 ”بس بھائی جان! حیدر نے تم ہو جائے سر از کی جی پی ہو۔“  
 ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے پیاس پی پالا پنا سوا بل اٹھا کر خضر کا نمبر لپٹا یا۔  
 ”کمال ہو بھئی۔“  
 ”کمر کے اگلے توبہ۔“  
 ”وہ کے۔“

انہوں نے آگ کر کے سوا لپٹا اس رکھا اور دھڑکی طرف دیکھ گئیں۔  
 ”بھئی! تم جادو تو زور پر رشت کرو۔ یہ دھاندلا حقیقت تھا دینے والی جا ب ہے۔“  
 ”نہیں! کوئی خاص مکان نہیں۔“ اس نے ان کی طرف دیکھا۔  
 ”کیا میں جی جان! تمہارا چہرہ ہا ہے کہ تم کوئی جگہ ملتی ہوئی ہو۔“  
 تب ہی خضر نے اندر داخل ہوتے ہوئے بلند آواز میں سب کو سلام کیا تو دھڑکال بیکار کی زور سے سر دھڑکا  
 چاہتے ہوئے بھی نظر اٹھا کر پل۔ اس روز کے بعد جب خضر نے اپنی جھین کی آگاہی دی تھی سب نے اس کا خضر  
 سے سامنا ہوا تھا۔ خضر نے اس کی بھی نظروں کو دیکھا تو ایک مہمان کی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھو لیا  
 ”نورا! سی اس نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں اور نصیر خان کی طرف بیٹھ گیا۔ کادل ابھی تک اسی  
 شدت سے حزن کا رہا تھا۔ یہ محبت ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”اور حزن کیا بنا عا کر انسان کے اختیار نہیں ہوا۔ میں نے کب سوچا کہ — خضر افضل حیدر  
 جیسی بے پایہ لوکی سے محبت کرے گا۔ وہ میرے لیے سوچے گا۔ میرے ساتھ زندگی کا سفر طے کرنے کی خواہش  
 رکھے گا۔ جہر جو بت مہمان ہے۔ زندگی اور محبت جیسا مہمان اور دہا اور نصیر احمد خان تم کس قدر خوش قسم  
 ہو کہ خضر نے تمہیں چاہا۔“ حزن کے احساس نے اندر جو جوت بکھیری تھی وہ خضر داخل ہو بھی جھلک اٹکی  
 حلیہ نے سب کو پس سے اتر دیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”تم روز روز خود شہر ہوتی جا رہی ہو ماما! کس کا کالگا ہے۔“  
 اس نے کھڑک پر حلیہ کو اور پھر خضر کی طرف کھانا ہوا لازم سے وہیل چیرے رہا تھا۔  
 ”یہ تمہارا سر از۔“  
 حزن اپنی جگہ سے اٹھیں تو سب نے ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔  
 ”نہ نصیر بھائی کے لیے ہے۔“  
 وہ اٹھ کر نصیر احمد خان کی طرف گئیں اور پھر افضل کی طرف دیکھا۔  
 ”کمال ہے بھائی جان! کی کو اس بات کا خیال ہو۔“ بھئی اور نصیر بھائی صرف کر کے تک سی حدود ہو گئے  
 سارا دن ستر بیٹھے اور لپٹے زندگی نہیں گزرتی۔  
 نصیر بھائی بایر لپٹ گفٹ کیا کہ آپ کو۔“  
 حزن نے ان کے صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے تو دوا سا ان کی طرف جھٹکے ہوئے پوچھا۔  
 ”حزن۔“

نصیر احمد خان نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ”مذمت چننا ہے ان کی کوا ز بھڑائی۔“  
 ”آپ کیلئے چہرے کام کر کے تمہاری زندگی کا کیا۔“ ساکت ہو جائے۔ نصیر جانے وہ ایک مضبوط مصلحت ہو کر ہو گیا  
 یں کہ جانے تو مر جانے کوئی چاہتا ہے۔“

پاس بیٹھے منصور نے یکدم سی اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ ہا نور کے اندر بھی آنسوؤں کی برسات ہونے  
 لگی۔ افضل حیدر ساحل کا بوجھ صلیب ان اور اداسی و دور کرنے کے لیے ہولے سے بیٹھے۔  
 ”حزن گریا! یہ خیال تمہارے ذہن میں آیا۔ ہم میں سے کسی نے اس طرح سوچا نہیں۔ بہر حال دیر آید رست  
 آید۔“  
 ”آپ جانتے ہیں نصیر بھائی! اس کی وجہ تھی۔ آپ نے ان سب کی بے حد محبت شدید محبت کر انہوں نے  
 چاہا کہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔ آپ کو آرام پہنچایا جائے۔ سب کچھ خدمت میں حاضر کر دیا جائے۔“  
 ”ہوں۔“

ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کو نہ پوچھتے ہوئے نصیر احمد نے سر اٹھا یا۔  
 ”منصور! بیٹا تم کو شام کو یا رے لپٹا کر کو تمہارے کمر کے قریب اتار دو امید ان ہے ان کے دوستوں  
 کے ملاقات کرواؤ۔“  
 ”جی۔“

منصور نے ہر جگہ سے کہا۔  
 ”وہ سیر بھائی! یہ چیز جو میں نے دکھائی ہے اس کو آپ خود بھی وینڈل کر سکتے ہیں۔ خضر آپ کو سب سمجھا دے  
 گا۔ سب ہی محکوم نظروں سے حزن کو دیکھ رہے تھے جبکہ مولیٰ نصیر احمد اور انیاں ایک طرف کھڑے تھے۔ رپہ  
 تھے۔“  
 ”خیز تھیں وہاں کیا کھڑے پھر کر رہے ہو۔“  
 حزن کی نظر اٹھا کر ان پر ڈری گئی۔

تینوں نے فوراً اپنے منہ بند کر لیے۔ لیکن مولیٰ کی ہنسی لگتی تھی۔  
 ”یہ زبانی کہہ رہا تھا خضر خالہ! اتنی ہیں اور اٹھل اٹھیں گریا کہ رہے ہیں۔“  
 مولیٰ ان بات پر سب سے قہقہہ لگایا۔  
 ”ہاں بھائی! واقعی! اتنی ہی ہو گئی ہے لیکن میں کیا کر رہی ہوں تو کچھ نہیں سے سی گزرا آتا آیا ہوں۔ زبان پر  
 چاہا ہوتا ہے۔“

”دیکھ لیں افضل بھائی جان! اب احتیاط کیا کریں۔ یہ میرا لاڈ بھی منہ چپے کی مسکرا رہا ہے۔“  
 انہوں نے شاہرم کی طرف اشارہ کیا جو ہولے ہولے مسکرا رہا تھا۔  
 ”حزن خالہ! بالکل سچی ہیں جیسا دعا نے بتایا تھا اور ہم نے کتنا مشکل وقت کاٹا ہے اور اگر حزن خالہ یہاں  
 انسان میں ہو تو شاید وہ مشکل وقت اتنا مشکل نہ لگتا تھا اور ان کی طرف سے دیکھ رہی تھی کہ حلیہ سے کہہ  
 ساس کیا وہ بہت رکھا۔“

”آپ کو کمرے میں چلے ہیں تم کچھ رشت کر لو پھر چلے کر فریض ہو جانا۔“  
 اس نے طبع خاتون کی طرف دیکھا تو انہوں نے تائید میں سر اٹھا دیا۔ حیدر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ واقعی بے حد  
 محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر کو لپٹنا چاہتی تھی۔ انہیں بند کر کے اعصاب پر سکون کرنا چاہتی تھی۔ سیار بار  
 ”اے صاحب کا خیال آجیا تھا اور بار بار وہ خود سے کہتی تھی۔“

I am strong enough to say "No."  
 کمرے میں اگر بیکر کے کرائوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ رہا ہوتا ہے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لوگ روم  
 سب کے بیٹھے ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ولید حلیہ کو لٹکا کے نام لے رہا تھا۔ جہاں اس کے خیال میں  
 اٹھا لٹکا دیا گیا تھا۔

حلیہ نے اس کے کمرے میں جانے کا کہہ کر خود کچن میں چلی گئی تھی اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دروازہ



اچھے نے بغور نہیں دیکھا۔

”میں نے شیطان تو نہیں ہوا، میں نہیں ہوں۔“

وہ کہنے لگا کہ اس کی بیڑی چھوٹ گئی۔

”ہاں جان لیو! تصاویر غزالہ اور شعی کے نکاح کی دیکھیے۔ آج ہی شعی دھولا کے لایا ہے۔“

”ہاں دکھاؤ۔“

وہ تصاویر دیکھنے لگیں۔

”باشاء اللہ دونوں کی جوڑی خوب صورت ہے۔ تمہارے ابا جان نے جلدی تو کی لیکن لڑکی بھاری ہے۔“

انہوں نے تصاویر اٹھائیں۔

”صرف چار ہوا ہائی ایس ایم ہونا ہی جان! اللہ کرے عادات و مزاج کی اچھی ہو، اپنے شعی بھی ہو۔ دونوں

میں انڈر اسٹینڈنگ ہو۔“

”ہاں بیٹا! اچھے سمجھ گئی ہیں۔“ انہوں نے احمک کی طرف دیکھا۔

”خند بھی کی رہی تھی۔“

”آپ کی بات ہوئی گی ان سے۔“

سمن نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں بالکل بات ہوئی گی۔“

”اگر آج سے آنے کے بعد انہوں نے پکری نہیں لگایا اور کدوہاں سب کیسے ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا۔“

”تصاویر لائیے گا۔ کچھ بتایا کہ تصاویر لائی ہیں یا نہیں۔“

وہاں سب اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے تو تصاویر کچھ نہیں بتائیں۔ میں سوچ رہی تھی اسفر تو ایک پیکر لگا آئی اس

کی طرف وہ بھی کہہ رہی تھی کہ پیکر لگا جائے۔“

”وہ خود ہی آجائیں۔“

”آہ آتے ہی مصروف ہو گئی ہے، اسپتال خزانہ کر لیا ہے اور پھر شاہرم بھی اسفر کے ساتھ گیا ہوا ہے۔“

اسفر بھائی کے ساتھ۔“

سمن نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔ خندتا رہی تھی اگرچی سے آتے ہی دو دن بعد اسنی کے ساتھ چلا گیا اس کے دوست کے بھائی کی شادی

میں شرکت کے لیے۔“

”آپ ابا بے پوچھ لیں تو میں اور شعی چلتے ہیں آپ کے ساتھ۔ جی بہت ہی چاہ رہا ہے ان سے ملنے کہہ

اتنی اچھی باتیں کہتی ہیں خند خالہ کہ دل پر دھواں ہو کچھ ہو جاتا ہے۔“

”جی ہاں! تمہارے ابا جان آئیں گے کھانا کھانے تو پوچھیں ہوں۔ دیکھے اسفر نے کوئی خبر نہ ہوئی نہیں دھاتا

وہاں گا۔“

”آپ نے ایک گہری نظر ان پر ڈالی۔“

”لیکن شاید شاہرم نے خند خالہ کو بتایا ہو پھر میرا خیال ہے شاہرم کے پاس پاک تیل بھی ہے۔ آپ اور کدوہاں

جائیں گی تو پوچھ کھینچے گا لیکن۔“

”کھانا بتایا ہے اسی جان ابا بے نے کچھ کہا ہے اسفر بھائی کے متعلق۔“

”تمہیں۔ انہوں نے تو اسنی کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ سہی تو جی آتا ہوا تھا۔ دل اداس ہو رہا ہے۔“

”تمہیں سارے سال کیسے گزارے آپ نے ان کے بغیر۔“

سمن ہولے ہولے ہنس۔“

”جی نہیں لیکن اب تو اسے جد کرنے کوئی نہیں چاہتا۔ وہ امریکہ جانے کی بات کرتا ہے تو میرے دل کو کچھ

ہونے لگا ہے۔“

”میں بھی سوچتی ہوں وہ ملے گئے تو ہم سب کتنے تنہا ہو جائیں گے۔ حالانکہ وہ جیٹ سے ساتھ نہیں رہے لیکن

پھر بھی اس کے ہونے سے کتنے خوف کا احساس ہوتا ہے۔“ ہے نا ابا۔“

”ہاں اچھا۔“

عذرا بیکر اٹھتے اٹھتے پھر پڑ گئیں۔

”رات تمہارے ابا بے رہے تھے کہ شعی کے اگروام کے فوراً بعد کی کوئی تاریخ رکھ رہے ہیں شادی کے

لے تو اس طرح تو بہت کمزور سا وقت ہے۔ اب بورے ہیں اس کے بچے۔“

”میرا خیال ہے اپرل کے ایڈونک۔“

سمن نے بتایا۔

”تو ابھی دوسرے ہے۔ کچھ تو نکال کر توڑی تیار کی شروع کرو۔ خاص طور پر کام کے لیے کم از کم ہند کر کے لے

لیں۔ چھ سات جوڑے تو بھاری کام والے ہوں گے۔ کچھ بچے کام اور کھانا دیکھو کہ وقت گزرتے پتا نہیں

چلے گا۔“

”جی آئی جان کچھ شروع کرتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ غزالہ سے بھی اس کی پسند و نفور پوچھ لی جائے۔“

”جی ہاں۔ اس میں اس کا کیا بوجھ ہے رات کا کھانا ہے۔ تم پوچھ لیتے غزالہ سے۔“

”جی خوش رہیں۔“

سمن نے پوچھا۔

”میں یو سی دھول محل بیٹھے کام نہاں ہے اور کیا ڈب آئیں میں رہتے ہوں تو اس طرح کی دعوت کے سلسلے تو

چلتے رہتے ہیں۔“

عذرا بیکر کے موٹیل پر ہم ہی مسکرا ہوا تھا۔

”تمہارے چھوٹے بھائی اللہ اسے خند نصیب کرے۔“ مقلی ہوئی تھی تو آتے دن دو موٹیل کا سلسلہ چلا

رہا تھا۔ تمہارے نانا اب بھی شوقین تھے اور اور شعی کے سرسرا والے بھی خوب دقت رہی تھی۔“

”جی بھائی! اس روز تمہارے بچے کے مہل جان کے کمال ابھی خوب دقت ہوئی ہے اور اس میں جان سب کے

ساتھ مل کر کپڑے لگاتے ہیں کیرم چیلنے ہیں اور بالکل دوستوں کی طرح صبر سے نہہ کر رہے ہیں۔“

”ہاں بھائی جان! ابھی ہی ہیں۔ میرے ابا جان بھی اپنے ہی تھے۔ بہت دوستی کی ان کی ہم نے آئی جان سے۔

میں کھوڑا خوف آتا تھا لیکن ابا جان سے تو بالکل بھی نہیں۔ انھیں بھائی اور وحید کو کوئی بات مٹوانا ہوتی تو ہمیں

آگے کرتے تھے اور وہ میری اور خند کی بات کرتے۔ جی نہیں تھانے تھے۔“

سمن کی آنکھوں اور ہرے پر حیرت کے رنگ بھر گئے۔

اور یہاں ہم چائیزیت بھی نہیں کر سکتے اس نے بدل ہی بدل میں سوچا اور عذرا بیکر سے کہا۔

”جی جان! اگر آئی چلیں نا۔ کسی روز پروگرام بنائیں۔ میں تو بچپن میں اگرچی تھی آپ کے ساتھ۔ مجھے تو کسی

کی شکل نکلیا تو میں اور چھوٹا ہو گیا میں نہیں آتے۔“

”ہاں جی تو میرا بھی چاہ رہا ہے۔ بہت بھائی جان سے بچوں سے ملنے کو۔ اسفر کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہی

اگرچی کارڈ کر اہم بنانا۔ دیکھو تمہارے ابا جان کیا کہتے ہیں۔“

”وہ مجھے جانے نہیں گئے۔“

سمن نے بچوں کی کی خصوصیت سے پوچھا۔

”ہاں نہیں۔“





سمن کی آنکھوں میں دبی اشتیاق تھا۔  
 "ہے وہ بوسہ میں پہلی بار اپنے کسی قریبی عزیز کے گھر جاؤں گی۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"ہاں اس کا دل ناگوار نہیں۔"

"میں تمہارے لابی سے پوچھتی ہوں۔ شہی گھر میں ہے اسی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ تم بھی آجانا۔" سمن کی آنکھوں میں جگنو سے جھک اٹھے۔

"مگر پورا روبرو تو ملاوے پہ لابی کا۔"

"جی ہاں۔"

"وہ ان کے ساتھ ہی اٹھ کر لاؤنج میں آئی اور نمبردار کریمپور ان کے کمرے میں تھمبھا۔"

"السلام علیکم۔"

"دوسری طرف سے میاں صلاح الدین کی کواڑ سنائی دی۔ "سچا ہوا آپ نے فن کر لیا، میں ابھی آپ کو فنون کرنے کی انکا تھا۔"

"جی نہیں۔" غدا بیگم نے پوچھا۔

"پہلے بتائیے آپ نے کیوں کیا تھا۔"

"میں دراصل محمد کی طرف جانا چاہ رہی تھی۔ وہ جب سے کراچی سے آئی ہے، جانا نہیں ہو پایا۔ تاحی وہ آگے ہے۔"

"مگر انہی سے آئی ہے، کوئی جگہ کے تو نہیں آئی کہ جانا بہت ضروری ہے۔"

"حسب معمول طریقہ ہے میں جواب داتا ایک مگر کوڈرا انکم کے چہرے کا رنگ بدلا۔"

"خیر آپ اپنی سمن صاحبہ سے کل مل لیجئے گا۔ اسی صاحب کا فون آیا تھا وہ لوگ شام کو آ رہے ہیں، تم کو دیکھنے۔ کچھ بازار سے منگوا کر دوڑا پور کے کمرے میں لکھ کر بھجوا دیجئے گا۔ زیادہ لوگ نہیں ہوں گے حاجی صاحب کی بیگم اور لڑکے کی بھابی اور بیگم بھی ہوگی۔"

"جی۔"

"ہو سنوں، یہ زبان بھرتے ہوئے انہوں نے دیکھو کہ سمن کی طرف دیکھا۔"

"میں ام کو کچھ لوگ انہوں کو کہنے آ رہے ہیں تمہیں میرے ساتھ چلیں میں اس کو اور انہوں کو اتار رہا ہوں جانا شام کو۔"

"انہم کے ساتھ سے اخبار لے کر پڑا۔ وہ کچھ دیر حیرت سے انہیں دیکھتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔"

"جی جان! آپ جادوئیے کیا کرتے ہیں اور سمن کر لیتے ہیں۔" غدا بیگم نے ایک شفقت بھری نظر انہوں پر ڈالی اور دل میں دل میں اس کے اچھے نصیب کی دعا مانگتے ہوئے اپنے اس سوچے سمجھے ہونے جیزی سے باہر نکل گئیں۔

"شہار رخ بھائی گلے تولیں لیا پچھانا نہیں۔"

"شہار رخ ام میں ایسے آگے میں نے منع کیا تھا نہیں۔" انہوں نے کسی قدر گھبرا کر پیچھے دیکھا اور پھر اپنی طرف بڑھتے شہار رخ کو۔

"میں اپنے کزن کے دوست کے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے اس کے ساتھ آیا ہوں۔ آپ کو اعتراض ہے کیا۔"

"ہاں نہیں تو۔"

"انہوں نے اسے گلے لگا کا توئے اختیار مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا۔

"ویسے تم بہت بولنا پڑا ایسا کیا تھا میری سادی۔"

"بخدا شاہ رخ بھائی! یہ صرف ایک مذاق تھا اور تب میرا ایسا کوئی راز نہ تھا لیکن جب اسکی بھالی نے بتایا کہ وہ جا رہے ہیں دوست شاہ رخ کے بھائی شاہ زیب کی شادی میں شرکت کے لیے اور یہ جان کر کہ وہ شاہ رخ آپ ہی ہیں تو میں نے فوراً پروگرام بنایا۔"

"تو بتاؤ چاچو اور چچی جان کو بتا ہے کہ تم سفر کے ساتھ کہاں آئے ہو اس کی شادی میں شرکت کے لیے۔"

"میں، پائل نہیں۔" وہ غصوا سا ہنسا۔

"جا کر تائیں گا۔"

"اس نے مرکز حیران سے پیچھے اسکی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے شہار رخ بھائی اسکو بھائی بہت حیران ہیں ان کا تجسس تو مضم کر رہا۔"

"ہاں ہاں۔"

"شاہ رخ نے حیران پیچھے اسکی طرف دیکھا۔

"شاہ رخ کے والد میرے قلم علی شاہ میرے کچے چاچو ہیں۔ ایک بار میں نے تم سے کر کیا تھا انان کا۔"

"ہاں ہاں، بیٹوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ اب اسکی آنکھوں میں ڈھکرا سی حیرت تھی۔"

"پائل وہی۔"

"شاہ رخ کے ہاتھ میں ابھی تک شہار رخ کا ہاتھ تھا۔ وہ اسے یہاں دیکھ کر خوش بھی ہو رہے تھے اور گھبراہٹ سی بھی تھی۔ شادی کا طعنے مٹھا علی شاہ کی ڈاسٹر اور نفرت کا تشہیر اٹھار۔

"اور ہمارے چاچو کی دانتھو کھنڈر حیدر میری نگاہ خالہ ہیں۔"

"رنگی اسکی۔"

"شاہ رخ بہت حیران ہو رہے تھے۔"

"کسی حیران کن بات ہے یعنی اس طرح تو ہم تم قریب دار بھی ہو گئے واؤ۔"

"کاش میں یہاں اس شخصیت کے شہار رخ طرف نہ آ سکتا۔"

"انہوں نے ایک ہنسی سا سر ہلایا۔"

"لیکن یہ سب بھی احتیاط کرنا شہار رخ کے والد کا بیانیہ کسی کو کسی کو شک بھی نہ ہو کہ شہار رخ کس کا بیٹا ہے۔"

"وہ ان سے پسند نہیں کریں گے پائل بھی نہیں۔"

"شاہ رخ کے لیے میں تشویش کی۔"

"تمہارے شادی بہت سخت مزاج ہیں، پہلے تو تم نے بھی بتایا نہیں۔"

"اس سے پہلے مجھے خود بھی نہیں کچھ شادی کا مزاج ایسا ہے میں نے تو بیوہ انہیں بہت محبت کرنے والا ہے اور بھائی پایا۔ شادی اور ان کے بچوں کے ہم سے بیوہ ہی انہوں نے چار اور محبت کا سلوک دیا رکھا لیکن چار کے ساتھ ان کا وہ میری بھجھ سے بالاتر ہے۔ خیر چھوٹے نم کوں نے لپائی والی کیا۔"

"ہاں کیا کیا۔"

"آخر نے جواب دیا۔ شہار رخ چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔

"تو تم ہاتھ لے کر فرش پر جاؤ سب تک چائے آجائے گی۔ چائے کی گرم لوگ آرام کا سفر بھی لبا ہے اپنی اپنی باتوں کو اور سے یہاں تک چھ سات گھنٹے تو لگ جائے ہیں پھر کھانے پر ملاقات ہوگی۔"

"ہاں میں واقعی صبح محسن محسن کر لوں گا۔ شہار رخ تو رات بھر اچھا ہے کرنا بار اور قدرت کو سراہتا ہوا۔ ویسے اپنی بہن بہت ہے اتنی بڑی بڑی آواز بڑی بڑی سب بہت انکڑت کر رہے تھے۔"

"ہاں ہمارا علاقہ خوبصورت بہت ہے۔"

"وہ نے جواب دے کر شہار رخ کی طرف دیکھا۔"



”تو ٹھیک ہے میں آپ کی پہل کر دانا ہوں۔ ہم کوئی آرام کے لیے تو نہیں آئے۔“  
 ”مگر بھائی کی طبیعت کچھ عجیب نہیں، محمود آرام کر لیتے ہیں۔“  
 ”میں نہیں، میں بھی کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی کام ہو چکا ہوں۔“

اس نے بھی کمرے ہو گئے۔  
 ”میں نہیں، آرام بھی آرام کرو۔ ہم تو اقلین گے جس میں ہیں نا چھوٹو میاں۔“  
 شاہ رخ نے شرارت بھری مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

اور اسے پیچھے آئے گا اشارہ کرتے ہوئے بڑبڑا کر نکلا۔  
 ”یہ جو شاہ بابا ہیں کیا کوئی بیٹے ہوئے بڑبڑا کر۔“

شاہ رخ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شاہ رخ نے پوچھا۔  
 ”میں ناراضی کوئی بات نہیں۔ ان کی یادداشت اچانک ختم ہوئی تھی اور کچھ سنتی ہی اہم تھا شاید۔ میں۔“

تو جب سے ہوش سنبھالا ہے، ”میں اس حالت میں دیکھا ہے۔ اکی تو دوسرے ہو گئے ہیں، لیکن جب تک تھے میں بھی یاد بات میں کرتے تھے۔ اپنے آپ میں من اور خاموش۔ ملازم کھانا دے دے تو کھالیتے، ناوے تو ہا نہیں لگی۔“  
 ”میں یہاں ہو گا شادی کے سچا ہیں تو سب اس طرح رہتے تھے تمہارے بھی دادا ہوئے۔“  
 ”ہاں میں کرتے کرتے ان کے کمرے کی طرف مڑ گئے شاہ بابا اپنے کمرے کے باہر بھی چلا پالی پر پٹھے تھے

بان کی چلا پالی پر ناکی اور چھٹی ناکی۔ غالباً کسی زمانے میں لے آئے تھے۔ شاہ بابا کمرے سے بھی کھانا ہی لگتے تھے۔ شاہ رخ ان کے کمرے کے ساتھ سے باقی کمروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ تو غریزی نما کمرے ایک ہی لائن میں تھے۔“  
 ”یہ کمرے کس مقصد کے لیے بنائے گئے ہیں۔“

اس نے پوچھا۔  
 ”اچھا چھوٹا رشتی ہیں، کسی زمانے میں یہاں حضرت نبی کے مرید ٹھہرا کرتے تھے۔“

”کیا پھر کی مرید کی سلسلہ اب بھی ہے۔“  
 ”نہیں۔“

شاہ رخ کی بات کا جواب دے کر شاہ رخ شاہ بابا کی طرف متوجہ ہو گئے۔  
 ”السلام علیکم شاہ بابا، کیسے ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں۔“

انہوں نے بے نیاز سی سے کہا۔

”میں اب ہر کون بیٹھے ہیں۔“

”موصوب کو دیکھ رہا ہوں۔“

انہوں نے نگاہیں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

”موصوب کو۔“

شاہ رخ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ہاں آتے سالانہ ہدیہ بھی ہے نا؟ ابھی لگ رہی ہے۔ اتنے سال اندر جو بند رہا۔“

”بندر کماں شاہ بابا۔“

شاہ رخ نے آنکھوں میں یکدم ہلچلی نظر نہ لگی۔ شاہ رخ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”یہاں اندر اور کماں۔“

انہوں نے سر مڑ کر دیکھ کر کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

”مگر یہاں تو دروازہ کھلا رہتا تھا۔ آپ باہر آکر دیکھ لیتے موصوب۔“

انہوں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”روانا تو بند تھا۔“

ان کی آنکھوں میں ابھرنے لگی۔  
 ”روانا تو بند تھا۔“

انہوں نے پھر دہرایا۔

”پتلیں اب تو محل کیا ہے۔ آپ کو کس جانا ہے۔“

”میں نہیں، میں تو دوصوب پہنچی ہے۔ دیکھ رہا ہوں۔“

”لیکن آپ کمرے سے آئے روز کہ آپ نے نہیں جانا ہے۔ تو بتائیے کہاں جانا ہے۔“

”میں نہیں، میں نہیں جانا۔“

انہوں نے لمبی من گھڑلیا۔

”اچھا جب جانا ہو تو مجھے بتائیے گا۔ لے چلوں گا اور یہ میرے دوست کا بھائی ہے شاہ رخ۔ آپ سے ملنے آیا

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر کچھ دیر سوچتے رہے۔

”اس کی آنکھیں۔“

انہوں نے شاہ رخ کو مخاطب کیا۔

”اس کی آنکھیں بڑبڑاتی ہیں۔“

”ہاں ہاں شاہ بابا اور اس کی آنکھیں بڑبڑاتی ہیں۔“

انہوں نے نگاہیں جھکا لیں۔

”بڑبڑاتی ہیں۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“

”نہ۔“



”ذاکر صاحب کو چاہیے تھا کہ ایک متفقہ پلے میٹ لے لیتے“

”وہ تو میری بیار“ ”کیا اور مجھے مرکز اگر اسے دیکھا۔“

”سرمزراہ جی ہیں ذاکر صاحب کی دعوت سے بلاوے ڈاٹ فٹ کرنے کی ورنہ ابھی ایڈیشن چلا بہت دن ہیں غالباً دوسرے کیلنڈر لائٹ میں ایک دن جاں گئے۔“

اس کی کوئی گت سے نہ لکھی کہ اشاف دوم سے ہر گزلی کی تو سرمزراہ نے پوچھا۔

”اس روز کے بعد ہر گز سے بات ہی نہ ہوگی۔ کوئی فری فیریڈ نہیں لاس اور ریک میں سب بیچے ہوئے

مجھے خیال میں نہیں رہا پوچھنے کا تمہاری خاطر میں نہیں کیا۔“

”اے! اس بات تو اگلے روز ہی بتانا تھا کہ اسے تو سب سامان جان کے کھرا کھٹے ہوئے تھے۔“ ”ماہور نے سمر

تیار کالی اٹھال۔“

”متم خوب صورت ہووا۔“ ”پھر بعد جب ابلی ٹیچر نے ہر گزلی میں ہر گزلی گئی تو سرمزراہ نے کہا۔

”ذاکر صاحب کوئی بہت اچھے آدمی ہیں اس لیے محتاط رہنا۔“

”کیا مطلب؟“ ”گالی ماہور کے ہاتھ سے پیچ کر دی۔“

”خوب صورتی ان کی کنوڑی ہے سنا ہے ان کی اولاد کم صورت میں اور یہ خود کو مشاہدہ کلام سمجھ

مظالم شو کرتے ہیں کہ ان کے والدین نے ان کے ساتھ زیادتی کی۔“ ”تمہیں تمہاری ولایت کی باجی کے ہاتھ

کہ چلی سائنس پتھر پتھر پھوڑ کر چلی گئی تھی کیا چاہتے۔“

”نہیں۔“ ”ماہور نے شک ہوئے ہوئے زبان پھیری۔

”وہ تو دیکھ رہی تھیں کہ ذاکر صاحب بہت اچھے اور مہمان آوی ہیں۔“

”ہاں اس کو تو قیامی مہمان ہیں۔“ ”سرمزراہ کے ہونٹوں پر ایک غمزہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی تھی

نہ سمجھنے والے انداز میں اس میں دیکھا جیسے ان کی بات میں نہ ہو۔“

”آپ نے بتایا نہیں کہ چلی سائنس پتھر پتھر پھوڑ کر چلی گئی تھی۔“

”اے ہاں۔“ ”سرمزراہ نے اصرار سے کہا اور پھر آواز قدرے بڑھ کر کہ۔

”ہاں چلی غاصی خوش شکل لڑی تھی۔ تم اسے خوب صورت کہہ سکتی ہو۔“ ”مفتی شدہ تھی۔ کھلیا ملا

ٹھک ہے۔ کھلیا ملاں ایک گرام میں تھا۔ یہی شوق پھر کر رہی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب کو اس کے پیچھے کسی

پلے اس کے گھر کے چکر لگانے لگے۔ پھر وہیں میں خوش دینے لگے۔ کسی کی بمانے بھی کیے مانتے

تھی سر کی دعوت سے چلی گئی لیکن کھنڈ میں بھی ساتھ میں کی بھائی نہیں کوئی لے۔ جب ایک روز ذاکر صاحب

شاہی کی آفر کر دی۔ وہ اس وقت ریڑھان دے کر چلی گئی اسے کیا ضرورت تھی چاہا بچوں کے باپ سے

کرنے کی جب کہ اس کا پتا گیتھر دھما کھلا اور اچھی بوٹ پر فائز تھا۔“

”کیا وہ سب سے پتا چلا۔“ ”ماہور نے بڑی آہستہ سے دیکھ رہی تھی۔“

”جہن جانی ہے پلے وہاں اشاف دوم میں سب کے سامنے ان کا سارا کپڑا کھول کر مٹی کی دیوار

سے پہلے تو سہی ذاکر صاحب کو بہت اچھا اور شریف آدمی سمجھتے تھے اس کے جانے کے بعد اس کی

سب سے کتنے لگیں کہ خود ذاکر صاحب میں اثر ملے تو جب ذاکر صاحب نے گھاس نہیں ڈالی تو ذاکر

صاحب کے خلاف گواہی کر کے چلی گئی ہر سال گاؤں ڈھنڈھ۔ یہاں بیچے تو کتنی ہیں کہ مس ماہور ذاکر صاحب

خیر نہیں کیا۔“ ”نہوں نے بہت اذھوری پھوڑ دی۔“

”اس میں محتاط رہنا۔“

تب ہی بیچے ڈاکر کی کوئی نظر نہیں دیکھتی ہیں اور جب بھی ذاکر صاحب اسے دیکھتا ہے تو

فرست طور کی بیچے کو دواہی آتے ہوئے سنا ہے وہ سمر کے دواہی پیا پیا ہر گز دیکھا تھا ان کی محسن نظر

کی طرف اٹھی تھیں اور اس سے بڑے عجیب انداز میں پوچھتی تھیں۔

”ابھی اس خانہ حیرت میں کسے لپٹا دیا تھا؟“ ”پھر جان کی بلی بلی مسکرائیں۔ اس کی بیٹیاں اپنے

اقدے جھلما لے گئے۔“

”کیا میں چاہیے چھوڑوں سرمزراہ؟“ ”ہاتھوں کی پشت سے ہینڈ صاف کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”نہیں اس انسان کی خود مینڈا ہو جاوے گا یہی کرنا نہیں بگاڑنا اگر اللہ نہ چاہے تو۔“ ”سرمزراہ نے

اسے تسلی دی۔

”تو چھوڑے۔“ ”اس نے سوچا۔

غرض یہ بھی تو یہی تھا کہ اسے اگر باہر نکلتا ہے تو خود کو مضبوط بنانا ہو گا چھوٹی چھوٹی باتیں پر گھبرا جانا آنا

بانا۔ انسان خود کو کمزور اور دوسرے کو شیر باہر جاتا ہے۔

”آپ جانتی ہیں سرمزراہ چاہیے یہ صورت ہے اور میں ان کی اہل چاہ میں چھوڑ سکتی۔ میرے سامنے

میرے بہن بھائیوں کا مستقبل ہے ایسا کی بیماری اہل کی خراب صحت ڈاؤی کا بوجھ لیکن میں غصہ بھائی سے

کون کی کہہ میرے لیے کوئی اچھی چاہ تھائی کریں۔“ ”اس نے جھک کر نش پور کر لی گالی اٹھائی اور مطلبہ صف

ہاش کرنے کے لیے اس کی دوش کر دیا کرتی تھی۔

”تم پریشان ہو گئی ہو۔“ ”میرے مقدمہ میں پریشان کرنا تھا۔ لیکن میں چاہتی تھی کہ تمہیں ذاکر صاحب کے

معتقل پتھر تو خرابت سے مطلع ہو جائے تاکہ تمہیں ان کے کردار کا انداز ہو اور تمہارا حق دوسرے روز جب تم چھٹی

کے بعد اپنے ہاں کے گھر کی تھیں اور ذاکر صاحب نے تمہیں فون سننے کے لیے اس میں بیاں چاہا تو تم اس

سے بہت پریشان سی لگی تھیں۔ تمہارا چھوٹی سہ ہو رہا تھا اور تمہیں نہ تو رنگ رہی تھیں۔“

بات نہ اٹھ کر چھوڑ کر انہوں نے حیرت سے منہ کھولے اپنی طرف مٹی ماہور کو دیکھا تو چھوٹی سی شرمندہ

”ہیں۔“

”میں زیادہ دراصل مجھے مس سامنے بتایا تھا کہ تم حیرت تھی ماہور کرنے تو کچھ۔“ ”نہوں نے دانستہ

بات اور دوسری چھوڑ دی۔ ایک ہر طرف ایک ہر گز کے لیے ماہور نے سوچا پھول چیں کرنے والی بات سرمزراہ کو

بات دے کر سہی گئے وہ بھی چلی گئی کہ اسے سرمزراہ سے لکھی کی بات نہیں لکھی جاوے گی۔ ابھی وہ اس

ابھی طرح نہیں جانتی تھی۔ سوان پر اکتھ کر حاضرت ہو گئی۔

”ماہور! مجھے خوشی ہے کہ تمہیں گھر پہنچ کر کھانا کھا کر سو کر رہے ہو۔“ ”ماہور نے اپنے ابا کے خوابوں کی تعبیر

اپنے کے لیے کھاتے ہوئے کہی ہوئی لیکن دیکھو باہر کی ہر اجسادت کرنا۔ باہر کی دنیا بڑی عجیب ہے۔ مہموں یا

عورت سب سے اپنے چہلوں پر نہ جانے کتنے قہر چھرا کر گئے ہیں اور ان تھانوں سے پیچھے چہلوں کو دیکھا آسمان

لیں ہو۔ تاوقت خورشید ان چہلوں کو قہر کرنا ہے۔“

”تمہیں سرمزراہ۔“ ”اس نے ہر کی بیانی سناں بھال کی۔

”تم نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی مجھے کہ میں پریشان ہو جاؤں۔“ ”الہ فون کا کرشن از حد آپ سیٹ ہو

گئی تھی کہ خدا آنحضرت اذاتی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو۔“ ”رات کو بھی ان کا بلی نالی تھا۔ اور بھی کبھی ایک دم

گھٹ کر جاتا ہے۔ لیکن یہ مس کا جو مجھے حیرت ہے ان کی نظروں نے کیے جانے لگا۔ تاکہ۔“

”اس بے ایمانی ہے سب کی نظروں میں یہاں ایک ہے لیکن فٹ ہیں جب سے وہ سائنس پتھر یہاں اشاف

ہاں میں وہ سب کہہ کر مٹی سے تپ سے ہر کوئی دوسرے کو کھوکھو نظر سے دیکھتا ہے چاہے میری اور سمر باپ

ہیں شاہی شدہ خواجہ میں کیل نہ ہوں۔“ ”وہ سب سے نہیں۔“

”میں نے تو یہاں کہا۔ ماہور اس کا شکل میں سبھی بیچے خوش ہیں۔“

ماہور نے کالی کھول لی تھی اور چاہ رہی تھی کہ بریک ختم ہوئے تک ساری کاپیاں چیک کر لے تاکہ اگلے فری

پیش میں بہت پیچڑ چپک ہو سکیں۔ آج اتفاق سے سب ٹیچر حاضر تھے اس کے فوری پیش میں کہیں چلنے کا خطرہ نہ تھا۔ اس نے مسز مراد کی بات کوئی مضمون کیا لیکن اس کے ذہن میں بیار بار مسز مراد کی باتیں آ رہی تھیں۔  
 ”دعا کیا ہے اسے سب کا ذکر تک نہیں کیا اور اگر دعا تھا تو شاید وہ بھی بھیجا۔ تب نہ کر لی مگر ہم کیا لیکن دعا کیا ہے؟“

”ماہ تمہاری جتنی ہو چکی ہے؟“ مسز مراد نے اچانک پوچھا تو چہ کی اور کا لپٹی بند کر کے کاپی تو اس نے بے غمی کھول رکھی تھی ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا اس نے۔  
 ”نہیں۔ اس نے مختصر کیا۔“

”تمہارا یہ لڑکنا کیا نام ہے؟“ مسز مراد نے اس سے ارادہ ہے تمہارے والدین کا۔“  
 ”چاہئیں۔ اس کے رشتہ داروں پر سرنی گھر گئی۔ اور پل کی وجہ سے معمول سے بڑھ گئی تھی۔  
 ”میں نے اس کے پچھے پچھے۔ بعض اوقات قاعدہ نہیں ہوتی لیکن رشتہ داروں میں لکھن میں بھلا

نہ بات بے کر مری ہوئی ہے۔“ انہوں نے وضاحت کی۔  
 ”نہیں ابھی تو ایسا کچھ نہیں۔ اس نے بظاہر ناراض لہجے میں جواب دیا لیکن اس نے مسز مراد کے نام پر جو ذکر نہیں کر قصہ شروع ہوا تھا وہ اسی طرح جاری تھا۔  
 ”اور اصل۔“ مسز مراد نے اس کا سامنا کیا۔

”میں ابھی سے بدل میں ایک خیالی آیا تھا۔ بلکہ ترامنا میرا اختیار کیا اور کچھ سے ایک روز میری دعا کی رہی تھیں کہ کوئی ایسا لڑکی ہو تو ہماری نظریں تو تھیں۔ یوں تو میں بھلا ہوں یا بھلا ہوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتی۔ میرا کوئی ایسا اندازہ تھا کسی لڑکی کے حلقہ میں تھیں تاکہ اور یقیناً انہوں نے بھی راسخانی ہو گا تو کچھ نہیں دیکھ کر اچانک خیال آیا تم کو تو میں اپنی بھابی سے سزا کروں۔“

”میں بلکہ نہیں۔“ بے اختیار اس کے گلوں سے نکلا۔  
 ”میرا بھی ایسا لڑکی کا ارادہ نہیں ہے میں نے آپ کو بتایا ہے تاکہ میرے سامنے ایک بڑا مقدمہ ہے اور وہ

اسے نہیں سمجھا لیکن اس کا طبع ان کا مستقبل۔“  
 ”نہیں۔“ مسز مراد نے ہر جیسے کہنے میں۔  
 ”تو پھر تمہیں چاہئے کہ تم کو منٹ کی جاہلی کی کشش کو اور علاوہ اقبال اور پوندرا سنی سے لے کر لکھن

”جی مسز مراد! ایسے کے متعلق میں بھی سوچ رہی تھی خیر بھائی کے کا تھا وہ میری مدد کریں گے میں ان کے ان کہوں گی۔“  
 ”خیر تمہارے ذہن والے کاموں کے بیٹے ہیں نا۔“ مسز مراد نے پوچھا تو اس نے اذیت میں سر ہلایا۔

”تمہارے یہ بالوں تو بہت اسیٹھتے ہیں۔ تم کو دل کی بندش نہیں کر سکتے۔“  
 ”امیوں جانے تو ختم ہی چاہا کہ وہ ہادی مدد کریں میرے پوندرا کی چھوڑنے پر بھی غصہ ناراض ہو لیکن ہم کسی کو دلینا نہیں چاہتے انسان کو اپنے لیے خودی کچھ نہ کرنا چاہیے۔“

”ایں تو ہے۔“ مسز مراد نے تباہی پر، نکلیا اور تھیں پر پڑا اٹھا کر اس میں رکھا۔  
 ”تو خیر تمہیں تم سے بڑے ہیں؟“  
 ”ہاں یا میں جان کے دو بیٹے ہیں خیر بڑے اور ولید بھوئے ہیں۔“

”تمہیں علم نہیں ہو گا کہ یہ یقیناً تمہارے والدین نے اندری اندر بات بے کر مری ہوئی پوندرا سے پیدا نہیں ہوئے۔ اگر ان کی بیاری لڑکی کو خاندان سے باہر جانا چاہئے۔ پوندرا نہیں ہے۔ میں بھی لکھن واہم ہو میں ایک شرمیلیں کے سمرامپت نے بے اختیار لیوں پر اگر لکھن کا چور ہا کر اس کو اس کے بند مری جو جو

بے مقصدی کا پلے کے کھانے لگے۔ لکھن اور کچھ دھڑکن کا کل میں شروع ہو گیا تھا والدین میں سے ہوا تھا

لیکن خیر سے ہر حال ملے کر کھا تھا کہ اسے صرف اور صرف ہا کوئی شرمک سوزنا ہے اور پھر خیر سے بھی کتنا اچھا لیکن اور دوست کے پلے کی تھا اب اسے لگتا تھا جیسے اس کی طرح اس پر سایہ کے ہوئے ہو اور اگر کسی اس پر کوئی مصیبت آتی تو وہ اسے ہر طرف سے بھالے گا۔

اس روز علینہ سے مذاکرات کر کے اور پریشان ہو گئی تھی اور اس پریشانی پر اس کا اقتدار ہرگز نہ تھا۔ اگر کوئی لڑکی اسے بدل میں خیر کے لیے کوئی جذبہ رکھتی ہے تو اس میں خیر کا کیا تصور اور نہ جیسی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں جو اپنے اپنے ہنر کے لیے بڑا ہو جانے والی اسے اپنی ہلاک سیلویا دیا۔ انہیں جنوں نے کسی بند کی یہو کو اپنے بدل میں برا جان کر کھا تھا اور بے چارے کے ہنر کے قتل تک کو جرنہ بھی کر دے کسی لڑکی کا آئینہ دل میں نکالے کہ ہر لڑکی کو کشش پل دل جان سے غذا نہیں۔ اب اگر نہ اسے ایسی کوئی بات کی تھی تو اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی لیکن وہ اپنے اس بدل کا کیا کرے جو دنیا یا جنت کے دروے کشا ہوا تھا۔ نہ کا نام نہ کر دے جیسی ہو گئی تھی اور یہ بے چینی اور اضطراب خیر سے چھپ نہ سکا تھا ہو جس کھانا کھاتے ہوئے کسی بار اس نے اسے نظروں کے

حصار میں کیا تھا اور پھر ابھی پر جب وہ اور ولید انہیں روپ کر کے آئے تو وہ دوا نہ دیکھ کر کوبہا ہری سخت کے پاس رک گیا تھا۔ حالانکہ وہ سخت سے جوں جوں سیت لیا جانے لگا۔ نیب کا کٹھا ہری تھی۔  
 ”اگر خودی چلو کر سے چل کر سو جائے۔ یہاں اس سروی میں کہاں لیتے ہو۔“

”بہت فخر اندری ہے آپ۔“  
 ”کار کاڑی میں بھی مارا رات سوئے رہے ہو۔“ خیر نے قریب آ کر خوش ہلی سے کہا تھا۔ منصور نصیر احمد خان کی دیکھ کر خیر اندر لے گیا تھا۔ اب بھی اندری چلے گئے جب کہ خیر کا لڑکاکہ کے قدرے بعد انہیں اندر داخل ہوا تھا۔ ہوں سے سیدھے گھر آئے تھے ولید کی گاڑی میں اماں ڈاؤی نزل ہوئی اور وہ بھی

جبکہ خیر کی گاڑی میں اپنی ڈاؤی اور منصور تھے۔ خیر خانہ اور علینہ ویو انفاصل حیدر کے ساتھ گھر گئی تھیں۔ سب اندر گئے سے چلے گئے تھے لیکن وہ دو گئے سے بڑے سخت پر لپٹ جانے والے نفی کی کیا اس رک فی کئی کر کے آج تھا وہ منٹوں میں سو جائے گا۔ اس نے سہروردہ ایک نظر قریب کھڑے خیر کو نہ کھا اور گھیر کر لپٹے

ہوئے زلی کا ہڈ پکڑا۔  
 ”خیر تو نا۔“ خیر نے اس کی گھبراہٹ سے محفوظ ہوا۔ وہ اس کے قریب کھا تھا ہاؤر پر خودا کھادی گھبراہٹ

طاری ہو گئی تھی چلی جیسے تھکے پر حصے میں دھڑک رہا تھا۔  
 ”خیر نا۔“ خیر نے جب کہ کر تب کو لکھ لکھ کر آؤر ہٹا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے کر کے کی طرف بھاگ گیا۔

”ماہ۔“ خیر کی آنکھیں چڑنے اندری تھیں۔  
 ”یہاں جاتی ہیں گے کہ تم نے مجھ سے بات کرنا تو درکنار میری طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا ہے کیا بھابھو مجھ

”نہیں۔“ اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔  
 ”میں جانتا ہوں میں نے تمہیں ڈسٹ کر دیا ہے حالانکہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اپنے جندوں کو سینٹ

بیت کر شہنشاہ شہنشاہ کر رہا تھا مناسب وقت کے منتظر تھا لیکن امی کی بات سے تم ڈسٹرب ہو گئی تھیں۔ بہت آپ عینت میں اس لیے تم سے ہم دوسرے کا اٹھا ہا۔ لیکن تم اب بھی پریشان ہو۔“

”میں اس وجہ سے تو پریشان نہیں ہوں۔“ اس نے بھٹل کر اپنی جگہ لیٹ لی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا مری نظروں سے اسے تک ہوا تھا اور اس کی نظروں کی حدت سے اس کے رشتہ داروں پر سرنی دھڑکی تھی۔

”پھر کیوں پریشان ہو تم نے مجھ سے اپنی پریشانی شہنشاہ میں کی بلکہ کیا اٹھا کر روکنے سے میں تمہارے لیے پر اپنا اور جیسی ہو گیا ہوں۔ لیکن ماہ میں وہی خیر ہوں۔ جس سے تم اپنی پریشانی اور ہر مسئلہ بے تکلفی سے

ڈسکس کرتی تھیں۔ میں چاہتا ہوں اب بھی تم اپنی ہی سے تنگ کی اس طرح ہر بات پر سہلہ مجھ سے کہو اب  
جتاؤ کیوں پریشان ہو۔

”میں تو بالکل بھی پریشان نہیں ہوں۔“ مانے لگا میں اٹھائیں۔  
”جو میری طرف سے نہ کہنا اور مجھے اصل بات نہ کہنا کہ اس کو میں کوئی برا اہل ہے۔“  
”میں وہ نہ۔“ ہے اعتبار اس کے کیوں سے نکلا تھا اس نے فوراً ہی اپنے ہونٹ کو لٹکوا کر اٹھایا تھا لیکن  
خضر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”یعنی اس کی خوف لڑی کے جس میں بھی تھا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔  
”یہ تو بڑی مشکل ہو جائے گی مہاشی۔“ اس کی نظریں مہاشور کے چہرے پر تھیں اور وہ اس کی حد سے  
چلبلی رہی تھی۔

”کیا تم لڑکی پر پابندی لگا دو گی کہ وہ میری طرف سے دیکھے۔ تم اپنی نو پسو بواہ۔“  
اس کی آنکھوں میں کچھ بھر کو حیرت آئی تھی، اور پھر وہ دیکھی سے اس کے چہرے پر پھلتے رنگوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی  
اٹھنی گئی چکلوں کو اس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ کو۔

”تم بہت خوب صورت بواہ۔“ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند تھی۔  
”تم پر اس کی پٹنی بھی بولا ہو۔“ میں نے اٹھنی کی آنکھوں میں اس کا مطلب دیکھ کر ہنسنے کو کہا تو وہ چوکی۔  
”ہاں فری تھی کیا میں چپک کر رہی تھی۔“

”خوش! وہ اس کے اٹھنی قریب آ کر بیٹھ گئی۔  
”آج چھٹی کے بعد رکنا مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔“ اور پھر وہ مہاشور کا جواب دے کر اپنے پیڑ سے  
باہر نکل گئی اور مہاشور نے اس کی ہڈی کو تھپتھپاتا کہ اس کا مطلب مجھے کی خوش رکھ کر رہی اور پھر اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس  
نے چھٹی کے بعد نہ رکنے کا فیصلہ کر لیا تھا خضر نے کہا تھا۔

”لہ آف ٹائم کے بعد کبھی بھی نہ رکنا اگر ڈاک صاحب کہیں تم بھی نہیں۔“ اور مہاشور کو کوئی بات نہ کہنا تو  
مگر کبھی آگئی ہیں۔ اس نے سوجھا تھا اور چھٹی کی تیل ہوتی بہت جلدی بچوں کے ساتھ یہ کیٹ سے باہر نکل  
آئی تھی۔

”تہی! تزل نے کچن کے دوڑے پر آکر اسے پکارا تو وہ چوکی اور مرکز اس کی طرف دیکھا۔  
”وہاں ہاؤز ووس میں لڑکیوں کی۔“  
”وہاں ہاؤز! آئی ہیں آپ سے ملنے میں نے انہیں بٹھالیا ہے۔ آپ جا بیٹھے دیکھتی ہوں کچن کا۔“

”مہاشور! وہ یکدم کھڑی ہوئی۔  
”کیا بات۔ اس کی بات کرنا ہے۔“ میں نے جھجھکی سے کہا۔  
”No I am strong enough to say“

اس نے اپنے آپ سے کہا اور ڈانٹ دہم کی طرف چل دی۔

”دیکھی گئیں وہ خاتون آپ کو؟“ میںاں صلاح الدین نے اخبار پڑھتے پڑھتے نظر اٹھا کر پاس ہی دوسری کر سی پر  
خاموش بیٹھی بعد از کچھ کو کھانا کھا کر نکلتی تھی۔  
”ظاہر دیکھنے میں تو کچھ متعلق ہی تھی تھیں لیکن۔“ وہ کچھ متعذب ہی ہو کر میںاں صلاح الدین کو دیکھنے

لگتی تھیں۔  
”میں کیا۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اخبار دیکھ کر کہا۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ لڑکی کے بھائی انہیں بالکل پسند  
نہیں آتے تھے۔ کافی تیز طرار کی تھیں وہ انہیں انڈر ڈسکوشن میں چاہتا تھا اور وہ دلتا تھیں۔ مگر صاف تھا۔ لڑکی  
کی بھانجی اور بیٹی کے ساتھ بیگم حامی عبدالمجید تھیں۔ بھانجی نے ڈانٹ دہم میں قدم دھرتے ہی پہلے تو

چاروں طرف تنقیدی نظروں سے دیکھا تھا اور شاید ابھی کچھ میرے جائزہ لیتیں لیکن بیگم حامی عبدالتار نے ان  
سے پیچھے کی اور خواست کی۔

”جیسے نا بھائی بی بی آپ۔“ اور وہ صوفے پر ایک تنقیدی نظروں سے ہونے بیٹھ گئیں۔ جیسے کے بعد کچھ دیر تو وہ  
انہی ہی تحریف میں رطب اللسان رہیں۔

”میں اہل اس کمزور کشش کی تو میری ساس چند سال بعد ہی انڈی کو پیاری ہو گئیں۔“ نندو غیور کو بھی نہیں دو  
بھائی تھے صرف میرے مایاں اور میرے دو بیویاں مجھے اپنے پیار اور کوشش سے ہی بلا ہے۔ آج کل ہر بی بی  
ہے بلا لکھوں ویسا ہوا اور کیا ہے میرا دور تو میرے ہر ایک میں لڑکی کا کھیل ہے گا وہ دلتا میں کھیلے گی۔“  
”دلتا تو کئی خانے سے ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اصل چیز تو خاندانی شرافت و نجابت ہے۔ لڑکا تھا وہ خاندانی ہو گئی اخلاقی برائی نہ ہو بڑھا لکھا ہو ویسی  
کی قدر کر سکتا ہو۔ سو ابھی ربا روپیہ ہے۔ تو وہ فارسی شہیتہ رہتا ہے ہماری بی بی کی قسمت میں ہوا تو ضرور ملے گا۔“  
عذرا بیگم کی بات نہ کر کے تو انہوں نے انہیں ملانی تھیں اور پھر بی بی کی طرف دیکھ کر کہہ گئیں آ آ آنکھوں  
میں کوئی اشارہ کیا۔ طرے مسکرائیں۔

”میں یہ تو صرف بیان ہی خرچ ہوا ہے۔ دولت کے لفظ تو کچھ بھی نہیں ہے ساری خوبیاں جن کا آپ نے ذکر کیا  
بغیر دولت کے بیکار ہیں۔ اب میں نے اپنی بی بی کا رشہ جہاں کیا ہے۔ خوب کھاتے تھے دولت مند لوگ ہیں۔ اے  
بن خانی شرافت کو چاہتا ہے کیا اور جہاں تک میرے دور کی بات ہے تو میں نے کہا کہ اب میرا ہے سیدھا سا  
شریف لڑکا اور سے دولت کا کہا ہے۔ دولتوں ہاتھوں سے آپ کی بی بی تیار کرے گی۔“

ان کی گفتگو میں ہر ایک اس وقت کیا جب رمضان حوس کے لڑ گیا۔  
”ہو بھی آپ سہریاں شروع ہو گئیں۔“ ٹھنڈی کی بجائے تھوڑی۔  
پاس بیٹھی بیٹی نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو یکدم خاموش ہو گئیں بیگم عبدالتار نے بے چینی سے پہلو دلا۔

”جس سے بھائی بی بی۔“  
”جسما اٹھانے لگا ہے یا موم کا۔“  
”میں نہیں لگا اٹھ رہی ہوں سے بڑے اور جس بھی پہلے آؤں؟“ رمضان نے گلاس ان کی طرف دیکھا۔

”میں نہیں سہریاں ہی ٹھیک ہے۔“ انہوں نے گلاس پکڑ لیا۔  
”ہاں تو میں گدھی میں میرے پیو کے پاس دولت بہت سے روپے پیسے میں کھیلے گی لڑکی۔“  
”روپے پیسے کی مایاں بھی کوئی کی نہیں ہے۔ شہادہ مایاں صاحب۔“ عاتقی صاحب کی بیگم کو شاید ان کی  
متفقا اچھی نہیں لگ رہی تھی کہ وہ بول رہی تھیں مگر حوس کا دوسرا کھوٹ لیتے ہوئے انہوں نے بیگم عبدالتار کی  
بات نہ کاٹی۔

”ہاں ہاں وہ حامی صاحب سے میرے مایاں کو بتایا تھا۔ خراب بی بی کو بھی لائے۔“ میں دراصل جلدی تھی۔  
کچھ شاہک بھی کرنا تھا میری بچی کے سر پر والوں نے کل کھاتے پر آتا تھا۔  
”بی بی بڑی لڑکی ہوں۔“ خضر بچہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آج بیٹھے میں لاتی ہوں انکم۔“ بیگم عبدالتار نے کہا کہ میںاں تھیں اور عذرا اب تک نے سوجھا تھا۔ مایاں ہوا ناگر  
میں خندہ کو بھی بلوائی میں نے دفعہ دل میں خیال بھی کیا تھا کہ میرا مایاں صلاح الدین کے خوف سے چلی ہو رہی۔  
نہ کم از کم کوئی کم کوئی چار کروا کے آئی۔ کمن کو تو مایاں صلاح الدین نے سامنے آنے سے منع کر دیا تھا۔

”کمن کو بھی ان سے سامنے مت بٹھانے۔ یہ تو کہہ بی بی کی بجائے چھوٹی کو بیٹھ کر لیں۔“  
”خدا نہ کرے۔“ میںاں تھیں کیا کی بٹھا تھا۔ خدا حسن صورت میں کمن سے بڑھ کر ہے۔“  
”ہاں ہاں جاتا ہوں لیکن کیا بیچو اور بھی ہوتی ہے اور وہ ہے عمر۔ لڑکی کو لے کر بیٹھ لائی کہ عمری بیٹھتے ہیں۔“

”اگر مگر ان کی تو دوسری ہو گئی ہے مایاں بی بی۔“ نظر اٹھ کر مایاں صلاح الدین کی بیات پر لڑنے نہ نہ آئی تھی۔

”ہاں لیکن دیکھا ہے میں نے اکثر گھروں میں بڑی کے لیے رشتہ کیا اور چھوٹی کو نہ کر لیا۔“ تب وہ چپ کر گئی  
 تھیں کہ میاں بی بی کی اپنی سوچ اور اپنا انداز فکر تھا نہیں سمن کو منع کرنا انہیں خاصا مشکل لگا تھا۔ سمن کی حالت  
 بھی جرح کرنے کی لیکن خلاف حادثہ خاموش رہی تھی۔  
 ”نیک ہے اسی جان اب جانے سے منع کیا ہے تو میں جاؤں گی“ اور تب ہی احم کا ہنسنے لگا تھا اندر داخل ہوئی  
 بلکہ سے کمرے سے سنا دے منہ اور ہر گھمبیر میں ہی مثال اور مضمے بغیر کسی سبک آپ کے وہ ایک خوب صورت اور  
 معصوم لگتی رہی تھی کہ بھلا صاحب کا نہ تھا کلا کلا اور ایسی بیٹی تو فوراً شتیاق سے کوئی ہوئی تھی۔  
 ”میرے آپ آپ ہیں احم“ وہ ایک قدم آگے بڑھی تھی اور پھر کمر کی طرف کھنکھاتا تھا۔  
 ”ملاں ہی احم تو اسی اسکول میں پڑتی تھی جس میں سمن بھی اوریہ تو تھیں سے بھی ایک سال جو تیر تھی اور چاچو  
 تو۔“

”اچھا اچھا اور آگے بیٹھ۔“ انہوں نے فوراً ٹوٹو بات اور دھری چھوڑ کر اس نے انگلی بائیں اور  
 دایاں اور اگر کمر کی طرف دیکھنے لگی۔  
 ”آپ نے مجھے بچپان میں آپ سے ایک سال سینئر تھی۔“  
 ”جی۔“ احم نے اس کی طرف دیکھا اور پھر خدا رب تکم کے پاس بیٹھ گئی۔  
 ”چھوٹا تو ہے آپ کی بیٹی۔“ مگر کے بھائی کا حضور اسے دیکھ رہی تھی۔  
 ”بڑھ رہی ہے ابھی بڑھ چکی ہے۔“  
 ”میزک کیا ہے اس نے آپ کو بتایا تھا میں نے۔“ تب مگر عود التار سے جواب دیا۔

”ہائے اس نے اپنے بیٹی کو صرف دس چھ ماہ میں پاس کر لیا تھا میں نے آج کل کے لڑکے تو سولہ ماہ عادت میں لڑکیاں  
 مانتے ہیں۔ خیر دل نہ لگا ہو گا اس کا پرانی میں ہوئی ہیں کچھ لڑکیاں۔“ دماغ کو درد ہو گیا کہ ان کا پڑھ نہیں سکتیں  
 ورنہ آج کل کے بچے میں کون کر رہا تھا ہے۔“  
 خدا رب تکم نے احم کی طرف دیکھا۔ جس کی پیشانی پر پینے کے ننھے ننھے قطرے جھللا رہے تھے اور رنگ سرخ  
 ہو رہا تھا۔

”ہائے نہیں ملاں احم تو پیشہ فرسٹ آف تھی۔ بہت لائق تھی۔ میں جس دوسروں میں تھی تو تب ہی کل اور ٹوٹو  
 صاحب شوشون کا اور اس سے ملا تھا۔“ ملاں نے اسے گھور کر دیکھا اور حق خیر انرا تو میں سر ہرایا۔  
 ”تو پھر کوئی اور دوجہ ہو گی۔“

”میں اور اصل میاں صاحب کو لڑکیوں کو پڑھنا تعلیم دلوانا پسند نہیں ہے ان کا خیال ہے کہ لڑکیوں کے لیے تعلیم  
 تعلیم کا ہوتی ہے۔“ خدا رب تکم نے بہت مشکل سے جواب دیا۔  
 ”لیکن وہ تو ہمارے دیر صاحب ہیں وہ تو اللہ جیسے میری ساری سے کہتے تھے۔“ ملاں اور کچھ ہونہ ہو لڑکی پڑھی  
 تھی ضرور ہو کہ ازم چوہہ جماعتیں۔“ خود تو سولہ جماعتیں پڑھی تھیں اس نے ان دنوں میری ساری لڑکیاں  
 دیکھ رہی تھیں بیٹے کے لیے کہ ایک رات ایسی سوئیں کہ کچھ آتھی ہے۔“ محل سکھ۔“

خدا رب تکم کو حیرت ہوئی ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے دیوہ کو پالا تو کیا جوان جہان لڑکے کو پالا  
 پوسا دھل ہی بل لڑکے کی عمر کا اندازہ لگتے تھیں۔  
 ”میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے خدا رب تکم نے بھی اس طرح کی اور دھری گفتگو پسند نہیں ہے۔“ نہیں مسلسل  
 خاموش رہے کہ میاں ملاں الدین کی پیشانی پر نکلیں ہی پڑتی تھیں۔  
 ”وہ لڑکے کی بھائی کچھ عجیب سی باتیں کرتی ہیں سارا وقت۔“ خدا رب تکم نے چوک کر میاں صلاح الدین کی  
 طرف دیکھا۔

”بھی کتنی تھیں تعلیم کہ ہے میرے دیر تو پڑھی کبھی لڑکی کے لیے کہا ہے۔“ بھی کتنی تھیں کہ اتنا پیسہ ہے۔

تو بیٹس میں کچھ کہیں نہیں لیا۔ ہم نے تو بیٹس میں بلاٹ لیا ہے۔“ خدا رب تکم نے مختصر ”ساری بات بتادی۔“  
 ”اگر چاہا۔“ انہوں نے خدا رب تکم پر اٹھایا۔  
 ”جی۔ تم خود تو کئی باتیں ہیں جو میں نے آپ سے بولی تھی جاتی ہو۔“ لڑکے کا بھائی تو بہت مذہب اور خاصا معتدل  
 شخص تھا۔ بڑی اچھی گفتگو کی اس نے بلکہ میں نے بہت ستر ہوا۔ اپنی بیٹی پر جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ تبلیغی دھوریں  
 پڑ جاتا رہتا ہے اور حاجی صاحب نے احم کی تعلیم اور ہمارے گھر خاندان کا دیوار سب کے متعلق بتا دیا تھا  
 ”آمین۔“

”جی۔“ خدا رب تکم نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ یہ احم کی پوری زندگی کا معاملہ تھا اور اسے وہ محض میاں  
 صاحب پر نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ جب تک ان کی اپنی کسم پوتی نہ ہو جاتی۔  
 ”ٹوٹو ابھی جرم میں ہے نہ جانے عادت اور اخلاق اور گوارا کیا گیا ہے اور پھر غیر مرگ ملک میں رہنے والے  
 لڑکوں کا کیا خاندان نہ جانے کیا کرتے ہیں۔“ سیتکوں واقعات پڑھ رہے تھے کہ باہر کے لالچ میں رشتہ دے دیا  
 اور وہاں جا کر لڑکے نہ۔“

”آپ کو تو پڑھی کبھی خاتین ہر بات میں میں بیخ نہ لگاتی ہو اتنا ہیہ قوف نہیں میں۔“ ساری تحقیق کی  
 ہے میں نے۔ حاجی صاحب نے بتایا ہے کہ لڑکا صومہ صلوٰۃ کا پانچ ہے کہ جو جس میں رہتا ہے لیکن سرکٹ کی  
 نہیں چلتی حاجی صاحب لڑکے کو اتنی طور پر جانتے ہیں اور لڑکے سے مل کے۔  
 ”پھر بھی میاں بی۔“ خدا رب تکم نے کو کٹش کی کہ میاں بی کو قائل کر سکیں۔  
 ”جب تک لڑکے سے آپ خود نہ ملیں ہاں تو میں کی جا سکتی۔“

”مگر مجھے حاجی صاحب کی بات پر اور اعتبار اور یقین ہے پھر بھی میں نے اس کے بھائی سے یہی کہا ہے کہ جب  
 تک میں خود لڑکے سے مل نہ لوں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔“  
 اس ساری گفتگو کے دوران پہلی بار خدا رب تکم کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ ورنہ وہ تو ساری رات سو  
 ہی نہ سکی تھیں کہ نہیں میاں صلاح الدین انہیں نہ کہوں لڑکے کی بھائی انہیں ایک نظر میں بھائی تھیں اور  
 جس طرح جانتے جاتے انہوں نے رشتے کی بات کی تھی وہ اتنا ہی خیر تھا۔

”آپ کی لڑکی خوب صورت تو خیر ہے لیکن صرف دس جماعتیں پاس ہے۔ میں تو اپنی چھ لڑکیوں کے رشتے  
 مل رہے تھے لیکن جب حاجی صاحب نے ڈاکہ بھائی کی بات کی تو اچھا ہے۔“ انہیں تو نہ نہیں کہتے تھے۔ ہم۔“  
 اور یہ تب تک عود التار کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ خاتون کے اندر آنکھوں سے شرمندگی محسوس کر رہی ہیں اور  
 جاتے جاتے انہوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا اور خدا رب تکم سے معذرت کی تھی۔  
 ”اُن کی باتوں کا پر امت ماننے کا میں حاجی صاحب کہہ رہے تھے اچھا لڑکا ہے احم بیٹی کو ساتھ ہی لے جائے  
 گا۔“

لیکن تب مگر عود التار کے اطمینان دلانے کے باوجود انہیں اطمینان نہیں تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ دیوار بار  
 اٹھ کر بیٹھ جاتی تھیں۔  
 اس فرسٹ کرتیں۔  
 انہوں نے سوچا لیکن پھر خود کو ک لیا وہ کچھ دیر پہلے ہی تھکا ہارا آیا تھا۔ نہ جانے کتنا سہرا تھا۔ شاید آستے  
 کا تھکا ہوا رخسار کے تانے سے کہ اس پریشان آگے میں جب دیوار پر انگلیں توہ کرے میں جا چکا تھا۔  
 ”رفضان تم نے کھانے کا کچھ لیا تھا۔“

”وہ کہہ رہے تھے کہ میاں کھانے کھائیں کھائیں کا آرام کروں گا اور انہوں نے منہ بھی کیا تھا کہ بہت دیر ہو چکی ہے اس  
 لیے آپ کو نہ بتاؤں ان کے آگے۔ لیکن آپ کے کہنے کی لاٹھ جل رہی تھی دروازہ کھلا تھا تو میں نے کہا تھا  
 ”اا۔“ اچھا ٹھیک ہے تم جا کر سو جاؤ اب اور سب کو دودھ دے دیا تھا۔“



”جو تھا جی ہاں کہہ رہے تھے کچھ نہیں لیوں گا بس سوئیں گا۔“ اور وہ اسفر کے کمرے کی طرف جاتے جاتے واپس پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ میاں صلاح الدین سورج تھے وہ بے سوتے تو بہت کم ہی نیند سوتے تھے رات کو جلدی سونا چاندی افسانوں کا اصول تھا۔ وہ کچھ دیر تو بیوی کی رہی تھی مگر پھر وہ سے روانہ کھول کر باہر نکلیں۔ سن جا کہ گریہ رہی تھی جبکہ انہیں سوچ چکی تھی۔

”ای جی جان خیریت۔“ سن نے انہیں دیکھ کر کتاب رکھ دی۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نہ۔“

”ہاں۔“ انہوں نے اٹھ کھڑے ہوئے کما اور سن کیسپاں اس کے بیڑ پر ہی بیٹھ گئیں۔

”کچھ کتابت ہے ای جان۔“ سن ان کا منتظر چرواہے کے کریشان ہوئی تھی۔

”سوچتے ہو خانان! جی نہیں کہیں۔“ چھوڑ کر ہی گئیں۔

”تو ضروری تو نہیں کہ بابا جان اس رشتے کو بند ہی کر دیں ہو سکتے ہیں لڑکے سے مل کر وہ خودی اٹھا کر کہیں۔“ ساری بات سن کر سن نے انہیں دیکھا ان کا تھا چرواہی دل تھا کہ تڑپ رہا تھا اور اب کو میاں صلاح الدین کے کہنے پر کہ لڑکے کو دیکھتے کہ بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے بظاہر کچھ اندیشہ تھا تو وہاں چرواہی مل کر دھڑکا سا کتاب تھا۔



”وہاں لگے آ رہا ہے ایک ماہ کی چھٹی پر۔“ میاں صلاح الدین نے اخبار سے نظر اٹھا کر غدار بیگم کی طرف دیکھا۔

”میں سوچ رہا ہوں اگر لڑکے پھندہ آجاتا ہے تو پھر میں ابریل میں انہیں اصرار دینی دونوں کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔“ غدار بیگم بغیر کچھ کے کڑی ہو گئیں۔

”آپ کے لیے اور چاہئے تو خاؤں۔“

”ابن خوادہ کو سہاوی ہوگی۔“ غدار اس سرکار نے

”اور اگر آپ کے صاحبزادے جاگ گئے ہوں تو انہیں اور بھی بھیجتے ہیں۔ وہی آگے بڑھنے والے طور طریقے دوسرے تک سوتے رہتا۔“

”وہ رات سوتے رہے آپ کا تھا۔“ غدار بیگم نے عیسیٰ کی طرح ان کا دماغ کیا۔ مگر میاں صلاح الدین کے لبوں پر

کبھی بھڑکے مگر اب ہنسی مری ہو گئی۔

”آپ کے صاحبزادے نے تو کڑی کر لی ہے کیا امریکہ جانے کا دعوت آ کر گیا ہے یا ماموں نے بد کرنے سے انکار کر دیا ہے بڑا لڑکڑکھتا تھا آپ سے مدد طلب نہیں کروں گا اور اب خاک میں مل گئے سارے دعوے۔“ وہ اپنے مخصوص طریقے انداز میں بٹھے۔

غدار بیگم جانتے جانتے رک گئیں۔

”کیا اسفر نے جاب کر لی کیا اس نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔“ یہ احساس جیسے اندر پر سے دھوپ سکون کی پھواریں کر اڑتا۔

”لیکن میاں صاحب کو یہ کیا ہے۔ اسفر تو جتنے دن بعد رات ہی اتنی دیر سے آیا ہے اور اب بھی تک سو رہا ہے۔“

میاں صلاح الدین نے شاید ان کی سوچ بڑھائی کہ خودی بولے۔

”ایسا فیصلہ لیٹر کیا ہے کل صاحبزادے کا۔ اب چند ہزار روپے تو نوکری کریں گے۔ اتنے ہزاروں روپے تو میں اپنے شیے کو دے دیتا ہوں۔ آپ کے کاروبار میں دوسریں کر سکتے ہو کئی نوکری کریں گے۔“

”آپ نے اس سے کامیابی کا روبرو نہیں کیا تھا نہ لگا۔“

”میں کیا کہوں اس سے خود اسے نہیں معلوم کہ میں آ گیا ہوں اور وہ وہ کام دیکھتا ہوں۔ کم از کم اتنے نہیں ہے جتنی جی چاہتا تھا۔ پھر رہا ہے۔ پوزری والی فیکٹری کا کام ہی سنبھال لے۔“

”خود سے وہ کام سنبھال لے میاں صاحب آپ کے تو سارے انداز پر نہ لگا۔“ وہ سال پہلے کہا تھا کہ ضرورت میں ہے انہیں غریب کی میرے ساتھ کام سنبھال لو لیکن خیر۔“ وہ عجیب طرح سے بٹھے۔

”آپ جانتے جاتے بھجوا دیتے اور اگر صاحبزادے کی زندگی پوری ہو گئی ہو تو۔“ غدار بیگم نے بھوکے کھنے کے لیے منہ کھولا مگر کچھ کھانے کے باجائے کی طرف مڑ گئیں۔ رمضان کو کھانے کا کہہ کر وہ اسفر کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور دروازے پر دستک دی۔

”آجائے۔“ غدار اسفر کی آواز آئی تو وہ دروازے کو آہستہ سے کھولتے ہوئے اندر چلی آئیں۔ اسفر کے کندھے میں اس طرف سے ٹپنے سے سال خشک کر رہے تھے۔

”ارے ای جان آپ۔“ وہ قلیہ بیڑ پر چھید کر کے اقتدار کی طرف بڑھے۔

”میں بس آئی رہا تھا آپ کی طرف دراصل رات دیر سے آیا تھا پھر خیرینو بھی بہت دیر سے آئی جمع جلد ہی ہی نہیں سک۔“ انہوں نے معذرت کرتے ہوئے سر تھوڑا سا جھکا یا غدار بیگم نے دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ تمام کر ان کی پیشانی چوی۔

”کیا سنبھال لگائے؟“ اسفر میں بہت اداس ہوئی تھی۔ بلکہ میں ہی کیسا سببی اداس تھے۔ ہمارے بغیر۔“

”ہیں ای جان شاہ رخ نے آئے ہیں نہیں دیا۔ کتا تھا پھر مارا کرتے ہو تو بچھن رہو۔ پھر اس نے شکار کا پروگرام بنایا۔ اور سید پور کے کوٹھ میں شکار سے ملتا ہے۔ شاہ رخ بھی ساتھ تھا اور اس کا ٹوٹی ہی میں چاہ رہا تھا آئے۔“

”کوہ اور سید پور سے باہر شاہ رخ کے بابا جان کی ذاتی شکار گاہ ہے۔ بلند بخت میں شاہ رخ اور شاہ رخ شادی کے بعد وہاں ہی ٹھہرے رہے۔“ اسفر نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر انہیں بیڑ پر بٹھائے ہوئے معذرتی انداز میں بتایا۔

”اور میں بلند بخت کا تو رہا ہے۔“ غدار اسفر نے جواب دیا۔ انہوں نے مزید وضاحت کی۔

”اور بلند بخت کا تو رہا ہے۔“ غدار اسفر نے جواب دیا۔ انہوں نے مزید وضاحت کی۔

”املا کہ اس کی امی اور ماما کے خون میں جن میں بیا آتے تھے۔“ ان کیسپاں بیٹھے ہوئے اسفر نے غدار انہیں دیکھا۔

”یوں بہت دن تو نہیں ہوئے۔“

”ہاں لیکن کتنے گد گد رہے ہیں۔“ غدار بیگم نے بس ایک اسفر کے فریش چہرے پر بد حالی تھی اور پھر نظریں بچھائی تھیں کہ کس ان کی نظریں لگ

ہائے وہ اتنا ہی اچھا لگا رہا تھا۔ بہت دنوں بعد انہوں نے اسفر کے چہرے پر اور آنکھوں میں وہ چمک دیکھی تھی جو ان جان کی زندگی میں ان کے چہرے اور آنکھوں میں دیکھی تھیں۔

”آج صبح کچھ وقت دستوں کے ساتھ چار لیا تو کچھ فریش ہو گئے ہو۔“

”جی ای جان۔“ اسفر نے خوش ہلے سے کہا۔

”بہت اچھا ہے کیا سب نے شاہ رخ کے کزن بھائی سب ہی بہت محبت کرنے والے لوگ ہیں اور پھر وہ تو بڑا پورا علاقہ ان کی اپنی جاگیر ہے جہاں جاتے لوگ بدی عزت دیتے تھے۔“

”شاہ رخ پور رہیں ہوا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”ارے نہیں۔“

”وہاں آکر انہوں نے تو۔“ انہوں نے بات اور پھر پھر ذکر غدار بیگم کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جو کچھ

ملنی کھڑی ہوئی تھیں۔ ”خیریت تو ہے ای جان۔“

”ہاں کو تم کیا کر رہے تھے۔“ وہ صبح ہی تھیں کہ اس وقت اسفرے اٹھ کر رشتے والی بات کر رہا تھا۔  
 ”کہیں۔“

”وہاں جان شاہ سن! شاہرم کے گئے تباہ کیا بنا ہے اور میرے لیے ہم سب راز قاتل اور اس جلاک لڑکے نے یہاں مجھ سے ترک نہ کیا تھا۔ میں بھی جڑان تھا کہ میرے دوست کے بھائی کی شادی میں ہی حضرت جانے کو کہیں تیار ہو گئے۔“ اسفرے نے تفصیل بتائی اس نے رشتے سے وہ بھی بے حد خوش ہو رہے تھے۔ عذرا بیگم بھی جڑان ہو گئی۔

”ہاں حنتہ بتاتی تھی کہ قادی بھائی کا خاندان بہت معزز ہے لیکن اس کے والدین اس رشتے پر رضامند نہ تھے۔“  
 ”ہاں جان شاہ سرخ کی جلی واپسے علاقے کی مالک ہے ایک طرح سے لوگ یہاں کی طرح عزت و توقیم دیتے ہیں انہیں۔“

”سو تمہارے باپ بی بی بیٹے بہن بہن جانے حنتہ کے خاندان میں شادی کر لی۔ بھی نہیں کیا پتا ہے تو آج ہر کوئی یہ سن رہا ہے کہ اس وقت سب نے اپنی ذاتیں بدل لی ہیں۔ کوئی سیدین کا کوئی گلیوٹی۔ جس لڑکے نے خاندان کو مختار فرما دیا اس کی ذات پر برادری بھی ٹھک رہی ہے۔“

”اس کی تو باتی ہیں۔“ فرمودے ہوئے۔  
 ”آپ تو شاہ سرخ سے مل چکی ہیں۔“

”ہاں ہاں صورت مثل انگورو سے یہ اعلیٰ خاندان کا لگتا ہے۔“ جب اسرار کی آکر رہنے لگے تھے تو کچی بارشاہ سرخ اور بدلتہ بختان کے ساتھ تھ کر آئے تھے اسفرے ان کے ساتھ انگریز سے ملوایا تھا۔

”اور سب ٹھک ہیں نا بھئی! احم، سو“ ہر اندر سب انہوں نے عذرا بیگم کو اداس دیکھ کر موضوع بدل دیا۔ وہ جان گئے تھے کہ مہاں صلاح الدین کی بات انہیں کتنی تکلیف دیتی ہے۔

”ہاں۔“ عذرا بیگم ایک بار پھر ان کے متعلق سوچنے لگیں۔ اسفرے ان کو کچھ تحقیق تو کر سکا ہے کہ کوئی لوگ ہیں کیسے ہیں۔ کیا خبر جانی صاحب ہی بہت زیادہ نہ جانتے ہوں اور خدا نخواستہ احم غلط اور بے دلوں میں چھس جاس تو اس خیال سے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ہاں جان کیا بات ہے بلکہ بہت عجیب ہے مجھ سے۔“ سرخ فرمایا تھے عذرا بیگم کی آنکھوں میں چلنے آنسو رشہاں بند نہ آئے وہ دھوکے سے کسی کدے کی تلاش میں تھیں جہاں سرخ کا گیل کا کباب کھال نکال سکے۔

اسفرے نے اپنا اپنا ہاؤس کے گرد و حال کر کے انہیں اسے ساتھ لگایا۔  
 ”ہاں جان پلیمزت روئیے آپ کے آسٹو مجھ تکلیف دے رہے ہیں۔ میں اگرچہ اب بھی کے سامنے بہت بے بس ہو جاؤں گا۔ بہت ترہا ہوں آپ سب کے لیے کہ کچھ نہیں کر سکتا مگر جان اس طرح دو میں وقت کچھ نہ بتا رہے تھے۔“

ان کا چنگا چوہا نہ دیا تھا اور چند لمبے لمبے سے جو خوشی جھک رہی تھی وہ مفقود ہو گئی تھی ان کے لیے کئی دھن اور بے بسی کے احساس نے عذرا بیگم کو تڑپا یا انہوں نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرائے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں ہوا! اسٹیٹس یوں ہی مل رہی ہیں۔ آتے دنوں بعد دیکھا ہے نا جس۔“ اپنا ہاؤس ان کے کدے پر رکھے اسفرے نے ان کی طرف دیکھا۔

یہ ان کا چنگا چوہا نہ دیا تھا اور چند لمبے لمبے سے جو خوشی جھک رہی تھی وہ مفقود ہو گئی تھی ان کے لیے کئی دھن اور بے بسی کے احساس نے عذرا بیگم کو تڑپا یا انہوں نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرائے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں ہوا! اسٹیٹس یوں ہی مل رہی ہیں۔ آتے دنوں بعد دیکھا ہے نا جس۔“ اپنا ہاؤس ان کے کدے پر رکھے اسفرے نے ان کی طرف دیکھا۔

یہ ان کا چنگا چوہا نہ دیا تھا اور چند لمبے لمبے سے جو خوشی جھک رہی تھی وہ مفقود ہو گئی تھی ان کے لیے کئی دھن اور بے بسی کے احساس نے عذرا بیگم کو تڑپا یا انہوں نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرائے کی کوشش کی۔

”یار ایک دن رک جاؤ مزید تو مجھیں سپرد ہے نیچے شاہ پور میں بے چارے ہوں بہت خوب صورت علاقہ ہے۔“  
 ”یار جان دل طرف درخت پانی کے چھتے۔“ شاہ سرخ نے بلند بخت کی طرف کھانچے کا پٹ پر بیٹھا اپنے بیگ میں لپٹ کر دھڑا تھا۔

”پاؤسٹ یا کر میں ایک دن بھی مزید رک گیا تو میرے ہاتھ میں کھانچا جاتا ہے اسے سارے بھائیوں کی طرف منظر منج لے کر۔ تو تمہیں جانتا تھا مشکل سے اجازت ملی ہے میں نے یہاں آنے کی۔ ایک ایک میری جان اور میرے روکنے والے بہت لیکن دادو مجھے۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی شرٹ بیگ میں رکھ کر خودی اپنے بازو پر چلی گئی۔

”میں اکیلا بالا خزان سب پر بھاری ہو گیا اور شرک کر دیا وہاں کے روز بھی بچا گیا۔“  
 ”لیکن وہ کیوں روک رہے تھے جس۔ تمہارے لیے جان! اسی کا نا سب سے تو میری ملاقات ہو چکی ہے وہ لگے جاتے ہیں۔“ شاہ سرخ کو بت ہوئی۔

”دراصل ہمارے خیال میں کچھ نیچوڑی ہو چکی ہے میرے ہاتھ کے بھائی کے ہاں کو لادنا نہیں تھی۔ اس بنائی صاحب اولاد تھے۔ پر میرے ہاتھ کے بھائی کو لادنا ہوئی تو لیکن کسی میں ہی انڈ کو باری ہو گئی۔ بس ہاتھ کو اولاد میں میری اسی اور میرے ماموں ہی سب کی آنکھوں کا تار تھے پھر ماموں میں عالم جڑانی میں ایک جانے میں لپٹ کر آنے کی وفات کے بعد صرف اسی ہی رہ گئیں اور اسی کے انوکھے سپوت ہوئے کا شرف مجھے حاصل ہے۔“

”اے اے جان کو بھی صرف وہی اولادیں ہیں میں اور چھوٹی۔ سن بچاؤں کو چھوٹی۔ کیا کسی کے ہاں فراواں ہے اولاد کی لیکن اسے خیالی کی جھپٹوں کے ہم انوکھے حق دار ہیں۔“ بلند بخت نے تفصیل سے بتائی۔  
 ”لیکن بے وقار کیا نہیں میں ہوا تمہاری اسی جان نے مجھے نہیں روکا تمہیں کیس جانے۔“ اسفر شاہ روم میں جاتے جاتے روک گئے تھے۔

”ہاں لیکن چاہیں کیس اسی بار۔ اسی جان اولاد نہ تو دے دو رو کر راستے میں دیواریں کھڑی کر دی تھیں کہ وہم آتا ہے بہت جاؤ۔ لیکن شاہ تیری خاطر میں چلا آیا۔“ صرف تیری خاطر۔“

”تو کب یو۔“ شاہ سرخ حشر ہوئے۔  
 ”تو کب کی تو نے جانا ہے خوشی ہی ہے۔ وہاں شاہ کی اور شاہ زیب بھی بہت خوش ہوئے ہیں۔“

”میں نے یہاں آکر بہت انجوائے کیا۔ تمہارا علاقہ بہت خوب صورت ہے اور سارے لوگ بھی بہت اچھے اس بہت کرتے دالے اور تمہاری جلی کا تو کچھ کمائی کی۔ میں ضرور ایک دن اور رک جانا لیکن یار شاہ! ابی جان آپ بہت پریشان ہو گئی ہر بات تو دن پر روز پر مجھے یہاں گزارنے اور بیٹھنا پور میں خاص طور پر جوں شکار میں کرے ہاٹل کے دونوں کی یاد نہ ہو گئی۔“ اس نے لپٹے ہاتھوں میں لیے کورے سنکڑی طرف دیکھا۔

”تو کب رک جاؤ گا۔“ کوئی سہا پر رخصتے شاہرم نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”نہیں، نہیں، ہم تمہارے ساتھ ہی چلیں گے انشاء اللہ اب جاتے رہیں گے شاہ سرخ بھی تو اب لاہور آتا رہا ہے۔“

”اسفرے نے جواب دیا اور اس دن کو رک کی طرف بڑھ گئے۔  
 ”میں ہاتھ لے لوں تو پھر لگتے ہیں۔“ شاہرم کا بھی چاہو اسفرے کے کہ وہ دن اور رک جائیں لیکن وہ کچھ کے

”یار وہ کدے سے جا رہے تھے اس کدے سے کوئی کب ہوا لہو احمد نظر آنا تھا کیٹ کے ساتھ بنا چوڑا پانچتہ رہا۔ اس کے دونوں طرف درخت تھے۔“

”ہاں اس گھر میں بیابا نے اپنی زندگی کے بچپن چھپیں سال گزارے تھے۔ کیسے کیسے ان کا دل نہ چلتا ہو گا وہاں آنے کے لیے لیکن کچھ عجیب سبب اور نقل ہوئی ہیں ہر چہ بے ہرشتہ کو ہمارے جان ہیں۔ شاید ہاکی

”میں بھی اتنی ہی یاد دل رہی۔ لیکن شاید محبت نہیں۔ بیابا تھے مجھے بہت سے زیادہ وہ عیش و عشرت چاہو انہوں نے ہاں سے کیا تھا وہ عہد کبھی نہیں کر سکتے تھے اور اس ایک عہد کے تمہارے میں بیابا سے کیا کیا چھوٹ کیا تھا۔ بھائی

”ہاں اس گھر میں بیابا نے اپنی زندگی کے بچپن چھپیں سال گزارے تھے۔ کیسے کیسے ان کا دل نہ چلتا ہو گا وہاں آنے کے لیے لیکن کچھ عجیب سبب اور نقل ہوئی ہیں ہر چہ بے ہرشتہ کو ہمارے جان ہیں۔ شاید ہاکی

”میں بھی اتنی ہی یاد دل رہی۔ لیکن شاید محبت نہیں۔ بیابا تھے مجھے بہت سے زیادہ وہ عیش و عشرت چاہو انہوں نے ہاں سے کیا تھا وہ عہد کبھی نہیں کر سکتے تھے اور اس ایک عہد کے تمہارے میں بیابا سے کیا کیا چھوٹ کیا تھا۔ بھائی





بولوں دیکھ لیا تو چہا بھائی سے نیچے لنگر رہے تھے۔ شادی کا سفاک لمحہ۔  
 ”میں ان کے لبوں سے نکلا۔“

”میں۔“ انہوں نے پھر کہا اور لڑائی گھسی۔ شاہ نے یکدم آگے بڑھ کر انہیں باہنوں میں لے لیا۔  
 کے لبوں سے نہیں بھینسی کی اور انکل بھی سی اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں جبکہ شاہ نے انہیں باہنوں میں  
 بے نالی سے پکار رہے تھے۔

■ ■ ■

سواری ہابائی میں چھٹی کے بعد رک نہ سکی۔ میں سوچ رہی تھی ابھی کام سے فارغ ہو کر کپ کی ط  
 آئی ہوں۔ سرت دلوں سے حنا سے بھی ملاقات میں ہوئی۔ اس سے بھی لبوں کی اور آپ سے بھی پوچھ لو  
 کہ کیا کام تھا۔ ”دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پوچھتی، ہانور نے اس کے سامنے بڑے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے معذرت  
 لمحہ بھر میں ہانے فوراً سے نکھا۔

”کچھ نہیں میرا مطلب ہے کچھ خاص نہیں۔“ یو نہیں میں سوچ رہی تھی تم سے ڈسکس کر لوں کہ کن  
 ایجنٹ سمجھا جائے۔ ڈاکر صاحب کہہ رہے تھے کہ ملاقاتی بچوں کا ایجنٹ ہرگز نہیں سمجھاتا۔ اس سے اسکل  
 رہے تھیں خراب ہوتی ہے اور میرے پاس ابھی سے سفارشیں اتنا شروع ہوئی ہیں والدین کی۔“

ہانور نے ایک اسٹینان بھری سائیلی خواہ خواہ کل سے اچھڑی تھی پریشان ہو رہی تھی۔  
 ”وہ اصل۔“

ہائے فانی تفصیلی بات کرنے کے بعد پھر وضاحت کی۔  
 ”میرے پاس تو فزری بیڑے سے ہی نہیں اور بریک میں دوسری ٹیجز بھی ہوتی ہیں تو میں نے جنہیں رکے  
 تھا۔ دراصل وہو رام سے نامی فریڈ کا بیٹا ہے اور وہ مجھے سرت بھجور کر رہی ہے کہ اس کا ایجنٹ نہیں سمجھتا  
 ”ہاں۔“ وہ وہو فانی سرت غرور ہے۔

ہانور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”میں چاہ رہی تھی کہ تم اپنے مضامین میں اس سے کہو۔ میرے ہی میں تو پاس ہے باقی کی بات میں  
 صاحب سے کر لوں گی اور یہ بات میں سب ٹیجز کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھی تم سے۔“

”دیکھ۔“  
 ہانور نے اچھے کر اسے نکھا۔  
 ”راحم نے تو صرف میں چار سطریں لکھی ہیں۔“  
 ”یہ بات ہے تو پھر بتیو وہاں اگر خفاش ہوتی تو خیر۔“  
 وہ میرا رادیو طور پر دوپٹے کے پلو کو انکلیوں پر بار بار پٹتے اور کول رہی تھیں۔ ہانور نے ان کی اس حرکت  
 جرت سے نکھا۔

”وہ میری کلاس تمہارے مضامین میں کیسی ہے۔“  
 ”اچھی ہے پر چھائی میں دیکھی گئی ہے۔“  
 وہ بھی لب کی ٹیجز خفاش تھیں۔  
 ”کیونکہ ہم اس کی لڑکیاں زیادہ اچھی ہیں۔“  
 ”آج کل الٹ حساب ہے۔“  
 مس ہا نہیں۔

”لو کہ دیکھی ہی نہیں لیجئے چھائی میں اور لڑکیاں خوب محنت کرتی ہیں۔ ہمارے اپنے گھر میں حنا اور حنا کا  
 دیکھی ہے پر چھائی سے جبکہ دونوں خائیں کو دھتیار لگتا ہے۔“

اوں نے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ کا پینڈ پوچھا۔  
 ہانور نے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ کا پینڈ ہی نہیں۔  
 ”اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“  
 اس نے سادگی سے پوچھا۔  
 ”ہاں ہاں۔“ وہ کسی خیال سے پوچھیں۔  
 ”میں جانتی ہوں اب۔“

”نہیں۔“ میں نے بیٹھے رہا چائے لاری ہو گئی۔  
 ”میں پلٹنے سے منع کر دوں۔ میں ابھی چائے پی کر رہی تھی۔“  
 بات کرنے کے لئے خود بخود کمرے کے دروازے تک آئیں اور نزل کو گواڑی۔

”نزل پر گیا چائے صحت جاننا میرے لیے۔“  
 ”نہیں۔“ نزل نے بچے سے جھاک کر کچھ کہنا چاہا۔  
 ”ایجنٹ وکٹن کچھ نہیں لڑا میں چائے پی کر رہی تھی۔“ وہ دروازے پر  
 گھڑی تھیں کچھ تھذیب کی۔

”میں چائے صحت جاننا میرے لیے۔“  
 نالی بانی ہونے کی وجہ سے ہانور ان کا سرت اجازت کرتی تھی۔  
 ”ہاں میں چلوں گی۔“  
 وہ انہوں پر دیکھا پٹتے رہی تھیں۔  
 ”وہ تم کو تو بھونپ رہی ہو۔“

”اب۔“  
 ”کوئی مسئلہ تو نہیں۔“  
 ”میں۔“ وہ سرت دروازے پر کھڑی تھیں۔  
 ”کوئی پرہیز ہو تو مجھے جانا نا مجھ۔“

”کی۔“  
 ہانور نے انہیں کھڑے کر کے کہہ کر کھڑی ہو گئی تھی۔  
 ”اور ہاں۔“ انہوں نے بیٹھے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔  
 ”وہ سرت دروازے سے نکلتی تھی خاصی کپ شپ ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے بورت تو نہیں ہوتی ہوگی۔“

ہانور مسکرائی۔  
 ”میں نے سرت دروازے سے نکلتے ہوئے ہیں تو کچھ بے تکلفی ہو گئی ہے۔“  
 ”سرت دروازے سے نکلتے ہوئے ہیں تو کچھ یاد کرتے ہوئے ہیں۔“  
 ”میں بتاتا تھا انہوں نے۔“  
 ”اور کیا بتاتی ہیں نہیں۔“  
 اوں نے دوپٹے کا پینڈا تھ سے بھجور کر ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں جکڑ لیا تھا اور براہ راست ہانور  
 کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

”کی۔“  
 ہانور نے آنکھوں میں جھرت تھی۔  
 ”پرہیز مطلب ہے کہ تمہاری اور ان کی بات میں فرق ہے۔ وہ میری تو تھا ہے تمہاری دیکھی کی باتیں تو نہ

بلکی سی مسکراہٹ نے اس کے لیوں کو چھوڑا اور وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔  
 "اور پھر خضر ہے نا۔"

اس نے کندے پر تن بیٹھ کر سبک میں رکھے  
 اس روز اس نے کتنی اوری اور حتیٰ لیجے میں کھاتا۔

"اے اہم خود کو بھی اکیلا مت بھٹا اور بھی مجھ سے کچھ مت چھپانا۔ ہر مسئلہ ہر بات تم مجھ سے ڈسکس  
 کر سکتی ہو اور جہاں تک دنیا کی بات ہے تو اپنی لڑکیاں تمہاری جگہ تمہیں سے سٹیں یہ یقین بھی نہ کھو نا۔ تم  
 نہیں جانتیں کہ تمہاری محنت کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔ میں بار بار اظہار محبت کا قائل نہیں ہوں لیکن اتنا چاہتا  
 ہوں کہ تمہارا اظہار پیشہ مجھ پر رہے۔ کوئی انداز اس اظہار کو مت چھڑاؤ۔ تمہارے ذکاوت میں بے نظریہ حرکت کھا بھی  
 نہیں ہے۔ پہلے پہل یہ سنا کہ لیکن میں بار بار مدعا میں نہیں آتا۔ گد گد نہ کرنا اور عمل مجھے اچھا لگا میں نے اس سے  
 جانا کہ تم میرے لیے کتنا سچی ہو لیکن بار بار اس طرح کا رد عمل چکرار کھیتا ہے۔ میں چاہوں گا تم ہمیشہ میرے  
 لیے اپنے اندر ایک ایسا یقین رکھو جسے کوئی مت چھڑاؤ نہ کرے اور میں تمہیں یقین دلانا ہوں تاکہ وہ خضریٰ زندگی میں  
 صرف باہور کی کھانچا نہیں ہے اور کسی کی نہیں۔"

وہ خاموشی ہو گئی مگر اور اس نے کچھ نہ کھا چاہا لیکن خضر نے اسے روک دیا۔  
 "کتنی سوری تمہیں۔"

اس نے ایک لمبی نظر اس پر ڈالی اور مسکرایا تھا۔  
 "میں نے تم سے کہا ہے کہ کن مجھے اچھا لگا۔ کم از کم مجھ کو اتنا تو پتا چلا کہ تم مجھے خیر چھوڑو۔" اس نے بات  
 اور حوری چھوڑ دی تھی۔

"میں تم سے کیا کہہ رہا تھا تو اب بھی کہتا ہوں تم خود مت سمجھو وارہو اور تمہیں سے سب کتنے  
 کی ضرورت نہیں ہے پھر میرے پاس تمہارے لیے کتنے کچھ ہے بہت سارے خوبصورت لفظ۔ بہت سے  
 جذبے بہت دل آویز اور دلچسپ۔ وقت گزرنے پر میں سب تمہاری بزرگوں کا جو تمہارے لیے وہ تمہارے لیے ہی  
 ہو گا۔ کسی ایک لفظ کی خیانت میں ہو گئی کوئی وقت سے پہلے ایک کوئی آرزو مت کرنا۔ بار بار تجدید محبت کی  
 ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں جذلوں میں محبت ہوتا ہے۔ میرے جذلوں میں محبت نہیں ہے میں صرف اپنا  
 ہی نہیں سوچتا۔ میں ان سب کو بھی دیکھتا ہے جو اس گھر میں رہتے ہیں۔ میں ان کے لیے اچھی مثال بناتا ہے۔  
 باہور نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔  
 "دفعہ آخر مجھے۔"

"اچھا! میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ تم سے یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا لیکن لڑکیاں  
 نازک ہوتی ہیں، کمزور ہوتی ہیں۔ جلد بھگوان ہو جاتی ہیں۔ چاہتی ہیں کہ وہ محض جس نے اپنا دل۔  
 "میں انکی نہیں ہوں۔"  
 اس نے خضریٰ کی بات کا تندی ختمی اس کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔  
 "پھر کیسی ہو۔"

خضریٰ آنکھوں میں شرارت تھی۔  
 "مجھے نہیں پتا۔"

اس کی آنکھوں میں پانی پھیل گیا تھا۔  
 "کی بات ہے۔"  
 خضر نے اسے دیکھا۔

"میں جانتا ہوں تم کیسی ہو اور جتنا میں تمہیں جانتا ہوں تم خود بھی میں جانتی ہوں۔ بس اپنا یقین بھی نہ کھو نا۔"

کرتی ہوں گی۔"  
 باہور نے پہلی بار کہا کہ اس مجلس انداز سے بیزاری محسوس کی لیکن اس نے اپنی بیزاری کو چھپا کر  
 نارمل انداز میں جواب دیا۔

"میرے خیال میں اس سچ سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ باہمی دلچسپی کی بات تو کل ہی آتی ہے لیکن ابھی تک  
 کوئی مسئلہ زیر بحث نہیں آیا۔ انہوں نے مجھے اپنے حلقہ میں لایا ہے اور مجھے کھانا سکول کے حوالے سے  
 ہو جاتی ہے۔  
 باہور کو اس کا مجلس سمجھ آیا تھا۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ تمہیں کہ مسز مراد نے اس سے کیا کیا تھیں کی ہیں۔  
 انہوں نے تمہیں سنا چکا ہے۔  
 وہ توں بات کھل گئے تھے اور ایک بار پھر وہ بے پلو کا لہجہ لے لیتے اور کھولنے کا شغل شروع ہو گیا تھا  
 "سکول کے حلقہ کیا۔"

باہور بات کر کے چھٹائی ناہم اس نے بڑے سلیقے سے جواب دیا۔  
 "کی کہ پڑھا ہی اچھی ہے۔ سرے اس سکول کے مقابلے میں کھری زیادہ ہے۔ نیچر ڈھنکی ہیں۔"  
 "وہاں اچھا۔"  
 مس ہانے سمجھ نہ جالے جب کار کا وہ اسٹارٹ بحال کیا۔  
 "پاؤں تو ہے۔"  
 وہ مسکرائی۔

"اور یہ سب ڈاکر صاحب کی وجہ سے ہے۔ وہ اگر سخت ڈسپان نہ رکھیں تو نیچر ڈھنکی کرنے کے بجائے  
 بائوٹی میں سارا وقت۔ وہ تم سے پہلے سائنس میں تھیں پھر تم کی نا اس کا تو کلاس میں جاتے کوئی ہی نہیں چاہتا تھا  
 ڈاکر صاحب راز بننے کے کہ ان میں گئے اور وہ کمرے سے باہر نکل کر کبھی کسی بچہ کی کپاس کھڑی ہوتی  
 کہ اس۔"

انوں نے کن انکھوں سے باہور کی طرف دیکھا لیکن باہور کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ حیا نہ  
 بات نہ رہی تھی۔  
 "بڑی عجیب لڑکی تھی۔"  
 مس ہانے دور سے برکھا ہوا اٹھایا۔

"سب چلوں اٹھانے شاپنگ کے لیے جانا۔ بائیو کے لیے کچھ کتابیں لینی ہیں۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت  
 تو تھا۔"  
 "میں اب باہمی کچھ نہیں چاہتا۔"  
 "میرے لیے تم کچھ نہیں ہی ہو۔ کسی باتوں پر اعتبار مت کرنا رہا۔"  
 چلے چلے انہوں نے لپٹ کر اسے دیکھا۔  
 "ڈاکر صاحب تمہاری بہت تحریف کر رہے تھے۔"  
 "کس بات کی۔"  
 باہور کو تڑپ ہوئی۔

"تمہارے وہ آف ہینڈنگ کی۔ کہہ رہے تھے بہت محنت لیجئے پھر ڈاکر صاحب بہت اچھے آدمی ہیں  
 وہ کہتے تھے کہ بڑی سے پیچھے آئی باہور کو دیکھتے ہیں لیکن بہت کھول کر ہار نکل گئیں۔ باہور کو کچھ دیر کھڑی رہی  
 مراد کہتی ہیں کہ ڈاکر صاحب اچھے آدمی نہیں ہیں۔ حنا باہمی کہتی ہیں کہ وہ اچھے آدمی ہیں اور سب میں  
 نے سائنس بچہ کے حلقہ میں کچھ کہا ہے یا مسز مراد۔ سر حال ہو گئی ہو گئے کیا۔

I am strong enough to say No



میرے ساتھ تھا وہی ایک سایہ مہواں

کہا تھا بلکہ ہمیشہ مبشر کو ہی کہتے تھے اگر



”فوج گمہ رہے تھے کہ اسفریہری فیکٹری کیوں نہیں سمجھ لیتا۔“ سے خاموش دیکھ کر عذرا بیگم نے کہا تو اسفر نے کسی قدر حیرت سے انہیں دیکھا اور کہنے ہو گئے۔  
 ”میرا نہیں خیال کہ ایسا جان حقیقتاً کیا چاہتے ہیں۔“

”عذرا! ایک نیم کی بات سمجھنا نہیں سکتے تھے اس لیے اپنا خیال ظاہر کیا۔ عذرا! بیگم نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے لیکن پھر خاموش ہو گئیں۔ سہارے میں صلااح صلاح الدین کی کواڑ اُن کی بھی وہ رمضان کو لارہے تھے۔  
 ”ہاں! کیا رمضان نے ابھی تک چائے نہیں دیا؟ میں نہیں ہوں اور میں جانتا! اپنے ایسا جان سے بات کر کے تم کہیں چلے نہ جانا چاہتے تھے۔“ عذرا ابھی بات کرنا ہے۔“ عذرا! بیگم ابھی کہیں تو دیکھ کر روٹی کر کے کے وسط میں کہنے ہوئے۔

”جانتا نہیں ایسا جان کو کیا بات کرنا ہے؟“ عذرا پریشان ہی تھی۔ کیا اس کو لائیو مسئلہ یا پھر جیسی کا۔ اور ایسا جان نے کیوں بلایا ہے؟ کیا صرف لیڈروں کے لیے لیکچر کی کماہد بھی بھجوا یا جاسکتا ہے۔ کبیں علینہ کاغذ نہ ہو اور ایسا جان نے کیا بیگم کو انہوں نے رکھ لیا ہو کھول کر حلالہ کا ۱۳۴ نہیں پڑھا لیکن کونسا چاہتے تھا۔ اس سے پہلے تو یہی ایسا نہیں ہوا تھا اور پھر عذرا کو کہہ رہے تھے اور اچھا بیٹا ان کی یاد آگیا۔ اگر کر کے ان کے کر کے اس کو رکھ دیا کرتی تھی پھر ایسا جان کے ساتھ یہ خط لے گیا اور علینہ سے دو تیسے اپنے بیٹوں کا اظہار کرتی ہے۔ محبت کے اظہار کے برزوں رکھ ہیں اس کے پاس اور برزوں رکھ ہیں۔“ وہ ایک دم کھبر سے گئے۔ ورنہ تک نہیں سے برش اٹھا کر انہوں نے جلدی جلدی ہاتھ دھنیا ہاتھ چلائے اور بار بار نگل آئے۔ میں صلااح صلاح الدین چائے لے رہے تھے۔ قریب ہی بیٹا بیگم کھڑی تھیں۔  
 ”سلام علیکم ایسا جان! اسفر نے قریب آکر سلام کیا۔

انہوں نے سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیا اور اشارے سے بیٹھے کے لیے کہا۔ اسفر نے عذرا بیگم کی طرف دیکھا۔  
 ”آپ بیٹھے اپنا جان!“

”ہاں۔“ وہ چونک کر بیٹھ گئے۔ اسفر نے بھی ڈانٹک جیڑا اٹھا دیا اور عذرا بیگم کے قریب رکھ کر کہنے لگے۔ میں صلااح صلاح الدین چائے پیتے ہوئے گا۔ یہ کہے ان پر ایک نظر ڈال لیتے تھے۔ ان کی خاموشی سے اس کو گھبراہٹ ہونے لگی۔

”جانتا نہیں علینہ نے کیا لکھا ہو۔ سرت نارض ہوگی۔“ عذرا کرچی جاتے جاتے رہ گئے تھے۔  
 ”میرا حال اب انشاء اللہ ایک دو روز میں کرچی چلا جائوں گا اور اس کی ساری باتیں اور کچھ لوگوں کا لیکن اب جانتا نہیں ایسا جان کیا کہتے ہیں۔ ساموں جان اور لال جان کو دیکھا جانتا میں سنائیں گے اور کیا۔“ میں جیسے یقین تھا کہ خط علینہ کافی ہو گا۔

”میرا حال جو ہو رہا ہو۔“ انہوں نے کہنے سے اچکا۔  
 ”جانتا! تمہارے لیے بھی چائے بنا دوں ایک کپ دیے میں نے رمضان سے کہا ہے ناشتے کے لیے ابھی سب نے ہی ناشتا کرنا ہے۔ میں تمہارے ایسا جان نے اور میں نے کر لیا ہے۔“  
 عذرا اب تک کو بھی میں صلااح صلاح الدین کی خاموشی سے کھربا ہو رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی ہی بات کی۔  
 ”میں ناشتے کے ساتھ ہی ایک کپ چائے لے لوں گا ابھی کر رہے ہیں۔“ میں صلااح صلاح الدین نے ایک مسخر بھری نظر ان پر ڈالی۔

”جانتا! بیگم! کچھ پانی کا یہ مطلب نہیں ہو گا کہ بارہ بجے تک سوتے رہیں۔ چاہیے ان کو دیکھانے جا کر یہ مسلمانوں کا گھر ہے۔“  
 ”میں متیرا ہوا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ نماز کے بعد سو لیٹ جاتے ہیں کچھ دیر کبھی تو پڑھ رہا ہے اور

”اچھا! ہم کہیں ہیں۔“ مدھڑے رات یوں ہی فرائض کی تھی۔ دونوں تیار کر دیں۔ آپ تو پوری کھاتے نہیں کسی نے میں سے جنوں کے ساتھ پر اٹھنا ہوا تھا۔“

انہوں نے عذرا بیگم کی بات سن کر ہی ان کے ہونے اسفر نے دیکھا اور آخری گھونٹ کے کچانے کا کپ نیل پر رکھا۔  
 ”تو آپ آگے واپس۔“ ہوئی بڑی دوست کی۔“  
 ”جی۔“ اسفر نے اس کی سے کہا۔

”تو اب نوکری تو عموزی جا رہی ہے۔ کیا امریکہ جانے کا ارادہ موقوف کر دیا یا امریکہ والوں نے وہاں آپ کے راضے پر پابندی لگا دی ہے۔“ اسفر کے چہرے پر سرفی ہوئی لیکن انہوں نے بدستور دیکھ کر موزب سمجھے میں جواب دیا۔

”امریکہ کا راسیس ہو رہا ہے لیکن ظاہر ہے اس میں اس وقت گے گا۔“ اس لیے میں نے سوچا فارغ رہنے کی بجائے جاب کر لوں۔“ عذرا بیگم کا دل ذوب سا کیا۔ وہ دیکھ کر پہلے میں خوشی پر کھنکھارنے لگی۔  
 ”ارادہ ترک کر دیا ہے۔ آپ مجھے بے مبادل ہی ہو کر مل کے فرش پر بیٹھ گئی۔  
 ”ہوں۔“ میں صلااح صلاح الدین کا انہوں ”ایسا اور میں خیر تھا۔“  
 ”رمضان۔“ انہوں نے آواز دی۔

”جیسے کرے میں کچھ کیسے کیا اس ایک خطا رہا ہے۔“ آؤ۔“ بیگم اسٹر کا دل زور سے دھڑکا۔

”اور اب کیا امکشافات ہوتے ہیں۔“ اس نے ایک کمری ماسٹر کی۔

”میک صاحب کے کمرے کا آپ کا لائنٹنٹ لیڈر ٹیک کیا تھا۔ پوسٹ میں غلطی سے کل رات گھر پر جا رہا تھا کہ انہوں نے مجھے دیا۔“ میں صلااح صلاح الدین نے رمضان کے ساتھ سے خط لے کر ان کی طرف برعالب۔

”وہ فیکٹری کا علینہ کا خط تھا۔“ اس نے جی پر میں پہلے بار اسفر نے ریٹیکس ہو کر میں صلااح صلاح الدین پر ایک نظر ڈالی تو اسفر کو غصے میں دیکھ کر کہنے لگے۔  
 ”نقشی خواہش میں آپ کو۔“ آؤ ہزار تو ہزار۔“

”جی! میرا میں تقریباً آٹھ ماہوں سے لگاتار اس پر ایک نظر ڈالی۔“

”کیمر کو میں جانتا کر تھا۔“ چلو میں اس پر بندہ رہا۔ وہ کرچی کا چکر لگاتے ہیں۔

”میک صاحب کے کمرے سے۔“ میں صلااح صلاح الدین کھڑے تھے۔  
 ”ہر آپ کے بچوں کو نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ لوگ مجھے بتائیں گے کہ میں بیٹوں کو اپنے ساتھ کلام کر لوں۔“

”چین شالی پر شائیں نمودار ہوئیں۔“

”بیٹوں کو خود غلام میں کیا۔“ انہوں نے ایک بھریہ نظر اسفر پر ڈالی۔

”میں صلااح صلاح الدین آؤں ہزار عذرا مجھ سے کہیں اور میری فیکٹری میں نوکری کر لیں۔ نوکری ہی تو کرنا ہے آپ کو کہیں بھی ہوگی۔“ اس نے کم کلم صاحب مجھے حضرت کو مجھے مشورہ دینے کی ضرورت میں ہوئی۔

”ہرے کارنگ بڑی تیزی سے اسلندرا ابھی سے کھلا کر بار بار دیوں کی طرف دیکھا۔

”آپ بھی میں صاحب کمال کرتے ہیں۔ کچھ بچا ہے۔“

”رمضان۔“ انہوں نے آواز دی۔ عذرا اب تک عمل نہ کر سکیں۔

”ذرا سیر سے کو گاڑی نکالے۔“ وہ کھڑے ہوئے اور عذرا اب تک کی طرف دیکھا۔  
 ”میں ذرا حاجی صاحب کی طرف جا رہا ہوں۔ کھانے پر انتظار مت کیجئے گا۔ دن کا کھانا میں ہی ان کے ساتھ کھاؤں گا۔“

انہوں نے سر جھکا کر بیٹھے اسفر کی نظر ڈالی۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے لیکن پھر کوئی بات کیے بغیر تیز

تیرہ آدمیوں سے پوریج کی طرف بڑھ گئے۔ عذرا بیگم کے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ اسفر کے ہاند پر رکھ کر گویا میاں صلاح الدین کے الفاظ کا کھوکھلا چاہا۔ اسفر نے خود کو مشکل کیڑا کرتے ہوئے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

”میں! تمہارے ابا جان میں اس کی کبھی بات کو ماننا نہیں کرتا۔“  
اسنے ہاند پر گئے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر انہوں نے بولے۔ دیکھا۔ اس سے انہیں اپنی ماں پرست ترس آیا اور ان کا دھیان ہٹانے کے لیے وہ منہ خال کے متعلق پوچھنے لگا۔

”ہی جان! ابا جان جلتے گئے کیے۔ سو نے اچاری بھائی بھائی تھی۔“  
اسفر کو اس کی پیشہ جو کہ قریب بل کی اور قریب اگر سلام کیا۔  
”کیسی ہو گئی؟“ اسفر نے اس سے ہاتھ لایا۔  
”جی ہاں! ٹھیک ہوں بھائی! آپ ٹھیک ہیں؟“  
”ہاں! ٹھیک۔“

”جی! بیٹا! تمہارے ابا جان تو ہاتھ کر چکے ہیں اور کسی کام سے چلے گئے تم ہاتھ لگاؤ۔ ساڑھس دس بج رہے ہیں۔ جاتی سب کو بھی بلاؤ۔“

”جی! ای جان! ہاتھ تو تیار ہے بس۔“ وہ مڑ گئی۔  
”آپ نے مجھ بات نہ سمی! ای جان! اسفر نے اسے فرماتے پوچھا۔  
”ہاں!۔“ انہوں نے اسفر سے نگاہیں نہائیں۔  
”آپ ہم سے متعلق ہی بات کرنا تھی۔“

”کیا بات۔“  
اسفر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔ تب ہی سمن کی ہاتھ پوچھتی ہوئی بکن سے باہر آئی۔ سمن کو یاد کر کے انہوں نے ہنسنے لگا۔ ہاتھ ملانا جو بھی کرے سے نکلا تھا۔

”کیسے ہو! اسفر نے خوش دلی سے پوچھا۔  
”میں ٹھیک ہوں۔“ ہنسنے لگی۔ سمن کی سچ کر تھیل کے گرد بیڑا گیا تھا۔ رمضان جلدی جلدی ہاتھ لگا۔ اسفر کو سمن کی سچ کر تھیل کے گرد بیڑا گیا تھا۔ رمضان جلدی جلدی ہاتھ لگا۔ اسفر کو سمن کی سچ کر تھیل کے گرد بیڑا گیا تھا۔

”میں نے سمن کو سمن سے ملنے کے لیے گریہ لیا ہے۔“ سمن نے بتایا۔  
”ہاں!۔“ اسفر نے اسے سار کیا۔  
”تمہارا انعام کیا کالو ہے؟“

”مجھے اور دادا کو ایک ایف سی ملے۔“  
”صرف تمہیں اور دادا کو اور باقی سب۔“  
”ہاں!۔“ اسفر نے سمن کی سمن سے کہا۔

”جی! سب کو ابا جان جانتے ہیں۔ سمن نے ان کے لیے ایک کرا کے لے آئیں گے۔“  
”نیکھا جی جان! ابا جان تو کتنا عطر ہے۔“  
”میں نے قندہ لگایا۔ کھوکھلا سا قندہ تھا۔ سمن نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر تھیل پر پیش کرنے لگی۔

”جی! ای جان! آپ کدھ کہہ رہی تھیں۔“  
”اور دادا کو کدھیں تھا کہ پھر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔“

”میں! احم کی بات کرتی تھی تم سے بیٹا! اس کے رشتے کے لیے کدھ لوگ آئے ہیں۔“  
”آپ جانتی ہیں انہیں؟“  
”نہیں! جانی صاحب کے توسط سے رشتہ کیا ہے۔ تمہارے ابا جان تو تقریباً راضی مندی ہیں۔“ تفصیل بتا کر انہوں نے کہا۔

”نہیں! مجھے خداوند کچھ نہیں سمجھ گئیں۔“  
”فعلیہ ڈولر کے آگے کے بعد ہی ہو گا۔“ اسفر نے ان کی طرف دیکھا۔  
”ہاں! تمہارے ابا جان کی کہہ رہے تھیں لیکن میں چاہو رہی تھی بیٹا! اگر کسی اور ذریعے سے بھی لڑکے کے خاندان داخل ٹھیک کر ڈیڑھ کے متعلق معلوم ہو جاتا۔“

”ٹھیک ہے جی! آپ! کلر نہ کریں! میں بتا کر ابا جان لگا۔ آپ مجھے ایڈریس اور نام وغیرہ دیتے تھے گا۔“  
انہوں نے عذرا بیگم کو کسلی دی۔ سمن اور میشراموش پیشان کی بات سن رہے تھے۔  
”ہوئیے جانی عبد! اسرار اور ان کی بیگم تو بہت تعریف کر رہی ہیں ان کے لڑکے کی۔“ عذرا بیگم نے آہستہ سے

”جی! خود کو کسلی دی۔  
”انتاہی اچھا تھا وہ لڑکا تو بہت خیر خیر اختر سے کیوں نہ شادی کر دی! اس کی۔“ میشراموش نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے ڈانٹا۔  
”آپ نے تمہاری بیوی سے۔“  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔

”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔

”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔

”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔

”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔

”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔

”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔

”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔  
”جی!۔“ سمن نے کدھ کہا۔

”میں خیر کاؤ تو نہیں چھوٹی چارہ سے، البتہ کل اچھی کے لیے کھک پچانے جا رہا ہوں۔ جالے مچ مع کماں نویداری کی ہے۔“ مہتر نے سمن کے کان میں سرگوشی کی۔  
 ”تمہارے سر ازل میں دھاوا بولا ہے۔“ سمن نے پوری نکال کر اس کی پلٹ میں رکھی۔  
 ”پوچھ کر کھک کی امید نہ رکھیں مجھ سے۔“ اس نے اس طرح کہا جیسے پچاسیایا صلا اللہین کی مدد کو جا رہا تھا۔ سمن ہنسی مانی۔

”یہ تم دونوں کیا سرگوشیاں کر رہے ہو۔“ سمن ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔  
 ”مجھ نہیں بھائی، آپ نے بھائی تو چھپیں۔“ سمن نے بتائی ہے۔  
 ”ہی جان، یہ والد محترم صاحب کی اپنی کتاب طے کرنے تو میں گئے۔“ مہتر کو کچا کھکسی خیال آیا تو اس نے ہاتھ میں پڑا اولڈ پلٹ میں رکھ دیا۔

”بھئی اگر دعا نہ کروں کہ رشتے طے کر آئے ہیں اس جرمن پر سالار سے۔ یوں میں ان کی عادت ہے دھماکا کرنے کی۔“

”آخر ہر طرف دھماکے ہوتے رہتے ہیں تو وہ کیوں پیچھے رہیں۔“  
 اس کے جلتے انداز پر سمن سے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی جبکہ مڈرا بیگم نے فوراً ”زیر کی۔“

”میں وہ تو اپنے کسی کام کے لیے یہاں صاحب سے ملے۔“  
 ”وہ کھلے جس کام سے ملے ہوں لیکن اپنی جان ایک ماتہ بتا دیجئے گا ان کو کہ اتنی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔“

اسے اپنی طرح لڑنے میں کھلنے نہیں دیا گیا۔  
 ”خدا کا خوف رکھو، انہیں کس لڑنے میں دیکھا ہے۔“ مہتر صاحب نے غزالہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ حاتی صاحب کی جگہ اور حاتی صاحب صدمہ جاتے ہیں غم پر۔

”چاند کا ٹکڑا ہو یا سوچ کی کرن، مجھ پر تو ظلم ہو گیا۔“ میری ذات کے تو پرچہ اڑ گئے۔ ”وہ بولے سے بیڑا دیا۔“

”اے ارباب غصہ، تھوک بھی دو ہو کیا جو کہو تو تھا۔“ سمن نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”لیکن بھائی اس وقت میں اپنی بات نہیں کر رہا، مجھے اتنی فکر ہے۔“

”شاء اللہ، کچھ نہیں ہو گا تمہارے فکر پر۔“ سمن نے اسے تسلی دی۔  
 ”اگر وہ لوگ آتے ہیں تو پھر ایک دن، ہر حال میں ان کو رخصت کرنا ہی ہوتا ہے اور اگر آتے نہیں تو پھر چارہ ہے۔“

”مجھے کسی ڈور سے اسے بھائی کہ اباجا جب فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر چارہ پڑا بھلا مجھ نہیں دیکھتے۔“ مہتر بھٹن ہو گیا تھا۔

”میں خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔ تمہارے معاملے میں تو انہوں نے خوب دھمک دیا کہیں نکالا ہے، داد دے گا۔“

”تم ان کی بے بندگی۔“ بھٹی اپنی جان واپس آتی چاند کا ٹکڑا ہے۔  
 ”سمن نے آج پھر بہت دنوں بعد کے لیے طرح مایا صلا اللہین کی حمایت کی۔“

”آخر تم نے بھی تصویریں تو دیکھی ہیں۔“  
 ”چھ تصویریں آگئیں۔“ سمن نے شوق سے پوچھا۔

”ہاں میں ابھی دکھا رہا ہوں آپ کو۔“ سمن نے چوں کا ڈور اپنی طرف کھینچا۔  
 ”تو جیسی کسی کی غزالہ تھیں۔“ سمن نے بے تکلفی سے پوچھا مہتر جھپٹ گیا۔

”میں نے سرسری سا دیکھا تھا میں غصہ کی ہے۔“  
 ”یوں ہی ہے۔“ سمن نے اسے چڑایا۔

”میں نے تمہارے کمرے کے دروازے سے جھانکا تھا۔“ مہتر غور سے تصور دیکھ رہے تھے۔  
 ”تو تمہاری مہتر کے لیے ہی تصور میرے کمرے میں رکھ لی تھیں کہ اچھی طرح دیکھ لوں کہ مستقبل میں جو بلا

”مہتر سرنہی جا رہی ہے۔“  
 ”مہتر جھپٹ کر مہتر کے کرتے ہو۔“  
 ”تو تمہارے نام لیا کرو اس کا۔“

”وہ نام تمہاری زندگی میں شامل ہو چکا ہے۔“ سمن نے سنجیدگی سے کہا۔  
 ”اب تم اور وہ الگ نہیں ہیں، آئے والے دنوں میں تم دونوں ہی ایک دوسرے کی خوشیوں کے ضامن

ہو گے۔“ مہتر اس کا خیال رکھنا ہو گا وہ تمہارا خیال رکھے گی۔“  
 ”بائی شل و صورت تو فارسی پڑھتی ہے۔“

”جی۔“  
 ”مہتر شرمندہ سا ہوا پتا نہیں کیوں اس ذکر پر لا شعوری طور پر چڑھا تھا، حالانکہ ذہنی طور پر اس نے اس

حقیقت کو قبول کر لیا تھا۔ اور پچھلے دنوں میں کئی بار غزالہ کی تصویر دیکھی تھی اور تصور دیکھتے ہوئے دل میں

اور کس گلوگ کی سی ہوتی تھی۔ حالانکہ تصور دیکھ کر کچھ تو اسے غصہ آیا تھا کہ غزالہ کی صورت میں کی شرات ہے۔ پھر

غور و افکار تھی۔  
 ”تو صورت سوٹ، دلکش آنکھیں، دل آویز نقوش، وہ کتنی ہی دیر تک محبت سے اسے دیکھا رہا تھا۔ اور اندر

میں پھر پھر اس کی چھوٹی سی تصویر

”مہتر نے غزالہ کی تصویر دیکھی تھی اور تصور دیکھتے ہوئے دل میں

”آئی آپ بھی آجاسے۔“  
 ”ہاں، بس ایک دھڑکی ہیں۔“

”رہنے، رہت ہیں۔“  
 ”مہتر اب تک سے اسے دیکھا تو وہ رمضان کو چھ ماہ بند کرنے کا کہہ کر بیٹھ گئی۔ تب ہی فون کی بیل ہونے

”مہتر نے غزالہ کی تصویر دیکھی۔“  
 ”مہتر غزالہ کا ہے۔“

”مہتر اب تک سے اسے دیکھا تو وہ رمضان کو چھ ماہ بند کرنے کا کہہ کر بیٹھ گئی۔ تب ہی فون کی بیل ہونے

”مہتر نے غزالہ کی تصویر دیکھی۔“  
 ”مہتر غزالہ کا ہے۔“

”مہتر اب تک سے اسے دیکھا تو وہ رمضان کو چھ ماہ بند کرنے کا کہہ کر بیٹھ گئی۔ تب ہی فون کی بیل ہونے

”مہتر نے غزالہ کی تصویر دیکھی۔“  
 ”مہتر غزالہ کا ہے۔“

”مہتر اب تک سے اسے دیکھا تو وہ رمضان کو چھ ماہ بند کرنے کا کہہ کر بیٹھ گئی۔ تب ہی فون کی بیل ہونے

کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ ممان خان سے آئے تھے۔

"ممان خان نے مجھے کیا ہے؟"

"بلند بخت ہے کہ میرے دیار فون آج کا ہے۔" اس نے بڑے چھا۔

"سورہ یہ پچھو کی طبیعت اچانک خراب ہوئی تھی۔"

"کیا ہوا؟" شاہر بہت متنبہ ہو گیا تھا۔

"نہیں، میں نہیں سمجھتا۔"

"بہتر ہے کہ وہ جلد ہوئے تھے۔"

"میں۔ میں دیکھ سکتا ہوں انہیں۔ مل سکتا ہوں۔"

"اباگل سے متواشاہد۔"

"سورہ بھائی۔"

"شاہر نام یاد ہو گیا تھا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ سورہ کو، لیکن یا ابھی وقت نہیں آیا اس کا لیکن بہت جلد تہہ صرف ہو لی۔ قلم چاکو کے بیچے کی حیثیت سے آگے بڑھنے سے طوع بھی۔" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا کہ خود انہیں یقین نہیں تھا کہ ایسا بھی ممکن ہو گا یا نہیں۔ خاص طور پر پچھو کی اس

ذہانت کے بعد۔

"اور اب سب کو رخصت کر کے وہ سیدھے پچھو کے پاس ہی آئے تھے۔"

"اگر آپ تہہ محسوس کریں ہوں تو انہیں کہاؤں کہ چلا ہوں آپ کو۔"

"نہیں میں اب بہتر ہوں۔"

"زہنت خاطر نے فوراً انکار کر دیا۔"

"دوپہے میں نے محسوس کیا کہ وہ دیکھ لے ڈھنڈی میں اگر لیڈی ڈاکٹر ہو اس وقت تو لے آئے جا کر۔"

"نہیں نہیں میں نے کہا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ بیٹا یا ہر کسی کو بھیج کر منع کر دو۔" انہوں نے عظمیٰ

کہہ کر کہا وہ فوراً گھڑی ہو گئی۔

"پچھو۔"

"عظمیٰ کے جانے کے بعد شاہر نے ان کی طرف دیکھا۔"

"آپ کو اچانک کیا ہوا تھا کہ دیکھا تھا آپ نے آپ کچھ کہہ رہی تھیں کہ اسے بھگا دو اسے اور اس گھوڑے۔"

"پچھو کا دل بے چین ہو گیا۔"

"زہنت خاطر کا دل بے چین ہو گیا۔"

"ہاں ہاں انہوں نے اسے دیکھا تھا عظام مرزا کو اس کی انہی نظروں کو اور پھر۔ پھر جیسے انہیں کسی بات پر اصرار نہیں رہا تھا انہوں نے شاہر کو اپنی سمت بڑھنے دیکھا تھا۔ اور سوچا تھا کہ شاہر وہاں شاہر سے بھاگنے کے لیے تھوڑے سے دور سے سکا ہے۔ نان و مکان کی قیود سے آزاد ہو گئی تھی وہ وقت سے جیسے پیچھے کی طرف ہی زبردستی

گیا۔ نہیں میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا تھا میرا سر یکدم جھکا رہا تھا۔ میرے حواس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ بے ربطہ سے چلتے چلتے میرے منہ سے لیکن مجھے نہیں خبر کہ میں نے کیا کہا۔"

"انہوں نے گناہیں جھگڑنے کے لیے کہا اب وہ شاہر کو کیا بتائیں کہ ان کے قصور سے کس حواس ان کے مانے سمجھ کر کیا تھا وہ زندگی بھر کا دکھا لیکن جس کی زندگی بچانے کے لیے وہ اس کی منت کر رہی تھیں۔ میں نے سمجھا شاید آپ نے شاہر کو دیکھ کر کچھ انکار کیا ہے۔"

لے کر گھاس پاس ہی میز پر رکھ دیا۔

"پچھو کی اس بات سے وہ کہیں سے آپ کو۔"

"میں چند اس وقت ہی میں چادر ہا۔"

"وہ عظمیٰ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی۔"

"میری طبیعت خراب ہو گئی تھی تو کوئی اور چلا جاتا اور۔"

"لی لی جانے فون کر کے بتا دیا تھا آپ کی طبیعت کا اور کہا تھا کہ آپ کو آئیں گے۔"

"اسی علاقے کا راج تھا کہ میرے بعد وہ جس کے لیے جاتی تھی تو پھر سرسرا لے کوئی نہ کوئی لے جاتا تھا۔"

"ساتھ میں ساس سر کے جوئے، مٹھائی، پھل، اپنی حیثیت کے مطابق لے کر جاتے تھے۔ شاہر نے فون میں

دوڑی مگر آج تھا۔ اور اس نے کہا تھا کہ۔"

"پچھو میرے کہیں وغیرہ اور زارا کو فون کریں کہ آجائے میں ایزی مل نہیں کرنا اور۔"

"لیکن لی لی جانے ڈانٹ دیا تھا۔"

"فصلی کا میں تھ کر میں تو ساری راتیں کیوں گی پچھو ہمارے آیا کا مگر ہے کسی غیر کا نہیں کہ تمہارا

ایزی مل نہیں کرتے ہو۔" اور وہ منہ نہ کر گیا تھا کہ میرا حال اسے کرتا ہی رہا تھا جو لی لی جانے لے گیا تھا۔

"پچھو آپ اپنی چپ چپ لہرائیں۔" عظمیٰ غوراً نہیں دیکھ رہی تھی۔

"خوش رہا کریں۔ شہر بھائی کی شادی میں آپ ہنسی ہوئی تھی ابھی لگ رہی تھیں۔ شاہر نے آپ کی نظر

بٹائی تھی جب آپ سزا بندی کے وقت شاہر نے بھائی سے بات کر رہی تھیں اور دس رہی تھیں۔

"خوش رہی رہی ہوئی میری جان مجھے بھلا کیا ہو گا؟"

"ہاں تم کو نہیں لیکن پھر میں جب آپ کو دیکھتی ہوں تو میرے ذہن میں اسی کا تصور آتا ہے کہ اگر ادا ہو

کی کوئی جسم شکل ہو تو آپ جیسی ہو۔"

"ابا گل ہو تم؟" سب کے زہنت خاطر میں دیر۔

"نہیں پچھو۔" عظمیٰ سنجیدہ تھی۔

"کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی دیکھ کر میرا کہ اندر ہی اندر آپ کے دل کو چھیل رہا ہو۔ اور اس کی

آپ کی آنکھوں میں گہرائی ہو۔"

"اسی طرح کہتی ہے، عظمیٰ شاہر کے ہمارے اندر کسی شاعری روح ہے۔"

"پچھو میں آسکتا ہوں۔"

"شاہر نے نہ سکتے کہ زوردار اور نہ کھول کر اندر چھاننا تو عظمیٰ کچھ کہنے کہتے چپ کر گئی۔

"غیر ارادی طور اس نے ہاتھ بندھ دیا۔"

"کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟"

"تھک ہوئی بیٹا بس ذرا سی تھابت ہے۔ چاہیں اچانک کیا ہو گیا تھا، آنکھوں کے آگے اندر چلا گیا تھا۔"

"لے تے فون لے لے آئی اور عظمیٰ اس عرصہ میں ہو جاتی تھی۔"

"شاہر نے بغور انہیں دیکھا۔ جس سے وہ سوچ رہے تھے، پچھو نے جو کچھ کہا تھا۔ کیا تھا۔

یہ وہ پہلے کیا انہوں نے شاہر کو پہچان لیا تھا۔ کیا وہ جان کی تھیں کہ وہ کام چاکو کا بیٹا ہے اور وہ فون پر

تھیں۔ لیکن انہوں نے تو آج تک شاہر کو دیکھا نہیں۔ شجاع کو اس کے بہت بچپن میں انہوں نے ایک بار دیکھا

تھا لیکن شاہر تو سال بھر لای نہیں ہوا تھا۔ پھر شجاع میں کام چاکو کی شہادت تھی جب کہ شاہر تو سب سے پہلے

وقت تو وہ انہیں سہارا دے کر اندر چلی گئی تھی۔ اور جب دیکھا کہ وہ فون میں لگی تھیں لیکن

پاس ہی بیٹھے رہے تھے۔ بے ہوشی میں تھیں۔ وہ جی سے ساتھ پاؤں مار رہی تھیں اور نہیں

شاہ رخ نے دانست اپنی آواز دھیمی کر لی تھی۔

”شاہ رخ تمہارا مطلب ہے“

”جی“ وہ ان کے ہاتھ کو اپنے ماتوں میں لے کر ہولے سے مس کرتا ہے

”لیکن یہاں کیسے شادی کے کیا کام وہاں خفا تو نہیں ہوئے اس کے لئے؟ پھر؟ شاہ رخ تم نے اسے منع کیا کیوں کیا وہ یہاں۔“

ان پر یکدم گہرے ماتراری ہوئی تھی۔ اور شاہ رخ کے ہاتھوں میں دیا ان کا ہاتھ کپکپا لگتا تھا۔

”پھوپھو جان بلیز بلیکس ہو جائیں۔“

شاہ رخ نے ان کے ہاتھ کو ہولے سے دبا کر تسلی دی۔

”شادی کو تمہیں معلوم کد“ وہ ہولے ہولے بہت دھیمی آواز میں انہیں شاہ رخ کی آمد کے متعلق بتا رہے تھے۔

”شادی کو ذرا ابھی تک نہیں ہوا۔ شاہ رخ۔“

”میں بلکہ شادی نے تو اسے پھر آنے کو بلکا اس کے والدین سے ملنے کی خواہش کی وہ تو اس سفر کے حلقے سے کام لے کر جھوٹ بول رہا اس کے والدین کو اپنی جگہ میں رہتے ہیں۔“

”وہ؟“ زینت فاطمہ نے ایک پر سکون سانس لیا۔

”اب بھی مت لانا اسے یہاں۔“

”پھوپھو اب اتنی خوفزدہ کیوں ہو جاتی ہیں کیا آپ کو خوف ہے کہ شادی چاہو یا ان کے بچوں کو نقص پہنچا سکتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ انہیں شادی سے جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔“

”جی نہیں میں کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن مجھے خوف آتا ہے۔“ ان کا رنگ زرد ہو گیا۔

”لیکن اس خوف کی کوئی وجہ تو ہوگی پھوپھو۔“ شاہ رخ نے جبرجری کی۔

”جی ہاں وجہ۔“ انہوں نے زیر لب کہا۔ اور کئی منظر تصور کے پردے پر لہرائے اور انہوں نے بچنے کی کوشش کی۔

”بچانے کے پھوپھو۔“ شاہ رخ نے پھر اصرار کیا۔

”میں کوئی وجہ نہیں۔“ زینت فاطمہ نے لگا کر بچنے کی کوشش کی۔

”پھوپھو میں چاہتا ہوں آپ شادی سے بات کریں کوئی مناسب موقع نہ کہ آپ جانتی نہیں چاہو کتنا ترس رہے ہیں۔ شاہ رخ اور خفا میں کتنی نفی خواہش ہے کہ وہ یہاں آئیں۔ انہیں کوئی لاف بھی نہیں دہا بہنوں سے چاہتے ہیں۔“

زینت فاطمہ ہاتھ گودیں دھرے خاموش بیٹھی تھیں۔

”میں سمجھتا ہوں آپ کا خوف ہے شاید یہ خان کا رشتہ ہے۔ یہاں بھی کیسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

کے بھائی کو بہت ہوشیاری تھی۔ فصد ہوں گے دانش میں چاچوں میں گے ساری ڈانٹ ڈکائی ہے۔ شادی کا ڈانٹا نہیں ہے۔“ زینت فاطمہ نے اس کے کچھ نہیں کہا۔ اس کو یہ بھی خاموش بیٹھی رہیں۔

”ہم کیا جوشوارہ نہیں کیا خبر؟“ ایسی ہی آواز تھا۔ ایسی ہی باتیں کرنا تھا لیکن وہاں نے کیا کیا کیا۔

”لیکن بھائی تو تھا۔“ رگوں میں دوڑنے والا خان تو ایک ہی تھا۔ پھر جی۔“

انہوں نے جھجھکی کر لے کر شاہ رخ کی طرف دیکھا۔

”جھاب بات کرو گی؟“

”نہیں پھوپھو۔“ شاہ رخ خاموش ہو گئے۔

”مجھے شاہ رخ پر ترس آ رہا تھا۔ جب میں نے آپ کا تپا تھا تو کتنا ترپ کر رہا تھا کہ وہ آپ کو کھیلے۔“

حالانکہ وہ آپ سے کبھی ملا نہیں تھا۔ راصل متنازع اور قادی نے اپنے بچوں کو ہر شے سے روکنا شروع کر رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے دل میں بھی جیت کو بچوں میں بھی منتقل کر دیا ہے۔“ زینت فاطمہ کے چہرے پر پھیلا اضطراب زرا کم ہوا تھا۔

”ختم آئی بہت کد رہی تھیں کہ کسی روز آپ کو لاؤں۔“

”ہاں بل تو میرا بیچا چاہ رہا ہے قادی سے دیا ہلے کو۔ شاہ رخ کا تپا دیتے تو دور سے ہی دیکھ لیتی۔“ بچے میں حسرت در لگی۔

”جائے آپ جا رہا ہو؟“

”مجھے جانا ہے۔“ ایک دو روز میں سیدہ اسما کو اور شاہ میر کو پھونٹنے لاہور۔ آپ کو بھی لے چلا ہوں کسی اسپیشلسٹ کو دکھانے کے بہانے۔“

شاہ رخ کے ہونٹوں پر دھمکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”اور یہ شاید شاہ رخ کی محبت کا اثر ہے۔“ انہوں نے بل میں دل میں سوچا۔

”میں شاہ رخ ابھی کرعش شادی ہوئی ہے سو مجھے بھی ہے۔ ابھی زارا کا جیزر آنا ہے۔ اور پھر زارا ابھی بہت گہرا رہی ہے۔ کوئی بچا کا کمر ہے لیکن باخل میں بہت فرق ہے۔ والدہ کی کامنوج بہت مختلف تھا۔ زارا ان کو لیتی ہوئی ہے۔ بہت سے لالچی بہت سے سب کی اور پھر جن بھائیوں میں وہ ستوں کی سی ہے تکلفی ہے۔ جب کہ

ابھی تک شاہ رخ بہت بات کرتے ہوئے بھی گہرا لیتی تھی۔

تم سے پھر کی محبت کرتی تھی۔ لیکن شاہ رخ کو کوئی بھی رنگ اڑا چکا ہے ان کے زارا مجھے کد رہی تھی شکر ہے پھوپھو اب ہیں اور وہ روز نہ تو ایک دن بھی نہ رہ سکیں یہاں۔ لیکن ابھی جیسٹ ہو جائے گی۔ ہولے ہولے بہت سمجھ دار ہے۔ شاہ رخ نے بہت محبت کیا اور اور ختم کی دیکھ جانے کو بل بھی نہیں چاہے گا اس کا بہت حساس ہے۔ بہت ڈاکٹر بل۔ گہری بات کوئی اونچی آواز سے بات کرنا تو تھا نہ شروع کر دیتی تھی۔ لوگوں میں اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ رکھی ہے۔ شاہ رخ بہت سن بہت سن والو کے پانی کی طرح ایسی خبیث شے مل جائے گی۔“

ان کے لیے میں زارا کا بہت بات تھا۔ گوہ کہ تم کوئی اونچی بات جانی تھیں لیکن اگھار شاہ کے بچوں سے بھی انہیں انکا ہی بات تھا۔ شاہ رخ شادی کے بچوں سے پھر زارا بالکل گڑبا نہیں لگتی تھی۔ انہیں۔

”زارا انہیں ساڑھے تین سال کی تھی جب اسامیہ رہا ہوئی تھی۔“ شاہ رخ خاموشی سے انہیں سن رہا تھا لیکن اس کا ذہن اور اوپر چٹک رہا تھا۔

”کیسے کیا ترکیب ہو کہ شادی کا بل نرم ہو جائے چاہو کے لیے۔ انہیں معاف کر کے گلے لگائیں۔“ یکدم ہی اس کے ذہن میں شاہ رخ کا خیال آ گیا۔

”کیسے کوٹ بدل کے ناراض ہو کر لے گئے تھے۔“

”میں شادی سے اجابت لے کر کد زارا میں سمجھانے لے جاؤں گا۔ ایک ہی جگہ ایک ہی باخل میں رہتے رہے۔ بدوہا جائے اور وہ بھی شاید اپنا بیٹا تو ان کو ہور ہے۔ تھی قادی طرح کی ہے۔ یعنی اور ہے وہ

ہاتھ کر رہے ہیں۔ یا پھر شاہ رخ کے بھائی کی یادداشت کی راہیں کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ شاید کسی کو اپنی بات نہ سن کر جتنی ہے اور پھر ایک مہینہ نہ نایک ہو جائے۔“

”پھوپھو۔“

انہوں نے یکدم مسراٹھا کر زینت فاطمہ کی طرف دیکھا۔

”یہ جوشاہ رخاں ہیں ان دنوں کچھ عجیب باتیں کرنے لگے ہیں۔ ایسی باتیں جو انہوں نے اس سے قبل کبھی نہیں لیں۔ شاہ رخ کہتا ہے کہ شاید کسی حادثے یا بیماری میں ان کی یادداشت کھو گئی تھی اور اب وہ یادداشت ہولے ہولے واپس بلت رہی ہے۔ شاید کسی روز اچانک انہیں سب یاد آ جائے۔“ زینت فاطمہ کا رنگ یکدم سفید پڑ گیا۔

”شاہد“ انہوں نے شاہد سے کہا اور اپنا ہاتھ رکھا۔

”یہ بات شادی سے متکنا نہیں سمجھتی تھانکہ ان کی یادداشت واپس آ رہی ہے۔“

شاہد کی سوائیل نظریں ان کی طرف اٹھیں۔

زینت فاطمہ نے اپنے منگے کو یوں بے زبان پھیرا۔

بہت سال پہلے کی بات تھی۔

انہوں نے انھوں کو زور سے سمجھ کر کھولا۔

اس رات حویلی میں صرف بائی کی یاد تھی۔ تینوں بھائی اور بڑی بہن بڑے شادی کے ساتھ کٹا ہوئے تھے، کسی مزید شادی میں شرکت کے لیے بائی کو دے کی تکلیف تھی۔ اور ان دنوں ان کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ سوائیل کے ساتھ حویلی میں رہ گئی تھی۔ رات آج چاکلی بی بی کو دے گا وہ دیکھا تھا۔ اس سانس اٹھنے لگا تو کمر کا گر لپٹ گئی۔

دایہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن وہ اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ یقیناً ”وہا پر حوانہ میں ہوں گے ایک لمحہ کے لیے دھری گئی۔“ لیکن بھار دایہ حوانے میں ہی سوچا تھے۔ چائے کی یادداشت تھا گاؤں میں تو ان دنوں مغرب کے بعد ہی رات کا کھانا کھایا جاتا تھا۔ اس وقت حویلی میں خاموشی کی طمانین بھی اپنے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ وہ گر لپٹ بی بی کے پاس آئیں۔ ان کی حالت بد تھی۔ کسی سانس رک رک کر تھل تھل تھا۔

”بی بی! انہوں نے ان کو سینہ سلایا اور پھر پڑی ہوئی اندرونی دروازہ کھول کر باہر کی طرف لپٹی جھینا مروانے سے روشنی کی بجلی کی لکیر دوڑانے کی کھڑی سے باہر آ رہی تھی۔

”تو دایہ اصرار ہی ہیں۔“ اطمینان ہوا تھا اور پھر وہ اسے کہا ہر کر انہوں نے دیکھا درست کیا تھا سے پہلے کہ وہ تنک دیتی اندر سے دایہ کی آواز آئی تھی۔

”مکرم شاہ کو کچھ میری طرف متاؤن مہول ہوں۔“ انہوں نے جھری سے ہٹا کر بالکل سامنے کرسی پر بیٹھ کر بھی بیٹھا تھا اس کے سر اور داہمی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ چہرے پر وحشت اور آنکھوں میں دیرپائی تھی۔ اس شخص کو بچکانہ نہیں لگتی تھی۔ لہجہ بھر کے لیے ان کے ذہن کی کئی کافیاں نکل آتی تھیں۔

اندرونی دروازہ کھلا تھا۔

”میں پوچھ رہا ہوں، مکرم شاہ میں کون ہوں۔“ دایہ کی آواز آئی اور پھر ایک زوردار چھینٹ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے پر لگا تھا۔ اسے صرف دایہ کا ہاتھ اور اپنا ذہنی نظریا تھا۔ وہ اس طرف کھڑے تھے۔ سامنے چھ شخص خورخوہ ہو گیا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں جیسے ابل رہی تھیں۔

”بولو کون ہوں۔“

دایہ کی پوچھ رہے تھے۔ اور وہ نہیں سمجھا تھا۔ ہاتھ باندھے اٹھائیں کر کہا تھا۔

”نہت ماروئے نہیں ہوتا کون ہوں۔“

وہ ساکت کھڑی تھیں۔ سانسو کی سہیلیوں کو بکھڑا ہو۔

”ہوں۔“

دایہ نے کسی کو مخاطب کیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ پوچھ رہے تھے۔ زور سے کہہ۔

”مکرم شاہ تو اپنی بچکانہ چاہتے تھے۔ کچھ سمجھا تھا۔ مجھ اور اب بچکانہ ہی جاتے گی جنہیں۔“

پھر انہوں نے ایک زوردار لاشداری تھی۔ کرسی پر بیٹھا شخص زور سے کچھ کہہ رہا ہو گیا تھا۔ اس کی چیخ

زینت فاطمہ جیسے ہوش میں آئی تھیں۔

”چھینک دے جا کر اسے باہر گئیں۔“

پھر کسی نے اس شخص کو سہارا کر کے اس کی آستین فلوڈ کر کے ایک آنکھیں لگایا تھا اور مسلسل چیخ رہا تھا۔ اور اس کی چیخوں سے خورخوہ ہو کر نہت فاطمہ تیزی سے سوا پرلٹ آئی تھیں۔ حویلی کا اندرونی دروازہ کھلتی ہوئی وہ گھبراہٹ سے دوڑ گئی۔

بی بی کا سانس اب بحال ہو چکا تھا اور تھکے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ بیٹھ ایسا ہی ہوتا تھا جب سے کا دورہ ہوا تو یوں ہی لگتا تھا کہ آکھڑا سانس بھی بحال نہ ہوگا۔

”کھاس پھٹی کی تھی تم؟“

بی بی نے ہنسا۔

”وہ میں دایہ کی طرف ملتی تھی۔ لیکن وہ کمرے میں نہیں ہیں۔“

وہ ہنستا تھا کہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھیں ان کا دل اندر ہی اندر قہر رہا تھا ابھی تک۔

”مروانے میں چلے گئے ہوں کہ وہ تو مجھے سوچا آپ کو ٹھیک ہوں۔“

اور وہ خاموشی سے اپنے ستر لٹ گئی تھیں۔ لیکن ان کے پورے وجود پر قہر قہر طاری تھی۔ چند سال پہلے جب وہ حویلی کے ہر کمرے میں گھول رہی تھیں تو یہی شخص تھا جس نے ان کے پاس رک کر ان کے گال کو ہونے سے بچوئے ہوئے کہا تھا۔

”میں تمہارا چاہوں مکرم علی شاہ۔“

گو انہوں نے کیا تھا نہیں تھا لیکن دایہ نے اسے اس نام سے ہی پکارا تھا۔ وہ تو دایہ کے بھائی ہیں۔ پھر دایہ انہیں کہیں مار رہے تھے۔

وہ پوری رات سو نہ تھی اور صبح کو انہیں بخار ہو گیا تھا۔ اور پھر بخار کی حالت ہی انہوں نے سنا تھا کہ دور کا کمرہ گرم شاہ لٹ گئے ہیں۔ لیکن ہوش و حواس سے بے گانہ، کسی کو پچھانے نہیں۔ ان کے سینے پر بوجھ دھرا تھا۔ کئی بار انہوں نے سوچا تھا کہ کسی سے اس رات کے اٹنے کا ذکر کرس لیتی ہے۔ بڑے شادی سے یا پھر اور کسی سے نہیں تو پتا سے کسی لپٹ کر چلا گیا۔ لیکن تین سالوں کا خوف تھا کون سی طاقت تھی جس نے انہیں بچے سے روک رکھا تھا۔

ایک روز انہوں نے سب بڑی بہن سے کہہ دیا تھا۔ وہ راز جو ایک بوجھ کی طرح بے پردہ ہوا تھا۔

بہت سال پہلے جب ان کی شادی ہو رہی تھی اور وہ دنوں بیٹھی جاگ رہی تھیں تو ہر سون پہلے کی وہ رات انہیں یاد آتی تھی۔ بی بی کا ذکر کرتے کرتے وہ اس رات کا بھی ذکر کر گئی تھیں اور کسی نام سے اندر آئے شادی نے سب بن لیا تھا۔

”زینت فاطمہ۔“

ان کی آواز اتنی سوتھی کہ وہ یکدم خورخوہ ہو کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

”ابھی جو کچھ آپ نے سہیل بی بی سے کہا ہے۔ آج کے بعد آپ کے لیوں سے نہ سنوں۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر ان کی کھائی بہت زور سے پکڑ لی تھی۔

”سن رہی ہوں آپ؟ آج کے بعد محمول چائیں کہ آپ نے کیا دیکھا اور کیا سنا تھا۔“

انہوں نے بھگدائے کہ ان کی کھائی چھوڑ دی تھی۔ اور پھر کھائی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ آج اتنے سالوں بعد بھی انہیں اپنی کھائی پر ان کے ہاتھوں کی سخت گرفت کا احساس ہوا تو انہوں نے کھبر کر شاہد کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ شاہد نے بھی تنک ان کی طرف سوائیل نظریں سے دیکھ رہے تھے۔

”سہیل یو۔“ انہوں نے نظریں چرائیں۔

”کیا آپ کو خوف ہے کہ شادی میں جاسیں گے کہ شاہد بایا کی یادداشت واپس آ جائے اور اگر یہ خوف ہے تو اس کی کوئی وجہ تو ہوگی یا پچھو۔“







”یہ سب تو جیسے پہلے سے ہی بتا تھا کہ آئیہ پند نہیں کرتیں اس پر بھی ایک کوہ“

”ہاں لیکن دل کہاں سوچتا ہے کچھ جب محبت حملہ کرتی ہے تو پھر سارے ہارنے کے کوئی راستہ نہیں رہتا تم اس کو دیکھو! وہ تو جان رہا ہو گا کہ وہی۔ بالکل بدل گئے ہیں۔ آجے سنجیدہ اور سہرے اور ان کے چہرے پر ایسا سو سا بھر رہا ہے کہ بدل چکے لگتے ہیں۔ یہ چاہتا ہے اس شخص کے سامنے دکھ اپنی بھولی میں بھر کر اس کے ہونٹوں پر مسکرائیں بھیروں۔“

”لیکن اس پر بھی کوئی بھلا کیا دکھ ہو سکتا ہے؟“ اس نے حیران ہو کر سوچا۔

”کیا سوچتے کیوں؟“

”سرمزرا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”آج یہاں ہی گزارنے کا ارادہ ہے چائے نہیں پیتی۔“

”چائے آگئی ہے؟“ اس نے چونک کر سرمزرا کو دیکھا۔

”ہاں ابھی کل علی عادلہ نے کر کیا ہے اسٹاف روہ میں۔“

”چلیں۔“

وہ ان کے ساتھ ساتھ چلے گئے تب ہی اس نے مس ہانکی طرف دیکھا وہ آہیں سے باہر نکل رہی تھیں۔ ان کا چہرہ سو سا ہوا تھا اور رنگ پیچکاڑا ہوا تھا۔ ”یقیناً ایسا ہی تھا کیا پھر اسے محسوس ہوا تھا۔ مس ہان کی طرف دیکھے بغیر

ان کے پاس سے گزر کر لا پیری کی طرف چلے گئیں۔

”لگتا ہے آج ہذاک صاحب نے مس ہان کو سنا ہے؟“ سرمزرا ہولے نہیں۔

”چلو آج کا کو تو پورا ہوا ورنہ نہ جانے کس کی شامت آتا تھی۔ ہاں یاد آیا اس روز پھر ہذاک صاحب نے

جیسے ڈانٹا تو نہیں تھا۔“ سرمزرا کو یاد آیا۔

”میں چھٹی لے کر چلی گئی تھی پھر پچھتاوا ہی نہیں رہا۔“

”ہاں ڈانٹا تو تھا لیکن کچھ زیادہ نہیں۔“ وہ مسکرائی۔

یاد جو اس کے شہر چانے کے علیحدہ نہ آئے جانے نہیں دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ولید خضر اور اسرا واپس آ گئے

خضر کی نظروں نے اس ایک لمحہ کے لیے اسے اپنے حصار میں لیا تھا۔

”کیسی بولہ؟“ عام سامر نے اپنا پوشہ جیتا۔

”میں بھی ہوں۔“ اس نے بھی کوشش کی اور خوش چائی دھر نکلتا اس کا احساس پھر سے نہ ہو۔

”اور سب لوگ؟“ اس نے کھڑے کھڑے پوچھا تھا۔

”سب ٹھیک ہیں۔“

وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ خضر کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی تھی جسے چھپانے کے لیے اس نے سر موڑ لیا۔ اب اس خضر کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ ”سرمزرا جواب دے کر اس نے ولید کو مخاطب کیا۔

”دلی پلیر جیسے گھر چھوڑ آؤں کس کے سہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

”یقیناً“ عینا آپ کو آغا کر کے لائی ہوں گی۔“

ولید نے مسکرا کر علیحدہ کی طرف دیکھا جوں کی بھی مسکرا دی۔

”ظاہر ہے اس طرح کے مبادرائے کارنامے کی توقع ہے تو میں کی جا سکتی۔“

”یقیناً“ ولید نے اوروڑا سا رخ موڑ کر خضر کی طرف دیکھا۔

”اور اب واپس پہنچانے کا مبادرائے کام اگر آپ سر انجام دے دیں تو نہ مدت منوں ہو گا۔ ایک چھوٹی سی مدت

تھک گیا ہوں۔“

یاد وہ پریشان ہی ہو کر اسے دیکھنے لگی تو خضر نے اسے تسلی دی۔

”دونوں درمی ماہ! پندرہ منٹ انتظار کرو میں چھوڑ آؤں گا۔ ایک ضروری کال کرتی ہے ابھی آتا ہوں۔ اسفر تم بیٹھیو۔“

وہ یک دم اس کی طرف مڑا تھا اور ولید کے ساتھ جا تیں کرنا ہوا اسے کہنے کی طرف بڑھا گیا۔ اسفر سے جھکائے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ علیحدہ اور کھلی سے اسے دیکھ رہی تھی جبکہ اس کی نظریں کاہٹ کر رہیں۔ ماہ نور نے آہستہ سے علیحدہ کے بازو کو چھوا تو چونکی۔

”یہ کیا محبت ہے عینا کیا اس پر بھیانی کو پہلی دفعہ دیکھ رہی ہو۔“

”ہائے کبوتہ تو نے بیانی ہی نہیں۔“ علیحدہ کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ وہ دونوں سرگوں میں جا تیں کر رہی تھیں۔

”اور سنو ماہ جب ملاؤں آجائے کبھی بھی وقت تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”یہ کو اب غفل کے خلاف ہے خواہ۔“ سرمزرا کچھ دھیمے آواز میں اس میں ہلکی سی شوخی تھی۔

”سو رہی ماہ تو نے فوراً“ معذرت کی۔

”مہربان کو شہر بند کرنے کے خیال سے آہستہ بول رہے تھے۔“

”لیکن میں تو شہر ہو رہا تھا۔“ سرمزرا نے ایک نظر علیحدہ پر ڈالی۔

”کہہ جاتے ہیں کہ یہ خلاف کاسا ز کی ہیں۔“

ابھی علیحدہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ خضر آیا۔

”بات ہو گئی؟“ سرمزرا نے پوچھا۔

”میں وہ کھر پر نہیں تھا۔“ کیونکہ اچھوٹے جیسے ڈراپ کر دیا پھر شاید ماما کو بھی لینے جاتا ہے۔ جہاں کہہ رہے تھے کہ میں جاسکتی تھی۔“

”ماہوں جان جاگ رہے ہیں۔“ ماہ کوڑی ہو گئی۔

”میں ان میں خدا حافظ کہہ کے آئی ہوں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔“ سرمزرا نے لال لال گا۔ ”میں بھی کھڑا ہو گیا تھا۔“

گاؤں میں بیٹھے ہی اس پر پھر ہذاک صاحب کا خوف سوار ہو گیا تھا۔ خضر نے دو تین بار بیک و فوروٹ میں اسے دیکھا۔ وہ کچھ پریشان سی لگ رہی تھی اپنی ہی سوچ میں کھنکھناتوں کی باتوں سے بے خبر تھی۔

”ماہ!“ سرمزرا نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

”جی۔“

”آجے جی نہیں چلا کر اسفر نے کیا پوچھا تھا۔“

”کہاں؟“ مہم کو ہم ۱۴ فرزندوں کے متعلق پوچھ رہا ہے۔“ خضر کے لیے جسے نری تھی۔

اور پھر واپس آتے ہوئے وہ ڈاک ڈرا اس کے پاس رکھا تھا لیکن میں کھڑی ڈانیاں کے لیے آلیٹھ تھاری تھی کیونکہ اسے سامنے پند نہیں لیا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اور اس نے اپنی پریشانی بتادی۔

”اس میں ایسی پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم آرام سے سو جانا۔ صبح تک بیٹھ کر پیچہ زن دیکھتی رہنا۔ سن رہی ہو نا میں کیا بات۔“ اس نے سر ہلا دیا۔

”کہہ دینا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم ڈرو گی نہیں تو کچھ نہیں ہو گا جتنا ڈرو گی اتنا ہی لوگ عبد اللہ کے۔“

”لیکن وہ اٹھ نہیں۔“

”تم اس کا سر کڑھائی ہو۔ تم پیچہ زچیک کے بغیر بھی پر نہیں ہو گا کہہ دوں گے۔“ اس کا دل میں کہ ان کا غلط بیجا پایا جاسکے۔“

"یہ تو ہے۔"  
"تو بس پریشان قسم نہ کھولہ پھولی پھولی پریشان ہوتا چھوڑ دو۔ اللہ پر چھوڑا کرو سب کچھ۔"  
اس نے ہتھکڑیاں اور پیرا پورے ایسا ہی کیا تھا۔

"بچہ زچہ کہہ گئے ہیں لوٹنا۔"  
سر ڈالنے اس میں ملایا تھا۔

"سوری سر میں ہیر زین چکر کر کسی طبیعت خراب تھی اور کچھ ممان آگے تھے۔"  
"مگر مطلب میں نے آپ سے کہا تھا مجھے ایڈیشن۔"

"سر میرے خیال میں وہ دنوں سب کھنڈوں میں صرف ایک ہی پڑا ہے جو کامیاب نہیں ہو سکا یا سب ایسے ہیں پرانی ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ گرختے پرستے اس نے ان کی بات گانت دی تھی اور بڑے اعتماد سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی کہ وہ کیسے گل میں آپ کو رزلٹ لے کر دے دیں گے۔

"اور اگر صاحب نے ڈانٹنے کا ارادہ ملتی کر دیا تھا۔"  
"اے کسے جائے۔" یہ نکتہ خاصا کار آمد تھا۔

اشافہ دہم میں آکر چائے پئے جسے اس نے سزمرا کو تفصیل بتائی وہ توں نہیں۔  
"سماں کن کن جھانکے اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے اور لوگوں کا قائلہ کرنے کے لیے ہمارا نڈا ہے۔"

دور تو یہ دیکھا جائے۔ "نہوں نے غالی کی شکل پر رکھ دیا۔"  
"اور سزا کر دیا جیسے کوئی بھی کمزور پرستے ہیں۔ وہ سائنس ٹیچر تو ایک کی دس سناتی تھی۔ بلاوجہ کی ڈانٹ پڑا دیتے نہیں کرتی تھی۔"

"لہذا اور اسے اشافہ دہم میں قدم رکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔"  
"میں چمکی لے کر کمر جاری ہوں تمہارے آج دو لاسٹ پیڑ ہیں پیر پیر کی کلاس لے لیتا۔"

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا امانی؟" اور نے محسوس کیا تھا کہ وہ رو کر گئی تھی۔  
"نہیں کچھ ہو رہا ہے اور سر میں درد بھی بہت ہے۔"

"میں آپ کی کلاس لے لیتا ہوں۔"  
"میں نے اشافہ دہم میں سنائی ہی پیر زکے لیے بھی کر دیا ہے فری ٹیچر سے۔"

اب اشافہ دہم سے نکل گئیں تو کچھ دو دانے سے ماہور نے دیکھا کہ سزا کر کے آفس کی طرف جاری تھیں۔  
"ابا چوٹی لیتے۔"

"میں ہانکے ساتھ کوئی مسئلہ ہے میں سب دنوں سے انہیں پریشان دیکھ رہی ہوں چشموں سے پہلے سے۔"

سزمرا نے تبہ کو کہا۔  
"ہاں شاید ٹیکنیکل کام مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

ماہور سوچنے لگی اور سزمرا سے سوچنے کو کہہ کر اس سے شیش نکال کر اپنی اسلک درست کرنے لگیں۔  
"اگر تجسین اعتراض نہ ہو تو میں بات کر دوں غدار سے۔"

جننے سے سوالیہ نظروں سے شہار کی طرف دیکھا جس نے بے حد جرت سے حزن کی ساری بات تھی۔  
"لیکن مائیں نے ابھی اس کے متعلق "آئی میں شادی کے متعلق پاگل نہیں سوچا۔ ابھی تو میں چند سال تک ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"میں سوچا تو میری جان اب سوچ لو۔" حزن کے وہ منہ پر ہدی و لقریب کی مسکراہٹ تھی۔  
"تجسین! جب میں نے کیڈا سے آکر پہلی بار تم کو دیکھا تو میرے سبب میں خیال کیا تھا کہ اچھا اتنی باری

لکھنے سے کہ میں اسے شہر کی دس ہٹاؤں کی۔ چراس کی عادات اس کا مزاج وہ ایسی بھی ہے شہر کی۔  
"تو بس زندگی بقیہ بہت خوش قسمت ہو گا ورنہ میری نہیں تمہارے بھائی بھی خواہش ہے۔"

"میں تمہاری جلدی کیا ہے۔"  
"میرا ہی آنکھوں کے سامنے سیاہ چادر کے بالے میں لپٹا ایک چوہا بار بار آ رہا تھا اور یہ آج کی بات نہیں تھی۔"

یہ جرت سے اسے بہت مزید کیا تھا۔ وہ جب آئے آنکھیں منہ دھو کر کھرا چوہہ سپید لالچی لکھن والے ہاتھ لکے سے چادر کورت کرتے تھے۔  
آخر میں وہ اس ایک کمرے پر حیدر نظر کو کھول نہیں پایا تھا۔ کیا قابلیا۔

اس نے کئی بار پتے بدلے تھے اور راجہ کا تھا اور تین دنوں میں وہ سیدہ آتھیں یا سیدہ عظمیٰ لیکن وہ چھوڑ دے۔  
دوسرے اوچھل ہی نہیں ہو تھا۔ میں اس نے خود کو یہ یقین دلایا تھا کہ یہ کسی فطری جذبہ ہے۔

خون کی۔ وہ چو کی اور کا میں اس کی کیا یاد کا تھا اور چونکہ وہ کسی زندگی میں اس سے ملا میں تھا اور اس کی کھنڈ ایک جھلک میں نظر آتی تھی۔ تو شاید اس سے لیکن اس وقت اس کے سامنے بیٹھے بیٹھے

اس کا بلے سے طرح بچل آتا تھا۔ ایک انمولی کی خواہش جیسے شوخی دیواروں سے چرختے تھی اور کتنا ماہور اس کی زندگی کا سراسر کی رفاقت میں کئے۔ بل ہی بدل میں وہ اس خواہش پر ہنسا وہ سیدہ آتھیں یا سیدہ

اس میں تو شاید ہی کی شیاں میں اس سے اسے سوانے میں کوئی کر نہیں چھوڑی تھی۔ محسوس اس جرم میں کہ ان کی اور کوئیں دل کا گایا اور پھر اس پر انکشاف میں کیا کیا بلکہ اس کا سراسر بھی کر دیا۔ یہ کسی صاحب نے صاف

اس سے بتا دیا تھا کہ اس کے لیے اس کا کوئی کارفرما تھا اور اس سے یہ جان لینا قطعی مشکل نہ تھا۔  
اسے ایسا ہر اس نے پوچھنے کی ضرورت نہیں محسوس نہیں کی تھی اور سکر دیا تھا۔

چرختے تو آج دیوانی ادا کرتا ہے چاہے اس میں آباد ہو کوئی اور جگہ۔"  
"میں بدلے میں شہر کی کئی طرح بچل کر امید دلائی۔"

"ابا جرمی شادی کا مل صاف ہو جائے بھی چھوٹے بھائی کی محبت پھر تو موسم کر دے۔ شاور بھی دیکھتا ہے کہ وہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" جب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ "یادوں کی آوت سے ہاتھ پھر تھمتے لگتا تھا۔"

"ہادی ہے شہر کی پٹا اٹھ کے رشتہ کیا ہے اور بھائی صاحب تقریباً رضامند ہیں اور ان سے کوئی عید نہ دے۔ وہ لڑکے کے آتے ہیں کمرے سے غدار بہت پریشان ہے اس پر نہ کر دیا ہے کہ کسی سے ایک توڑنے کی کمر

نہا ہے۔ وہ دوسرے لڑکے کی بھائی خاص چلا گئے عورت ہے۔ وہ دھڑاس کی مٹکی کر کے توڑ چکی ہے۔  
"جب اس ایک عورت اور ہی ہے ان دونوں علاج کے لیے۔ اسے کافی بات چیت رہتی تھی میری۔ جب اس پر

تھمتا کہ لڑکے کی عمر زیادہ ہے جبکہ اس کی بھائی نے کافی عمر بھائی ہے۔ یہ ایک جھوٹ بولا ہے تو نہ جانے کیا کیا جوت ہو گا۔ بہر حال میں نے اس پر سے لڑنے سے کیا تھا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ عورت بھی یہاں

آئی تھی۔ جب میں نے یو کی باتوں میں اس کی ذکر کیا تو اس نے لڑکے کی بھائی کے متعلق بتایا۔ کہہ رہی تھی کہ اصل لڑکے کی بھائی کو اس کے پیوں کا لالچ ہے اور وہ بھی اس کی شادی نہیں کسے کی اور اگر بھی کر بھی

لاؤں گا کہ نہیں بھرتے ہیں۔"  
"آپ نے غدار خال کو نہیں بتایا ہے؟"

"آئی روز جا کر بتا دیا تھا۔"  
"ابہ۔" "بھائی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔"

ہر بارے چاری تو بہت پریشان ہو گئی ہے۔ اس پر بھی کراچی کیا ہوا ہے اور بھائی صاحب کہہ رہے تھے کہ اس آ رہا ہے جرم میں ہے۔ لڑکے کو چھینے کے بعد اگر انہیں پسند آیا تو وہاں کر دیں گے اور شہر کے ساتھ ہی

میری ہی شادی کر دیں گے۔

نہا خبر لڑھکائی ہو۔“ شیعہ کا کعبہ میں جھانکا اور اس نے دل میں دعا کی تھی کہ اللہ کرے کہ وہ انتہا پر  
 ”میں شیعہ لڑھکائی ہو تو کسی اس کی عمر تو زیادہ ہے، کم از کم بھی چالیس سال کا تو ہو گا۔“ وہ  
 رہی تھی جسے کہ وہ اس کا ہم عمر ہے۔“  
 ”یہی صورت میں تو خالجان ضرور انکار کریں گے۔ اللہ تو بہت کم عمر ہے۔“  
 شیعہ نے جہنم کو لکھ دیا لیکن وہ اپنی روش میں بدل کر لکھیں۔

۱۱ "اے اس سے"

”حضرت! انہوں نے پھر کہا تو حضرت نے محسوس کیا کہ وہ دوری ہیں۔ انہوں نے تصور میں ان کے رخساروں آنسوؤں کو بہتے دیکھا۔

”ریلیکس نار۔“ انہوں نے پہلے ایسی بے تکلفی سے کہا۔

”اس میں اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو جب سے کئی ہوں تب سے سوچ رہی تھی لیکن پھر کراہ چلی گئی، دل میں اتنی آغوش کا تک چلا گیا تھا۔ اور وہ مختصر دور رسہ لے کر بھی آئی۔ آخر شجاع ہے ابھی ان لوگوں کو آئے کی جواب نہیں دیا۔“

”عزیز تک! تو حضرت! بڑی بڑے بعد غرا بیگم کے یوں سے نکلا تھا۔“

”میں صاحب کل ہی مل کے آئے ہیں لڑکے سے کہہ رہے تھے کہ اور تو سب ٹھیک ہے لڑکے کے داغ رکھی ہوئی ہے۔ نیک اور دین دار لگتا ہے۔ لیکن عمر کچھ زیادہ ہے اور اپنی اہم تو ابھی میں سال کی بھی ہوئی۔“

”چلو شجرہ! انہوں نے ہاں نہیں کی۔“ حضرت نے شکر ادا کیا۔

”ہاں کہہ رہے تھے، خدا میں دن تک سوچ کر جواب دینے کو مانا ہے۔“

”تو بس پھر ٹھیک ہے ہم رات کو انشاء اللہ آگے آئیں گے۔“ حضرت فونہ بند کر کے بچن میں آگئیں۔

ایک سڑک سے ہی اویا دل میں تھا جب وہ خود کو لنگر لگی تھیں۔ درخت لگ ہی لگا تھا اور آج تو شجاع بھی لگا تھا۔

وہ جیسے سر میں شگفتا ہی ہوئی جلدی جلدی سلاہتا رہی تھیں کہ شاہرم نے پیچھے سے آکر ان کے کندھے ہاتھ رکھتے ہوئے ٹھیک کر لپیٹ سے گھر کے کھڑا تھا کہ کندھ میں ڈالا انہوں نے نہ ڈرا کرے دیکھا۔

”اسلام علیکم ماہی خوش نظر آ رہی ہیں۔ آپ کے کوئی عہد بار داریں یا سید شجاع آگئے کیا؟“

”ہاں۔ رات بھر سڑکیا ہے سو رہا ہے۔“ انہوں نے مسرور سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”شاہو تم نے اہم کو دیکھا ہے یا تباؤ سہی گئی تھیں؟“

”وہاں؟“ وہ اچھلا۔

”جیسی کہ دال میں کچھ کھا رہا ہے۔ آپ میرے سر پر سراجا نے کا تو میں سوچ رہی لیکن ڈیرہام میں تو ابھی ہوں۔ ابھی تو میرے ٹھیلے کو گھونٹنے کے دن ہیں۔“

اس نے چہرے پر معنوی شرمندہ اگر سہی کی کوشش کی اور نگاہیں جھکا لیں۔

”شرر۔“ حضرت نے بولے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا۔

”تم بے پرواہی کوئی ہے۔“

”وہاں ہاں! میں اپنی عہد بار دہ لے لے لیکن آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں شعی بھائی سے پوچھ رہے ہیں اس نے چہرے پر معنوی شرمندہ اگر سہی کی کوشش کی اور نگاہیں جھکا لیں۔

”وہ تو کسی میں پڑی گا جو اگر انہیں کچن میں ایک طرف پڑی بلا سگ کی کڑی پر بیٹھ گیا۔“ شعی سے پوچھ لیا ہے۔

”نہ۔“ وہ ہلکا سا ہنس۔

”ہاں لیکن شعی بھائی نے کہاں دیکھا کہ تو۔ میرا جہاں تک خیال ہے ابھی تک انہیں غر خا کے جانے کا موقع نہیں ملا اور کم از کم میری مظلومت کے مطابق ابھی تک سمن یا اہم سے کوئی اور صبر نہیں چہ۔“

”شعی کو گنچہ پر اعتماد ہے۔ ان کے لیے میں مان تھا سنا کا فور تھا۔“

”میں تو مذہبی رانے پوچھ رہی ہوں۔“

”اور میں نے کہاں اتنے دھیان سے دیکھا ہے اہم کو ان کے منظر کا ٹیپ والڈ رز گوار کے سامنے تو نظر نہیں میں گزریں تو پھر کھر آ کر ہی نگاہیں اٹھائی تھیں۔ آپ کا یہ حکم تھا کہ بھائی صاحب کے سامنے زبان اور دھکا دھکا

کا وہاں میں رکھو۔ جی ہام گاہیں وال کر بیٹھا رہا۔ حالانکہ کتنی بار ہی چاہا تھا کہ ان سے پوچھوں یہ ٹوپی کہاں سے لی آپ نے؟ جی کسی زبردست کڑھائی والی ٹوپی تھی۔“ حضرت کو اپنی آہٹ۔

”شاہرم تم کبھی۔“

”ام ابھی جا کر دیکھو آؤں! انظر سے تھی وہ دال بھائی کی نظر سے۔“

”شاہرم کو ہمارے ساتھ چلے جانا۔“ حضرت نے پلیٹ تیار کر کے کانٹر پر رکھی۔

”وہاں اپنے بابا جان کو تو فون کو کتنی دیر تک آگے گھر کی طرف آتے ہوئے بات ہوئی تھی۔ وہ نکل ہی رہے تھے ہسپتال سے۔ اللہ بخش تم پر برتن و حلو تو بھیل لگاؤ اور حما بند کرو تا جی منٹ بعد۔“ وہ صاف سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہاتھ پر انگلیں تو شاہرم بھی ان کے ساتھ باہر آ گیا اور صوفے پر بیٹھے ہوئے نہ کہوٹ اٹھایا۔

”شجاع بھائی اب آئے تھے؟“

”تمہارے جانے کے فوراً بعد ہی آگئے تھے۔“

”تو اب تک تو میری دوری ہو چکی ہوگی۔“

وہ شجاع کے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا تو شجاع خود ہی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر کھٹن تھی۔ شاہرم سے مل کر وہ اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا تو حضرت نے اس کی طرف دیکھا۔

”تم سوئے نہیں شجاع۔“

”بہت کوشش کی تھیں میں آئی۔“

”باتھ لے لو فریش ہو جاؤ گے تمہارے پاپا آنے ہی والے ہیں پھر کھانا لگاتی ہوں۔ ہسپتال سے نکل چکے ہیں۔“

”جی۔“ شجاع سر ہلا کر شاہرم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”کیسے ہو؟“

”اکھن۔“

”سانے بڑا مکر مارا ہے۔“

”تو آؤ اس سے آپ کی۔“ شاہرم نے تھوڑا سا سرخم کیا۔

”کیسے شعی مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ شاہو سید پور میں کئی دن رہ کر آیا ہے۔“ حضرت نے مسکرا کر ادا کیا۔

”یقین تو پایا جان کو کبھی نہیں آ رہا تھا لیکن جب میں نے بتایا کہ کیسے میں شادی کے سینے سے لگا رہا اور رہا ہے شجاع بھائی جب ہم آ رہے تھے تو شادی نے اس پر اٹھائی ہے کیا کہا۔“

”یا؟“ شجاع نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس فرمایاں تو میرے کہ چند دنوں میں آپ کا بھائی میں میں بہت مرز ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے آپ سے مانگ لیں۔ اور اس پر بھائی نے بڑے مزے سے جواب دیا کہ آپ کا بھائی ہے شادی سے۔ اس وقت شاہرم بھائی کا چہرہ دھن والا تھا۔ لیکن جب شادی نے کہا کہ شاہرم کے دوست ہونے کے ناتے تم سب ہی میرے اپنے ہو تو توجہ دھن ہوا ہے۔“

”ایا واقعی۔“ شجاع کو حیرت ہوئی۔ شادی کا جو خاکہ اس کے تصور میں تھا وہ اس سے بالکل بیچ نہیں کر رہا تھا جو شاہرم بتا رہا تھا۔

”وہ مزاج کے کافی سخت ہوں گے۔“

”شجاع نے پوچھا۔ کو فون پر اسے شاہرم کے سید پور جانے اور واپس آنے کی خبر مل چکی تھی اور بابا نے کافی

تفصیل سے بتایا تھا وہ یوں خوش ہو رہے تھے جیسے وہ خود سید پور سے ہو کر آئے ہیں۔ پھر بھی وہ سب شاہرم کی دعا جانتا چاہتا تھا۔  
 "چنانچہ کیا بات ہے میں نے جس بھی شادی کو دیکھا تو ان کے لیوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرے پر ایک سا ناثر۔ اب یہ شاہ زیب کی شادی کی وجہ سے تھا یا وہ پیش ہی ایسے رہتے ہیں۔"  
 "دور کیا جاز؟"

شجاع کے سبب میں ایک ہو کر ہی اٹھی۔  
 "مگر شادی کا دل انتہائی نرم ہو چکا ہے۔"  
 "سنا چار کس کے؟ میں گھر اچھا چھوڑ کر کون سا گھر آتا ہوں اور گھبراہٹ کا ناثر نہ کھو گیا۔"  
 "گنا ہے بھائی، انہی بھائی کے تصور میں ہو گئے ہیں۔"  
 "شاہرم نے جس کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بولے سے کھڑا۔"  
 "شجاع بھائی کا کچھ بھائی کا انہی بھائی کو سوچا جا رہا ہے۔"  
 "کون انہی؟" شجاع چونکا۔

"اللہ رے بے باؤ۔" شاہرم چونکا۔  
 "ہمارا ہونے والی بھالی۔" تب سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کیسی ہیں۔ تو کب فکر نہ کریں اس موقع پر۔  
 "بھئی کام آتی ہیں۔ لیکن میں بھی کسی من سے نہیں ہوں کیا ہو یا جو بھائی ہوں۔ یہ سب کچھ بے جا میرے پاس۔  
 بس رات کو ہی انہی قصور حاضر۔"  
 "میں کچھ اور سوچ رہا تھا شاہرم۔" ایک چٹکی سی مسکراہٹ شجاع کے لیوں پر کھنکھری۔  
 "منا کو وہ بند سے تو کھک ہے مجھے تصور دیکھ کر کیا کرنا ہے۔"  
 "منا کو تصور دیکھ کر کیا کرنا ہے۔" شاہرم نے انہیں چھپایا نہیں۔  
 "یار بھائی،" شاہرم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔  
 "تجس کی بات ہے لیکن دل کی اور وہاں میں کی دلوں میں تو نہیں لگا ہوا جوتی ہے یا زاری۔"  
 "مختصر مت بول۔" شجاع نے اپنی مسکراہٹ بچانے کے لیے اسے ڈانٹا اور کھڑکھولیا۔  
 "میں ہاتھ لے کر آتا ہوں۔" شاہرم نے اپنے ہاتھ سے ہاتھ لے کر کہا۔

ان کے ہتھال سے جو ہر کاؤن تک کا راستہ تقریباً پڑھ گئے تھا۔  
 "آپ نے شعی بھائی سے تو سمجھا تھا نا شاہرم جو کچھ کہے گے مجھے وہ ہو گیا۔ شجاع کے اس انداز نے اسے  
 دا تھا۔ وہ کم اور دوسرے مزاج کا تھا لیکن شاہرم کی ہر بات کو ناجواز نہ کرتا تھا اور کسی مذاق میں ہر سادہ جملہ  
 "ہاں۔" حسن نے جرت سے اسے دیکھا۔  
 "کیا شعی بھائی نے صاف صاف اپنی بی بی کی ظاہری تھی۔"  
 "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"آپ کے حسن انہی قصور تہی فون کی نسل ہوئی۔ شاہرم نے فون اٹھایا اور چہرہ کی طرف دیکھا۔  
 "خدا خال کا ہے۔"  
 "کیا ہوا خدا کا ہے؟"

وہ سری طرف ہڈا راتے جو کچھ کہا تھا اس نے حسن پریشان کر دیا۔ وہ دیکھ رہا تھا جس پر کڑے وہیں ہنسی  
 چھہ گئیں۔ شاہرم ہر وقت غور سے ان کے چہرے کے سب سے دل کو اور دیکھتا ہی پڑتی لگتیوں کو دیکھ رہا تھا۔  
 شاہ زیب وہ لوں ہاتھوں کو سر کے نیچے رکھے دارا کو دیکھ رہا تھا جو درنگ نہیں کے سامنے کھڑی تھی۔  
 برش کرتے کرتے اس کی نظر شاہ زیب پر پڑی تو اس کے رخساروں پر سرخی ہو ڈلی۔

"آپ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔"  
 اس نے برش ڈرنگ بھیل پر رکھ دیا اور اپ اسٹاک اٹھادی تھی۔  
 "تو تمہارے کس طرح کیوں لگتی ہو گی؟"

شاہ زیب کے گیسے میں دار کھنکی گئی وہ صیغہ گئی۔ لانی پکلیں جھک گئیں اور ہونٹوں پر شرمیں مسکراہٹ کھر

"دارا۔" شاہ زیب اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 "اور کچھ میری طرف۔" اس نے بمشکل پکلیں اٹھائیں اور پھر فوراً ہی جھک گئیں۔ شادی کو ایک ماہ ہونے  
 لگا تھا لیکن ابھی بھی شاہ زیب کی طرف لگاؤ تھا کہ لگتا ہے اسے محال لگتا تھا۔  
 "اور کچھ آکر میرے پاس۔"

شاہ زیب نے بیوی کی طرف اشارہ کیا تو وہ اپ اسٹاک بوٹی میں پکڑے سے ہولے ہولے چلتی ہوئی اس کے

لب پر آکر بیٹھ گئی۔  
 "دارا ایک کیا بات ہو چکی؟"

"ہی۔" شاہ زیب کے گیسے کی جھجکی لے آئے چوٹ لگایا۔  
 "شادی سے پہلے کرتے تھے بھی چھوٹا کچھ تمہاری شادی مجھ سے ہو گی اور کیا میں تمہیں بتا سکتا تھا۔"  
 شاہ زیب اس کا کڑن تھا۔ اس کے گیسے سچا کا بنا۔ اس نے بیٹھوں یا شاہ زیب کو دیکھا تھا۔ جب وہ سید پور  
 میں آئے تھے تب بھی بیٹھوں میں جب وہ انہی کو حویلی آئے تب سے یہ ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن اس نے یہ  
 بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی اس کی شادی شاہ زیب سے ہو گی۔ اس کے ذہن میں سر سے شادی کا خیال ہی نہیں  
 لگا۔ وہ تو بس سیکڑا ہی بھائی ہی تو تھی۔ اسے دیکھنے کا اور پوزیشن حاصل کرنے کا یہ تھا پھر بھائی جان بھی اس کی  
 حوصلہ افزائی کرتے کرتے اور کہا بھائی جان زور دے رہے تو وہ ضرور سڑو کے لیے اپنا پیش لے لیتی۔ لیکن اسے آرزو مکمل  
 کرنے کے لیے جب اسے ہوش رہنا پڑا تو کھنکھری گئی۔ اٹھارہ گھنٹہ کاؤن آچکے تھے سوا سوا چمک دیتے ہی سید پور  
 گئی۔ وہ اسے سڑو کرتے رہا کرتے اور جب اس نے ارادہ کیا تو وہ دنا سے رخصت ہو گئے۔ انہی چند ماہ پہلے  
 اس نے اسے طور پر تیار کی کہ اس کا کڑن کا کڑا بھائی تھا۔ وہ بولے سے مسکرائی شاہ زیب کے لب سے چھٹ گئے۔  
 "بھائی کچھ اٹھا گئے کی بات ہے تو ظاہر ہے جس طرح سب کڑن آج بھی گتے گتے تھے ایسے ہی آپ بھی گتے گتے۔"

شاہ زیب نے آپ کو مزاج خست سے نکال کر بعد دیکھ گئے تھا۔  
 "دارا اب کیا کر نہیں لگتا۔" شاہ زیب کے گیسے میں اشتیاق در کیا۔  
 "نہیں۔" اسے اس ایک ماہ میں شاہ زیب کی وارفتگی کا اور شرمندہ یاد آگئیں تو پکلیں بو جھل ہو کر بھک

جھٹکتے نہیں گتے۔  
 "نہیں خست مزاج کا تو میں ہوں اب بھی۔"

اس نے بچوں کی سی مصیبت سے کام تو شاہ زیب کا بھی چاہا اسے اپنے اندر جذب کر لے۔ وہ بھی ہی اتنی  
 فطرت۔ اتنا عمل اس تھا اس کا کہ صورت تو وہ بھی نہ تھا۔ چاند سورج کی جوتی تھی۔ جب وہ تیار ہو کر  
 ادا تو اپنی ہی جان بھائی کی نظر پر دیکھ کر چھوٹ گئیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں اس وقت یہ خیال شدت سے  
 اس کے ذہن میں آیا تھا کہ وہ کچھ کھٹے کا پھر اس کے ذہن میں خیال آتا کہ وہ کچھ شادی صرف کر کھیت ہے  
 اور اس لیے اس نے یہ بھی پوچھا تھا تو انہی ان گھنٹوں میں حیرت آ کر گئی۔

"آج شادی کا دن ہے۔" شاہ زیب نے اپنے گیسے میں تو ایک بھائی کی خیال نہیں آیا کہ آپ کی بھینچ کر کم  
 رہ۔ کچھ نہیں کوئی کم تعلیم تو میں ہوئی شاہ زیب میری ایک فریڈ کی بھائی میں سڑو کیا ہوا تھا انہوں نے لیکن ان  
 نے ہر ایک ان پر دھتے تھے لیکن ان کی میری ڈانٹ نفست ابھی تھی۔ میری فریڈ کی بھائی تو بہت خوش تھیں۔ دوسری

لے لیے انہیں وہ آواز سب اصل بات ہے کہ کوئی کس سوچ میں جرات نہ ہو اور میری جو فریاد شاہ  
آئی تھیں سب مجھ پر رشک کر رہی تھیں کہ مجھے اتنا۔“

”خوب صورت بن رہا ہوں۔“

شاہ زیب نے اس کی بات مقل کی اور اپنا ہانڈ اس کے گرد جامل کر تے ہوئے اسے قریب کر لیا۔ یہ  
کراسی کے پاؤں کے سطح سے نکل کر ڈرنک کھیل کے سامنے کڑی ہو کر پلاسٹک گنگے لگی۔ شاہ زیب  
سکڑا کر نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ اس کا کچھ کراس کے پیچھے آکر ہوا۔

”زارا تم اتنی خوب صورت ہو، حسین ان معنوی چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔“ آئینے میں اس کا وارڈ  
نہایاں لگ رہا تھا۔

”مجھے خود میک اپ کرنا پسند نہیں ہے۔ لیکن بی بی انجی ہیں تیار ہار کو تو بس آپ اسٹیک لگاتی ہوں۔“

”تم اتنی پیاری ہو زارا وہاں انڈیو میں تو لڑکے تم پر حسرتے ہوئے ہیں۔“

وہ ایک بات جو نکاح سے پہلے اور نکاح کے بعد انکراس کے معاملہ میں آئی رہتی تھی اور اس نے سوچا تھا  
شادی کے بعد زارا سے ضرور پیچھے چلے گا لیکن پھر اس کے حسن اور رفاقت کے جادو میں ایسا کھوکھا کر دین میں  
وہ اور اس کی بونٹیں قربت نہ تھی۔ اس کی اور اب پورے ایک ماہ بعد وہ اس کے پیچھے کڑا آئینے میں اسے دیکھتے  
بڑے رساں سے پوچھ رہا تھا۔ زارا تیزی سے مڑی تھی اس کی پیشانی پر تارواری سے ٹکائیں پڑی تھیں۔  
”مجھے نہیں معلوم کہ کسی کے دل میں کیا ہے۔ اور اگر مرے بھی ہوں گے تو مجھے کسی نے نہیں کہا کہ وہ مفلح  
ہے۔“

اس کا اخیر شاہ زیب کو بہت برا لگا۔  
”زارا یہ تم کسی بھٹ کر رہی ہو۔“ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”آپ نے سوال کیا ہے وہی ایسے کا منتنا بھی تھا۔“

زارا بدستور غصے میں تھی کہ کھر بھر کی لالائی تھی۔ اس میں بے پناہ احتما تھا جو اظہار شاہ زیب کی پاپیاں  
اسے بخشتا تھا۔ بھائی بھی اس پر جان ڈرتا کرتے تھے۔ شاہ زیب کو اس سے اس کی یہ خود اعتمادی بہت بری لگی۔

”مگر میں نے وہ سوال پوچھا ہی تھا تو تم اس کا سیدھی طرح سے بھی جواب دے سکتی تھیں۔“ اس نے  
نے شاہ زیب کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کی انکھیں بیگم رہی تھیں وہ شاہ زیب کے سامنے روٹا نہیں  
تھی اس لیے نہ تو رخ موند کر کڑی ہو لیکن شاہ زیب نے اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ لیے۔

اسے یکدم نہ دامت محسوس ہوئی۔ اسے واقعی زارا سے یہ سوال نہیں کرتا تھا لیکن جب سے زارا اس کے  
میں آئی تھی وہ مسلسل سوچتا رہتا تھا کہ کیا خیر۔

”یہی زارا۔“ اس نے زارا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ زارا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”سو رہی میں نے بھی اپنے لیے سب سے کچھ کو بھرت کیا۔ لیکن شاہ زیب مایاں ہوئی کے درمیان سب سے اہم  
اعتداد ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی شک نہ تھی کہ گنگے کا آئینہ۔“ اس نے ایک صاف ستھری اور پائیز زندگی کا زاری  
مجھے بچپن سے ہی یہ یاد کر لیا تھا کہ میں کس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ مجھے اپنے خاندان کا وقار دیکھنا  
ہوا اور میں نے پیشہ سے ہی سوچا کہ میرے والد میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے وہی بہتر ہو گا۔ مجھے بابا چاہیے  
بڑے لالہ بھونے لالہ سب نے ہی احتما کیا ہے۔“

”اگر اس کو ڈاؤ۔“

شاہ زیب نے اس کے رخساروں پر ہر آنسو والے موتوں کے قطرے اپنی انگلی کی پوروں سے چنے۔

”میں دراصل بہت پوز ہو رہا ہوں اور جو کچھ میں نے تم سے پوچھا ہے بھی اس کی روای کا نتیجہ ہے۔“

میری زندگی میں جس طرح چاکلہ بامیں آئی تھی وہ اور چھائی ہوئی۔ اس نے مجھے دوا نہ کر لیا ہے۔ میں تمہارا

سزا اور میرے دل نے خواہش کی کہ نہ مجھ سے پہلے تم کی بے بسی محبت بھری نظر ڈالیں اور نہ اب۔ میرے  
اعتقاد میں جو تو میں سمجھا کر کسی دنیا میں بند کر کے رکھ لوں گا کہ کسی کی نظروں پر نہ تم پر۔“ وہ اسے دونوں  
کندھوں سے تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت دھڑکتی ہے دیکھ رہا تھا۔ وہ محبوب سی ہوئی۔

”ہر چیز میں اعتدال اور توازن ہونا چاہیے۔“  
”لیکن محبت میں توازن ایسی ہی جتنی ہے۔ میری جان۔“

اس کے ہانڈوں نے پھر اسے صدارت میں لے لیا چاکلہ کو دوا کے پردے تک ہوئی۔ زارا جلدی سے پیچھے ہٹ کر بیڑ پر  
بیٹھ گئی۔ شاہ زیب نے دوا ڈال دیا۔ وہاں پھر عظمیٰ شاہ کھڑی تھی۔

”آپ کو شاہی بلانے ہیں۔“  
”سید عظمیٰ کی نظروں میں جلی ہوئی تھیں۔“

”شاہی کی بات نہیں۔“  
”بی بی جان کے کمرے میں۔“

”چھٹا میں آتا ہوں۔“  
اس نے مڑ کر بیڑ پر بیٹھی زارا کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”تم کمرے میں رہنا میں شاہی کی بات سن کر آ رہا ہوں۔“  
زارا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھری۔ زندگی کو آواز پر جس طرح اس نے برا سامنے بنایا تھا زارا کو بہت ہنسی آ

رہی تھی۔  
”زارا یہ کہا تو اندر۔“

زارا نے اسے دوا کے کعبے سے لے کر لایا تو عظمیٰ اندر آکر اس کے سامنے موجود صوف پر بیٹھ گئی۔

”زارا بھائی آپ اور بھائی میں کوئی شے نہیں چاہیں گے۔ کافان سوا تو عجیب۔“  
”تجربہ کلی اور تیرے بند ہیں۔“ زارا اسکر آئی۔

”لیکن شاہ زیب کو کہہ دے کہ جب موسم اچھا ہو تو لے چلیں گے۔“  
”لیکن جب تک تو بہت دور ہو جائے گی۔ جتنی مون پر تو شاہی کے خور۔“ بعد جانا چاہیے۔“ زارا کو عظمیٰ کی

معمو بہت بری لگی۔  
”ہم ذرا کچھ دور میں مائیں گے۔“

”زارا بھائی آپ خوش ہیں یا آپ کو شاہ زیب بھائی سے ڈر تو نہیں لگتا؟“  
”کیوں کیا تمہارے شاہ زیب بھائی ذرا ڈرتے ہیں۔“

”میں۔“ عظمیٰ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔  
”میری فریاد تو کبھی دہی نہیں کہ تمہارے شاہ زیب بھائی تو کسی ملک کے شہزادے لگتے ہیں۔ مگر مجھے ان سے

ڈر لگتا ہے۔ بہت غصے والے ہیں۔ البتہ شاہ زیب بھائی سے ڈر نہیں لگتا اور شاہ میرے تو بہت دہی ہے۔ شاہ میر  
بہیں مڑے مڑے کی بات کرتا ہے۔“

”شاہ کیا باتیں؟“  
زارا نے پچھی سے اسے دیکھا۔

”کوئی سوچی سمجھی بات کی اسٹوری سناتا ہے اور بھی اپنے دوستوں کی باتیں لٹنے شروع ہوتی۔“  
زارا کو عظمیٰ سے باتیں کر کے مڑا آ رہا تھا۔ وہ دوسری جماعت میں تھی مگر مجھے اس سے بڑی لگتی تھی۔

میں اس سے بڑا تھا۔ گندی رنگ پڑی سیاہ آنکھیں۔ بے حد چٹکی ہوئی تھی۔ لیکن لہجے میں بچوں جیسی  
معمو بہت تھی۔

”شاہ بہو تیار ہوں آپ کا دل بہت گنگا سا بھی نہیں ہیں اور میں بھی جیلاں کی پھو پھو بھی ہمارے ساتھ  
 جاؤں گی تو پھر آپ کا دل بہت گنگرا جائے گا۔“  
 ”کہاں چلے جائیں گے سب۔“ زارا نے کہا۔  
 ”اے اور بڑھنے کے لیے۔ شادی ہواں گھر کے رہے ہیں نا اور پھو پھو ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔“ تارے نے زارا بھائی  
 میں نے پلان کر لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے میں لڑچکر میں سائز کروں گی پھر لکچر میں جاؤں گی۔ اساتو ڈاکٹر بننا چاہتا  
 ہے۔“  
 ”تو کیا شادی اسے ڈاکٹر بننے کی اجازت دے دیں گے۔“  
 زارا نے پوچھا۔  
 ”نہا نہیں نہ ڈی تو پھر اور کریں گی۔“  
 اس نے لارو والی سے کہا۔  
 ”میں مجھے تو پھو پھو کی طرح چورلا نکال نہیں سکتا رہی۔“  
 ”کیوں پھو پھو کی طرح چورلا نکالیں۔“ زارا مسکرائی۔  
 ”تمہاری شادی ہوگی ایک چھ ماہ بعد زندگی ملے گا تو پھر رہے ہوگی نافا انجرا کے ساتھ۔“  
 ”شادی ہی تو نہیں ہوگی۔ زارا بھائی۔“ دیکھیں نا ہماری جیلاں میں تو کوئی لڑکا ہے نہیں آپ کے سارے بھائی  
 کی شادی ہو چکی۔ پھو پھو کی شادی ہی نہیں ہوئی۔ سیدہ پھو پھو کی ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ اللہ جلے نہ  
 بھی ہیں یا نہیں۔ جھنگ سے بھی کوئی اور آگیا ہی نہیں اور قادی چاچو اور شادی میں نا رہا تھی جیلاں آ رہی ہے  
 جانے کب سے وہیں ان کا ایک بیٹا ہے۔ ایس بی سے بھی کوئی ڈاکٹر نہیں جاتی لیکن میں تو یہی جاتی ناہم  
 بھی اس لیے میں نے سب پلان کر لیا ہے ابھی سے جھنگ کی گلیں میں اور خمرے سے زندگی گزاروں گی۔“  
 ”ابا خیر کہیں سے کوئی خیر خواہ آئی جانے کہ جس بیٹا ہے۔“  
 زارا کو اس کی باتوں پر ہنسی آنے جاری تھی۔  
 ”کہاں سے آئے گا زارا بھائی اور دو تھوک آپ اس کیس کوئی ہے ہی نہیں اور میں نے ہی سوچ رکھا ہے کہ  
 کسی خیمے کے کوئی اپٹ کر لوں گی۔ میں نے اپنی کوئی خواب دیکھا ہی نہیں جس کے پورا ہونے کا چانس نہ  
 ہوں۔“  
 ”اے دیو رب تک سوچ لیا کرتے۔“ زارا ہنسی پڑی تھی۔  
 ”ہاں کوئی کوئی زندگی کی پلاننگ کر لیں جا چاہیے ایک حقیقت کا آپ کو علم ہے تو اسے قبول کر لو تو کچھ کم  
 نفسیاتی مریض کیا بنتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں جیلاں سے باہر شادی نہیں ہوئی تو نہ کسی زندگی میں شادی کی  
 کوئی اتنا ضروری بھی نہیں ہے کوئی اور مصروفیت بھی تو خود بنی جاسکتی ہے۔“ زارا نے بہت غور سے اسے دیکھا  
 بہت پروا اور مطمئن کی رہی تھی۔  
 ”اس پر قائم چاہا ہے بیٹے کا کس نے بتایا تمہیں۔“  
 ”میں شائنگ کے لیے جا رہے تھے تو اس نے ہماری گاڑی روک لی تھی۔ بعد میں شاہ رخ بھائی نے بتایا تھا کہ  
 قادی چاچا کا بیٹا ہے کہ اپنی بی بی جان ساتھ نہ ہو تو نہیں دیکھنا تھا اسے اور دو چار باتیں بھی کرتا نہیں۔“  
 ”تو تم نے نہیں دیکھا۔“  
 ”نہیں۔“  
 اس نے نفی میں سر ہلایا۔  
 ”ابا ڈاکٹر کا بھی کیا ذکر کرتے تھے۔ ابا یا رہا بیٹا فٹھے سے پہلے انہوں نے کہا تھا۔“ قادی سے ملے کو سہرا  
 چاہتا ہے۔ لیکن یہاں سب وہ کہاں ہے۔“

”اگر انہوں نے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی تو یہ کوئی اتنا بڑا جرم تو نہیں تھا۔ تھوڑا سا ڈانٹ فٹ کر  
 صاف کر دینا چاہیے تھا۔ غلطیوں تو انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ اگر تیرا دانی ہے صاف نہیں کیا تھا تو اب شادی  
 ہی صاف کر دیں۔“ گرا کر ان کا منہ نہ چلے وہ جانے کا کہیں پھو پھو بھی ہیں تو یہ دینا اور صرے اور وہ جانے شادی  
 کبھی نہیں ہائیں گے۔ لارو والی نے وہ نہ تو شادی اتنے سالوں بعد صاف نہیں کر دیتے قادی چاچو کو۔  
 ”ہاں لارو والی کہتے تھے اگر اس وقت وہ قادی چاچا کا ساتھ دے دیتے تو شادی کی بھی اپنا بدلہ نرم کر لیتے لیکن وہاں کی  
 ناراضگی سے ڈر گئے تھے پھر انہیں بی بی جان اور شادی کے شے کا بھی خیال تھا لیکن بعد میں پچھتاہے تھے۔“  
 زارا نے بتایا تو اس نے سر ہلایا تب ہی شاہ زب نے اندر قمر رکھا۔ ایک مسکرائی ہوئی کمری نظر ڈار پر والی  
 اور پھر کمری کی طرف دیکھا۔  
 ”قمر چاچو پھو پھو کی بیٹی ہیں ان سے کب لگاؤ۔“  
 ”شادی کر دے رہے ہیں کہ قمری اس کی سٹ کے لیے کھانا تانمڑی داخل کروا دو۔“  
 ”بھئی کون بی بی جان تو کہہ رہے تھے شادی کھڑے ہو رہے ہیں۔“  
 ”ان کا ارادہ بدل گیا ہے۔ مگر لوگ مجبور کر رہے ہیں۔“  
 ”تو پھر کھڑے ہوں گے۔“  
 ”ہاں۔“  
 ”لیکن کیا بیٹے تھے سیاست میں بہت گندے خاص طور پر ہمارے ملک میں پختا سیاست دان کرے ہاں اتنا کوئی  
 اور نہیں۔“  
 ”ضروری نہیں کہ سب ہی کرے ہوں۔“  
 شاہ زب نے لارو والی سے کہا۔  
 ”وہی ہے اور بڑے شاہ جی نے علاقے کے لیے بہت کام کیا ہے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کا ہائی اسکول کھول دیا  
 سب انہوں نے ہی بنوائے لیکن لڑکیوں کے اسکول کے لیے انہیں لکھنا ہوتا پورا پورے وسائل لگ گئے تھے اگر  
 وہ سیاست میں ہوتے تو وزیر کی کمرہ تو آسانی سے ہو جاتا نا اس اسی نے شادی چاہتے ہیں کہ میں صوبائی اسمبلی  
 کے لیے کھڑا ہو جاؤں ہاں تو کوئی امکان ہے ہی نہیں اس طرح میں علاقے کی بہتری کے لیے سب کام کر سکوں  
 گا۔“ زارا نے سر ہلایا۔  
 ”میں ذرا بیچ کر لوں تو پھر مجھے شادی کے ساتھ جانا ہے اسی سلسلے میں ایک بیٹنگ ہے۔“  
 وہ اور دو روپے کے چرے نکال کر دواں روم کی طرف بڑھ گیا تو زارا بھی اٹھ کر باہر آئی اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ  
 دیر پھو پھو اور بی بی جان کے پاس بیٹھے کی اور بی بی جان سے اونچی چوٹی جانے کی اجازت لے لی۔ برآمدے میں بڑے  
 فون کی بیل ہو رہی تھی اس نے اور دواں رکھا اس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ سات آٹھ بیلوں کے بعد اس نے  
 رہیں اور اٹھایا دواں کی طرف شاہ رخ تھا۔  
 ”ارے آپ زارا ہیں کبھی ہیں آپ میں شاہ زب ہوں۔“  
 ”جی میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں۔“  
 ”اللہ کا شکر ہے مجھے شادی سے بات کرنا تھی لیکن انہوں نے موبائل آف کر رکھا ہے کہ کیا کر رہے ہیں۔“  
 ”کچھ دیر پہلے تو بی بی جان کے کمرے میں تھے میں دیکھتی ہوں۔“  
 ”آپ خوش ہیں زارا ایڈجسٹ منٹ میں کوئی پرالیم تو نہیں ہوا۔“  
 ”نہیں۔“  
 ”شاہ زب تانا تو نہیں۔“ ان کے لیے میں شرارت تھی۔ اس کے رخساروں پر سرنی دو لگی۔  
 ”آپ ہونے لگیں میں۔ جیتی جیتی شادی کو۔“

”اس سے اگر تسہاری مراد اپنا بھائی ہے تو وہ ہرگز اسنی سے بہتر نہیں ہے نہ شکل و صورت میں نہ طرز اور نہایت میں۔“

افضل حیدر جہاں بات منہ پر کر دینے کے عادی تھے۔  
 ”انتہا تو جاتی تھی ہی ہوگی کہ نہ ان حضرت کے تعلیم عمل کی اور نہ ہی کوئی ذہن کا کام کر سکے۔ چنوں پپ پر چند دن کام کیا اور پھر ایک کالے سے اچھے کو توڑی بھونڈی شیشیہ ساری فضیل میرا نے تھی جتنی قابل آپ کو یاد نہیں رہی۔“

سعدیہ ایک لہو کو خاموش ہو گئیں۔  
 ”میں نے تجھ میں اس کی بات نہیں کر دی تھی فی الحال اور پھر تعلیم کا کیا ہے، بھائی جان! اسے اسٹوڈنٹ بنا کر روے رہے ہیں وہاں۔“  
 ”چھو۔“

افضل حیدر کا اجماعی خیر تھا۔  
 ”تپ میری بات کو مذاق میں ممت اڑائے، میں سنجیدہ ہوں۔ غدا اگر اس مقصد کے لیے آری ہیں تو نہ آئیں۔ دیکھ سہار! آئیں، ان کے بھائی کا گھر ہے۔“

غدا رات قابلاً، شیشیہ کی شادی کا بلا دوائے کرنی ہیں اور جہاں تک ہماری بات ہے سعدیہ بیگم راتو میں نے تو سبھی آپ کی بات کو مذاق میں جانے دیوں گے، آپ نے اتفاق کیا تھا لیکن ہم نے سچ جانایا اور ان۔“  
 ”مکمل ہونے کا راز ان کا ہوا تو انہوں نے کیا؟ افضل حیدر ذرا سا مسکرائے۔  
 لیکن سعدیہ نے کچھ بھی نہیں کہی۔ ان کی بیٹی شالی رشتہ بنی ہوئی تھیں۔“

”افضل میں کمرہ رہی ہوں کہ اگر غدا راتے سفر کے لیے بات تو میں صاف انکار کر دوں گی۔“  
 ”وہ پھر بعد سعدیہ نے کہا۔  
 افضل حیدر کے مسکراتے چہرے پر سنجیدگی نظر کرنے لگی۔  
 ”کبھی میں میں سوچا ہوں سعدیہ! میں نے تمہیں مجھے میں غلطی کی۔“

ان کی آواز بدست دھم کی جیسے انہوں نے خود سے کہا ہو۔ سعدیہ ان کی پسند تھیں۔ یہ نہیں کہ ان کا سعدیہ کے ساتھ تھی اور پھر انہوں نے سعدیہ کو دکھا اور پھر ان کا تھا۔ ان کی کلاس ٹیوٹ میں اور ایک بھونڈا مذاق انہیں قریب سے آیا تھا لیکن زندگی میں بہت سے ایسے مقام آئے تھے جہاں سب احساس ہوا تھا کہ انہوں نے سعدیہ کو منتخب کرنے میں جلدی کی تھی۔ وہ ان کی امیدوں پر پوری نہیں اتری تھیں خصوصاً ”اماں جان“ کے لیے۔ انہیں سعدیہ سے بہت شکایتیں تھیں کہ انہوں نے سعدیہ کو کبھی بتایا نہیں تھا لیکن انہیں سعدیہ کا سہلے میں کو شک تھا کہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی انہیں سعدیہ کا انداز کاوارزرا تھا لیکن انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔

وہی لاؤنڈن میں بیٹھے تھے جب غدا رات کا فون آیا تھا اور انہوں نے شیشیہ کی شادی کا ذکر کیا تھا کہ وہ تین دن تک اس کی شادی کرتا ہے اور سب نے ہی شادی میں آنا ہے۔ غدا رات تیار رہیں۔ انہوں نے اپنے کراچی آئے گا بھی ذکر کیا تھا کہ وہ فون تک وہ کراچی کا چکر لگائیں گی یا ضابطہ دعوت دینے کے لیے۔ جب غدا راتے سب میں گردے تھے تو سعدیہ بھی لاؤنڈن میں آگئی تھیں اور یہ جان کر کہ غدا راتے والی ہیں انہیں خدشہ ہوا کہ کہیں وہ سفر کے سہلے میں تو نہیں آریں کیونکہ افضل حیدر نے چند دن پہلے ہی اس سفر کے حلق ان سے بات کر کے ان کی رائے پوچھی تھی۔

اس سفر تو انہیں اس کے بچپن سے ہی چھٹی تھی۔ اماں جان جب اس کو رے کر لئی تھیں تو ایک دو بار اس کے سہلے میں ان کی حزب ہوئی تھی۔ فیروزہ دھڑلے سے ایسی ہی چھٹی چھٹی باتوں پر۔ اماں جان چاہتی تھیں

اس نے ریسپورنڈ کر رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے شاہ زیب نے آکر ریسپورنڈ کر لیا۔  
 ”کس کا فون ہے؟“

”شاہ زیب، شاہ زیب کا فون ہے۔ بات کرتا ہے۔ انہیں میں ملتا ہے جا رہی ہوں۔“  
 ”شاہ زیب باہر مروتا ہے میں چلے گئے ہیں۔“  
 اس نے ایک تیز سے بھری نظراس پر ڈالی اور دیکھا کہ جس میں بولا۔  
 ”بیلو شاہ زیب، شاہ زیب کی بات سنتا رہا۔ گا ہے گا ہے ایک تیز نظراس پر بھی ڈال لیتا

کچھ ویرہ ہو کر آ رہی ہیں کاؤں سے لگاتے شاہ زیب کی بات سنتا رہا۔ گا ہے گا ہے ایک تیز نظراس پر بھی ڈال لیتا تھا۔“  
 ”تمہیک ہے میں ابھی شاہ زیب کو بتا رہا ہوں۔“ ریسپورنڈ کر لیتا ہوا اس نے زار کی طرف دیکھا۔  
 ”ہمارے ہاں خاتون ریسپورنڈ نہیں کر رہی زار! شاہ زیب۔“

”بہت دیر سے تیل ہو رہی تھی اس لیے میں نے اٹھا لیا۔“  
 ”اور آج پورے مسکرا مسکرا کر کیا نہیں لگا رہی تھیں۔“  
 ”وہ کوئی تیز نہیں شاہ زیب تھا تھا تھا۔“ زار کو شاہ زیب کے طرز عمل پر حیرت ہوئی۔

”نو، آؤ گے منٹ زار! شاہ زیب نے ہاتھ اٹھایا اور تیزی سے واپس پلٹ کر کمرے میں چلا گیا۔ فون کی بیل سن کر وہ اس روم میں جاتے جاتے پلٹ آیا تھا لیکن اس کے باہر آنے سے پہلے ہی زار فون اٹھا چکی تھی اور اسے بات کر رہے تھے کہ ٹھیک سے دیکھ میں اس کے دل میں ڈنکسا تھا۔  
 ”لوگوں ہو سکتا ہے جس سے زار اسکا مسکرا کر بات کر رہی ہے۔“  
 شاہ زیب کا نام سن کر بھی اس کے اندر دل کھٹا غصہ نہ نہیں ہوا تھا اور زار اجرائی سی برکتے میں کھڑی اس کے لیے اور فون پورے غور کر رہی تھی اور چلکیں سمجھتی جا رہی تھیں۔

”آخر تمہیں اسراور علیہ کے رشتے پر اعتراض کیوں ہے؟ بڑھا لکھا ہے، اپنا ہے۔ خاندان، برادر، یہ کچھ بھی دیکھنے کی ضرورت نہیں پھر اپنا دیکھا بھلا ہے۔ بچپن سے خوان ہونے تک کا ایک ایک لمحہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مذہب ہے، گوشتی بری عادت میں پھر۔“

افضل حیدر نے اس کی دیکھ کر۔  
 ”تو کچھ بھی نہ دیکھ بھائی شاہ زیب! ہر اڑا سفر سے نہیں کرتی۔“  
 سعدیہ پر افضل حیدر کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔  
 ”لیکن سعدیہ کوئی بوج۔“

افضل حیدر نے دست فور سے انہیں دیکھا۔  
 ”بوج کوئی چیز نہیں ہیں وہ مجھے پسند نہیں ہے کیا میں اپنی بیٹی کے لیے اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ آپ نے خضر کے لیے سب کچھ کیا تو میں خضر کو ہوتی۔ حالانکہ میری قی خواہش تھی کہ میں عرش یا نازش کو اپنی بہنوئیوں۔ اب میں اس سفر کے لیے منع کر رہی ہوں۔ آپ کبھی مہند کریں۔“  
 ”تو کیا تم شخص اسے خضر کر رہی ہو کہ میں نے خضر کے لیے۔“

افضل حیدر کو جرت ہوئی۔  
 ”تمہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ علیہ کے لیے میں اس سفر سے بہتر مشغلہ کر سکتا ہے۔“  
 سعدیہ نے ان کی بات کاٹ دی۔  
 ”اسنی سے بہتر۔“

افضل حیدر نے تمہیں اچکا نہیں۔



”لیکن گلتا ہے ممانے فخر بھائی کی طرف سے ایسے ہو کر تمہارے لیے حیران آئی۔“  
”ہرگز نہیں۔“

”کمرے میں تیزی سے اصرار سے دھر جاتے ہوئے علیحدہ سے زور سے پاؤں زمین پر پٹختے  
”مجھے اس باؤڑے کے شادی نہیں کرنا۔ بندر انگریزوں کی فٹالی کر کے سمجھتا ہے انگریز ہو گیا ہے۔ خود کو  
امریکہ کا مہمدر سمجھتا ہے۔“  
”تو تم دانا ہے کہ دانا ہے سب۔“

”ایرج نے مشورہ دیا۔“  
”اور میں کہ بھی دونوں کی کیا سمجھی ہو کہ میں خاموشی سے ممانے فیصلے پر سر ہٹا دوں گی۔ کہ مجھے ان کا  
خبر پانا تھا منظور ہے۔“

”ایرج حتمہ پٹختے کر کے سمراتی۔“  
”تو جس پھر پریشان کنی ہے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ یہ کوئی بچا سواں پکڑے تمہارا اب تو تمہارے پاؤں بھی  
دوبادے گئے ہوں گے کہ میں کہ ان پھر روازے کے پاس آئی۔ تمہارا سا دروازہ کھول کر باہر نکالنا۔ لاؤچ میں خاموشی تھی۔“

”افضل حیدر بیوی دیکھ رہے تھے اور سحرہ بیگم جاچکی تھیں غالباً“ ”سنے کر کہ میں۔“ ”پانچس بلٹ کراس نے ایرج  
کی طرف دیکھا جو اپنی باؤڑی کی کالی کھولے اس پر کوئی دایا گرام ہٹا رہی تھی اور پھر بیڑ پر بیٹھ کر سائیڈ میں سے اپنا  
مہاں اٹھایا اور اسٹرکٹر ڈاؤن کر کے لگی۔“

”بیٹو۔“ ”دوسری طرف سے اسٹرے فوراً اٹھ بیٹھ گیا۔“  
”اسٹرے۔“ ”سڑکی آواز سنتے ہی اس کی پگلیں مٹ ہوئے گئیں۔“  
”ہاں عیناً! کو کیسی ہو؟“

”دوسری طرف اسٹرے کا ہاتھ۔“

”نہا نہیں۔“

”اس کی آواز بھرائی۔“

”کیوں کیا ہوا عیناً؟“

”کچھ نہیں۔“

”آنسو اس کے رخساروں پر دھلک آئے اور لیوں سے سکی نکل گئی۔“

”تم روری ہو عیناً؟“

”اسٹرے نہیں ہو گیا۔“

”نہیں تو۔“ ”اس نے انکار کیا لیکن آنسو اور روانی سے بہنے لگے تھے۔“

”عیناً! بیٹو۔ کیا ہوا ہے دو وقت۔“ ”کہ وہ روئے تھی۔“

”سیرا بل بند ہو جائے گا عیناً! بیڑ رو تو مت۔ خدا راجا کیا ہوا۔“

”نہا نہیں۔“

”علہ۔“ ”نہا نہیں۔“ ”تھی۔“ ”تھی۔“ ”تھی۔“

”ایسی جان پر و گرام ہٹا رہی ہیں اسے کا۔“

”آپ نے پچھو سے بات کی۔“

”نہاں یا ار بھی بات میں کی۔ ایسی جان پہلے کی کچھ پریشان ہیں ان دونوں۔“

”کہ اسٹرے کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ساں باپ سے دور لائی تھیں تو چاہتی تھیں بہت توجہ اور سیاہ روپ۔ خود بعض  
اوقات بڑھاپے کمزوری اور بیماری کی وجہ سے وہ اسٹرے کا کام نہ کیا تھیں تو سحرہ سے بہت دور سحرہ بختری  
وجہ سے اس دوری بند داری سے چڑتی تھیں۔ اسٹرے کا بڑا ہوا تو فخر کا کوئی حلو نہ تھا تا تو چھین تھیں۔ موقع ملا تو  
ایک آدھ فخر بھی نکا دیتیں۔ اسل جان نے جب محسوس کر لیا کہ وہ اسٹرے سے چڑتی ہیں تو پھر انہوں نے سحرہ بیگم  
سے آخر کے حوالے سے کچھ کہنا چھوڑ دیا اور جس طرح حرفی جیل کے خوف سے بچوں کو اپنے پیروں تلے چھپا لیتی  
تھیں انہوں نے بھی اسٹرے کو اپنے پیروں تلے چھپا لیا تھا۔“  
”افضل بھی اسٹرے کا خیال فخر کی طرح ہی رکھتے تھے۔“

”اب عذرار کے آنے کا سن کر سحرہ سے سوچا ضرور وہ اسٹرے کے لیے آ رہی ہیں۔ صوفاف صاف کہہ دیا تھا کہ  
”اسٹیں اسٹرے اور علیحدہ کارشتہ منظور نہیں ہے۔ کو افضل جانتے تھے کہ عذرار اس مقدمہ کے لیے نہیں آ رہیں۔ اسٹرے  
سے علیحدہ کے متعلق خود ان سے بات کی تھی کہ اگر اسٹیں اعتراض نہ ہو تو وہ ای جان اور ایا جان کو بھیجے تو انہوں  
نے سوکت سے منع کر دیا تھا۔“

”تم سے بڑھ کر مجھے کئی عزیز نہیں ہے اسٹی بیٹا! لیکن فی افعال نہیں۔ جب میں کہوں گا کہ تم بھی اور بھائی  
جان کو بھیج دینا اور مطمئن رہو میں سمجھتا ہوں کہ کھینا کے لیے تم سے بہتر ہم ضرور کوئی نہیں ہو سکتا۔“  
”میں نے کیا کہا ہے آپ نے؟ میں اسٹیں افضل! میں خاموشی دیکھ کر سحرہ سے اپنی بات نہ ہرائی۔“  
”میں صاف انکار کر دوں گی اگر۔“

”میں نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ اس مقدمہ کے لیے نہیں آ رہیں اور فارگلا سیک۔ کوئی افضل بات مت کرنا  
عجی۔ ہر سول بعدہ آ رہی ہے۔“

”افضل حیدر کے لیے سے ناگواری تھک رہی تھی۔“  
”لیکن میری آپ بات بھی یاد رکھیے گا۔ کیا مجھے اپنے بچوں کی شادیوں کے سلسلے میں رائے دینے یا فیصلہ  
کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”نہو سحرہ۔“

”ان کا بیڑ نرم اور اناڑ سمجھنے والا تھا۔“

”ہمارے بچوں کی شادیوں ہماری باہمی رضامندی سے ہی ہوں گی لیکن اس میں بچوں کی پسند بھی شامل ہوگی۔“

”ان کی زندگی کا فیصلہ ہم تجنا نہیں کر سکتے۔“

”عیناً بھی اسٹرے کو اس لحاظ سے پسند نہیں کرتی۔“

”جھوٹ پائل جھوٹ۔“

”اپنے کر کے سحرہ کو دوازے سے لگی علیحدہ چل بیڑی۔“

”تمہا کو اس طرح غلط بات نہیں کرنا چاہیے۔ میں اب بھی کہا ہے کہ سحرہ ہوں کہ۔“

”مجھے صرف اور صرف اسٹرے شادی کرنا ہے۔“

”ایرج نے اس کی بات مکمل کر دی۔“

”وہ بیڑ پر بیٹھی مسکراتی نظروں سے علیحدہ کو دیکھ رہی تھی جو بک سے دروازے کے ساتھ چڑی کڑی افضل  
حیدر اور سحرہ کی گفتگو سن رہی تھی۔ کو ان کی آواز کمرے تک آ رہی تھی پھر بھی جب ایرج نے اسے آگرتا یہ کہ  
مماورہ اسٹرے اور اس کی شادی کو ڈسکس کر رہے ہیں تو وہ اٹھ کر دروازے کے پاس آنکھری ہوئی تھی۔“

”تو اور کیا۔“

”وہ دروازے کے پاس سے ہٹ آئی۔“

”شادی تو مجھے اسٹرے سے کرنا ہے۔“

”کیوں اس نے پوچھا۔“

”پھر یہی بتاؤ گا اس وقت تمہارا بن بن رہا ہو گا اور سونے پر غرور ہو۔ ماموں جان سے میری تفصیلی بات ہو چکی ہے اور انہوں نے مجھے کہا ہے کہ اسی میں ای جان کو نہ بھیجوں کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ جب ای جان آس تو اس ہو کر نہ جائیں۔ تم سمجھ رہی ہو۔ پسکے وہ ممالی جان سے بات کر کے ان کا دل نرم کرتا چاہتے ہیں۔ سو مجھے فکر ہو۔“

”کیسے فکر ہو! اسنی! اما تو میری شادی کرنے پر تلی ہیں اس ولا جی کو دیکھتے سے۔“ وہ جھلائی۔

”تو کیا اچھا ہے ولایت کی میر کرنا دل کیلئے ساتھ میرے چار غریب سا بندہ۔“ سفر نے مزالیا۔

”آپ بھی اسٹراڈا اسٹاس میں سے آپ کو کون میں کتنی پریشان ہوں۔“ اگر۔“

”میری جان! میں نے کہا تھا پرانی ولا کوئی بات نہیں۔“

علینہ کے چہرے پر رنگ سے چہل کے اسٹراڈا میں اس طرح فرہنگ کی بات کر آ تھا۔ زیادہ تر سیریس ہی رہتا تھا۔ ”ماموں جان نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ مجھ سے بہت مناسب سمجھتے ہیں۔“

”لیکن اسنی مجھے رو لگتا ہے کیس ماما۔“

”دیکھو علینہ تم کو خود نہ پتا۔“ کچھ نہیں ہو گا ہاں اگر تم اپنی جی کے سامنے بار گئیں تو پھر ماموں بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

”میں تو آپ کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی اسنی۔“

”تو میں کبھی تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔“

اسٹراڈا کا جب تک کی شدت سے ہماری ہو گیا۔

”تم نہیں جانتیں عینا تم نے جس جذبے کی آگھی تھی دی ہے اس جذبے نے میرے اندر چراغ اٹھ کر دکھا ہے۔ میں تو ہر لمحہ تمہیں اپنے قریب محسوس کر رہا ہوں۔ تم جیوش میرے آس پاس رہتی ہو۔“

عینہ کے رخسار پر یہ ہے۔ اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسٹراڈا کیا کیے۔ اس نے مڑ کر ایراج کو دیکھا

وہ اسنے لوٹس پر جھلی ہوئی تھی۔ اسے دل ہی دل میں اسٹراڈا سے شکوہ رہتا تھا کہ وہ اٹھارہ کے معاملے میں بہت قیوس ہے لیکن آج جب وہ بول رہا تھا اٹھارہ کر رہا تھا لفظ اس کا ساتھ چھوڑنے سے۔

”اسٹراڈا! اللہ حافظ! میں یہ بات کر لوں گی آپ سے۔“

”اوکے اللہ حافظ۔“

فون بند کر کے اس نے میاں بل بند کر کے بیڑ پر بیٹھا۔ ایراج نے سرائی کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ

دروازہ کھول کر باہر دیکھ رہی تھی۔ افضال حیدر لاؤنچ میں آگئے ہی بیٹھے دی وی دیکھ رہے تھے سعدیہ بیگم واپس

نہیں آئی تھیں۔ ”نابا! ۱۳ چھاپا۔“ ڈاک آؤٹ کر چکی تھیں۔ واپس پلٹ کر اس نے میز سے نکل اٹھائی اور کھول کر

لوٹ دیکھنے کی گپ لیکن سب سے پہلے وہ اوپر سے گزر رہا تھا اس نے جھجکا کر فائل بند کر دی۔ اور کھڑی ہو گئی۔

”چلو ایراج! آؤ دیکھتے ہیں۔“

”کیوں کیا خریدتا ہے؟“ ایراج نے پوچھا۔

”جھنجھکی رہتے ہو۔“ اس نے گھٹے اور مجھے کتا ہیں بھی خریدنا ہیں۔“

”تو یہ شاہک! کھینچتے تھے کتنی نہیں کر سکتیں۔“ ایراج نے سکندری سے کہا۔

”نہیں اس وقت کچھ بھی کر کے کاموڑ نہیں ہو رہا۔ شاہک! کریں گے گھوٹیں پھریں گے بس چلو اٹھو اور اوپر آؤ۔“

اگر وقت ہو تو ان دنوں کی طرف چلیں گے۔

”چھاپا پھر ٹھیک ہے مجھے بھی میل سے کام ہے۔“

”تم ہر روز دکان میں رہنا ہے تھی ہو پھر میں اس سے ملنے کو بے تاب رہتی ہو۔“ علینہ مسکرائی۔

”مجھے اس سے کچھ نوٹس لینے تھے۔“

ایراج نے کتا میں سمیٹ کر ایک طرف رکھیں۔ اور کھڑی ہو گئی۔

”تم اپنا ہو جاؤ میں ابھی اسے اجازت دے لوں۔“

”مسا کو بھی بتا دینا تو جیسے ہی ان کا موڑ آئے۔“

علینہ نے کہا تو ایراج نے اس پر ایک کمری نظر ڈالی۔

”بہا فرض کرو اگر اسٹراڈا سے تمہاری شادی نہ ہو سکتی۔“

”تو کیا۔“ وہ گھر میں مل کر بندہ جائے گا یہ دیکھ کر ہی ہوں میں ہی نہ پاؤں گی۔“

”خدا کرے کہ ایسا بھی نہ ہو۔“

ایراج نے اسے بل میں بل میں جاکر اسٹراڈا اور علینہ کی شادی ہو جائے علینہ وہ شادی اس صدمے کو برداشت

ہی کر سکتے وہ بھیجیں سے ایسی ہی تھی کریں۔ جس بات پر اڑجائی تھی اسے پورا کر کے ہی پھوڑتی تھی۔ کتا کتا

ابھی بھجھا۔

ایراج کو یاد تھا ایک بار اس نے بچپن میں ایک لڑکا لیتے کی ضد کی تھی۔ اور ماموں نے نہیں لے کر دی تھی۔ اور وہ

را اس نے بخار چڑھا تھا۔ اور جب وہ سنے ہو گیا وہ لڑکا لیتے کچھ تو وہ بچہ بچلی تھی تب تک ہی دن وہ بیمار

رہی تھی۔ جب تک اس کا دل نہیں لگتی اس کی جی اس نے مسابقت نہیں کی تھی۔ جب کہ ایراج کا مزاج

بل کے بالکل برعکس تھا کہ وہ کی بات کے لیے ضد نہیں کرتی تھی۔ افضال حیدر اکثر لیتے تھے وہ مزاج میں بالکل

عکس پر تھی۔ کیونکہ اسے فطری طبع پیچھوئے ہی تھی۔

”ابھی اس اور عینا شاہک کرنے جارے ہیں واپس پر ہم انکل نصیر کی طرف جائیں گے۔“

ایراج نے لاؤنچ میں آکر افضال حیدر سے کہا تو انہوں نے دی وی آف کر کے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے لیکن اگر تمہیں نصیر بھائی کی طرف دیا تو وہ دیر کرنا ہو گا ڈی واپس بیچ دینا۔ مجھے ایک جگہ کام سے

ہانا ہے۔ میں ڈھکرو فون کروں گا کہ وہ اس سے اٹھے تو تمہیں نصیر کے گھر سے پک کر لے۔“

”کیا اچھا۔“

ایراج سر ہلاتی ہوئی ماموں کے کمرے کی طرف بڑھی گئی۔

”ماما۔“

اس نے دروازے کو زور سے کھول کر اندر جھانکنا بیڑ کے کراؤن سے ٹکک لگائے اخبار دیکھ رہی تھیں۔

”ماما! ہزار شاہک کرنے جارے ہیں۔ میں نے کہا ہے اجازت لے لی ہے۔ اور شاہک کے بعد وہ انکل نصیر

کو لے جائیں گے۔“

”لوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی۔“

”ہیہ یہ اخبار ایک طرف رکھ دو۔“

”شاہک! کر کے سیدھی گھر کو آؤ۔“

”نکریں ماما؟“ ایراج کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”مجھے نہیں پسند ماما! دروازہ دروازہ جاننا ہی طرف۔“

”ایسا! ماما! تم بہت کم جارے ہیں اور جب نہ پیچھو آؤ تھیں تو میں ان کے ساتھ جاتی تھی۔ اور عینا کو بھی گئے

”انہو گئے ہیں۔“

ایراج کی عادت جیت کی تھی۔ لیکن ماما کی بات سن کر اسے افسوس ہوا تھا۔

”اور پھر وہ کسی غیر کا نہیں ہماری پیچھو کا گھر ہے۔“

”کی پیچھو نہیں ہیں وہ مسکرائی۔“ ”سعدیہ کا گھر جلا آتا تھا۔“

”مدید۔“

افضل حیدر بھی اچھے کردہاں ہی آگئے تھے سیراج نے افضل حیدر کی طرف دیکھا تو ایک طرف ہٹ گئی وہ اندر کرے میں بیٹے گئے تھے۔

”میں نے طیبہ کو پیش کر دیا، سن رہی تھی اور سکی نہ سہی ماموں زادوں کو ہے۔ اور پھر میرے تم کس اندام میں بات کر رہی ہو۔“ کی اور کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔

افضل حیدر کے لیے میں نئی جگہ مقرر کر رہی تھی۔  
”ہلاچہ اور حان بچوں کا بھاک بھاک کر رہا تھا۔ پسند نہیں ہے ایک وہ فخر ہے پھر پتے وہاں جانا اس کے فرائض میں شامل ہے۔ کچھ کو تو جو اس میں نے فخریت معلوم کرنے کا ہوا نہیں۔ اگلے تصویر خوش ہو جاتے ہیں۔ ان کے اپنے بچے جو ان ہیں۔ نیز فخریت معلوم کر سکتے ہیں اس۔“

افضل حیدر نے اس سے اس سے انہیں دیکھا۔ اور پھر کچھ کہتے کہتے کہ مرکز امیر کی طرف دیکھا۔  
”تم جاؤ بیٹا۔“

امیر کو ان میں سے اس واقعہ سے کچھ یاد نہ رہا۔ اور پھر یہ تھی۔  
”آج محالاً کو موت خراب ہے۔“  
گازی میں بیٹھے ہوئے اس نے علینہ کو بتایا۔

”اور تم آج ان سے اچھے سوچی فوج کر رہی تھیں۔“ علینہ بولے۔  
”وہ ساری کھنگھرتے تھے۔ بعد بھی جوانی بھاگے ساتھ ہوئی۔“

”لیکن عینا وہ طیبہ پچھو کی طرف بھی جانے سے منع کر رہی تھیں ان کی باتوں سے یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں پسند نہ کرتی ہیں۔ مگر وہ بھی کون سا مدھی کی پچھو ہیں۔“ امیر بھی حیرت میں تھی۔  
”مما کو یہ خوف ہے کہ کسی خضر بھائی باہور کو پسند نہ کر لیں جب کہ وہ خضر بھائی کے سرخ سر یا باغش کو پسند نہ کر لیں۔“

”لیکن باہور آئی تو عرض اور نازش کے ساتھ میں بہت خوبصورت ہیں پھر۔“  
”یہی تو بات ہے میری جان۔“ علینہ سگرائی۔  
”اور تمہیں یہ بھی بتانا کہ خضر بھائی باہور سے ہی شادی کریں گے چاہے وہ اچھے یا بکریں یا نہیں۔“

”تمہیں کہنے چاہیے خضر بھائی نے بتایا؟“  
”نہیں۔ لیکن ناؤ بے دل ہے بھی تو امت کی نظر رکھتے ہیں۔“

امیر کو حیرت بھی ہوئی تھی اور خوش بھی پھر وہ سارا وقت اسی موضوع پر بات کرتی رہی۔ یہاں تک کہ شاہنگ سینئر کی ایک گاڑی ایک فخریہ پارک کروا کے وہ شاہنگ سینئر میں بیٹھ گئی۔ علینہ کو جلد ہی گفت پسند آ گیا تھا۔ سو زادہ کھونا نہیں پڑا۔ دیکھ دیکھ یو یو کی حکومت پھر کروا اور پھر پھر دیکھی رہیں۔ امیر نے بھی ایک دو جھجھکیاں

خیر کیا۔  
ایک لالہ کار نے بیٹنی سے کہا کہ وہ گاڑی کی طرف جاری تھیں کہ ایک چاکا علینہ کو ٹھک کر رک گئی۔  
”نہا۔“ اس کے کیوں سے زبرد گلا۔

وہ یقیناً نہا ہی تھی۔ ناز جو یونیورسٹی میں علیا پس کر آتی تھی۔ اور جس کا سارا چہرہ چاب میں چھپا ہوا تھا۔ سوائے آنکھوں کا خیال آئے۔ آئی اس نے بے حد غور سے شاہنگ سینئر کی طرف دیکھا۔ ناز کو دیکھا۔ اس لڑکی کی آنکھوں کا رنگ دوسرے مختلف تھا۔ لیکن وہ رنگ تو نہیں ہے بھی نہ جڑیں ہو سکتا ہے۔ وہاں شاید نہا ہی تھی۔ بہت شرم اور زار زور تھے۔ لکھے میں ڈیڑھا لکھے جو ایک اس کا رخ بتاتا چڑھا تھا وہ اپنے ساتھ چلنے والے درمائی عمر کے محو سے ہنس ہنس کر کچھ کہہ رہی تھی۔ اور علینہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اور اب تک کیا تمہاری بہن صاحبہ سوری تھیں پہلے انہیں اچھے نظر نہیں آتی تھی۔“

”یہاں صلاح الدین نے بیڑے کے کراٹوں سے ٹیک لگاتے ہوئے صوفہ چیر چیر بیٹھی عذرا بیگم کی طرف دیکھا۔ جو صطرب کی بار بار بکریوں کی طرح تھیں۔“

”اور اب جب کہ میں نے ہاں کر دی ہے تو چلی آئی ہیں رشتہ کر کے۔“  
”لیکن میاں صاحبہ وہ ابھی تو چننا ہوئے کئے کئے آئے۔“  
”ان روز انہوں نے فون کر کے آئے کہ کماؤ آپ نے منع کر دیا۔ حالانکہ میں نے آپ کو بتایا بھی تھا کہ وہ اس مقصد سے آئی ہیں۔“

”اور یہی ہے۔“  
”تو؟“  
”میاں صلاح الدین نے عینوں پر اچھا کیا۔“

”وہ تو کا جرحی سے صرف میرے گئے آئے۔“  
”اور اب جب کہ میں نے ہاں کر دی ہے تو چلی آئی ہیں رشتہ کر کے۔“  
”میں صاحبہ آپ نے بتایا تھا کہ اگر اس کی عمر زیادہ ہے اور تمہاری عمر تو ابھی۔“

”اور اوہ لالہ کار بیگم جہاں اور بہت سی خوبیاں ہوں وہاں ایک اچھے کی برداشت کر رہی ہوتی ہے۔“  
”لیکن میاں صاحبہ۔“

”وہ ابھی اس بات پر اس بحث کو ختم کرو۔ میں نے کل شام ہی حامی صاحب کے ذریعے ہاں کھلا دی تھی۔ اور اب کو بتایا تھا پھر بھی حتمہ یکساں ہی آئیں۔“  
”اب کچھ طرے ہو گیا۔“  
”میں صاحبہ آپ نے بتایا تھا کہ اگر اس کی عمر زیادہ ہے اور تمہاری عمر تو ابھی۔“

”اور اوہ لالہ کار بیگم جہاں اور بہت سی خوبیاں ہوں وہاں ایک اچھے کی برداشت کر رہی ہوتی ہے۔“  
”لیکن میاں صاحبہ۔“

”وہ ابھی اس بات پر اس بحث کو ختم کرو۔ میں نے کل شام ہی حامی صاحب کے ذریعے ہاں کھلا دی تھی۔ اور اب کو بتایا تھا پھر بھی حتمہ یکساں ہی آئیں۔“  
”اب کچھ طرے ہو گیا۔“

”میں صاحبہ آپ نے بتایا تھا کہ اگر اس کی عمر زیادہ ہے اور تمہاری عمر تو ابھی۔“  
”اور اوہ لالہ کار بیگم جہاں اور بہت سی خوبیاں ہوں وہاں ایک اچھے کی برداشت کر رہی ہوتی ہے۔“  
”لیکن میاں صاحبہ۔“

”وہ ابھی اس بات پر اس بحث کو ختم کرو۔ میں نے کل شام ہی حامی صاحب کے ذریعے ہاں کھلا دی تھی۔ اور اب کو بتایا تھا پھر بھی حتمہ یکساں ہی آئیں۔“  
”اب کچھ طرے ہو گیا۔“

”میں صاحبہ آپ نے بتایا تھا کہ اگر اس کی عمر زیادہ ہے اور تمہاری عمر تو ابھی۔“  
”اور اوہ لالہ کار بیگم جہاں اور بہت سی خوبیاں ہوں وہاں ایک اچھے کی برداشت کر رہی ہوتی ہے۔“  
”لیکن میاں صاحبہ۔“

”وہ ابھی اس بات پر اس بحث کو ختم کرو۔ میں نے کل شام ہی حامی صاحب کے ذریعے ہاں کھلا دی تھی۔ اور اب کو بتایا تھا پھر بھی حتمہ یکساں ہی آئیں۔“  
”اب کچھ طرے ہو گیا۔“

”بھلا شجاع سے بڑھ کر ہمیں کون عزیز ہو سکتا ہے۔ میاں صاحب نے بتایا تھا کہ لڑکے کی عمر تیرہ ہے۔“

انہوں نے حزن کو مطمئن کر دیا تھا لیکن خود ان کے دل میں اضطراب و غم تھا۔ وہ بے چین سی ادھر سے پھرتی رہیں۔ سن اور انہوں نے پوچھا بھی تھا۔

”کیا جان کیا بات ہے؟“

لیکن انہوں نے غل و مل کو چھٹکے لگے تھے اور پھر شام کو اپنے وقت پر جب میاں صاحب گھر آئے تو یہ قرار ہی ہو کر پوچھ بیٹھیں۔

”آپ تو جلد ہی آئے حزن کو کہہ دوں کہ وہ لوگ آج نہیں۔“

”چھری سندھو تو لے کر دوڑا تھا۔“

انہوں نے فوٹی یا ناک ٹیکے کیساں رکھی اور بڑے اطمینان سے حوتے اتارتے ہوئے بتایا۔

”میں نے حاجی صاحب سے کہہ دیا ہے کہ تمہیں بتاؤں کہ تمہارے قتل قریب کر دیا ہے۔“

”کیا؟“

عذرا بیکر سا کہہ رہی تھیں، کچھ رو کر تو انہیں یوں دکھا تھا جیسے کسی نے ان کی روح نکال لی ہو۔ دل خزن تھا۔ جب بے کلی تھی وہ بار بار نہ سوچتی تھیں لیکن لفظ جیسے اندری پتھر اکر کم ہو جاتے تھے۔

”میں نے کل لڑکے کو لایا ہے گھر کے کمرے پر آب بھی مل چکے گا۔“

لیکن عذرا نے کچھ یوں بھی پوچھا تھا کہ انہوں نے انیس دیکھ رہی تھیں۔ جب حزن نے ان سے شجاع کی بات

سنی تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہیں، انہیں گلہ تھا جیسے برسوں محراب میں پایادہ تپتی رہتے رہ چکے تھے۔

اچانک انہیں کسی نے اس پتے چلے محراب میں غلستان کی خبر دی ہو۔ اور اس غلستان سے آئے والی ہلکے

دل و جان کو لکھن پوچھ رہی ہو۔ انہوں نے تصوری تصور میں کتنی بار انہیں اور شجاع کو ایک ساتھ دیکھا اور خود مسکرا دیں۔

”خدا میری اٹھ کو خیریاں دے گا، کیسے اپنے دکھ بھول جاؤں گی، لیکن یہ میاں صاحب نے کیا کیا

وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑتے اڑتے زمین پر اُگر رہی تھیں۔

بڑی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہو سکی تھیں۔

”میں نے آپ کو حزن کی خواہش بتائی تھی پھر بھی آپ نے نف۔“

”ہاں پھر بھی مجھے لڑکا حزن سے کہنے کے مقابلے میں زیادہ اچھا لگا۔“

وہ بے چینی سے انہیں دیکھنے کی تھیں۔ انہم تو ان کی اپنی بھی اس پھر کی کوئی باپ بیٹی کے لیے غلام

تھے، کیا انہم کو خیریاں اس کا مستقبل نہیں عزم نہیں انہیں لگا جیسے ان کے اندر زہر توٹ نوٹ پھوٹ

ہو۔ وہ ایک لفظ بھی مزید کہنے لڑکا کرتے قدموں سے باہر آئیں اور پھر حزن کو فون کرتے ہوئے ضبط کے ہتھ

لگے۔ وہ ہلکے ہلکے کر دیتے تھیں۔

”سوی میری انہم مجھے سزا دے گا کہ اب وہ لوگ اس قابل تھے لیکن میاں صاحب!“

”پاک ہو گی ہو عذرا وصلہ کرو۔“

حزن نے سمجھا۔

”میں اور قاتل کی کل آئیں گے میں خود بات کروں گی۔ بھائی صاحب سے اب ریلیکس ہو جاؤ۔“

سمان اور انہم پر ان کی بات کے رو کر انہیں رو کر دیکھ رہی تھیں۔

فون بند کرنے کے بعد کچھ ہو ہی چکی تھیں۔

”کیا جان کیا جان بلیز مت روئیے مت روئیے۔“

”میں نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ انہم نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

”کیا ہوا ہے اکی جان کیا بات ہے کچھ لگا ہے۔“

بڑی دیر بعد وہ تسلیں دیا تو انہوں نے ساری بات بتادی۔ سمن نے یکدم ان کے گلے سے باز نکال کر حیرت سے

اپنے دیکھا۔

”کیا جان نے شجاع بھائی کی بجائے ایک انجیان شخص کا رشتہ قبول کر لیا، نہیں۔“

اب وہ بے چینی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”اچا جان تمہیں سے ظالم نہیں ہو سکتے۔“ کچھ عرصہ تو نئی انہیں دیکھتی رہی پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چپا کر اپنے

لہرے کی طرف بھاگ گئی۔ انہو خواشانی بھی سمن نے اس نے انہیں لکھی تھی۔

”کیا جان بلیز اس طرح مت کر اس اچا جان نے کچھ سوچ کر ہی ایسا فیصلہ کیا ہو گا۔ بھتیجی نے کہے گا پھر

وہ انہیں کیا بات ہے۔ تاہم اللہ نے میرا فیصلہ کسی شخص کے ساتھ لکھا ہو گا۔“

”اچا!“ انہوں نے اسے یکدم اپنے ساتھ چھوٹایا۔

”میری بچی خدا تمہارا فیصلہ اچھا کرے۔“

کو سمن سے بات کر کے دل پر دھرا ہوا قدرے کم ہوا تھا لیکن وہ ساری رات سونے لگی تھیں۔ پوری رات

کراہیں بدل چکی رہیں۔ بار بار اچھا کر دیکھتا تھا۔ لیکن دل کی صورت سمن تھی۔ خدا خدا کر کے سمن کوئی نئی

لہجہ بن چکا تھا۔ کئی وہ چلیاؤں کی بلی کی طرح پورے گھر میں پھرتی رہی تھیں۔ حزن اور قاتل غم کھانے

نے بیٹھے سے میاں صلاح اللہ نے بات کی۔ حزن نے سمن کو دایا اور انہم نے گھر میں بہت خوش رہے۔ ک

فریٹے سے قاتل کرنے کی کوشش کی لیکن میاں صاحب کا ایک ہی جواب تھا میں نے ہاں کر دی ہے اور شریف

لوگ کیا بات سے نہیں پھٹے۔ بلا خیریاں ہو کر وہ چلے گئے تھے۔

عذرا بیکم کو لگ رہا تھا جیسے کسی نے ان کا دل سینے سے فوج میں دبا لیا ہو اور اب مٹی بھینچے جا رہا ہو۔

وہ اور قاتل شاہ کے جانے کے بعد انہوں نے میاں صاحب کو سنانے کی کوشش کی تھی لیکن بے سود۔

”آپ بچی کیا سوچ رہی ہیں۔ جائے چائے بھجوا کیجئے آپ کی حزن صاحبہ نے سر میں درد کر دیا ہے

بہت۔“

عذرا بیکم خواشانی سے اٹھ کھڑی ہوئیں لیکن دل بھی پیچھے پیچھے نچھپا تھا۔ میں گرجا جا رہا تھا تب ہی مشرک

کراہا اور اندر داخل ہوا وہ بھی اکیلا باہر سے آیا تھا اور سمن سے حزن خالہ اور قاتل اگل گئے آئے اور رشتہ لگتے

لی ساری تفصیل کر چکا تھا۔

”تو تمہیں انہمیں سوچ ہی پڑا تھا کہ جس بلور مشورہ کر تا ہوں۔ بڑے صاحبزادے تو اپنے نصیال میں جا

رہا ہے اور پھر ان کے مشورے میں کیا کر سکتا یا اگر عزت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حاجی صاحب کے توسط سے

نہایت اچھا نہیں لگا ہاں میں کہہ دی ہے۔ اور اب وہ نکاح کرنا چاہتے ہیں کیونکہ لڑکا جرم میں ہے۔“

”کیا لیکن شجاع بھائی کا رشتہ بھی تو حزن خالہ لائی ہیں۔“

”ہاں تو میں نے منع کر دیا میں زبان سے چکا ہوں۔“

”لیکن اباجی شجاع پر لحاظ سے اس سے بہتر نہیں۔“

”میاں صاحب کی بیٹی شادی ہو چکی ہے۔“

”آپ نے میرے لیے جو فیصلہ کیا تھا ایک لمحہ میں نے قبول کر لیا لیکن اتنی کے لیے آپ یوں بلا سوچے سمجھے

لہجہ کر رہے۔“

”میرے لیے اسے اتنی حق سوا میاں صلاح اللہ نے بھی نرم لہجے میں بات کی۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے اس لڑکے سے ملاہوں موصوم صلوٰۃ کا پائندہ ہے۔ نیک شریف دھا

یاد پر بیٹھ گئیں اور خالی خالی نظروں سے ہمیشی طرف دیکھنے لگیں۔ بمشکو کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔  
 ”امی جان۔“

عذرا تیکم نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے ہوئے انعم کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔

”میں تیرے جیسے دل کہاں سے لاؤں۔ میری بیٹی اپنا آپس پار کریدل تو اب کوئی دہشت سننے کے قابل نہ نہیں رہا۔ پتا نہیں کیوں دل کو اطمینان نہیں ہو رہا۔“  
”اللہ بخیر کرے گا۔“

”اچھے بولے سناں کے ساتھ تھمتا ہے۔  
سمن اور مشرب خاموش بیٹھے تھے اور اچھ بولے بولے عذرا تیکم کو سمجھا رہی تھی، ہملا رہی تھی، آہی دے رہی تھی۔“

”تم نے بابی سے بات کی تھی شعی۔“  
”سمن نے اچھ کے خاموش ہونے کے بعد پوچھا۔“  
”بالہ۔“

”مجھ سے سرھٹا کیا۔“  
”دیکھن گل انا ہی کس سے میں نہیں ہوئے۔ انہوں نے انا رکھی کو زندہ دیوار میں چنوا لے کا ٹیبلہ کر لیا ہے۔“  
”خدا نہ کرے۔“

عذرا تیکم کے کیوں سے بے اختیار نکلا، ہیشہ کے ہونٹوں پر ایک نظریہ سی مسکراہٹ لہر بھر کو ابھر کر معدوم ہو گئی۔

”تپ کے والد محترم کے بقول شریف لوگوں میں زبان سے پھرنا ہے غیرتی ہے۔“  
”دیکھن بابی نے جان بوجھ کر کیا ہے ایسا۔ جب حتمہ خالد نے فون کیا تھا تو اس وقت تک ابائی نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ انہوں نے شخص حتمہ خالد کی خدمت ایسا کیا ہے۔ بے ناشبی کیوں۔ کیوں ناشبی متنبھاں بھائی تو اتنے اچھے ہیں۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔  
”چپ کر۔“

”اچھے نے اسے ڈانڈ دیا تھا۔“  
”ہی جان کو روڈ پر کس کر۔ جب مجھے انکار نہیں تو تم لوگ کیوں خود بخود اپنی انٹی ویسٹ کر رہے ہو۔ اور ای جان پائیز آپ خودی دیر رست کر لیں۔ بلکہ آؤ کسی کو لین سکن کے کیے۔ وہ کھٹنے کی بندے لیں اچھی چپہ ہیں۔ سمن اچھے ساڑھے اچھے بیچے تک آئیں گے۔“  
”سمن اور مجھ سے ریت سے اس کے پر سکون بھرے کو کھلا۔“  
”وہ دعوت کے لیے۔“

”میں کر لوں گی۔“  
”کس میں برائی کا گوشت تیار کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا حتمہ خالد اور قادیان اگلے کھا کھا کر جائیں گے۔ بس چاہیل بھگوتی ہوں۔ تو مرہی میں تیار کر لیا تھا۔ دن کا مڑھ کر اور پھلچلی بیڑی ہے۔ فرزندیں بچن نکھن اور شامی کباب بھی پڑے ہیں۔ چکن کڑائی کھریں بنا لیں ہوں۔ بروسٹ کے الیف سے شعی لے آئے گا۔ اور سمن کڑائی فرنی اور بچھ اور جو بھی میں نے منگوا ہے میں شعی کو بتاؤں گی ہوں۔ بیٹھے میں آؤں کریم بھی بیڑی سے فرزندیں۔ کپ اطمینان سے لیٹ جائیں۔ سمن۔“ وہ سمن کی طرف مڑی۔

”اُمی جان کو کیڈٹ سے دو لیکن ہالہ نہ۔“  
”سمن خاموشی سے کھڑی ہوئی۔ وہ پلٹے ہوئے کوٹھ کو دانتوں سے بے دردی سے چکر رہی تھی۔  
”ای جان پائیز یہاں ہی لیٹ جائیں۔“  
”اس نے زبردستی! میں ناناہا۔ اور خود ان کے قریب بیٹھ کر نرم نہا تھوں سے سر میں مساج کر لگی۔“  
”آئی۔“

”میشہ نے اس کی طرف نکھا۔“

”اگر مجھے وہ شخص پسند نہ آیا تو میں۔“ پھر کمرزاس بات کی اجازت نہیں دلاں گا کہ وہ۔“  
”اس کی آواز آہستہ آہستہ اور بچھہ مٹھو تھا۔ اچھے نے اس کی طرف نکھن نکھن اور روشن سامیشہ بچھہ مد شعیہ ما اٹھ کھینے کو نکھن اور بچھہ مٹھو کی کوشش کے پیشتر اس کی محبت پر اچھ کی پچھلی پچھلی گئیں اور وہ سرھٹا کئے اوسپنے کی کوشش کرے لگی۔“

”چھو۔“ چھو شاہ زیب کیسے کیوں ہیں وہ اس طرح کیوں بیڑ کرے ہیں میرے ساتھ۔“  
”زارا زینت فاطمہ کی گود میں سرگے روڑی۔“  
”زارا میری جان کیا ہو اگیا کما زینب نے۔“

”زینت فاطمہ پریشان ہو گئیں لیکن زارا روڑے چلی گئی۔“  
”زارا۔“ زارا اپنے حوصلہ کو۔ کیا کما زینب نے کچھ مجھے بھی بتاؤ۔“  
”زینت فاطمہ نے اس کے بالوں میں اگلیاں پھیرتے ہوئے نری سے پوچھا تو اس نے سر اٹھا کر زینت فاطمہ کی طرف نکھا۔“

”چھو۔“  
”اگر اس کی آواز بھرا ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بھرے تھے۔ زینت فاطمہ بہت چار سے اس کے آنسو پچھے اس کی پیشانی پر۔ سوہ دیا اور پھر اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے بولے نکھنے لگیں۔ کچھ دیر بعد زارا نے اسے الگ ہو کر انہوں کی پشت سے اپنا چھو صاف کیا۔“

”اپنا جتاؤ چنڈا کیا بات ہے۔“  
”زینت فاطمہ نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے مسکرائے کی کوشش کی۔“  
”چھو آج چھ دن ہوئے ہیں۔ شاہ زیب مجھ سے بات نہیں کر رہے۔ حالانکہ چھو میں۔ میری کوئی غلطی بھی تو نہیں۔ وہ صرف اپنی ہی بات پر مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ کس نے فون کیوں رسیو کیا۔ حالانکہ میں نے سوری بھی کر لیا ہے اور وعدہ بھی کیا ہے کہ آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔ اب مجھے کیا تھا کہ یہاں بیڑی کو بیلی میں خواہیں فون رسیو نہیں کرتیں۔ چھو جتاؤ میں تا میری غلطی کہاں ہے؟ اس کی آنکھیں پھر نرم ہو گئیں۔“

”پاگل سے وہیں سمجھاؤ کیا ہے۔“  
”زینت فاطمہ نے پھر اسے لے نکالیا۔ زارا تو بیڑی لاڈلی تھی مگر بھری۔ اعلیاء شاہی نہیں تینوں بھائیوں نے بھی اسے اٹھل کا چھلا دیا ہوا تھا۔ بات حسیاس بھی تھی۔ اور زینت فاطمہ جانتی تھیں کہ زارا اسے لٹاؤ اور چھو کے باوجود نہ سمن کو مزاح کی تھی اس نے بھی کوئی ضد نہیں کی تھی کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ تینوں بھائیوں میں اسے اپنی جتنی تعینا شاہ زیب زینت فاطمہ کی زیادتی کر رہا تھا اس کے ساتھ۔“

”چھو یہ ایڑی بیڑی بات تو میں بھی سن رہا تھا وہ جانا۔“  
”ہاں میری جان لیکن زینب ایسا ہے۔ بھی بیڑی سے بیڑی بات نظر انداز کر دیتا ہے اور کبھی چھوئی سی بات کو مسئلہ سمجھتے۔“

”دیکھن چھو مجھے کیسے پٹے کا گورن کی بات کوہ مسئلہ نہیں گے اس طرح تو مشکل ہو جائے گی۔“  
”وہ معصومیت سے انہیں دیکھ رہی تھی تب شاہ زیب سلام کرنا ہوا۔ اندر داخل ہوا۔ اور ایک اچھی سی نظر زارا روڑی اور پھر زینت فاطمہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔“

”چھو شاہی پڑے ہوئے ہیں آپ کی تیاری عمل ہے ایک دو روز میں شاہ شامی بھائی آرہے ہیں۔ تو پھر آپ کو ان کے ساتھ جانا ہوگا۔“

”میں تیاری کیا بناؤں شاہ شامی تو آج چل دوں گی۔ اور۔۔۔ تم دھرہ بیٹھو میرے پاس اور یہ میری بیٹی کو کیا کہا ہے؟“  
”میں نے کیا کہا ہے چھو۔“

شاہ زیب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا زارا کے بالکل سامنے۔  
 ”برہنہ بات ہے۔ یہاں۔ ابھی تمہاری شادی کو دن ہی گئے ہوئے ہیں۔ اور تم دونوں ناراض بھی ہو گئے ہو ایک دوسرے۔“

”پچھو میں نہیں یہ ناراض ہیں۔“  
 زارا نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔ شاہ زیب اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ روٹی روٹی سرخ آنکھیں۔ خفا خفا وہ اس کے دل میں اتاری جا رہی تھی۔ جذبات میں یکدم مکمل سی پید ہوئی تھی اسے انہوں نے وہ اس کے دور تھا۔ بات تک نہیں کر رہا تھا۔ اور اب یکدم ہی اس کے دل میں اس کی قربت کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ وہ دھستے دھستے ہنسا کر آیا۔  
 ”پچھو سے شکایت کرنے کی کیا ضرورت تھی کیا تم جو دیکھے مٹا نہیں سکتی تھیں۔“

زارا نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔  
 اس کی آنکھیں جذبے لٹا رہی تھیں۔ اور اسے دن سے وہ کس قدر کھنور ہو رہا تھا۔ کیا اس نے مٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کتنی بار تو سوری کیا تھا۔  
 ”شام کو تیار متاؤ۔ ابھی تو چلے گئے۔ مار بھائی کا فون آیا تھا۔“  
 شاہ زیب نے یو جی کہی مگر نظروں سے اسے نہ گئے ہوئے کہا تو اس کے چہرے پر سرخی بکھر گئی۔ اور وہ ایک گمر اس لیے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”جھا پچھو میں چلا ہوں۔ پیراں جوڑ میں جلد۔ مجھے شاہ زیب کے ساتھ وہاں جانا ہے۔“  
 جاتے جاتے پھر اس نے ایک اندر تک اتنی نظرس ڈالی کہ وہ محبوب سی ہو کر زینت فاطمہ کی طرف دیکھنے لگی تھی۔  
 ”بیٹا مرید بیٹی انا کو اتنا چار کھانا چاہتا ہے۔ وہ عورت کو تھکا کر خوش ہوتا ہے۔ خصوصاً ہمارے خاندان کے مروتاؤ انا کا چہرہ بیٹھ بند رہ گئے ہیں۔ شاہ زیب بھی ایسا ہی ہے۔ بچے بھی اس کی انا کو بھیج کر نہ زارا نے سر ملا دیا۔“

اس نے جواب بھی ایسا نہیں کیا تھا لیکن شاہ زیب پتا نہیں وہ شاہ زیب کو کچھ بھیجے گا۔ یہی کیا نہیں سہا اندر سے خود ہی ہو گئی۔ لیکن اپنے اپنی دلوں کی خوشی سے اسے جو مل رہا۔ شاہ زیب کی وارفتگی اس کی محبتیں اس کی شوقیں۔ شاید پچھو صحیح تھی جن کو وہ مہیار کرنے والا ہے۔ لیکن بس غصے کا تیز ہے۔ خیر اب ایسا کچھ نہیں کر سکتا اس کے ہفتے آئے۔  
 ”زارا! ایک بات اور یاد رکھنا زیب کو کبھی غصہ نہ دانا کسی بات پر غصہ نہ کرنا۔ بحث مت کرنا۔ وہ بالکل شادی کی طرح ہے۔ وہ بھی ایسی ہے جتنی جانی ہے۔ انہیں عورت کا بحث کرنا بحث پانچ نہ تھا۔“

”ہی اچھا۔“  
 اس نے پھر سر ملا دیا تھا۔  
 ”لیکن پچھو آپ چل جائیں گی تو میں مت اکیلا محسوس کروں گی۔ ایسا نہیں ہو سکتا آپ نہ جائیں اور بی بی بی چل جائیں۔“  
 ”میں بی بی بی کا تو دل ہاں جا کر رہتا ممکن نہیں۔ پھر شادی ہی کے اسے کچھ بھیجی جاتا ہے۔“

انہوں نے زارا کی طرف دیکھا۔ اب اسے کہاں خبر تھی کہ وہ خود بخوبی آ کر وہ مٹا دیں اور ہر جائے کی وہاں قیام ہے۔ جسے ہر مٹا رہا اور شجاع ہے۔ جنہیں ابھی تک انہوں نے نہیں دیکھا۔ اور قیام ہی سے وہ تنہا کی ملاقات تو قطعی برصا کی تھی۔  
 ابھی تو سیدہ عظمیٰ شاہ زیب ہاتھ ہمارا دل بھلا رہے گا۔ پھر زیب کے ہوتے تھیں اس کو ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“

انہوں نے مسکرا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن زارا کا دل تو ان کے جانے کی خبر سن کر افسوسا ہو گیا تھا۔  
 ”میں کہوں گی کہ زیب سے کچھ دنوں کے لیے تمہیں ملا ہو رہی ہو جائے۔“  
 ”پچھو۔“

اس کی آنکھیں تنک اٹھیں۔  
 تب ہی سیدہ عظمیٰ شاہ زیب دروازے سے بھاٹک کر اندر دیکھا۔  
 ”ارے زارا! آپ اپنی آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔“  
 وہ اندر ہی آکر زینت فاطمہ کے پاس بیٹھ گئی۔  
 ”بی بی جان کہہ رہی تھیں زارا سے کہ وہ شاہ زیب بھائی اور روز تک کراچی جا رہے ہیں وہ بھی تیاری کر لے کر آچکی جانے گی۔“

”میں۔“  
 زارا نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ہاں بی بی جان کہہ رہی تھیں۔ آپ شادی کے بعد کہیں گھومنے بھی نہیں گئے اور پھر جوں جوں دعوت دے رہے تھے کہ کراچی کا پکڑ لیں۔ تو بی بی جان کہہ رہی ہیں ہم سب نہ جانا تو مشکل ہے۔ آپ زیب بھائی کے ساتھ چل جائیں۔ اور ٹکٹ ہو جائے گی۔ آپ کی کسی زیب بھائی نے تو جانا ہی ہے۔“  
 ”شاہ زیب کیوں جا رہا ہے کراچی۔“

زینت فاطمہ نے پوچھا۔  
 ”بی بی جان کہہ رہی تھیں شادی اپنے کسی دوست کی شرکت میں وہاں کوئی کام شروع کر رہے ہیں۔ اور شاہ زیب بھائی اسی سلسلے میں جا رہے ہیں وہاں سب معاملات طے کرنے تو بی بی جان نے سوچا۔ زارا! ابھی شادی چلی جائیں۔ بعد میں چرچنا۔ ایک شاہ زیب انکیشن کے سلسلے میں بہت مصروف رہیں گے۔“  
 ”تم۔“  
 زارا کو ابھی کہہ رہی ہو عظمیٰ۔

زینت فاطمہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”یاد ہے شاہ زیب اب بات پر کتنا ناراض ہوا تھا کہ اب زارا بھائی کو کہو۔“  
 ”لیکن اس سے کیا فرق پڑے پچھو۔ اپنی گئے سے رشتہ کی تو محنت بدل تو نہیں جائے گی۔ اب بچپن سے آپ کی کسی آ رہی ہوں تو سب بھائی ہیں۔ پھر اگر بھائی کو کہیں کہہ دیں تو اس میں کیا فرق ہے۔“  
 ”حرج تو کوئی نہیں لیکن شاہ زیب کو اچھا لگتا ہو گا کہ تم زارا کو اس کے حوالے سے کہو۔ اور یہ شاہ زیب کی زارا سے محبت ہے۔ انہیں ہے۔ اپنی بہت بڑی ہے۔ اپنی بیٹیوں کو تو وہ کسی کو تھکے بھی نہیں لگاتے۔ دیتا تھا کہ یاد ہے ایک بار تمہارے ماموں کے بیٹے آئے ہوئے تھے ایک نے شاہ زیب کی کن اٹھائی تھی اور شاہ زیب نے اس کن کو ہی تو ڈھونڈ کر پھینک دیا تھا۔“

”لیکن یہ بادل دودھ تو نہیں ہے پچھو۔“  
 زارا نے ہنس کر کہا۔  
 ”بچپن میں تو کبھی اسے ایسے دھوپوں کا ٹوٹ لیتا جا ہے۔“  
 ”لیکن اب تو کچھ نہیں ہو سکتا زارا! ابھی سو رہی تھی۔“  
 عظمیٰ کی آنکھوں میں شرارت تھی۔  
 ”اب شاہ زیب بھائی بیٹے تو ہے نہیں کہ آپ ان کی ایسی حرکتوں کا ٹوٹ لیں۔“  
 ”لیکن یہ وہیہ تکلف نہ ہونا ہے دو ماموں کے لیے۔“

زارا سنجیدہ تھی اور اس کے ذہن میں شاہ زنب کے الفاظ گونج رہے تھے۔ کسی غلط اور فضول باتیں کی تھیں اس نے۔

اس کا دل بھر بخیر ہو گیا۔

”کیا سارے حوایے ہی ہوتے ہیں شاہ زنب جیسے شکی مزاج اور تھوڑے۔ لیکن نہیں سب حوایے نہیں ہوتے اس کے بھائی بھی تھے اور پھر باپان سب کے دلوں میں جو تے کا احترام تھا وہ عورت کی حیثیت اور مقام کو تسلیم کرتے تھے۔ کتنا اچھا حال تھا اس کے گھر کا گوشہ جی اور اس کے باپا کے بھائی تھے، لیکن دونوں گھروں کے باجول کا اعتقاد اسے منسوب کرنا تھا۔

”چھپو میں آپ کو بت مس کر دوں گی۔“

عظمی شاہ نے لاڈ سے اپنا سر زنت فاطمہ کے کندھے پر رکھ دیا تو انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”میں زارا ہوئی ہوں۔ تمہارا دل بھلا رہے گا۔“

زارا کو دیکھنے کے لیے انہوں نے نظر اٹھائی تو دیکھ کر وہ اسے سے نظر اہر پر آئے تب تک چلی گئی۔ جہاں کچھ متوجہ اور پریشان سے شاہ بابا کھڑے تھے۔ شاہ بابا اندر کیسے آئے تھے وہ تو اپنے حصے سے کبھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ پھر اندر ہی دروازہ کس نے کھولا۔

”دن کے وقت دور دراز نکال نہیں ہوا تھا بس یونہی بند کر دیا جاتا تھا وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔“

”شاہ بابا“

سیدہ عظمیٰ شاہ اور زارا شاہ نے ایک ساتھ باہر کی طرف دیکھا تھا۔ چھپن میں انہوں نے کئی بار شاہ بابا کو دیکھا تھا لیکن ناشعور ہونے کے بعد ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ زارا شاہ تو چھپن میں شہر کی باہر بھی چلی آتی تب ہی شاہ بابا کو دیکھ پائی تھی۔ اگر وہ اٹھارہ شاہ کے ساتھ آتی تو وہ ضرور شاہ بابا کو سلام کرنے جاتے تھے۔ لیکن عظمیٰ شاہ وہ سال پہلے تک شاہ بابا کو دیکھتی رہی تھی۔ دو سال پہلے تک وہ اکثر شام کو باہر کی طرف کھیلنے نکل جاتی تھی۔ تو شاہ بابا بھی انہی کو شہر سے باہر بھیے نظر آتے تھے۔ تو اسے شاہ سلام ضرور کرنی سی۔ اور شاہ بابا بھی مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیتے تھے۔ زنت فاطمہ غیر ارادی طور پر کمرے سے باہر نکل آئیں۔

”شاہ بابا آپ یہاں“

شاہ بابا نے نظریں اٹھائیں۔ ان کی آنکھیں بالکل سیاہ اور بڑی پران سی تھیں۔ اور وہ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ زنت فاطمہ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ہر آنکھ میں کوئی نئی شہد شاہ بابا بھی ادھر ادھر ہے چھپن سے دیکھ رہے تھے۔

”شاہ بابا آپ کسے دھونڈ رہے ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں میں تو کسی کو نہیں دھونڈ رہا۔“

وہ ہلا ہی زنت فاطمہ کے کمرے کے بالکل سامنے کھڑے تھے۔

”آپ اندر سو چلی میں کیسے آگئے شاہ بابا۔“

زنت فاطمہ پر یکدم گہرا ہٹ ملا رہی ہو گئی تھی۔

”دوسرے“

انہوں نے ہر آنکھ اور پھر منہ سے ہر آنکھ کی طرف اشارہ کیا۔

ہر آنکھ سے ادھر کھلا کٹاؤ، چھپن تھا اور پھر چھپن کے اختتام پر زمین و سڑک میں اندر ہی دروازہ تھا تو انہیں ہوا تھی۔

”آپ بیٹھ جائیے شاہ بابا۔“

زنت فاطمہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں انہوں نے ہر آنکھ سے ہر آنکھ کی طرف اشارہ کیا۔

”چھا۔“

شاہ بابا مرکز مڑوہوں کی طرف دیکھنے لگے اور پھر ہولے ہولے چلے ہوئے موڑے پر جا کر بیٹھ گئے اور زنت فاطمہ کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ کوں ہیں میں نے پہلے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔“

”میں۔“

زنت فاطمہ اور گھبرا گئیں۔

”زنت فاطمہ ہوں آپ کی بیٹی۔“

”چھا۔“

وہ بغور انہیں دیکھنے لگے۔

”لیکن۔“

وہ تھوڑا سا بڑھے۔

”میرے بیٹی ہو تو میرا بھائی کہاں ہے۔“

”راجی کو باب کے فوت ہو گئے۔“

”فوت ہو گئے۔“

انہوں نے دہرایا۔

”راجی فوت ہو گئے لیکن میں تو ان سے ملے آیا تھا۔“

”راہی۔“

زنت فاطمہ نے غیر ارادی طور پر چھا۔

”نہیں ہوں میں شادی ہے۔“

وہ یکدم کھڑے ہو گئے اور پھر مرکز کیچھے کمرے کی طرف دیکھنے لگے۔ زنت فاطمہ ساکت کھڑی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”بڑے شادی کے ساتھ باہر جاتے ہیں ان کے کمرے سے نکل کر باہر آتے شادی۔“

”آج شام کا عملی شادی ہوئی ہو میں تمہارا چاچو ہوں۔“

تو کیا شاہ بابا کی یادداشت لوٹ آئی۔

”آپ آپ کس سے ملے تے ہیں شاہ بابا۔“

”میں۔“

انہوں نے اچھ کر زنت فاطمہ کی طرف دیکھا۔

”میں۔“

وہ سوچنے لگے ذہن پھر ایک دم تاریکیوں میں گھو گیا تھا وہ کیچھے ہٹ کر پھر موڑے پر بیٹھ گئے۔

”لیکن ابھی تو آپ کمرے سے گئے آپ۔“

تب ہی شاہ بابا نے منہ میں قدم رکھا۔ اور دروازے کو زور سے بند کیا زنت فاطمہ نے مرکز انہیں دیکھا۔ وہ لیے لے بڑگ بھرے تھیں کہ عبور کر کے ہر آنکھ سے آگئے۔ زنت فاطمہ کا رنگ سبلا پڑ گیا۔

”سیدہ زنت فاطمہ آپ یہاں کھڑی ہیں اور یہ شاہ بابا کیسے آئے ہیں۔ کیا گھر میں ہیں یہ یہاں۔“

شاہ بابا نے ناز سے سیاہی کے انگوٹھے کو زمین پر ہولے ہولے مار رہے تھے۔

”تو میں شادی۔ میری تو اچانک سی نظر پڑی۔ تو یہ ہر آنکھ سے کھڑے تھے۔“

”یہ شادال گھاٹی۔ جیتاں سب کہاں مری ہیں۔“

وہ غصے سے دھات سے ٹوڑا آگے کے سرے پر بے چین سے گھبراہٹ ہوئی جیتاں باہر نکلی۔

”میری بیٹی شادی۔“



”کمال مری ہوئی ہو قسم“  
”جی میں اور حیا پر ستودہ گرم کر رہی تھی۔ شادان اور گلاب بیچنے کے محلے میں کپڑے دھو رہی ہیں۔“  
ان کی اونچی آواز سن کر بی بی جان بھی اپنے کمرے سے نکل گئی تھیں اور پھر وہ بھی شاہ بابا کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اور سوائے نظروں سے زینت فاطمہ کی طرف نہ کھلا۔

”خود ہی اندر آگئے“

زینت فاطمہ نے آنکھیں سے بتایا۔

”چلے شاہ بابا اپنے کمرے میں۔“

شاہدہ نے ان کے اندر ہاتھ رکھ کر تندرے زری سے کہا۔

”میں میں اور حیا رہوں گا۔ یہ بھی ہے شاہ بابا نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔

”وہ جبکہ بھی اچھی ہے شاہ بابا اٹھئے“

شاہدہ نے پھر کہا۔

”میں یہ جگہ اچھی ہے اتنی بڑی۔“

انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”اور سہل۔“

انہوں نے ہاتھ کرمانے کڑے شاہدہ کی بی بی جان اور زینت فاطمہ کی طرف نہ کھلا۔

”اور سہل یہ بھی ہے سہی۔“

شاہدہ نے چونک کر زینت فاطمہ کو نہ کھلا۔ ان کی آنکھیں خون چھلکانے لگی تھیں۔

”یہ شاہ بابا نے پوچھا تھا کہ تم کون ہو تو میں نے بتایا تھا کہ تم سبھی ہوں ان کی۔“

زینت فاطمہ کی نوادیں کچکپات رہی۔

”سبھی سے تائیہ۔“

شاہ بابا کی آنکھوں سے اشتیاق جھلکنے لگا۔

”میں۔“

شاہدہ کے لمحوں سے جانے لگا تھا کہ زینت فاطمہ کا دل اندر ہی اندر کر ڈگیا۔

شاہ بابا کی آنکھیں کچھ گھٹی گئیں اور ان کے چہرے پر کرب پھیل گیا۔

”بھوت بولا تھا اس نے بھوت۔“

وہ زرب زرب بڑبڑاتے میرا گئی تھیں۔ میں اکیلا ہوں۔ بالکل اکیلا۔“

”کرم داد کو ہوا دکھائے۔“

شاہدہ کی تجزی سے چلنے سے محض وہ سمن کے دووازے تک آئے اور دو دروازے کھول کر آواز دی تو زینت فاطمہ اور بی بی

جان اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ کمرہ دار نے اندر آکر شاہ بابا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

”میں نہیں مجھے مرنے کے گرجاؤ مجھے مست مارد۔“

شاہ بابا چلا رہے تھے اور کمرہ دار اسے پکڑ کر آواز دے ”مجھ جیتا ہوا لے جا رہا تھا۔“

\*\*\*

”تم تعین کرو۔“ یہ وہ فیصلہ دہا تھا۔ ندائی آنکھیں سیاہ ہیں لیکن دور سے مجھے اس لڑکی کی آنکھیں کچھ

گہری گہری لگی تھیں شاید نرس لگا رہے ہوں۔“

علینہ ابھی تک سیاحت میں تھی۔ ہوتی تھی حالانکہ اسے ماہ نور کے گھر آئے گھر اٹھنا ہو چکا تھا۔

”چنانچہ یہ انداز ہی ہوئی لیکن تم کیوں اتنا بچہ رہی ہو۔“

ماہ نور نے اروا کے بالوں میں لپکتی لپکتی ہونے اس کی طرف نہ کھلا۔  
”یار مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ لوگ کتنے دوغلے ہوتے ہیں۔ جامدہ میں وہ عیالیا پن کر آتی ہے چاہا لیا ہوا ہے  
اس نے سوائے آنکھوں کے کچھ نظر نہیں آ رہا ہوا ہے۔ کاسن روم میں بھی وہ عیالیا نہیں آ رہی۔ دو تین بار  
میں کے اصرار پر اس نے کچھ دیر کے لیے چاہا چہرے سے بنایا تھا۔“

”اے بی بی جان۔“

اردا بی بی نے آواز کر لی ہوئی تھی۔

”جاؤ۔“

ماہ نور نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر علینہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ہوئی کوئی چھوری علینہ یہ تو بھی ہو سکتا ہے اس کے رشتہ دار اس کا جامدہ جانا پسند نہ کرتے ہوں اور وہ پڑھائی

کے شوق میں عیالیا پن کر آتی ہو تاکہ کوئی اسے بچان نہ لے۔“

”لیکن اس وقت تو وہ بڑے ماڈرن لباس میں تھی۔“

علینہ کو ابھی تک حیرت تھی۔

”خیر کچھ لوگ بڑے ماڈرن ہوتے ہیں۔ پیسہ بھی ہوتا ہے ان کے پاس لیکن وہ لڑکیوں کی زیادہ تعلیم پسند نہیں

کرتے۔ پیسہ ہمارے پاس جان میں نہیں۔ لباس تاری تھیں۔ ایک سے ایک مخرن اور ہتھی ڈکس آتا ہے گھر میں

بچوں کے لیے لیکن وہ لڑکیوں کی تعلیم کے سخت خلاف ہیں۔ اچھ بے چاری نے تو میری کرسی کیا ہے حالانکہ بہت

لاٹھی اور ڈپٹن ہے۔ منہ خالہ نہ بتایا تو تھا۔“

ماہ نور نے اسے ابھمن سے لگا لپکی کو کوشش کی۔

”ہاں یاد آگیا اس وقت رہے تھے کہ اچھ کے رشتے کے لیے بھی کچھ لوگ آ رہے ہیں۔“

”اگر چاہیے تو وہاں جانے کے بعد اسٹریٹ لائٹوں کا فون کیا کوئی آ؟“

ماہ نور نے پوچھا۔

”خیر تو میں نہیں ہمارے یہ ماموں زاد میں نے ہی دو تین بار کیا۔ آج بھی بات ہوئی ہے۔“

علینہ نے برا سا منہ بنایا۔

”میرے ماموں زاد تمہارے بھی کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔“

ماہ نور کا مومڑا آج بہت اچھا تھا۔ نصیر احمد بہت اچھو کر رہے تھے۔ منصور نے انہیں جس فریڈ قورائٹ کے پاس

لے جانا شروع کیا تھا تو پلے کے مقابلے میں زیادہ قابل تھا اس نے تعین دلایا تھا کہ چھ دن تک انشاء اللہ نصیر احمد

خان اسٹریٹ پر چلے گئیں گے۔

”ارسل محضوں کے نیچے کے پتے دے دیے۔ اس وقت کسی نے خیال نہیں کیا اور نہ اتنی تکلیف دہ اٹھائی

پڑتی۔ پھر مسلسل مجھے اور علیہ رہنے سے مجھے متکرتے ہیں۔ بہر حال دنیا میں یہ قائم ہے۔“

ڈاکٹر نے اچھ کا تھا جس سے سب سے بہت خوش تھے۔

”لیکن۔“

وہ علینہ کی طرف کچھ کر سکا رہی۔

”کچھ اور بھی شاید مستقبل قریب میں۔“

”چاہا نہیں۔“

علینہ ماموں کی تھی۔

”میں نے نہیں ماما اور ماما کے درمیان ہونے والی گفتگو بتائی تو ہے۔“

”لیکن اسٹریٹ لائٹوں کے میں نے تو سہی ہوئی ہے۔“

ماہ نور کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”لیکن سوچو تو اگر نماز نہ پڑھیں۔“

علینہ نے اس کی طرف نہ دیکھا۔

”میں غلط بات کہیں نہیں۔“

ماہ نور کھڑی ہو گئی۔

”مجھے بتائیے آئی تمہاری ہر ضد مان لیں ہیں بلا اثر۔“

”یہ تو ہے۔“

علینہ کی آنکھوں میں ایک چمک کیڑیا ہو گئی تھی۔

بچپن سے لے کر اب تک وہ اپنی ہر ضد متوالی چلی آئی تھی اور اب بھی اگر وہ ضد پر اڑ گئی تو ماما کو پار مانا ہی پڑے گی۔ لیکن اللہ کرے ایسا موقع ہی نہ آئے اور کچھ ایسا ہو کہ ماما خود ہی اسٹرکے لیے رضامند ہو جائیں۔

”تم کہیں کھڑی ہو گئی ہو۔“

اس نے ماہ نور سے پوچھا۔

”میں کھول ڈار رہا اور پھر کیا کر رہی ہیں؟ آج میرے کچن میں کھسی ہیں ابھی تک چائے تیار نہیں ہوئی۔“

”کہ کام کر اور باتیں زیادہ کر رہی ہو۔“ چائیں کھسی تھیں ہیں ان کی جو ختمی نہیں ہو تیں۔ تم بیٹھو آجائے

کی چائے۔“

علینہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھایا۔

”بلکہ ایسا کرو جا کر چائے منع کرو اگر رو بہ صرف ہمارے لیے چائے بنا رہی ہے تو۔“ جیسے ہاتھ تو ہے اسی طرح تو

چائے بالکل نہیں چینی چائے اور میں بھی لپٹی زیادہ شوٹیں میں ہوں چائے کی۔ ایسا کرتے ہیں ابھی خضر بھائی آئیں گے تو

ان کے ساتھ باہر چائیں گے کھوئے۔ کسی ابھی سی جگہ سے ابھی سی کافی پڑی گئی ہے کیا پھر پراہٹ جائیں گے۔“

”علینہ۔“

ماہ نور نے مصروفی حیرت سے اسے دیکھا۔

”یہ جاسد کا تم کچھ زیادہ آزاد نہیں ہو گئی ہو۔“

”تو اپنے بھائی کے ساتھ جائیں گے تا کہ میرے ساتھ تو نہیں جائیں گے۔“

ماہ نور نے اختیار دیا۔

”یہ اردو محاوروں سے کہیں کب سے دلچسپی ہو گئی ہے۔“

”جی کہہ رہی ہو ماہ نور سارا مخلصہ میں تا نا نہ بٹھنے میں باجا ہر ڈنڈ کرتی ہیں۔ سمندر چلتی ہیں اور ہم مینوں

باہر نہیں نکلتے۔ گھر کو توڑی مٹی مٹی اور لوہے کے تمہارے گھر کا پھر اب آئی حیرت اٹھائی ہیں کیڑا سے تو ان کے

گھر کبھی کبھار بیٹی ملا کی دو دو مسجد تک۔“

”کلی حینا۔“

اب کے ماہ نور کھٹکھٹا کر ہنس دی۔

”تم تو واقعی محاوروں میں ماہ نور ہو گئی ہو۔“

”مذاق نہیں یاد رکھو روہا کو چائے بنانے سے میں انکل نمبر سے اجازت لے لوں گی۔“

”چائے تو ابھی سب سے چینی سے لیا اماں دای سب نے دراصل دای سواری میں تو اماں نے کہا جب وہ

جائیں گی تو باقیہ تمام سوچت ہو آئیں تو میں چائے بنائے ہی جا رہی تھی۔“

”میں میں نے کہہ دیا کہ تمہارا نہیں ہے خضر بھائی کے ساتھ۔“

وہ کھڑی ہوئی اور دو دروازے سے جھانک کر روہا کو آواز دی۔

”روہا زہر ہمارے لیے چائے سنبھالنا۔“

”لیکن مٹی سے آئی اس بکڑے توں رہی تھی۔“

”مٹی بچن سے نکل کر جاب دیا اور پھر بچن میں چلی گئی جہاں اسی طرح چلے گئے کپاس کھڑی کڑائی میں سے

نکل کر رہی تھی۔“

”خضر بھائی کل ہیں مزدورت ملتا۔“

علینہ نے اونچی آواز میں کہا اور جرانی سے اپنی طرف ہنسی کر کے اندر سے پر ہاتھ مارا۔

”ماہ نور خضر بھائی کے آنے سے پہلے تیار ہو جاؤ۔“

”اگلی حینا۔“

ماہ نور نے ہنسی دی۔

”میر نہیں ہوئی ہو یا ایک ہی جیسی رو میں ان کف سے دن بھر بچوں کے ساتھ مغز کھانا اور پھر گھر میں بھی

نہ ہر روز اسلاف کف میں بیچ بیچ ہوئی ہو لگا بھٹکا ہو جا تا ہے۔“

”الطاف خیر کے پاس پیسے کی فراوانی تھی لیکن انہی آزادی نہ تھی۔ سوہرائی انداز کی قدر کرتے تھے پھر بچوں

کا بھاری نہ تھی وہ بھی بھرا کوٹنگ بھی ساری چیلی کو لے جاتے تھے لیکن ایسا نہیں تھا کہ شتر بے ماماری

ہر روز رو بچیاں کوٹنگ کے لیے جاتی رہیں۔“

”ابھی اس وقت تمہارے دماغ میں یہ گیزا کیسے گلیا یا ہے۔“

ماہ نور نے صورت پریشانی ہوئی تھی۔

”جیت سے ماہیلی کی کہ لڑا دل آج اس سے کہیں۔ یہ مجھے بھی نہیں معلوم اور میں چاہتی ہوں کہ کسی طرح یہ

معلوم ہو جائے اور یہ جو ہم سوچ رہی ہو کہ میں پوچھ رہی جا کر کچھ بدل گئی ہوں تو ایسا مجھ نہیں ہے۔ میں خود ہر

بکھرے باہر پر تپند نہیں کرتی۔“ جیسے۔ لیکن اس وقت ہم جائیں گے۔“

اس نے آخری جملہ چاچا کر کہا۔

”چائے لا کر لاؤ یا اور ابا کے کمرے میں سب اکٹھے بیٹیں گے۔“

”لڑل روہا زے سے جھانک رہی تھی۔“

”میر میری لے جاؤ۔“

علینہ نے جواب دیا اور پس سے موبائل نکال کر نمبر ملائے گی۔ ماہ نور اسے دیکھنے لگی۔

”لو لو خضر بھائی۔“

”بلکہ اس نے موبائل کاٹوں سے لگایا۔“

”اب کوہا کا سبیل کیا تھا۔“

”اس میں ابھی اس میں ہی ہوں بس کچھ دیر میں آ رہا ہوں۔“

”اگر اچلی آئیے گا۔“

”کل۔“

”پورے کچھ کتنا چاہا تو اس نے روک دیا۔“

”لیکن وہ دیکھ چھوڑو اور آ کر دیا بلا رہی ہے۔“

علینہ اور ماہ نور ایک ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ طبعی طور پر کچھ بات چیت ہوئی تھی جس کی

گروہ تھیں۔ دای ان کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بیچ بھی اور کھانا اور اخبار دیکھ رہے

ابھی اور زہل نیز کپاس کھڑی تھیں۔ زہل چائے پکھل میں ڈال رہی تھی۔

”اگر وہ بیٹھو۔“

علی خاتم نے اپنے پاس بڑے کپڑے اٹھا کر ایک طرف لیے اور زہل کی طرف دیکھا۔

”میںاں ہوں کو پورے اور کثرت دعاویہ بنے کہاں ہیں ان میں ہلاؤ۔“  
 ”داوی جان پوچھتے تو کچھ نہیں لیا اگر اس وقت کھالے تو پھر ہر کچھ نہیں کھالیا جائے گا۔“  
 نصیر احمد خان نے اخبار کیسے کپاں رکھ دیا تھا اور نزل کے ساتھ سے چائے کا کپ لینے ہوئے اسے دیکھ کر  
 تھے  
 ”انگل میں سے ایرج وغیرہ کو ٹیٹ دینی ہے۔ وعدہ کیا تھا ان سے اور اسی لیے میں نزل اور ماہ نور کو لینے لال  
 ہوں۔“

”کس بات کی ٹیٹ دینا۔“  
 نصیر احمد مسکرائے  
 ”نہ انگل میں سے مہاتے میں انعام جیتا ہے بافرٹ انعام اور وہ مہاتے میں۔“  
 ”پھر تو مبارک ہو برت۔“  
 وہ خوش ہلی سے مسکرائے  
 ”تو بیٹا اس کے لیے ہر جانے کی کیا ضرورت ہے ایک مٹھائی کا ڈبائے آئیں۔“  
 سلی خان نے اس کی طرف دیکھا۔

”فہر اصل داوی یہ جو ایرج ہے بنا پر ضد کر رہی تھی بڑا کھانے کی۔“  
 ایرج نے داوی کی طرف ہونٹوں کی پلٹت بڑھاتے ہوئے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔  
 ”نگال ہے کھر سے جلتے وقت تو نہ خندہ بھوکا کرتے تھا یہ اچھا کھانے۔“  
 پاس کھڑی علیہ نے بولے اس کے بازو پر پکلی بھری تو اپنے خیالوں سے چونک کر اس نے گھورا۔ ”جواب“  
 علیہ مسکرائی اور نصیر احمد خان کے طرف دیکھنے لگی۔  
 ”تو انگل اجازت ہے میں ماہ اور دعا کو ساتھ لے جاؤں خضر بھائی ہوں گے نا ساتھ ہم زیادہ دیر نہیں لگا سکیں  
 گے جلد آجائیں گے۔“

”تم کچھ ہے جلتے جاؤ لیکن بنا میں نے کیا تصور کیا ہے۔“ وہ مسکرائے  
 ”کیا میں ٹیٹ نہیں لے گی۔“  
 ”وہ انگل ہوا میں آپ کے لیے بیک کر دلائیں گے۔“  
 ”اے اے میں بیٹا میں مذاق کر رہا تھا۔“ ”دوئے کا پک کیا تھا مہاتے کا۔“  
 ”وہاں۔“  
 ”فوری طور پر علیہ کو کوئی ٹاپکسی میں سوچ رہا تھا۔  
 ”میں فزاد خضر بھائی کا پتا کھلی تھی، میں آئیں گے اس میں موضوع پر مباحثہ ہوا تھا۔ علیہ نے متین  
 ”ہاں بیٹا کر اور کرنا جلدی آئے۔“  
 طبع خاتون نے بیٹس پلٹ کر ایک طرف رکھی اور نزل کے ساتھ سے چائے کا کپ لیا۔  
 ”ہاں تو بیٹا کیا ٹاپک تھا۔“  
 نصیر احمد خان چائے کی چمکیاں لے رہے تھے۔  
 ”جھوٹ کا مایاب زندگی کی مخالفت ہے۔“  
 ایرج نے جواب دیا ابھی کچھ دن پہلے ہی ان کے کالج میں اس موضوع پر مباحثہ ہوا تھا۔ علیہ نے متین  
 نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”تم نے فیور میں تقریر کی یا مخالفت میں۔“ نصیر احمد نے پوچھا تو اس نے بوکھلا کر ماہ نور کی طرف دیکھا ایرج  
 نے کچھ ہلکی۔ ”انگل علیہ نے مخالفت میں تقریر کی تھی۔“

”فہر اصل داوی یہ جو ایرج ہے بنا پر ضد کر رہی تھی بڑا کھانے کی۔“  
 ایرج نے داوی کی طرف ہونٹوں کی پلٹت بڑھاتے ہوئے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔  
 ”نگال ہے کھر سے جلتے وقت تو نہ خندہ بھوکا کرتے تھا یہ اچھا کھانے۔“  
 پاس کھڑی علیہ نے بولے اس کے بازو پر پکلی بھری تو اپنے خیالوں سے چونک کر اس نے گھورا۔ ”جواب“  
 علیہ مسکرائی اور نصیر احمد خان کے طرف دیکھنے لگی۔  
 ”تو انگل اجازت ہے میں ماہ اور دعا کو ساتھ لے جاؤں خضر بھائی ہوں گے نا ساتھ ہم زیادہ دیر نہیں لگا سکیں  
 گے جلد آجائیں گے۔“

”تم کچھ ہے جلتے جاؤ لیکن بنا میں نے کیا تصور کیا ہے۔“ وہ مسکرائے  
 ”کیا میں ٹیٹ نہیں لے گی۔“  
 ”وہ انگل ہوا میں آپ کے لیے بیک کر دلائیں گے۔“  
 ”اے اے میں بیٹا میں مذاق کر رہا تھا۔“ ”دوئے کا پک کیا تھا مہاتے کا۔“  
 ”وہاں۔“  
 ”فوری طور پر علیہ کو کوئی ٹاپکسی میں سوچ رہا تھا۔  
 ”میں فزاد خضر بھائی کا پتا کھلی تھی، میں آئیں گے اس میں موضوع پر مباحثہ ہوا تھا۔ علیہ نے متین  
 ”ہاں بیٹا کر اور کرنا جلدی آئے۔“  
 طبع خاتون نے بیٹس پلٹ کر ایک طرف رکھی اور نزل کے ساتھ سے چائے کا کپ لیا۔  
 ”ہاں تو بیٹا کیا ٹاپک تھا۔“  
 نصیر احمد خان چائے کی چمکیاں لے رہے تھے۔  
 ”جھوٹ کا مایاب زندگی کی مخالفت ہے۔“  
 ایرج نے جواب دیا ابھی کچھ دن پہلے ہی ان کے کالج میں اس موضوع پر مباحثہ ہوا تھا۔ علیہ نے متین  
 نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”تم نے فیور میں تقریر کی یا مخالفت میں۔“ نصیر احمد نے پوچھا تو اس نے بوکھلا کر ماہ نور کی طرف دیکھا ایرج  
 نے کچھ ہلکی۔ ”انگل علیہ نے مخالفت میں تقریر کی تھی۔“

”فہر اصل داوی یہ جو ایرج ہے بنا پر ضد کر رہی تھی بڑا کھانے کی۔“  
 ایرج نے داوی کی طرف ہونٹوں کی پلٹت بڑھاتے ہوئے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔  
 ”نگال ہے کھر سے جلتے وقت تو نہ خندہ بھوکا کرتے تھا یہ اچھا کھانے۔“  
 پاس کھڑی علیہ نے بولے اس کے بازو پر پکلی بھری تو اپنے خیالوں سے چونک کر اس نے گھورا۔ ”جواب“  
 علیہ مسکرائی اور نصیر احمد خان کے طرف دیکھنے لگی۔  
 ”تو انگل اجازت ہے میں ماہ اور دعا کو ساتھ لے جاؤں خضر بھائی ہوں گے نا ساتھ ہم زیادہ دیر نہیں لگا سکیں  
 گے جلد آجائیں گے۔“

”تم کچھ ہے جلتے جاؤ لیکن بنا میں نے کیا تصور کیا ہے۔“ وہ مسکرائے  
 ”کیا میں ٹیٹ نہیں لے گی۔“  
 ”وہ انگل ہوا میں آپ کے لیے بیک کر دلائیں گے۔“  
 ”اے اے میں بیٹا میں مذاق کر رہا تھا۔“ ”دوئے کا پک کیا تھا مہاتے کا۔“  
 ”وہاں۔“  
 ”فوری طور پر علیہ کو کوئی ٹاپکسی میں سوچ رہا تھا۔  
 ”میں فزاد خضر بھائی کا پتا کھلی تھی، میں آئیں گے اس میں موضوع پر مباحثہ ہوا تھا۔ علیہ نے متین  
 ”ہاں بیٹا کر اور کرنا جلدی آئے۔“  
 طبع خاتون نے بیٹس پلٹ کر ایک طرف رکھی اور نزل کے ساتھ سے چائے کا کپ لیا۔  
 ”ہاں تو بیٹا کیا ٹاپک تھا۔“  
 نصیر احمد خان چائے کی چمکیاں لے رہے تھے۔  
 ”جھوٹ کا مایاب زندگی کی مخالفت ہے۔“  
 ایرج نے جواب دیا ابھی کچھ دن پہلے ہی ان کے کالج میں اس موضوع پر مباحثہ ہوا تھا۔ علیہ نے متین  
 نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”تم نے فیور میں تقریر کی یا مخالفت میں۔“ نصیر احمد نے پوچھا تو اس نے بوکھلا کر ماہ نور کی طرف دیکھا ایرج  
 نے کچھ ہلکی۔ ”انگل علیہ نے مخالفت میں تقریر کی تھی۔“



”ہم بڑے آرام سے بیٹھے ہیں آگے چھپے ہو کر اور کوئی بھی جھگ نہیں ہو رہا۔“

اس پر دور رس و مصلحت پسند لوگوں میں جبکہ مالک اور عدلیہ خاموش تھیں۔  
پارکنگ گے لے کے گاڑی میں حاضر رہا دوسرے نظروں دار ہاتھ مالک اپنی نظر سفید کرولا کہ اس نے  
اسی لوگ پر بڑی جاکڑی سے ٹیک لگائے گاڑی بھی اور سید ماس کے ذہن میں دوسری کوئی رو ہو جو پڑنے میں  
ہلک سی بھی یکدم شعور میں آگئی تھی۔ اس نے اس لوگ کی جھلک اس کرولا میں دیکھی تھی جو اسے اور  
کر کے زوری بھی اس کے پاس گاڑی کی پھر اسے پار کیا وہ لوگ اس سے لفٹ مانگ رہی تھی تو اس  
سڑک سے ہٹ کر سائین پر درخت کے نیچے سفید کرولا کھڑا دیکھی تھی۔ عین اسی وقت عدلیہ کی نظر بھی باہر نکل

”ہا۔۔۔ ماہ۔“

اس نے مالک اور گاڑی دیکھا۔

”دور رسو گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے گاڑی وہ لوگ وہی ہے وہی شاہنگ چلانہ میں جو ملی تھی اور اس کے ساتھ  
وہی مرد ہے۔ یہ بڑا ہے۔“  
اس نے سر کو گھمائی کھلی مالک اور نے باہر دیکھا چلا لیکن خضر نے پارکنگ کی جگہ نہ پار گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

”شعبی بنام تھے تلے لوکے سے کیا ہے؟“

خضر نے شعبی کو پہنچی پکارتے ہوئے پوچھا۔

”اس کی بھابی کے متعلق تو کوئی اچھی بات نہیں سنی مرزا اللہ ستر کے گا اور خدا کرے انعام کا نصیب اچھا

ہو۔“

چاہے ہوئے بھی وہ اپنے لیے کی اس پر بھی جان سکی تھیں۔ مشر نے ایک گرمی ماس ماری۔ اسہ کی ایک کڑا لاوا  
کیا ہے۔ بظاہر تو اس میں کوئی خرابی نہ تھی۔ سوائے عمر کے۔ اس رات کو حاجی عبدالستار کے ساتھ وہ لوگ بھابی  
آئے تھے۔ میاں صلاح الدین نے سنی تعارف کر دیا تھا۔

”یہ میرا بیٹا ہے مشر ایف ایس کی کر رہا ہے اور یہ آصف صاحب اور یہ ان کے بھائی و اصاف ہیں۔ آصف  
جڑی میں ہوتے ہیں۔“

مشر نے دونوں سے ہاتھ ملایا تھا اور پھر آصف سے کافی بات کر رہا تھا میں بھی کہیں۔ آصف کی گفتگو میں شائع  
تھی۔ وہ ایک جگہ تھا اور اس کی خیالات اچھے تھے۔ شکل و صورت کا بھی مناسب تھا اس عمر کا آدمی چالیس سال  
ہوئی اس میں ایک پوائنٹ ایسا تھا جو اسے ٹھیک رہا تھا۔ اس کے علاوہ اسے آصف میں کوئی برائی نظر نہیں آئی تھی  
بلکہ ایک جگہ وہ اس کی گفتگو سے متاثر ہوا تھا۔ اس بات کرنے کا بہتر انداز تھا اور پھر مشر کو خون سا جاتا ہوا تھا کہ  
وہ کوئی راستے سے ٹکرا گیا۔ آصف کے لیے میں اس بات کرنے سے شققت کا رنگ بھٹکا رہا تھا۔

اس وقت اس سفر بھابی کی کسی بات محسوس نہیں تھی۔ وہ ہوتے تو آدم کر آصف صاحب سے بات چیت کر  
کے ان کی شخصیت کو رہا کر کے متعلق کچھ تو اندازہ لگاتے لیکن اس سفر کا جی سے سیدھے اسلام آباد آگئے تھے اور  
ان کا وہ آرام دہ مین دان اسلام آباد میں بائیں بخت کے پاس ٹھہرے گا تھا۔ ٹھکانے کے دوران بھی کوئی بی بی باس نے  
رہا تھا کہ آصف اور پھر میاں صلاح الدین کی طرف سے کیا تھا۔ میاں صلاح الدین بہت خوش اور مطمئن دکھائی  
دے رہے تھے جبکہ دریا بھیم نے کچھ زیادہ بات نہیں کی تھی یا بار بار کھوی جاتی تھیں۔ آصف سے بھی ایک سا  
باتیں ہی کی تھیں۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

وہ اگر خیال کے ساتھ آصف کو کھینچ کر آتا تو آصف اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا لیکن اگر خیال کو بنا کر  
وہ صرف آصف کی شخصیت اور گفتگو کا جائزہ لیتا تو آصف میں سوائے عمر کے اور کوئی خرابی نہ دکھائی۔ آصف  
جڑی میں رہتے ہوئے بھی سرگت تک نہ جیتا تھا اور اس بات کو میاں صلاح الدین اور حاجی عبدالستار نے کتو

”اگر انہی پر اس کا خیال، جیسا تھا۔ سب کے جاننے کے بعد جب ممکن ہے کہ میں برتن کھینچنے کو  
اس کی طرف جانے دیکھا تو بے چین سا ہو کر اسے پکارا تھا۔“

”کیسے ہیں شعبی۔“

”میں اس ٹیکسی میں۔“

”مجھے بھی میں آ رہا تھا کہ کیا کرانے کو۔“

”مجھے کچھ تو رائے کا کام ہی تو نہیں۔“

”میں اسے یہ کہہ رہی تھی۔“

”کئی رائے نہیں قائم کر سکا۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔

”اب اس معاملے میں ہے۔“

”میں اگر انہیں خیال بھابی سے کھینچ کر کیا جائے تو وہ ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لیکن اگر انہیں خیال  
بے باک کر کے دیکھیں تو ٹیکسی میں۔ اگر عمر کو نظر انداز کر دیا جائے تو۔“

”اب اس کے کیا کام؟“

”میں نے بے باکی سے پوچھا۔“

”اب اس کے لیے ہی انہیں اور کر دیا تھا۔ اب تو کھاج کی تاریخ طے ہونے کی بات ہو رہی تھی۔ غالباً دو تین

دن کی بجلی تاریخ طے کرنے کے آگے۔“

”اب کیا ہو گا شعبی۔“

”میں نے تو اس سے مل چکے ہو۔ میں نے تو اس حتمہ خالد اور

ان سے ان کی طرف سے سنی ہے اللہ کرے اس سفر بھابی میں آج میں جلدی تو پھر میں ان سے کوئی وہ ایک بار پھر

بات کریں۔ تمہارا نہیں کر۔“

”میں ضرورت میں اب اس سے کچھ کہنے کا نہیں کر۔“

”میں سمجھا ہوا سامان فرج میں رکھ رہی تھی یکدم کہا۔“

”مجھے کچھ کوئی اعتراض نہیں ہے تو تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔“

”مجھے بہت غور سے ان کی طرف دیکھا تھا اس کے چہرے پر کوئی ناؤ انداز تھے نہ غم نہ خوشی کے وہ ہر

کی طرح تیار لگ رہی تھی۔“

”ایک دفعہ اس سفر بھابی میں بات کر لیں تو شاید۔“

”میں نے اس کی بات کو ذرا بھی یاد نہیں کیا تھی اور میری طرف دیکھ رہی تھی۔“

”میں اس کو بھی اس سفر بھابی کو اسلام آباد لے کر کے بلاوا۔ ان کی تو پیشین دانسی ان کے بڑے سائینڈیکل پر پڑی

پاس میں ضرورت بخت بھابی کا نہیں ہو گا۔“

”مکن کو بے چینی کی تھی۔“  
 ”ہاں میرے کچھ خراج بھائی اور آصف ایک جیسے ہیں۔ میں دونوں کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ میں دونوں سے کہی نہیں لی ہاں خراج بھائی بہت باری خالہ کے بیٹے ہیں۔ اس پر فرق ہے۔ میرے لیے تو وہی احترام ۱۱ گا جیسے میرے والدین متعجب کریں گے چاہے وہ خراج ہو چاہے آصف۔“  
 ”اُئی تم بھی سہی۔“

سمن نے منہ پھلایا تھا۔ بشری کو پوچھنے سے ٹیک لگنے لگا اور احم کو دیکھ رہا تھا۔  
 ”شعبی تم بھی جاؤ جا کر آرام کرو اور اس مسئلے پریشان مت ہو اور نہ ہی اپائی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ جس میں۔“

احم کے لیے جس شفقت در آئی تھی اس نے ابتر سے مشربہ کرنا چھوڑا۔  
 ”جائز شائستگی میں باہمی دودھ گرم کر کے رفیقان کے ساتھ تجھ کو اپنی ہوں سو جاننا فضول مت سوچنا۔“  
 مشربہ کچھ کے پائے کرے میں چلا آیا لیکن احم کی نایک کے بعد وہ اس نے آج نصفی ایک بار پھر میاں صلاح الدین سے بات کرنے کی کوشش کی۔  
 ”اپائی بیڑا اپنے فضل پر ایک بار پھر غور کریں۔ آصف ایک اجنبی انسان ہے سنا اپنی ہفتک اور بات چیت سے وہ کوئی بے شخص دکھائی نہیں دیتے لیکن کوئی کچھ باریک نہ متکمل ہوتا ہے۔ لوگوں نے نہ جانے چھوڑ دینے نقاب چھڑا کرے ہیں۔“

ہمارا تو جرعی میں کوئی بندہ نہ جاننا پچان والا بھی نہیں جو تحقیق کر کے بتائے  
 میاں صلاح الدین نے بہت مشکل سے اس کی بات سنی تھی۔ اس دوران ان کے ہونٹوں پر گاہے گاہے مسکراہٹ آتی رہی وہ بڑے خردورمان سے مشربہ کر رہے تھے۔

”تم ابھی اتنے بڑے نہیں ہوئے جتنی بڑی باتیں کر رہے ہو۔ لیکن بہن کے لیے تمہاری یہ محبت اور پریشانی اچھی ملی مجھے۔ ایک بڑے میاں میں جنہیں گھر کی سی بات سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ بھی جیسے ثانی نے یہ دلچسپی پیدا ہی کی ہو نہ ہی اور انہوں نے تم کو اپنا بہن بھائی کب سمجھا۔“  
 ”میں اپائی ابھی باتیں نہیں ہے اس پر خالی ہم سب سے بہت محبت کرتے ہیں۔“ مشربے ان کی ولایت کی تھی۔

”خیر تمہاری تسلی کے لیے یہ تباہ کر کاہی صاحب کے ایک دو جانے والے ہاں رہتے ہیں جہاں آصف رہتا ہے بلکہ ایک صاحب تو سی جگہ کام بھی کرتے ہیں اور حاجی صاحب نے ان سے ساری معلومات لے لی ہیں۔ آصف میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ اسے روک دیا جائے۔“

وہ اتنا جانتا تھا کہ خراج بھائی میں بھی تو ایسی کوئی بات نہ تھی کہ اس میں روک دیا جائے بلکہ وہ تو۔ لیکن وہ ان سے مزید بحث نہ کر سکا تھا اور میاں صلاح الدین اس سے نکاح کی تاریخ کا ذکر کرنے لگے تھے۔ عذر یا تیکہ خاموشی میں ان پر ایک جگہ چٹپٹا رہی تھی۔ حالانکہ احم نے انہیں بہت تسلی اور حوصلہ دیا تھا لیکن ان کی چپ میں کوئی کی۔ میاں صلاح الدین نے جو کہا انہوں نے سہرا دیا۔ نکاح کی تاریخ طے پا گئی۔ بروکرام میں انہوں نے کسی بھی بات میں اپنا غور نہیں دیا تھا۔ مشربان کے اس پیاسی رہنے کی کوشش کرنا تھا۔ سمن بھی ان کے دو گردن ملائی رہتی تھی۔

”جاؤ بچ اپنا کام کر دینا ٹھیک ہوں۔“  
 وہ ایک بار انہوں نے مشربہ کو کھاتھا لیکن مشربہ کو تو تھا نہیں کیا وہ سوام ہو گیا تھا جیسے وہ ٹھیک نہ ہوں۔ لیکن وہ بظاہر بڑی پر سکون سی لگتی تھیں۔  
 ”عذرا بیٹیم اب وہ لوگ سو نہ لانے کو کہہ رہے ہیں تو کیا خیال ہے کہ اپنی والدین کو بھی دعوت دے دی جائے۔“

”جو آپ کی مرضی میاں صاحب۔“ عذرا بیٹیم نے فقط اتنا ہی کہا تھا۔  
 ”مجھے یہ وقت تو بہت صرف گھر کے افراد سے اس لیے میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا کہ راجی والدین کو بلا لیکن اب وہ لوگ سو نہ لانے کا کہہ رہے ہیں تو آج بھانجہ بیٹا فکھن ہو جائے گا اب ہم ان کی ہوائے میں منع و نہیں کر سکتے اور اتنی بڑی دعوت ہو اور تمہارے بھائی بھائی کو دعوت نہ دی جائے میرا خیال ہے تم آج فون کرنا کرنا۔“

”انہوں نے خودی فیصلہ کر لیا تھا۔“  
 ”ہاں اپنی میں آپ کی افلاکی بہن بھی ہے۔“ عذرا بیٹیم نے انہیں یاد دلایا تھا۔  
 ”ہاں اسے بھی فون کر دینا اور حمنہ کی طرف شبی کو بھیج دینا فون کر دینا۔“

”شعبی تم چلے جانا۔“  
 میاں صلاح الدین کے بعد انہوں نے مشربے کا تھا۔ میاں صلاح الدین نے جو سلوک کیا تھا ان کے لیے اس کے بعد وہ دن کی دل میں حمنہ سے خرم نہ تھیں۔  
 ”مجھے حمنہ کو منع کرنا چاہیے تھا جب میاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ انہوں نے اوپر ہاں کر دی ہے۔“

”میں نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔“  
 مشربے نے بولے اس نے ان کے ہاتھ تھمتائے تھے۔  
 ”حمنہ خالدہ کر سکتی ہیں اور بہت اعلیٰ طرف سے ان کا۔“ انہوں نے انہیں نہیں کیا ہو گا بالکل اور پھر بھی

عالمی کے لیے کوئی اڑھائی کی تو ہے نہیں۔ اب گلزن کر میں شادی چلا جائے گا حمنہ خالدہ کی طرف۔“  
 اور اب نتیجے کے طور پر حمنہ خالدہ کے سامنے بٹھا تھا۔  
 ”وہاں سوچنے کے بجائے آصف پسند نہیں کیا نہیں۔“  
 حمنہ نے خاموشی دیکھ کر کسی قدر بے قراری سے پوچھا۔

”میں آصف بھائی ٹھیک ہیں بس۔“  
 ”عذرا کیسے ہے بہت پریشان تو نہیں۔“  
 ”اب وہ پھر دہری نہیں۔“  
 ”چاہے نہیں ایسی جان مجھے کچھ بھی نہیں لگ رہی۔“

اس نے حمنہ کی طرف دیکھا۔  
 ”نہ جان پلیر آپ آج میرے ساتھ چلیں۔ اسی جان آپ سے بہت قریب ہیں۔ ہم سے تو وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔“  
 ”نہاں نہیں میں کچھ نہ کر رہا ہے مجھے بھی باری کی ہے۔“  
 ”تمہیں شام کو پھر گاؤں کی شادی تو ہوا ہے تم گلزن کو سہاں سے تو حوزا پریشان سے ٹھیک ہو جائے گی۔“  
 ”میں بھائی اب آئے اور اسان ہیں۔“  
 ”رات آج تھا اس وقت دونوں بھائی کس باہر گئے ہیں۔ آتے ہوں کچھ بھی کو بہت شرت خرید لی تھیں۔“

”ہو اور اگلے۔“  
 وہ ہتھال چمے لیے ایک بار عرضی آ رہی تھی اور اس پر اس کا گھر آیا کہ جی ہے۔“  
 ”ہاں کر جی ہے تو آئے تھے لیکن اسلام آباد میں گھر گئے ہیں اپنے دوست کہاں۔“  
 ”میں آٹھ گھڑا ہوا۔“

”اب چلا ہوں۔“  
 ”اے کہاں چل رہے بیٹھ جاؤ۔ کہاں کھا کر بیٹھا جانا۔ شام اور خراج آتے ہی ہوں گے۔“  
 ”میں اس چاول کا۔“  
 ”بیٹھ جاؤ آرام سے۔“ انہوں نے آگے گھرا۔

”کب آتا ہو تا ہے تم لوگوں کا دھرم ہے خیال میں دوسری یا تیسری بار آئے تو میرے گھر میں سے تو سچا تھا اپنے وطن جاؤں گی یا بچوں کی رفاقت کے لیے لیکن یہاں اگر بھی ہے“  
 وہ خرمندہ سا ہو کر بیٹھ گیا۔ منہ بستی سے تکلف میں اور بیٹھے ادا خاص سے ان سے ملتی تھیں۔ وہ ایسے بے تکلف نہیں ہو سکتے تھے غالباً۔ یہاں صلاح الدین کے مزاج کی وجہ سے۔  
 ”تم چاہتے ہو گے؟“  
 ”ہاں کچھ دیر کیلئے یا شاید ایک قاف۔ چھٹی چھٹی باتوں میں بھی کچھ دیر سے کیا تھا۔“  
 ”چلو چروڑوں خالہ بھانجے سب کے آئے نکل جائیں گے ہیں۔ شہی تم لوگ بھی اپنی چھپو کے گھر میں“

شاہرم نے خاموشی دیکھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔  
 ”شاہو! ہاں! منہ نہ کرو۔“  
 ”شہی کو بالکل ٹھیک تم کراش میں ڈرا کر چلی جاتی ہو۔“  
 ”اما شہی میرا کی کن سے صرف آپ کا ہاتھ چاہتا ہے۔“  
 شاہرم نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

”لیکن شہی یہ میری ہاں جو کہنے کو تھیں کار بھیجی ہیں۔ اب بھلا میں۔“  
 ”شاہو! ابھی یہی کہتی ہیں پریشان ہے اور میں نہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

وہ۔۔۔ پھر سیر نہ کر سکی ہوئی لاؤنج سے نکل نکلیں۔ شہی چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ رات نامانے انیس تھا کیا قاف بھائی صاحب نے اگر کراش لے کر آیا ہے اور انہیں لگا تھا جیسے بل پر جو اٹھنا یا سوچہ دھرا تھا وہ کم ہو گیا ہے۔ لاسٹ ویک اینڈ پر جس طرح ہمارے اچانک ان سے اٹھ کے یہ حلقوں رائے پوچھی تھی تو وہ ان کی شدید خواہش کے سامنے یکدم پپ کر گئے تھے اور پھر سچ بھی کہیں پر کرتے۔ وہ ایک جھلک جو دیکھی تھی اور وہ جھلک۔

دل بھی جانے کہاں کہ سستی کے لیے دھڑکا تھا جس کا حصول بظاہر ناممکن تھا۔ دوپہر وہاں کو خاکہ لیں کرتے انہوں نے بلانے کی خوشی پر جو کچا قاف لیکن بل ایسا باقی تھا کہ وہ پوری رات سو نہ سکے تھے۔ شاید کبھی۔ شاید کہیں ایسا ممکن ہو جائے۔ بل بار بار ریمکس دہا کر کہہ کر منہ کر دیں۔ روک دیں اور کہہ دیں کہ ”میں خود سادقت چاہتے ہیں۔ یہاں سے۔“ قاف کو منہ اور قائم علی شہانے یہاں صلاح الدین کی طرف جانا تھا اور انی حالت سے گھر کا انہوں نے ناشتے کے بعد ہی واپسی کا پروگرام کیا تھا۔ منہ جڑا ان ہو گئیں۔

وہاں بھی ان کا بل گھرا کر ہاتھ پائی بار انہوں نے شاد رخ کے سماں کا گوبر لایا تھا لیکن وہ آف تھا۔ ایک بار تو یہی چوٹی کا گوبر بھی ملا بیٹھے تھے پھر اپنی اس افراطی حرکت پر خرمندہ ہو کر فوراً یہی انہوں نے فون آف کر دیا تھا۔ ان کو زبردستی چھوڑ دیا۔ انہوں نے میں جا رہا تھا کہ منہ سے یہ بات ہوئی کہ لیکن منہ سے کچھ نہیں بتایا تھا تب ہی وہ بے چین ہو کر کھائے چلے آئے تھے اور جب منہ سے بہت دھمکے لیے میں بتایا کہ ان کا کراش مانگنے سے کیلئے یہاں صاحب ہاں کر رہے تھے تو انہیں اپنا ایک بہت بڑا محسوس ہوا۔ شاید وہ لا شعوری طور پر یہی سننے کے منتظر تھے اور شاید ان کے دل نے خاموشی دیکھی تھی۔ کہ انے کراش اٹھ کر میں اور ہو جائے کسی بہت اچھے لڑکے سے جو سچے سے بھی اچھا ہو۔ لیکن تو کراہم اور دھڑا کے لیے پریشان ہو کر یہ وہی دل میں بل نام ہو گئے تھے۔ سب اس کے دل کی نیت کی وجہ سے ہوا۔

فیہر رادی طور پر وہ میشری طرف دیکھے یہ جا رہے تھے۔ شاہرم ہولے سے کھڑا رہا۔  
 ”اما شہی بہت خوب صورت ہے لیکن ہم بھی کچھ کم نہیں ایک نظر اور بھی ڈال لیجئے۔“  
 ”شاہو تم۔“ وہ جھپٹنے لگے۔

”میں یوٹی بیو حیاتی میں کچھ سوچ رہا تھا۔“  
 ”ویسے اگر کہیں کی بات ہے۔“  
 شاہرم نے جھپٹنے کے بعد کچھ بڑھ کر کہا۔  
 ”سچ بتانا تو کیا اب تک مگر میں جی تو ہر۔۔۔“ مگر جھپٹ گیا۔  
 ”اے سہا بار انہوں سے کیا ہو۔“  
 ”میں تو کوئی بات نہیں۔“  
 مہر نے خود کو پکڑ کر نہ کی کو شش کی تھی۔

”کتنا بار بار رش ہے یہ چھپو کا اور تمہاری تو ایک ہی چھپو میں اور جانتے ہو ان لوگوں کے حالات کیسے ہیں۔ میں اگر اپنی کئی کئی نو تقریباً دو روز جاتی رہی طہر سے۔۔۔ دراصل ہندو۔۔۔ میسر اور طہر کی بہت حد تک جی جی کر رہی ہوں۔ سب کے علاوہ بہت جا رہے ہیں اس کے چچاں بہت مہنگی ہوئی اور کچھ اور ہیں۔“  
 وہ تفصیل سے اسے ان کے حلقوں بتاتے لیکن باہر کی حد تک تو وہ میں جانتا تھا کبھی کبھار دھرم ذکر کرتی تھیں۔ یہاں صلاح الدین نے تو فریجی ذکر کیا کہ میں قاضیہ سے غور سے سنتی تھی یہاں تھا اور سوچ رہا تھا منہ خالہ نے ایک بار بھی کئی بار واقعی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی اور قطعی غیر متعلقہ باتیں کر رہی تھیں۔  
 ”کیا ایں دکھ نہیں ہوا ہو گا۔ بلانے سے شہی بھائی کے رشتے کو ٹھکرا دیا۔ حالانکہ شہی بھائی کو کوئی کی نہیں ہے پر لحاظ سے بہترین انسان ہیں۔“  
 ”خالہ جان آپ کو الہامی کے انکار پر دکھ نہیں ہوا۔“  
 ”اس نے جھپٹنے جھپٹنے پر چھپو تو ایک افروسی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر گئی۔“  
 ”فوس کو ہوا۔ اما بہت جا رہی ہیں۔“

”سچ ہو تو مجھے زیادہ پریشان ہندو اور اٹھ کے ہوئے لیکن جیسا کہ مجھے پتا چلا تھا وہی کہتے ہیں اچھے لوگ نہیں ہیں لڑکے کی بھائی بہت شاطر عورت ہے۔ اب خدا کرے۔ کیا بتانا تھا۔ منہ سے آف اچھا نکلے اور یوں کہیں تمہارے ہو کہ کراش اس کے لیے کیلے ہوا ہے کہ وہ لڑا بیوی کو رخصتی کے بعد ساتھ ہی لے جائے گا۔ جو مری تو پھر اٹھ لے تو آف کے ساتھ ہی رہتا ہے اللہ اس کا مقدر اچھا کرے۔“  
 اس نے ایک عقیدت پر نظر خرمندہ پر ڈالی۔ ختم خالہ اتنی اچھی ہیں اور باہمی ان کا ذکر کتنی نفرت سے کرتے ہیں۔  
 ”وہ دونوں بھی آگئے۔“  
 ”ہاں گاڑی کا بارن سٹائی دیا تھا۔ بار پھر گرت کھلے اور پھر میں گاڑی رکھنے کی کواڑ آئی۔ منہ سے مسکرا کر ہنسر کی طرف دیکھا ملازم لڑکے نے اندر کی دھڑکھلاؤں بھائی بچتے مسکراتے اندر داخل ہوئے۔“  
 ”سو آؤ ان کی یہ چاندی یہاں سے طلوع ہو گیا۔“

شاہرم نے ہنسر کو دیکھ کر نواگوار تھا۔ ہنسر کو دیکھ کر وہاں ہائیں نے بہت سے گھمے گایا۔ شہی کی مہر پر اور شاندار جمعیت نے اسے افروہ سا کر دیا تھا۔ یکدم اسے کچھ کھو جانے کا احساس ہوا۔  
 ”اے میرا راتے چپ چپ سے کیوں ہوئی تو چاروں ہیں بیٹے ہو لے کہہ کر تو تم نے خاموشی ہی رہتا ہے اور بولتا ہے ہماری بھائی نے۔“

”پچھو شاہیابی تو ہمارے اپنے ہیں پھر وہ اندر خوشی میں کیوں نہیں رہ سکتے۔ یہاں کتنے کمرے خالی پڑے ہیں۔“  
علی شاہ کو دکھ ہو رہا تھا۔

زینت فاطمہ خاموش رہی تھیں لہذا رات شاہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا تھا۔  
”شاہ زینب سے کیا تھا؟ انہیں فطرس پڑے ہیں۔ کبھی کبھی بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں اگر وہ ہیں تو کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ وہاں نوکر مہار اور کالے نوکر فیہا کے ساتھ ہوئے ہیں۔ یہاں بیٹے ہیں۔ شاہ زانے بھی شاہ زینب سے ایسا ہی سوال کیا ہو گا تو شاہ زینب نے جواب میں کہا ہو گا۔ حالانکہ شاہیابی کبھی بھی خطرناک نہیں رہے تھے۔ جس دن وہ اپنے بوسہ و حواس میں نہیں تھے تب بھی نہیں۔“  
وہ دونوں تک بہت سیٹ رہی تھیں۔ ان کا گفتگو یا چال چل تھا کہ وہ شاہیابی کے پاس جا میں ان کے پاس بیٹھیں۔  
”نہ جاساں کریں۔ دو روز سے یہاں رہنے ہوئے انہوں نے کتنی بے بسی کے انہیں پکارا تھا۔“

”بھئی۔ بھئی۔ میری وہاں کے اہل رہوں گا۔“  
شاہیابی اس کا جواب کوئی نہ سکا ہو۔ ”انہوں نے زب کا ہار پھر زینت فاطمہ کی طرف دیکھ کر دیکھا۔“  
”میں کبھی کبھی شاہیابی کو ضرور یہاں لائوں گا اور کسی پیشکش سے چپک کر لائوں گا۔“  
”تم مجھے کسی کی طرف کب لے کر جاؤ گے شاہ زینب؟“

زینت فاطمہ نے سر ہٹ کر شاہیابی کا خیال دین سے نکالنے کی کوشش کی۔ وہ رات ہی شاہ زینب کے ساتھ سید پور سے آئی تھیں۔ ایک چوکیدار ایک ملازم لڑکا اور ایک ملازم بھی ان کے ساتھ ہی گاؤں سے آئے تھے۔ شاہ مرغ شاہ میر اور ادا شاہ کو بھی وہاں سے لے آئے تھے اور اب وہ دونوں اپنا اپنا کھانا کھا رہے تھے۔ جبکہ زینت ادا اور شاہ زینب کی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

”شاہ تو قاتل ہوئی ہی رہے کی ایسی کی کیا جلدی ہے۔“  
شاہ مرغ سر کر کے زینت فاطمہ صرف انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔ تب ہی ملازم لڑکی پردین نے لاؤنج میں آکر چمچا۔

”میں شہ میں کیا بنا رہی؟“  
”کچھ نہیں آج کا شہا کھا مناسب میرے ایک دوست کے گھر سے آئے گا۔“  
”جی اچھا۔“  
پردین نے ان کے سامنے بڑی چھوٹی تھیل سے جانے کاغذی کپ اٹھا لیا۔  
”سنو۔“

شاہ زینب نے سہاوت دی۔  
”سیدہ! شاہ اور ادا میرے کو کہ تیار ہو کر آئی لاؤنج میں آجائیں۔ میرے دوست کی فیکل آئی ہی ہوگی۔ کمرے بعد میں دیتے رہیں گے۔“

یوں تو کہ خریدنے کے بعد انہوں نے ایک انٹریر ڈیکوریری خدمات حاصل کی تھیں۔ مگر تقریباً نو فٹ لہذا تھا۔  
”یہاں سے کمر لائن میں بڑی چیز تک بیٹھ گئیں۔ لیکن شاہ میر اور ادا شاہ کو ابھی اپنی پرسل آسٹیا سیٹ کرنا تھیں۔ شاہ میر چارہ ہاتھ کھینچ کر بیٹھ گئی۔ ادا شاہ نے اس کے بیڑہ میں ہو کر اسے وقت سے وقت انتظار کیا رہا پڑا۔ وہ آسمانی رہے۔ اس طرح اس کو بھی اپنی چیزیں سیٹ کرنا تھیں۔ مثلاً کسی ڈی پیٹر کماں رکھا جائے۔ کبھی شہ میں کہاں ہو۔ سو دونوں نماز کے بعد اپنے اپنے کمرے سے نکلے ہی تھیں۔  
”نہ افسوس شاہ زینب کے کمرے سے نکلا تو زینت فاطمہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔“  
”جی جی شاہ وادوں کو ناشتا لارہا ہے۔“  
”اب نہ سے نکل ہی گیا ہے تو کیا چھپاؤں قائم چاچو منہ آئی اور شاہ زینب آ رہے ہیں۔“

”یہاں صاحب سے کب مشہور ہوئی ہے۔“ مشورے نفی میں سر ہلاوا۔  
”کمال ہے چار تھیں۔ کبھی تو خوش نہیں کی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہزاروں تیر بہدہد نے ہیں میری سہا۔“  
”شاہو کو آئے کیا کما تھا۔“ شجاع نے اس کی طرف دیکھا۔  
”سوری۔“ اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگا گئے۔

”قرنے نافہ تو نہیں کیا۔“  
”نہیں۔“ بشور کھل کے مگر آیا۔ وہ خود بھی تو ایسا ہی تھا کھلنا دروغ شر نہیں لکھنے پر دیے ہوئے والے واقعات نے اس کا ذہن ہاؤف کر دیا تھا۔ کتنی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سیٹ کیا تھا کہ اس پر آخر کاسٹل۔  
”ہماری کوئی سہ نہیں ہے لیکن میں بمشکری پریشانی محسوس کر سکتا ہوں۔ کاش میں۔“  
شجاع نے ایک بار پھر بہت محسوس کی۔

ایک سو سو خیال کے پیچھے انہوں نے ایسا نہ ہونے کی دعا کی تھی اور اگر وہ دعا نہ کرتے تو شاہیابی شاید وہ یکدم انھو کمرے سے ابھول کی پوری رضامندی کے ساتھ منہ سے کہنے جا رہے تھے کہ وہ ایک بار پھر کوشش کرے دیکھیں شاہیابی شاید صلح اللہ بن نہیں کرے۔ تو بہت سارے لوگ خوش ہو جائیں گے اور ایک اپنی خوشی کی قربانی دے کر اگر وہ سوں کو خوش کر سکتی ہے تو۔ وہ پانچ کی طرف بڑھ گئے۔ شاہ زینب نے انہیں پانچ کی طرف جاتے دیکھا کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلاوا اور پھر بمشکری طرف متوجہ ہو گیا۔

”شاہیابی کیسے ہیں کچھ رہے آپ۔“  
شاہ زینب نے زینت فاطمہ کے سامنے بیٹھے ہوئے چمچا۔  
”میری ملاقات ہی نہیں ہو سکی رات مستحضر سے پچانچا اور پھر میری سہا سے ہی ہم نکل آئے۔ اس خیال سے ان کی طرف نہیں گیا کہ وہ سورہے ہوں گے۔“  
”شاہ۔“

زینت فاطمہ کی آواز بہت آہستہ تھی۔  
”تم صبح کتنے ہو شاہیابی کیا رات دوا دہیں آئی ہے۔“  
”چھوچو کو کیسے پتا چلا۔“  
شاہ زینب کی آنکھوں میں کچھ نظر آئی۔  
زینت فاطمہ نے شاہیابی کے اندر خوشی میں آجائے کا سارا واقعہ شاہ زینب کو سنایا۔

”شاہ زینب کا خیال صبح سے پچھو کہ ان کی یادداشت کی واپسی کا پراسس شروع ہو چکا ہے۔ کہیں کوئی تار اسار چکتا ہے کہ شہیادہ کا اور پھر ان کیوں میں آہو جا آتا ہے۔ یہ پراسس بہت آہستہ ہے لیکن اگر انہیں کسی اچھے ڈاکٹر کی زیر نگرانی رکھا جائے تو یہ پراسس تیز ہو سکتا ہے۔ اور۔“

”لیکن میری جان شاہیابی ایسا بھی نہیں چاہیں گے۔“  
”مگر کیوں پچھو؟“ شاہ زینب کے کبھی بھی ہلکا سا احتجاج تھا۔  
”بہت سی باتوں کا جواب میں دیا جا سکتا تھا۔“  
زینت فاطمہ نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس روز کمرہ دوسرے سے دردی سے ان کا بازو پکڑ کر انہیں کھینچا ہوا لے گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی چل کر کمرہ رہے تھے۔  
”میں جانوں گا لیکن میں جانوں گا۔ اور دوسروں کو اس سے کیا۔“

”تو شاہیابی نے کتنی بے دردی سے انہیں غور کر دیا تھی اور زینت فاطمہ کا دل لرز گیا تھا انہوں نے گھر اور بار بار باری دار شاہ اور کھنکھنی شاہ کی طرف دیکھا تھا۔“ علی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ زارہ کے چہرے پر حیرت تھی



”لیکن یہاں وہاں کیل اُڑے ہیں بیٹا تم نے انہیں منع نہیں کیا۔“

”حسب حاجت زینت فاطمہ گھر آئیں۔“

”وہ پھوپھو جان آپ تو بڑی گھبرا جاتی ہیں۔ یہ سید پور نہیں ہے اور نہ ہی بڑی جوبلی ہے جہاں چاچو کا غلہ بند ہے۔“

”لیکن شاہ رخ بیٹا! اگر شادی کو تباہ چل گیا تو۔“ وہ بدستور گھبرا ئی ہوئی تھیں۔

”کیسے پتہ چلے گا۔“ شاہ رخ بہت مطمئن رہا تھا۔

”میں ملازم جو سید پور سے آئے ہیں کدو سن سال سے جوبلی میں ہیں اور ان میں سے کوئی بھی چاچو کو پہچانتا نہیں بڑی کی عمر اب انیس بیس سال ہوئی۔ سووی تو ہے ہی تینو چھ سال کا اور چچا کی عمر بھی مجھ سے دو تین سال کہی ہوئی اس سے ثابت ہو کہ سید پور کے چاچے کے بعد سید پور میں۔“

”انہوں نے کسی قدر خوشی سے کہا کہ زینت فاطمہ ریٹیکس ہو جائیں۔“

”سید پور شاہ رخ میرا نیکو آدمی ہے۔“

”ہاں۔“ شاہ رخ نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔

”وہ دونوں تو بہت ایکساٹینڈ ہو رہے ہیں۔“

”لیکن شادی تو تم نے ہی منع کی تھی تو کروا کر وہ کسی سے ذکر نہ کریں۔ کسی سے بھی نہیں۔“

”آپ بالکل اطمینان رکھیں پھوپھو میں نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے شادی کے تو دن میں کہیں بھی کسی بچا کا رخصت نہیں تھا۔ اب اس بچا کی شادی چلی یہاں میرے دوست کی شادی کی حیثیت سے متعارف ہوئی۔“

شاہ رخ کے اطمینان دلانے کے باوجود زینت فاطمہ اندر سے مضطرب ہی تھیں۔ اور یہ اضطراب سید قائم علی شاہ سمجھتا اور شاہ رخ کے آنے کے بعد بھی اندر ہی اندر جیسے انہیں بے چین کر رہا تھا۔

”یہ شادی تو بالکل بے فائدہ ہے مگر تم نے بھی مجھے نہیں سوجھا۔“

”میں نے کیا سوچا تھا۔“

سید قائم علی شاہ سرور سے شاہ رخ کے کردار پر پھلائے بیٹھے تھے۔

”بہت دور ڈر کر زندگی گزار لی ہے۔ آپ یہاں ہوں میرے شہر میرے گھر سے چند گز کے فاصلے پر اور

میں خود کو آپ سے دور رکھوں یہ ناممکن ہے اور یہ دیکھنا میری اتنی باری کی جی ہے کہ کیا میں اس سے دور رہ سکتا ہوں نہیں تا تو بس ایسا اس موضوع پر بات ختم میرا جملہ چاہے گا میں آؤں گا اور جب تم کو کھل کھل چاہے میرے گھر کرو۔“

سید پاشا شاہ نے بڑے اشتیاق سے حزن کو دیکھا تھا۔

”حزن آئی کس قدر خوب صورت ہیں اور چاچو بھی۔“

”تمہیں تو ہمارے متعلق علمی بھی نہیں ہو گا سید پاشا شاہ لیکن میں سب کی خبر کرتا تھا۔ جس روز تم پیدا ہوئی تھیں۔ اسی روز مجھے علم ہو گیا تھا کہ بڑی جوبلی میں ایک ننھی سی بچی آئی ہے اور میں نے اسی وقت حزن سے کہا تھا۔ ہوئی آج ہمارے۔“

حزن نے یکدم نظریں اٹھا کر قائم علی شاہ کی طرف دیکھا تو بیٹھا بیٹھا اور یکدم سر جھکا کر اپنی سرکراہٹ چھپائی تھی ان کی اور سوچی بات پر اور کئی دھمکان دیا ہوئے لیکن شاہ رخ نے مست دھیان سے ان کی بات سن لی تھی اور

اب متنی خیز انداز میں سر ہلا رہا تھا۔

”شاہ رخ بیٹا! آپ کو ذرا نہیں لگا تھا اس طرح جوبلی میں آئے ہوئے اگر شادی کو تباہ چل گیا تو۔“

سید پاشا شاہ کو شاہ رخ بہت اچھا لگا تھا اور شاہ رخ نے بھی ان دونوں سے بے تکلف ہونے میں ڈرا بھی دیر نہیں لگا لی تھی۔

”کیا ہو گیا ہو یا کیا شادی مجھے موار ہے؟“ زیادہ سے زیادہ کیوں ہونا کہ وہ مجھے گھر سے نکال دے تو میں کیسے کتنا کہ

نامحسوس طور پر اداسی سے جو کچھ کہے ساتھ ہو تھا وہی بیٹے کے ساتھ ہو رہا ہے البتہ باپ نے یہ بے

وفائی ایک جہنم کی نیند لیکن یہ طاقت کے لیے برداشت کی تھی جبکہ بیٹا چاہا مفت میں مارا گیا۔

”سب کے ساتھ ساتھ قائم علی شاہ کے ہونٹوں پر بھی سرکراہٹ آئی۔“

”اسا اور شاہ رخ بیٹے شاہ رخ کی بات سن مت اتنا یہ تو تمہیں یوں لگے گا کہ سب سے شہر ہے۔“

”یہ زیادتی ہے بیٹا آپ خواہ مخواہ میرے لئے کزنز کے سامنے میرا منہ خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”تمہارے لئے کزنز میرے بھائی کی اولاد ہیں لہذا ان کو گناہ نہ کرنا بھی میرا فرض بنتا ہے۔“

”کیسا نام بیٹا نے کیسے طوطے کی طرح انکھیں پھیل لی ہیں اپنوں سے ملنے ہی ورنہ پہلے تو مانا گا کہ میرے شاہو

ہے گھر کی روٹی ہے یہ تو میرے گھر کا اجالا ہے۔“ شاہ رخ غصہ سے ہونٹوں پر لائی جھجائی ہے بولے تو یکدم خراں میں ہمار

آجائی ہے۔ اتنی جلدی تھا اور یاد میں کہنے لگے کسی کو نہیں دیکھا غالباً یہاں کی خفایاں کا اثر ہے۔“

”اس نے جہرے پر بھیج دیکھا طاری کرلی۔“

”میری جان! تو بچ چکے میرے گھر کی روٹی میں۔“

سید قائم علی شاہ نے اپنے بائیں طرف بیٹھے شاہ رخ کے گرد اپنی بائیں بازو پھیلا لیا۔ دائیں طرف بیٹھے شاہ رخ

کے گرد بائیں کان کا بازو پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے دونوں کان پر خوب کرنا۔

”تو میں کون مجبور تھا میں بھی ایکٹنگ کر رہا تھا یوں بھی میں سوچ رہا ہوں! انجینئر مجھ کو درکار داکٹر داکٹر جانوں

۔ میرا خیال ہے میں اچھا ایکٹرز سنساروں کیل کرنا۔“

”وہ حتمی کی طرف بیٹھے گا۔“

”یہ انکشاف کب ہوا تم پر کہ تم اچھے ایکٹرز بن سکتے ہو۔“

حزن سر ہلا رہی تھیں۔

”جب میں اونچی عمر میں شادی کے سامنے کھڑا صرف اسنو بیٹا کا کزن ہونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔“

”میں نے کزن تو تم کو ہی دیکھا تھا۔“

”میں نے کزن تو تم کو ہی دیکھا تھا۔“

”میں نے کزن تو تم کو ہی دیکھا تھا۔“

”میں نے کزن تو تم کو ہی دیکھا تھا۔“

”میں نے کزن تو تم کو ہی دیکھا تھا۔“

”میں نے کزن تو تم کو ہی دیکھا تھا۔“

”میں نے کزن تو تم کو ہی دیکھا تھا۔“

”میں نے کزن تو تم کو ہی دیکھا تھا۔“

”میں نے کزن تو تم کو ہی دیکھا تھا۔“



”ہمت اور کرتے ہیں۔“  
 نذا کے لیے میں نے ڈاری تھی۔  
 ”مگر بہت اہم کیونکہ تھا۔“ علیحدہ کس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔  
 ”حفصہ نے کوس لے لیا۔“  
 نذا کے انداز میں لاہور والی تھی جب معمول اس وقت بھی وہ حجاب اور عیال میں تھی۔  
 ”اس وقت تم کہاں جا رہی ہو کیا کیشین۔“

علینہ نے پوچھا۔  
 ”میں کچھ دیر لان میں بیٹھوں گی۔ بارہ بجے مجھے ڈرائیور لینے آجائے گا۔ میں صرف ڈاکٹر فاروق کا لیکچر لینے آئی تھی۔“  
 ”تھا چلو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں میرا بھی موڈ نہیں ہے اس وقت لب جانے کا ڈاکٹر اعظمی نے سب کو لب میں بلایا ہے۔“

نذا خاموش رہی۔  
 ”تپا ہے نذا چند دن پہلے ہی عیال میں ہو چکی ہے۔“  
 اپنا شلڈر بیک گھاس پر رکتے ہوئے علینہ نے بیٹھے ہوئے کہا۔  
 ”کیا۔“  
 نذا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کا پورا چہرہ چھپا ہوا تھا سوائے آنکھوں کے اور آنکھیں۔

علینہ نے بغور دیکھا اس کی بے انتہا خوب صورت آنکھوں میں بے تحاشا ہنس تھی۔  
 ”ہم اس روز مارکٹ گئے تھے تو ہمیں وہاں ایک لڑکی نظر آئی۔ لیکن کوئی نذا وہ تم سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی تھی بس آنکھوں کا کٹر مختلف تھا۔ میں نے تو سمجھا تھا یہی ہو شاید مگر نے کرن لیس مار گئے ہیں۔“  
 ”لیکن میں تو کئی دن سے گھر سے باہر نہیں نکلی۔ اچھو کوئی دوسری سے تم سے کزن اور ان کی فیملی آئی ہوئی تھی۔ آج بھی اس لیے جلد جا رہی ہوں۔“

”وہ آجما۔“  
 علینہ نے پھر بغور سے دیکھا اس کا جی چاہا وہ نذا کے کچھ دیر کے لیے ذرا اپنے چہرے سے حجاب ہٹا لے لیکن حیرت انگیز مشابہت تھی نہ۔ میں نے اسے دوبارہ رپاٹ میں بھی دیکھا تھا مجھے تھما داکماں ہوا تھا۔“  
 ”وہ گلا نہیں تم نے کو تو نہیں لیا۔“  
 نذا نے اپنی بیٹیلی پر ہاتھ مارا۔  
 ”نابادی کون تمہاری بہن۔“

”میں میری کزن ہے۔ میرے چچا کی بیٹی اور خالہ کی بھی میری جی اور خالہ جڑواں بہنیں تھیں اور میں اپنی جی سے بہت مشابہ ہوں نابادی بھی اپنی مہار ہے بہت حد تک۔ نابادی کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے۔“  
 ”دیکھو کتنی مشابہت ہے۔“  
 علینہ کا چہرہ کچھ کم ہوا تھا۔  
 ”تپا ہے میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ تم نہیں ہو تو ضرور تمہاری کوئی بہن ہوگی۔“  
 ”میں کیا میں تو آگاہی ہوں۔“

نذا افسوس دی۔  
 ”نابادی تمہارے گھر میں رہتی ہے لیکن تمہارے مقابلے میں وہ بہت ڈانگ رہی تھی۔“  
 علینہ نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

نذا افسوس دی۔  
 ”نابادی تمہارے گھر میں رہتی ہے لیکن تمہارے مقابلے میں وہ بہت ڈانگ رہی تھی۔“  
 علینہ نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

نذا افسوس دی۔  
 ”نابادی تمہارے گھر میں رہتی ہے لیکن تمہارے مقابلے میں وہ بہت ڈانگ رہی تھی۔“  
 علینہ نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

نذا افسوس دی۔  
 ”نابادی تمہارے گھر میں رہتی ہے لیکن تمہارے مقابلے میں وہ بہت ڈانگ رہی تھی۔“  
 علینہ نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

نذا افسوس دی۔  
 ”نابادی تمہارے گھر میں رہتی ہے لیکن تمہارے مقابلے میں وہ بہت ڈانگ رہی تھی۔“  
 علینہ نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

مگلی ہو چکی ہے میری مرضی سے ہی مئی کے ایک دو پارکے کزن ہے“  
 ”یہاں۔“

”ارک شیں۔“ ”نرانے بتایا۔“  
 ”تھوڑا سی فیملی کے متعلق تمہارے گھر میں کون کون ہوتا ہے۔“

”نرا ایک اتنی غول بات سن کر علینہ کو یاد آیا۔“  
 ”مجھے حفسہ نے بتایا تھا لیکن تم کلیر روٹیں یا باجو میں۔“  
 ”ہاں کر تو تھا لیکن سن شرمندی کی کہ کر حفسہ نے تمہیں بتایا وہ تو کم کیا سوچتی ہوگی۔“  
 ”اے نہیں حفسہ نے تو اس روز تک جب گھر آئی تھیں ذکر تک نہیں کیا تھا۔ یہ تو کافی دن بعد اہل  
 روز بتایا تھا اور مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ تم اتنا کسی روز۔“  
 ”ہاں ضرور۔“

”نرا اسکرالٹی۔“  
 ”مجھے خود کم ہے۔“ مختلف اور اچھی گئی ہو۔ میں نے مئی کو تمہارا بتایا تھا۔ اور مئی نے مجھے ابا  
 دے دی تھی کہ کس تمہارے ساتھ دوستی کر سکتی ہوں۔“  
 ”لیکن آج بھی بلایا تو میں نے تمہیں ہے۔“  
 ”دراصل میں۔“ ”جھجکی ہوں بہت۔ لیکن اس وقت تم بہت انا چھا لگ رہا ہے مجھے۔“  
 ”تینیک یو دائیں تو ہمیں بہت مغرور سمجھتی تھی۔“  
 ”علینہ نے صاف کہی ہے کہ نہ۔“

”میں عینا میں مغرور نہیں ہوں لیکن مجھے جلدی ہے ٹکف ہوتا نہیں اتنا حفسہ وغیرہ کی طرح حالانکہ نہ  
 پکے روز ہی مجھے اچھی لگی تھی۔“  
 ”رنگی۔“ ”علینہ سن دی۔“  
 ”چلو آج سے دوستی کر۔“

”نرا بھی سکرادی۔“  
 ”میں تو سمجھتی تھی حفسہ اور فیدہ وغیرہ تم بہت کلوز ہو۔“  
 ”میں میرا مال کوئی دوست نہیں ہے اور کسی سے آج تک میری اتنی گفتگو نہیں ہوئی تھی آج تم سے ہوئی  
 ہے۔ جہاں تک حفسہ وغیرہ کی بات ہے تو پہلے روز ان سے ملاقات ہوئی تھی اور پھر حفسہ بھی گفتگو قابل سے  
 آئی ہے اور میں بھی۔“ ”میں بھی ڈاؤن پڑ گئی ہو تو تم ہوا گٹھ سے اکٹھے آجائے ہیں۔“ ”نرانے بتایا۔“  
 ”شیریں تو حفسہ نے اور میں نے چاہا تھا کہ تم ہمارے گروپ میں شامل ہو جاؤ لیکن تم خود ہی ہم سے  
 کڑوائی کر۔“

”علینہ ماہ کی طرف سے کبھی تھی۔“  
 ”تم سے نہیں پتا۔“  
 ”نرانے ضد نہ کر۔“

”میں تو سب سے ہی کڑوائی ہوں اور اصل میری مائی پند نہیں کرتیں کہ میں کالج یا یونیورسٹی میں لڑکیوں سے  
 دوستانہ کر دوں۔“ ”کتنی جلد نہ جانے کیسے خاندان اور مزاج کی ہوں تو بس اس لیے۔“  
 ”سب ہی اچھی ہیں نہ۔“ ”اچھے خاندانوں سے ہیں۔“  
 ”علینہ کو اس کی بات نہ سہی نہ لگی۔“

”ہاں۔“ لیکن میری کسی بہت سخت ہیں کئی دفعہ تو مجھے خوران کے اس طرح کے رویے سے بہت ابا جس ہوتی  
 ہے لیکن وہ ہیں جن تمہارے ڈیڑھی ملک میں تو نہیں ہوتے اور مجھ پر بڑی ذمہ داری ہے۔“  
 ”تمہارے ڈیڑھی کہاں ہوتے ہیں۔“ ”علینہ نے پوچھا۔“

”میں شکر ہے اچھی ہو گئی۔“  
 ”نرانے بتایا۔“  
 ”میں شکر ہے اچھی ہو گئی۔“  
 ”نرانے بتایا۔“

”میں شکر ہے اچھی ہو گئی۔“  
 ”نرانے بتایا۔“  
 ”میں شکر ہے اچھی ہو گئی۔“  
 ”نرانے بتایا۔“



”مرد بھی چلو وہاں کی بات ہے۔ میں نے ہوش میں تو لاہور نہیں لی آج تک جی بہت مڑا آئے گا۔ سب سے پیش کے لئے تو کسی کی شکیں تک کیا وہ نہیں ہیں پھر مزہ چھوڑ بھی تو ہیں، تالا ہو رہا تھا۔ یہاں سے ہی ملاقات ہو جائے گی۔“

”میں نہیں لے کر جاؤں گی۔ عینا وہ کہہ رہی تھیں وہاں دیکھو یہی کی شادی ہو جانا تو ہے ہی اور پھر صرف ان کی تقریب ہے۔ سب کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کناجی پوری شادی میں سب سے اہم ہوتا ہے۔“  
علینہ کی سوچ بڑی ہوتی تھی۔  
”مما آج میں تو میں جات کر رہی ہوں۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔ کم از کم میرا انتظار تو کر لیتیں۔ میں بھی کچھ شایانہ کرتی۔“

”بھئی، پہلی بار جاؤں گی تو سب کے لیے کچھ بچھوئے تھے جو کھانے کے لیے آئے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک اور آدمی کو کے لیے“  
علینہ نے تو بھائی کی بتا جانے کا۔ ماما شایانہ نہیں لے کر جائیں۔“  
ایرج نے فوراً سے دیکھا وہ بہت پر جوش نظر آ رہی تھی۔  
”یاد رہے ماما کچھ بھی نہیں آئی ایک دم ہی کیا پلٹ گئی ہے ان کی پہلے تو نہیں تھے۔“

”کیسی۔“  
ایرج نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔  
”کیسی جیسی اب ہو گی ہیں۔ یعنی بھائی کے رشتہ داروں سے الگ۔“ علیہ پچھو کے گھر جانا انہیں پسند نہیں رہا۔ عذرا پچھو اور اسٹرا میں آگے نہیں لگتے اور نور اور نرمل میں نہیں لے شاد غاساں نظر آنے لگی ہیں۔“

”اب یہ تو ہے پہلے تو ماما علیہ پچھو کے ہاں رہ کر جاتا کرتی تھیں اور وہاں جانا بھی انہیں برا نہ لگتا تھا۔“ ایرج نے تائید کی۔  
”شاید یہ میرا آئی کی آمد کی وجہ سے ہوئے ان کے گھر سے کلن جا رہا ہے۔“

”صرف پچھو جاتیں کی ماما علیہ کے ساتھ ہی۔“ ایرج نے بتایا۔  
”میرا حال میں تو ضرور جاؤں گی۔“  
علینہ کا انداز جیسی تھا۔

”تھنا تم بھی بس جو بات تھناں لیتی ہو پورا کے ہی رہتی ہو۔ ماما علیہ کی تو گھر رہی ہیں وہاں دیکھو یہی کی شادی میں سب سے پیش کے لئے تو کسی کی شکیں تک کیا وہ نہیں ہیں پھر مزہ چھوڑ بھی تو ہیں، تالا ہو رہا تھا۔ یہاں سے ہی ملاقات ہو جائے گی۔“

”پھر کچھ چلے جائیں گے۔“  
ایرج نے کہا وہ کتنا ہی جانتی تھی کہ فون کی بیل ہوتی۔  
”میرا بھائی کا ہی ہو گا تھا۔“

ایرج نے قریب سے فون کی طرف اشارہ کیا تو بات ادھر ہی چھوڑ کر فون کی طرف بڑھی۔ دوسری طرف اسٹری تھا اس نے مسکرا کر ایرج کی طرف دیکھا اور دھڑے دھڑے سر ہٹا کر نہیں لے گئی۔

اسٹری اس سے اٹھے تو بے حد محسوس ہو رہی تھی۔  
”ابا پر تو خوش کے انتظار میں کھڑے کھڑے ایک لمحہ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ گھر جانے کے بجائے مزہ خالی کی طرف چلے جائیں اور اپنی کاندان کے گھر کے ضرورت ماحول میں شاہزادہ اور قائم انگل کی دلچسپ باتیں میں گزار دیں۔ مزہ خالی کی گفتگو اور محبت کا کالٹ اٹھائیں۔ اور وہ چوں کہ ایک بوجھ سا ماحول سے انار کر بہت پر سکون سے ہو کر کھڑے جاتیں لیکن پھر عذرا تیکر کے خیال سے وہ اپنے گھر کی طرف جاتی ہیں پر سوار ہو گئے۔“

”نواہ خواہی جان پریشان ہوں گی۔ پھر کسی روز چلا جاؤں گا۔ پھر کسی روز زانی جان اور سن انم کو بھی

ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔“  
”میں نہیں لے کر جاؤں گی۔ عینا وہ کہہ رہی تھیں وہاں دیکھو یہی کی شادی ہو جانا تو ہے ہی اور پھر صرف ان کی تقریب ہے۔ سب کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کناجی پوری شادی میں سب سے اہم ہوتا ہے۔“  
علینہ کی سوچ بڑی ہوتی تھی۔  
”مما آج میں تو میں جات کر رہی ہوں۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔ کم از کم میرا انتظار تو کر لیتیں۔ میں بھی کچھ شایانہ کرتی۔“

”بھئی، پہلی بار جاؤں گی تو سب کے لیے کچھ بچھوئے تھے جو کھانے کے لیے آئے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک اور آدمی کو کے لیے“  
علینہ نے تو بھائی کی بتا جانے کا۔ ماما شایانہ نہیں لے کر جائیں۔“  
ایرج نے فوراً سے دیکھا وہ بہت پر جوش نظر آ رہی تھی۔  
”یاد رہے ماما کچھ بھی نہیں آئی ایک دم ہی کیا پلٹ گئی ہے ان کی پہلے تو نہیں تھے۔“

”کیسی۔“  
ایرج نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔  
”کیسی جیسی اب ہو گی ہیں۔ یعنی بھائی کے رشتہ داروں سے الگ۔“ علیہ پچھو کے گھر جانا انہیں پسند نہیں رہا۔ عذرا پچھو اور اسٹرا میں آگے نہیں لگتے اور نور اور نرمل میں نہیں لے شاد غاساں نظر آنے لگی ہیں۔“

”اب یہ تو ہے پہلے تو ماما علیہ پچھو کے ہاں رہ کر جاتا کرتی تھیں اور وہاں جانا بھی انہیں برا نہ لگتا تھا۔“ ایرج نے تائید کی۔  
”شاید یہ میرا آئی کی آمد کی وجہ سے ہوئے ان کے گھر سے کلن جا رہا ہے۔“

”صرف پچھو جاتیں کی ماما علیہ کے ساتھ ہی۔“ ایرج نے بتایا۔  
”میرا حال میں تو ضرور جاؤں گی۔“  
علینہ کا انداز جیسی تھا۔

”تھنا تم بھی بس جو بات تھناں لیتی ہو پورا کے ہی رہتی ہو۔ ماما علیہ کی تو گھر رہی ہیں وہاں دیکھو یہی کی شادی میں سب سے پیش کے لئے تو کسی کی شکیں تک کیا وہ نہیں ہیں پھر مزہ چھوڑ بھی تو ہیں، تالا ہو رہا تھا۔ یہاں سے ہی ملاقات ہو جائے گی۔“

”پھر کچھ چلے جائیں گے۔“  
ایرج نے کہا وہ کتنا ہی جانتی تھی کہ فون کی بیل ہوتی۔  
”میرا بھائی کا ہی ہو گا تھا۔“

ایرج نے قریب سے فون کی طرف اشارہ کیا تو بات ادھر ہی چھوڑ کر فون کی طرف بڑھی۔ دوسری طرف اسٹری تھا اس نے مسکرا کر ایرج کی طرف دیکھا اور دھڑے دھڑے سر ہٹا کر نہیں لے گئی۔

اسٹری اس سے اٹھے تو بے حد محسوس ہو رہی تھی۔  
”ابا پر تو خوش کے انتظار میں کھڑے کھڑے ایک لمحہ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ گھر جانے کے بجائے مزہ خالی کی طرف چلے جائیں اور اپنی کاندان کے گھر کے ضرورت ماحول میں شاہزادہ اور قائم انگل کی دلچسپ باتیں میں گزار دیں۔ مزہ خالی کی گفتگو اور محبت کا کالٹ اٹھائیں۔ اور وہ چوں کہ ایک بوجھ سا ماحول سے انار کر بہت پر سکون سے ہو کر کھڑے جاتیں لیکن پھر عذرا تیکر کے خیال سے وہ اپنے گھر کی طرف جاتی ہیں پر سوار ہو گئے۔“

”نواہ خواہی جان پریشان ہوں گی۔ پھر کسی روز چلا جاؤں گا۔ پھر کسی روز زانی جان اور سن انم کو بھی

ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔“

اور بھی شوکار تھی کرتے ایک دوسرے سے ٹوک بھونک کرتے دیکھا تھا لیکن انھوں نے اپنا دل بولوں پر دھجھکے مسکراتی رہتی تھی۔ مگر وہ اپنی تنہید اور خاموشی تو بھی نہ لگتی تھی اس کا ایک دوسرا کام نثر محسوس ہوتا تھا۔ انہیں کیا وہ اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔ ان کے دل میں بارہوں میں بارہا انہوں نے سوچا تھا اور پھر ہزار انگلیں بھی تو بے حد اس میں کاش و کار کی سے واپس آ کر لینڈ بخت کے کپاس نہ رکھتے تو شاید۔

لیکن وہ بھلا کیا کر لیتے۔  
ان کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ کھڑکی اباجان نے بھلا کب ان کی بات کو اپنی تھی وہی جواب ...  
وہ اسلام آباد سے واپس آئے تو سمن نے انہیں انھم کا رشتہ دے ہوئے اور حنہ خالہ کی شجرار کے سلسلے میں آمد کے متعلق بتایا تھا۔ انہیں اذہد حیرت ہوئی۔

”سو اباجان نے حنہ خالہ کو انکار کر دیا۔ اور یہ لاکا آصف کیا ہے شجرار کے مقابلے میں بہت اچھا ہے۔“  
”سمن اسی بھائی لیکن اباجان کا بھی فیصلہ ہے چند دن بعد نکاح ہے خودی دیکھ جائے کہ وہ شجرار بھائی سے کتنے بہتر ہیں۔“

سمن کے لیے بھی سمن تھی۔  
”اباجان اباجان نے احم سے پوچھا۔“  
وہ سمن سے پوچھ رہے تھے جس احم کمرے میں داخل ہوئی۔

”اباجان نے کیسے؟“ سمن نے پوچھا۔  
”میں صرف فیصلہ کرتا رہا ہے۔“  
سمن کے لیے بھی کئی بدستور قائم تھی۔

”سمن۔“  
”اباجان کی نظروں میں متنبہ تھی۔“  
”مجھے اباجان کے فیصلے پر کئی اعتراض ہیں پھر تم خواہ تو وہ کیوں ملکان ہو رہی ہو۔“

وہ بات عمل کر کے تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ حنہ خالہ سمن سے ساری تفصیل سن کر پریشان ہے وہ مجھے تھے۔ کراچی میں اور پھر اسلام آباد میں اپنے شوکاروں کے زوار کر آئے تھے اور وہاں آئے تھے۔  
”اباجان کی بہت افسردہ ہیں۔“ انہیں حنہ خالہ کو انکار کرنے کا بہت دکھ ہے۔

سمن نے انہیں بتایا تھا اور وہ کچھ دیر بعد پھر ان کے سامنے بیٹھ افسردہ سی پوچھ رہے تھے۔  
”آؤ اباجان ایسا کیوں کرتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا صرف مجھ سے اباجان کو کچھ ہے لیکن باقی سمن احم، سمن رضی، رونا، مدثر سب ان کے بے حد لڑاؤ کے ہیں لیکن پہلے سمن پھر رضی اور پھر کئی۔“ انہوں نے ایک نظر پھر ان کے ہرے پر ڈالی تھی جو بالکل چپ بیٹھی ہے نا پھر ہے کے ساتھ انہیں بچہ رہی تھی۔

”اور آئی کے ان کے بے فیصلہ ہونے بالکل پسند نہیں آیا اباجان۔ میرا دل ان کے اس فیصلے پر بڑا بھی خوش نہیں ہے۔ بے شک آصف بہت اچھا ہو لیکن شجرار کا یہ فیصلہ حنہ خالہ کا بیٹا ہے وہ اس لحاظ سے اس کا پڑا بھائی ہونا چاہیے تھا۔“

”اور اس لیے تو ماں صاحب نے اسے روک رکھا ہے کہ وہ حنہ کا بیٹا ہے۔“  
”غذا پر غالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کا چہرہ پست تھا ہوا احساس سے ماری اور وہ ہونٹوں کو جھپکی سے جھپکے ہوئے تھیں۔

”فجعی بہت مہرمن لڑا ہے اور حنہ خالہ کا گھر ایک انڈیل گھر ہے۔ آئی وہاں بہت خوش رہی۔ تاہم ابی جان جب میں اہل جان کے گھر رہتا تھا تب بھی حنہ خالہ آئیں تو مجھے اتنا بار کر تیں کہ میں دل ہی دل میں دعا میں مانگا کرتا تھا کہ وہ سمن نہ جائیں۔ مجھے ان کے اس سے آپ کی خوشبو آتی تھی۔ آپ نے کچھ تو ضد کی اباجان سے احم آپ کی بیٹی سے آپ کا حق ہے کہ آپ اس کے مستقبل کے فیصلے میں رائے دیں۔“

”خمس۔ حق۔“

غذرا انیمک کے ہونٹ لڑے۔

”سمن نے بہت بات کا تھا۔ ابی سمن حنہ کی تھی پہلی بار زندگی میں پہلی بار سمن نے میاں صاحب کے کسی فیصلے پر اختلاف کیا تھا۔ ابی انھیں حنہ کی خوشیوں کے لیے۔“ ان کی کوئی بارہا تھی تھی۔ انھوں نے بھی اتر آئی تھی اور سیات چہرے پر آسف اور وہ کرا کر گرجے جھلکے اترے تھیں۔ سمن کی عیاری تھی۔ اس سفر کے سامنے اس کے کسی کاغذ ہونے کا تھا۔ دل چاہیے مکمل مکمل کیا ہی ہو رہا تھا۔

”ابی جان۔“

اسفر نے عقیدت و محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”سمن باتوں اباجان سے۔“

”نہیں۔“

انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور آسواں کے رخساروں پر ڈھلک آئے اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بلکہ ہلک کر روئے لگیں۔ سمن کو کاغذ پر جوں پر چھایا تھا اس کو سمن کی راہ پر لگا تھا۔ اسفر بچہ دیر سے کسی سے انہیں رونا دیکھتے رہے۔

”ابی جان بیل۔“

”انہوں نے نفی سے ان کے ہاتھ چہرے سے ہٹائے۔“ ایسا بت کریں۔ اس طرحت میں روئیں بلکہ بیات کرنا ہوں اباجان سے نہیں تو قائل کر دینی کو کوشش کرنا ہوں شاید۔“

”نہیں نہیں بس رو دیکھو خدا میری احم کا فیصلہ اچھا کرے سمنی کہ رہا ہے لاکا اچھا ہے۔ حاجی صاحب بھی تعریف کر رہے ہیں۔ سمن شجرار اچھا ہے تاہم اہل اس کی طرف لپکتا ہے۔ ورنہ تو سمن خوش ہوں۔“

”نہیں تو سمن خوش نہیں ہیں۔ سمن خوش نہیں ہے سمنی اباجان سے۔ مجھے اباجان سے ضروریات کرنا چاہیے۔“  
”انہوں نے انھیں اباجان کو تو پھر انیمک نے گھر کا کرنا نہیں اٹھنے سے روکا۔

”نہیں، نہیں اس کی بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نکاح کی باتیں غلط ہو چکی ہیں سمن نے بھی خواہ خواہ نہیں پریشان کر دیا۔“ سمن کی سمن نے آئے۔ جانا تو جو کھو کر لیکس ہو جاوے۔  
”انہوں نے انھیں اپنے سر سے لے کر شجرار کی نظروں سے انہیں روکا۔

”آپ کی پریشانیاں کیا بچھ سے الگ ہیں کیا میں گھر کا فوٹو میں ہوں۔ ایسا بت کیا کر ابی جان۔ مجھے لگتا ہے جیسے سمن ابی تک آپ کے لیے اس گھر کے لیے نہیں ہوں۔“  
”میرا اس گھر کی خوشیوں پر بیٹھوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”نہیں میری جان۔“

غذرا انیمک نے روتے روتے روکا۔

”تمرا ابی نہیں ہو۔ تم تو تو جس سے میں اپنا دکھ سکھ کر سکتی ہوں۔ تم اور احم سوچنا پاتی ہے اور سمنی ابی بچہ ہی ہے۔“  
”پوچھو پوچھو کہ کد میں سے مجھ سے کد میں۔ میں اب کا بیٹا سمن آپ کا دوست۔“

”انہوں نے اسے غصے سے غصے سے انھیں کہا انھوں نے ایک منونیت بھری نظر ان پر ڈالی۔  
”مجھے اس کا دکھ تو ہے کہ میں صاحب کے حق میں لڑاؤ کر دیا ہے۔ فطری بات ہے میں اور حنہ جس قدر ایک دوسرے کے قریب تھے۔ اور جس طرح شادی سے پہلے ہم میں تھا پھر حنہ کے منہ سے شجرار کے رشتے کا سن کر مجھے بہت ہی تھی ہوئی تھی اور انکار پر وہ بھی ہوا۔ لیکن شاید احم کے فیصلے میں شجرار نہیں تھا میں نے اس پر بھی سر ہکا دیا۔ اللہ کی بی مرضی ہو لیکن میں ہوں جا نہیں کیوں میرا دل تو رہا ہے۔ حالانکہ فطری نے مجھے بری

تسلیم دی ہے اسے اسف آجھای گا۔ بس خدی امیر الاحم کا نقیب اچھا کرے قدر کرنے والا شریک زندگی ہو۔

انہوں نے ایک مختصری سانس لی۔

”مرد عورت کی قدر کرنے والا ہوا اس کا احترام کرے اس کے حقوق کا خیال رکھے اسے حقیر اور کمتر نہ سمجھے تو عورت غنیمت اور کئی شے بھی باخوشی گزارا کر سکتی ہے۔ اور اگر مرد عورت کا مسخرہ اٹا رہے اسے حقیر اور کمتر جان رہے اس کی قدر نہ کرے تو سونے کے ڈھیر پر بیٹھ کر بھی وہ خاموش رہتی ہے۔ بیٹا۔ مٹی کا ڈھیر ہو جاتی ہے۔“

اور امیں لگا جیسے عذرا بنیم بھی مٹی کا ڈھیر ہو چکی ہوں۔ وہ سوچیں اور مٹی کی ہوں۔ وہ ایک کمرے کو اپنے اندر اترتے محسوس کر رہے تھے اور انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے کس طرح عذرا بنیم کا دامن خوشیوں سے بھر دیں۔ کاش میاں صلاح الدین نے ان کی قدر کی ہو مٹی بدل لگتی اور ادنیٰ طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آ جیسے تھے اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر خاموش کھلی دی۔ کوئی ایسا لفظ نہیں بل رہا تھا جو ان کے احساسات کی ترجمانی کر سکے یہی میاں صلاح الدین کمرے میں داخل ہوئے۔ اسفر نے اجڑا کمرہ کھڑے ہو کر سلام کیا۔

”تو آپ آ گئے۔“

سلام کا جواب دے کر انہوں نے سر ہٹا اسفر پر ایک نظر ڈالی۔ ایک طرف یہ مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا اور دوسرا بنیم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”تو آپ نے ہمارا اپنے صاحبزادے کو احم کے نکاح کے متعلق۔“

”جی۔“

عذرا بنیم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان کے چہرے پر بھڑپوئی پھیلنے لگا۔ اس بات پر آ گیا تھا۔ اور شاید جب کسی کو اتنا زیادہ ڈر کر لیا جاتا ہے اور اس کی اپنی نافرمانی کی جاتی ہے تو ایسا ہی سہا پٹا پن آ جاتا ہے اس میں اسفر نے سوچا تھا۔

”اگر ان کو اپنی دلچسپیوں سے فرغت مل سکے تو ان سے کہیے گا کہ میں کے نکاح کی تقریب میں بھی کچھ دلچسپی لیں۔“

بیٹھ کر طرح ان کے لیے میں طہور آیا تھا۔ وہ عذرا بنیم کی طرف کھڑے رہے تھے کو مخاطب اسفر تھا۔

”بشری بڑھائی کا رخ ہو گا ورنہ مجھ سے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔“

”جی کہنے مجھے کیا کرتا ہے۔“

اسفر کا لبہ مدبب تھا۔

”بھئی بل تو جوئے نہیں۔ لوگ تو ہنسون کی مشاییم کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لیتے ہیں لیکن آپ نہیں۔“

انہوں نے ایک طرف سی نظر ان پر ڈالی۔

”کچھ ایسا بڑا کام نہیں۔ کارڈ پھینچنے کے لیے دے دے تھی علی پریس پر ڈالے آئیے۔“

بشری کے پاس مسلمانوں کی

سنت ہے۔ وہ لے کر کارڈز تقسیم کروا دیجئے۔“

اب یہ براہ راست اسفر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”ہاں کی جگہ ہو چکی ہے کھانے وغیرہ کا انتظام حاجی صاحب کے حوالے کر دیا ہے۔ ان کی کٹھنوں کے

اجی ویا سلام ہے۔“

”جی سر۔“

اسفر اب تک کھڑے تھے۔

”اور میں اس لیے آیا تھا۔ عذرا بنیم کہ آپ کو کچھ فرہم کر کے کیا کرتا ہے اور کیا نہیں حالاکہ یہ عورتوں کے

کلمہ ہوتے ہیں۔ انہیں خبر ہوتی ہے کہ کیا دن رات لانا ہے لیکن پھر بھی جان مرحوم سے نہ جانے آپ کی کیسی تربیت کی ہے کہ یہ بات سمجھتے پتال پاتی ہے۔“

اسفر کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا اور انہوں نے بے اختیار عذرا بنیم کی طرف دیکھا جو اپنی سہا پٹاں چوہلے کھڑی تھیں جیسے میاں صلاح الدین کی اس طرف سے گفتگو سے کوئی اثر نہ رہا ہوا۔

”تو کے کے لیے انکو بھی اور کھڑی خریدتا ہے۔ کہ بیٹوں کے لیے میں نے اسے تیس ہزار بھجوا دیے ہیں۔ اچھے سے دو جوئے اور جوئے دیکھو اپنی پسند کے خرید لے میرے خیال میں دو جوئے کافی ہوں گے۔ ایک سوٹ

قرمی پٹن اور ایک پیٹنٹ شرت۔“

”جی جو آپ مناسب سمجھیں۔“

عذرا بنیم نے بھی آواز میں کہا۔

”اور شکر ہے کہ آج میں حاجی صاحب کی طرف چلا گیا تو بھائی صاحبہ نے پوچھ لیا کہ کیا کچھ دینا لانا ہے۔“

سہا پٹاں والوں کے لیے کیا خریدنا ہے۔ وہ نہ آپ نے تو نکاح کے بوڑھے عزتی کو ادنیٰ بھی بھائی صاحبہ سے ہی

پوچھ لیا تھا میں نے کیا کرتا ہے کہ رہی میں لڑکے کے کمال پاپ تو ہیں میں بھائی صاحبہ کے لیے اور سچیں سچیں

کے لیے جوئے تو ہوں۔ ایک چھوٹا موٹا زور بھی دینا چاہیے بھانجے کے لیے ہاں کی جگہ سے رخصتی پر کوئی

بھاری سیٹ یا کڑے ویڈیو دے دیں گے اس وقت کوئی ہلکا سا لاکٹ سیٹ کے لیے یا پائیاں ٹائیس وغیرہ کیا

خیال ہے آپ کا۔“

”جو آپ مناسب سمجھیں۔“

عذرا بنیم کا جواب کلمے بھائی تھا۔

”کیا آپ کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے۔“

میاں صلاح الدین جھنجھلائے۔

”میری رائے۔“

ان کی آنکھوں میں حیرت اور آسف کے رنگ ملے جلتے تھے اسفر کا بل جیسے کسی نے صفی میں لے لیا۔

”جی آپ کی رائے۔“

میاں صلاح الدین کی آواز میں جھنجھلاہٹ نمایاں تھی۔

”میری رائے۔“

انہوں نے دہرایا۔

”میں میں کیا کرنا دے سکتی ہوں۔“

انہوں نے بے بسی سے میاں صلاح الدین کی طرف دیکھا اسفر کے دل پر ضرب پی دی۔

”آپ ستر سمجھتے ہیں جو کرنا ہے۔“

”تھک ہے آپ رائے مت دیں اور اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میرے ساتھ چلیے میں آپ کو لینے ہی آیا تھا۔“

انکو خمی کڑے کڑے غصہ بھی خریدے تھے آج کے لیے۔“

”جی اجی۔“ عذرا بنیم کھڑی ہو گئیں۔

”میں جانوں آپ کا مڈو کیل خراب ہے کہ میں نے آپ کے بھائی محترم کو ڈیجیٹل کر دیا ہے لیکن

عذرا بنیم اور کچھ گھٹ کر کہہ دیں کہ میں نے بھی وہ دن گزرتا ہے آج نہ کل چاہے اس کا بیٹا مشغول بن کر لیکن

آجائے اگر یہ بات آپ کو سمجھ آئی تو پھر یہ سیلا خیمہ کر کے خوش دلی سے بیٹی کے نکاح کی تیاری میں حصہ

لیں۔“

بات عمل کر کے ایک نظر انہوں نے زور پڑتے عذرا بنیم کے چہرے پر ڈالی اور پھر اسفر کی طرف دیکھا جو ہونٹ

چپکے کھڑے تھے۔





زینت فاطمہ شاہدہ کے اتنی ہی بات کرنے سے دل میں ہلچل مچا رہی تھی۔  
 ”آپ کی خوش قسمت راگین پچھو۔“  
 شاہدہ نے مسکرا کر انہیں لکھ دی۔

”اور بالآخر شام چل رہی ہیں باقی چاچو کی طرف۔ حزنہ آئی ہے نہ تاکیدی تھی کہ سب رات کا کھانا اور  
 ہی کھا میں گئے۔“

”شاہدہ تو تم نے حزنہ کو منع نہیں کیا۔ میں نے کہا تھا تمہیں منع کرو۔“

”لیکن کیوں منع کر رہا تھا میں۔ اسنے شوق اور محبت سے تو کیا ہے انہوں نے اور پھر اتنے سالوں بعد تو آپ  
 قافی چاچے سے ہی ہیں آپ کا بھی نہیں چاہتا کہ روزانہ سے ملیں۔ چاچو تو کہہ رہے تھے کہ میرا ہی چاہتا ہے زینت  
 فاطمہ کو اسنے اس کے آگے بہت سارے دن اسنے اس رکھیں میرا اور میرے بچوں کا بھی ہے ان پر تم لوگوں  
 نے بہت معمول کر لیں ان کی محبتیں۔ میں نے کہا کہ پچھو آئی ہیں تو بے شک ہے آئیں۔“

”بلکی کی مسکراہٹ نے زینت فاطمہ کے لبوں کو چھو لیا۔ شاہدہ ہی انھیں تم ہو گئیں۔“  
 ”جیہ بھی بھی شاہدہ کی بات چلا کہ قافی اور اس کے بچوں سے ہم رتے رہے ہیں وہ بہت تھاکوں گے شاہدہ تم  
 سمجھتے کیوں نہیں ہو اور ان کاغذ نہ سمجھتے خوف آتا ہے شاہدہ۔“

”میں سب سمجھتا ہوں پچھو۔ یہ سب ہلین آپ نے جدا کیا ہوں پچھو ہم نے سب رشتوں کی محبتیں دیکھی  
 ہیں۔ سارے رشتے ہیں جا رہے ہیں لیکن شاہدہ اور شجاع تو رشتوں کے معاملوں میں بہت نمایاں ہیں۔ آپ  
 شفیقوں اور مہربانوں کا بھی حق ہے پچھو اور جہاں تک شاہدہ کی بات ہے انہیں اس کی خیر میں ہو سکتی بھی  
 بھی نہیں سیدہ اس اور شاہدہ میرے لئے اچھی طرح سمجھا رہی ہے۔ وہ دونوں بہت سمجھدار ہیں اور بہت خوش بھی  
 ہیں چاچو سے کر کہ۔“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں ذرا بلند بخت کی طرف جا رہا ہوں۔ میں کچھ شاپنگ کرتا ہے۔ شام کو پھر جتا رہے گا۔“  
 ”میری سہیلی سے کوئی کیا۔“

زینت فاطمہ نے بوجھا۔

”شاہدہ کی کافون کیا تھا کل رات کو آپ نماز پڑھ رہی تھیں لیکن جی سے بھی بات ہوئی تھی سب ٹھیک ہیں زارا  
 اور شاہدہ زینت آپ کی لئے ہوئے ہیں۔ سب لیلی کی اداں اور دینی تھیں۔“

”ہاں اتنی رونق کے بعد یکدم سب ہی گھر سے چلے گئے لیکن اچھا وہ انہیں ڈرا اور بھی ساتھ لے گیا ہل  
 جائے گا اس کا بھی ورز اس کے مود کا تو یہی نہیں چلا۔ زارا بھی کہہ رہی تھی کہ کیا خبر جاری کرلوں تو ساتھ لے  
 جانے سے انکار کر دیں۔“

”کیا مطلب۔“

شاہدہ جاتے جاتے فہم گئے۔

”کیا زینت شاہدہ خوش نہیں ہے زارا کے ساتھ۔“

”میں خیر ناخوش تو نہیں ہے لیکن جی بہت زیادتی کر جاتا ہے زارا کے ساتھ۔ وہ بھی بے چاری تو کسی  
 کسی ہی رشتہ سے سلا لے کر کھانا دلوا رہی تھی۔“

”ذرا نہیں پچھو زیادہ مختلف۔ شاہدہ بولے تھے۔“

”جب وہ محل گیا تو میں تھے تو قافی بدان کے ہاں گیا تھا پچھو میں ان کے ہاں دوستانہ ماحول تھا۔ جبکہ  
 ہمارے ہاں محض ہے۔ انکار لانا تو سارے بچوں سے بلکہ زارا سے بھی بہت بے تعلقی کی بات سمجھتے کرتے تھے۔  
 مختلف مسائل زیر بحث آتے تھے۔ بچوں کو اس کے احترام کرتے تھے اور بے جا پابندیوں میں نہیں۔“  
 ”ہاں یہ تو ہے۔“ زینت فاطمہ نے اسکی سے کہا۔

”پچھو کیا آپ نے شاہدہ کو سمجھا نہیں کہ وہ زارا کے ساتھ زیادتی نہ کیا کرے۔ ابھی شادی کو دن ہی گئے  
 تھے۔“

”اچھا تھا لیکن شاہدہ رخ وہ بالکل شاہدہ کی کالی ہے۔ کبھی چھوٹی سی بات پر غصے میں آجاتا ہے اور کبھی بڑی سے  
 شکایت نظر انداز کر جاتا ہے اور اس کی بات سے زارا اور جاتی ہے۔“

”مغرب ایسا بھی ہوا نہیں ہے شاہدہ زارا اس کی بیوی ہے۔ میں کون ہوں اس سے کہ اتنا بھی ڈرنے کی  
 ضرورت نہیں ہے اس طرح تو حضرت اور کبھی میرے ہوجا میں گئے اور خواہ مخواہ عجب جاس میں گئے۔“

وہ ہنسنے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے تو زینت فاطمہ کے چہرے سے برشانی جھلکتے گلی وہ شاہدہ سے یہ نہ کہہ  
 سکے کہ ایسا تم کیا۔ شاہدہ کو تو یہ بھی اچھا نہیں لگا کہ زارا نے تم سے فون پر بات کی اور یہ بات وہ شاہدہ رخ  
 سے کہہ بھی نہ سکتی تھیں۔ ”مصرم ہو نہ شاہدہ رخ اور شاہدہ زینت کے مزاج میں اتنا فرق کیوں ہے۔“

انہوں نے یہی سے ہوجا اور بلی میں دل میں دھماکے لگائے سب کی خوشیوں اور زینت کی۔  
 شاہدہ بچے آکر ان کی دلی لالچ میں آئے تو تب بھی ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور پھر وہ بلی نہی مسکراتے  
 ہوئے۔ ”نیت دوم کی طرف بڑھ گئے۔ نیت بدلت کرے میں میں تھا۔ دوم سے چلی گئے کی آواز آ رہی تھی۔“

”تو حضرت ہاتھ لے رہے ہیں۔“  
 انہوں نے صوف پر چڑھتے ہوئے پکارت سے مہیا نکل نکالا اور شاہدہ زینت کا گھبراہٹ۔ کچھ ہی دیر بعد شاہدہ زینت کی  
 آواز سنائی دی۔

”کسے ہو شاہدہ زینت۔“

ان کے لیے میں چھوٹے بھائی کے لیے یہاں تھا۔

”فائن۔“

”کیسا جا رہا ہے تمہارا یہ ٹرپ۔“

”بہت اچھا۔“

شاہدہ زینت نے خوش ہو کر بتایا۔

”میں نے شاہدہ کی دوست کی شرارت میں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ڈاکو منٹن تیار کر دیا ہوں۔“

اس کے لیے میں چھوٹے بھائی کا تھا۔

”شاہدہ کی دوست تو بہت بڑے برنس یا ٹائیکون ہیں اور یہ بہت ہرافٹ ایل برنس ہے۔“

”وہ بلیو کنگ شاہدہ کی کئی ہوپ کہ بہت کامیاب رہو گے۔“

”عاجی گئے۔“

شاہدہ زینت نے بعد خوشگوار لیے میں کہا۔

”زارا کہاں ہے زارا اسے تو دونوں اس سے کون تمہارے کان سمجھ کر رکھے۔“ ان کا انداز بے حد دوستانہ اور

بے انگلی ہے ہوئے تھا۔ دوسری طرف ایک لمبے کے کے خاموشی چھائی پھر شاہدہ زینت کی آواز آئی۔

”زارا انہیں جیسی کے ساتھ ہیں کئی سے شاپنگ وغیرہ کرنے۔“

”اچھا جیسی طرف سے دھماکا ہے۔ زارا وہاں وہاں سے فارغ ہو کر لاہور کا چکر بیک لگانا تم لوگ آؤ کھجک ہو جائے

گی اور پچھو بھی خوش ہو جائیں گی۔“

”ہو گے کو خوش کرلوں گا۔“

شاہدہ زینت سے بات کر کے وہ خامے مطمئن سے ہو گئے تھے ورنہ کچھ پر پلے زینت فاطمہ کی باتوں سے قدرے

بریشان سے ہو گئے تھے وہ جانتے تھے زارا مختلف ماحول میں ملی ہے جسہ جہاں وہ ہیں پڑھ رہے تھے تو اخبار لانا کے

پلانے لگتی تھی پچھو میں ان کے ہاں گئے تھے زارا انہوں نے محسوس کیا تھا کہ کوئی بھی زارا کی خواہش کو رد

نہیں کرنا تھا نہ بھائی نہ اخبار لانا۔ یہ سروس پلے کی ایک شام انہیں یاد آئی وہ ان کے ساتھ لان میں بیٹھے تھے ان

دنوں انہوں نے گھر منصف کالج لاہور میں ایڈمیشن لیا تھا اور ذرا غائبانہ آغوش میں بائیس جماعت میں رہتی تھی۔  
اخبار لالا ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے متعلق بات کرتے کرتے انہیں ایک دوپٹے مقدس کے متعلق بتانے  
لگے تھے اور وہ بدستور پچھی اور اٹھا کھانے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ زار لالا میں اتنی بھی ناراض ناراض اور  
خفا تھی۔

”یاد رکھیں نا مالہا جان مجھے اپنی دوست کے ہاں جانے کی اجازت نہیں دے رہیں۔ اس کی بہن کی منندی ہے  
اور مجھے ضرور جانا ہے۔“

”ہاں ہاں ضرور جاؤ بیٹا۔“

”لیکن ماں جان نے منع کر دیا ہے۔ آپ دواؤں سے ناان سے اجازت۔“

وہ بدستور ہی ہوئی ان کے قہر میں اس کی پریشانی کی کمی۔

”ایک شریک دواؤں میں دیر نہ ہو۔“

”ہی۔“

وہ خوش ہو گئی۔ لیکن نائی جان نے جسے میں تھیں۔

”نئی بات ہوئی تو اور تھی۔ میں آج رات کے فحشکشن میں شریک ہو تا ہوں۔ میں ہے۔ آپ کو کچھ سوچنے  
مجھے نہیں ہیں۔ تمہاری کو جانے کی اجازت دے دی۔ آپ اتنے لڑکوں کے کل کو بچتا پتا پڑے۔“

نائی جان لالا میں آئی تھیں۔

”مجھے بھی پتی پر اصرار ہے۔ کبھی ہمارا نہیں ٹھکانے کی اور ہاں ہوسے کو وہ اس کے ساتھ چل جائے ہمارے  
خود چھوڑ آئے گا اور لے لے لے گا اور دیکھو تم زیادہ روک ٹوک مت کیا کرو۔ کی تو پھول چھوٹی خوشیاں ہیں جن  
سے یہ موصوم چڑیاں خوش ہو جاتی ہیں۔ سیکھیں یہ یادیں کون جانے سرال میں جا کر انہیں کشمال مارنا پڑے  
کتی خواہش دل کے آئین میں ہی دھری دے جا کریں۔“

ان کی کواڑ بھاری ہوئی تھی اور اس سے انہیں اسوار عظمیٰ کا خیال آ گیا تھا ابھی پچھلے سال کی ہی قویات تھی

دولوں نے میدان باز اور کچھ نیاں بیٹنی خواہش کی تھی تو شادی کے کسی نہ کسی طرح فائنل کیا تھا انہیں۔

”شہناز چو نیاں لے آئے گا خود کواڑوں میں خوار ہونے کی ضرورت نہیں۔“

حالانکہ وہ دولوں تو ابھی بالکل بچیاں تھیں۔ نائی ماں خاموش ہو گئی تھیں اور وہ زار کے جانے کے بعد بہت  
دیر تک اس کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ تب اس کے مزاج کے متعلق اس کی حساس طبیعت کے متعلق۔

”خدا کرے کہ اسے قدر اور محبت کرنے والا ملے۔ زنی ملے۔“

وہ جبران ہوتے رہے تھے کہ بھلا اخبار لالا ان سے یہ سب کیوں کر رہے ہیں لیکن رات کو جب کھانے کے

بعد وہ چل قدمی کے لیے لالا میں آئے تھے اور اپنے ہی دھماں میں مل رہے تھے تو انہوں نے زار اور بھالی کو

باتیں کرتے ساتھ وہ فحشکشن سے واپس آئی تھیں اور گاڑی سے اتر کر اب اندر کی طرف جاتے جاتے پورچی  
پر مڑھوں پر رک گئی تھیں انہوں نے شہناز کو نہیں دیکھا تھا جو چل قدمی کرتے کرتے لالا میں چڑی کی پر پیڑھ  
گرتے تھے۔

”تمہاری فریڈی، بہن تو باری ہے پتا نہیں دلا کیا ہے۔“

بھالی کہہ رہی تھیں۔

”میری فریڈ نے بتایا ہے مجھے دو ماہ بھی خوب صورت ہے۔ لیکن شہناز بہت بے دہ کے میری دوست کی بہن  
بہت شریف ہے اپنے کزن سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔ میری فریڈ کہہ رہی تھی کہ کامراں کو چھوٹے بھائی سے  
مٹا ہے لیکن شادی ہو رہی ہے۔“

”خیر شہناز وہ نائی پرانی ہے۔“

بھالی پر کدے سے رک گئی تھیں۔

”ہاں لیکن ہم کچھ بڑے کام ساتھ ہو تو زندگی بھی گزرتی ہے۔“ دار نے جواب دیا۔

”میں کیا مانتا ہوں۔“

”شر پر اصرار ہے۔“

”لیکن شہناز تو بچیدہ ہے۔“

بھالی کے لیے میں شرارت تھی۔

”یاد رکھنا۔“

زار کے لیے کی جرت انہوں نے وہاں بیٹھے بیٹھے بھی محسوس کی تھی۔

مطلب یہ کہ اگر تمہاری شادی شہناز سے ہو جائے تو۔“

”تو اگر کیا جان اور مال جان نے خودی فیصلہ کر لیا تو ٹھیک ہے لیکن اگر میری رائے پوچھی تو میں کہہ دوں گی کہ  
شہناز سے کچھ نہ ہو۔“

بھالی نے بھی اپنی اور باتیں کر لی ہوئی انداز میں کہیں۔

زار کی جرات پورے سکر ابے تھے اور انہوں نے ایک بار پھر سوچا تھا کہ اس کی جگہ اگر اساتوی تو کچھ بھی نہ

کہہ سکتی تھی۔ پھر یہ بات سننے کے بعد اس کی نگاہ میں تھی۔ جہاں بعد جسہ اپنی تعلیم مکمل کر کے تھے تو بھلی بی بی

نے زار سے متعلق ان کی رائے پوچھی تھی۔ انہیں یہ بات یاد آئی تھی۔ حالانکہ زار کا کم عمر کی بھی

اور وہ بھی سیکڑا پیر کے اسٹوڈنٹ تھے۔ اسے سالوں میں انسان کی سوچ بدل چکی تھی۔ لیکن یہاں جانے کے علاوہ

یہ خیال بھی اندر نہیں موجود تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کسی کو باندھ کر نہیں جانا چاہتا تھے۔ متعلق کر کے جانا غلط

تھا تو شادی کر کے تھا چھوڑنا اور بھی غلط تھا۔ اتفاقاً اور نہ بیاہی۔ پتا نہیں وہاں انہیں چار۔ بال لگ جائیں یا

پانچ۔ سال سو انہوں نے منع کر دیا تھا اور پھر بھی کیا تھا کہ انہیں باہر جانا ہے اور کسی کو انتظار کی سولی پر لٹکا کر جانا وہ

مناسب نہیں سمجھتے۔

تایا زار بہن ہونے کے ناتے زارا انہیں عزیز تھی۔ اس رشتے کے علاوہ انہوں نے کبھی کسی اور حوالے سے

اس کے متعلق کبھی بھی سوچا تھا۔ حالانکہ وہ ایک بار زینت فاطمہ نے انہوں میں ذکر کیا تھا کہ سب کی خواہش

ہے کہ زار اس کی لڑائی کر لیں۔ لیکن انہوں نے زار کے خیالات سے آگاہ ہو چکے تھے اس لیے ان کے ذہن

میں کبھی کوئی اور خیال نہیں آتا تھا۔ سب کے ہاں اس کی طرف جی بھاری تھی۔

”کم کب آئے۔“

بلند بخت تو لیے سے ہال کو پوچھتا ہوا باہر دم سے نکلا۔

”میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں کہ حضرت وادش روم سے کب رہہ ہوئے ہیں مجھے تو تم نے کہا تھا  
وہ صاف آج آئے۔“

”دور اصل۔“

بال اچھی طرح نوکر اس نے توجہ صوفے پر پینچا۔

”میں اس وقت جب میں وادش روم میں قدم رکھا تو میرے ہاتھ جان کا فون آ گیا۔ پھر حسب معمول باری  
باری میرے ہاتھ کے سارے مہمانوں اور بھائیوں نے میری خیریت پوچھی نا لی جان نے پورے چندہ منٹ مجھے  
تفصیل دی۔“

”چھ! شہناز خنہ۔“

”اس سے پہلے پر گئی تمہاری خیریت پوچھنے کے لیے آجائے تم تیار ہو جاؤ۔“ شائیک کے بعد اس کی طرف بھی

جاتا ہے۔

”ہاں تمہارا کیا خیال ہے اس کی بہن کے لیے کچھ گفت لینا چاہیے۔ میں فحشکشن میں شریک نہیں ہو سکا  
تھا۔ بلند بخت نے پوچھا۔“

”ابھی رخصتی تو میں ہوئی۔ نکاح کی تقریب تھی میں اس وقت تو سلائی کے طور پر پیسے دے رہے تھے۔ اب تم جو مناسب سمجھو۔“  
شاہ رخ نے سنجیدگی سے کہا بلند بخت مال میں برش کرتے کرتے بے اختیار پیسہ پڑا۔  
”یہ کیا ہم عورتوں کی طرح ہتھکڑی کرنے لگے۔“  
”اگلی۔“ شاہ رخ بھی نہیں ہے۔

”دور یہ کیا اتفاق ہے کہ تم یوں دوست بھرا ایک سی کہنی میں اکٹھے ہو گئے ہیں۔“  
”ہاں میرے ڈنڈی بھی اس اتفاق پر جڑا ہے اور خوش بھی۔ میرا خیال تھا کہ دونوں تو ملے جاؤ گے امریکہ اور میں یہاں اکیلا اندر اچھا کر رہوں گا۔ میرے چاہنے والوں نے دیکھے کسی صورت باہر جانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ یہاں ان کا بس چلے تو مجھے کسی دنیا میں بند کرنا چاہیے اس لئے اس رکھ کر۔“  
”تم اتنے تھے لیے پوئے کسی دنیا میں تو میں بند ہو چکے ہیں اس لیے جاؤ گے دور سے جنہیں کبھی بتایا جائے تو آیا ممکن ہے۔“  
شاہ رخ چار چھیدتے لیکن ان کی آنکھوں اور یوں کے گوشے سے مسکراہٹ ٹھک رہی تھی۔  
”یار تم بھی سے سچیز نہیں سوچ سکتے تھے۔“  
بلند بخت نے براہ راست نہایت۔

”مٹلا۔“ شاہ رخ نے اس کی طرف دیکھا۔  
”مٹلا۔“ تیلی۔ بلند بخت نے کچھ سوچے ہوئے کہا۔  
”چلو اب سوچ لیتا ہوں۔“  
وہ بے اختیار غصے سے تپتی ان کے بل فون کی تیل ہوئی۔ انہوں نے مہربانہ کہا۔ قائم علی شاہ ہے۔  
”شاہ رخ تم شام کو آ رہے ہو مناسب دُعا کیے اسے کہا تھا۔“  
”جی چاچو پچھو کہنا تھا صاحب معمول یہ تو زور سا خوف ہو میں اور بچہ ہوں۔“

”میں نے فون اس لیے کیا کہ ابھی مجھے شاہ رخ مل گیا وہ دیا ہے کہ بلند بخت بھی تمہارے ہاں ٹھہرا ہوا ہے مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ اسے بھی میری طرف سے دعوت دے دو۔“  
”بلند بخت۔“ شاہ رخ نے حیرت سے پوچھا۔  
”ہاں بل بلند بخت۔“ قائم علی شاہ نے جواب دیا۔  
”جی تو چاہیں گے لگتا کہ تم اسے کب کچھ پوچھو تو آؤ۔ تمہارا مہمان ہے۔“  
”وہ کون چاچو۔“  
”لیکن وہ یوں چھوڑا دینا مجھے مناسب نہیں لگتا کہ تمہارا مہمان گھر بیٹھا رہے دعوت محسوس نہیں کرے گا کیا۔“  
”مہربانہ بے تکلف دوست ہیں چاچو۔ وہ جانتے ہمارے گھر لے کر دوایات۔“

بلند بخت نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو شاہ رخ نے فون ہاتھ میں لیے لیے اسے بتایا کہ چاچو نے رات کے کھانے پر اسے بھی دعوت دی ہے بلند بخت نے شاہ رخ کے چہرے سے اس کے خرو کا نذرہ لگایا تھا۔ اس نے فون شاہ رخ کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔  
”سلام علیکم۔“  
”وعلیکم السلام۔“

سید قائم علی شاہ نے اس کے سلام کا جواب دے کر اسے رات کے کھانے کی دعوت کی بلند بخت نے بہت شائستگی سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کی کہ ان کی خال خال گھر پر دعوت ہے اس لیے وہ مناسب نہیں سمجھتا لیکن اس کا پورا ارادہ اس کے ساتھ باہر کھانے کا ہے۔  
”اسٹر کو تو ابھی بھی فون کرنے والا تھا کہ وہ بھی رات کو ادھر ہی آجائے۔ شاہ رخ زور اسٹریک۔“ جی قائم علی

کہہ رہا تھا چاہے سب بل جل کر کب کا نہیں گئے۔  
اور بلند بخت کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے اسٹر کے ساتھ باہر کھانے کا پورا گرام اس نے ابھی ابھی کہا تھا۔ اگر اسے اسٹر کے بل جانے کا علم ہو گیا تو وہ پھر کدو نہ دیتا۔  
”بل اس مہربانہ کچھ نہیں سنوں گا تم شاہ رخ کے ساتھ آ رہے ہو۔“ سید قائم علی شاہ نے اپنا ہاتھ سے ٹپکا۔

اور بلند بخت کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ فون آف کر کے اس نے شاہ رخ کی طرف بڑھایا۔ جو سید قائم علی شاہ کی اس دعوت پر اندر ہی اندر بریشان ہو گئے تھے صرف اس خیال سے کہ نہایت فاطمہ ناراض ہوں گی اور وہ جو نہایت فاطمہ کو گھبرائے شاہ رخ سے فخرانہ ہوئے کا مشورہ دے رہے تھے اس خیال سے خود بھی اس وقت دور رہے تھے کہ اگر شاہ رخ کو معلوم ہو گیا تو۔  
تیل فون بلند بخت کے ہاتھ سے لے کر وہ کھڑے ہو گئے۔  
”چلیں۔“

ہاں برش ڈرنک ٹیبل پر رکھ کر بلند بخت ان کے ساتھ ہی گیسٹ روم سے باہر نکل گیا۔

”جی تم انٹری میٹھ کی تیاری کے لیے لاہور جاؤ گی۔“ حمنہ پچھو کے پاس۔ ”امیر حمنہ پر اتنی باتیں مارے ابھی بھی۔“  
”ہاں میں نے ابا اور دادی سے اجازت لے لی ہے۔“ زہل نے سلا کی پلیٹ سجاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”حمنہ خالہ کہہ دی تھیں کہ وہاں بھی اچھی آئیہ میز ہیں جہاں بہترین تیاری کراہتے ہیں پچھوہ خود بھی تو دلچسپ کریں گی۔ انہوں نے شہسب کی شاہی میں ابا سے کہا تھا کہ مجھے لاہور ہی سمجھیں۔ انٹری میٹھ کی تیاری کے لیے بھی اور بعد میں اگر لاہور کے کسی کالج میں ایڈمیشن ہو گیا تو بھی انہوں نے اپنے ہاں ہی رہنے کے لیے کہا ہے۔“

”مگر بل نے اجازت دے دی۔“ امیر نے پوچھا۔  
”ہاں جب سب نے جی کہ منوں نے بھی میری سفارش کی تو انہیں گئے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے۔“ اس نے نماز کا پھول جاکر پلیٹ میں رکھا۔  
”کیا یہاں کی کسی اکیڈمی میں جاؤ گی۔ میری مامو تو تم بھی میرے ساتھ لاہور چلو۔ حمنہ خال بہت خوش ہوں گی۔“

”میرے پیارے زائچے میں نہیں ہوئے۔ مشکل ایچھے نہیں آتے۔“ امیر نے میٹھ کی تیاری کا گولی فائدہ نہیں۔“  
”تو وہاں رہا ہو ہو کر گی۔“ زہل اب وہاں اس کے انڈے سے نکلنے سے خرو خوش بن رہی تھی۔  
”میں یہاں۔“ امیر نے کھڑا اٹھا۔  
”یہ میٹھ کی کی رحمتی میرے بس کی نہیں ہے میں نے تو بس پوچھی تمہارے ساتھ کے شوق میں ماسٹریس لے گئی۔ جس کیلئے اسے کرلوں گی۔ وہی کہہ رہا تھا آنا اس میں ماسٹر کرلو۔“  
”چھ۔“ زہل کو افسوس ہوا۔

”تم نے پہلے تو نہیں بتایا کہ تمہارے پیارے زائچے میں ہوئے۔“  
”یار دقت ہی کمال یہ کہ آرام سے بات کرنے کا پیچھے زخم ہوئے ہی تو قہس کی شاہی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ جی میں نے تو سوچا تھا کہ شہسب کی سزاؤں کے اندر ہوں گی لیکن اس اور انٹری میں تیاری ہوئی کہ بہت سی باتیں مل رہی ہیں۔“ امیر نے پچھو کے کچھ نہیں بتائی تو بھی کہ چاہیں نہیں ہوا۔  
”میں سمجھتی تھی کہ بس یوں ہی کہہ دی ہو ایک آدھ زہل جس کو کیا ہو گا۔“

زبل اب پلٹ کے نکلا اور اپنے خیمے خیمے خرگوش چارہ قہی اور اپنی چوٹی سے دیکھ رہی تھی۔  
 ”اس کی ٹلف پڑھائی کے ساتھ تم یہ سب کیسے کر رہے ہو؟ اس روز ماہی گیری تمہاری کھنگ کی تعریف کرنی  
 تھیں۔“

”یادہ تر کھنگ تو لاپ اور اہ آبی ہی کرتی ہیں۔ میں تو بس مجبوراً ہی جاتی ہوں لیکن میں۔ اس روز سب  
 انھماں ماموں اور آبی کئی کئی گھنٹے تک کھنگ نہ تھی اس لیے مجھے جانا پڑا تھا۔ میں۔“  
 اس نے سلاوی ڈنڈ تیار کر کے سینٹر ٹیبل پر رکھی۔ وہ دونوں اس وقت کی لادڑ میں بیٹھی تھیں۔ آج علیحدہ  
 نے کچھ فریڈز کو اپنی برتھ ڈے پر بلایا تھا۔ ڈنڈ پر ڈنڈ پر گرام تھا۔ ہمارے زبل اور زبل بھی دوسرے آئی ہوئی تھیں۔ لادڑ اور  
 علیحدہ دونوں میں تھیں۔ کچھ دوسرے علیحدہ سے سادہ سامان پکڑا کر آئی تھی۔  
 ”شیشی کی دکن نہیں لینی کی۔ دینے سے تو خوب صورت۔“  
 امیر نے پوچھا اور سنے کے بعد آج کی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔  
 ”ہاں خوب صورت تو ہے۔“ زبل نے پچھلے سیٹ کی باکس میں والے اور سلاو کا پچا ہوا سامان پاؤں میں

رکھا۔  
 ”لیکن کچھ مفروضہ اور دیکھ چھٹی سی انگ رہی تھیں۔“  
 ”ہاں یہ بات تو میں نے بھی نوٹ کی ہے۔“ امیر نے اس کی تائید کی۔  
 ”پتا ہے ویکہ کہ دوسرے روز ہم جمن پچھو کے کھانے گئے تو میں نے سوچا کہ چلو غزالہ بھائی کو بھی دعا

حافظہ کروں۔ وہ اپنے پیڑ پر لیٹ گئی تھیں۔ جبکہ شیشی لادڑ میں سب کے ساتھ کپ کا تھا۔ میرے ساتھ ہی رہنا  
 اور ڈر بھی گئے تھے۔ وہیں میں کھیل کے سامنے بیٹھی تیار ہو رہی تھیں۔ روٹا بے چاری نے پیڑ پر بڑے ان کے  
 دے کچھ کھاتے تھے۔ پچھو کہہ کھاتا تو اس بری طرح ڈانٹ دیا کہ وہ کمر نہ کر سکی۔ میرے ساتھ بھی بڑی سخت سبات  
 کی اور کچھ دیر بعد بچوں کو ڈانٹ کر پیڑ پر کھانا رکھ دیا۔ میں نے بھی کھانے کے بعد دعا حافظہ کیا حالانکہ سوچ  
 رہی تھی کہ جب تک سب لوگ تیار ہوئے ہیں اتنی دیر بھی ان صاحب سے کپ لگاؤں کی۔ دیوان تو بھی نوٹ لے  
 پور ڈانٹا ہوا تھا۔ اس نے دعا حافظہ کہہ کر کچل آئی کہ ہر شیشی بھائی لگے تھے ہیں۔ ڈینٹ سے۔ انھلے سے بھی اس جلد  
 بازی کی کورن۔“

اس نے ایک نظر زبل کی طرف دیکھا۔ غور غلا جتنی خوب صورت تو تھی لیکن اس سے زیادہ کچھ کشش نگ  
 رہی تھی۔

”ہاں ماموں جان ایسے ہی جن خود فیصلے کرنے والے پتا ہے عذرا خالہ کتنی اپ سیٹ تھیں۔ انھم آبی کی وجہ  
 سے۔ جمن خالہ نے لاپ کو پتا تھا کہ کتنی آبی کے سلسلے میں بھی ماموں جان نے اپنی سی جلائی۔ حالانکہ انھوں نے  
 شجاع بھائی کے لیے بات کی تھی۔“

”ہائے اچھی اچھی تو بالکل تھی۔ ہر جیسے ہیں اور انھم آبی کے سرال والے کسے چھوڑے گے۔ پتا ہے مجھے یہ  
 والے دن دیکھا تھا۔ تم نے ان کی کزن کو کیسے پلٹ میں روٹ کا پھاڑا تھا۔ ہوا تھا۔ مجھے تو ان کی پلٹ دیکھ کر ہنسی آ  
 رہی تھی۔ میں نے کمن کو دکھائی تھی اس کا بیرو پوچھو پچھو تھا کہمہ رہی کمن اور پوچھو تو جان کر اس سے کیا خبر  
 معلوم ہے آئی ہوں۔“

”ممن کو بھی انھم کی سرال پلٹ نہیں آئی۔“ امیر نے ہاؤل سے مٹی کا ٹکڑا اٹھایا۔  
 ”ممن کیسا سب ہی خوش نہیں تھے اس رشتے سے خاص طور پر سب جماع بھائی کا رشتہ بھی موجود تھا۔“  
 زبل ہی اس پر ہنسی ہوئی۔

”تیار امیر سے لے کر شجاع بھائی جیسے بڑے کا رشتہ آیا ہوا تو میں تعادلات کو دیتی ہوں انھم آبی کی طرح چپ چاپ  
 مرنے نہ جانتی۔“

”بات کروں جمن خالہ سے۔“ زبل نے شرارت سے اسے دیکھا۔  
 ”مفروضہ کہ میں یونی ایکسٹ کر رہی تھی۔ کمن تھری تھی کہ انھم آبی کو کوئی اعتراض نہیں تھا حالانکہ  
 ہمارا ہی یہی کہ ایکسٹ تو وہ احتجاج کرتی۔“

”اور کمن نے جو بھائی کے لیے خد کی احتجاج کیا تو کیا نتیجہ نکلا ماموں جان ابھی تک اس سے بات نہیں  
 ہو گئی۔“ زبل نے بتایا۔

”جواب دے کہ تو خود ہی بات کرنے لگیں گے۔“ امیر نے لاپرواہی سے کہا۔ تب ہی ماہور اور اس کے  
 ساتھ ہی علیحدہ بھی لادڑ میں داخل ہوئیں۔  
 ”ماہم ختم ہو کر آگیا۔“ زبل نے بے جھجکا

”ہاں ہماری حد تک۔“ ماہور اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔  
 ”سب بانی کا کام بنانا زور کیا کمن کا ہے۔“  
 ”وہ بے عینا آبی اگر ڈر کر کمن کے بجائے بانی ہی ہو جاتی تو اچھا نہیں تھا۔ جنت دہر ہو جائے گی۔“ زبل نے علیحدہ کی  
 طرف دیکھا۔

”میں برا خیال تو بھی تھا لیکن میری سب فریڈز تو زسے کمر راضی ہی نہ تھیں۔ بلکہ ان کا تو امراد تھا کہ باہر ڈر لیں  
 آگئی کہ امیر کی جگہ پر لیٹ کر بھانے اجازت میں ہی دے لی۔ صرف لڑکیوں کے جانے کی۔ اب میں دلی خضر کو تو  
 ساتھ ساتھ لے جا سکتی تھی۔ فریڈز میں تو کس پر کھر میں ہی راج کر گیا۔ وہی دوسری بات تو سب ہی ماڈرن  
 تھیں۔ میں ان کے پیرس کو کھر میں ہوئی تھیں۔ بارہ بجے تک کھر کھائیں۔ انہاں بڑی مشکل سے تیار ہوئی  
 تھیں۔“ علیحدہ نے تفصیل بتائی۔

”کچھ لوگ تمہاری اندھا صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ اتنے دنوں سے ان کا ذکر سن رہے ہیں۔“ ماہور کا  
 لہجہ خوشگوار تھا۔  
 ”میں نے سنا ہے تو جس بتایا وہی نہیں رہا وہ خضر والی بات غلط تھی اندھا تیری تھی کہ اس نے خدا کی آقا تھا۔“

”علیحدہ کو اچھا کیا دیا۔“  
 ماہور مسکرا دی کہ گیت ج بھی ہو تو تھی بھی خضر نے کہا تھا۔ اچھے سے کبھی بدگمان مت ہونا۔ کبھی بے یقین نہ  
 ہونا۔ خضر کے دل میں اگر کوئی بے تصرف اور فرسٹا ہے کمن کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔

”یوں ہی بات۔“ امیر نے بے جھجکا۔  
 ”ممن کی ایکسٹ۔“ علیحدہ نے شرارت سے ماہور کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔  
 ”ممن نوٹ کر رہی ہوں کہ تم اب مجھ سے باتیں چھپانے لگی ہو۔“

امیر نے ناراضی سے اسے دیکھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔  
 ”سب باتیں بچوں کو پتا نہ دلائیں ہوتیں۔“ علیحدہ کی آنکھوں میں شرارت تھی۔  
 ”آج۔“ امیر نے اچھا کوا لیا تھا۔

”ورہہ اور جو بھائی کی جنت کے قصے سنائے جاتے تھے۔“ ایادہ بچوں سے کرنے والی باتیں تھیں۔  
 ”مجھوری تھی تیار۔“ علیحدہ نے کندھے پر کھائے۔

”اب کسی سے تو زابل کہنا ہی تھا اور ماہور لاپی سے روز روز ملاقات ہو نہیں سکتی تھی تو مجبوراً۔“ اس نے  
 بات اور صوری چھوڑ دی۔ ”امیر نے منہ پچھلایا اور مضبوطی سے ناراضی سے اسے دیکھا۔

”ہاں ایادہ اس بھائی کا کیا قصہ ہے۔“ زبل نے تیرت سے باہر کی پارسی کی طرف دیکھا۔  
 ”ممن بھی اچھی بھولی ہو۔“ علیحدہ کی شہرت پر دستور شرارت کی چمک تھی۔  
 ”تو پھر ہر دونوں چھوٹا سا دو بھائی کی مشکل سے داگ آؤٹ کر رہی ہیں۔“ امیر نے یکدم کھڑے ہوتے ہوئے  
 زبل کا ہاتھ پکڑا۔

”چلو رہا ہے کمرے میں چل کر بیٹھے ہیں۔“

”اے ارے ناراض کس ہوتے میری جان۔“

علینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹھیکھا۔

”بات صرف یہ تھی کہ بدراے ایک روز مذاق میں کہہ دیا تھا کہ وہ خضر بھائی سے پہلی ہی نظر میں محبت کرنے کیلئے جبکہ حقیقت نے مجھ اور اس میں نہ بات خضر بھائی کا اور ہاؤرہ دونوں کو تباہ کیا۔“

علینہ نے بتایا تو ایرج نے بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”تم تمہاری ماہِ اصاحبہ ہیں کیا چیز۔“

”دیکھ لیا آج بہت باری شے ہے بدراہمی۔ آج کل مجھ سے مست دوستی ہے۔“

”یہ دوستی کس خضر بھائی کے چکر میں تو کس۔“

”اے کس اس کی عقلی ہو چکی ہے۔“

”چلو پھر خبر ہے۔“ ایرج نے بولے تو کس۔

”دور نہ چارے خضر بھائی کے ساتھ ایک انار سو بار والا معاملہ ہو جا تا ہے۔ دوسرے عرصہ اور نازش آ رہی ہیں تا

ہاں کہہ دو رہی تھیں۔ یہ راہ اور وہ نہیں تھا۔ انیس ہلائے نا لکین پھر مہما کی تار اٹھنے کے خیال سے بلایا۔“

”یہ اسے اتنی ہی تھی کس میں جس تم خواہ مخواہ چڑی ہو ان سے۔“ ایرج نے ہمہ رویا۔

”خواہ مخواہ میں جان چھنے ان کی کھٹکھٹ سے چڑھتی ہے دس جھلوں میں ساڑھے آٹھ جملے کینیزا کی

تعریف میں ہوں گے۔ وہاں کا داخلہ وہاں کی آزادی وہاں کی جلیوٹ۔“ علینہ نے برا سانس بتایا۔

”مجھے اتنا نہیں تھا تو وہاں آنے کی ضرورت تھی وہاں ہی رہتیں۔ خواہ مخواہ شرب کر رہی ہیں سب کو اور مہما

کی پوری کو قتل ہے کہ کسی طرح خضر بھائی کو چائیں کسی ایک کے لیے۔“

”تمہارا انداز کھٹکھٹو کچھ بدل نہیں گیا۔“ ہاؤرہ نے مکدم بدل پر چما جانے والی گھبراہٹ پر قابو پانے کی

کوشش کی۔ ”یہ میری جان ڈار لگ سکتی۔“

”بس وہاں میرا مطلب ہے تمہارے ساتھ رہنے سے یہ لفظ زبان پر چڑھ گئے ہیں۔“

علینہ نے ایک سکرانی نظر اس پر ڈالی۔

”دوسرے تہہ فکر ہو خضر بھائی شے بولے نہیں۔“

ہاؤرہ کے رخساروں پر سرخی ہو ڈلی۔ ”تم سچی اس۔“

”میں بھی بس کیا؟“ علینہ نے تو شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”جانتے ہو تم بھی ہیں بچا جتے تم بھی ہیں۔“

ایرج نے لنگائی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی صغیر مسکراہٹ تھی۔ نزل کے ہونٹوں پر بھی بے اختیار مسکراہٹ آ

گئی اس نے اس کے دل میں مکدم خوش رنگ پھول بھجھ دیے تھے۔

”تمہاری تکت تھک تھک بھی کی شادی کی تصاویر میں دکھائیں۔“

ہاؤرہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

ہاؤرہ۔ ”وادی اور لہا کے ساتھ گھر پر رہی تھی جبکہ باقی بے شادی میں شرکت کے لیے لاہور گئے تھے۔

آج یہ منصور جانا میں چاہتا تھا۔ ایک ماہ ہاؤرہ اس کے پیچھے تھیں۔“

”تمہارے ماموں کی جیلی جواز پر جانے کی اور ہم آؤرہ نہیں کر سکتے اور انفصال کے پہلے ہی اتنے احسان ہیں

اور منصور خاموش ہو گیا تھا اور جب انفصال حیدر نے سب کو ساتھ چلنے کو کہا تو انہوں نے سمولت سے انکار کر

دیا تھا۔

”تمہارے کی فکر نہ کرو میں سب کے ٹکٹ لے لوں گا۔“ انفصال حیدر جانتے تھے کہ اصل مسئلہ کیا ہے

”مٹھے چلے گئے سب۔“

”میں یاد دار اصل بچوں کو گاڑی میں سفر کرنے کا بہت شوق بھی ہے۔ نصیرا حیدر نے بات سن کر سنائی۔“

”ہاں تصویروں دکھائی ہوں ہیں۔“ ایرج لکڑی ہوئی۔

”کلی ہی وید نے قلم بولنا ہے۔“

”لیکن بہت زیادہ اچھی میں نہیں۔“ دراصل ایرج نے پہلی بار تصویروں بتائی تھیں تا اس لیے۔“ علینہ نے

بظاہر سنجیدگی سے کہا۔

”جی نہیں بہت اچھی آئی ہیں۔“ ایرج نے جاتے جاتے مرکزہ کا نور کی طرف دیکھا۔

”ماہو آئی آپ کتنا عرصہ تازہ دست تصاویر ہیں۔“

”مجھے تو بھی نہیں لگیں۔“

”خضر بھائی کی تصویر جو میں ہے اس میں، لیکن خضر بھائی نے جو تصاویر بتائی تھیں ان میں ہیں اسفر بھائی کی

تصاویر۔“

”وہ عمارت سے فسی ہوئی چلی گئی۔“

”کیا وہاں بھی اسفر بھائی کی تصاویر ہیں میں تا میں ایرج نے۔“ ہاؤرہ نے پوچھا۔

”جی تو یاد آتی ہے۔“

”کلی زیادہ دیکھی۔“ ایرج فورا ہی منی اس لیے کہ آگئی تھی۔

”میں نے تو بہت کوشش کی تھی کہ میں وہاں اس کے ساتھ دکھائی دے جاؤں تو وہاں لیکن وہ تو اب

بھی نہیں آئے۔“ اب تمام پہلی کی تصاویر میں بھی نہیں تھے۔ حالہ کلاہ ٹھہرنا، منعم، پھوپھو جان، لکڑی

سب نے ہی بھی اور غزال کے ساتھ تصاویر بنوائیں۔ ایک ایک بھی اور پھر سب نے ایک ساتھ بھی۔“

”خدا رحمان نے لایا تو تھا انہیں لیکن پھر ماموں جان نے انہیں کسی کام سے بچھ دیا تھا بد فوٹوں رہے تھے

تجربہ۔“ نزل نے کہا۔

”حسنہ خالہ مجھے کتنی ہیں کہ ماموں جان انہی بھائی کو اتنی اہمیت نہیں دیتے، جتنی کہ بڑے بیٹے کی حیثیت

سے ملتی ہے۔“

”ہو تو ظاہر ہے۔“ ہاؤرہ نے بھی راستہ کھری۔

”ورنہ شعی کی بجائے پہلے اسفر بھائی کی شادی ہوتی۔“

”شادی کے علاوہ بھی ماموں جان نے انہیں امریکہ جانے کی اجازت نہیں دی، حالانکہ انہیں اس کی ضرورت

ان کی خواہش شدید تھی۔ لیکن ان کا جاب کمرہ ہے۔“ نزل نے بتایا۔

”ہاں اسفر نے راہ ترک کر دیا ہے باہر جا کر رہنے کا۔“ علینہ نے چونک کر پوچھا۔

”میں خوش ترک تو نہیں کیا۔ البتہ حسنہ خالہ تباری تھیں کہ فی الحال ترک کر دیا ہے۔ ایک دو سال تک جاب

کریں گے پھر اپنے گھر کریں گے۔ ظاہر ہے شروع میں تو پیسے کی ضرورت ہو، بعد میں تو باہر جانے والے طلبہ اپنا

نامہ جاب کر لیتے ہیں۔“ نزل کو تاہم ”حسنہ سے یہ سب بتا چلا تھا۔“

”تمہاؤں کو پتہ ہے وہی ہو جائے تم میں جا نہیں۔“ اسفر بھائی نے تمہیں بتایا تو ہاگنا جاب کا۔“

ہاؤرہ نے آہستگی سے کہا۔

”اس جاب کا لیکن میرا خیال تھا مجھے چند ماہ کے لیے جاب کی ہے۔“

”جو مسئلہ ہے چند ماہ کے لیے ہی ہو۔ وہ تو حسنہ خالہ نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔“

نزل نے ایرج کے ہاتھ سے اٹھ کر لکڑی اور اس کے ٹکٹے اٹھ کر دیکھی تھی۔ ہاؤرہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکی

تصاویر دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ نزل سب کا تعارف بھی کر داری تھی۔

”یہ اس لیے نہیں۔“

”سب بہت مت جا رہے ہیں۔“ ہانور نے خوش دلی سے کہا۔  
 ”اور بھی کون سی خوب صورت ہے۔ سن تہذا راجھو ٹانگ رہا ہے۔“  
 ”اس قدر توجہی کے قابل ہے کہ سب مت جھوٹا ہے۔“ راج نے بھی تائید کی۔  
 ”خواب ضروری نہیں کہ سب بڑھکتا ہو۔“  
 ”لیکن کچھ لوگوں کو تو لگتا ہے کہ اللہ میاں سے سب ہی کچھ دے دیا ہے۔ تم تہذا کو دیکھنا کتنا مکمل حسن ہے اس کا

علیحدہ نام نہ نزل سکا ہے۔“ علی نے کہا۔  
 ”آجکے دن ایک تہذا ہم رنگ سب لٹش ہے۔“  
 ”اے ہاں! ہم تہذا نام نہ سن کر تھک چکے ہیں آپ سنے پہلے اسفریاد تھا تو اب اندازہ۔“ اس نے نزل کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔

”چلو اٹھو ہم بھی تیار ہو جائیں۔“  
 ”ہاں آجھ سنے ہوئے ہیں۔“ نزل کڑی ہوئی۔  
 ”تپ بھی تیار ہو جائیں۔“

”ہو جائیں گے بھی کی سب دھن لگیں گے ہماری تیاری میں اور میری فریڈ ز نے نوبتے آئے تو کہا تھا۔“  
 علیحدہ سے صوفے کی پشت سے ٹپک لگالی۔

”کیا بات ہے عین نام کچھ پریشان ہو۔“ ہانور نے بغورا سے دیکھا۔  
 ”نہیں تو کوئی بات نہیں ہے بڑے ہی یوم ہوا ہے تمہیں۔“  
 ”نہیں خبر دو تم تو نہیں کیا اسنی بھائی سے ناراض ہو۔“ ہانور نے اندازہ لگایا۔  
 ”تمہیں یہ خیال کیوں ہوا۔“ علیحدہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہمت سارے دنوں سے تمہارے اسنی بھائی کی کوئی بات نہیں کی۔ شاید یہ آئے کے بعد کتنی ہی بار فون پر تم نے بات کی لیکن اسنی بھائی کا ذکر تک نہیں کیا۔ تم اچھے کے کلچر پر جتنی محنت ہے تم نے وہاں اگر کوئی خاص بات نہیں کی۔“

”کوئی خاص بات ہوئی تو بتائی نہ۔“ علیحدہ کے لیے سے ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔  
 ”میں تو تب سے ہی دل ہی دل میں بھانور سے اسفر ہے۔“

علیحدہ بھی اندازہ پر غصہ ثابت دل میں نہ رکھ سکتی تھی۔ ”لگتا ہے تو سخت ناراض ہوں۔“  
 ”کیا کروا دے جا رہے اسنی بھائی نے۔“ ہانور کے یوں پر دم مٹی سسکا ہوا تھا۔

”دو بج چکے جا رہے ہیں اس قدر دور بڑھل میں تو جیران نہ کی انکل سے تو اس قدر ڈرتے ہیں جیسے چڑا ملی سے ڈرتا ہے۔“

ہانور کو بھی آگئی۔ ”حرام کرتے ہیں وہ ماحول جان کا تم سے ڈرتو نہیں کہ کتنی اور اگر ڈرتے بھی ہیں تو ظاہر ہے والد ہیں ان کے۔“

”اور اگر والد صاحب نے حکم دے دیا کہ علیحدہ بلی سے شادی نہیں کرنا تو بس سر جھکا دیں گے کہ جو حکم آپ کا تو خیر ایسے قربان ہوا میری نہیں۔“

”جی ہاں اس سے زیادہ فریادیں ہوا رہیں کیا پتا۔“ اچھ کے نکل حوالے سے روز بھی کئی بار بات مندی میں سب نے میری تحریف کی۔ لیکن اسفر نے ایک لفظ تک نہیں کہا مجھ سے لگتا ہے نظروں پر بھی پیسے خرچ ہوتے ہیں۔“

”میریوں کو تا کہ تمہیں اس بات پر غصہ ہے کہ اسفر بھائی سے تمہیں سراپا نہیں۔“  
 ”نہیں یاں صرف یہ بات نہیں ہے۔“

”تو پھر اور کیا بات ہے۔“

”چنانچہ میں لیکن ہانور جا کر میں بہت اوس ہوئی ہوں۔“

”مصلحتاً ہی ہے عینائی! جب عورت کسی سے محبت کرتی ہے تو پھر اسے یہ بھی چاہ ہوتی ہے کہ اس کا محبوب اسے سراسر اس کی تحریف کرے۔ لیکن شاید اسفر بھائی نے کہاں اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں تم سے اس بات کا مناسبہ سمجھا ہوا۔“

”عینائی میں الگ سے بھی تو کہہ سکتے تھے۔ لیکن انہیں تو میری پرواہی نہیں تھی۔“  
 ”شاید انہوں نے یہ بھی مناسب نہ سمجھا ہو۔ کسی ایکٹریل کے خوف سے ایسے موقعوں پر تو سب ہی کی نظروں میں ہوتا ہے۔ ہندو مت سمجھنا اور میں عینا اور انہیں تمہاری عزت بہت عزیز ہوگی۔“  
 ”لیکن ہمیں لاہور سے آئے ہوئے بھی چوں ہو گئے انہوں نے فون بھی نہیں کیا۔“ علیحدہ کا اندازہ ہنر ادا ہوئی کے ہوئے تھا۔

”تم معمول رہی ہو کہ پہلے بھی تم ہی انہیں فون کرتی تھیں۔“ ہانور نے یاد دلایا۔  
 ”تو اب نہیں کروں گی۔“ دیکھتی ہوں خود سے فون کرتے ہیں یا نہیں۔“ سب ہی فون کی تیل ہوئی تو علیحدہ نے اٹھ کر ریکارڈ اٹھایا۔

”محبت بات کریں، مجھ سے آپ۔“

”دوسری طرف کی آواز سننے ہی علیحدہ نے کہا تہذا ہانور نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ یقیناً ”اسفر کا ہی فون تھا۔“ علیحدہ کو اسفر سے باتیں کرتے چھوڑ کر اراجک کے کر کے کی طرف بڑھ گئی۔



”میں بھی تمہارا رزلٹ آیا ہے۔“

”سن تقریباً اسی طرح ہوئی تھی کے کمرے میں آئی۔“  
 ”ہاں اسفر بھائی بیٹہ پر چپ کر رہے ہیں۔“ بید کے کاؤن سے ٹپک لگے میٹر اشیاء دیکھ رہا تھا اور غزالہ بیڈ پر بیٹھی ہاتھوں سے کچھ نمک صاف کر رہی تھی۔ جب دروازہ کھل کر سن اندر داخل ہوئی۔

”تمہیں خبر نہیں ہے سن دو دروازے پر دستک دے کر آئے ہیں۔“ غزالہ نے بد دعا گاری سے اسے دیکھا۔

”موری۔“ سن بے حد شرمندہ سی ہو کر واپس مڑی۔ ”بشرے ایک نظر غزالہ پر ڈالی جو بات کر کے بے حد مطمئن ہوئی پھر کچھ گپیں اُٹارنے میں مصروف ہو گئی۔

”تمہیں سن سے اس لیے میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔“ ”بشرے بیڈ سے اتر کر چل پستے ہوئے آہستگی سے آئے۔“

”اور کس لیے میں بات کرنا چاہیے تھی۔“ ”نیل پائلز ریڈیو بند کر کے اس نے ہاتھ بچھا کر ڈسک نیل پر رکھا اور چپٹی ہوئی نظروں سے بھر کر دیکھا۔

”تو تو تمہاری بیٹیں بڑی گنیم ہیں مجھ سے زیادہ قابل ہیں اور یہ سن کاغذ میں پڑھ رہی ہے اسے نہیں معلوم کہ اس طرح شادی شدہ بھائی کے کمرے میں بے حذر کد داخل نہیں ہوتے۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن جب سارے لوگ اٹھے رہتے ہوں تو ایسا ہو جائے گا۔“ ”پھر نہ یہ دوسرا وقت ہے کہ ہم آرام کر رہے ہوں اور نہ۔“

”چھا۔“ ”اس کا بیٹہ شفر ازا ہوا تھا۔“  
 ”اب کہا نہیں صاحب سے کہ میں دوسریں مہر مہر کرتی تھیں آئے کمرے میں۔“  
 ”غزالہ تم خراہ خواہات کو برصارتی ہو۔“ ”بشرے بے زار ہوا۔

”بات میں نہیں تم بھڑکتے ہو۔ میں نے تو بیچ بھاتی تھی۔“

اب کے بھرنے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کہے سے باہر نکل گیا۔ کبھی غزالہ کا یہ انداز اسے بہت پسند آتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر برا بھلا بولتی تھی۔

”وہ اور مدثر کیوں آئے بندہ دم میں۔“ سننے سے آج بھگت سے بات نہیں کی۔ انھیں بھگت پسند نہیں کرتی۔ سمن مغرور ہے اور تمہاری اہلی جان کو میں پسند نہیں ہوں۔“ وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا لیکن وہ سمجھتی نہیں تھی۔ وہ دو دو ملاشیں ہی اس کی رفاقت سے تنگ لگا تھا۔ حالانکہ ابتدا ہی ایک بار وہ خاصا خوش نظر آتا ہوا اور اسے خوش دیکھ کر سب ہی مطمئن ہو گئے تھے۔

عذرا بیگم نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ بھرنے غزالہ کو قبل کر لیا تھا۔ ایک نیا رشتہ ایک نیا تعلق اس کے لیے بھی خوشگوار تھا۔ غزالہ خوب صورت تھی اور اس کے رفاقت دشمن۔

یہ رشتہ شاید ایسا ہی ہوتا ہے کہ کچھ باتوں میں وہ جتنی ایک دوسرے کے بہت قریب آجاتے ہیں۔ اس کے دل میں بھی غزالہ کے لیے ایک جگہ بن گئی تھی اور اس کے دل میں میاں صلاح الدین کے لیے جو فخر اور ناراضی کبھی وہ بھی محسوس نہیں کرتی۔ سب ایک بلکا بلکا سکھ رہا تھا کہ انہوں نے اسے دوران تعلیم مغرب کی باتیں سنیں اور وہیں لوگوں پر رشک آتا۔

”یار تم کی ہو ہمیں دیکھو ہمارے والدین تو ہماری شادی کے متعلق ابھی سوچتے تک نہیں۔“  
”میرے بھائی نے تو صاف کر دیا ہے مجھ سے کہ لڑکھ لڑکھ کر بک کر کمانے والے کو تو پھر شادی کا چوتھا۔“

دوست حسرت سے کہتے تو اس سے وہ اپنی خود کو خوش قسمت سمجھنے لگتا۔  
”اور تمہارے کمانے کے بعد وہ نظارت کر سکتی تو۔“  
”تو کوئی بات نہیں تو میں اور سنی اور سنی اور سنی۔“ کوئی اور مشورہ دیتا۔

شاید میاں صلاح الدین نے صحیح فیصلہ کر لیا تھا۔ غزالہ کی رنجشوں میں ڈال کر۔ اب کم از کم اس کے بھگتے کا امکان نہیں رہا تھا۔ یہ وہ دوستوں کی طرح اور دھڑلے والوں کی طرح لگا پڑا تھا۔

”اب ایسا ہی نہیں!“  
اس نے یوں بے سہم بہت آگئی۔  
وہ بڑے آگے میں لڑا تھا۔ اس نے کمرے سے سب کی توازیں آ رہی تھیں۔ اسے پھر سمن کا خیال آیا۔ کیسے بیک وقت چمک چمک رہی تھی اس کی۔

اور اسے غزالہ کی اس کی ایک سی بات بہت بری لگتی تھی کہ جب بھی وہ تنہا ہوتے وہ انھیں سمن کی برائیاں کرنے لگتی تھی۔

”سمن مغرور ہے اسے کالج میں پڑھنے کا دفتر ہے اور انھیں میری دشمن۔“ یہ اس کا خاص مسئلہ تھا۔  
”ایسا نہیں ہے غزالہ! سمن تیار ہے یہاں سے نہاں سے سمجھا تھا۔“  
”وہ دونوں تم سے بہت پیار کرتی ہیں تم خود ہی ان میں کتنی لگتی جاتی نہیں ہو۔“

”شہر!“  
اس نے کمرے کا دروازہ کھلا اور انھیں باہر لگا اس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔  
”سماں مارک ہو۔ سنا تھا مجھے تمہیں غائب!“ نے کالج میں دوسرے نمبر ہو۔“  
اپنی منہ میں پھینک دیتے تھے اس نے اسے انھیں بات پر یقین نہیں کیا۔

”آئی آپ کچھ کر رہی ہیں۔“  
”ہاں۔ اور یہ سمن کہاں ہو گی۔ جس بلانے جاتی تھی۔“  
”انھیں نہ پوچھا تو بھرنے آجکل سے کہا۔“  
”شاید اپنے کمرے میں جاتی ہو۔“

”کمال ہے۔“ انھیں کج حیرت ہوئی۔

”اسے تو سب سے پہلے تمہارے عاشق قریب نہیں بتاتی ہوں اسے۔“

”سمن سمجھو۔“ وہ اسے توازیں دیتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف دوڑی۔ مشرا بھی تک لگا تھا۔ اس نے بھی اپنے کمرے سے نکل آئے اور انہوں نے خاموش کمرے میں کھڑے ہو گئے۔ لگا کر مبارک باد دی۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کہا ہے سب سے پہلے کالج میں داخلے کے لیے انٹری ٹیسٹ دنا ہو گا جس میں کچھ تاریخی وغیرہ کر رہے ہو۔“

”انہوں نے خود ہی سوال کا جواب بھی دے دیا۔“

”نہیں۔“ بھرنے نے کہا۔ ”ایسا جان کا خیال ہے کہ مجھے ایم بی اے کرنا چاہیے تاکہ ان کے پرنس کو سنبھالنے میں مدد مل سکے۔“

”لیکن تم نے پھر میڈیکل کے مضامین کیوں لیے تھے۔“ اس نے کج حیرت ہوئی۔

”جس کا چاہیے۔“ قائم ذیل مہتمم کے ساتھ فرس رکھ لیا پھر میڈیکل پی اے کر لینے آتا کس کے ساتھ۔“

”اس وقت مجھے ایسا جان کے خیالات کا علم نہیں تھا۔ میرے دوستوں نے پری میڈیکل کا انتخاب کیا تو میں نے بھی کی۔“

”تو ڈاکٹر بننا تمہاری خواہش نہیں تھی۔“ اس نے ایک نئی بات کہی۔

”نہیں۔“ بھرنے نے نظریں حائل۔

”جین سے ہی انھیں اور سمن کے ساتھ ڈاکٹر ڈاکٹر کہنے اور ان سے ڈاکٹر بننے کی باتیں سنتے ہو اسے کچھ دل میں بھی انداز کہیں یہ خواہش چھپ کر بیٹھتی تھی تب ہی وہ جب فرسٹ ایئر کے فارم فل کر رہا تھا پری ایجنڈنگ کے مضامین لکھنے کی بجائے میڈیکل کے سبجیکٹ لکھ دیتے تھے۔ پتا نہیں کیوں انھوں نے سامنے اس سے کوئی کلمہ نہیں لکھا۔“

”تو ڈاکٹر بننے کا وہ نہیں چاہتے تھے۔“

”نہیں۔“ اس نے فرس دلی سے سکرانے۔

”تم نے بہت زبردستی لیے ہیں یا راسی خوشی میں ایک زبردستی جیے ہو نا چاہیے۔ میں سنبھالنے لے کر آتا ہوں تو انھیں تم کو چاہئے۔ لیکن پہلے اسی جا کر کچھ آگیا۔“

”نہیں۔ تم نے تو کمال کر دیا ہے۔“

ایک لڑکے کے نمبر تمہارے کالج میں تم سے زیادہ ہیں اور وہ بھی صرف وہیوں کا فرق ہے۔“

وہ اس کا کدھرا کہتے ہوئے اسی جان کے کمرے کی طرف دوڑے۔ وہ کچھ تو بڑا ہی کھڑا انھیں عذرا بیگم کے کمرے کی طرف جانے لگا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ادھ کھلے دروازے سے اس نے دیکھا کہ وہیں دوری میں اور انھیں سمن کی تمہاری کمی۔

”تمہاری عقلی تو ہے سامو! جس دن کدھرا کر جانا چاہیے تھا۔“

”ہاں میری عقلی ہے لیکن وہ یہ بات نہ سے بھی تو کہہ سکتی تھی۔“

”جی ہاں۔“

وہ ہلے سے کھڑا کراسن سے جلدی سے تھوکی دیتے آگے صاف نہیں۔

”مگر یہ بھی تم لوگ کمرے میں کھسکی ہو یا میری کامیابی کی خوش نہیں ہوئی تھی۔“

”کوئی دوسرے کا نہیں جاننا ہے یا کچھ نہیں ہوئی ہو۔“ اس نے کمرے میں قدم رکھا۔

اور لا شعوری کو شش سے کچھ کوٹھکھا رہا۔ سمن نہ بیٹھنے کے آگے کچھ کو شش کر رہی تھی۔

”فکر نہ کرو تمہارے بھرنے سے زیادہ آئیں گے کوئی کاروبار بہت تھی ہوئی ہو چکے ہو۔“

”مگر کیا لیکن سب سے بڑا ڈنٹ گئے تھے تو سمن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگا۔“

”مگر اے۔“ بھرنے نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کی کپاس بیٹھے ہوئے آنکھوں کی پودوں سے اس کے



”کھل پوڑ ہو سو۔“  
”میری غلطی تھی یہی سبب میں خوشی میں۔ بہت سارے آنسوؤں نے اس کا طلق سی لیا۔“  
”جیسا ہوا۔“ میشر نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”تم نے خواہ مخواہ غزالہ کی بات بدل کر لے لی اور وہاں ہا میں تم نے اسے پکچا کیا نہیں۔ وہ تو ایسی ہی ہے بلا سوچے سمجھے بول دیتی ہے۔ دل کی بری نہیں ہے۔“

”نہیں سسکیاں تکی رہی۔“  
”پھر کیا اب نہیں دو بھی نہیں تو میں سمجھوں کہ تیرے جی جلیس ہو گئی ہو۔“  
”میرے جلدی سے آنسو پوچھے۔“

”وہ کیا رہے گل اتنی کی سزا ہے۔ میں تمہا کیوں بھٹکتی۔ کبھی کبھی تم لوگ بھی اس میں حصہ دار بن جایا کرو تا آخر یہاں ہوں تمہارا۔“ اس نے قہقہہ لگایا لیکن کمن پر ٹوک کر اسے بیٹھے لگی۔

”کیا کیا وہ تمہارے ساتھ اچھی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے لڑکی ہے۔“ کمن کی آنکھوں میں تشویش تھی۔  
”ایسا دلستہ نہ کر یہ کھشت روز اول والا نسخہ آزمایا ہے۔ کمنی ہوں کمنی۔“ اس نے اپنے کار بھائے۔

”تمہاری شخصیت ایسی ہے کہ جتنے پستوں ہی آپریٹس ہو گئیں۔ بلکہ نکاح کے روز ہی چاروں شانے جت کر گئی تھیں۔ بغیر ان کے رات کو سونے سے پہلے چپے چپے ہماری تصویر دیکھتی تھیں کہ یہ خواہہ کیسے راہ بھول کر گھر سے دور آئے۔“

”کمن کے لبوں پر مسکراہٹ دو گئی۔ اچھ بھی ایک مطمئن سی مسکراہٹ لبوں پر جمائے مڑی۔  
”نہی! اس پر غالی غلطی لینے گئے ہیں وہ آپ کو جانے سنا ہے کہ مگر رہے تھے۔“

”تمہارے کے سامنے بھی ڈانٹ لاک ہوئے ہو گئے۔“  
”کمن کے دل سے سارا غبار چھٹ گیا تھا اور وہ بڑی مطمئن سی میشر سے باتیں کر رہی تھی۔

”ایسے بے وفائے لوگ۔“ میشر اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”تم خوش تو ہو نا بھی۔“ کمن نے اپنا کمر ہاتھ پر تھما۔

”تمہاری اور غزالہ کی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔“ ایک لمحہ کے لیے میشر کے چہرے پر سایہ سا کیا لیکن

دوسرے لمحے وہ خوش دلی سے کہہ رہا تھا۔

”اب تو خوشی والی کیا بات ہے۔ اتنی خوب صورت ہیں تمہاری بھائی۔ اور جہاں تک انڈر اسٹینڈنگ کی بات ہے تو مجھے کتنے سیال پیوئی ہیں۔ جن میں تو ذہنی ہم آہنگی ہو گئی ہے اب جان اور اہلی جان کوئی دیکھ لو۔“

”مہربانی تو نہیں تھا کہ اب جان اور اہلی جان میں ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی تو ان کے بچوں کا مقدر بھی ایسا ہی ہوتا۔“ وہ افسوسہ ہی ہوئی۔

”یہ ہر کوئی افسوسہ ہونے والی بات نہیں ہے۔ ہو جائے گی ذہنی ہم آہنگی ہماری بھی غزالہ صاحبہ سے۔“ اس نے پھر قہقہہ لگایا تب ہی میشر کا تکیہ کمر سے داخل ہو گیا تو وہ کھڑا ہو گیا۔

”بارک ہو۔ اللہ اکیسا کامیابیاں پیش دے۔“ انہوں نے اس کی پیشانی پر جم کر دعا دی اور کمن کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”جیسا کہ اب جان کو بھی لگایا۔“

”جی! کیا تمہاں ہوں۔“ وہ کمن کی طرف بڑھ گیا۔  
اس پر سامان سے ملے سے پھرتے پھرتے جگہ میں آئے تھے۔  
”یہ سبھی احوال۔“ انہوں نے شاپر زائے پڑا کرے۔

”سب لوگ کہاں ہیں۔“

”ہمارے کمرے میں۔“ اچھ نے غصہ نہ کیا۔

”تو پھر جانے دو اور وہی لے آؤ۔“

”مڑو رونا۔“ کمنی کہاں ہو تم دونوں اجاڑ اور ہر ملانی کچوریاں سموسے تمہاری پند کی بہت سی چیزیں ہیں

انہوں نے اچھ کمن کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے آواز لگائی۔ وہ وہاں غزالہ کے کمرے میں تھے۔  
کچھ ہی دیر بعد وہ اچھ کمن کے کمرے میں بیٹھے جن میں وہ رہتے تھے۔ مڑو میشر کے صوفے کے ہتے پر بیٹھا جانے لگا۔

”کمرے سے غزالہ کو بھی قہقہہ۔“ غزالہ نے اچھ کو ڈال دیا تے دیکھ کر کہا۔

”جاؤ رونا بیٹے کھال کو لالو۔“

”رے نہیں جتنا اچھ تو میں نے کر آتا ہوں۔“

”میشر کمرہ کھڑا ہو گیا تھا۔

”خوشخبری ہی تو سنا جی جی۔“

”اس پر نے محبت سے اسے دیکھا پھر جواہر مسکرایا۔

غزالہ دیکھنے میں چھائے اندر کی غلطی تھی۔

”مکھو! میشر نے اسے اٹھایا۔

”ایسا دلستہ نہ کر۔“

”تو میں کیا کروں۔“ کمن نے کروشیدل کر میشر کو دیکھا۔

”منا تو اپنی باتیں بہنوں کے ساتھ کامیابی کی خوشی۔“ میشر نے اپنی بات کواری کو چھپاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”مکھو! رات کیا جاہل عورتوں والی باتیں کرنے لگی ہو تم۔“

”میں تو جاہل ہوں کتنا تھا کہ اپنے آپ سے کمنی پر بھی کھلی لڑکی سے شادی کرادیے تمہاری۔“

اس کا عجیب دستور ویسا ہی تھا۔ خطن چھپتا ہوا۔

”ابا کی ہی پند ہو۔“ میشر کا پی چاہا کہ وہ نہ لیکن وہ اس وقت مزید بڑی نہیں جانتا تھا۔ وہاں اچھ کمن کے کمرے میں سب کتنے خوش خوش بیٹھے تھے اور اگر اس وقت غزالہ نہ جاتی تو سب کا دل برا ہو گیا۔ اس نے نرمی اختیار کی۔

”کیا تم غزالہ اگر تمہیں سمجھا آئی کی کوئی بات بری بھی لگتی ہے تو پھر اگور کرو اور سو کو میں سمجھاؤں گا کتنا وہ تمہارے کمرے میں نہیں آئے گی۔“ کمن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”مگر مجھ پر پہلے کتاب کروا کر شرکت خبر سے اس کا تھا کیا تھا اگر مجھ دن اور اس پر اس کی اجارہ داری رہتی۔ اس کے دل پر کھونٹے سا لگا لیکن وہ مسکرا کر غزالہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”چھو! کیا اب تو بھی مجھے خرے میں مت لاد۔“ کمن نے کمرے کا ہاتھ پکڑ کر کچھ تھوڑا منہ بتائی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”سب نے ہی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔

”مگر کوئی! غزالہ نے تکیہ سے اپنا سر اسے جکڑ دیا۔ وہ منہ بھلائے ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”کو بھی منہ دیکھا کر پہلے۔“ غزالہ نے میشر کی بدلتی اس کی طرف بھلائی

”بہت اچھے نمبر لے ہیں بھی۔“ غزالہ نے تکیہ بہت خوش نگ رہی تھیں۔ اچھ اور کمن نے ایک ساتھ ان کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور دل ہی دل میں ان کے لیے دعا کی۔ تب ہی رمضان چائے کے کرپا کیا اور ایک طرف گھر سے رے کر گئی۔

”چائے بناؤں باہی۔“ کمن نے اچھ سے پوچھا۔



”میرا میں گاڑی نکالتا ہوں ہسپتال پہلے ہیں۔“

”نہیں خدا نخواستہ انڈیکس نہ ہو۔“ میاں صلاح الدین بھی پریشان ہو گئے اور عذر دینے کے بچے بچے بھرتے کر کے میں آئے یہاں دودھ کی شدت سے وہ سر ہٹھوٹیں کھینچ کر دیکھ رہے تھے۔

”چلو بیٹا مت کرو انھوں۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔

”بھئی اسے سارا رے کلاؤ میں بھی ساتھ چاہتا ہوں۔“

”سفر بھائی ہیں نا بیچ آرام کریں۔“ بھئی نے ان کی طرف دیکھا۔

”میں میں چلوں گا عذر راہیکم تم بھی آ جاؤ گی۔“ اس کی صورت کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔“ ابھی اتنی ہی بچے تھے۔

میاں صلاح الدین کے باں رات کا کھانا جلد ہی کھایا جانا تھا۔ اس لیے ہسپتال میں ڈاکٹر مریضوں کو چیک کر

تھے کئی ڈاکٹر موجود تھے لیکن انہیں کوئی ڈیرہ کھانا ہونا پڑا۔ ایک مریضی میں ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ ایک نرس

آتی نبض چیک کرتی۔ ”تم بھائی تکلیف ہے۔“ پھر کھٹ کھٹ کرتی چلی جاتی۔ پھر دوسری آ کر یہی کچھ کرتی آخر

ایک نوجوان ڈاکٹر نے آ کر چیک کیا۔

”کیا کھانا چاہتے ہیں۔“ میرے خیال میں کچھ فٹل چیز کھال ہوگی۔“

”نہیں میں انڈیکس۔“ میاں صلاح الدین نے کہا چاہا۔

”وہاں باہمی نہیں آرام سے ڈاکٹر آپ نہیں ہیں۔“

”میرا خیال ہے بیٹا کراچی ہسپتال ٹیکٹ میں چلو۔“ میاں صلاح الدین نے اسفر سے کہا۔

”تمہارے دوست کا ٹکٹ ہے نا۔“

یہ نزدیک ترن ہسپتال تھا۔ اس لیے دھر آئے تھے بھئی پریشان سا کھڑا تھا۔

”آپ لوگ بیٹھیں یہاں ایک شخص میرا جانے والا ہے۔“ میاں صلاح الدین نے اس سے بات کرتا ہوں۔“

اسٹرا میں وہاں ہی بھڑو کر کے گئے اور کچھ دیر بعد ایک شخص گئے ساتھ واپس آئے۔

”آئیے آپ کو ڈاکٹر جعفر کے روم میں لے جاتا ہوں۔“ ڈاکٹر جعفر نے پہلے مریض دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

لیکن اب انہوں نے غزالہ کو چیک کیا۔

”میرے خیال میں یو بی وی بھی ڈیو ہے۔“ لیکن اپنی تسلی کے لیے اگر آپ الزام ساز نہ کروانا چاہیں تو کروائیں

انڈیکس میں سے ہیں۔“ کہنے کے لیے ایک جیش لگا دیا۔

”اور دیکھنے کے بعد جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے۔“ میاں صلاح الدین نے بھئی کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے شہی تم میڈیکل لائن ہی انتظار کرو کہ کمرش میں آنا ڈاکٹر ہونا چاہیے ورنہ یہ لوگ تو خوار کر کے

رکھ دیتے ہیں۔“ بھئی چونے حیران میں بیٹھا جھوٹ کر انہیں دیکھنے لگا۔

”جی کیا۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم ڈاکٹر ہی ہو گئے۔“

”بندہ مجھے بیمار بھی بنا دیا ہے ہسپتال میں کوئی ایڈاڈ نہ ہونا چاہیے۔“ غزالہ اب سکون سے بیٹھی تھی۔

”کیسی طبیعت ہے اب؟“ گاڑی سے اترتے ہوئے میاں صلاح الدین نے پوچھا۔

”اب درد کم ہے۔“ کہنے نہ بتایا۔

”چلو اب تم لوگ آرام کرو۔“ اور اب طبیعت اگر زیادہ خراب ہو جائے تو چکا لیتا۔“

میاں صلاح الدین بھئی سے ملے کر اپنے کمرے میں گئے۔ عذر راہیکم بھئی نے بھرتے کر کے میں غصہ میں اور

پھر غزالہ کو سوجانے کی تاکید کرتی چلی گئیں۔ بھئی بیچ کر دے دوش روم سے نکلا تو غزالہ روم فرخ سے بائیں اہل

کان نکال رہی تھی۔

”غزالہ میرے خیال میں جس میں اس وقت کچھ نہیں کھانا چاہیے۔“

”مجھے بھوک لگی ہے اور میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“

”کیا مطلب تم۔“ بھئی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”بھوت بولا تھا میں نے۔“

”لیکن کیوں۔“ بھئی نے اس کی بات کو جان تھا۔

”وہ کہنے کا چکر اس کو ملے لگی۔“

”غزالہ یہ اس طرح کے ڈرامے جال اور میں کرتی ہیں۔ آخر اس کی کیا ضرورت تھی۔ سب کو پریشان کر کے

کہنا۔“

”اور تم جو میری پرانی کہیں نہیں گارہے تھے۔“

”جی جان خود نہیں بلانے لگی تھیں۔“

”بھئی نے ناواری سے اسے دیکھا اور مزید کوئی بات کے بغیر سونے کے لیے لیٹ گیا۔“

\*\*\*

”میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے شاعر کہ جیسے تک ایکشن ہوئے والے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ ایکشن

تھک آپ نہیں ہی رہیں شاہ زیب کے ساتھ۔“

شاہ زیب نے شاعر کو بول چاٹا جگلائے کا سبب بتایا۔ شاعر ابھی حویلی پہنچے تھے اور سید سے مروانے میں

شاعری کیا ہی آتی تھے۔

”جی بھئی میں آپ جیسے فون پر ہی بتا دیتے کہ زیادہ دنوں کے لیے آتا ہے تو چھٹی لے لیتا۔ بہر حال اسٹریا بلند

بخت سے کہہ دوں گا۔“

”وہاں یہ دو دنوں کے ہیں وہاں تمہارے ساتھ ہیں۔“ میرا کرنا ایکشن سے ایک سو دن پہلے ان کو بھی بلایا تو وہ کیا

ہم تھا اس کے گاؤں گاؤں تھا اسے بھی۔ اپنے بندے جیسے ہوا اچھا ہے پڑے گئے ہیں۔ بہتر طریقے سے

لوگوں کو پینڈل کر سکیں گے۔“

”جی اچھا۔“

”میرا دوسرا ہے ابھی خبریں آ رہی ہیں۔“ ڈاکٹر بھئی نے پروری کا ڈور کھینچا۔ میں وقت پر دھوکا دے

چاہیں۔ وعدے تو بڑے ہیں ہمارے ساتھ دے شاہ زیب کی جگہ اگر کم کمرے ہوئے تو کامیابی سو فی صد ہماری

جی۔ شاہ زیب ڈراما ساز کا تخت ہے ناہم ہائیں بھی۔ سینٹ تو چاندی ہیں۔“

”مجھے سیاست سے کبھی نہیں ہے شاعری۔“

”میرا وہ تو ہو گیا میں نے یو بی ایکسیٹ کی بھی۔“

”نہیں۔“ ایک نظر شاعر نے ڈالی۔ اگرچہ مجھے کھارو شاعر نے ناراض ہو جاتے تھے ان کی بے جا

بھڑکائی کی وجہ سے لیکن شاعر نے انہیں بھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا جبکہ شاہ زیب کی وجہ سے ایک سو دو

ایک سو بیس پریشان کرنا سنا کرنا تھا پھر بھی بہت ساری باتوں میں شاہ زیب کو شاعر نے ترجیح دیتے تھے شاہ زیب

نے جیسے سال شکار گاہ پر جوئے دوستوں کو اکٹھا کر کے گانے والوں کو بلایا تھا اور پھر اس کے ایک دوست نے

شقاق آرا میں کچی کھا کر اور اپنے پیچھے رہا تھا جس پر غصا شورچا تھا اور مخالف امیدوار اس بات پر لوگوں کو اکٹھا

تھا تھا۔ تاہم اس کے بعد انہیں کامیابی کی امید تھی۔ انتظامیہ سے باہمی تھی۔

”شاہ زیب شاہ زیب کا ارادہ تو کراچی میں ملے ہوئے کا ہے پھر صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے لیے اس کا اپنے

لگاؤ ہے کڑا ہوا۔“ میرا خیال تھا کہ اس نے انتخاب لڑنے کا ارادہ سوچ کر دیا ہے۔“

”اس سے فرق میں پڑنا آنا چاہتا ہے گا میں بھی اسلام آباد بھی۔“ انہوں نے ڈالی سے کہا۔

”اور سب لوگ زینت فاطمہ سیدہ اسٹاڈیا میر سب ٹیک تھے۔ زینت کا دل لگ گیا ہاں۔“

”ہاں یہ کہ کھانا تم ہمارے ساتھ نہیں لے کر کھاؤ گے۔ بارہنہ اور میں اتنی ہی ڈانگ نہیں لے سکتے۔“  
 ”جی۔“  
 ”میں نے یہ صاحب کو یہ دوسرے تیرے سونے کے ساتھ کھانا ہر کھانے کے شوقین ہیں۔“  
 اور بلند بخت اس خلوص کے سامنے مجبور ہو گیا تھا۔

جس نے بلند بخت کی اور اس کی وجہ سے مروں کے لیے آگ کھانے کا نظام کیا تھا۔ شاہرہ مروں طرف پکر لگا تھا۔

”میرا خیال ہے شاہو تم اور میری بیٹہ چاہوں بھی اور خدا کرے کہ نہ کچھ تو ان رہے گا۔“ سید قائم علی شہ نے حضور پر۔

”میں نے تو کہا تھا کہ یہ آپ کی بیٹی دعوت ہے۔ بلند بخت مرہنہ ہو گیا۔“  
 ”سے! ایسی کوئی بات نہیں تم ہمارے لیے شاہرہ اور زہرا کی طرح ہی ہو۔ میں نے تو کہا تھا جس نے کہ صاحب کیسے جگہ کھانا کھائیں گے لیکن وہ کچھ ڈنکی کر رہی ہیں۔ آگ کھانے پر نہ مان جائیں۔“

اسنے سال کینڈا میں رہنے سے سید قائم علی شہر میں لپک ہو گئے تھے۔ شاہرہ کو خداوند نکلتا کوڑا ہینڈ ٹھیل کر رہے تھے۔ تم ان کے بلند بخت اور اس کے حد تک جس کے قائل نہ تھے بلکہ چاہتے تھے کہ بلند بخت کو پچھو سے ملو۔ لیکن انہیں جرنی کے یہ اعتقاد اچھی لگی تھی۔ اب بلند بخت کو سید قائم علی شہ کے گھر میں رہنے ہوئے کی بات ہو گئے تھے اور اس نے گھر کے ایک فزونی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس کے تالی بنانا اور والدہ بھی ایک پکار لگتی تھیں اور انہوں نے بہت خلوص سے خداوند بخت کا پیسہ ان کے لیے دعوت بھی تھی۔

نہت فاطمہ بھی سب سے پہلی ہوئی تھیں اور سید کے لیے بات بابت پر کھجالی نہ تھیں بلکہ بھی سب بدل کھجالی اور خود ہی سید قائم علی شہ کی طرف زارا کی سہ ماہی کے ساتھ بل جاتی تھیں۔ سید کا پیسہ تو سب سے اوپر چلے جاتے تھے۔ خود سید قائم علی شہ اور حضرت ماکر آتے تھے۔

”یار اعتقاد اچھی ہے، ہمیں تمہارے لیے مسئلہ نہ بن جائے۔“ شاہرہ کے اسرار پر کہتے۔  
 ”نہیں اس ذرا سی ملاقات سے بھی نہ جائیں گے۔ گویا کئی دنوں سے پھر کچھ۔“

حلی اور سید کا کھانا کھول کر جو ان کی طرف سے نہ تو رقم نہ کھانا ان کی نظر کھن کی طرف جاتی زارا پر ذری

”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

”جی۔“  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔  
 ”میں یہ کہ تم گھر پر آکر رہے۔“ سید قائم علی شہ نے جواب دیا۔

[illegible]

”ہاں! ہم لوگوں کو اللہ جل جلالہ کی رحمت و کرم سے بہرہ ور کرنا ہے۔“

”اللہ سے آپ کو بھی کچھ فخر نہ ہوگا۔ یہ دولت عطا نہیں کی۔ ہاں نہ اے خود بھی اپنے حسن کو بھروسہ نہ کرنا کہ میں کیسے ہے۔“

”نہرل ایک ہی زبیر نہ کر کے اس کیسے ہی آ کر بیٹھ گئی۔“

”میں نے غور کیا تھا، نہ ایک آپ کتنا پتلا تھا، حالہ کا ہاؤس کے خانوں سے لے کر آکھوں تک کو سنوارا تھا۔“

320

بیایا۔ کہ انہوں نے جانے جاتے ہو۔

ہاؤور نے اہانت میں سر ہلا دیا۔ اور طبع خائفان کے جانے کے بعد فرنیج سے گوشت کا پیٹ نکال کر باؤل میں پانی ڈال کر رکھا۔ فور سے میں تو دیر لگی کر اسی بیلاں کی۔ فرنیج کھولا تو رات کا آٹو گوشت بھی نظر آیا تھا۔ سارا پو کی پڑا تھا۔ طبع نے وادی کے لیے کچھ بیلاں بھی سب نے وہی کھالی صرف نصیران اور منصور نے وہی کھالی کھی۔ پلاؤ کے لیے گوشت چڑھا کر وہ کڑائی کے لیے چن وھوڑی بھی کر آہٹ پر مرکوز کیا۔ بچن کے دروازے پر ہاتھ رکھے خضر کھڑا تھا۔

”آپ برال۔“ وہ در اساتیران ہوئی۔

”بچوں کیا میں یہاں نہیں آسکتا۔“ وہ مسکرایا۔

”ہاں۔“ خضر کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔

”ہاں۔“ ہاؤور نے چمکیں اٹھائیں۔

”تمہاری کچھ دین کرنا تھا۔“

اس کی مسکراہٹ مزید گرمی ہوئی اور ہاؤور نوکی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ یہ خضر تھا جس کے ساتھ وہ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتی تھی۔ لاپاک بیٹاری ان کی جدوجہد اور ان روزوں کے خواب منوں کی پڑھائی۔ لیکن یہ جو ایک بھی کسی کو نہیں مل کر دینیں پر پھلتی تھی اس کے خواب کا پرہہ سا ناک نہ تھا۔ خضر کو سامنے پر کیوئی کسی کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی تھیں۔

”ہاں ہاہ! اہانت دلوں سے چاہ رہا تھا کہ ہمیں دیکھوں تم سے باتیں کروں۔ تمہارا احوال پوچھوں لگتا ہے تم سے صدمہ اہانت کی ہوں۔“

”اس روز عینا کی بڑھتے تو ملاقات ہوئی تھی۔“ ہاؤور کو حیرت ہوئی۔

”اس روز وہ ملاقات بھی ماہ محض چند لوگوں کی۔“ خضر کی نظر ہاؤور کے چہرے پر تھیں۔

”آپ مجھ سے بھی تو آئے تھے راستے میں کیا باتیں ہوئی رہی تھیں۔“

”کیا ہاہ! قاعدہ ملاقات خضر کی شادی جانے سے پہلے ہوئی تھی یا ان دنوں اس قدر مصروفیت رہی کہ ہاؤور خواہش کرنے نہ کر سکا۔ تو روزی چاہتا تھا کہ۔“

”خضر آج۔“ ہاؤور نے کھمکنا چاہا وہ نہ تھا۔

”موری ہاہ یو بھی ہمیں شک کر رہا تھا دیکھو۔“ کبھی کبھی تھوڑی سی دھمکنج گفتگو کر لینے میں کوئی حرج تو نہیں۔“

”لوں پر شرر مسکرا رہے اس نے معصومیت سے پوچھا وہ تو بھی اس کی شرارت سمجھ گئی۔“

”جانتے تھے کس کام سے آئے تھے۔“

”کیا اتنی بے وقاحتیں بے برہان تھا تو اصل ہمیں دیکھنا چاہ رہا تھا۔“

”مغضوب کیا میں مت کر۔“ عجیب سی ہو کر ہاؤور فرنیج کی طرف مڑی اور ہال کی پوئل نکالی۔

اس کے ساتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے خضر سنجیدہ ہو گیا۔

”تم شک تو نہ کرنا۔ اس روز مجھے کچھ کھڑی لگی تھی۔“

”ہاں! شک ہوں بالکل۔“

”اسکول تک کل رہے ہیں۔“

”تمہارا گت تک کل جا میں گے۔“ ڈاک صاحب تو چاہتے تھے کہ یکہ اہانت کو ہی کھول دیں پراپیٹ اداروں کا اپنا بی شعل ہوئے۔ لیکن مجھے اسے احتجاج کیا تو انہارہ کو کھول رہے ہیں۔“

”پھر چند ہی دن رہ گئے ہیں۔“ خضر نے گلاس داہیں کیا۔

”یہی ہے رانیوٹ اور اسے چھیلوں کی بے دیتے ہیں۔“

”وہ کاتو مجھے بتائیں۔“ ہاؤور نے گلاس کاؤٹر پر رکھا۔

”ڈاکر صاحب دیتے ہیں لیکن ڈاکر ایک سال کی حاجت ہو تب۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں چھیلوں کی بے دیتے ہیں۔“

”ظاہر ہے مجھے تو پتہ ہاہی ہوئے تھے حاجت کرنے اور چھیلوں ہو گئیں۔“

”کیوئی پر اہلم تو میں ہوا ہاہ۔“ خضر کے لیے میں توشیح تھی۔

”تم نے مجھ سے ڈر کر تک نہیں کیا۔ پھر بھی کسی شادی بھی میری خراجا تھا تو۔“

”کیوئی پر اہلم میں ہوا۔“ آپ کی کسی ریشان ہو رہے ہیں۔“

”مجھے خود خیال رکھنا چاہیے تھا۔ مجھے بتا ہے کسی بھی خود سے کچھ نہیں کوئی۔ امیری اتنی محبت اتنے خلوص کے باوجود تمہاری یہ اہانت نہ دکھ دیتی ہے مجھے نہ مجھے اپنا نہیں سمجھتی ہو۔“

اس کے لیے سے ہی میں چہرے سے بھی ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”ڈاکر کیوئی پر اہلم یا مسئلہ ہو ناؤ آپ سے ہی کبھی ٹھکر کیوئی پر اہلم ہو ہی نہیں اہل شہر کی لیے تو تھی

میں جو بے بخت کر رہی تھی۔“ گفت تو امان نے خضر سے ہی نکال لیا۔ ہائیں۔ خالد جان اور غزالہ بھابی کے

جوڑے تو گھر سے ہی نکل آئے تھے۔ صرف ماہ جان اور شہر کے لیے کچھ بڑے خریدے۔“

”اور یہ جوڑے مفت مل گئے کیا۔“ خضر کا ہبہ بھونچا ہوا تھا۔

”نکل گیا وہاں میں دیکھو۔“

”اب آ رہی ہیں۔“ ہاؤور ہولے سے ہنسی۔

”چھیلوں میں زیادہ بیٹے بیٹوں کے آئے ہیں تو۔“

خضر نے بہت کئی نظریں ڈالی تو اس نے نظریں نہ اٹھیں۔

”خضر کی محبت اور خلوص کی معترف بھی لیکن مجھ سے بچو۔“ بے مسائل خضر نے ڈمکیں کرنا اب انہما

میں لگ گیا تھا۔ خراجا تھا۔ داخلی زیادہ تھے اور خارجی ہاؤور اس کی دین سے نہیں اس کی نہیں۔ لیکن کوئی خاص

مسئلہ نہیں اور تھا۔ اہانت ہو کر رہے تھے۔ کوئی کھڑی نہیں ہو سکتے تھے تاہم اپنی ناخوشی کو کہانی سے حرکت

دے سکتے تھے۔ منصور انہیں باقاعدگی سے فزول تھراپی کے لیے لے جاتا تھا۔

”خضر! اس سے خاموشی کرے خضر ایک نظروں کی۔“

”آپ کے ہونے کا احساس بیش بہا ہے تو تیرا ہے۔“ خیال کہ جب کبھی تیرا ہوا میں تو آپ ضرور

ہمیں ان دنوں میں سے بچانے کے لیے آئیں گے۔“ آپ کو کیا پھر افضل حیدر کہ بہن کی راز کی بات پر

دوڑنے لگا ہاؤور کو کاٹھ کے بعد آپ کے ساتھ کا احساس ہی ہاؤور کا ہے۔“

”اے! خضر! خضر! خاموشی ہاؤور کے احساسات جیسے جان لے تھے۔“

”میں ہر گز نہیں تمہارے ساتھ ہو رہا ہوں ہر آن ہر گز یہ کبھی نہ بھولنا ماہ۔“

ہاؤور نے سر ہلا دیا۔

”کیا آپ کا ہے؟“ خضر نے ناک سے کھینچی۔

”ہوئی! کچھ خوشیوں کی آ رہی ہیں۔“

”ہاں! ہاؤور نے لگی تھی۔“

”زل کے جانے کی خوشی میں۔“ زل کو آنا دیکھ کر خضر نے فور سے بلند آواز میں کہا۔

”مجھے جانے کی خوشی میں کیا مطلب؟“ زل قریب آگئی تھی۔

”مطلب تو کہ میں نہیں ہر رات کا کہ تمہارے جانے کی خوشی میں پلاؤں رہا ہے۔“

”میں نہیں! مجھے بے سب اداس ہیں اور پلاؤں مجھ سے بہت پند ہے اس لیے اہانت لگتا ہاؤور نے کو۔“

”تو کیا حنہ چھو کو پکڑا گیا نہیں آ؟ کیا وہاں جسیں ملائے رکھا تھا کہ وہ“ ”خضر نے اسے چھیڑا۔  
”یہ تو بال کا دل ہے نا خضر بھائی اور مال کے بدل کی اٹھاؤ کو لون پنا سا ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”یہ تو ہے۔“ خضر نے تادیق کی۔  
”وہ لے آئے تو کیا ہیں؟“

”زہل نے انھوں نے تم کو کونوں کو انھوں کی پشت سے پوچھا۔  
”اگر خضر نے کچھ کہنے کے لیے نہ کھولا تو انھوں نے ڈانڈا لگا دیا۔“

”نہ ان آج کا فون ہے سرزم اور ہیں۔“  
”وہاں تو رات کو شہر دیکھ لیتا۔ میرے خیال میں گل گیا ہے۔“ آگ دھبی کر دھ۔ میں ابھی آکر بھون لیتے ہوں۔“

بھرنے کتاب اور فائل اٹھائی اور کمرے سے نکلے یہی لگا تھا کہ ڈر بینک ٹھیل کے سامنے بیٹھی بال سنواری  
غزالہ نہ دیکھا۔  
”ماں۔۔۔ ہو۔“

”نہ رات منہ خالہ کی طرف جا رہا ہوں۔“ قالی انکل سے ایک دو پانچ ڈنکس کرنے ہیں۔ کچھ نہیں آ  
رہے۔“ مشرک کر اسے دیکھ گئے۔

”قالی انکل سے پوچھو ڈنکس کرنے ہیں یا پھر اپنی پچھو کی بیٹی سے ڈسکشن کرنا ہے۔“  
غزالہ کے لیے جس میں غرور تھا۔ بھرے چرے کا رنگ نکلا۔

”غزالہ تم بہت فضول پوٹی اور فضول سوچی ہو۔“

”کیا فضول بات کی ہے میں نے۔“ وہ پوری کی پوری اس کی طرف مڑ گئی۔

”کیا تم حنہ خالہ کے گھر زہل کی خاطر میں جاتے ہو۔ اتنی باتیں نہیں ہوں میں سب سمجھتی ہوں۔“

”تمہاری سوچ غلط ہے۔“ مشرک نے ایک آدھ بھری نظار میں ڈالی۔

”زہل سے مجھے کچھ کہنا پڑا کرتا ہو تو وہ سارا دل میرے ساتھ کاج میں ہوتی ہے۔“

”جی نہیں بھرا ناوگان بھرا لیے شام کو بھی چل پڑتے ہو۔“ مشرک مزید بھونک رہا تھا۔

”میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب زہل بل لیتی ہیں اتنی ہی ہنسنے میں تو کون نہ شادی کر لی میری قسمت  
کیوں ہو گئی۔“

”غزالہ فار گاڑ سیک! ایسا کچھ نہیں ہے۔“ مشرک دروازے کے پاس سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کا انداز  
سمجھا نہ والا تھا۔

”خزاہ مجاہد ہم کر کے اور فضول باتیں سوچ کر مت تھکا کر دینا۔“ قالی انکل نے ہاتھ دھو کر تھکایا ہے میں نے

لیکن تم ہر دو زہل نہ کوئی بات کے کر شک میں جھٹا ہو جاتی ہو اور مجھے بھی بے ضرب کر لیتی ہو۔“

”یہ تو میں نہیں سے میرا نہیں سب جانتی ہوں۔“

”غزالہ کی گواہی نہ لائی۔“

”میں غرضی تم سے ہوں۔ ہر سب تو دھمی لکھی نہیں ہوں جب کہ وہ۔“

”تم بہت ابھی ہو غزالہ! خوب صورت ہو۔“ میری ہوتی ہوئی میں نے اپنے تھے سارے لوگوں کی موجودگی میں

قبول کیا ہے تمہیں۔ اور تمہارا جو مقام ہے کہ کاج میں ہو سکتا خدا کے لیے غزالہ ایسی باتیں کر کے مجھے

پریشان کر لیا کہ میں نے کبھی سے نہ جانتی تھی۔“ غزالہ نے سر ہٹا کر کہا۔

مشرک اس کی سال میں بہت چل گیا تھا۔ اس نے انٹری ٹیسٹ کیلئے کرنا تھا اور اسے کہ اس میں ایڈمیشن  
مل گیا تھا۔ زہل کو بھی اس کی کاج میں ایڈمیشن ملا تھا۔ غزالہ کی غرض سے وہ حنہ کے گھر آئی تھی۔

میرا لیکل کی بڑھائی بہت تھکی۔ مشرک نے سنجیدگی سے بڑھائی کو دیکھا تھا۔ لیکن غزالہ کی وجہ سے اکثر وہ  
بھول جاتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو سنبھال دیتی تھی۔ ذرا سی بات پر الجھتی تو کھینچ لیتی تھی۔ مشرک  
کو کھینچ لیتی تھی۔ اس کے ہنسنے اور تارار کھنک کا ہم بھڑا بیکم اور اصرار کہ نہ ہو۔ لیکن پھر بھی کبھی بھلا وہ ان  
کے سامنے یہ دیکھتا ہوں جی تو خدا کا بیکم کیلئے نہ لکھو گی۔ ہمیں بار بار مشرک سے پوچھیں۔

”خوش ہو؟“

”جی ای جانی۔“ وہ انہیں یقین دلا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں کی نمی اسے بے چین

کر دیتی تھی۔

”ای جان بیڑا آپ میرے لیے پریشان نہ ہوا کریں۔ میں بہت خوش ہوں۔ اب ہر لڑکی آپ جیسی تو نہ ہو۔“

سکتی تھی۔ ناخوشی پر حنہ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ غزالہ نے ہنسی۔

”وہ غزالہ کو سمجھتا نا رہتا تھا صرف ایک سال میں لگتا تھا جیسے وہ دس سال بڑھ گیا ہو۔ سنجیدہ اور سمجھ دار۔“

صالح الدین۔ اسے دیکھتے تو بہت خوش ہوتے اور انہیں اپنا فیصلہ بالکل سچ لگتا۔

”مگر میں اس کی شادی نہ کر سکتا تم عمری میں تو یہ ایسا ہی رکھنا تھا۔“ غزالہ اور لاہور۔ میں نے ہنسنے دیا۔ ہر شام دوستوں

کے ساتھ گوارہ گری کر کے نکلتا ہوں۔ اور پھر اپنے خوب صورت اور حسین مو کوئی نہ کی لڑکی چھاس لیتی ہے۔

”وہ خدا پرست ہے۔ اسے احساسات کا اظہار کرتے تو خدا کا بیکم خاص کر میں۔ وہ جانتی ہیں کہ غزالہ جیسی لڑکی

کی رفاقت کتنی اذیت ناک ہے اور ہم بس وہاں سے بھاگ جائیں گے۔ اسی خوف سے وہ قلی“ قلی“ اسے

سمجھاتی رہیں۔

”ایسا وہ سمجھ سے اتنی عقل نہیں ہے اس کے پاس اس کی باتوں کو رد کر دیا کہ وہ عقل عورت اکثر اپنی

کچھ کی کہ انھوں نے گریڈ کر دیتی ہے لیکن اگر مجھ کو وہ تو گھر کو بچا کر رکھتا ہے۔ بیٹا وہ جب تھے میں ہونو تم

خاص ہو گیا کہ۔“

لیکن وہ جتنا رد کر کر کرنا وہ اتنی ہی ہوتی تھی اور اب پچھلے چند سال سے تو وہ اس پر شک کرنے لگی تھی۔ اب اس

کے کانٹے کھینچنے کے گرد فون سے ہوتی تھی۔ جسے غلطی سے وہاں سے دیکھنا پڑتا تھا۔

”یہ لڑکیاں بھی تمہارے ساتھ بڑھتی ہیں اور یہ اور حال اتنی خوب صورت ہے۔“ اس نے ایک مٹھلو کی

نظار اس پر ڈالی کہ۔“

”ہاں لیکن اس سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں ہیں۔ میری کلاس میں۔“ مشرک کا موزم بہت خوشگوار تھا۔

تمہاری دوستی ہے۔“ اس نے جیسے اس کی بات سنی نہ تھی۔

”ہاں یہ ایک باتیں ساری خوب صورت لڑکیاں ہیں غزالہ کیا میں سب سے دوستیاں کرنا پھرتا ہوں۔“

پڑنے جانا ہوں۔“

”اس نے کندھے اچکا ہے تھے۔“

”تم لڑکی کا کیا ہوتا ہے باہر نہ جانے کیا کرتے پھرے ہو اور تمہاری ساتھ ذاتی لڑکیاں بڑھتی ہیں۔“

وہ مٹھلو نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”چلو بار بار جو بھی کرتے ہیں۔ شادی تو تم سے ہو چکی اب کسی سے شادی تو نہیں کر سکتا ابا جان نے پہلے ہی

پابند کر دیا کہ میں کوئی خوب صورت لڑکی نظر آئی گی تو یہ آجائے کہ گھر میں ایک مختصر مہر جو دوں۔“

”جی ہاں کیا کر۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔

”میں گریبا پر میں کیا ہونا ہر تمہارے ساتھ ہوتی ہوں۔“

آنسو تو جسے اس کی آنکھوں میں دھرتے تھے ذرا سی بات ہوتی ہمارے گنتی اور مشرک کا سارا رخ خوشگوار

خواب ہو جاتا۔



”میرے پاس پیش کرنے کے لیے وقت نہیں ہو گا تو اگلے بجے اڑھتے جا رہا ہوں۔“  
 اور پھر اس روز کے بعد اسے ایک یا موصوفی لکھا گیا تھا۔ کالج سے آتے ہی تفتیش شروع ہو جاتی تھی۔  
 ”آج کیا کرتے رہے کالج میں؟“  
 ”کیا کرنا تھا؟“ وہ پوچھتا۔

”رحمائی کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتا ہے کالج میں۔“  
 ”کچھ کیا ہے۔“ وہ انجان بن جاتی۔ کبھی اس کا فائز اور کتابیں چیک کرتی تو وہ ہلچلتا۔

”کیا کر رہی ہو؟“  
 ”تو مجھ رہی ہوں کسی لڑکی کی تصویر یا خط و نشان نہیں ہے۔“  
 ”اتنا کچل بھجھا ہے مجھے کہ میں تصویر یا خط کتابوں میں رکھوں گا۔“  
 اس کی تفتیش سے تنگ آکر کبھی وہ اسے چلانے کے لیے ایسی بات کر جاتا کہ اس کا شک بڑھ جاتا۔  
 ”بہت سنبھال کر رکھا ہوں میں اس کی چیز۔“  
 اور وہ حواس و حار و سرد شروع کر دیتی۔ کبھی پوچھتی۔  
 ”جنگ تباہ کنی لڑکیاں تم پر مری ہیں۔“  
 ”یہ کیا فضول انداز گفتگو ہے۔“

”میں بتاؤ ناٹھی، چلو تم نہیں دو تو ہر مری ہوں گی۔ تم اتنے خوب صورت ہو۔“  
 ”عزت افس ہے نہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا۔  
 ”وہ تو ہے۔“

”تو پھر اراں خوب صورت لگوں کو وہ سروں کی باتوں میں ضائع مت کیا کرو۔“  
 پارسے منھے سے ہر طرح سے وہ اسے سمجھاتا تھا۔ لیکن یہ نہیں کیوں وہ جتنی ہی نہو گی۔ اور کج نہو یا شوشا  
 چھوڑا تھا اس نے۔

”دینے نزل سے تو بہت خوب صورت۔“

غزالہ پر جیسے اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جو شکر کر اسے نہ کھینچے لگا۔  
 ”بہ نہ۔ خوب صورت ہے نا۔ اس دن کبھی کبھی نہو گی۔ بہت کشش ہے اس میں۔“  
 ”وہ تم سے زیادہ خوب صورت نہیں ہے غزالہ۔“ میرے اس کے نظر ڈالی۔ وہ اس ایک سال میں  
 اور بھی بڑھ کر گئی تھی۔ گوہ عمر میں اس سے دو تین سال بھی تھی۔ لیکن کتنی بھی نہیں۔  
 اور پھر کٹا ہی خوب صورتی ہے۔ اصل خوب صورتی انسان کے کردار اور اس کی شخصیت میں ہوتی  
 ہے۔ اس کی بات چیت اس کا اخلاق اس کی افتاد پر ہے متاثر کرتے ہیں۔ حسن عارضی ہوتا ہے۔ میرے ایک  
 دوست کے چچا جو ہم سے خاصے بے گفتگو ہیں ان کو کہتے ہیں۔  
 ”بڑی جتنے کے کچھ عرصہ بعد سب لڑکیاں ایک جیسی ہی لگنے لگتی ہیں خوب صورت بنارہی۔ بد صورت وہ  
 وہ بنا۔“

لیکن اس کی سنی بنوڑ میں ابھی ہوئی تھی۔  
 ”میری بھجھ میں اس کا جب تمہارے اپنے خاندان میں اتنی خوب صورت لڑکیاں موجود تھیں۔ تمہاری  
 چھوٹی اور پھر تمہارے ماموں کی بیٹیاں سب ایک سے ایک بڑھ رہی ہیں پچھلے چارے میں ہزار شاخ کیوں مانگا۔“  
 ”میں لے کر میرا لقب تمہارے ساتھ چھوڑا تھا۔ انڈے میری قسمت میں نہیں لکھ رہا تھا۔“  
 ”کیسے تم میرا مطلب ہے۔ تمہارا کرکٹر تو ایسا نہیں تھا کہ خاندان ہمیشہ کیسے نہیں رشتہ نہو رہا ہو۔“

اب اس کا ذہن کیسے ابھرتا رہتا۔ سوچ رہا تھا۔  
 ”پھر تمہاری عمر بھی کم تھی۔ اتنی جلدی شادی کرنے کی کوئی توجہ ہوگی۔“  
 ”بھرتے مشکل اپنے مجھے کوئی یاد اور کھڑا ہو گیا۔“

”غزالہ“ بھگتا اس نے نازک خان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا کہ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ زیادہ بوجھ برداشت نہ کر سکے اور  
 وہی خاندان میں رہنے کی بات تو والد بزرگوار نے بھی خاندان والوں کو اس کی نہیں سمجھا کہ ان کے ساتھ رشتہ

جوڑے۔  
 ”اور اگر چاہا جان مان جاتے تو پھر تو تم خاندان میں ہی شادی کرتے شاید نزل سے ہے نا۔“  
 وہ اس کی طرف سوایہ انداز میں دنگے لگے۔ ”میرا کامل چاہا کہ کے یہ میری خوش قسمتی ہوئی لیکن پھر کیا کچھ

کے اس نے جگ کر بیڑ پر دی فائل اور کتاب اٹھالی۔  
 ”ابا جیادہ تو میں جاؤں۔“ پھینکی بہت سیٹ ہو گیا ہوں۔ ”میرے نذر اس اس فرم کیا تھا۔“  
 ”میں ایلے جیسے ابھی کے کھڑے ہو۔“

اس نے نوڈارڈ رنگ میل سے برش اٹھا اور جلدی جلدی پالوں میں پھیرنے لگی۔  
 ”اس وقت! میرے جیت سے اسے دکھا۔“

”ہاں میں نے اہل کو فون کر دیا تھا کہ میں آج آؤں گی۔“  
 ”لیکن اس وقت تو مشکل ہے۔ کل منٹے ہے۔ میں جس میں مچی جھوڑ آؤں گا۔“

”مگر مجھے تو آج جانا ہے۔“  
 ”تو کچھ غزالہ خواہ خواہ ضد نہ کرو۔ میں پہلی بہت سیٹ ہو گیا ہوں۔ انکل انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”کل انکل فارغ نہیں ہیں۔ انہوں نے دو تین آپریشن کیے ہیں۔ دو کچھ میرے مں ہو گئے تھے اور۔“  
 ”مصلیات کرو میرا نزل سے وعدہ کر رکھا ہو گا۔ کات کا۔ انتظار کر رہی ہوگی۔“

”میرا کالج سے فرم گیا۔ اب میری سے وہ نہو گی۔ سمجھا رہا تھا لیکن مرے کی وہی ایک ٹانگہ وہ اپنی بات پر  
 اڑی تھی۔“

”کتنے میں نے نزل کے ساتھ کوئی وعدہ ہی کر رکھا ہو تا تو پھر اتنی دیر میں تمہارے ساتھ جھک جھک نہ کرنا  
 اب تک چلایا ہوتا۔“ اس نے بہت آواز میں کہیں منھے سے کہا۔

”تو لیکن تم جھک مارے تو میرے ساتھ ڈنگ کو منھے نے آوازے گھر۔ مجھے مجھوا دیر سے کیے۔ بھوکے منھے  
 نہیں ہیں ماری زندگی میں مجھے کھانے کھانے ہیں۔“

”ابہ حوالہ حار و سردی تھی۔ میرا بھوکڑ بھینٹ گیا۔“  
 ”ماتش میں ایسا کر سکتا۔“

اس نے زہر کا توبہ ہی دروازے پر دنگ ہوئی اس نے دوئی ہوئی غزالہ پر ایک نظر ڈالی اور اٹھ کر  
 دروازے کے پاس آیا اور دروازے کو تھوڑا سا کھولا۔ باہر اسفرختہ۔

”یار! تمہارا فون ہے قادی انکل ہیں۔“  
 وہ واپس پلٹے تو اسے پیچھے دروازہ کھیرنا ہوا وہ ان کے ساتھ چلا ہوا پر گدے میں رکھے فون اسٹینڈ تک آیا۔

”بھئی کہاں ہوا صا جیادہ! ہمیں پانڈ کر کے خوراک ہو گئے۔“  
 ”وہی طرف سے قادی قادی شاکر ہو گئے۔“  
 ”سروا انکل! آج میرے گھر آیا ہوں۔ ابھی انکل ہی رہا تھا۔“  
 ”کچھ میں چندا کام لیت ہو گئے ہو۔ میں ذرا اسپتال جا رہا ہوں کال آئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کا کام  
 ہے نہت کرنا میرا کام ہو کر کھاگتے جانا۔“

”میں پھر آجوں گا کسی روز۔“

”اے نہیں آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا ہے۔“ وہ سمجھے۔

”تو آجھا تو نہیں یہاں آئے میں ملک جائے گا پانی آجھا گھنٹا تیری ڈیڑھ بیوی سے گپ لگا۔“

”آپ کی ڈیڑھ بیوی میری بیاری خالہ بھی تو ہیں۔“

”وہ ہاں لیا کہوں گئے تو بس ایک ہی رشتہ یاد رہتا ہے۔ یہ بھول جانا ہوں اکثر کہ میرے پیارے بچوں کی

الیا جان بھی ہے۔“ انہوں نے فتنہ لگایا اور فدا حافظہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میشر ریموٹر کر لیٹل پر ڈال کر وہیں برآمدے میں بیڑی کر کے بیٹھ گیا۔ اسٹریو کر کے بچے پر ہاتھ رکھے اس کی

بات ختم کرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ریموٹر اٹھا کر کوئی بھرم لائے گئے میشر انھیں موندے دامن باغدی کی

انگیوں اور انگوٹھے سے پتہ چلا کہ وہاں لگا۔

اسٹریو فون بند کر کے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کیا سر میں درد ہو رہا ہے۔“ میشر نے انھیں بھول کر ان کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہو

گیا۔

”پھر تو تجھ پر آرام کرنا چاہیے تاہم کین تھالیا۔“ قائم انگلی کی طرف جا رہے ہو۔ میں شاد رخ کی طرف جا رہا

ہوں رات میں تمہیں ڈرا ب کر دوں گا گاؤں میں ایک بیک بھی کروں گا۔“

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہے تھے ایک ساتھ میشر کی انھیں کبھی کی طرف سے گاڑی ملی تھی۔

”جی اچھا۔“ وہ غزال کے متعلق سوچ رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ ہم کچھ پریشان کہہ رہے ہو مگر طبیعت بہتر نہیں محسوس ہو رہی تھی تو قافی انگلی کو تیار ہے کہ

نہیں آسکتے۔“

”میں اب غزال کہہ رہی ہے کہ میں اس کی ابا کی ابا سے کہہ چھوڑاؤں اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔“

”تو میں غزال بھائی کو چھوڑ آتا ہوں۔“ مجھے کوئی خاص کام تو ہے نہیں مگر کوئی کافی دن ہو گئے تھے شاد رخ سے ملے

اس نے دراصل دو سہری چینی ہوا جس کی رہے تو بس نلے جا رہا تھا کہ غزال کو لے کر آئے۔ میں گاڑی کی چابی لے کر

آتا ہوں۔ شاد رخ کو ہی میں فون کرنے جا رہا تھا کہ قافلہ میں ہونے کو دوسری طرف انگلی تھے۔ تمہارا پتہ چر رہے

تھے۔“ مجھے نے ایک منہ ہی نظر اس پر ڈالی۔

”غز اب آپ نے شاد رخ بھائی کو اپنے آئے کا بتا دیا ہو گا۔“

”وہاں شاد رخ میرے بات بھئی کی میں نے صرف پوچھا تھا شاد رخ کمرہ میں ہیں یا تمہیں مریض مت ہو۔“

”اس کی طرف کچھ کر سکتا۔“ میں نے کہا کہ بھائی کو چھوڑ آتا ہوں۔“

میشر سر ہلا کر اٹھ اٹھے میرے میں داخل ہو گیا۔ حسب معمول دو دو کر غزال اب بستر پر اونچے لیٹی تھی۔

”غزال! انگوٹھ۔“ میشر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”میں سر بھائی نہیں شیوہ پر چھوڑ آتے ہیں۔“

”نہیں جانا مجھے تمہارے بھائی کے ساتھ۔“ غزال نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”پلیز غزال میری مجبور ہو کر سمجھا کر دو۔“ اس کا ناز دیکھنا نہ چاہتا تھا۔

”کہہ دیا کہ میں جانا تم جاؤ گاؤں میں بیاری کے پاس۔“

”میشر نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا دیا یا اور ہاتھ کے فاصلے اٹھا کر پارنگل گیا۔ اسٹراس کے ہتھکڑے۔

”غزال! میں سنی۔“

”نہیں۔“ وہ اپنا فتنہ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسٹراس نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

”جی۔“ وہ جھپٹ گیا۔

”عورت اس کے لیے عذاب نہیں تھی اور نہ جانے انعام کیا ہو گا۔“ کب کب کہاں کہاں اس نے کمر ہٹا

کر لیا تھا۔ بہت بار چاہے ہوئے ہیں اس کے ساتھ کبھی اس کا تھا اس کی سیلیوں کی فصول یا میں برکاشت کی

میں کیا کار کاج سے اشتیاق تھا ہوا آئے کے ساتھ اس کی فریاض پراسے اس نے کیا تھا۔

”میں اس کے خلاف اس کی بلا دیا اور غلط شکایتیں خاموشی سے نہ لی تھیں لیکن۔“

”جی! گاڑی پر اسے پلائے ہوئے اسٹریو آہستہ سے کہا۔

”جی! اس کا بیڑی پر لٹا ہوا تھا۔“

”میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

”جی! اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔“

330

اس نے فون آف کر کے پاس ہی بیٹھ کر رکھ دیا۔ میڈم سفینہ نے اس کی ملاقات ایک بڑے ڈائریس ہوئی تھی۔ وہ راجہ زبیر کے ساتھ کھڑا بیٹھ کر رہا تھا جب ہاتھ میں مشروب کا گلاس لیے اس نے اراجہ زبیر کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا تھا۔

”کمال! میں راجہ صاحب آج کل؟ آپ بہت دنوں سے نظر نہیں آئے کس اور نہ ہی غریب خانے پر تشریف لائے آپ۔“

”بس میڈم کچھ معصیت رہی ان دنوں دیکھی گیا ہوا تھا۔ انشاء اللہ جلد ہی حاضر ہوں گا اور ان سے ملے گی یہ شاہ زبیر ہیں۔ شہر صاحب کے بڑے کزن نذیر عموالی اسمبلی کے ممبر اور ہمارے پار۔“

میڈم سفینہ نے دیکھی سے اسے دیکھا تھا۔

”اور شاہ زبیر یا ربہ میڈم سفینہ میں ان کے لیے انتہائی تعارف کافی ہے کہ یہ میڈم سفینہ ہیں بس۔“

میڈم سفینہ بڑی ادا سے مسکرائی تھیں۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر شاہ زبیر صاحب کی روزگار غریب خانے پر تشریف لائے گا۔“

”جی ضرور۔“ شاہ زبیر کو وہ عجیب سی عورت لگی تھی۔ اس کے ناز و انداز بڑے سنجی سے تھے۔ اس نے راجہ صاحب کے ہاتھ سے سرگرمی سے کرا لیا تھا۔

”میڈم آپ بڑے میرے سرگرم قیصر بنائیں ہیں۔“

راجہ زبیر نے دائیں سرگرمی سے لپٹا چلا اور میڈم سفینہ نے ہاتھ پیچھ کر لیا۔

”اس ایک شخص میں بھی راجہ ہو رہا ہے راجہ صاحب۔“

اس نے کہا میں آٹھ گاؤں کا دایا اور پھر راجہ صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ کر رشتی اور لڑائی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

”کیا چاہتے ہیں۔“ شاہ زبیر نے راجہ زبیر سے پوچھا۔

”یہ دماغی چیزیں بڑی دور تک رسائی ہے ان کی۔ چاہی تو یہ بیڈیٹ ہاؤس تک ہو آئیں۔“

”اوہ! شاہ زبیر نے ہونٹ کھینچے۔“

”لیکن مجھے تو اس کو بے گندہ کرنا ہے۔“

”کچھ ایسی ہی بات ہے بار شاہ زبیر اب نام بدل گئے ہیں طور طریقہ بدل گئے ہیں رہن سہن بدل گیا ہے لیکن۔“

راجہ زبیر نے بات ادھر ہی پھوڑی۔ راجہ زبیر کو عمریں شاہ زبیر سے بڑا تھا لیکن شہر صاحب کے ہاں ایک پانچ سال ملاقات کے بعد شاہ زبیر اور راجہ زبیر میں تیزی سے ایک دوسرے کو قریب آئے تھے۔

راجہ زبیر ایک بڑے ناگینوں ہی نہیں تھا بار شاہ خراج اور بارشاری آدمی تھا۔ سواہاں سائیز پر اس کی اپنی زمینیں تھیں اسوں کے بغاوت تھے۔ قس غارم تھے اور ہر سال اپنی اپنی ہوتی وہ ستوں یا دوں کو لپٹا جاتا تھا۔ خوب موقع ملتا ہوا تھا۔ شاہ زبیر کو راجہ زبیر بہت پسند آیا تھا۔ کراچی میں ایک راجہ زبیر وہ شخص تھا جس کے ساتھ شاہ زبیر کے تعلقات بہت گہرے تھے اور وہ بڑے بڑے کے ہر حال میں راجہ زبیر سے ہی مشورہ لینا تھا۔ کئی دفعہ گھوڑوں نے راجہ زبیر کے مشورے سے کی تھیں اور ان میں سے کامیابی ہوئی تھی اپنی اپنی فوج کے لئے کردہ دھولوں کو لے کر ایک بڑے بیڑے میں تھے۔

چند سال پہلے میڈم سفینہ اچانک سے اپنی بیٹی کے ساتھ کراچی آئی تھیں۔ نہ ان عرفانہ بی بی نام کی بیٹی کے حسن نے اور اول کو لیا۔

راجہ زبیر نے شاہ زبیر کو میڈم سفینہ سے متعلق تفصیل بتائی۔

”اس کا ماضی کیا تھا۔ وہ لون گئی۔ اس کے آئی سے آئی سے متعلق کسی کو تو علم نہیں لیکن بہت جلد کراچی کے اونچے طبقے میں وہ پہچانی جانے لگی خاص طور پر مردوں میں۔ اس کی وجہ وہ لڑکیاں تھیں جنہیں وہ اپنی بھانجی سمجھتی یا دشت دار کا پر کرتی تھی بھول اس کے بھائی کی غرض سے اس کی سیکس تھم رہی ہوئی ہیں۔ اس کے کراچی آنے کے

چند ماہ بعد ہی یہ لڑکیاں اس کی کوٹھی میں نظر آنے لگی تھیں۔ یہی طرح بار لڑکیاں آئیں۔ اور جیسے ہی دو تین لڑکیاں اس کے گوشہ میں موجود ہوتی تھیں۔ ان چند سالوں میں کئی لڑکیاں آئیں اور پہلی تھیں۔ پر اپنی لڑکیوں کی کمال جلی جاتی ہیں اور کئی کمال سے آتی ہیں۔ ہم نے بھی کونج نہیں لگایا۔ میں کام کھانے سے کام لے بیڑے سے نہیں۔“

راجہ زبیر نے قہقہہ لگایا۔

”کچھ دوستوں کا خیال ہے وہی اور عرب ریاستوں میں اسمگل کر دی جاتی ہیں واللہ اعلم۔ کسی دن ان چلیں گے جہیں بھی میڈم سفینہ کے منتظر ہیں۔“

”میں یہاں جا کر کیا کروں گا۔“ شاہ زبیر کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”جو ہم کریں گے۔“ راجہ زبیر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

شاہ زبیر کا ذکر شروع ہوا۔ دوست بار کا ذکر گھر آئے تو کبھی کبھار شہر سے ایک دو گانے بجانے والی لڑکیاں بھی آجاتی تھیں لیکن اس کو بے تکہ بھی نہیں لگتا تھا۔ لیکن یہاں زندگی قدرے مختلف تھی۔ حلقہ احباب میں کی لوگ راجہ زبیر حسین سمیت بڑے شہین مزاج تھے۔

”ہمارے کسی بھائی کا نانا تبدیل لپٹا جائے۔ ایک سی ڈا نقد چھتے چھتے اپنے صاحب نہیں جاتے ہو۔“

راجہ زبیر نے اس کا کیا تھا۔

شروع شروع میں وہ شاہ زبیر نے راجہ زبیر کی دعوت کو انور کیا لیکن ایک روز راجہ زبیر سے میڈم سفینہ کے ہاں لے گیا۔

”اگر وہ آواز نہ چاند نکل جائے میرے غریب خانے پر۔“

میڈم سفینہ نے ہمار خوش استقبال کیا تھا اور شاہ زبیر پر خصوصی توجہ دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد میڈم سفینہ نے ایک لڑکی کو آواز دی تھی۔

”اگر رشتہ ختم نہ ہو تو میرے سوا میرے سمانوں کی خاطر ذرا متعجب کرو۔“

میڈم سفینہ نے شاہ زبیر کی طرف دیکھا۔

”یہ رشتہ ختم نہ ہو تو میرے سوا میرے سمانوں کی خاطر ذرا متعجب کرو۔“

”یہ رشتہ ختم نہ ہو تو میرے سوا میرے سمانوں کی خاطر ذرا متعجب کرو۔“

”یہ رشتہ ختم نہ ہو تو میرے سوا میرے سمانوں کی خاطر ذرا متعجب کرو۔“

راجہ زبیر نے شاہ زبیر کے ہاں دوش پہن لیا۔

”بھئی اپنی میڈم سفینہ بوسل والی ہی بیٹی تھی۔ بوسل کوئی نہ کوئی ان کا ہاتھ ٹھہرا ہوا ہے۔“

”ہیں راجہ صاحب میں بات کیا ہی نہیں ہاں ہاں کے لیے خواہ ہوں۔“

تب یہ شاہ زبیر کی نظر لاؤ راج میں آئی بیڑوں کی طرف اٹھی تھی۔ وہ نہ جانے کون تھی جو دھیرے دھیرے بیڑوں سے اٹھ کر اتر رہی تھی۔ ایک کچھ کو شاہ زبیر کی نظر پر چڑھ گیا تھی۔ اتنا حسن نہ لپٹا تھا قیامت ڈھکا ہوا۔ میڈم سفینہ نے شاہ زبیر کی نظروں کے تقاب میں بیڑوں کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی حیرت انگیز نظر پڑی۔

”میری بیٹی کے ہاں ماز کر رہی ہے۔“

”نارے بیڑوں سے اتر کر ایک لپٹا پڑا ہی نظر شاہ زبیر پر پائی تھی اور راجہ زبیر کی طرف کچھ کر مسکرائی۔“

”کچھ نہیں آپ راجہ صاحب۔“

”اللہ کا کریم ہے۔“

”ہاں کس جادو جادو جادو۔“ میڈم سفینہ نے پوچھا۔

”اپنی اہل قوت میں لیکن شام کو مجھے اپنی ایک دوست کی طرف جانا ہے اس کی منگنی ہے۔ شام کو آپ نے

میں نے یہ سب لڑکیاں لہسن نہ نہیں بڑی تھیں۔ میڈم کو بھی کہیں جانا تھا۔ میڈم نے ان کو اسے کہہ دیا کہ وہ یہاں سے چلیں۔

میں نے ان کو بوجھ کیا کیا اور اچھے بڑے زینے پوچھا تھا۔

میں نے ان کو کہا کہ ان کو لے کر آؤ۔

میں نے اسے اپنے کمرے کے سامنے بیٹھ کر ڈاکا دیوڑھے پہنا دیے۔ وہ کھڑا ہو کر کہا: "میں جیلا میں آ گیا ہوں۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہنس پڑا۔

میں نے بڑی مشکل سے اجازت دی۔ میں نے بتایا کہ میں سیلیوں کے ساتھ تھوڑا گرام ہے۔  
 ٹھیکہ کے لیے ایک پیش کروں۔ "جہول چاہے۔" دل و جان سب حاضر ہوئے۔  
 شاد بہ بہہ رہیں گے۔ ہوا بہا تھا۔ آدھرا سراس کا رازدار اور مجھ سے کوئی تھا۔  
 ہر گز نہ کہیں گے۔

ہوائے اپنا ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھا۔  
 ”ہو جاؤ گئے۔“ عشاء نے سہمے خوش تھا۔  
 ”یاد رکھیے گا اپنا بیات۔“ عدائے مسکراتے دیکھا بیوٹ کی طرح اس کا حسن جلیان گرا ہوا تھا۔  
 ”کو تو کھو لہو۔“ ”میں اعتبار ہے مجھے۔“ عدائے کی دیکھ رہی تھی۔  
 ”جو میں نہیں بلکہ کر دالی ہے۔“ عدائے نے پوچھا۔  
 ”میرا اپنا بیات ہے۔“ عدائے نے کہا۔  
 ”مگر میں اس کو لہو لہو میرے نام کر رہی تو۔“  
 ”کو تو ابھی اس پر لٹ جاتے سے پہلے اس نام پر۔“ لکھ دوں۔“  
 ”میں نہیں بلکہ کر دالی ہے۔“ عدائے نے کہا۔

[illegible]

”مزمروا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“  
 کیا پاں چپک کرے گا تو رنے مزمروا کی طرف دکھا۔  
 ”ہاں۔“

انہوں نے چونک کر اناؤر کو دکھا۔  
 ”لیکن مجھے آپ ٹھیک نہیں لگ رہیں مزمروا۔“  
 ماؤر نے کالی بند کر کے ٹکلی پر رکھی۔  
 ”اور پھر پریشان بھی لگ رہی ہیں۔“  
 ماؤر نے انورا میں دیکھا۔  
 ”ان کی آنکھوں کے پونے سو بے ہوش تھے اور چوہا بوا تھا۔“  
 ”نہیں نہیں تو۔“

انہوں نے مسکرائے کی کوشش کی۔  
 ”تپا نہیں کیں کئی دنوں سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔“  
 ماؤر نے دوسری کالی اٹھا کر کھولی۔  
 اس وقت وہ دونوں اسٹاف دوم میں ایک تھیں۔ دونوں کے بیڑی فری تھے۔  
 ”یہ بھی غیبت ہے کہ کبھی کسی بیڑی اٹھا لیا جاتا ہے اور نہ تو بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا ہے۔“  
 مزمروا نے ماؤر سے کہا۔  
 ”ہاں تو ہے۔“

”میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی تم پر پھوں کہ تم نے لی ایف کے لیے کیا کیا؟“  
 ”کچھ بھی نہیں مزمروا۔“ ماؤر نے مزمروا کی طرف دکھا۔  
 ”وقت ہی نہیں ملتا کہ کسی سے مہلکات لول کہ پراپیٹ کیسے ممکن ہے۔ لوہن پیورٹی کا تو خرچ بہت ہے۔“

”جی صوفی ہوں ماسٹر ڈکولن۔“  
 ”صرف سوچ نہیں ماؤر کچھ کر لو۔ ایسے پراپیٹ اسکول کی جانب تو خراپ ہے۔ سارا خون نچوڑ لیں گے۔ اور خوفناک چند روپے میری ایک جاننے والی ہیں جو ٹرنڈ اسکول میں جاب کر رہی ہیں میں ہزار تنخواہ ہے ان کی اور جڑے الگ۔ اور تمہیں تو چاہیے تھا کہ پہلے پریکٹری ایف میں ایک سال لگا لیں پھر آرام سے جاب کر لیں۔ چھوٹے بین بینا میں نے کبھی جو خواب دکھ کر وہی ہوا اس کے لیے تو ضروری تھا کہ تمہیں ابھی پناہ ملے یہاں دو سال ضائع کر دیے تم نے۔“

مزمروا کی باتوں سے اس کا دھیان کاپوں کی طرف سے ہٹ گیا تھا۔  
 ”شکر ہے کہ وقت اچھا ملا لڑی رہا ہے۔ مضمون تو اپنا خرچ نیٹھن سے نکال ہی لیا تھا۔ بہت کم ایسا ہوا تھا کہ اسے رقم کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب تیرا سال شروع ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ دو سال کی بات ہے کہ ریجنٹر میں عمل ہونے کے بعد میں نے نہیں جاب مل ہی جاتی ہے۔“

”نزل کی سبیل میں کئی مہینے کا تو بہت خرچ ہو گا۔“  
 مزمروا نے پوچھا۔  
 ”ہاں ہاں نہیں۔“  
 ”وہ جی۔“  
 ”نزل کو اس کا شرب بھی تو ملتا ہے اور پھر حنہ خاں ہیں۔ انہوں نے ماں سے کہہ دیا تھا کہ اس کی فکر نہ کر۔“  
 یہ میری ذمہ داری ہے پھر مجھ کی اہل دل میں بیٹوں بعد دو تین ہزار بجوای دیتی ہیں اسے۔ حالا کہ حنہ خاں بہت متح کر گئی ہیں۔“

”چلو ابھی جا۔“

مزمروا نے کہا۔

”اس طرح کچھ پوچھ تو کم ہوا تمہارا لیکن ماہ تم نے کبھی اپنے حلق بھی سوجا ہے؟“

”میں نے حلق کیا مزمروا؟“

ماؤر کی آنکھوں میں کدھر بھر کے حیرت اتری۔

”میں نے حلق کیا۔ ساری زندگی یوں ہی تو نہیں لڑا رہی تبا۔ ابھی موی والی اور نڈلی تو چھوٹے ہیں ان کی بڑھائی مکمل ہونے تک تو تم دو موی ہو جاؤ گی اور پھر تمہارا اتنا انتظار نہیں کرے گا۔ جانو امیری ماؤ تو تمہوں کے جاب کرنے کے بعد تم جاب چھوڑ دو۔ یہ وقت ہے کہ تم شادی کر کے نیا گھر بنادو۔“  
 خضر عمر کے آؤی لمے نکاس کا انتظار کر سکتا ہے۔ یہ یقین تھا لیکن شاید آئی نہ کر سکیں۔  
 اس کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار تھی۔ ایک اپنی خوشیوں کے لیے وہ اب سب کو بچ رہا مں تو نہیں چھوڑ سکتی تھی نا۔

ابھی چند دن پہلے کی بات تھی جب علیحدہ سے اسے بتایا تھا۔  
 ”ارہا کر میں بدی چھوڑی پک رہی ہے۔“  
 ”کیا؟“

اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔  
 ”ہمارا آج کل کلیر اور خضر کی شادی کا شوق چرایا ہے۔ بس صبح و شام ہی ذکر ہے سب سے خاموش رہے کچھ دن تو لیکن پھر انہوں نے خضر بھائی سے پوچھ ہی لیا کہ ان کے کیا ارادے ہیں اور پتا ہے خضر بھائی پہلے تو خاموش رہے لیکن کہا کہ لیجان ان کا شادی کا ارادہ نہیں کر لیا ہے۔ شادی کی بہترین عمر کی ہے۔ مہر پڑھ کے اسے سفینش ہو چکے اب شادی کر لے۔ ہمارا ارادہ تمہاری اور بھینا کی اس بھنی شادی کرنے کا ہے۔“  
 وہ دھڑک رہے تھے کہ دل کو سنبھالے علیحدہ بات نہ رہی تھی علیحدہ حسب معمول تفصیل سے بتا رہی تھی۔  
 ”دوستا ہے جب سبیلے پوچھا خضر بھائی سے تمہاری اپنی کوئی بات نہ تو تازہ تو خضر بھائی نے کیا کہا۔“  
 وہ انور کی کیفیت سے لطف اٹھا رہی تھی۔  
 ”کیا؟“

اس کے یوں سے ہنسنے لگا۔  
 ”انہوں نے کہا۔“ چلے آئی پناہ نہ تائیں۔“  
 کیا بات تھیں۔

”جیت استا ہو یا راسر حال اپنی ماما کی بیٹہ کا تو تیار ہے جسے۔ کوئی اہل تمہاری خالہ جان واپس کیڑا جا بنگل ہیں۔ سبیلے کے چھوڑ کر گئے پر لیجان اس میں لاپا یا آئی تھی۔“  
 اور خضر بھائی کے یوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔ ”انتہہ نہ کرے۔“ سبیلے نے قہقہہ لگایا تھا اور جہاں تک میری بیٹہ کی بات ہے تو مجھے اور رند ہے۔“ اور خضر بھائی کو کھو مضمون سے بڑھانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ ”پاپا! مجھے آپ کی بندہ پر کوئی اعتراض نہیں۔ یقیناً آپ نے میرے لیے بہترین سوچا ہو گا۔“

اور ماؤر نے تھیں دیر کا راسا ساس باہر نکالا تھا۔  
 ”خوشی تک کہ میں کچھ ہی مچھوڑی۔ سبیلہ اور پاپا کے اکر ات گرا گری۔ سہر حال اب دو تین روز تک ہمارا پاپا کا مقصد ہے کہ تمہارے گھر آئے والے ہیں۔ سہر حال بہت سی ماما کی ہی ہوئی۔ فاضل ہوتے ہیں میں تمہاری طرف ہمارا کہ جس خبر کروں۔“ اور ماؤر کے چہرے پر اس وقت جو رنگ بکھرے تھے انہوں نے اس کے دل کی چٹکی کھائی تھی تب سبیلہ تو علیحدہ سے پوچھا تھا۔



میرے دو بچے ہیں جن کو اور اپنا رونا بچوں کی وجہ سے آستان اکامیر لے کر آئے ہیں۔ میں نے یہ کہنا سنا ہے کہ یہ بچے کبھی نہیں آئے۔

”لیکن میں طلاق لے کر کیا کروں گی مراد پاپا زیادت کرنا۔“

”وہ بڑی سچی بات ہے۔ لیکن جو کچھ خاں جی کے بعد مراد نے کہا تھا۔“

”نیک ہے اگر تم اپنی باتیں چاہتی ہو تو میں خرچ کے لیے رقم بھیجتا ہوں گا لیکن جب بھی تم نے کوئی فیصلہ کرنا ہے تو مجھے بتا دینا۔“

پہلے ایک آس تھی کہ مجھے تو مراد انہیں بلاوے گا اور اب تو کوئی امید ہی نہیں رہی تھی۔ کتنی بار ان کا جی چاہا تھا ان کے پیچھے سات آٹھ دنوں میں کہ وہ ماہور سے اپنا دل شیر کر لیں لیکن پھر سوچا کہ کیا فائدہ بھرم جب تک کام نہ ہوئے گا۔ انہیں بل تھا کہ کتنا خستہ ہوئے کہ کوسہ کرنا چاہتا تھا۔

ماہور نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالتے ہوئے سوچا۔ مراد کے ساتھ کچھ نہ کچھ مسئلہ ہے ضرور۔ گو وہ اسے شریک نہیں کرنا چاہتیں۔ خیر ضروری تو نہیں کہ ہر بات ہر ایک سے ڈسکس کی جائے۔ مجھے بھی زمانہ کر رہا تھا کہ اس سے میرے کاپی اٹھائی اور چیک کرنے لگی۔ مراد بڑے بڑے اعتبار اور آگے والے آنسوؤں کو دیکھ کر اسے کھینچ کر اپنے کمرے کو لے گیا۔ وہاں پر اپنی جگہ کر بیٹھ گیا اور ماہور کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے آہستہ سے کہا۔

”تمہاری بہانیاں کہ حقیقت آج کل اسلاف میں بڑی سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔“

”کیا؟“

”وہ جو کچھ۔“

”میں چار دن پہلے کی بات ہے مراد صاحب کی گاڑی لیٹ آئی۔ وہاں ہوا لے کر اوڑھ میں بیٹھی تھی۔ کلرک آفس کے باہر موجود تھا۔ وہ بے ہوش دنگ تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا ساوا اور کوئی نہیں تھا۔ اپنے اپنی اپنی گاڑیوں کے انتظار میں کھڑے رہ کر اوڑھ میں بیٹھ کر اسے ہاتھ دیا اور صاحب کے آفس میں گئے۔ وہاں سے ڈاک صاحب شعبے میں لوٹے ہوئے باہر نکلے۔ مس ہاتھ پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے آ رہی تھی۔ مراد صاحب نے خود اس میں دوڑتے دیکھا۔“

”تو؟“

”ماہور نے منوں ایچا کیا نہیں۔ ڈاک صاحب نے بے عزتی کر دی ہو گی۔ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی سینئر تجربہ کار جو تیز ایک تو بے چاری مس ہاتھ کا کام کرتی ہیں۔ اس پر ڈاک صاحب نے الگ۔“

”میں یہ بات نہیں سمجھتا۔ ماہور نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ وہ اس کام کی وجہ سے ڈانٹ میں پڑی تھی۔ کوئی اور بات ہے۔“

”کوئی اور بات کیا مراد صاحب؟“

”ماہور نے حیرت سے پوچھا۔“

”کیا تھا کل کچھ میں چاہتا تھا۔“

”مراد صاحب نے بھی قدرے حیرت سے پوچھا۔“

”میں نہیں۔“ وہ ماہور نے بھی مسرہ کیا۔

”کیا کچھ تجویز کرتی ہیں مس ہاتھ اور ڈاک صاحب کے درمیان کوئی پلکرتھا۔ کسی نے مس ہاتھ اور ڈاک صاحب کو ایک بار تو اس کی اسکاٹھا بھی لکھا ہے اور یہ بھی سنتے ہی آئے کہ ڈاک صاحب مس ہاتھ سے ڈاکر شادی کرنے والے تھے لیکن اسکاٹھا نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ ہیں تو پھر اس بات پر ہے۔“

”میں مراد صاحب۔“ ماہور کو گھبراہٹ میں کیا۔

کا بھی براہم تھا۔ وہ دن بھر میں بھٹکا ایک سو سی باقی تھی۔ اب ایک سو کڑے ہونے لگتے تھے لیکن وہ تین دم اٹھانے کے بعد ان کے گھٹے مڑنے لگتے تھے۔ ان کا رخ خیال تھا کہ ابھی کچھ وقت اور لگے گا پھر وہاں کے سارے چلنے لگنے کے اور ایک وقت آئے گا کہ وہ پھر اس کے چلنے کے لیکن اس کے لیے ان کی مسلسل تھراپی ضروری تھی۔ پھر اپنی ڈیڑھ اور سوئی کی تعلیم۔ منوں ایچا کیا کیا کرے گا۔

نصیر احمد خان نے یہ تو انصاف حیدر سے کہہ دیا تھا کہ ان کو کم از کم دو سال تک ان کے لیے شادی کرنا مشکل ہے اور انصاف حیدر نے فوراً ہی ان کی بات مان لی تھی۔

”نیک ہے نیک ہے۔ دو سال بعد سی۔“

گو سہیہ آئی ہے کہ ان کا تھا کہ ان کی خواہش تو سال بھر بعد رخصتی کرنے کی ہے۔ تب نصیر احمد خان نے اسے کھاتھا۔

”تھانہ میں چاہتا ہوں منوں کی تعلیم ختم ہو جائے اور وہ جاہ کر لے تو پھر زیادہ سہولت سے ماہر رخصت کر سکیں گے۔“

”رخصتی کی باتیں بعد میں طے کر لیں گے یا راضی تو وہ اس نئی رشتہ داری کی بات کریں۔“

انصاف حیدر نے موضوع بدل دیا تھا۔

”ابھی تو دو سال ہیں۔ منوں پکھن جانے پھر خضر سے خودی بات کروں گی۔“

اس نے خود کو سمجھایا تھا۔ آج اس سے کیا پریشان ہوئے اسکول میں چونکہ اس کی صرف مراد سے ہی مری دوست تھی اس لیے اس نے انہیں اپنی اور خضر کی بات سے ہونے لگا دیا تھا۔ جس پر انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اماں نے لاہور میں نزل اور حیدر خالہ کو بھی بتا دیا تھا۔ سب نے یہ خوشی کا اظہار کیا تھا اور نزل نے تو فخر کر کے خاں اس کا راز لگا دیا۔ لاہور جا کر وہ خاصی تیز ہو گئی تھی۔

”کمال ہے ماہور۔ کوئی خالہ کمال سچ میں آیا اور نہ ہی کسی نے کوئی روڑا اٹھایا اور ماہور اپنی خضر بھائی سے منسوب ہو گئے۔ حالانکہ مجھے سہیہ آئی کی طرف سے خلاصہ ہوا تھا۔“

”تم یہ بات شیخ ہو گئی ہو۔“

وہ جھنجھکی مٹی تھی۔

”بات تمہاری ملے ہوئی ہے اور میں حیدر خالہ اور قائم انکل سب مجھ سے نہایت ناگوار رہے ہیں اور لگتا ہے آج حیدر خالہ کی کتاب دے گی۔“

ان دو سالوں میں نزل کے اندر بے پناہ اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ پہلے تو نزل ہے۔

”ماہور کی بات۔“

مراد صاحب نے پھر پوچھا تو وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”لیکن میں ابھی تو کچھ بتا نہیں۔ دعا اب آگے۔“

”وہیے اچھا ہے۔ ایک مختصر قریب قریب میں مضابطہ طور پر رشتہ طے ہو جائے۔ بلکہ میرے خیال میں تو نکاح ہو جائے تو بہتر تھا۔ لوگوں کو بدلتے رہیں گے۔“

مراد صاحب نے رائے دی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“

مراد صاحب نے زرب کما اور سوچا۔

”جس کو حقیق تو زیادہ ہو اس کے لیے کوئی تعلق بھی مضبوط نہیں ہو۔ وہاں ہے تو ان میں توڑ ہے۔ جیسا کہ مراد نے کیا۔ کتنی آسانی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ اگر تم طلاق لینا چاہتی ہو تو مجھے تو کچھ بھی اعتراض نہیں۔ مجھے خودی ہو گی اگر تم اپنی اپنی زندگی شروع کر سکو۔ جہاں تک میری بات ہے میں نے نہ صرف شادی کر لی ہے بلکہ





عزرا بخیر خاموش ہی رہیں۔ خود انہیں پہلے دن سے ہی آصف کی بھابی کی گفتگو اور رویہ پسند نہیں آیا تھا اور انہوں نے ساری بات میاں صلاح الدین سے کہی لیکن۔۔۔  
انہوں نے ایک آسف بھری نظر میاں صلاح الدین پر ڈالی۔

کاشان میں ٹھوڑی سی ٹیگ ہوئی اور وہ ان کی بات سن کر اس پر غور کرتے تو آج یہ صورت حال نہ ہوتی۔ کئے  
ای سو سے دل سے چٹے تھے۔ کیا خبر آصف نے وہاں شادی کر لی یا کوئی اور مسئلہ ہو۔ آصف کا ان سے تو کوئی  
رابطہ نہ تھا۔ حالانکہ وہ ایک بار سفر نے ان سے کہا تھا کہ اے جان ابی آصف کا خون نمبر لے لیجئے گا ان سے کہہ بھی  
بکھار خیر خیرت معلوم کرتے ہیں اس طرح تعلق مضبوط ہو گا اور کم از کم وہاں کے رابطے میں رہے گا لیکن  
جب بھی انہوں نے اس کی بھابی سے نمبر لیا تھا انہوں نے ٹال دیا۔ جب سے انہم کا نکاح ہو تھا وہ ایک دہا راس  
کے سرالائی تھیں۔ ہاں آصف کی بھابی کا قاعدہ کی سے بھننے میں ایک چکر لگا بیٹھیں اور اس کا ٹھکانہ وہاں کھسکا رہی  
جاتی تھیں لیکن کل سال ملاح الدین نے انہیں بطور خاص اور بھرے کو کہا تھا کہ یونہی کہہ دو تو اس سے ہاتھ  
رخ کر کے چھٹی سوچ رہے تھے اور ان کی بار بار انہوں نے غذا پر ایکم سے کہا بھی تھا کہ نکاح کے بعد جراتا عرصہ  
نہیں کرتے کیا تم نے معلوم نہیں ہے کہ وہ معلوم نہیں ہے کہ وہ خاموش کیوں بیٹھے ہیں جب کہ آصف کی کوئی وجہ ان  
کو کا نہیں ہے کہ وہ میں ان انتظار کے بعد شادی کرے

”وہ کہہ رہی تھیں کہ آصف پہلے جہاں کام کرنا تھا وہاں سے چاہ بچھوڑ دی ہے اور کسی دوسرے شہر میں چلا گیا ہے اور ابھی تک اس نے نیا نمبر وارڈ نہیں ملا۔ میں جب دھڑکے گا تو وہ دس کیس کی۔“

”ہوں۔“ یہاں صلا اللہ زین نے ہنگامہ مچا دیا۔

”میرا تو خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کر ٹال رہی ہیں، ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کیس پاس آصف کافون نمبر نہ ہو۔ حالانکہ ایک دوا پارک میں بھی میں نے نمبر لگا تھا۔“

”ہوں۔“

میاں صلاح الدین کی گمراہی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔  
 ”آپ حاجی صاحب سے بات کہیں نہیں کرتے یہ رشتہ انہیں کی وساطت سے تو طے پایا تھا۔“  
 ”ہاں نہیں بھی کبھی سوچ باہوں کے آج ان کی طرف جا کہبت کرلوں۔“  
 ”دور اگر ممکن ہو تو ان کے ساتھ جا کر آصف کے بھائی سے بات کرلیں۔ وہ اپنی بیوی کی نسبت کچھ معقول  
 انسان سمجھتے ہیں۔“ آپ میرے کپڑے نکالے، میں ہاتھ لے کر گناہوں حاجی صاحب کی طرف۔  
 وارڈروب سے میاں صلاح الدین کے کپڑے نکال کر وہ پر لٹکیں۔ سب اس وقت اپنے اپنے کمروں میں  
 تھے۔ چھٹی کافن تھا وہ کھانے کے بعد وہ ٹوکسا ساتھ لے کر حاجی صاحب کے کنبے پر آصف کی بھانجی سے بات  
 کرنے چلی گئی تھیں اور وہاں زیادہ نہیں بیٹھی تھیں، کیونکہ آصف کی بھانجی بابا رانا میں سناری تھیں کہ ان  
 کی لہاں کی کیفیت ٹھیک نہیں ہے اور اس میں ادھر جاہلوں اور گروہ زن آئیں تو اب تک وہ جاچکی ہوئیں۔ وہ صرف  
 آدھ گھنٹہ نہیں ہوئی وہاں اور کچھ دیر انہوں نے رخصتی کی بات کر لی تھی اس لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔  
 ”اے اے اے“ بیٹھے۔ چائے بنوائی ہوں۔“

آصف کی بھابی نے انہیں اٹھنے کو کہہ کر کہا تو انہوں نے معذرت چاہی۔  
 "۳۴ وقت تو آپ کو اپنی والدہ کی طرف جانا ہے چائے پھر کبھی پیس لیں گے"  
 ان کا جی بہت مکر رہا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا کہ کہیں کچھ غلط ہے۔ دو سال سے وہ انہیں کے لیے دعائیں کر رہی

اس کے لیے ایک اچھی اور بہتر زندگی کی لگن نہیں کیا ہو تو والدین کا  
 الحاح نے نہ تو اس کے دیوار پر موجود خاک پر غور فرمائی یا بجے والے تھے  
 اس کے غزالہ پسند نہیں کرتی تھی کہ کوئی اس کے آرام میں مداخلت کرے۔ خاص  
 طور پر بہت ناراض ہوتی تھی کیوں کہ میاں صلاح الدین کا حکم تھا کہ اگر وہ غزالہ  
 کو اپنے پاس سے دور کر دیں تو وہ بڑے کمرے تک آئیں اور ہوئے سے دستک  
 کے ساتھ میں کتاب لے کر عذر ایسے کو کہہ کر حیران ہوں۔

”مرے اہی جان! آپ آئیے نا خیریت ہے۔“  
 ”تم سو تو نہیں رہے تھے بنا!“  
 ”ابھی تک جاہزی لکڑی تھیں۔“  
 ”میں سمجھتا تھا کہ آئے نا، آجائے اندر۔“

[illegible]

”غیر متعارف! با جان اس وقت شہنشاہ کیل جا رہے ہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟“  
 غزالہ کی بجائے مہر نے پوچھا۔  
 ”خاص بات کیا ہوئی ہے بیٹا۔“  
 مہر راہیکہ نے افسردگی سے کہا۔

”ہاں“ صحیح ہے، لیکن اس طرح طریقے سے ان سے بات کر سکیں گے رشتہ بھی  
”شکر“ طرہ کے ساتھ ان کو نہایت اچھا۔“

میں نے ایک تفصیلی گزارش پر ڈالی۔  
 ”میرا جان اس کی عبادت ہے فضول ہوئے کی۔“  
 ”غور والے نے جھک کر کہا۔  
 ”میرا ایکم۔“

وہ منہ ہی منہ میں بیڑا لے ہوئے میگزین بیڈ پر پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی تو

”تم بھی چلو گے۔ اے امی جان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے کئی دنوں سے مریض  
 ”نہیں، مجھے پڑھنا ہے۔“ بھرتی سختی سے کہا۔  
 ”تم نے جانا ہے تو چلی جاؤ۔“  
 ”آپ اب کون سا پڑھا رہے ہیں؟“ ان کا سارے جملے اے الگ۔“

”نہیں یہاں دیکھو کہ رہا ہے اس کی پرہیزی کا حرج ہوتا ہے“  
عذرا بیگم نے محل سے سمجھایا۔

”کی ہاں بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں۔ پرہیزی کا حرج صرف میرے کیے جانے سے ہوتا ہے ورنہ نہ خالہ کی طرف تو تھاگ بھاگ کر چلیا کرتا ہے۔ اچھی اگر ہوں آئے تو ساری پرہیزاویں بھول جائیں گے۔“  
لیکن میں ہنسنے لگا۔ ہوشیار نہ پ کر اسے دیکھا لیکن عذرا بیگم کے خیال سے ضبط کر لیا اور نہ کچھ جواب دینے عذرا بیگم کی طرف متوجہ ہو گیا اور نرمی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔  
”کچھ پریشان نہ ہوں اُمی جان! انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حاجی صاحب قید یا بہتر طریقے سے معاف ہو پھیل کر رہیں گے۔“

عذرا بیگم نے ایک بے بسی کی نظر میسر پر ڈالی اور تجزی سے باہر نکل گئیں۔ ہوش کے ضبط نے ان کے دل پر اڑ لیا تھا۔

”دیکھنا کھینکا رہتا تھا میرا بچہ اور اب تو مجھے ہنسنی بھول گیا۔ کیا خبر تھی کہ ایسی بہاری صورت اور منہ میں اتنی لمبی زبان ہوگی۔ ان دو سالوں میں غزالہ کا شہر چلا تو قیسم بالکل ہی ختم ہو گیا تھا اب تو ان کو سب کے سامنے ہی میسر سے زبان چلنے لگی تھی۔ بچی تو بچی لگتی تھی زبان کاٹنے لگ آئے ہوں۔ تعلیم و تربیت دونوں کی ہی کمی تھی۔ وہ بچی تو عذرا بیگم بالکل خاموش ہو جاتی تھیں۔ ہوشیار بھی سمجھتی تھیں کہ دھڑکڑ کیا کرے اور سہارو محبت سے اسے سمجھایا کرے اس کا قصور نہیں ہے حد سے زیادہ لاپرواہی سے اسے خمدی اور مدہم چھٹھایا ہے۔ تم بہار سے کھٹاؤ گے تو ہونے ہونے سمجھ جائے گی۔ برسوں کی عادی عادتیں آسانی سے تو ختم ہوتی ہیں لیکن میسر کا خیال تھا کہ غزالہ سمجھنے والی تھی نہیں ہے اس کا بی جانتا تھا کہ وہ اس کے حرج کی طرف نہیں کرنا ہے اسے ساتھ لے کر گھومے پھرے مخصوص ”میکے“ کے عزیزوں کے ہاں اور اس کی بے سروا اور بے ٹکی پائش چوتنا سولہ فیصد سرسرا والوں کی برائیاں پر مبنی ہوئی تھیں دوپٹی سے سے اور اس کی ہاں میں ہاں ملائے کہ واقعی اس کی بہنوں بھائیوں اور ماں باپ میں ہیں بے برائیاں موجود ہیں اور یہ سب میسر نہیں کر سکتا تھا تو وہ اس پر الزام لگانے لگی تھی کہ وہ دوسری لڑکیوں میں پڑتی تھی یہاں سے غرض زندگی ایک عذاب ہے کہ نہیں سمجھتی اس کے لیے غزالہ پر کسی کے بھاننے کا اثر نہیں ہونا تھا۔ دو سالوں میں اس کی دو نہیں بدلی تھی، وہی چلی کی ہاں میں تھیں جو پہلے کرے کے اندر ہوتی تھیں اب وہ سب کے سامنے بیٹھ کر کھتی تھی۔ میسر شرمندہ سا سوچا تھا کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اوری اور بیٹھیں اس کی وجہ سے پریشان ہوئے۔ پختہ وہ کوئی کوشش کرنا تھا کہ سب کے سامنے وہ دونوں نارمل اور خوش رہیں۔ اتنی ہی غزالہ اس کی کوئی پرہیزی یا پھیرتی تھی۔

”اُمی جان کے سامنے تو اپنی پانی کا تو ہیں رکھا کر غزالہ۔ اتنی ہاں نہیں سمجھاتی ہے۔“  
عذرا بیگم کے جانے کے بعد میسر نے لا شعوری کو کوشش سے اپنے کچے کو زبردستی کی کوشش کی۔  
”میں نے کیا غلط کیا اور تمہاری اہل کو کون سے پتہ چار دیے ہیں۔ نے یہی کہا تھا کہ پرہیزی کا مہماں صرف میرے کیے جانے کے لیے ہے۔“

”ہاں ہے تو پھر کیا کر لو گی تم۔“  
میسر نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔  
”میں نے کیا کرنا ہے میرے تو نصیب یہی مل گئے جسے جان تمہارے گھر کی تھی۔“  
اس کی آواز پہلے سے زیادہ اونچی تھی۔ میسر کا ہاں کہہ کے نصیب تمہارے نہیں میرے خراب تھے جو تم جیسی بد زبان عورت میرے بچے کی مبینہ مکمل ضبط سے اس نے سونو لیا اور اپنی رائے تک نہیں کی طرف بڑھ گیا۔ غزالہ کچھ دیر کرے سے کچھ بچ چکھی اسے غصے سے دیکھ کر ہی پھر ایک جھلے سے وارڈ وہ کھل گیا اور کپڑے لے کر دواں دم میں گھر گئی اور میسر نے قہر ماکر لیا۔ کچھ دیر تو وہ بچی بیٹھا ہوا ڈیڑھ یکدم منتشر ہو گیا

”لہذا اس نے بدھنی کو کوشش کی لیکن کچھ نہیں آ رہا تھا۔ تب کتاب بند کر کے باہر نکل آیا۔ رمضان میں اظہار الدین کے گھر کے میں چائے نہ جا رہا تھا۔“  
”رمضان میرے لیے چائے نہ جانتے تھے۔ اس نے رمضان سے کہا۔“  
”چائے نہ پونے دی ہے میں صاحب کو بے کرب کے لیے لہا رہا ہوں۔“  
”میں اس پرہیزی کے کرے میں جا رہا ہوں وہاں ہی بیٹھ سیتا۔“  
”ہیات کر کے اس کے کرے کی طرف چلا گیا۔ اس پر ہوا زار سے بیٹھ کر اس کے کراؤں سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھ سے تھا۔ اسے دیکھ کر کتاب الٹ کر تھیکے پاس رکھ دی اور مسکرائے۔“  
”کو کو غصی اگر کچھ ملے۔“  
”میں نے تو سڑبے نہیں کیا۔“  
”ہاں کس کی ہی بیڑہ بیڑہ کیا۔“

”اُسے نہیں باکل نہیں کھلی کوئی وقت گزار کر کے لیے کتاب پڑھ رہا تھا بلند بخت نے مجھے بھی پڑھنے کا چکر ڈال دیا ہے تم نہ تو پرہیزی کیسی جا رہی ہے۔“  
”میں گزارا ہے اس پرہیزی۔“

”ایک افسردہ سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوڑا۔  
”خیر مجھے یہ کیا غزالہ سے پھر کوئی بات ہو گی ہے۔“  
”جو کوئی بات نہ ہو گی نہیں۔ آپ جانتے ہیں کیا امریکہ جانے کا ارادہ بالکل کینسل کر دیا۔“  
”ہاں یار۔“  
”انہوں نے ایک کمی سانس لی۔

”جب تک آئی کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا نہیں اُمی جان کو اس طرح پریشانی میں مجھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“  
”لیکن یہاں آپ کو اس طرح چاس نہیں کس کرنا چاہیے۔ اب جب کہ تین سال کے لیے آپ کا پر داگ چکا ہے تو آپ کو چاہنا چاہیے میں ہوں یا نہیں۔“  
”ہاں تو ہو لیکن یہ تمہیں کیا بات ہے میرے قدم ہی نہیں اٹھتے یہاں سے شاعر بھی کہ رہا تھا۔ کہ وہوں اٹھنے چلے ہیں۔ پھر ماں جان کا بھی نہیں آئی تھا انہوں نے کہا تھا کہ وہ ہر طرح کی ہالی سپورٹس گے مجھے اٹھا کر بیٹھ کا مسئلہ نہیں ہے۔ میرے اپنے اکاؤنٹ میں کافی رقم ہے اب لیکن یہاں میرا نہیں اس دل کو کیا ہوا ہے چلنے پر تیار ہی نہیں۔“  
”راز ملے آپ اپنی جاب میں بہت اونیو ہو گئے ہیں۔ آپ کو پڑھنے کے لیے جانا تھا تو جواب نہ کرتے۔“

”ہاں شاید لیکن میں جاب کرنا چاہتا تھا کم از کم ایک سال آگ کچھ رقم جمع کر سکوں گرا نے وغیرہ اور ابتدائی اخراجات کے لیے۔“

”ان دو سالوں میں میسر کے ساتھ ان کی دوستوں ایسی بے تکلف ہو گئی تھی، میسر خاموش ہو گیا اور جانتا تھا کہ میاں صلاح الدین کے صاف کہہ دیا تھا ان سے کہ وہ ان کے امریکہ جا کر پڑھنے کے سلسلہ میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ”کاش اپنا جان کے فیصلوں میں کچھ ہوش ملے۔“  
میسر نے افسردگی سے سوچا۔

”خوشیہ آج میں بہت مطمئن اور پرسکون ہوں۔ تاکہ کبھی کوئی مسئلہ نہ ہو تا مشیاع بھائی کا ساتھ ختمہ خالہ اور قلم انگلی کی محبت حاصل ہوئی اسے اور سمن کی اہلیوں سے بچن نہ رہتی۔ دو سال ہو گئے تھے سمن کا اکیف ایس ای کارڈ مل گیا تھا۔ آئے تو لا لا تھا اور میاں صلاح الدین سے سمن سے براہ راست کوئی بات نہیں کی تھی۔ اور اس کو دھ نے سمن کو بے حد پیچیدہ کر دیا تھا اس پر سپورٹ اور حوصلہ فراہمی نہ ہوئی تو وہ کبھی پرہیزی یا مجھوڑ چکی ہوئی۔

کتی ہی باروس ہارت ہو کر اس نے کہا تھا کہ وہ نہیں پڑھے لیکن اس نے اسے سمجھایا کہ وہ صرف پڑھے ایک روز لایا جان کی تیار اسکی خیم ہو جائے گی آخر کب تک وہ اس سے غدار ہیں گے  
”کیا سوچتے لگے گیار۔“

اس نے بغور اسے نہ کیا۔  
”کچھ نہیں۔“ وہ چونکتی تھی رمضان چائے نہ کر گیا۔  
”دیسے شبی بھائی چائے کم ہی کیا کریں۔“ اس نے چائے کے کپ سائیزہ نیل پر رکھے۔  
”دیکھیں تو کیا شکل نکلی آئی ہے چائے پانی کر۔“  
”کیا ہوا ہے میری شکل کر۔“  
”بھڑا رمضان کو دیکھ لگا۔“

”آئیے میں دیکھیں شبی بھائی نہ رنگ رہا نہ وہ پ نہ۔“  
”اچھا اچھا اس روز دیکھا ہوں اپنی شکل کچھ نہیں ہوا تھجے۔“  
”ہائے کھینچتی تو نہیں ہیں۔“

رمضان بڑیا دیا اور پھر نظر کیا۔ اس نے ایک جبت بھری نظر اس پر ڈالی۔  
”دیسے رمضان کچھ کم رہا ہے شبی۔“ اپنی محنت کا خیال رکھا اور اپنی ہی محنت کو جس سے صحت پر اثر نہ پڑے اور غلام کی شین سے ایک کوفت کے ساتھ ساتھ بیچل چائے کی۔  
”کیسے ٹینشن نہ لوں اسلی بھائی۔“ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے اسی چائے کے ساتھ جو بد قیزی کی ہے بی چاہتا تھا کہ۔“  
”کہا ہوا۔“

اس پریشان ہو گئے تو اس نے ساری تفصیل بتائی۔ ”بے وقوف ہے سوچے کچھ بغیر پوچھی ہے۔ تم درگزر کیا کرد۔“

”دوان نکار خوش ہو سبار۔“  
”بھڑکے کیوں پر طنزی ہی سکر ہارت ابھری اور اس نے چائے کا کپ اٹھالیا۔ تب ہی دروازے میں سے غزالہ نے اندر بھاٹکا۔“

”اب بھائی کا رخ نہیں ہو رہا۔“  
”لو طریشیں ڈو ڈو تھا موشے نہ مزارا سے دیکھا اور بغیر جواب دیے چائے کا کپ وہ نونوں سے لگالیا۔  
”آئیے کھا بھی آجائے اندر۔“  
”نہیں میں تو جاری ہوں لایا جان کے ساتھ شوخوہہ صرف یہ بتائے آئی تھی کہ میں دو تین روزا دھری رہوں گی۔ منالہ بتائی بھر کے رنگ رلیاں اپنی زہل کے ساتھ۔“ وہ واپس مڑی۔

”غزالہ۔“  
”میشی آج صبح خان رنگ ہو گئیں۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہولے ہو لایا۔  
”ریٹیکس میری جان۔“  
”کیا ہے۔“

اس نے چائے جاتے پلٹ کر دیکھا۔  
”میں نے کہا تھا نہیں کہ آج صبح منالہ تاس کا۔“  
”میں لایا ہزار بار لکھی لیکن سچ کر تکلیف کیوں ہوتی ہے۔“  
”بھڑکے چائے کا کپ میرے چٹا اور ایک دم کھڑا ہو کر اس کی طرف لپکا۔ اس نے تیزی سے بڑھ کر اس کا اٹھا ہوا ہاتھ کھڑکایا۔“

”تم کہتے ہو مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔“

اس کی آنکھوں میں پلٹے پلٹے جرت اتاری پھر وہ جوج کر رونے لگی۔ اس نے ہنسنے کا ہاتھ چھوڑا اور تیزی سے اس کے قریب آئے۔

”غزالہ! غزالہ! یہاں بھی بلایا نہ آجائے پلیر۔“ لیکن وہ وہیں دروازے کے کپاس کھڑی دھانڑیں مارا نہ کر رہی تھی۔ میاں صلاح الدین غدار کا بچہ، حسن سب بھرا کر اپنے کمرے کے باہر نکل آئے تھے اور اب اس کے گرو کھڑے پوچھ رہے تھے کیا ہو آیا ہوا لیکن وہ بونہی میں چلی جا رہی تھی۔

”نہ نہ جانے وہ کیا آواز تھی جس سے سیدہ زہنت فاطمہ کی آنکھ کھلی تھی۔ سیدہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہیں لگا تھا کہ میں کوئی زور سے چنچا تھا اور پھر کسی کے رونے کی آواز تھی۔  
”کیا کوئی خواب دیکھا تھا میں نے۔“

انہوں نے پتہ چلائی سے کہیں پوچھتے ہوئے سوچا۔  
اور سائیزہ نیل پر پڑی پانی کی بوتل سے پانی ڈال کر کیا۔ اور غور سے کچھ سننے کی کوشش کی۔ ہر طرف سنا اور خاموش تھی۔  
”نہ نہ چائے کیا قوت ہو ہے۔“

زمین و لب کی بدھم ہی روشنی میں انہوں نے کاکا پر نظر ڈال کر قوت دیکھنے کی کوشش کی۔ دن چرے تھے۔ کاکا اور اس کے لیے ہوئے پھر ٹپٹ نہیں۔ ابھی کچھ دنوں قبل وہ سب چوٹی آئے تھے۔ سیدہ اساد اور سید علی لہو تھیں اسی امتحانات سے فارغ ہو گئے تھے۔ لہذا چوٹی واپس آگئے تھے۔ ہاں شاہ زبے کو انہیں چھوڑ کر واپس پھیرا جاتا تھا۔ سید قائم کی شادی سونہ شاہرم شتیاج عسبی سے ہوتی تھی۔  
”چھوٹی کیا اتنے سارے دن ہم کیسے کرا دیں گے کچھ کا ہم ایک روز والی ہی پہنچ جائیں گے۔ پھر شادی ہو کر۔“

”نہیں نہیں قاتی قمرت آتا رہا۔“  
”یہاں کی قیامت سے رزلٹ آجائے گا تو پھر اتنا ہی ہے ہم نے۔“  
”لیکن چھوٹی کیا اب برواشت نہیں ہوئیں گے سیدہ انیاں۔ میں شاہ زبے سے زارا سے شادی سے سب سے پہلے چاہتا ہوں اپنی ٹھوڑی کی زندگی سے اس میں بھی کمزور نہ بنو لے رہیں یہ کیا پتا کل میں۔“  
”اگے مت کچھ کہنا قاتی۔“

انہوں نے انہیں ٹوک دیا۔  
”تھجے نہیں جس زندگی سے۔“  
”دور کرتا نہیں کہ تم چھوٹی کیا۔“  
وہ افسوس سے ہونے لگی۔

”دو سال چار سال آٹھ سال پھر ایک دن کو جاننا ہی ہے۔ چھوٹی کیا پلیر آپ شادی سے لپٹی جان سے بات کریں کہ میرا قصور معاف کریں۔“

”میں چاہتی ہوں کہ میں۔“  
انہوں نے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن وہ جانتی تھیں کہ وہ ایسا نہ کر سکیں گی۔ لاہور میں گزارا وقت ایک خوبصورت شہر تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اپنی پر سکون اور مطمئن تھیں۔ قاتی احمد ان کے ساتھ پھر شاہ زبے کے فطرت اسٹر اور بلند تختہ سب بیکے بیکے گھر کے قریب طرح ہو گئے تھے یہاں آتے ہوئے صرف قاتی ہی میں اسٹر اور بلند تختہ بھی بہت اداس تھے۔ اسٹر تو فرحت کا بھائی تھا لیکن بلند تختہ بھی انہیں بہت عزیز ہو گیا تھا اس دوران کا یوں ہی دل گھرایا تو وہ اسکو ساتھ سے کر قاتی کی طرف چلی گئیں۔ لاؤنج میں شاہرم اور بلند تختہ

بٹھے بائیں کر رہے تھے۔ سید قائم علی شاہ بھی وہاں ہی ایک طرف صوفے پر نیم دراز کوئی میڈیل سے متعلق بیٹھ کر دیکھ رہے تھے۔

”رے پچھو آپ۔“  
شاہراہ انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ بلند بخت کو دیکھ کر وہیں لہلہک کر گئی تھیں۔

”پھول کا آجائے نا۔“  
سید قائم علی شاہ نے بھی کوسہ ہو کر ان کا استقبال کیا۔ بلند بخت بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

”پہل ہوں شاہراہ۔“  
”رے نہیں ہمارا کوئی۔“

سید قائم علی شاہ نے آگے بڑھ کر اپنا بازو اس کے گرد مائل کرتے ہوئے زینت طاہر کی طرف دیکھا۔  
”پھول کیا یہ جو بلند بخت ہے نا، مجھے بہت عزیز ہو گیا ہے۔ بالکل اپنے شاہراہ جی کی طرح اور سنے نا۔

اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ کیا آپ میرے بیٹے سے بڑھ کر کسی۔“  
اور تب وہ جھکے ہوئے آگے بڑھی تھیں۔ سیدہ امنا شاہان کے پیچھے سر جھکا کر آ رہی تھیں۔

”بلند بخت میری بہت باری بہت محبت کر سوائی اور میری دوستوں بھی نہیں ہیں۔“  
انہوں نے بلند بخت کی کمرے کے گرد مائل ہاتھ ہلاتے ہوئے تعارف کروایا تھا ”تو اب ذرا زینت طاہر نے

نظر سنا لی تھی اور پھر فوراً ہی بھٹک گئی تھی۔  
”عاس مرزا۔“ انہوں نے ذرا ہی بل میں بڑھ کر کہا تھا۔

”کیا اتنی زیادہ مشاہدہ بھی ہو سکتی ہے۔“ انہیں حیرت ہوئی تھی۔  
ساتھی راجت بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سے تھمٹا تھمٹا کر دیکھ رہی تھیں۔

روزانہ جو ولی میں عاس مرزا کے ہونٹوں پر بھی لکھی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے گھبرا کر سید قائم علی شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ جن کے لبوں پر بڑی مہمانی کی مسکراہٹ تھی اور پھر ان کے لبوں سے نکلی ہوئی کئی آواز نکلی تھی۔

”جیسے جیسے۔“  
”کیا اس روز کو ولی میں وہ ان کا انویشن نہیں تھا۔“ انہیں عاس مرزا بے حد یاد آیا تھا۔ وہ جیسے دھچکے چلتی ہوئی

صوفے پر جا بیٹھی تھیں۔ جب کہ سید قائم علی شاہ ان کا تعارف کروا رہے تھے۔  
”سیدہ امنا شاہ ہیں ہماری بیٹی۔“

اور ان کی راجت زرد و ہری تھی اور اگر شاہد ہی اس وقت یہاں آجائیں تو شاہدہ ہم سب کو قتل کر دیں۔ میری چھ تک تو خیر کبھی لیکن سیدہ امنا شاہیں شاہراہ بھی اسے پسند نہ کرے۔ لیکن شاہراہ نے کوئی خاص پروا نہیں لی تھی۔ جب ڈرتے ڈرتے انہوں نے قائم شاہ کہاں ہونے والی اپنی اس ملاقات کا ذکر کیا۔

”بلند بخت بہت گھس گھس انسان ہے پچھو جان اور جب میں جا رہی ہوں بھی اس کے کھر تو اس کی شکل کی سب خاتون میرے سامنے آتی ہیں اور مجھے بہت سہت چیت کرتی ہیں۔“

اس رات وہ بہت بے چمن رہی تھیں۔ اور خیر ان کے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیوں رو رہی ہیں۔ کیا عاس مرزا کے لیے صرف ایک نظر دیکھا تھا انہوں نے۔

اور پھر گزرتے دنوں کے ساتھ بلند بخت گھس گھس آزادی سے آئے گا تھا۔ اسنو تو سنجیدہ مانتا لیکن بلند بخت آتا تو سب کو خوب ہشانا۔

وہ انہیں بھی غیر نہیں کیونکہ اشعار سے زبانی بات دیتے۔ عظمیٰ کے آنے سے اسے ایک مہنڈ کی لیا تھا۔ ”میری لڑائی میں شاہراہ کی ایک ہی ایک خریدی ہے شعر سنو گی۔“

وہ جب بھی شاہراہ کی طرف آتا عظمیٰ کو اشعار ضرور سنانا۔

”تم سب بد وقت ہو ہماری گریباں ایک بافاق ہے۔“

”عاس آپ کو شعر کیسے یاد ہو جاتے ہیں بخت بھائی میرے تو سرے گزر جاتے ہیں۔“  
شاہراہ کو حیرت ہوتی تھی۔

”چراغہ اعلیٰ کے بھائی ہو کر کیا کہہ رہے ہو۔“  
وہ ان کو سب سے سر ہاتا۔

شاہراہ عظمیٰ امنا سب ہی اسے پسند کرتے تھے۔ اور اس کے آنے پر خوش ہوتے تھے۔  
وہ ایک طرف بیٹھی انہیں بائیں کرتی دیکھتی راتی تھیں۔ کبھی بھی کسی نہ کسی وہ انہیں بھی اپنے ساتھ شامل کر لیتا۔

”پچھو اور آجائے یہ کیا وہ صول کی طس الگ تھلک ہو کر بیٹھ گئی ہیں۔“  
”تو کیا صول ڈھکی نہیں ہوں۔“

انہیں اس کی باتوں پر کسی آلی تھی۔  
”بالکل کسی نہیں کیوں شاہراہ کیا پچھو وہی ہیں۔“

”میرے خیال میں بلند بخت جج کو رہا ہے پچھو۔“  
شاہراہ اس کی بات پر کراہ۔

جب بھی بار بار جانے کو گرام ہوتا تو وہ انہیں بھی ساتھ ضرور گھسیٹ لے جاتا تو نہ کرتی رہ جاتیں۔ لیکن اسے قائل کرنے کا فخر آتا تھا۔

”آپ بزرگ کا ساتھ ہونا بڑا ضروری ہے پچھو۔“ معتبر سے گتے ہیں سب ہو ٹل میں کھانا کھاتے ہوئے اگر درگم ساتھ ہوں۔“

کی کوٹھا انہیں حیرت ہوئی کہ وہ چند ماہ ہی اتنا نرم ہو گیا تھا کہ اگر کبھی چند دن وہ نہ آتا تو اس ہو جاتیں۔  
”یہ جو بلند بخت ہے پچھو اس سے ملنے میں میں اتنا ہلکا ہے کہ ہم پوری زندگی میں اتنا نہیں بنے۔“

شاہراہ نے ایک بار بتایا تھا جب وہی وی لاؤنگ میں بیٹھا سو کوسے شخص ساتھ رہا تھا جو بھیل اس کے س کے کسی ایک ہاتھ کے دست تھے۔

”بخت بھائی لوگوں کے تو آپ کہہ تانا تو ہیں آپ کے تو اتنے سارے تانا ہیں آپ کو بتی ہو مشکل ہوتی لی سب کو ہلانے میں اتنا ٹھیک کیا تانا نہ ہو۔“

شاہراہ نے اچانک ہی پوچھ لیا تھا۔  
”اے میں بھائی میں پچھوئے تانا بڑے تانا ہوں تانا بڑا تانا کر تانا۔“

”اے آپ کے تاناؤں نے تو سب قتل ہوا شاہراہوں کے نام پر لے لیے ہیں۔“  
شاہراہ میرا کر پڑ سانس کا اسٹونڈ تھا لیکن اسے تاریخ سے بھی بہت دلچسپی تھی۔

”گنگا سے آپ کا سلسلہ کہیں مفلوں سے ملتا ہے۔“  
”اے اے بار کچھ ایسا ہی ہے بڑے نا جانا گھیر مرزا کھولتے ہیں اور خیر بتاتے ہیں کہ ان کی والدہ ہمارا شاہ ظفر کی

پھوپھی کی اواسی وغیرہ تھیں۔“  
وہ تار کھیر سے قصہ سنانے لگا تھا تو زینت طاہر نے یکدم چوک کر اسے دیکھا تھا۔

وہ تار نام نے انہیں چونکا یا تھا بالکل ہی آگھیں۔  
وہ اپنی لمباقت دیکھتے ہی ہوش بھی ہونٹ کی باران کا پانی کھا تو اس سے پوچھیں کہ کیا وہ عاس مرزا کو جانتا ہے کیا

اس کے باپ کا نام۔“ اسے تو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ شخص عاس مرزا شاہی شدہ تھا لیکن پچھو وہیں بیٹھا لیگا سوچے گا وہ کہ میں کیوں پوچھ رہی ہوں اور پھر میں کسی عاس مرزا کو کیسے جانتی ہوں۔ لیکن اس روز وہ بے اختیار رہی پوچھ بیٹھی تھی۔

”تمہارے والد کا کیا نام ہے بلند بخت؟“

”میرے ابو؟“

وہ اسے افسانوی نام پر اٹھا۔

”چھو چھو میرے ابو کے نام کے ساتھ یہ مٹل اور مزاد والا لہجہ نہیں لگتا۔ ان کا نام سید حفص علی شاہ ہے۔“

اور شاہوں کے علاوہ سب کو جنت ہوئی تھی کہ وہ بھی ان کی طرح سید ہے۔

”راصل میری اہلی کی شادی اپنی چھیلی سے باہر ہو چکی تھی۔ ہماری چھیلی میں کوئی رشتہ تھا ہی نہیں، میری اہلی چٹائی اور چھو بھی کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی اور تحصیل میں بھی کوئی جوڑ کا نہ تھا۔ اس لیے میرے ڈیڑی کے ابو

کے دوست تھے یوں یہ رشتہ ہو گیا۔“

”لیکن ہمارے ہاں تو سیدوں کی شاہیوں غیر سیدوں میں نہیں ہوتیں پھر آپ کے نانا کے دوست نہ کیے؟“

”یہی کی شادی غیر سیدوں میں کر لی۔“

عظمیٰ اکثر یہ تو فائدہ سال بھی کر جاتی تھی۔

”سب انسان برابر ہیں۔ عظمیٰ بی بی اور چھو خانہ ان اب ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتے سید کا کسی غیر سید کے ہاں

شادی کرنا اسلام کی دوسے تعلقہ نہیں ہے۔ یہ تو ہم انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔“

”اں لیکن شادی نے تو قادی چاچو کے ساتھ زیادتی کر دی تھی کبھی بھی سید کو نہ مانا ہے۔“

عظمیٰ بے حد سناں کی۔

”برسوں پرانے قوانین توڑنے والوں کو ایسے کرانسمس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی ایک کو تو قرآنی دینی پڑی

ہے۔ گزرا رانی سو قادی اٹکل نہ دی۔ وہ سلسلے سے آنے والی لوگوں کو اس کو کچھ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔“

”یعنی آپ کا مطلب ہے اگر شاہوں نے بھی اپنی شادی میرے کہیں کی اور خاندان کی لڑکی پسند کی تو شادی انہیں

شادی کی اجازت دے دیں گے۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”آپ میرے شاہی کو نہیں جانتے۔ بخت بھائی وہ تو بھی نہیں مانتا میں گے۔“ اس کے لیے کہ عین پر بلند

بخت نے جو تک کر اسے دیکھا تھا۔

”میں گزرا وقت کے ساتھ ٹپک اٹھ جاتی ہے۔“

”شاہی میں نہیں آ سکتی۔“

عظمیٰ کے لیے جسے وہی یقین تھا۔

”عظمیٰ کی پیٹھ ڈار رہی ہو۔“

شاہ میرے ڈرنے کی ایک لگ کی۔

”کیا میو خیر ہے نا میں کوئی گزرو نہیں۔“ بلند بخت نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ہاں یہ وہ گزرا دوسو گچھ گز شاہوں کے ہونٹوں میں مسکرات نمودار ہوئی تھی۔“

”میرے معاملات میں سوچنا ساتھ میں رہتی ہائی ڈیٹر شاہوں نے عقل کام کرتی ہے۔ میں بیو۔“

اور شاہوں نے پیٹ دیکھا تھا۔

”میں تو اس لیے کہ رہا تھا کہ میں مستقبل میں اگر ایسا عادی ہو گیا تو۔“

”عادی۔“

”گڈ۔ بخت ایک حادثہ ہی ہوئی ہے۔ اور اس کے لیے اس سے بہتر لفظ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔“

بلند بخت نے تہو کیا تھا۔

وہ سب سنی سے گفتگو ہے۔ پیشہ ہاں کر رہے تھے۔ میں انہیں شاہ زیب کا خاں آ گیا تھا۔ کتنا عرصہ ہو گیا

تھا میں اس سے ملے۔ اور ذرا اسے تو پیچھے رکھ کر آئی ہے جا کر بھولی گیا تھا۔ سنی یا رانہوں نے اس سے کہا تھا

کہ کچھ دنوں کے لیے وہ اور ذرا اور آجائیں۔ یا پھر ذرا کو یہ چھوڑ جائے حالانکہ اکثر اسلام آباد آتا ہو تھا اس کا کیا ہی اچھا ہوا اگر وہ بھی شہر کی طرح سب سنی بھائیوں کے ساتھ کھل کر رہتا۔ کتنا اچھا لگا تھا شاہ کا سر کاٹنے سے شاہ میرا رہا۔ اور کھلی سے سنا کر نہ۔

”مختیار بھائی نے آئے ہی تو اپنی جان سے کون کی وہ شاہ زیب اور ذرا کو کچھ دنوں کے لیے چولی ہلا میں سب

میں بھائی بل چل کر میں کے ہاں بھی شاہ زیب کی یاد کر رہی تھی۔ وہ عظمیٰ کے لیے اس کی۔“

انہوں نے کوٹ بدلتے ہوئے سوچا۔ اور انہیں پتہ نہ کہے کوٹوں کے کوٹیشن کرنے لگیں۔ اگر یوں بھی

تو میری رات کو کچھ کھل جاتی ڈیڑہ مشکل سے ہی آتی تھی۔ اسی انہوں نے آتھیں نہ ہی کی تھیں کہ انہیں

لگا کچھ سی نے انہوں نے دروازہ اندر سے کھلیا ہوا اور پھر جسے کوئی دروازہ پتہ نہ تھا۔

وہ گھر کا راتھ بھٹی۔

”یا اللہ خیر۔“

وہ سترے آ کر دروازے کی طرف دیکھیں، لیکن پھر ٹھٹک کر رک گئیں۔ دھتک کے ساتھ ہی کی کے رونے

کی آواز آئی تھی۔

پھر شاہ زیب نے آواز بھی کی تھی پھر ہم سی رونے کی آواز اور پھر زور سے دھتک سبب ہی شادی کے کرنے

کا دروازہ کھلا تھا۔ اور ان کی آواز آئی۔

”کون ہے کون ہے؟“

اور زینت فاطمہ نے بھی بند کر دیا۔ کی چٹکی کھلی۔ شادی دروازہ کھول چکے تھے۔ وہ وہی ننھیلا دل بہرنگل

آئیں اور شادی کے پیچھے لگیں۔ کھڑے دروازے کے باہر شاہ زیب اپنے سر اوچا گئے شادی کو دیکھ رہے تھے۔

”کس سے ملنا ہے؟“

شادی نے تھوڑا سا کھینچا۔ وہ ان کا دروازہ سے نکلا۔

”یہ اس وقت آئی یہاں کبھی نہ جائے گا سو جاگئے جانتے ہیں میں تو بھی رات سے سب مکمل مر گئے

ہیں۔ بدرالدین اور کریم آباد۔“ ان کی آواز بلند تھی۔ ”میں مجھے منہ مارو۔“

وہ ایک دم ان کی آواز سے خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹے۔

”میں نہیں جاتا کچھ بھی نہیں جانتا میں کون ہوں۔ میں۔“

اور زینت فاطمہ کو وہ رات خالی تھی جب دلانی ان سے پوچھ رہے تھے۔

”ہو کر مر مٹل شاہ کون ہو؟“

وہ جھمک رہی سی لے کر ایک دم پیچھے ہٹ گئیں۔ ”کیا ہوا ہے شادی؟“

شاہوں میں سے اپنے کر کے کا دروازہ کھول کر باہر آ چکے تھے۔

”یہ شاہیابی طبیعت شاہ زیب ٹپک نہیں ہے اور یہ یہاں آکر دروازہ کھٹکا رہے تھے۔“

”بدرالدین رات کو اصرار میں سو گیا۔“

شاہوں نے ان کے قریب پہنچے تھے۔

”میرے ہیں کہیں؟“ ”کیا؟“ ”اگر سو رہے ہیں مفت کی۔ کھا کھا کر حرام خور ہو گئے ہیں۔“ ”مج دیکھو گاسب

کو۔“ ”شاہی نے نصف میں شاہ زیب کا بازو کھٹکا تھا۔“

”میں نہیں مجھے مت مارو۔“

بوڑھے کریم شاہیابی ان کے خوف اور آنسو تھے۔ زینت فاطمہ کا دل گداز ہو گیا اور آنسوؤں نے دل کی

نہیں تم کر دی۔ شاہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر شاہیابی کا بازو تھام لیا۔



”میرا منوں کیسا ہے کیسے ہوا حادثہ۔“

آہ ریشی ٹھٹھکی دیوار سے لیکھ لگے گئے اس نے تھنا ساق کا دوست تفصیل بتا رہا تھا۔

”دہاں دو روپ ٹڑپے تھے۔ حقیقی لڑائی تو دونوں لوگوں کے درمیان شروع ہوئی، ہم نہیں جانتے لڑائی کیوں ہوئی۔ منصور نے دونوں لوگوں کو چھڑانے کی کوشش کی بھی حالانکہ میں نے اسے منع بھی کیا تھا۔ وہ دونوں ٹھٹھک رہے تھے۔ منصور ایک لڑکے کا بازو پکڑ کر چھڑا رہا تھا کہ دوسرے نے چاقو نکال لیا اس نے چاقو تواس لڑکے کو مارا تھا لیکن وہ منصور کے لگ گیا۔ منصور کو گر گیا تھا اس کا خون تیزی سے بہنے لگا۔ میں نے جلدی سے اسے پکڑ پیچھے کی اس اثنا میں بچہ اور لڑکے بھی اٹھتے ہوئے تھے اور لڑنے والوں میں سے ایک نے ہسپتال نکال کر نکال چلائی وہ لڑا جس نے چاقو نکالا تھا وہ گردا تھا۔ ابھی لڑائی ہو رہی تھی لیکن ہم فوراً ہی منصور کو لے کر ہسپتال آ گئے۔“

خون بہت ضائع ہوا کیا تھا چاقو بائیں طرف پسلیوں کے نیچے لگا تھا اس کے دو ستون نے خون بھی دیا تھا۔ بچہ اسے اتنی ہی یوں لائے تھا اس کی ہڈ آٹھوں اور زرد روئی تخت کو دیکھ کر اس سے ممبر نہیں ہو سکا تھا وہ بے حاشا رونے لگی تھی خضر اسے ہارے گیا تھا۔

”اللہ کا شکر اوروں کو دیکھ کر زندگی بچ گئی۔“

زندگی تو بچ گئی تھی لیکن یوں بیان لینے آئی تو پتا چلا کہ وہ لڑکے کو گولی کی تھی موقع پر ہی گر گیا تھا اور پولیس نے کل کا یوم منصور پر عائد کیا تھا۔

”میں یہ جھوٹ سے غلط ہے۔“ منصور بے بسی سے رو رہا تھا۔ لیکن ساری گواہیاں اس کے خلاف تھیں۔ حتیٰ کہ اس کا دوست بھی اس کے حق میں نہیں تھا اور ہسپتال سے منصور کو کھیل کے جایا گیا تھا۔ وہ کیا تھا جس نے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا تھا اس پر کل کا الزام لگایا گیا تھا۔ یہ بہت مضبوط تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اس سارے قحط سے صاف نکال لیا تھا جو بدورت لکھی تھی اس میں بھی لکھا گیا تھا کہ چھڑا منصور اور مرے والے لڑکے کے درمیان ہوا تھا اور منصور نے غصے میں دوسرے لڑکے سے ہسپتال جبین کر گولی چلا دی۔ جس نے گھص ڈرانے کے لیے ہسپتال نکالا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ کوئی قحط آسانی سے اتنا بڑا جھوٹ بول لیتے ہیں۔ اتنا قریب ایک سے کنارہ پر الزام دینے کے کیا وہ مطمئن ہوں گے کیا ان کا اختیار ان میں طاعت نہیں کرنا ہو گا کہ ایک معصوم اور بے گناہ لڑکے کی زندگی ختم کرنے کے لیے انہوں نے ایسے لوگوں کے ضمیر نہیں ہوتے۔

صبر خان تو جیسے بھرے ٹوٹ گئے۔ وہ چاہتا ہی نہ رہے تھے اگر افضال حیدر اور حضرت ہوتے تو میں نہیں کیا ہو۔ وہی وہ تھے جنہوں نے ہسپتال میں ہر طرح منصور کا خیال رکھا۔ اس کا پس لڑنے کے لیے وہ کل ایک خضر لکھی ہی بائیں باج کر لوگوں سے ملا۔ اس میں حقیقت تانے پر تانہ کرنے کی کوشش کی لیکن سب کو اپنی جان بچاری تھی۔ سب منصور کے لیے دیکھی ہوئے تھے، لیکن اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ بچ بچہ کہتے ہو کل ہونے والے لڑکے کے والد سے کسی ملائین وہ تو کلی بائیں بننے کے لیے تیار نہ تھے ان میں پوری طرح یں ملا دیا گیا تھا کہ ان کے بیٹے کا قاتل منصور ہے۔

منصور ہسپتال سے نکل چلا گیا اور اس کی راتوں کی نیند اٹ گئی۔ وہ ساری ساری رات جاتی رہی تھی باہر سے نزل بھی آ گئی تھی۔

”روایا کیا ہو گیا ہے، ہم نے کسی کا کیا کیا دیا تھا وہ کیا قصور تھا ہمارا۔“

وہ کتنی ہی دیر تک اس کے گھر کی دیواریں دیکھتی تھی۔

خضر خالہ روبا کے ساتھ ہی آئی تھیں اور بہتہ بھرہ کروائیں چل گئی تھیں۔ سب کو یقین تھا کہ منصور نے جو بیان لکھوایا وہی ہے صحیح ہے لیکن سب بے بسی تھے۔ وہ اچانک کمرے کرتے کرتے اس کے ہونٹ ٹھک گئے لیکن کوئی مجبور نہیں ہوا۔ ابھی تک منہانت نہیں ہوئی تھی۔ کل کا کس تھا۔ خفایت اتنی آسان نہیں تھی۔ وہ دیر نہ دن تک اسکول میر، اپنی پھر اسکول سے لینے لگا گیا کہ دیا تو اسکول آئے یا پھر جا بے چھوڑے۔ سمر اور بھی اس اثنا

میں دو تین بار آئی تھیں اور سمجھایا تھا کہ ”میں اب اسکول آتا ہوں چاہیے۔ پندرہ دن کی چھوڑا تمہاری کٹ جائے گی یا تو تم اسکول سے یہاں تو اس طرح ہو جائے۔“

اور رقم کی تنگی ضرورت تھی سب سے زیادہ۔ تیس ہفت کے اس نے اسکول جانا شروع کیا تھا وہاں تو کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے رکھتی تھی لیکن گھر آتے ہی ٹھٹھکے لگتی۔ چلی جاتا چھپ چھپ مارا کر دے۔ چلائے تھی نا انصافی کی، کسی غلط فعل آسان پھٹ کیوں نہیں پر پاس ملتا ہے، وہ سوچتی لیکن کوئی بار تو ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی منصور کو رات بے قصور نہ رہا تھی۔ بیٹیں بھرتی ہیں جس نے لڑکا اور بے قصور ہوئے ان دونوں کے ابا اور دادی کی دوا یوں سے بھی غافل ہو گئی تھی اور باپ کی عزت پر۔ منصور تنگی باقاعدگی سے ان میں ہسپتال کے رجاتا تھا۔

اس کے دل میں ایک ہو سی اٹھی پانی کے چھپا کے منہ پرارے ہوئے ایک بار پھر کتنے ہی آنسو اس کے رخسار چھو گئے۔ اسے منصور بتا دیا تھا، ایک بائیں سے زیادہ ہو گیا تھا اسے منصور کو بچے۔ آخری بار اس نے ہسپتال سے اسے دیکھا تھا جب پولیس کے ایک بائیں نے اس کے ہاتھ میں پھنک دی وہاں آئی تھی اور وہ دونوں چاہوں کے درمیان چلتا ہوا ہسپتال کے گورڈ میں کچھ بھر کر کھاتا تھا اور اس نے بے حاشا آنسو ہوائی باہر اور طیبہ چکر کو دیکھا تھا۔ کتنی حسرت اور بے بسی تھی اس کی نظریں میں ابھی تو اس کا زخم پوری طرح مند لکھی نہیں ہو تھا ابھی تو ٹانگے میں اسے تکلیف تھی۔ اسے بے بسی میں کیا کچھ نہ تھا۔ حیرت ہے لیکن باپو اس کا دل تو جیسے کٹ کر کٹ گیا تھا۔ ”منوں! تو تیزی سے اس کی طرف ہو گئی لیکن خضر نے اس کے زانو پر ہاتھ رکھا تھا۔“

”واہ پلینز۔“

اور پھر وہ چاہوں کے درمیان سر جھکا لے چلا ہوا ان کی نظریں اس پر مائل ہو گیا تو وہ طیبہ بیک کے گلے لگا کر زانو تھکا روئے گی اور پھر جب وہ سر جھکا لے کھڑا رعل ہوئی تو اسے لگا تھا جیسے اس کا دل جھٹ جائے گا۔ وہ بھاگ کر نصیر خان سے پٹ لگی تھی۔

”ابا! وہاں سے ہی لے گئے۔ ابا وہ کیسے رہے گا وہاں کیسے نیند آئے گی اے وہاں۔ کیسے کھائے گا وہاں کا کھانا ابا تو اس کا زخم کیا تھا۔“

اور نصیر خان نے اسے اپنے انڈوں میں لے لیا اور سارے کے لیے ان کے پاس کوئی لفظ نہ تھے۔ ان کے پاس نہ کسی اور کسی اس سبب ہی دور ہے تھے تب نصیر نے ہی بڑھ کر اسے ابا سے الگ کیا تھا۔

”پاگل ہوئی ہو! اکل اور در پستان کرو۔“

”ماںوں تو تھی خاموش طبع اور معصوم سا تھا اپنے آپ میں گمن اس کے ساتھ کیوں ہو ایسا۔ کیں۔“

”بہت سارے کیوں کے خواب نہیں ہوتے تھے ابا۔ سارے۔“ خضر نے کہا اور پھر نزل کو اشارہ کیا کہ وہ اسے وہاں سے لے جائے لیکن وہ تو پوری راستہ ہی سے آپ کی طرح تو بڑی ہی تھی حالانکہ نزل نے زرد ختی سے نیند کی ایک ٹیبلٹ بھی کھادی تھی۔

مند و حو کہ عید کی چکن میں چلی گئی۔ دادی کو وہاں دیکھ کر وہ شرمندہ ہی ہو گئی۔

”دادی آپ یہاں چکن میں سے سوچا کہ رات کے لیے کچھڑی بنا دوں سب کھا لیں گے۔“

”آپا! ہمیں دادی میں کٹ گئی ہوں۔“

”خضر جیجی! کتا ہے مجھے حوصلہ دینا ہے اور سب کا خیال کرنا ہے لیکن میں سب سے بڑے پروا ہو گئی ہوں۔“

”چنا! تمہاری طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں رہتی باہر نال دیکھا ہے کیا ہو گیا ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں دادی پڑی آپ چھپ چھپ چھپ کر پھر مجھڑی بنا دیتی ہوں آپا کے کمرے میں چٹیں خضر بھی وہاں ہیں۔“



وہ گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔

فہمی اور دل کی بارہادی کے تحت جذباتی خاموشی سے بیٹھے ہوم ورک کر رہے تھے اس نے چائے کانی کی دھک کر کہا ہر  
 جگہ کلاں کا کلر ہوا کیسے بڑا زور سے منہ رکھ لیا آئے ہیں اس کے اور تھکے ہیں تو کہنے میں نے کہا ہوم  
 ورک کروا دینے چیک کیا ہوم۔۔۔ اور یہ موبی سائی۔۔۔ میں نے یوں کہہ کر تھکے سے کھسک کر پال ہوائے نے  
 آئی تھی چھپائیں اس کو یا بغیر نام کون اس کی کرنا ہے۔۔۔ میں جانتا تھا کون کوں دیتا ہے۔۔۔ پال ڈون صرف مجھ سے ہی عوامی  
 تھی اماں اور نرل سے بھی نہیں۔ اس کا ساتھ ڈونر سے کبھی کرتی ہیں جس سے اسے دور رہنا ہے۔

”موبو موبو“

”مومو! مومو!“

اس نے بے یقین ہو کر اسے آواز دی تو بڑے کمرے سے نکل کر وہ کچن میں آگئی۔ اس کی بے حد گلابی رنگت مانع پڑی ہوئی تھی۔

”مسمومی تم نے ہوم ورک کر لیا۔“

“3.”

اس نے سر ہلا دیا تھا۔

”صبح تمہارے بال کون ہوتا ہے۔“ بے اختیار اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”واوی یا اماں۔“

کیا منوں کے ساتھ اس کی اماں سے زیادہ رشتہ داری ہے نہیں، لیکن اس میں شاید اماں جتنا وصلہ نہیں تھا۔ لیکن میں اب ان سب کا خیال رکھوں گی پہلے کی طرح اور مجھے یہ ان کا خیال رکھنا ہے۔

مومل کو واپس جانے کا کہہ کر وہ دل ہی دل میں عہد کر رہی تھی۔

”ماہ آبی سنگ میں برتن بڑے ہیں تو میں دھو دیتی ہوں۔“

”اے نہیں گڑھا میرے دھولوں کا تم جاؤ شاہاثر کھلو جا کر۔“

اس کے رخسار کو پھینٹتیا کر دیا۔ چن چن علی آئی۔ پہلی اہل رہا تھا۔ اس نے چائے دم کر کے رکھی۔ ایک حادثہ خواہ مخواہ ہوا۔ پڑا خانہ ان کے فرزند پر ایک ہی طرہ از رازد از تو ماسے۔ بھلا مونی نے پہلے کچھ برتر، دھوئے تھے

”تو بہ طے پہا نور نصیر احمد خان کہ تمہیں خود کو اب اس دکھ سے نکالنا ہے۔ اب ذمہ داریاں پہلے سے بڑھ گئی ہیں۔“

منوں کے ہونے سے کتنا سہارا تھا وہ سارے کام جو پہلے منوں کرتا تھا اب اسے کرنے تھے۔

آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے تو اس نے بے دردی سے انہیں چپچپہ دھکیلا اور یہاںوں میں جانے لگے۔

اور چائے کے کرب نصیر احمد خان کے کمرے میں آئی دھڑا کر میں کی چابی لے کر بیٹھان کے اہل خانہ کو اپنے  
تھوڑے میں لیے ہوئے ہوئے کچھ کر رہا تھا۔ ان کے سامنے چائے کی برکھ کر اس نے ایک کپڑے پر بنیم کوڑا  
اور ان کے پاس بیٹھنے کی ان کی آنکھیں سوئی ہوئی تھیں شاید وہ بھی روتی رہی تھیں۔ چلیں، ابھی تک سگی ہوئی  
تھیں۔ خضر نے نصیر احمد خان کا ہاتھ پھیر کر ایک کمری کے طرف اس پر روائی۔ دھلا دھلا چٹائی پر روائی آنکھیں۔ چہرے

برعری اور ایسی - تنازعہ خصلت حاملہ نے کیا کیا باتیں ہی کی جاتی تھیں کہ اس طرح اس کا نام لے کرے میں خیال حاصل ہوتا تھا کہ جب مجھے بھی ایسا ہوتا آیا ہے مابقی بہت زیادہ مخالف کام سامنے کرنا پڑے ہیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ مگر اس نے اس سے مجھے نہیں بلکہ کتنا بھی بات چیت نہ ہونے کے باوجود کہ میں ہوتی تھی اور پھر یہ شیخ سے کہتا تھا کہ میں نے اس کو بھی خریدی ہے۔ مگر تو کہیں نہ صرف کہ اس کو خریدی تھا بلکہ اس کے چھوٹے بھائی سے بہت مشابہت کے شکار ہو گیا تھا۔ مگر تو کہیں نہ صرف کہ اس کو خریدی تھا بلکہ اس کے چھوٹے بھائی سے بہت مشابہت کے شکار ہو گیا تھا۔

اس کی بات طے کی تھی تب سے اس کا بی جاہر تھا کہ وہ بارہ سو بات کرے اس احساس کے ساتھ کہ وہ اس کے منصوبہ ہو گی کبھی لیکن ان دنوں سے حد مصروفیت تھی اور اس روز اس نے بہت ارادہ کر رکھا تھا کہ آج کم از کم کچھ بارہ سو کروڑ فن ضرور کرے گا لیکن پھر حادثہ ہو گیا۔ منصور کے ساتھ جو بیانی ہوئی تھی اس کو دیکھنے اس کو ہی نہیں سب کویشان کر ڈالا تھا افضل حیدر اور وہ بھی اس کو شش کر رہے تھے۔ جہاں جہاں تعلقات تھے سب کو کام میں لا رہے تھے لیکن دوسری بیانی بھی اس کے منصوبہ کی ساری باتیں نہ تھیں۔ یہ صرف ایک پتہ تھا کہ منصور کو پھنسانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ دوسری صورت میں طریم ان کا جانا تھا کہ اس کے ہر حال میں تلوے پر ایک تھی۔ لیکن ایک ایسی صورت بھی ہو سکتی تھی اور وہی ہے جو سب سے مارا ہے اور آسمانوں پر اُڑت ہے۔ یہی بات فیصلہ خاں سے کہہ رہا تھا کہ وہ اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا۔ جن کا کوئی نہیں ہو نا ان کا لالہ ہو تا ہے۔ وہ جو انصاف کرنے والا ہے۔

”چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

سر جھکائے آنے باشتوں کو دیکھتے ہوئے اناور نے سر اٹھا کر کہا تو اس نے جو تک کر جائے کا ایک کب اٹھا کر نصیر

احمد خاں کو دیا اور وہ سر اخوند کے لئے لیا۔

”تمہارا بیٹا لڑکا نہیں بنا سکتا۔“

م آپ سے چائے میں لائیں۔  
 ”نہیں، نہ لیں۔“

"تکلیف ہے کہ تم میری جگہ پر جاؤ۔"

”م کل جاؤ کے منوں سے ملنے۔“

نصیر احمد خان نے چائے کا کھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے بھی لے جاؤ بیٹا۔ میں نے اسے اتنے دنوں سے نہیں دیکھا۔“ کن کی آواز بھرا رہی تھی۔

”لے جاؤں گا۔“ اس نے ماموں ہاتھ سے ان کا بازو تھپتھپایا۔

وہ حضرت ابھی منہ سے ملنا چاہتی تھی کہ اس کا

”الیکم تم“ خضعہ سچ میں، رنگ اور مہیج، نظموں سے اس سے دیکھو،

ہاں میں ہاں - سحر سحر میں پڑ گیا وہ جی سسوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”فیل ہے م اسٹول سے مٹے بجے اوئی۔“

”جب جانا ہو گا میں اسی وقت آ جاؤں گی“

”بہتر ہے کہ پھنسی کر لوں یا پھر دون کر دوں گا کب جانا ہے۔“ خضر نے چائے کا کھونٹ بھرا۔

”ہیں۔“ انہوں نے نفی میں سرملایا۔

”نہیں میں نہیں دیکھ سکتی اسے اس حالت میں وہاں مجرموں کی طرح نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔“

اور رونے لگیں۔ سب یکدم خاموش ہو گئے تھے۔ کسی نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی منوں کو وہ جیل میں

مگر ان سے نہ تو ان کے آنکھوں میں ایک خواب سجا رہا تھا۔

”اے بلبلِ دہلی! تم نے میری ہر شے کو چھو لیا۔ میری ہر شے کو چھو لیا۔ میری ہر شے کو چھو لیا۔“

۱۱۔ سب حیل ہو جائے، اے اللہ! یہ جلد سوں ہمارے درمیان ہو گا۔



”کتنی ہے مجھے نہیں دھانا ب۔“  
 ”لیکن کیوں؟“ سزیرشان نے سوچے۔ ایف ایس سی کا امتحان اس نے بہت اچھے نمبروں میں پاس کیا تھا۔  
 اور سرور اور اس فرزند کے اصرار پر انٹری ٹیسٹ کی تیاری بھی کر لی تھی۔ لیکن پھر یکدم ہی اس نے ٹیسٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

”دو سال پہلے پورے دو سال سے وہ مجھ سے بات نہیں کر رہے۔“  
”تو کیا تم مجھ سے یہ کہہ کر اب تمہارے نہ پڑھنے سے وہ تم سے بات کرنے لگیں گے اس غلط فہمی میں مت  
”

”میں بھی اب جاننا چاہتا ہوں کہ اس کی سزا کتنی ہوئی تھی۔“  
 ”ایف ایس سی تک تو خیر تھی لیکن مجھے لگتا ہے میڈیکل کالج کا نام سننے ہی مجھے قتل کر دیں گے۔“  
 اس نے دو نولہاتھوں کی پٹ سے رخسار پر چٹختے تھے۔  
 ”پلو میڈیکل نہ سہی تھی ایس سی کر لو۔“

۱۳۔ میں آپ کا خیال ایسا جاننا صحابہ نے خود سے رکھا ہو گا انہوں نے کیا کرنا سے اپنی مرضی کی

میں صلح الدین کا وہی انداز تھا۔ آتے جاتے طنز کے تیر چلاتے رہتے تھے لیکن ہمیشہ کی طرح اس سفر میرے کام لیتے وہ آج تک میاں صلح الدین کے اس رویے کا جوڑ نہیں تلاش کر سکے تھے۔

علینہ! ابھی نہیں بھی لیکن وہ سب احساسات ابھی لیکن خوب صورت تھے جن کے وہ چار ہوئے تھے۔  
 علینہ کے لئے کے خطوط وہ سن رہا ہے لیکن ان کی سیر کی ہوئی تھی وہ اسے لکھنے کی ضروری تھے تھے۔  
 اور اب تک اسے ہو گیا تھا اس نے ان میں خط نہیں لکھا تھا۔ ان کے ڈیڑھوں یا تین نہیں کی تھیں۔ ان کی ایک سی  
 ان کا دل چاہتا تھا وہ اس کے ڈیڑھ ساری یا تین کریں۔ انہوں نے کانک کا کارڈ خریدے ہوئے سوچا تھا علینہ  
 ضرور دے گی لیکن وہ نہیں دے گی۔

”ہاں ہاں آجاؤ۔“ کن کا لہجہ بے حد خوش گو اور ساقھانہ۔  
 ”آپ آئیں بے آکر سوئے نہیں۔“ وہ اندر آگیا۔

”ہاں نہیں تو۔“ وہ پٹٹا کر بولا۔  
 ”ایسا کچھ خاص نہیں پڑھنے کا موذ نہیں ہو رہا تھا سوچا آپ سے گپ لگا لوں۔“

”تم کہاں سے آرہے ہو۔“ سفر بخیر سے دیکھ رہے تھے۔  
 ”میں سمن کے کمرے میں تھا۔ بھائی آپ اسے سمجھائیں۔ اس کا داغ خراب ہو رہا ہے۔ چھ مہینے سال بعد

362

”تو آپ کی طرف سے اجازت ہے ایڈیشن کی میڈیکل کالج میں۔“

”میری اجازت کی کیا ضرورت ہے مجھے جو چاہے کرے۔“

انہوں نے گویا اس کے کچھ لمحے میں سوچتی نہ دینے کا عہد کر رکھا تھا۔

”اسے اسے کریں بالکل سچی بات کہیں۔“ وہ نیکیں سے ہاتھ پونچھ کر کہہ رہے تھے۔

”خدا ربیک کھانے کے بعد رمضان سے کہہ کر ایک کپ قہوہ بھجوا دیجیے گا کہ میں۔“ ان کے ڈائرینگ ہال سے جاتے ہی وہ دو دو ہاتھوں میں نہ چھپا کر رونے کی گئی اسٹریبے اختیار پائی جگہ سے اٹھے تھے اور اس کا سر پینے سے لگا کر کھینچنے لگے۔

”دو گزیا۔“

”مسی بخائی! وہ کچھ مٹی تھی۔“

”ایہا جان! مٹی تک میری حرمت نہیں بولے میں کیا کروں ایسا کہ۔“

”ایک وقت اسے گاڑنا جب ایہا جان خوبی۔“

”میرے سر نہ کے بعد۔“ اس نے بے حد افسوس سے کہا تھا لیکن اسفر نے سن لیا تھا۔

”فضل امت کو گزیا۔“ پھر اسے اسٹور ہش کا صوابی تھا کہ اس نے ڈائری ٹیسٹ بھی دیا اور میڈیکل کالج میں ایڈیشن بھی لے لیا۔ میڈیکل کالج میں اس کا ایڈیشن ہو گیا تھا۔ میاں صلاح الدین نے اس روز کے بعد بڑے نہیں کیا تھا۔ اس کی ایڈیشن کے متعلق کوئی بات نہ تھی اور اب تو اس کے سینکڑوں پوچھنے ہوئے والے تھے پھر آخر کیا بات ہو گئی اسٹریبے پانی سے مشروط دیکھ رہے تھے۔

”میں بات کرنا ہوں سن رہے لیکن مجھے پتا چلے کہ ہوا کیا ہے ایہا جان نے کچھ کہا ہے۔“

”میں دھڑا صل۔“ میٹر جھوٹا۔

”میرا خیال ہے غزالہ نے کچھ کہا ہے اس سے۔“

”ایہا۔“ اسفر نے سوالیہ نظروں سے اے دیکھا۔

”کچھ غلطی کہا ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی فضول بات کی ہے۔“

”اوہ!۔“ اسفر نے ہونٹ پیچھے ضرور غزالہ نے فضول ہی بات کی ہوگی وہ دیکھ رہے تھے ان تین ساڑھے تین سالوں میں غزالہ اگر فضول ہی بول دیتی کسی بلا سے سمجھے۔ انہیں مہر پر ترس آتا تھا اور ان کا دل دکھتا تھا اس کے لیے ایہا جان نے نتیجہاً ”مکرم کیا تھا مہر“ لکھا تو اس میں ڈرامہ بھی نہ تھا پکے خواب میں وہ کہے میں میٹر سے کسی کی عیب اب سب کے سامنے نہ ملے کہ وہ کہتی ہے اسے اگر خلاف معمول دیر ہو جاتی تو یہ لکھانے کے بغیر کہ سب پیٹھے ہیں وہ فوراً بول پڑتی تھی۔

”کہاں دیکھتے تھے ضروری سبکی کے ساتھ گھوم رہے ہو گے۔“

میٹر جھوٹا اور بے شرم نہ ہوا جاتے۔

”وہ کل کالج میں کوئی فنکشن تھا۔“ سن نے ای جان کو تیار کیا تھا اس پر وہ جانا گئی۔

اب میٹر جھوٹے ہوئے تھا ہر وقت۔ اور جب وہ دیر سے آئی تو سن کو کچھ ہی غزالہ کہنے لگی۔ ”بڑی دیر کی ہے۔“

”کالج میں فنکشن تھا۔“ سن نے تیار کیا۔

”لیکن بھائی آپ جانتے ہیں ناغراہ کی عادت عجیب ہے کہنے لگی ہمیں کیا پتا کالج میں فنکشن تھا یا کسی

ساتھ گھومتے گئی تھیں۔“

جتنا جانتے تھے میٹر کا رنگ سن ہو گیا تھا۔ اسفر نے بھی بے حد ناگوار محسوس کی اور انہیں غزالہ پر بے حد غصہ آیا۔

”میں نے غزالہ کو ڈانٹا تھا لیکن کئی دن سے منع کر دیا۔“ میٹر نے سر جھکا لیا۔

”خیر ڈانٹنے کا بھی کیا فائدہ۔“ زہر لگے ہوئے اسٹریبے کھڑے ہوئے۔

”میں گناہوں میں کو اور کم۔“ انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کس چارے ہو کیا۔“

”جی میں منہ خالی کی طرف جا رہا تھا۔ کبھی بھائی جی آئے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے میں کھانا کھا کر آؤں۔“

گھانے پر انہیں انتظار میں بیٹھے گا۔

”گھانے تک آنا باغیچہ ایہا جان کو انہیں گلتا اس روز بھی تھا وہ رہے تھے۔“

اسفر نے نرم لہجے میں سمجھایا۔ میٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں رہتا جانتا تھا کہ وہ غزالہ کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور گھر پر رہتا تو لازمی اس کا سامنا ہوتا۔ اسے غزالہ پر نے اتنا غصہ تھا اس کا جی چاہا رہا تھا وہ پھولوں سے اس کا چوہا لال کر دے اس نے سن کے کو اور پر حملہ کیا تھا۔ کتنی گھٹیا سوچ تھی اس کی۔ اس کی اپنی ہی تھی۔ لیکن انہوں نے سمجھنے پر اس نے غزالہ سے بات نہیں کی تھی۔

”بھئی میٹر سے کچھ مت کہنا۔“

”اچھا میں اس کی منت کی تھی۔“

”خداوند خداوند بڑے گناہ۔“ وہ بنگار کرے گی کہ بہن لگائی بھائی کرتی ہیں اور پھر اگر ایہا جان کے کان میں اس

بہن کی جھپک پڑی تو جانتے ہو گیا ہوگا۔“

اور اس نے مشکل شہید کیا تھا۔ سن کل سے ورد کر رہا تھا۔ کوئی جاری تھی وہ تو یونی کوئی کتاب لینے اس کے کمرے میں گیا تھا تو اسے دو دیکھ کر حیران رہا تھا۔

”ہو گیا ہو سکتا ایہا جان نے کچھ کہا۔“

پہلا خیال اسے یہی آیا تھا اور جیسا رونانے خواہی کے بیڑ پر بیٹھی تھی مصیبت میں ساری بات بتا دی۔

”بھائی جان نے ایسا کیا تھا تب سے آئی دور رہی ہیں۔“

”وہ اس نے بے یو اس کی ہے میں دیکھتا ہوں۔“ وہ یکدم مڑا تھا لیکن انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔

”پلیز بھئی!۔“ اور کئی قدر روبرو کیا تھا وہ سن کے کمرے سے دیکھنا سزا کے کمرے میں آتا تھا۔ اسے زہنا

لہو غزالہ کو سامنے دیکھ کر ضبط نہ کر سکے گا۔ اپنی ذات پر تو وہ اس کے بیکار کس کا عادی ہو گیا تھا لیکن سن نہیں اسے اس کی اجازت نہیں سے سنا تھا کہ وہ اس کی بہنوں پر بلا دیں۔ بہن بنا دیکھے۔ اسفر بھائی سے اس روز اس

لہو دیکھنا تھا کہ وہ آئندہ غزالہ پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ اسٹریبے بھی سمجھا تھا۔

”محوریت ہاتھ اٹھانا سزا کی نہیں ہے بھئی۔ اسے پیار سے محبت سے سمجھاؤ۔“

”جی جان میں نے اسے سارا سنا۔“ وہ شرمندہ ہوا تھا۔

”مارنے تو لگے تھے۔“

غزالہ نے کواؤر ڈانٹیم نے اسے ساتھ کیا تھا اور بولے بولے سمجھانے لگی تھیں۔

یہاں سب اس کا کتنا خیال کرتے اور کتنی محبت کرتے تھے لیکن غصے سے اس کا اندر کھول رہا تھا تب ہی تو اس کے منہ خالی سے کھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہاں شام ہر تھا لیکن خاتونہ خالہ اور قائم اگل تھے بلند بہت تھا اور

بڑنزل تھی۔

نزل اپنے نام کی طرح ہی تھی نرم خوب اور ہمدرد۔ وہ دو دنوں ایک ہی کالج میں تھے۔ ایک سال تک تو ان کے

میان ان کی بات نہ تھی۔ یہی تھی رسی لیکن پھر تب انہیں کس اور کیسے ان کے درمیان ایک دوستانہ سا تعلق

پیدا کیا تھا۔ نزل اس کی پیچیدگی تھی جی اس کی گھاس پیچیدگی خوب صورت تھی ذہین تھی۔

کی بار بار اس نے بہت دھیان سے اسے دیکھا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں بھی اس فرشتے کے علاوہ کوئی خیال نہیں آیا تھا غزالہ کے شک کرنے کے باوجود۔ اس روز وہ بہت ڈر تھا اور غزالہ کی بات پر بہت ہر ت ہو کر

گھر سے نکلا تھا۔ گھر صرف نزل تھی سو جانے کے لیے بلاناؤ نزل سے روکا گیا۔  
 ”بھی بھائی پتہ چاہیں۔ ختم خاندان کی آئی ہوئی ہیں۔ آئی ہسپتال میں مگر دیر ہو گئی ہے انہیں۔“  
 ”غزالہ بھائی کیسی ہیں؟“

اس نے پوچھا تھا اور پھر تپا نہیں کیوں وہ سب کچھ اس سے کہہ گیا تھا۔ وہ جی رہی اور ناسف سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”بھی بھائی آپ ان کا بہت خیال رکھیں پہلے سے زیادہ تو۔“  
 اس نے سمجھا یا تھا اور وہ دھڑکی سے مسکرا دیا تھا اور اس روز کے بعد وہ آکر نزل کی باتیں اس سے کرنے لگا تھا اور وہ بھی کسی بات کی دوست کی طرح اسے سمجھاتی مگر اور جو ملے سے کام لینے کا کئی اور نزل سے باتیں کر کے، ہلکا ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی ہی خوب صورتی سے بات کرتی تھی نرم اور دلکش لہجے میں کہ تو کی طرح غزالہ کے مزاجوں میں غبار ختم ہو جاتا تھا۔  
 ”اتھارہ آج اچانک میری شادی غزالہ کی بجائے نزل سے کر دیے تو۔“ نہ جانے کہاں سے یہ خیال میں آیا  
 وہ اپنی اس سوچ پر خودی حیران سا کھڑا کر گیا۔

”اس گھر میں سوائے عظمیٰ کے سب ہی بددقیق ہیں۔“  
 بلند بخت نے کیا تو ازبند اعلان کیا تو لی وی پر کرکٹ کا ایک پرانا بیچ کھتے ہوئے شاہ پرچہ نکلا۔  
 ”کیا مطلب ہے آپ کا بخت بھائی یعنی کہ میں بھی۔“  
 اس نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا اس کا ماز انا بلایا تھا جیسے اس بات سے انتہائی صدمہ پہنچا ہو۔  
 ”تو تو کر گیا۔“ بلند بخت نے دانی سے اکتا ہو کر نزل کے والے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔  
 ”یعنی کہ میں بھی۔“ شاہ میر کچھ اسب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔  
 ”تو تم میں کوئی سرغلاب کے گتے ہیں۔ تم بھی شاہوں خاور اور لالی کی طرح بددقیق ہو۔“  
 ”یہ زیادتی ہے بخت بھائی۔“ اسب اس کا انداز احتجاج کرنے لگا تھا۔  
 ”میں یقین شاہ میر کی سی کا خوشنود اور بددقیق کم از کم میری سی کا کوئی اسنوؤنڈ بددقیق نہیں ہو سکتا ارے بخت

بھائی میں رادرن۔“ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔  
 ”ہمارے جیسے بددقیق کسی میں ہو تو سامنے آئے۔“  
 ”جھا تو تم ”رادرن“ ہو سو رہی یار۔“ بلند بخت نے فوراً معذرت کی۔  
 ”مجھے خیال ہی نہیں ہوا تھا کہ تمہارے جیسے بددقیق تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا کسی کہ عظمیٰ بھی نہیں۔“  
 ”بالکل بالکل۔“ شاہ میر خوش ہو کر دیکھ کر کھنکھانے لگا۔  
 ”ہاں تو شاہ میر میری جان زور نورات میں ہے کتنی زبردست نظم کی ہے۔ کیا کہوں یا ریس ایک دم ہی آدہ ہوئی اور اس پر مگر مصرعے پر مصرعے جتنے ملے گئے کیا زبردست جتن تیار ہوئے۔“ سنو تو۔  
 بلند بخت نے کرکٹ کی جیب سے ایک لمبا چڑ نکالا اور اسے کھولے لگا۔ ”چر سارا بھر اہو تھا۔  
 ”بھائی کا گاڈ بخت بھائی یہ اتنی ہی ایک کیسی نظم ہے۔“  
 ”میں کو بھی وہ سرے کاغذ ہے۔“  
 ”یعنی اور بھی۔“ شاہ میر کراہا۔

”ہاں اور میں بھی ہیں میرے پاس۔ رات مزاج شاعرانہ ہو گیا تھا۔ دو تین غزلیں بھی ہو گئیں۔ یہ نظم سن لو پھر وہی سنا نا ہو۔“

بلند بخت نے کھار کا گھاٹا کیا۔  
 میں آج تجھے سے پھر گیا ہوں تو سچا ہوں

تو سچا ہوں  
 کہ میرے صدمہ میں کی پہلی گھڑی سے ہی ساتھ چل رہا تھا۔

غیر وصل تھا نہ رفاقتیں بھی  
 نہ وصل تھا نہ جدائیاں بھی

”بخت بھائی پلے میں ذرا بے چارے کو دل بھر پکا کلاسا سنتا ہوں۔“  
 شاہ میر نے استرا عامی اور لی وی کی آواز قدر سے بلند کر دی۔  
 ”یہ کچھ۔“ بلند بخت نے عینیں کڑی کی طرف دیکھا۔  
 ”یہ کچھ کافر پرانا جو کا میرا خیال ہے خود جاوید میاں اور گو بھی یاد نہ ہو گا کہجی اس نے یہ کچھ کیا تھا۔“  
 ”خلع۔“ جاوید میاں دل کو بھی کچھ نہیں سمجھ سکتا۔  
 ”چلنا لیا یا ریس لیکن اسے ایک سو اس بار دیکھو مجھے جو جب کہ میری نظم بیکار میں رہے ہو۔“  
 ”اور میں اسے ایک بڑا کرانیک سو اس بار دیکھو مجھے جو جب کہ میری نظم بیکار میں رہے ہو۔“  
 ”شاہ میر پوری طرح کچھ کی طرف متوجہ تھا۔ ابھی کچھ دیر بعد وہ نارنجی چھٹا لگتا تھا۔ شاہ میر کی آنکھوں میں ہلا

لی چمک گئی اور جس پر بلی جلی پر جوش کیفیت۔ بلند بخت کے لیوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اس نے کاغذ لپیٹ کر جیب میں رکھا۔  
 ”یار تم نے تو فی کا کام ڈھونڈا۔“  
 شبی عظمیٰ کا تھیں جس کا پیکٹ پڑے اندر داخل ہوئی اور پھر بلند بخت کو دیکھ کر چوگی۔  
 ”ارے بخت بھائی آپ آئے۔“

بلند بخت کو دیکھ کر اس کا چوہ چمکنے لگا تھا کہ اس گھر میں سب سے پہلے عظمیٰ اس سے بے تکلف ہوئی تھی۔ جب وہ کمرے اندر آئے جانے لگا تھا اور ایک طرح سے کمرے کی حیثیت ہی اقتدار کر لی تھی تو شروع شروع میں اس کا شاہ اور زینت فاطمہ کا انداز لیا دیا تھا۔ بلند بخت سے بے تکلفی سے بات نہ کرتی تھیں کوئی بات ہوئی تو جواب دے دیتیں نہیں تو خاموش رہتیں۔ اس شاہ۔ سمجھتی تھیں تو بلی بات نہیں سمجھتی وہ نوجوان لڑکی تھیں۔ بے شک بلند بخت شاہوں کا دوست تھا۔ فاطمہ انکل اور خمنہ آئی سے جانا کتنی تھیں۔ لیکن تھا تو غیر مروتی تھیں۔ لیکن وقت فاطمہ کا اتنا تکلف سے بات کرنا بلند بخت کو عجیب لگتا تھا اور اس جیسے بے تکلف شخص کے لیے ابھیں کا کہیں بھی نہ جاتا تھا جبکہ خمنہ اور فاطمہ شاہ کے گھر میں وہ اب سب سے زیادتی مل کر آتا تھا۔ خمنہ اس سے ڈھیروں باتیں کرتی تھیں۔ شبی ایک روز وہ شاہوں سے ملنے آیا اور اس کے اصرار کے باوجود اس کے ساتھ اندر کھائے۔  
 لینے نہ کیا تو شاہوں نے جو حیرت ہوئی۔

”پچھو اور سدا۔“ اسے نہیں بلوگے بخت۔  
 ”یار مجھے لگتا ہے پچھو اور سدا اسماعیلی میری بیوی سے ڈر رہا ہو جاتی ہیں۔ تم میری وجہ سے اپنے گھر کا مینٹ اپ خراب نہ کرو۔“  
 ”اب تو خراب ہو چکا۔“ شاہوں نے مسکراتے لیکن پھر فوراً ”ہی جمیدہ ہو گئے۔“  
 ”تمہارا اتنا تو پچھو کو برا لگتا ہے بخت نہ سدا اس کو لیکن تمہیں ہماری جولی کے احوال کا تو علم ہے۔ بس تم سے بات کرتے سمجھتی ہیں۔ حالانکہ پچھو تمہیں بہت مس کرتی ہیں کہ ایک ہفتے سے نہیں آ رہے تو کتنی باری پچھو چکی ہیں۔“  
 ”جی جی۔“

بلند بخت کی سیاہ آنکھیں جگر جگر کرنے لگیں۔ اسے سمجھتیں مگر جوشی غلوں اپنا بہت بہت بھاتی تھیں،  
 حالانکہ اسے اپنے خاندان میں سے خامشا تمجی میں تھیں پھر بھی وہ عینوں کی بہت قدر کرتا تھا۔ شاہوں خاور اس پر

یونہی رہی کہ غافلے میں کسی بھی اس پر بہت ہنستے تھے۔

”یار میرے کیا غور توں کی طرح ڈانڑیاں بھر کر بھی ہیں غمخواروں اور غمخواروں سے“  
شاہ رخ نے اس کی الماری میں سر بھی بے شمار ڈانڑیاں لگا کر لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔

”کہیں کیا لڑکوں کو اچھا شعر انٹیک نہیں کر سکتا۔ مجھے جو شعر نظم اثر کرکٹ کرتی ہے میں لکھ لیتا ہوں۔“  
اس نے ڈانڑیاں شاہ رخ سے بچھین لی تھیں۔

بالکل ٹھیکوں کی طرح ہی کوئی ٹریڈی پڑھ کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔ جب پہلی بار انہوں نے ایک ساتھ ایک ایسی مہووی دیکھی جس کا انجام انتہائی المناک تھا تو اس کی سرخ آنکھیں اور پہلی ٹپکس دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ وہ اتنا ہی حساس تھا تو اس کی تیر خورت پر ناؤ اور ذرا سی بات پر اداس ہو جاتا تھا۔ اسے زینت فاطمہ کا لایا یا انداز دیکھتا تھا کہیں عظمیٰ کوئی آتی تو اس کی جلدی اس سے بے تکلف ہوتی کہ زینت فاطمہ کی بے اعتنائی کا خیال جانا بارہو عظمیٰ کو کچھ سے بچوں کی طرح خیر نہ کرتا تھا وہ سیدہ اس سے صرف ایک کلاس پہنچے تھی مگر عمر میں وہ تقریباً ”تین سال چھوٹی تھی اس سے لیکن اس کا سبھی نتیجہ وہی تھا جتنی ہی چلی اور شاہ رخ عظمیٰ نے لاہور آجائے سے رونق سی ہوئی تھی اور قائم شاہ کی توجہ وہ جان گئی۔

”زینت فاطمہ عظمیٰ کو بالکل بھڑکائی ہے۔ نہ ہے نہ تا۔“ وہ کہتے تھے۔  
”میں قاتی یہ تو بالکل ہوتی کیا جیسی ہے سو کی بھی تازہ کدل تیر شاہ رخ گیا ہے مزاج۔“ بھی مادتا۔ ”بھی۔“  
”وہ شکار بھی۔“ وہ تفرہ لگاتے۔

”اب دعا کریں کہ کہیں وہ میرے نقص قدم پر چلے ہوئے اپنی پند سے شادی نہ کر لے ڈرنے کو چلی میں ایک بار بہت دنوں سے انہوں نے جو چلی جانے کی چھوڑ دی تھی۔ بتائیں زینت فاطمہ نے انہیں کچھ بتایا تھا یا نہ اور

ی انہیں اور اک ہو گیا تھا کہ اب وہ روانے بھی ان کے لیے نہیں کھل سکتے۔

”یہاں سہی سے تول لیتے تھے سوا سبلی بیجان شاہ رخ سب بھائیوں اور ذرا کر کے کچھ پر سکے آئے ہوں۔“ انہوں نے قدرے توجہ سے جواب دیا۔

”اور ایک گورڈون کے ساتھ بیٹھا ایک لقمہ سنانے کی کوشش کر رہا تھا۔“  
”لقمہ۔“ عظمیٰ نے فوراً ”بھیر“ کا لفظ آگے لگا۔

”یہ لیس تا چھس اور اب سر کی مگر کفر کیا تھی بوسہ شاہ کی فرحت عباس شاہ کی۔“  
وہ شوق نظروں سے اے دیکھنے لگی۔

دونوں میں اکثر نظروں کا تبادلہ ہو آ رہتا تھا۔ عظمیٰ نے اسے اپنا سارا انتخاب دکھایا تھا اور بلند بخت نے بھی اسے اچھی اچھی شاعری کی بس پڑھنے کو دی تھیں۔ بھی وہ دونوں سب سے بے نیاز ایک دوسرے کا پہلی پند ہیہ نظمیں سنانے۔

ان تین سالوں میں اجنبیت بالکل نہیں رہی تھی۔ عظمیٰ اب تھوڑا بڑھ چکی تھی جب کہ سیدہ اساتہ میرزا بیک کے دوسرے سال میں تھیں۔ اس کے نمبر اچھے تھے وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اور شاہ رخ نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ پڑھائی کے وہ پہلے ہی خلاف نہ تھے یہاں وہ چاہتے تھے کہ سیدہ اساتہ کے بجائے شاہ رخ کے لڑکھن جانے اور سیدہ اساتہ اپنی پند کے کسی شخص میں ماسزور کر لیں لیکن شاہ رخ میرے صاف انکار کر دیا تھا۔

”یہ سائنس کے فارمولے مجھ سے رہنے نہیں جاتے شاہ رخ کی کیا بات یا ایف ایس سی کیسے میں نے روئے دھوئے کیا ہے وہ بھی اگر دوستوں کی مدد مثال حال نہ ہوئی تو میں نے تو پچھلی میں جانا تھا ایف ایس سی میں اور پھر وہ ایوں کی بات تو میرا دل اٹنے لگا۔“  
اور شاہ رخ کیوں پر مسکرا رہی تھی۔

یوں شاہ رخ نے اپنی پند سے آنا کس دو کپیٹر سائنس کے سیکھیجھ پنے تھے اور سیدہ اساتہ کو اس کے شوق اور اچھے نمبروں کی وجہ سے ڈاکٹر بننے کی باز جانتہ رہی تھی۔

”مجھے خاندان میں ایک ڈاکٹر بننا چاہیے۔“  
اور عظمیٰ اس نے تو سچیل ایف اے کرنے کے بعد اب تھوڑا بڑھ چکی تھی۔

”میں اردو میں اے اے کروں گی۔“  
”کیا اردو میں کوئی ماسزور کرنے والا سیکھیجھ ہے۔“ شاہ رخ اسے جڑاتا۔

”اور پھر خانی میں ماسزور لیں گی۔“  
وہ شاہ رخ کی پند میں کئی کئی کلاس کا کارہا دیتے تھا اور اب تو بلند بخت بھی اس کی پوری سپورٹ کرتا تھا۔  
”عظمیٰ خرم خرم اردو میں ہی ماسزور۔ میں خود کرنا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس میرے بزرگوں کے خواب میرے خوابوں سے بھر گئے۔“

”اور میری سیدہ۔“ عظمیٰ کو کچھ افسوس ہوتا۔  
”وہ بھی کوئی شاعر بن۔“ بلند بخت اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”ہائے نہیں بخت بھائی وہ بھی شاہ رخ کی اچھی نظم ہے۔“  
کاش میں تیرے حسین ہاتھ کا لکھوں اور فزعت عباس شاہ کی وہ شام کے بعد“

”اس سے بھی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔“  
”اچھا پھر ضرور اچھا اسلام آباد کی بھی ہوگی۔“ سائے نا مجھے۔ آپ کو تو پتا ہے نا مجھے اچھا اسلام آباد کی نظمیں کتنی پند ہیں۔ کیا کوئی ان لکھ ہے۔“

”ہاں سے توئی ہی بیان امجد کی نہیں ہے۔“  
”پھر کس کی ہے۔“ وہ اشتیاق سے بلند بخت کو دیکھ رہی تھی۔ بلند بخت نے پھر کوٹ کی جیب سے لقمہ نکالی۔

”ختم ہو گیا تھا۔“ بلند بخت نے وہی آف ایف ایف کی طرف دکھا۔  
”بخت بھائی یہ خود لکھی ہے اور وہ بھی میں چار صفحات پر مشتمل۔“

”عظمیٰ! یہ بھائی سے اسے دیکھ رہی تھی۔  
”آپ نے پہلے تو بھی نہیں بتایا کہ آپ لکھتے ہیں۔“ اس نے گھر کیا۔

”پتے مجھے خود بھی نہیں تھا۔“ بلند بخت اب کاغذ کھول رہا تھا۔  
”وہ اصل کئی بھی یاداری کے جرم بعض اوقات شروع میں کتب میں آ جتا تھا۔

”شاہ رخ میرے بچپن کے کام تو بلند بخت نے اس کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا۔  
”لیکن خرم تو تیرا اپنی کرکٹ کے جراثیم موجود تھے۔“

”ہاں۔“ وہ راز۔  
”شاہ رخ میرا ہنسنے دیتا۔“ عظمیٰ پر شوق نظروں سے بلند بخت کو دیکھ رہی تھی بلند بخت کھکا راز۔

”بھائی یہ شاعر شام حضرت کا۔ سنانے سے پہلے کھکا رہے کیوں ہیں۔ کیا یہ بھی کوئی فیشن ہے۔“  
شاہ رخ میرے مصغریت سے تو بچاؤ عظمیٰ نے اسے گھورا۔

”میں آج تجھ سے چھڑ گیا ہوں۔“  
”تو سوچتا ہوں۔“

”کہ مجھ کو موسم ملن کی پکڑ گئی ہے اس ساتھ چل رہا تھا۔  
مجھ میں یہ رفاقتیں تھیں

ند وصل تھا نہ جدا کیاں تھیں

”واہ“ بھٹکی کے لبوں سے اُبھار نکلا۔  
 ”پہلی نظم اور وہ بھی اس قدر ”دیوبلی“ خدا خواستہ کوئی حادثہ تو ہوا تاہم اس پر نہیں مگرز کیا۔“  
 شاہ میر کی نگاہوں میں شرارت تھی۔  
 ”بڑے کچھ سے شاہ میر“ بلند بخت غالباً ”بھٹکی کو وجہ سے بھیج دیا۔

”کیسے بلند بخت بھائی! کہیں کی بات ہے آپ جتنیں دوست اسٹری بھائی شاہ میر بھائی اور آپ ابھی تک اندر سے پھر رہے ہیں جب کہ آپ کی عمر کے لوگ نین میں نین چوس کر کباب پختہ ہی دیکھتے ہوں گے لیکن آپ نہیں۔“  
 اس نے بات ادھوری چھوڑی اور نچلے پوٹ کا دیوانہ ہوا توں گئے دیا کر شرارت سے کمر اٹایا۔  
 ”ابھی تم خود ہیجے ہیں میری جان۔“ اور بھٹکی بی بی ذرا دیکھے اگر شاہ میر خدا و حور ربانی آرائش و زیبائش سے فارغ ہو چکا ہو تو اسے کتنا کہ کس ایشانہ ہو کہ ان کی تپری تک دوامداد کو لے کر رخصت ہو چکا ہو اور ہم خالی کرسیوں اور میزوں کو کسائی دے کر اپنی آجائیں۔“

بھٹکی نے سامنے ٹاکا پر نظر ڈالی ”دور یہاں تو سنا ہے بارائیں گیا یہ بجے سے پہلے نہیں آئیں“ عمدہ خالہ بتا رہی تھی۔

”بہ زور اپنی دھڑ سے لوگ ہیں وقت کے تحت پابند۔“ بلند بخت نے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”بھائی! افسوس۔“  
 ”یہ خود پڑھ لیت۔“ بلند بخت نے فراخی دی ہے اور راق اس کے حوالے کر دیے اور شاہ میر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ہاں تو صاحبزادے کیا فرما رہے تھے آپ۔“ بلند بخت نے اس کا کان پکڑ کر ہلکا سا مڑا۔

”صاحب! غلط کر رہا تھا۔“  
 ”جہاں کان تو چھوڑ۔“

”بات یہ ہے۔“ بلند بخت نے اس کا کان چھوڑتے ہوئے سرگوئی کی۔  
 ”پہلے تو ہم تینوں کا خیال تھا کہ امریکہ سے ملے آئیں گے عمر میری بیوی ہوتی تو یہاں بھی میری راشن بن جاتی۔ رعب اب پڑا تو لوگوں پر کین پھر ہوا تو اس کے میرے امریکہ جانے کا نکلے تو میرے چھٹے ہانا کو غشی کے دورے پڑنے لگے۔ تہی سال کی عمر۔ میں دیر ہی کیا کہ کین رخصت ہی نہ ہو جائیں۔ پھر چھوٹے ہانا کا بلڈ پریشر نہ ہو گیا اور انہوں نے کہا۔“

”بیٹا مجھے اپنے ہاتھوں پر تیش امار کر جانا میریوں کے ہاتھوں تاجہ نہ اٹھتے تب سے بیٹائی انتظار میں ہوں لیکن چھوٹے ہانا کا کافی خیال جانے کا کوئی ارادہ نہیں لگتا اور شاہ میر فرمایاں میرا ساتھ بھار ہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں وفا میری جان۔“

”تو پھر مجبوراً“ یہاں ہی بند کر لیں۔“ شاہ میر نے مشورہ دیا۔  
 ”میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میرے بچے عہد تھا نا صاحبان کسی ایک خاندان اور ایک لڑکی پر متفق نہیں ہوتے شکر ہے بڑے ہانا اس جھگڑے میں پڑنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے ورنہ وہ کئی انچہ بھائیوں کی طرح اس وقت حیران و پریشان و سرگرداں ہوتے۔“

”اور اسٹری بھائی اور شاہ میر بھائی آپ کا ساتھ بھار ہے ہیں۔“

”بالکل بالکل وفاق اور دوستی اسے ہی کہتے ہیں۔“ بلند بخت نے بڑے زور و شور سے سر ہرایا۔

تب شاہ میر لاؤنڈ میں داخل ہوئے۔  
 ”سوئی یا د نہیں انتظار کرنا پڑا۔“ میں کوشاں ہی ذرا آرام کے لیے لیٹا تو آنکھ لگ گئی کیا خیال ہے چلتی

”اب۔“

بلند بخت نے کلاہی سوڑ کر وقت نکھا۔  
 ”جو بچے تک لٹکے گئے بیٹھ جاؤ اور ایک ایک کپ چائے نہ ہو جائے۔“  
 ”ہاں کیوں نہیں۔“ شاہ میر نے شاہ میر کی طرف نکھا۔  
 ”جہاں چائے کا کدو۔“

”دیکھ لے کوس کی شادی میں جانا ہے۔“ شاہ میر نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ایک لوگ ہیں۔“ بلند بخت نے جواب دے کر شاہ میر کی طرف نکھا۔  
 ”آج تو نصف چار ہے۔ ہمارے سامنے تو بھی میری ویلیو زیرو ہو جاتی ہے۔ آج تو لگتا ہے خوب دل لگا کر تیار ہوئے ہیں۔ تو اس لئے تو آج گھاس بھی کھیں ڈالیں۔“ شاہ میر نے ایک شیشی نظراس پر ڈالی۔  
 ”شاہ میر کا تو بچہ ظاہر کر لیا۔“

”شاہ میر اب پچھ نہیں ہے اپنا پار ہے جاتا ہے سب۔“ بلند بخت نے غشی سے کہل شش و شریر توہم پیش سے تھا ہاں میر کی محنت نے چار چاند لگائے تھے۔ دونوں مل کر وقت نکاتے تھے۔

شاہ میر پہلے سے بھی زیادہ عجیبہ ہو گئے تھے۔ ایک بڑی سوزی کیفیت آنکھوں میں آٹھمیری تھی۔ جانے کس آگہی کے کرب سے ان کا دل چھٹا رہتا تھا۔ انہوں نے بھی انی خیال ہوا جا کر بڑھنے کا ارادہ لٹو کر یا تھا۔ بلند بخت کے خاندان والے کی صورت اسے بار بھیجے کو تیار نہ تھے۔ اس کے کچھ پر تلے ہالعو تھے اور انہوں نے بھی انہوں ترک کر دیا تھا۔ کلاہی کے اسٹراور بلند بخت نے بتے اس کیا۔ لیکن ان کا دل یکدم ہی اجاٹ ہو گیا تھا۔ اب ہر وقت جیسے ایک بھاری سایہ چہرہ پر رہتا تھا۔ تقریباً ”دوسال پہلے جس طرح شاہ میر نے رات کے وقت شاہ بابا کو حویلی کے اندر دلی تھے میں پکڑ کر لگاں دیا تھا۔ اس سے انہیں بہت تکلیف ہوئی تھی اور پہلی بار انہوں نے اس صبح شاہ بابا کو اسے تھمتے میں رکھا تھا۔ دھڑکے کو اواز نہ تھے۔“

”زنجیریں ڈال دو! وہاں میں اور چار ہائی کے ساتھ باہر دو۔“ آئندہ مجھے حویلی کے اندر کی طرف جانے نہ دیں اور تم لوگ کیا لیٹو گن کر سوتے ہو کہ تمہیں بتائیں چلا کہ وہ رات کے وقت کدھر جا رہے ہیں۔“

”وہ ہے خواس میں نہیں تھے شادی۔“ شاہ میر کا چھٹا میں لگا تھا یہ سب۔  
 ”میں نے پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ انہیں کسی آگے ڈاکو کی ضرورت ہے۔“  
 ”شاہ میر شاہ میر جی سے آپ کا تعلق نہیں ہے اس میں دخل مستدیر۔“  
 ”شاہ میر کی آواز گونگے پہ بلند نہ تھی لیکن اس میں شش تھی۔  
 ”میرا تعلق یہ نہیں ہے۔“ شاہ میر نے جڑالی سے سوچا تھا۔

”کیا میں اس حویلی کا کلاہی نہیں ہوں اور حویلی میں ہونے والے واقعات کیا براہ راست یا بلا واسطہ مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتے اور شاہ بابا۔“

ان کا دل ان کے لیے بدی سے بھر گیا۔ انہیں رات کو ان کی کیفیت دیکھ کر ترس آیا تھا اور اس وقت بھی ان کا دل بہت گدگد کر رہا تھا اس لیے شاہ میر کی تنبیہ کے بعد جو دھڑکے کے جانے کے بعد انہوں نے پھر کہا۔  
 ”شاہ بابا کا کلاہی حویلی میں سب کے ساتھ گھومنے کو چاہتا ہے اس عرش خدائی بہت تکلیف دہوتی ہے شاہ میر۔“  
 ”تو۔“

شاہ میر نے معنوں پر اپنی تھی۔  
 ”بھیلے رہنا چاہیں لیکن حویلی میں رہنے والے شاہ بابا کا خاندان نہیں ہیں شاہ میر شاہ۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھیے۔“  
 ”میرا مطلب۔“ شاہ میر کو جھٹ کی عادت تھی۔ میری پھر بھی وہ اچھ رہے تھے۔  
 ”کیا شاہ بابا بڑے شادی کی اولاد ہیں اور کیا وہاں کی ان کی بھائی نہیں تھیں۔“

”بڑے شاہی کے بیٹے یا ان کی ایک غلطی کی نشانی۔ شاہ رخ کیا آپ نہیں جانتے کہ شاہیاد بے کسی کی عورت کا دل وہ ہے اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون صرف بڑے شاہی کا نہیں اس کی عورت کا بھی ہے اس لیے ہمارے خاندان سے نہیں ہیں۔ ہمارا خاندان وہ ہے جس کے خون میں ملاوٹ نہیں۔“

شاہی کا قصہ ایک سوچ بیک تھا اور وہ بشکل غصہ ضبط کر رہے تھے۔  
”اور شاہ رخ شاہی مجھے ہرگز نہیں پسند ہے یہ کہ آپ ان کے معاملات میں دلچسپی لیں۔ میں بہتر جان ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“

اور اس روز شاہ رخ کو لگا تھا کہ شاہی کبھی بھی قادی چکا کو معاف نہیں کر سکتے اور نہ ہی کبھی شیخ اور شاہ رخ کو اپنے خاندان کا فرد تسلیم کر سکتے ہیں اور وہ جو ان کے دل میں ایک امیر کا دیا سا جہاں رہتا تھا کبھی وہ شاہی کو متاثر نہ کرے گا وہ قادی چکا کو معاف کر دیں اس روز مجھے کچھ مدد ہوئی اور رگن گھر سے جو لی ہے لوٹے تھے اور تب سے ہی یہ جو جہان کے بدل پر دھرا تھا وہ شاہیاد کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔  
وہ قادی چکا کے لیے جو لی کے دروازے نہیں کھول سکتے تھے۔

شاہی سوچتا ہو گا شاہ میر کا بہن۔  
”کچھ میر کے جانے کے بعد انہوں نے بلند بخت سے کچھ کرنا چاہا لیکن بلند بخت نے انہیں نوک دیا۔“

”کچھ نہیں سوچتا ہو گا جانتا ہے مجھے بھی اور تمہیں بھی۔“  
تبھی فون کی بیل ہوئی تو وہ چلایا ”کچھ کتے کتے رہ گئے اور فون کی طرف بڑھ گئے۔“  
”بیچو! دوسری طرف زارا بھی۔“

”ارے زارا کیسی ہو؟“ ان کے لیے میں بڑے بھائیوں کی سی شفقت تھی۔ دوسری طرف زارا ایک سو روپڑی۔  
”کیا ہوا زارا کیوں دوسری ہیں آپ۔“ وہ فیکس مگر رہا۔

”وہ شاہ نسیب۔“ زارا کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔  
”کیا ہوا شاہ نسیب کو؟ زارا جلد ہی بتائیں۔“

انہیں لگا تھا جیسے ان کا دل میں پیچھا بھاگ رہا ہو۔ ریمو پر ان کی گرفت ختم ہو گئی تھی۔  
”بعد راتوں سے گھر نہیں آئے۔“ زارا نے بتایا۔

”کیا مطلب؟ کیا بتا کر نہیں گیا تھا شاہ نسیب؟ کیا خبر اسلام آباد چلا گیا ہو تم نے موبائل پر رنگ کیا۔“  
وہ مسلسل سوال کر رہے تھے۔

”نہیں وہ اسلام آباد نہیں گئے۔ ایک دوست سے ملنے کا کہہ کر شام کو گھر سے نکلے تھے پھر آئے نہیں۔ وہ راتیں گزر گئیں اور اب پھر رات آنے والی ہے۔“

”کیا پہلے بھی ایسی طرح غصہ کرتے تھے کہ گیا ہے۔“ شاہ رخ نے ایک مگری سانس لے کر پوچھا۔  
”بڑے گھر والے بھی صرف ایک رات نہیں آتے تھے دوسرے روز دن میں آگئے تھے۔“

”بڑے گھر والے نہیں آتے تھے۔“ میں آ رہا ہوں مگر یہ جانتا تھا کہ وہ وہاں رہنے والی تو فون نہیں کیا تھا۔  
”نہیں۔“ زارا نے بتایا۔ ”میں نے سوچا شاہی اور بی بی جان پریشان ہو جائیں گی اور مجھ۔“

وہ پھر روئے گئی تھی۔  
”پریشان نہیں ہو نا زارا اور اب شاہ نسیب کے دوستوں کے فون نمبر مل جائیں تو ادھر ہر گز کوں بہت جلد پہنچا رہا ہوں تمہارے پاس۔“

شاہ رخ نے مڑ کر بلند بخت کو ساری بات بتائی۔ جو پریشان سا مصیبت حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر اپنا پورٹ فون کرنے کے لیے نمبر ملانے لگا۔



”کیا ہوا میںوں کی حیثیت کا۔“  
”سرمزاد نے اسمبلی میں یہ پوچھ لیا۔ وہ کچھ لٹ آئی تھیں۔ اسمبلی شروع ہو چکی تھی۔ قرات وقت کے بعد ایک لڑکی کی بات پر بلند رہی تھی۔ بار بار یہی کہتا تھا کہ اس کا مطلب علم سچا اسمبلی میں کسی نہ کسی ٹاکیڈ پر لیا تھا۔“  
”سرمزاد نے کئی دن میں قدم نہ اٹھایا تھا وہ پورے ایک ماہ تو کویہ لیا تھا جو جماعت دوم کی قمار کے پیچھے خاموشی سے سرھٹکے کھڑی تھی۔ اور گھر سے بہتر سرمزاد ہوئے ہوں چلتی ہوئی اس کے قریب آکھڑی ہوئی تھیں۔“

”میں ہوں سکی۔“ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔  
”تمہارا اوکل ڈومر پر نامیہ تھا اس بار پھر۔“

”ہاں ہنس نہیں ہو سکی۔“  
”اور تم کی سی نہیں اس سڑکے کو منوں سے ملے۔“

”ہاں غصے نے بتایا تھا وہ بتا رہا ہے۔ بخار رہنے لگا ہے۔ میں نے ساتھ چلنے کی فدی کی تو غصہ مجھے لے گئے۔ وہ ان چند ماہ میں بہت تیز ہو گیا ہے۔ میں دوسری بار اس سے ملاقات کے لیے گئی تھی۔“ اس نے وہاں اس حالت میں دیکھنا نہایت تشویش دہکے سرمزاد۔

”کچھ کہنا تھا۔“  
”کچھ نہیں ہنس سرھٹکے بیٹھا۔ میں اور غصہ ہی بات کرتے رہے۔ وہ بہت نامیہ اوپاوس لگ رہا تھا۔“

اس نے مجھ سے کہا کہ میں ان کیوں آپ کا قاتل نہیں ہے لیکن غصے نے کہا ہے کہ تمہارے لیے وہاں بھی اور میں خود ساتھ لیا ہوں۔ سرمزاد میرا بھائی ستلہ وہ جو ہم سب کی امیدوں کا مرکز تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنی خاموشی اور نامیہ تھی جیسے وہ اپنے جوئے شخص کی آنکھوں میں ہوئی ہے۔ سرمزاد وہ دھچکا جائے گا۔ میرا بھائی وہ ہے

تمہارے پھر سے سزا دینے ہو سکتی ہے۔  
وہ ہونے کو لے گیا میں کر دی تھیں کہ ڈاک صاحب نے اچانک چپچپے سے آکر انہیں ڈانڈا دیا۔

”میں ہاؤس سرمزاد پر بے افسوس کی بات ہے کہ آپ اسمبلی میں کھڑے ہو کر باتیں کر رہی ہیں جب آپ باتیں کریں گی تو بچوں سے کیا کہنا ہے کہ ان کی باتیں کریں گے اسمبلی میں۔“

”سواری سر۔“ ہاؤس نے فوراً سواری کر لیا۔  
”اس نے کھلے سامنے کھڑی کھڑی پھوڑا کر کہا کہ یہاں آپ بڑھانے آئی ہیں۔“

”سزا ڈاک تو موقع چاہے ہو تھا تو انہوں نے کاٹنا مگر مجھ پر مزہ مڑا رہے دیکھنے لگیں۔“  
”اور میں ہاؤس پر کچھ عجائبات کرنے لگی ہیں اور ہماری چٹھیاں انورڈ میں کر سکتے۔“

”سرمزاد مجھے اپنا پورا اثر کھپا کر لے کر آتا تھا۔“  
”اس کے لیے آپ کوئی اور سندوست کریں ان چند دنوں میں آپ نے تین چٹھیاں کی ہیں۔“

”وہ دراصل۔“ ہاؤس نے کچھ کہنا چاہا۔  
”پھر کو جو کچھ کہنا ہے اسمبلی کے بعد میرے آفس میں آکر کہے گا۔“

بچوں نے تڑانے دینا شروع کر دیا اور وہ کویہ لیا ہاؤس کے قریب کھڑے ہو گئے کہ ان کا ہاؤس انورڈ کے بانڈ سے مٹا ہوا تھا۔ انورڈ نے انتظار وہ دم چپچپے جٹ گئی۔ تڑانے کے بعد ڈاک صاحب تو اپنے آفس کی طرف چلے گئے

اسٹوڈنٹ اپنی اپنی کلاس کی طرف جاری تھیں جب ہاؤس نے سرمزاد کی طرف دیکھا۔  
”جو تمہیں کیا باتیں کہے۔“

”جو تمہیں میں خاموشی سے سن لیتا۔ ان حالات میں جا ب تمہاری ضرورت ہے۔“ سرمزاد نے مشورہ دیا۔  
”آپ خواہ خواہ ذلیل ہوئی ہیں سرمزاد آپ کو جا ب کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ ان کے ساتھ چلے ہوئے





”جائی توں ماہ جس میں نے اُصیاطا“ تم سے ذکر کیا ہے اور ہاں پھر تمہاری مٹکی کی تقریب کا کوئی سلسلہ نہیں ہوا۔“

”ہیوں میں قوت پڑے ہو گی بھی یا پھر حالات ایسے نہ تھے کہ کوئی تعویذ کی جانی۔“ سہمب ابھی تک منوں کے غم سے نہیں نکل سکے، مرمز مراد نے ہر دن پہلے سے زیادہ کراہا۔ ”جہزات کا خانوں پر برسوا ہوتی ہے ہمار ی۔“ ”ہاں میں نے دراصل ہوں پوچھ لیا کہ اس روز تمہارے ہاتھ میں رنگ تھی تو میں نے سوچا شاید سدا کی سے تعویذ کر دی ہو۔“ غم نے پہلے ہی رنگ نہیں پٹا۔“

”اے ماما اور علیہ وغیرہ تمہارے لیے خریداری کر رہی ہیں تو میرا بیچا چاہتا ہے اپنی طرف سے بھی تمہارے لیے کچھ لو۔ یہ نسبت جو میرے اور تمہارے درمیان ہے پانی ہے میرا بیچا چاہتا تھا اس خوب صورت بوندھن کی یادگار کے طور پر میں تمہارے لیے جو رنگ خریدیں۔ یہ یہ صرف رنگ نہیں ہے یہ ماہ اس میں میرے بہت سے خوب صورت جذبے ہیں۔ ہمیں۔ میری تخیلی طرحوں میں اعتبار اور یقین حالات میں نہیں رہے کہ ہم کو کوئی خوشی ملے۔ میں نے اپنے کارفرما پر ہم بھی خوشی کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن یہ رنگ میں ابھی تمہاری نذر کرنا چاہتا ہوں۔ اس معزوبہ تعلق کی نشانی کے طور پر جو اے میرے درمیان ہے۔ یہ خوب صورت رشتے کے لیے جو اے میرے بزرگوں نے دونوں کے لیے طے کیا ہے۔ یہ رنگ اس بات کی علامت ہو گا کہ ہم میری ہو۔“

”میلن خضر میں اماں ایسا بے کیا ہوئی کہ یہ پہلے آپ کے لیے اچھی۔“  
 ”نہیں ماہ تم اسے داپس مت کرو۔ کوئی کچھ نہیں گئے، جاؤ تو پتھر پھینکو تیار رہا۔“  
 اور تب وہ خاموش ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ خضر یہ اماں جانے گا تب گھر جاتے ہی اس نے طبع کو تیار کر دیا کچھ

”میں نہیں لینا چاہتی تھی لیکن وہ خضر۔“  
”ٹھیک ہے۔“

”واینا! بیچ ہے کہ ہم نے تمہارا رشتہ خضر سے طے کر دیا ہے۔ لیکن بیٹا میں مناسب نہیں سمجھتی کہ تم یہ رعب اپنے رعبوں کے ساتھ کسی کو بتاؤ گی خضر نے دی ہے، ہو سکتا ہے کہ سعدیہ بھابی اور علیہہ وغیرہ کو اچھا نہ لگے بیٹا اس کو خیال کر رکھو۔“

”ماں نے کہا تھا۔“

”میں تو خود آپ سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔ بس اپنی پریشانیوں میں الجھ کر پوچھ ہی نہیں پائی۔ بھنے میں ایک بار تو اپنے کاموں سے ملتا ہے اور گھر کا کہیں بیٹھ سوچتی ہوں کہ کل ضرور آپ سے پوچھوں گی کہ کیا مسئلہ ہے۔“

”میرا تو نے ایک کھری سانس لی۔“  
 ”میرا تو نے شادی کر لی ہے وہاں۔۔۔“ ان کی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی۔ ماہ نور نے بے اختیار ان کے بازو پر

”کب کیوں۔“

”میں کاتو میرے پاس جواب نہیں۔ شاید اسے ضرورت تھی۔ شاید میں نے انہوں نے لب بچھ لیے  
 بال فوران کے بازو پر ہاتھ رکھے تاسف سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ بھلا کیا کبھی مسز مراد میں جو۔“

کچھ دیر کے توقف کے بعد انہوں نے اپنی اور مراد کی ساری گفتگو ماہ نور کو بتادی۔ اور ماہ نور کو سمجھ نہیں آ رہا تھا

”میں نے بھالی بھالی کو تپا۔“ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔  
 ”نہیں کسی کو بھی نہیں، مجھے اپنا بھرم نہیں کھونا۔ تم بھی کسی سے مت کہنا۔ مجھے لگتا تھا میں کسی سے یہ دکھ

”کتاب کیسے رہیں گی بالکل آگلی، بالکل تھلا“

یہ جاب بھی تو تمہاری یاد رکھنے کا ایک ذریعہ ہی ہے نہ۔"

اور انہوں نے کوئی اور رکے گا جو درجہ عاقل یا حادو چاہے ہوئے جی مادور سے پیر میں

نہیں۔ ان کے لیے یہی سبب ہے۔

ہاں! میں ایک فکشنسٹ ہوں۔ میں یہ فکشنسٹ کی ان ایب سے ہوں جو حلقوں کے ہاں حلقہ۔ ان حلقوں کے

مگر اچھی پہاڑی زندگی تمہارا نہیں ہے تو لوگوں سے ملنا ملنا رکھنا چاہیے تب ہی توجہ بیگم مسرور انیس

میں نے تو یہ سنا تھا کہ ان کے ہاں غفلت میلاؤں وغیرہ میں کئی تھیں۔ ان کے میں ایک بڑے بزنس

انہوں نے اپنے تمام پرانے پروسیوں کو انوائٹ کیا تھا۔ لیکن وہاں جا کر وہ بہت بور ہوئیں۔ سب ہی بزرگ

میرا نام نلی ہے میں بہت دیر سے آپ کو چاہ کر رہی تھی کہ آپ آج آکر مجھے مل سکیں۔

”میں اکیلی ہی آئی ہوں۔ میرے اسمبلینگ ملک سے باہر ہوتے ہیں۔“

۴۳ اس نے ہونٹ سکپڑے۔

”کتنے عرصہ بعد آتے ہیں۔“

”پانچ سال بعد پھر کھائے۔“

”بچے۔“ اس نے سوائے نظروں سے انہیں دیکھا۔

”نہیں ہیں۔“

”ہاں! گاؤں کی سبقت کرتا ہے آپ؟ آپ کا پوسٹل بھی میں نے کسی فنکشن میں نہیں دیکھا۔“

”میں چاہ کرٹی ہوں ایک اسکول میں۔“ انہوں نے بتایا۔

”اور اسکول سے آگیا ہی وقت۔“

”ہاں! وہی دیکھتے ہوئے گزر جاتا ہے۔“

”آپ کو فرسٹیشن نہیں ہوتی سڑ۔“

”مسز مراد۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ دیا۔

”آپ کی کلب کو جان کیوں نہیں کر لیتیں۔“ وہ خاموش رہی تھیں۔

”یہ موت۔“ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

”یہ خود قیامتہ جیہ ہیں وہ دوسرے ٹکوں میں جا کر اور انہیں احساس نہیں ہوتا کہ یہ وہاں بے چاری تیار رہ رہ کر

کیے فرسٹیشن ہو جاتی ہیں۔“

اب کے مسز مراد نے غور سے دیکھا۔ بے انتہا خوب صورت لڑکی تھی منہری ہال جو غالباً ”ڈائی کیے گئے تھے

ڈاکٹر ہونفٹ فیسٹ کا سر لایا۔

”میں لاہور سے چاہ کر کوئی لڑکی تھی۔“ اور اس طرف اور ملتان کے آگے میرے سر لایا والوں کی بہت زمین

اور جاگیر ہے۔ زمین کے بزار کے سلسلے میں ہمیں میں بھگڑا ہے۔ میرے پسینہ بجھے اور بچوں کو یہاں

چھوڑ گئے ہیں۔ دو بچے ہیں میرے سات اور آٹھ سال کے انہیں یہاں کے اچھے اسکول میں داخل کر دیا۔

ڈسٹ میں میں یہ یاد کر رہا ہوں۔ خود چھ سات سال میں چکر لگایا ہے۔ اس کے دورہ کر میں تو فرسٹیشن ہو گئی تھی اور پھر

بوڑھا ملا کر کیا رہا کر بھیج دیا تھا ساتھ۔ لیکن ٹھیک گاڑتے میڈم مل گئیں ایک فنکشن میں انہوں نے کلب

بنا رکھا ہے فرسٹیشن کا کار خاں کے لیے۔ آپ بھی ان کا کلب جو جان کر لیں جی پھر آپ بھی یوں پڑیں نہ

ہوں گی دیکھیں۔“

اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ایک بیک لڑکی جو سیلوں کی شرت اور اس کے چپٹے ٹاؤڈر تھی حتیٰ ایک ادا

عرض کے کنبے پاتھ مار کر رہی تھی اس کے پٹیل پاتھ میں مگر تھا۔

موجود حال کے سرے سے نہیں تھے گودر میان میں کئی پارٹیشن ہو گئے تھے۔

یہ بھی فرسٹیشن دور کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

”دور کلب میں اس طرح کی ایک کھٹی ڈیر ہوئی ہیں۔“ ان کا دل چاہا وہ کلب کو جان کر لیں۔

”بہت صحت مندانہ ایکھی پیر۔“ اس نے فقہ لگایا۔

”میں یہ لڑکی تیلی اچھی لگی تھی۔“

”آپ کے پسینہ بہاں ہی کیوں نہیں میں رہتے آپ کی اس۔“

”خوف رہتا ہے کہ اگر وہ کراچی آگیا تو پیچھے اس کے بھائی اور چچا زاد قبضہ کر لیں گے اس کی زمینوں

پر اسے میری کی خاص صورت میں بدل ملانے کو لڑکیاں بہت ہیں۔“ اس نے پھر فرقہ لگایا۔

”تو یہ ہے کہ میں اس کے بغیر بہت خوش ہوں۔“

میرے کانکشن سمجھنے کی آواز تھیں سے مرن پاتھ۔ کیا آسائش اور دولت زبور صرف یہ سب عورت کو

خوش رکھ سکتے ہیں۔ اس بستی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر سوچا۔

”میں میں جی آپ کی طرح نہیں رہتی تھی۔ پھر میں نے کلب جو جان کر لیا۔ اب میں بہت خوش ہوں آئیے

میں آپ کو میڈم سے ملوان۔“ اس کی ڈیڑھ ارادی طور پر وہ بھی کھڑی ہو گئیں۔

”دو لاکھ کالیو کی ملاؤ ڈھکے جاسی رنگ کی سامی ہو گئی کسی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر نہیں رہی تھیں۔ جب نیلی

نے ان کے قریب جا کر تعارف کروایا۔

”یہ مسز مراد ہیں شاید عذریہ آپ کا کلب جو جان کر لیں اور مسز مراد یہ ہیں میڈم سفینہ۔“

”مسز مراد۔“ ہاؤر نے ان کے ہاتھ سے ہاتھ بنا کر ان کی طرف دیکھا۔

”انہوں نے شادی کر لی ہے لیکن آپ ان سے کس وہ آپ کو بھی وہاں بلا لیں۔ اپنے بھائیوں سے کہہ کر ان پر

دھاؤں نہ۔“

”دور کلب ملانے کا دوسرے۔“ میں ماہ نہیں دیکھتے کسی نہیں بلوا سکتا۔“

”پھر پھر کیا ہو گا۔“

”کچھ نہیں۔“ چمکی مسکراہٹ سے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

”پھر پھر ان سے۔“ میں نے اسی کے ہاتھوں سے تم بات نہیں کی کہ آپ پہلی پریشان ہو۔ انسان اپنی تقدیر

پر قادر نہیں ہو تا میرے تقدیر میں کچھ لکھا تھا۔“

”ہاں انسان تقدیر پر قادر نہیں ہو سکتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہوتا تو ہی ہوتا ہے نامہ جود مقدر میں لکھا ہوتا ہے۔ حادثہ ہوا لکھا تھا سو کیا اور اندھ جب چاہے گا کوئی وسیلہ بنا دے گا۔ تمہارے ملنے کو نہ دے گا۔“  
 ”دعا میں کر کے بھی تمک جی ہوں بھی۔“  
 ”مگر تیری رو۔“ وہ مسکرایا۔

”اللہ کو بہت پسند ہے اپنے بندوں سے دعائیں منانا اور دیکھا وہ انہیں قبول بھی کر لے گا۔“

”اصل مجرم وہ نہ تھا جو میرے پس میں اور نہیں۔“ اس کی آواز بھر پور تھی۔  
 ”رات آگئی ہے بات ہوئی کچھ ہوا ان کی آپس میں کچھ ہوا ان میں یہاں میں کرتی پھر رہی ہوں۔ نہیں بننا مجھے ڈاکٹر۔ میں وہاں جا رہی ہوں اگر کسی میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ چلتے چلتے لان میں آگئے تھے۔ وہ دیکھ کر ان کی فائل اور کتابیں پیکیٹ کر بیٹھی تھیں۔  
 ”اور تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہارے راجہ جی جانے سے تمہاری آپنی اور پھر جو خوش ہوں گی۔“ وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”تو چھپتا تو تھا بھی میں کیا کروں۔ جب کھائے گی میرے بیٹھے ہوں تو تو لے میرے ملنے میں چھپنے لگتے ہیں۔ مہا نہیں لڑائی میں میرے گھر میں کچھ بھی ہو گا یا نہیں؟ چپا نہیں وادی کی دہائی کی ہرالی میں چلی آئی تھیں۔ سب کچھ میرے سچ کوئی برگی مہا ایلکی اس کی خواہش تو معلوم ہی ہے۔ وہاں کی نہیں۔“ اور وہ آج پتلی بار بیٹھنے سامنے دوڑتی تھی حالانکہ اس نے بیٹھ ہی ہو کر چلا تھا۔ لیکن آج خود بخود بھی تھی۔ بشرطہ پھر بھی اسے سرخ سے دوڑا تھا۔ بار پھر اس کے بازو پر ہولے سے ہاتھ رکھ کر۔  
 ”مہا پلے آئے تو تم کہہ۔ یہاں اس طرح میں ان میں کچھ تم کو دیکھنا اور دوسرے گزرتے اسٹوڈنٹ آیا کہیں کچھ دیکھو تم نے خود مجھے کہا تھا کہ ہم انسانوں پر ہی آتی ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم ان

آنا اسٹوڈنٹ پر پورے اثر ہیں۔“

”آپنی بات رہی تھیں میں بہت کم کر رہا ہوں۔ اب کی بار وہ کئی تھیں ولید کے ساتھ اس سے ملنے تو اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اس خاموشی پر بیٹھا آپنی تھی وہاں اس کو وہاں سے اور یہاں سے اس کے اندر موجود زندگی ہولے ہولے ختم کر رہی ہے۔ اس نے آپنی سے کہا تھا کہ اس کے لیے جو دیکھ کر تھک چکے ہیں وہ اپنی تقدیر پر مشاہدہ کیا ہے اور اس نے تقدیر کو لکھا قبول کر لیا ہے۔“ اس کی آواز پھر بھر پور تھی۔ ہمشکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

”اللہ بہتر کرے گا نزل ہمیں اللہ کی بات سے یاس نہیں ہونا چاہیے۔ جس رب کی طرف سے آنا نہیں آتی ہی وہی رب ہمیں ان آنا اسٹوڈنٹ سے نکالنا بھی ہے۔

اب مجھے سمجھو گا۔“ وہ جان بوجھ کر نہا۔  
 ”جس بھی یاس ہو اور ہوں؟ غزالہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ وہ بے ہوش بھی بیٹھ رہا ہو کہ امیہ رہتا ہوں کہ آسمان سے ایک مہمان پری اتارے گی اور غزالہ بیگم کی جگہ

ہلے۔“ اس نے فقیر لگایا۔

نزل جو تک راستہ دیکھنے لگی۔ اس کی ہنسی اور قہقہے میں کیسی چھین کی تھی۔  
 ”ہاں جان جائے نہ تو میں اس کے ساتھ نہ لڑائی کی ہے۔“ یہی کہی سوچی ہوئی بات اس نے لے لیکھا پھر سوچی۔  
 ”کاش غزالہ جیانی ایسی نہ ہوتی۔ میں اس کے ساتھ نہ ہونے پر غریب صورت میں نہ ہونے پر غریب تھا کہ ان کی محبت اور اخلاق سے اسے اپنا گروہ کر لیتیں۔ حسن خداداد تھا لیکن اس قدر لڑائی کے لیے یہاں نہ تھی جس سامان ہمارے کی طرف نہ صرف وہیں ہمارے خال کے ساتھ کی تھی اور غزالہ ایک بار پھر کے ساتھ اور ایک بار ساری شکل کے ساتھ حتمہ خال کی طرف آئی تھی اور ان چہرہ کا قاتل میں غزالہ نے کی لکھا تھا تاثر نہ ہو تو تھا اس پر اور اگر

ہاں جانے ہمشکی شادی جلد ہی کا تھی تو امیر کی طرف کیوں وہاں میں نہیں لگایا۔ اس نے سرت غلوس سے سوچا تھا۔

”میرج اور مہر کا کیل بہت اچھا ہوتا۔ لیکن ہاں جان بھی اس۔“  
 ”ہاں سوچ رہی تھی۔“ سمجھنے لگی تھی۔  
 ”کچھ نہیں۔“

”تو سن کھاری ہو مجھ پر۔“ وہ جیسے اس کے اندر جھانک رہا تھا۔

”میں سن رہی تھی خود ترس کھا تھا۔ اور یہ خود میری جتنی بڑا باری تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا وہ تین بار میں ہلا دی۔ اچھا رہا تھا غزالہ سے۔ حالانکہ وہ ایسی بات نہ تھی جس پر اچھا۔“ انور بھی کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے اب سب اللہ پر چھوڑ دیا۔ وہ چاہے گا تو اسے گا اور وہ بلی تو مجھے تو سمجھ رہا تھا۔“ وہ پھر نہ دینی ہنسی جس میں نزل کو کچھ بھی کی چھین محسوس ہوئی تھی۔  
 ”اور یوں مجھ کو اپنے خود ترس نہیں آنا نزل کیو۔“ اللہ نے مجھے تم جیسی دوستی ہے یہ کیا کم نعمت ہے اس کی۔“ لفظ دوست پر نزل پھر چوڑی تھی لیکن ہمشکی نے دیا آگھوں میں دوڑ کر کچھ کیا یا نہ تھا جو اسے اپ

میٹ کر نہا۔ بہت غلوس اور اپنا بیٹھنے سے اسے دیکھ رہا تھا۔  
 ”میرج میری چھوڑی تھی۔ یہ وہاں اپنے پورے نہیں پلے بار میں لے اپنی شادی میں دیکھا تھا سرسری سا پھر تم یہاں آکر رہے تھیں۔ حتمہ خال کے کہاں کی یاد تھی۔ حتمہ خال تو بلی تھی۔ ایک ہی کاغذ میں لکھا تھا۔ یعنی ہمارے قہم سے ملا مجھے افسوس ہوا کہ ہم اب تک کیوں نہ ملے تھے۔ تم نے مجھے میری پریشانیوں سے کیا بغیر ارادی طور پر نکالا۔“ پھر ایک دوڑ جب میں نے تم سے اپنے سنے پر بات کی تو تب سے میں دل میں تمہیں دوست ہی سمجھنے لگا ہوں۔“ وہاں میں شاید لفظ دوست پر اعتراض ہوا ہو یا نہ تھا۔ لیکن اس سے بہت لفظ اور کوئی کئی ایسے شخص کے لیے کیا اشتعال کیا جا سکتا ہے جس کے ساتھ وہ کچھ شیر کیے جا سکتے جس کے مشورے پر عمل کیا جائے۔“

وہ سوالیہ نظروں سے نزل کی طرف دیکھنے لگے۔  
 ”ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو بھی۔“ نزل اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”میں اب چلی ہوں۔“

”دیکھو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلا ہوں۔“

”دیکھو میں تو سر حریف۔“  
 ”نہیں اب مڑو میں رہا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اب وہ دونوں باہر کی طرف جا رہے تھے۔ وہ نزل کے ساتھ ہی اسٹاپ تک آیا تھا۔  
 ”تمہا ایک ٹھیک لگائے آئی۔“ نزل نے اسے اپنے ساتھ اسٹاپ پر کھڑے کر دیا پھر چلا۔  
 ”گیا ہوں۔“

اس نے مختصر ”کمان“ نزل نے اس سے پوچھا کہ پھر ہاں اسٹاپ پر اس کے ساتھ کیوں کھڑا ہے اور نہ ہی ہمشکر نے وضاحت کی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس دن میں سوار کرانے آیا ہے۔ صبح کے وقت تو حتمہ خال اور قادی اگلے اپنے ہسپتال جاتے ہوئے اسے روپ کر رہی تھی لیکن وہاں سے کچھ مقرر نہیں تھا اس لیے وہ وہیں سے آجاتی تھی۔ مگر انہیں ہسپتال میں دیر ہو جاتی تھی مگر اسے دانا نہ تھا۔ مگر کبھی ان کے شہر میں گھر پر ہوتا تو اسے پک کر لیتا تھا۔ لیکن ایک سال سے جب سے اس نے جاب اسٹاپ کی تھی یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ قہم کے گزرنے سے اس کے لیے اس کے سرت غور سے نزل کی طرف دیکھا تو ہمشکر اندر ہی اندر چل کر کہہ دیا۔  
 ”وہ گا اور وہ تک کہیں تھیں تھا۔ کچھ اور اسٹوڈنٹ بھی آکر کھڑے ہو گئے تھے جن میں کچھ فائل کے اور کچھ نیو گزرتے۔ نزل اور ہمشکر ڈاؤن کر بیٹھ کر باہر کھڑے تھے۔ ایک اجڑا عمر شخص ٹھیک اٹھتا تھا جس نے غزالہ قریب آ



”میزائل۔“ وہ گھبرا گیا۔  
 ”میری تو ایک دو بار کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوئی آج اس نے مجھے خود ہی بلا کر انوائٹ کیا ہے۔“  
 ”کئی تو کئی“ سب دھل کر رہ گئی۔  
 ”میں جان کر دیکھ لیں کہ جن لوگوں سے چپانے کے لیے انہوں نے غزالہ کو تمہارے سر میں رکھا تھا،  
 لوگ کیا جواب بھی تمہیں۔“  
 ”نزل۔“ وہ بیٹھ گیا اور کہا دیکھنے لگا۔  
 ”یہ تم کئی کئی باتیں کر رہی ہو۔“  
 ”نزل۔“ وہ خود بھی شاید احساس ہوا تھا کہ وہ آج بھر سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی ہے۔  
 ”دوراصل میں ابھی ایک گروپ سے تمہارے متعلق کنفیرنس میں کر آ رہی ہوں۔“  
 ”ہاں چھ!“ کئی نے کچھ اور باتیں کر لیں۔  
 ”دوراصل ہماری شخصیت ہی ایسی ہے ڈپر کنز کہ لوگ انہیں۔“ لیکن دوسرے ہی لمحے بات ادھوری چھوڑ دو،  
 اسے دیکھنے لگا۔  
 اور اگر وہ ان میں سے تین چار لوگوں سے فرزند شپ کر لے گھوے پھرے ان کے ساتھ وہ لٹنگ کرے تو  
 کون روک سکتا ہے کیا غزالہ۔  
 اس کے اندر بھی کئی بھر کی محی اور اس نے سوچا تھا وہ اس لڑکی فضلہ علی کی دعوت ضرور قبول کر لے گا لیکن  
 جب نزل نے پوچھا تھا۔  
 ”تو تمہارے ہونے کی ہر تھوڑے پر۔“ تو اس کا سر بے اختیار نیچے میل گیا تھا۔  
 ایک موز کاٹنے ہوئے وہ مخالف سمت سے آئے والے تانکے سے غمراے لگا کر اسے جھٹکا تو سر جھٹک کر اس نے  
 اپنے ذہن کو ان خیالات سے آزاد کر کے کی کوشش کی۔  
 اور جہاں نہیں کیوں میں اتنا زیادہ نزل کے متعلق سوچنے لگا ہوں۔ بڑھتے بڑھتے بالکل غمراہی طور پر وہ اس کے  
 متعلق سوچنے لگا تھا اور اسے احساس بھی نہ ہوا تھا۔  
 ”یہ کچھ نہیں ہے بھوش۔“ اس نے خود کو تقویٰ ہی بار سمجھا تھا۔ اور اگر کبھی نزل کو پتا چل جائے کہ وہ اس کے  
 متعلق ایسی سچی باتیں سوچتا رہے تو وہ بھی اس سے نظریں ملا کر بات نہ کر سکے۔ کھڑے اندر داخل ہوئے  
 ہوئے اس نے ایک غمراہی بھری سانس لی۔  
 ”شکر ہے آج غزالہ گھر نہیں ہوئی۔“ ورنہ وہ اس کی کھوجی نظروں سے گھمائی بات نہ بھی کرتی تو بھی وہ اس کی ان  
 گفتگوں کی نظروں سے زار ہو جاتا تھا۔ اس نے کتنا ہی دیکھ لیا تھا اسے اپنی ہفتاؤں کا محبت کا۔  
 بھٹ صرف اسی کارے کا لیکن وہ پتا نہیں لیکن نہیں کرتی کسی اب تو کچھ عرصہ سے اس نے وضاحتیں کرنا اور  
 لیکن دانا پھوڑا تھا۔  
 بالکل غمراہی میں اس کی طرف کھڑی کر کے وہ گھر میں داخل ہوا تو اسے برآمدے میں ہی اسے کھڑے نظر آئے۔  
 پاس ہی عذرا بیگم کھڑی تھیں۔ آسمانوں کے رخساروں پر بہت دورانی سے بہہ رہے تھے۔  
 ”آپ اس طرح رو رہی ہیں تو مجھے کہیے پتہ چلے گا بات کیا ہے۔“  
 ”کیا ہوا ہے۔“ بھوش نے بے حد پریشان ہو کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔  
 ”سب ٹھیک ہے نا۔“ عذرا بیگم نے سر ہلایا لیکن ان کی آنکھیں سو بہت سی تھیں۔  
 ”آپ جانیں پیٹھے بلین۔“ سفر نے ان کے کندھوں پر ہلکا سا ڈاؤ ڈالتے ہوئے انہیں پاس کر دی پر بٹھا دیا۔ اور  
 رمضان کو گواڑ دی۔

”رمضان پانی کا ایک گلاس ملاؤ۔“ اور پھر خود دوسری کرسی محبت کران کے سامنے بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ  
 تھام لیے۔  
 ”اب بتائیے پلیر آپ نے اس طس فون کر کے مجھے کیوں بلوایا ہے۔ لیکن یہ پہلی باتی لیں۔“ رمضان کے  
 ہاتھ سے گلاس لے کر انہوں نے عذرا بیگم کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے ایک ٹھونٹ لے کر گلاس ڈانٹنگ نہیں پر  
 رکھ دیا۔ میٹر پریشان سا انہیں دیکھ رہا تھا۔  
 ”خود کل اس نے کوئی نیا آرڈر جاری کیا ہوا تھا۔“ بے حد سختی سے اس نے سوچا اور کہہ دیا۔  
 ”بھئی نہیں تمہارے ایجاں تو میری اسلام کا پلو تھے تھے۔“ عذرا بیگم نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔  
 ”وہ تو آصف۔“ فقط بھران کے ہونٹوں پر فونے لگے۔  
 ”تھف نے طلاق دینے سے کئی کئی۔“ انہوں نے مشکل بات عمل کی اور پھر دونے لگیں۔  
 ”میری کئی میری کئی۔“ اس نے کیوں سے کل رہا تھا اور اس پر بھرا مکت ہو گئے تھے جیسے انہیں عذرا بیگم  
 کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ جیسے ان کے کانوں سے جتنا وہ غلط ہو۔  
 ”بھئی۔“ کچھ دیر بعد بھرش کیوں سے نکلا تھا۔ وہ اس کی کرسی کی پشت کو سختی سے تھامے کھڑا تھا اور اس پر  
 بے چینی سے عذرا بیگم کو دیکھ رہے تھے۔  
 ”خوشی ہے تمہاری بات نہ دیکھنے سے میرے لیے کہاں چلا گیا تھا۔“  
 سید قائم علی شاہ نے جیسے شاہین علی کو پاس کی کرسی پر ملنے چلے آئے۔  
 ”جب بلا تے تھے آکر تھا یا پھر کسی بھی شخص میں آکر تھا کہ کیا کریں اسے ہم آ رہے تھے  
 کہ وہ بات خیر نہیں آتی تھے اور حتمہ بھی جان رہی تھیں اس لیے تھوڑے وقت گھر کے کھلے دروازے اور شاہین صاحب  
 کے گھر کے کھلے دروازے پر آکر تھا کہ کچھ مہینے بعد بخت نے آکر تھا کہ شاہین صاحب اس لیے کھلے دروازے پر آکر تھا  
 پھر بھی بے چینی ہی کی تھی۔ کیا ہوا تھا۔“  
 ”کچھ نہیں چاہیے۔“ شاہین نے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کی۔  
 ”شاہین صاحب! آسمانی ایلا دیا ہے۔“ کچھ دنوں کے ساتھ حیدر آباد سے آگے کیں چلا گیا تھا۔ وہیں رہا دونوں اور  
 دارا کو خیر تک نہیں دی۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔  
 ”یہ تو یہی غلط بات ہے تم نے سمجھا یا نہیں اسے۔“ وہی وہاں آگے۔  
 ”سمجھا تھا چاہیے۔“  
 ”خالی سمجھا تھا میں ہو نا تو ان پکڑ کر سمجھا۔“ وہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔  
 ”ارباب چاہیے کو کیا خیر شاہین کے مزاج کی۔ وہ شروع سے ہی کچھ آکر تھا لیکن ایسا تو تھا جیسا اب ہو گیا  
 تھا۔“ شاہین نے دگر بگھڑی سے سوچا۔  
 ”چاہیے اس کے رات بھر جاتے رہے۔“ حیدر آئی نے اس کی سلامتی کے لیے نقل پڑھے اور وہ اس نے تو  
 کبھی باہم تک نہیں آیا تھا چاہیے کا ایک بار شاہین نے اس سے بات کر کے کی کوشش کی تھی وہ چاہتے تھے کہ شاہ  
 زب کو پہنچا کر وہ شاہین سے چاہیے کے لیے بات کریں لیکن شاہین نے اس کے قدرے باغی سے ان کی بات  
 کاٹ دی تھی۔  
 ”رہے دس گئے موصے مت آکھا میں جو رشتہ ٹوٹ گئے وہ ٹوٹ گئے انہیں دیا وہ حال میں کیا جا  
 سکتا۔“  
 سید قائم علی شاہ کو تو اس نے اپنے ہوش میں نہیں دیکھا تھا لیکن وہ تو ان سے بھی بے گناہ ہو رہا تھا جس کے  
 ساتھ اس کا شاہ اور تعلیق بہت گرا تھا۔ دارا کے فون کے بعد وہ کس قدر پریشانی میں آکر رہی کے لیے روانہ ہوئے  
 تھے کیا وہ بچے کی فائیت میں چائیں پر انہیں بیٹھ لیں تھی اور جب انہوں نے اپنی اپنی رپورٹ سے باہر قدم



”میں نے اپنی پریشانی کا کما تھا وہ ناراض ہونے لگے تھے غصے میں آگئے تھے اس لیے۔“ زاراکہ نظر پر بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

”ناراکہ کیا شاہ زیب کا وہی ہے جسارے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔“ انہوں نے یکدم پوچھا تھا۔ زاراکہ نے چونک کر نظریں اٹھائی تھیں اور پھر جھکا لی تھیں۔

”میں تو شاہ زیب میرے ساتھ ٹھیک ہیں بالکل۔“

”پھر تم اپنی پریشان اور سہمی سی کیوں لگ رہی ہو۔“ انہوں نے اس کے چہرے سے کچھ کھوجنے کی کوشش کی تھی۔

”دور ملا شاہ زیب کے اس طرح جانے سے پریشان ہو گئی تھی اس کا اثر ہے ابھی تک۔ بہت دیر گئی تھی میں اتنے سوچ رہا تھا۔“

”شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی وہ خود بھی تو اتنے پریشان ہو گئے تھے لیکن پھر بھی کوئی چیز تھی جو ان کے دل میں کلک رہی تھی۔ انہوں نے دو تین بار بغور اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی، میٹھی سی تھیں چہرے پر کوئی رونق نہ تھی۔ زاراکہ ایسی تو نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں تو ہر دم جھکدو تھے اور چہرہ کھلا ہوا رونق لگا تھا۔“

”ناراکہ تم کچھ دنوں کے لیے کوئی کیوں نہیں چلی جاتیں۔ میں کچھ دنوں گیا تھا تو کوئی میں میں سہمی تھیں بہت یاد کر رہے تھے۔ لیلی جان بھی کوئی میں میں آگئی تھی ہمارے چہرے خوش ہو جا جائیں گی۔“

”ہاں سب ٹھیک ہے شاہ زیب چھائی گرا لالہ، بڑی بھاری چھائی بھالی ہے۔“

”ہاں سب ٹھیک ہے لیکن مجھیں بہت مرس کر رہے تھے۔“ زاراکہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

”رے اورے تم روتے کیوں نہیں۔“ شاہ زیب گھبرا گئے۔

”میں سب یاد آگئے تھے۔“ زاراکہ نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے اور کھڑی ہو گئی۔

”بھائی میں ذرا بچن میں دیکھ لو اور صداؤں کا کیا پتا نہ ہے۔ آپ لہتے ہیں آرام کریں۔ لیوی وی نہیں یا۔“

انہوں نے اذیت میں سر ہلادیا۔ زاراکہ نے مزہ کو میرے برتن اٹھانے کے لیے کہا وہ اسے بچن کی طرف جاتے دیکھتے رہے پھر بلاؤنج میں آکر لیوی لگا لیکن دل میں ٹھیک لگا کچھ دیر اور پھر جھکے تھمھانے کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ رات بھر سوئیں سکے تھے انھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

”ناراکہ۔“ انہوں نے آواز دی۔

”میں کچھ دیر سوچا جاتا ہوں شاہ زیب آئے تو مجھے دکھایا۔“ زاراکہ بچن سے باہر آئی۔

”اور یہ گیسٹ روم ہے۔ اس نے گیسٹ روم میں مکان کی راہ بتائی کی اور وہیں چلی گئی۔

گیسٹ روم کا فرنیچر کراکسمیر پر دے کاربٹ سب بہت شان دار تھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں شاہ زیب کے ذوق کی یاد دہی۔ لیوی کی آواز۔ ٹھیک گوا ٹھیک گوا ٹھیک۔ میں بھی زبردست تھی۔ شاہ زیب آیا تو وہ ضرور اس کے ذوق کی تعریف کریں گے۔ سب کا تپا نہیں ہے زاراکہ کو ذوق ہے یا شاہ زیب۔“

وہ گھمراہ ہونے بیڑ پر لیٹ گئے۔ تکیے پر سر رکھتے ہوئے انہوں نے تکیے کے دائیں طرف پڑی چینی سی شیشی گورکھو کھا اور ہاتھ میں اٹھایا۔

”یہ کیا شاہ زیب ڈرک کرنے لگا ہے۔“ میں شاک سا لگا تھا۔

”جو سب ملتا ہے کسی مہمان۔“

”لیکن شاہ زیب کم از کم یہاں اس گیسٹ روم میں نہ جلاؤنج سے ملحق تھا کسی اجنبی دوست کو مہمان نہیں غمراہ سکا۔ کیا اتنے تو اس کے مزاج اختیار تھے پھر۔“

”یہ وہ چھین سے ہو کر کچھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے داؤد روم کا دروازہ کھولا۔ صابن اور شیمپو کی مٹک پھیلی ہوئی تھی اور سامنے ریک پر شیوا کا مسلمان رکھا تھا۔ شاید شاہ زیب نے کچھ دیر پہلے ہی اس داؤد روم میں ہاتھ لیا اور شیوا کیا تھا۔“

تو کیا رات شاہ زیب گیسٹ روم میں سوچا تھا اور کیا نہیں۔

انہوں نے داؤد روم میں بیٹھ کر اپنے کے ساتھ والی چھوٹی سی لماری کا پتہ کھولا اور پھر حیرت سے اندر ترتیب سے بڑی بڑی کونوں کو دیکھنے کے اور پھر گھبرا کر ہارنگل آئے۔

”ناراکہ۔“ گوا ٹھیک میں آکر انہوں نے آواز دی۔

”آپ سوئے نہیں۔“ زاراکہ اپنے بیڈ روم سے باہر نکلی شاید وہ کھانے کی ہدایت دے کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

”ناراکہ اور کون کونھے تھے کچھ پوچھنا ہے۔“

”جی۔“ زاراکہ نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔

”ملازمہ بچن میں مصروف تھی پھر بھی انہوں نے بہت آہستگی سے پوچھا۔

”ناراکہ کیا شاہ زیب ڈرک کرنے لگا ہے۔“

”آپ کچھ کیسے پتا چلا۔“ زاراکہ گنگ زور پڑ گیا تھا۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں زاراکہ۔“

”ہاں میں شاید۔“ زاراکہ نے نظریں جھکا لی تھیں۔

”کیا گیسٹ روم میں شاہ زیب کے دوست آکر ٹھہرتے ہیں کبھی۔“

”میں نہیں جانتی گیسٹ روم بلاؤنج کے ساتھ ہی ہے۔ کبھی کبھی شاہ زیب کو دیر تک جانا ہوتا تو خود۔“ زاراکہ زبان لڑکھائی تو اس میں اس پر ترس آگیا۔

”چھ ٹھیک ہے۔“ وہ اسی گیسٹ روم میں آگئے تھے لیکن نیند اب جیسے بھاگ گئی تھی وہ بیڈ پر بیٹھے مسلسل ایک ہی بات سوچے چلے جا رہے تھے کہ کیا وہ شاہ زیب سے اس کے متعلق بات کریں۔ لیکن اگر وہ پرمان کیا کر اسے۔ لیکن وہ سہرا ل اس کے بڑے بھائی ہیں اور وہ اس سے پوچھ سکتے ہیں اسے سمجھا سکتے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے اس کا انتظار کرنے لگے۔

لیکن شاہ زیب نے ان کی بات کو یاد کر سہرا سری سالیانہ تھا۔

”رے شاہ زیب چھائی ہی سب چل رہا ہے۔ لیوی بھی گھبرا کر شکل کر لیتا ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔“

”لیکن شاہ زیب میری جان ہے۔“

”چھوڑو بھائی کوئی اور بات کریں۔“ اس نے ان کے ہاتھ سے وہ چینی شیشی لے کر بیڈ کی دراز میں ڈال دی تھی۔

اور پھر وہ چھوڑ کر سب کچھ اپنے شاہ زیب کے روتے کا جائزہ لیتے رہے۔ انہوں نے غصے سے کیا تھا کہ شاہ زیب اور زاراکہ کے درمیان کچھ رنجش ہے۔ وہ زاراکہ کی طرف رخ کر رہی تھیں۔ کچھ اٹھا لکھ کوئی میں میں انہوں نے دیکھا تھا کہ شاہ زیب کی نظریں جب بھی زاراکہ کی طرف اٹھیں اس میں ایک داؤد لنگی اور المانہ بن ہو آتا تھا۔ وہ کراچی کے آگے تو از حد بڑھتی تھیں۔ انہوں نے شاہ زیب سے بھی کہا تھا کہ وہ زاراکہ کو کچھ دنوں کے لیے کوئی جگہ دے لیکن شاہ زیب کا کیا پتا وہاں آراہہ تھا۔

”میں چھوڑا لیا وہ جاؤں گا اس کے جانے سے۔“ اس نے بظاہر خوشی سے کہا تھا۔ لیکن زاراکہ کی طرف اٹھتی اس کی نظریں بالکل ساٹ تھیں۔

”ناراکہ کہاں ہو گئے ہو چھ ٹاؤب ٹھیک ہے نا۔“ سید قائم علی شاہ نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا تو شاہ زیب فرج گئے۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“

”چھوچھو چھو آئے ہیں۔“

”یہ سیدہ اسٹاڈ کی آواز آئی تھی۔

”تو میری بیٹی بھی آئی۔“ سیدہ نے شاہ زیب کو دیکھا کہ اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔



نہم دلوں اور ہورہے تھے۔ جنہو ہسپتال میں ملتی تھی لیکن مجھے کہا ہے اسکا لیے آئیے گاہ۔  
پتا ہے شادی۔ وہ خود اسکا کی طرف تھے۔  
”سوچتا ہوں کسی روز جو ملی چلا جائوں اور شادی کے سامنے جموں پھیلا کر بیٹھ جاؤں کہ سید اسکو میری بیٹی بنا دیجئے اور بھی چاہتا بیٹا نہیں۔“

شاہ نے بے حد حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ آج ان کے چہرے پر کسی امید کے رنگ نہیں بکھرے تھے نہ ہی انہوں نے سید کا قلم کیلئے شادی کا تھا نا شانہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سید نے ان سے انہیں دیکھ رہے تھے اور سید کا قلم کیلئے انہوں میں سے تھا چٹک اور امید ہے پوچھ رہے تھے۔

”کیوں شادی شادی مان جائیں گے۔ سید کے تان کے اوں پکڑ کر مانی گاؤں اور پھر جموں پھیلاؤں گا۔“  
گوان کی آواز کی بلند نہ تھی اپنی آہستہ جہی نہ تھی کہ لڑکی میں آئی اس شادی نہ پائی۔ اس نے سید کا قلم کیلئے شادی کی پوری بات سنی تھی اور وہیں ٹھک کر رک گئی تھی۔ رخسار رنگ ہو گئے تھے اور دل کی دھڑکنیں یکدم تیز ہو گئیں۔ سید جموں کیلئے شادی کے جسم ہو کر اس کے سامنے آکر ہوا تھا۔ برشتی تھیں اسے اے نکلا ہوا چھوٹی چھوٹی دقتی باتیں کرنا ہوا۔ کو آج تک شہار نے اس سے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے اس کے جذباتوں کا اظہار ہوتا لیکن اس کی آنکھیں ہوتی تھیں۔ اس کی برشتی نظریں سید اس شادی کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیتی تھیں۔

تنبلی میں اکثر وہ شہار کو غیر ارادی طور پر سوچنے لگتی تھی۔ لیکن پھر پڑ کر اس خیال کو ذہن سے نکال دیتی۔  
”نہیں مجھے شہار کے متعلق نہیں سوتا چاہیے شادی بھی بھی نہیں ہائیں گے۔“ وہ اپنے ہی خیالوں سے خوفزدہ ہو جاتی اور کئی کئی نکتہ سہی رہتی تھی لیکن اب یہ سید کا قلم کیلئے شادی کیا کہ رہے تھے۔ دھڑکنوں سے نکل میں اوروں میں چار رکھا تھا۔

”اور اگر شادی نہ مانیں اگر شادی۔“ اس کے رخسار ایک انجمنی حد سے تپ گئے۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے رخسار پر رکھا تب ہی شادی کی تواضع۔  
”کیسے ممکن ہے چاہو۔ شادی بھی نہیں ہائیں گے۔ کبھی نہیں۔“  
شاہ نے اس کے پیشانی پر ہاتھ پڑا دیا اور اس کی سید اس شادی کا ناپاؤں دھڑکا ہوا احساس ہوا۔  
”آپ نے چاہا کہ آپ کیسے خیال کو اپنے دل میں کیوں پھینچے جس کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔“  
شاہ نے بے حد ادا سی سے کہہ رہے تھے اور سید اس شادی کو دل رکھا تھا جیسے اس کا دل تجھی پیچھا چل میں کرنا چاہا ہوا۔

رخصتو رچنے دکھ کر کہہ اور نے نصیر احمد خان کی طرف دیکھا جو اسے دیکھ رہے تھے۔

”وہ سید ہوتی ہے؟“ انہوں نے سید کے بچنے سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ عموں کی ان کے سامنے ہی کر رہی بیٹھ گئی۔

صبح سے اب تک وہ تین باؤں اور کچی کی مین ہزار آئی تھی۔ یہی رخصتو کر رہی تھیں اور ہر ماہ یہ کہ کر فون بند کر دیتی تھیں کہ گھر نہیں ہیں۔

تسلی ایک مختصر سا جھٹکا نہ اس کا حال احوال نہ اداں اور ایک کے متعلق کوئی بات نہ منصور کے حوالے سے کوئی نہیں مل رہا تھا۔

”پیشانی پر ہوتا وہ بھی پڑاؤ دار لڑکا ہے یا سہو گاہ کہ اسے وہیل کی طرف جانا ہے۔ کل تاریخ ہے۔“  
”جی ہاں لیکن میں اسے بس دانا جانتی تھی کہ اسے منصور کے پیڑھے لے کر جانے ہیں وہیل صاحب نے کچھ بار کہا تھا کہ وہ منصور کا سارا ایک بیکس کا راز دینا پھانسی لیکن ولید کیا ہی نہیں۔“

”آجائے گا کیا تمہارے پیشانی پر۔“ نصیر احمد خان نے اسے تسلی دی۔

”چھوٹی کانہ ہے نہ سون کی طرف نکل گیا ہو کا شام تک شاید پھر لگا ہے۔“  
”میں غم نے کوئی صاحب کا دفتر دیکھ رکھا ہے۔“

سلی خان نے یہ نصیر احمد خان کیس کی بیٹی جیسی خاموشی سے دونوں کی گفتگوں کی تھیں پوچھا۔

”جی ہاں لیکن میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ شادی کی گمان کے پیش میں۔“

”تو پھر میں پتلی ہوں تیرے ساتھ دونوں جا کر کاغذ دے آتے ہیں وہیل صاحب کو۔“ دانی کو بھیج کر علیسی

مکھوا۔

”آپ دادی جان! ہاں اور کو حیرت ہوئی۔“

”ہاں میں۔“ اللہ بخشے میرے والد کہا کرتے تھے کہ اپنا بوجھ اپنے ہی کندھوں پر اٹھانا چاہیے۔ اب کوئی کب

تک ہماری ذمہ داریاں نبھائے۔ بندہ ہوں گا پوچھو دھوٹے دھوٹے ٹھکڑے جانا ہے ایک روز۔“

”نہیں ابا۔“ نصیر احمد نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”افضل اور اس کی بیٹی ایسی نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں؟“ انہوں نے ہر مشکل کے لیے میں اپنی سے بڑھ کر ساتھ

ہوا ہے۔“

”جانتی ہوں نصیر احمد! کوئی کب تک کسی کا ساتھ دے۔ ولید تو ابھی بچہ ہی ہے ابھی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں

پڑی۔“ غصہ ہوا تب اس اور افضل اور بات تھی۔ ”سلی خان نے اسے آگے اور زنی سے کہا۔

”اب اس کیلئے غصہ کے چلے جانے سے خود کو کتنا اکیلا اور خاموش کرنے لگی تھی۔“ لہذا وہ نے نصیر احمد خان

کے مجھے ہونے پر کوئی دھڑکا ہوا۔

اور غصہ کا جانا بھی کتنا ضروری تھا۔ وہ اتنی خود غرض نہ تھی کہ محض اپنے لیے اس کے کیرئیر کا یہ سب سے

گولڈن چانس کس کر دیتی۔ لیکن غصہ ہوا تھا تو اسے کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود ہی وہیل سے ملکہ ہر تاریخ

پر عدالت میں جاتا۔ اس کی خند پر کبھی کبھار اسے بھی منصور سے ملوانے لے جا کر اور ہر ماہ اس کے جانے پر منصور

جزیرہ ہوتا۔

”کیوں؟“ آپ میں پلینز نہ کیا کریں۔“ اور ہر روز غصہ کو منع کرتا۔

”نصیر احمد پلینز میرے لیے جلد کرنا چھوڑ دیں۔ میں جانتا ہوں اس سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے

سوائے غولڈن کیلئے میں غصہ کرنے کے تو پھر سلی خان آپ کے بہت احسان مند ہیں مزید زیارت مت کریں ہمیں۔“

اور غصہ سے زنی سے سمجھا۔

”مگر تم نے یہ بات کسی اور موقع پر اور مختلف حالات میں کی ہوئی تو میں جس میں تمہارے

کیفیات کو سمجھتا ہوں پلینز منصور یا کسی مت ہو اور اپنی سیدھی باتیں مت سنا کر۔“

وہ ہولے ہولے اسے سمجھا۔ ”چاہا میں اس لیے کہ میں اور گفتگو کیا کیا تیرہ ہوتی کہ کچھ دیر کے لیے منصور

کی آنکھوں میں امید کے رنگ چھلکانے لگتے تھے۔“

اور پھر غصہ کی بیٹی کو ایک کب کو یہ بات کہ سب سے بڑا ایک مت کیا۔ سید مت کیا۔ سید مت کیا۔ سید مت کیا۔

”ابا یہ میری پریشانی لاف کا سب سے بڑا ایک مت ہے۔ اتنی پرانی کہیں پھوڑ کر میرا انتخاب کیا گیا۔ اگر

میں کامیاب ہو جاؤں اور ادا میں نرمی کی فضا نہ کے مطابق سب کچھ ہو جاتا ہے تو مجھو میری بیٹی کو یقین

الافوازی میں رہا مل جائے گا۔ ایک مت بڑا ایک مت ہے اس میں تین سال گئیں گے۔ سلی خان نے کہا۔

”نہیں سہ۔“ غصہ پڑنے میں سال کے لیے کتے چلے جائیں گے۔ لہذا وہ پلینز کیلئے کی تھیں۔

”ابا! تم پریشان نہ ہوں تم سے۔“ غصہ پڑنے میں سال کا۔ پھر کہاں پلینز اور ولید کی بیٹی۔

غصہ نے اس کی بیٹی کیلئے دیکھ کر اسے تسلی دی۔

”ابا! جانتی ہو نہیں یوں اس پریشانی میں پھوڑ کر میں خود بھی میں جانتا تھا تھا۔ لیکن یہ بڑا ایک مت میرے

ایک چٹخے۔ جب میں نے میڈر بھرا تھا تو مجھے گمان تک نہ تھا کہ میرا میڈر منظور ہوگا۔ میں ہو گیا بھی تو میں صرف جائزہ لینے جا رہا ہوں، ہاں یہی دورک میں بھی سات آٹھ ماہ تو لگ جائیں گے۔ یہ سب میں دال ہی رہ کر کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا اور ماہ نور کے آنسو اس کے رخساروں پر پھل رہے تھے۔  
 ”ماہ نور کیوں بلا اس طرح رو کر بیٹھے، مذہب نہ کرو۔ راستہ بنائے یہ بھی میری بات ہوئی تھی وہ بھی بہت خوش ہیں اور ان کا بھی خیال ہے کہ مجھے پرور جائیکٹ مس نہیں کرنا چاہیے۔“  
 لیکن اسے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رہا تھا وہ یوں سر تھکا لے رہی تھی اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم اکیلے اور تنہا ہو گئی ہے۔  
 ”تمہارا میری جدائی کے خیال سے دور ہی ہو۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ تم مجھے اتنا چاہتی ہو۔“  
 وہ ہولے سے مسکرایا تو اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے تو اس کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا۔

”میں یہ بات نہیں ہے۔“  
 ”میں نہیں سمجھ سکتی تھی کہ تم مجھے نہیں ہے۔“  
 غصہ کا یہ انداز میں تھا لیکن شاید وہ اس کا خیال بنانا چاہتا تھا۔  
 ”میں! آپ مجھے لگ رہا ہے جیسے آپ کے چل جانے سے میں بالکل اکیلی اور تنہا ہو گئی ہوں۔ آپ یہاں تھے تو مجھے درمیں لٹا تھا اور وہ منوں۔“  
 ”جی! مجھے ضرور ہونے سے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔“  
 ”میں نے ولید کو سب سمجھا دیا ہے منوں کی تم فکر نہ کرو، یہ ہمارا سب سنبھال لے گا۔“  
 ”لیکن غصہ۔“  
 ”میں جانتا ہوں تمہاری زندگی میں اس سے مشکل لمبے کبھی نہیں آئے تھے۔ منوں کا اس طرح بے گناہ جیل چلے جانا کسی خدا پر ہے کہ میں۔ پھر اصل کی حالت ایسی نہیں ہے کہ۔ چلو ان میں میں جا رہا ہوں یہ پرائیویٹ چھوڑ دیتا ہوں۔“  
 ”میں نہیں بلکہ غصہ ایسا بہت کر رہی ہوں۔ میں بس یہ کہہ کر جانے چاہتی ہوں کہ اس پریشان ہو گئی تھی۔“  
 اس نے مسکرائے کی خوشگئی کہ تم آنکھوں میں چھپائی اس مسکراہٹ کی چمک غصہ کو بہت چھپی گئی۔ وہ مہسوت سال سے بچنے لگا۔  
 ”میں نے یاد کیا کہ یہ ہیں۔“ ہانور کی پگھلیں جھک گئیں اور رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔  
 ”تم تعجب خوب صورت ہو، وہاں تعجب نہ لگے۔“ غصہ کی آواز سرگوشی میں تھی۔  
 ”میں درمیں لٹا خوش قسمت ہوں۔ وہاں میں چلے سے بغیر کسی آنسو کے کہہ رہا ہوں کہ تم کو تو میں نہیں جانتا۔“  
 ”میں نہیں بلکہ آپ جانتیں۔“ اس نے خود کو دکھائی تھی۔  
 ”تم بھی تعجب خود کو اکیلا سمجھنا۔ جب بھی تم نے آواز دی میں تمہارے پاس آنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہیں لگاؤں گا۔“

اور اس روز غصہ نے کتنی ہی امیدوں کے چراغ اس کی ہتھیلیوں پر جلائے تھے اور کتنی ہی خوش رنگ نظروں کے پھولوں سے اس کا دامن بھریا تھا۔ کتنی ہی دن اس کے اندر یہ انساں رہا اور دال میں خوشبو بھٹی رہی۔ کیا غصہ ایک عاقل سے لڑی اور غصہ نے اسے سمجھنا تھا اور پھر غصہ اٹھا گیا۔ بہت ساری تسلیاں دے کر اور ولید کو سب سمجھا کر۔ اس کے جانے کے بعد کتنی ہی دن وہ بالائی والائی سی چھٹی رہی حالانکہ غصہ پر روزی تو اس کے گھر نہیں آتا تھا۔ ویک اینڈ پر چارگاہ لایا جیسے حضور کا مسئلہ ہو تھا تو اس کی ہر بات پر آپا۔ منصور سے مل کر آنا

جب بھی اگر سب احوال بتا دیا اور اب اس کے جانے کے بعد یہ پہلی تاریخ تھی۔ وہ سب کے لئے وہاں سے جبر کرنا غصہ کے ہرل ہوتے ہوئے اس نے کبھی کبھ جانے کی کوشش بھی تو نہیں کی تھی۔ وہی سب کچھ کر رہا تھا اور اب افضل حیدر تو غصہ کے جانے سے پہلے ہی سب معمول اپنے پر اس دور پر چلے گئے تھے اور ان کی دینی سب سات ماہ سے پہلے ممکن نہ تھی اور ولید۔ ولید کو کچھ ہی تھا وہ فون کر کے بتاتا کہ میں نہیں بلکہ کام تو نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے ذہن سے نکل گیا ہو مجھے اس کو یاد دلانا چاہیے کہ کل اس سے عدالت جانا ہے بلکہ آج تمام دوپہر صاب سے اس کے بیچ میں جا کر ملے اور منصور کو بھی ریکارڈ بھی ان تک پہنچا دے اور جب اس نے فون کیا تو سعدیہ بیگم نے رسیا کیا۔  
 ”اسلام علیکم آئی! میں ماہ نوروں! آپ کیسی ہیں۔“  
 ”جیسی ہوں! آسان کا لہجہ اسے بہت روکھا دیا تھا سا لگا تھا۔“  
 ”ولید کہاں ہے مجھے اس سے بات کرنا چاہی۔“ اس نے کچھ جھجکے ہوئے کہا تھا۔  
 ”کیا بات۔“  
 ”وہ سب کی طرف جانا تھا کل منوں کی تاریخ ہے۔“  
 ”وہ تو اس وقت رہ کر نہیں ہے۔“ اور انہوں نے اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ بیٹا ہے بھی بات کرنا چاہتی تھی بہت دن ہو گئے تھے تو تعلیم سے اس کی ملاقات ہو گئی تھی اور نہ ہی بات ایک دیوار اس نے فون کیا تھا تاریخ نے بتایا تھا وہ گھر نہیں ہے۔ ایک گھنٹے بعد اس نے دوبارہ فون کیا۔ اس کی پار میں سعدیہ بیگم نے ہی فون رسیا کیا تھا۔  
 ”ولید نہیں ہے۔“ انہوں نے اس کے سلام کے جواب میں انتہائی کم کر دیکھ کر دیا تھا اور پھر تیسری بار نصیر احمد خان کے لئے پر اس نے فون کیا حالانکہ اس کا بھی میں چاہ رہا تھا اب فون کرنے کو اور سعدیہ بیگم نے پہلے کی طرح اس کے بچنے سے پہلے بتا دیا کہ ”ولید گھر نہیں ہے۔“ اور فون بند کر دیا۔  
 ”داوی! تم کبھی گئی ہیں۔“ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور نصیر احمد خان کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر کتنی غمی۔  
 ”کاش میں کی قابل ہو تا تو۔“ امیرا ہونا وہ نا تو زار رہے۔  
 ”اپنی غمی میں جگے سے اٹھ کر وہ ان کے قریب آئی اور جھک کر ان کے کندھ پر رکھا۔  
 ”ہیسات نہیں آپ کا ہونا ہمارے بہت اہم ہے۔“ کچھ دیر پہلے کی مایوسی اب اس کے چہرے پر نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ آنکھوں میں ایک عزم تھا۔  
 ”آپ گھر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا اگر ولید نہ بھی آتا تو میں دانی کو ساتھ لے کر چلی جاؤں گی۔“  
 ”آپ کو بہت زیادہ آنا غمی میں نہیں دلانا چاہیے۔ ٹھیک ہے نا اور کل سے میں آپ کو فون نہ کر رہی ہوں لے کر جاؤں گی جب سے منوں کی آپ اب گھر آئیے کہ لے بھی نہیں گئے۔“ اس کی آواز بھر مرنے کی تو وہ بات کرنے نہ کرنے داسار کی اور پھر مسکرا کر انہیں دیکھا۔  
 ”آپ نے اتنا سوچو کہ کرنا تھا۔ ہمارا تو خیال تھا کچھ دنوں تک آپ بھاگ گئے تھیں گے۔  
 ”لہو! میں! آپ کو کیا روٹی میرے حلق پر چھوڑ دو اور۔“  
 ”ہیسات نہیں اب۔“ وہ تو دہری سی جگہ بنا کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی اور اپنا دایاں ہاتھ ان کے گرد لپیٹے ہوئے زبردستی مسکرائی۔  
 ”آپ ہمارا حوصلہ ہیں مگر آپ بے حوصلہ ہوئے تو ہم کیا کریں گے۔ داوی کو دیکھیں کتنی بہت ہے ان میں اور آپ کو پتا ہے جب منوں آپ کو آخری بار ہسپتال سے لے کر کیا تھا تو انہیں لے کر کیا کہا تھا کہ آپ بہت جلد چلنے لگیں گے۔“

”ہاں۔“ انہوں نے ایک چمک کر آنسوؤں کے کی پیش کی  
 ”اور جب منوں نے آگیا تھا تو ہم کتنا خوش ہوئے تھے میں نے اس وقت دوا کو فون کیا تھا۔“

”ہاں یاد ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”تو اس اب نے ہمارے گھر کو مشورہ کرنا ہے۔ جب منوں جیل سے واپس آئے گا تو آپ کو اپنے قدموں سے چنا دیکھ کر جرات مان رہا ہے گا۔“

ان کی مسکراہٹ بچھڑ گئی۔

”پتا نہیں منوں واپس بھی آئے گا۔ اسے قتل جیسے سنگین جرم میں بھڑایا گیا ہے۔“

”تو پھر بے طے ہو گیا ہے کہ اگر ولید نے کیا تو پھر میں ذیلی والی کو ساتھ لے کر چلی جاؤں گی اور کل اسکول سے واپس پر مسز مہراؤ کے ساتھ جا کر کل صاحب سے پوچھ لوں گی کیا ہوا۔“

”کیا ہوا ہے بیٹا شاید پھر جی تان چڑھا ہے۔ ایسا ہی ہو جائے۔“

”لیکن ایسا یہ لوگ جلد فیصلہ کیوں نہیں کر دیتے۔“ وہ ہاتھ کھڑی ہوئی۔

”مراواں تک لگاتے ہیں۔ ہمارا رعد اس کی نظام ایسا ہے۔ بیٹیاں، ناراضیاں، گواہیاں اگر کوئی بے گناہ ہو تو سالوں فیصلے کے انتظار میں جیل میں کاٹ دیتا ہے۔“ نصیر احمد خان نے وضاحت دیا۔

”ماہا بیٹا! مشین سے آگے کپڑے نکال دوں میں ہوں۔“ وہ اپنے لیے طیبہ خاتون سے آواز دی۔

”ارے میں اماں میں سے کہا بھی تھا کہ ابھی آگے کپڑے دھوئی ہوں مگر آپ نے خودی مشین لگا دی۔“ وہ ان کی بات کا جواب دیتی ہوئی باپ پر نکل آئی۔

طیبہ بہن میں گھس۔ وہ نہ کچھ بولی آئی اور پھر کپڑے لگاتے ہی بچہ نہ ہونے مسلسل ایک ہی بات سوچتی رہی تھی ابھی زندہ وارپوں کا پوچھ خود اٹھاتا ہے مجھے ولید یا کسی اور کی طرف نہیں دیکھنا۔ وادی صبح گئی ہیں آخر کوئی کب تک مسز مہراؤ کا پوچھ دھوئے پھر افضل حیدر کے خاندان کے ساتھ اس کا ایک اور رشید بھی تو جڑ چکا تھا۔ وہ اس خاندان کی ہوسہ۔ افضل حیدر نے مار مار کر جانے سے پہلے سعید بیگم اور علیہندہ ابرج کے ساتھ آکر اسے لگو بھی بنادی تھی اور جو جڑے کپڑوں کے اس کے لیے خریدے گئے تھے وہ بھی ساتھ لے آئے تھے۔

”لیکن اگلا۔“ نصیر احمد خان غصہ سے تھے۔

”تم مجھے پہلے بتا دیتے تھیں تو زراست انتظام کر لیتا تمہارے گھر کی پہلی خوشی تھی۔“

وہ بغیر اطلاع کے اچانک سی اس رات آگئے تھے۔ وہ ذیلی اور والی کو ہومورک کر دیا تھی جب اچانک سی سب کو دیکھ کر وہ ایران سی ہو گئی تھی اور اس نے ساتھ ساتھ کھانا کھا دیا وہ بھی سب کی تحیرت معلوم کرنے آئے ہیں اور جب وہ بچن میں چائے بنا رہی تھی تو ابھی اچانک سی اسے ہالے آئی تھی اور دوپٹے سے ہاتھ پر چھتی ہوئی جبکہ نصیر احمد خان کے کمرے میں کئی توڑا فضل حیدر نے اسے اس بلا کر اس کے ساتھ ہی لگو بھی بنادی۔

ایک کھ کو تو اسے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا وہ جو چکا ہی ہو کر انہیں دیکھتے ہو کر انہیں دیکھتے ہوئے کھی۔ سعید بیگم خاموش سی بیٹھی تھیں اس نے ان کی خاموشی کو محسوس کیا تھا۔

”تیار تعریف بھی ہوئی اور ضرور ہوگی لیکن فی الحال تو میں صرف یہ چاہ رہا تھا کہ تمہیں یاد رہے کہ ماہ نور ہماری اہانت ہے اور تم مجھ سے غیور نہیں جیسا میں مت کیا کہو نصیر احمد کے تکلیف ہوئی ہے۔ میری منصوبہ سے تم نے زیادہ رشتہ داری ہے۔ تمہارا وفد صرف بیٹا ہے اور میرا بھی نہیں ہے اور میرا بھیجنا بھی ہوئی تاہم سے زیادہ رشتہ داری۔“

انہوں نے تہقید لگایا تھا اور پھر فوراً ”بہی“ سنجیدہ ہو گئے تھے۔

”اس کے بغیر ہر خوشی اور مصوری ہے لیکن یہ ضروری تھا میں چاہتا تھا کہ سب کے علم میں یہ بات آجائے کہ ماہ نور ہمارے خضر کی اہانت ہے۔“

اور حیران گڑی ماہ نور کو جب علیہندہ لگے لگایا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”مبارک ہو ڈیر۔“ ان کے رخساروں پر رنگ بکھر گئے تھے اور ہلکی جھک گئی تھیں۔ وہ خضر نے اپنے ہانسی اٹھو بھی پہلے ہی اسے بنادی تھی لیکن یہ رنگ جواب سب کے سامنے انکل افضل نے اس کے دامن ہاتھ کی دوسری انگلی سے پرتائی تھی اس انگوٹھی نے اسے سنبھل کر دیا تھا۔

کیا بہت خوب صورت ہے۔“

علیہندہ نے اسے مسلسل انگوٹھی کی طرف دیکھتے باکر پھر کا تو وہ جینپ مٹی تپ سلی غامض نے اسے گلے لگا کر دیا دی اور پھر باری باری اماں انہیں سعید بیگم سے ہی اسے گلے لگا کر دیا جس دی تھیں لیکن اس کے اندر تو انہوں کی برسات ہو رہی تھی بار بار منصور کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ جب افضل حیدر نے اس کا رشتہ ان کا تھا تو کتنا خوش تھا اور بہت سارے دنوں بعد پہلی بار اس نے منصور کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی اور اسے منصور کا چہرہ تھفتہ تھفتہ سا لگا تھا تو وہ جب سے نصیر احمد خان کے ساتھ حادثہ ہوا تھا وہ بے حد سنجیدہ رہنے لگا تھا۔

والی کی شرت بچہ نہ ہونے اس نے ایک نظر اپنی انگوٹھی پر ڈالی۔

”کلام کرتے ہوئے مجھے اسے اتار کر رکھ دینا چاہیے تھا۔“ وہ یونی کے خیال میں کتنی ہی دیر تک اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔

”آئی اس کی مکتفی سے خوش نہیں ہیں۔“

بہت باری کی مکتفی سے خوش نہیں ہیں۔“

”اور جس رشتے میں مال کی ہاں اور ضمانتی شامل نہ ہو وہ رش۔“

”خدا نہ کرے۔“ اس نے بے ساختہ کہا وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچتا تھا تھی۔ خضر کی محبت نے کب اور کیے اس کے دل میں سنبھل گئی تھی وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن اس سبب کہ اسے اس محبت کا دور کا دور کا ہو چکا تھا اور خضر کے ساتھ مسلوب بھی ہو چکی تھی اس لیے خیال سے اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

”مناوش آئی کی بھانجی ہے نا اس نے کچھ نہ ناوش ہیں۔ لیکن ہونے والے ہوئے لگتا تھا۔“

سب تو خوش ہیں انکل ابن علیہندہ ولید سب اور سب سے بڑھ کر خضر۔

وہ کپڑے دھو کر باغی ہوئی تھی اور اسٹیک مشین دھوری تھی کہ مس ہا کو کچھ کر ایران دہ گئی۔

”اسے ہالیاں آپ آئیے۔“ وہ اپنے ساتھ پوچھتے ہوئے وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

”ہنا کو بھی ساتھ لے آئیں یہ سب دن ہو گئے اس سے طے۔“

”ہنا کا رش لے کر دیا ہے کہ منے۔“ وہ لگاتے ہوئے مسکرائی۔

”کل شام کو اس کی مکتفی کی تعریف ہے میں تمہیں کہنے آئی تھی کہ تم ضرور اپنا مکتفی اگلی کی دوست ہو تم۔ مجھے بتا ہے اپنے بھائی کی دوج سے بہت رشتاں ہو لیکن خودی دیر کے لیے آجنا ناوش ہو جائے گی۔“

”جی کیوں میں میں اس کی ضرورت ہے بہت مبارک ہو۔“

”خیر یہ بات۔“ وہ اس کے ہاتھ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ماہ نے ان کی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے غیر اور اور پھر ہاتھ پکڑ کر لیا۔

”تمہاری بھی مکتفی ہو گئی ہے شاید لیکن تم نے بتایا نہیں۔“

”ہنا کو تو بتا ہے میں ان کی دوج سے کوئی تعریف نہیں ہوئی اس انکل افضل اپنی فیملی کے ساتھ آئے تھے اور انہوں نے انگوٹھی بنادی۔“ اس کے کلاں پر شرمیلی سی مسکراہٹ ابھری۔

”تمہارے عزیز ہیں شاید۔“

”جی اماں کی پانچویں بیٹے ہیں انکل افضل۔“

”ہاں سرال دالے خیر ہیں لیکن ابھی تو لوگ ہیں۔ لڑکائی تک میں جاب کرتا ہے۔ اگلے ماہ کے ایڈیز میں رخصتی کر دیں گے۔“



الدرین کی آواز سن کر یہودیوں نے رک گیا یہودی عبادۃ السترار سے کہہ رہے تھے۔  
 "علانی صاحب اس سے ایک بار تو پوچھنے کے میری بیٹی کا تصور کیا تھا اسے اگر شادی نہیں کرتا حتیٰ وچھڑا۔  
 نکاح کیوں کیا۔"

اسے میان صلاط الدین کی آواز سنیں انہوں کی نمی محسوس ہوئی تھی اس کا بھی چاہا تھا وہ زور سے تہ۔  
 لگا لگا اور ہوا ہار کر گئے۔

"یہ تھا آپ کا انتخاب اور پھر یہ۔۔۔ پھر کیا کرے۔۔۔" اس نے فیسے سے نیپل پر دکھایا تھا اور بیڑ پر آکر انہوں نے  
 منہ لپٹ لیا تھا۔ اس کے اس میں کچھ نہیں تھا۔ جانے تھی وہ یوں ہی کیے میں منہ پھپھانے آنسو پینٹنی  
 کو شش کر رہا تھا جب اس نے اسے کھانے کے لیے بلانے آئے تھے۔

"بھئی!" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔  
 "تھوڑا کھانا کھا لو اگر۔۔۔" ان کے اس شفیق لہجے میں جانے ایسا کیا تھا کہ اس کا دل چاہا کہ وہ چھوٹ چھوٹ کر  
 روئے نہ لگے۔

"بھوک نہیں ہے۔۔۔" اس نے ذرا سا راسرا اٹھایا۔  
 ضبط کر کے یہ کوشش میں سرخ ہوئی آنکھیں اس پریشان سے ہو کر اس کی سپاس ہی بیٹھ گئے۔  
 "شعبی یاد رکھتے ہو یا نہیں۔۔۔ شایہ اس میں بہتری ہو۔"

"بہتری۔۔۔" وہ یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔  
 "جب یہ رشتہ ہو رہا تھا جب میں جب کہ رہے تھے کہ شاید اس میں بہتری ہو تو پھلایا گیا بہتری تھی میری اور  
 غلام کی شادی میں آصف اور تلی کے نکاح میں پوچھے جا کر عمل لایا۔"

"شعبی کل بڑا ذکاوت!" انہوں نے اس کے ساتھ ہاتھوں میں لے کر بولے سے دیا۔  
 "کچھ باتیں انسان کی قدر میں لکھی ہوئی ہیں اللہ کی طرف سے آزمائش ہوئی ہیں اپنے بندوں کی۔"

"لیکن اس پر بھائی آئی۔۔۔" اس کی آواز بڑے کئی اور آنکھوں میں آنسو چھپنے لگے۔  
 "آئی کا کیا تصور ہے اگر ایسا جان۔۔۔"

"ایسا جان تلی کے دشمن ہیں میں بھی لیکن تقدیر۔۔۔" سفر کرتی ہی وہ ایک سے سمجھا رہے تھے۔ بولے  
 بولے نرم لہجے میں۔ لیکن وہ سننے کے لیے جس خوشگلی کی ضرورت تھی وہ اس میں نہیں تھا۔ اس کے جانے کے  
 بعد وہ کتنی ہی دور تک بچوں کی طرح رونا رہا تھا۔

اور پھر اگلے چند دن وہ نہ تو کھانا کھا تھا نہ ہی تلی اور دھڑا بیکم کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت پیدا ہوئی۔ تب  
 انہو خود ہی اس کے کمرے میں آئی تھی۔

"شعبی تم کا کچھ کیوں نہیں جا رہے۔۔۔" وہ تلی کا سا انداز۔ اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے  
 چہرے سے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

"اور تم غلام کو لینے بھی نہیں گئے۔۔۔" انہو اس کی سپاس ہی بیٹھ گئی تھی۔  
 "دھنئے کچھ کا کہہ کر کئی کئی گھنٹے میں آجائے گی خودی۔"

"شعبی! اور دھو کچھ میری طرف۔ تم اتنے اب بیٹھ کیوں ہو رہے ہو۔ کچھ باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی  
 ہیں۔ ان کا دکھ ان کا کرب اپنی جگہ پر لیکن ہم اللہ سے تھکوا تو ہمیں کر سکتے تھے۔ چلو انھو شایہ یا ہر کو سننا ہوتا تھا کہ  
 وہی ہے تم بھی کر لو اور کچھ جانو۔"

اور وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اس نے انہو سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اسے لگا تھا اس کی اس کچھ  
 کہنے کے لیے ہی نہیں۔ بھلا وہ کیا کہتا اس سے کہ اس کے اس طلاق کا مقصود ہے۔ دکھ ہے بلکہ اس نے کسی  
 سے بھی کچھ نہیں کہا تھا نہ کچھ پوچھا تھا۔ منہ سے خودی اسے بتایا تھا۔

"علانی صاحب نے آصف کو فون کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے ہماری خواہش پر یہ قدم اٹھایا ہے۔ جب بھی  
 اس نے ہفتی کے لیے کہا ہے تالیاں۔"

"بھگواس کرنا ہے۔۔۔" اسے سن کر بیات پر غصہ آیا تھا۔  
 "وہ اصل حاوی صاحب کا خیال ہے کہ سب کیا کرنا ہے اس کا بھرا اس کی بھالی کا ہے وہی اسے الٹی سیدھی باتیں دے رہا تھا۔

وہی ہے۔۔۔ دراصل وہ اس کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔  
 "اور کیا یہ علانی صاحب کو پہلے دے نہیں تھا۔۔۔" اس نے اسے معلوم ہوا تھا کہ موصوف کی بھالی انگوٹھی اور  
 لٹاں میں دے گئے تھے۔ لیکن تلی کیسے اور کہہ رہی تھیں کہ ہم کیا جانیں کہ آصف نے تکیوں طلاق دی۔ کوئی  
 بات ہوگی۔

"تھوڑے دنے کر ہا ہر نکال دینا تھا۔۔۔" وہ یوں ہی غصے میں کھولتا ہوا کالج پر پتھا جب زلزلے دیکھتے ہی اس کی  
 طرف لپکی تھی۔

"بھئی! ہوا تھوڑی سی آہم کچھ کیوں نہیں آ رہے تھے۔ تمہارا اسل بھی آئی تھا تم ٹھیک تو تھے۔ ہاتھ خالہ اور انکل  
 بھی اسلام آباد گئے ہوئے تھے تلی بے نیاز تھا اور کچھ کامیابوں سے وہ میری چلے گئے۔ آج آنا ہے انہوں نے میں  
 یہاں بھی باہل میں اپنی فریضے کے پاس۔۔۔" وہ تیز تیز بولتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بے چینی اس کا  
 اظہار ہے۔ بیشتر نے سیدھا رو کر دیکھا۔

"شہر بھائی کی بھی بھائی کیسے اس گئے ہوئے ہیں۔ ایک ہفتے کی چھپانیں لے رہی تھیں انہوں نے میں  
 اس قدر پریشان ہوئی تھی کہ اندازہ نہیں کر سکتے۔ جتاؤ نا کیا ہوا سب ٹھیک ہیں ناغذا خالہ۔ تلی، منہ تمہارے گھر کا  
 بھی تو آج تک مجھے معلوم نہیں مجھ خالہ ہی فون کرتی ہیں۔ آج اگر مجھ آئے تو میں نے سوچ رکھا تھا اپنی دوست  
 کو ساتھ لے کر فاطمہ جان جاتیں گی سن لے اتنے دوں کہ آ رہے تھے۔"

"جب ٹھیک ہے زلزلہ۔۔۔" بیشتر نے ایک گری سا لپکی۔  
 "تم کو توئی پریشان ہو گئی تھیں۔"

"ہاں شاید میں وہی نہیں ہوں۔ منوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے چانک اس نے میرا دل کنڈر کر دیا ہے۔"  
 "زلزلہ۔۔۔" بیشتر نے آٹھ کیسے لے لیا۔

"کچھ کچھ دور کے لیے کہیں چل کر بیٹھے ہیں۔ لائن میں چلیں۔" زلزلہ سہلا کر خاموشی سے اس کے پیچھے چل  
 گیا ایک ایک گوشے میں اپنا فاصلہ حاصل پر گئے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

"زلزلہ آئی کو تو نہیں ہوئی۔"  
 "بھئی! اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ کچھ قاصد پر بیٹھی لڑکیوں نے مرکز اسے دیکھا  
 "ہاں رہا کھنٹے۔"

"لیکن کیوں۔۔۔" کبھی شعبی۔۔۔ اس نے بیشتر کا ہاند پکڑ کر جھنجھوڑا۔  
 "آئی تو آئی تھی اتنی باری ہیں کہ جب میں نے بولی مارا انہیں دیکھا تو ہمت ہی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا

تھا خوش قسمت ہے وہ شخص جس کی شریک حیات تلی نہیں گی۔"  
 "مجھے تو کوئی کہ نصیب اچھے میں ہوتے شاید۔" وہ دست دگر تہہ ہو رہا تھا۔ آئی کی طلاق کا دکھ جیسے اس کے  
 دل پر بوجھن کر گھبرا ہوا تھا۔

"بھئی! اب چاہتا ہے خود کو ختم کر لوں۔"  
 "نہیں! نہیں! شعبی! کیا باتیں مت کرو۔"

"دیکھو تم مجھے اب سب کی طرح لکھتے رہا۔" وہ کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہ تھا۔ اس کا تکی چادر ہاتھ مارا  
 دیا کو کس نہیں کرے۔  
 "میں لکھ کر مرنے دیں شعبی۔۔۔" اس کے لہجے میں زاریاں آتی تھیں۔

”دیکھن تم کہتے تھے جاہیں آصف ہند نہیں ہے تو کیا پتا آتی ہے نصیب میں کئی بہت اچھا بندہ لکھا ہو:۔“  
 آصف سے بہت اچھا ہو بہت قدر کرنے والا۔“

”ہاں۔“ اس کے ہتھے بھیلے ہیں امید کی بوی بھڑکی تھی۔  
 ”آصف آتی کے ساتھ بالکل نہیں جیتا تھا۔ لیکن ہم نے اسے ایکسٹ کر لیا تھا۔ نکاح کے بعد ہم نے اپنا بیجان لیا تھا اور پھر ان کے نام کے ساتھ اس کا نام جڑا تھا۔ لوگ تو کہیں کے نام لکھتے سال اہیں کے ان کے اہل ہیں۔“

امید کے ساتھ ہی ایک سو سو سا بھی مل میں اٹھا تھا۔  
 ”سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوئے تھے، سبھی کچھ لوگ بہت اعلا عرف بھی ہوتے ہیں۔“ وہ بولے نرم نرم لہجے میں تو کئی رہی اور اس کے دل پر دھرا ہوا کچھ کم ہو گیا اور اس نے کبھی باریزی طمانیت ہی محسوس کی۔  
 ”چھاپے ایسے کم ظرف لوگوں سے جان بھولی۔ کیا پتا تھی کہ بعد وہ کچھ ایسا کر دیتا تو۔“  
 ”نرمل اہل سے بوجھ ہوتا تو اس سیاسی پیشی نرمل کو بغور دیکھا۔“

”مگر آخری پریشان کیوں ہوئی تھی۔“ کسی احساس سے بدل بہت زور سے دھڑکا تھا۔  
 ”دیکھیں بھیرے پریشان نہیں ہونا چاہیے تھاقبھی تم اتنے دن بغیر اطلاع کے غائب رہے۔ حسنہ خالہ یہاں ہوتیں تو۔“ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔  
 ”تھیلے میں سوچتا۔ اس کا جواب ایک سو م ہی کھڑا ہو گیا تھا اور نرمل حیران ہی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔“  
 ”چلو اب آتھو۔“ وہ مسکرایا تھا۔  
 ”مزید مکی کلاس ہے۔“

نرمل بغیر کچھ کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں اسی طرح حیرت تھی اور وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”میں نے تم سے کچھ کہا کہ ہوش۔ لیکن اگر آپ نے ناہیں دیکھا تو پھر جہاں کے میرا کئی چاہا رہا ہے کہ آج یا ہر روز کریں۔“ غزالہ نے کسی قدر ماند آوازیں لگا کر کہنے لگا۔  
 ”تم نے کبھی شاید ناہیں میں سے نہیں کیا کیا ہے۔“  
 ”مجھے خدا کے لیے یہ سیلاب تم کو دینے دو مجھ کو لڑکا ہے۔“ وہ اسے اور وہ سے طلاق ہوئی ہے۔ مزے سے خوش خوش پھر رہی ہے۔ آخر کئی بات ہوئی تو سب ہی تھ۔  
 ”نہیں نہ کرو پتا اس سے۔“ وہ اپنے جگے ایک لفظ بھی لگاتا۔“  
 ”وہاں ایک کو گئے۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

”ہاں بولو کیا کو گئے اور کس کس کا منہ بند کر گئے سب ہی تو کہہ رہے ہیں کہ آصف نے کوئی ایسی ویسی بات سنی ہوئی روزہ اتنی خوب صورت۔“  
 ”غزالہ۔“ وہ زور سے چیتا۔

”بھوکہ چکا تو روزہ۔“ ایک لمبے کو غزالہ اس کے تیرہ دیکھ کر سہم گئی لیکن دوسرے ہی لمحے چل کر بولی۔  
 ”بہن کی بات پر کسی ایک گتے سے اور۔“ بات دوسری چھوڑ دے ہنر سے مسکرائی۔  
 ”یہ تمہارے والد محترم کا کیا دھرا ہے۔“ ایسا ٹھٹھا خاندان۔“ ہنر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے کس طرح اس کو خاموش کرانے۔

”میں بہت کلام مت لیتا ایک تو انہوں نے احسان کیا کہ رشہ کر دیا اور اٹا۔“  
 ”مگر نے ایک تیر نظراس پر ڈالی اور تیری سے دردناک کھول کر ہر نگل کیا۔ کچھ دیر یونی تر آمدے میں کھڑے ہو کر اس نے اپنے ہتھے پر قابو پانے کی کوشش کی۔“

”دوسری روز شاید میں بالکل ہو جاؤں گا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں کی مضبوطی اپنے ہاتھوں کو جکڑ کر کیٹھا۔ دروگا لپکسا احساس اس کے ہاتھوں سے رشتان کے گانگہ کی گواہ آ رہی تھی۔ وہ غالباً ”بہن تو دھوئے ہوئے گنگنا رہا تھا۔“  
 ”نہن اور ان کے کمرے میں بھی لائن بدل رہی تھی۔

سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ میاں صلاح الدین انہیں بھی لوٹنے سے ورنہ ان کے آتے ہی کھانا لگا دیا جاتا تھا۔ اس نے ذرا سا رخ کو دروازہ کی طرف دیکھا۔ اسٹرک کے لیے لائن چل رہی تھی۔ جتنی وہ دھڑکی تھی۔ اس وقت وہ سہن ایسا کمرے کے کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ نہیں غزالہ نے آکر کیا کیا بکواس کی ہوگی۔ وہ اس کی کچھ سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ دل ہی دل میں حرمین کی محسوس کرنا، وہ وہ جیسے قدموں سے چلتا ہوا اسٹرک کے کمرے کی طرف بڑھا اور دروازے کے کپاس رک کر دیکھ دی۔

”ہاں۔“ اس نے کئی گواہ تھی تھی۔ وہ وہ وہ کھول کر اندر دلی ہوا اسٹرکوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لے کر سر سے کرسی پر پھونکا رہا تھا اور انہیں بند نہیں۔  
 ”وہ حرمین پر رکھ دو۔“ بغیر انہیں کھولنے کی کوئی بھی حکمی آوازیں انہوں نے نہ کہا۔  
 ”اس نے پھانسی ہوئی ہوش۔“

”اسے کبھی۔“ وہ یکدم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔  
 ”میں سمجھا رہا تھا۔“ وہ اپنے ہاتھوں کے لیے کہا تھا۔“  
 ”تھیلے میں سے کچھ تو پھانسی ہوئی جا رہی ہے؟“  
 ”میں رہی ہے۔“ وہ فریادی سے مسکرایا۔  
 ”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“  
 ”ہاں نہیں تو ٹھیک ہوں یو کی محسوس ہے۔“

انہوں نے مسکرائے کی کوشش کی۔ یہ کسی محسوس تھی جس نے جسمو جاں دونوں کو متھل کر دیا تھا اس روز وہ عذر دیکھ سے علیحدگی بات نہ کر سکتے تھے۔ اس امر کی طلاق نے خود انہیں پریشان کر کے رکھا تھا۔ اس پر علیحدگی کا رویہ انہیں اندر سے توڑا تھا۔ انہوں نے علیحدگی کو ان کے متعلق ہانے کے لیے فون کیا تھا لیکن اس کا بے زار اور دھما دھم محسوس کر کے کچھ بھی نہ کہہ سکے تھے۔ کس کیل ایسا کر رہی تھی یہ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ آج تک بھی اس نے انہوں نے اسے فون کیا تھا۔ کیا لیکن اس نے فون اٹھایا نہیں کیا تھا اور پھر دیر بعد آف کر دیا تھا۔ انہوں نے کمرے کے نمبر فون کیا اور پھر نہ بتایا کہ وہ۔“ پر نہیں ہے۔

وہ بہت اچھے سے تھے۔ بہت پریشان تھے۔ اگر کئی کا سلسلہ نہ ہو تو وہ ایک دن بھی نہ رکتے اور خود کو کراچی جا کر اس سے اس دے کا جواز مانگتے۔ لیکن عذر دیکھ کر اس پریشان چھوڑ کر جانے کو ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا اور پھر میاں صلاح الدین کی طبیعت بھی ٹھیک نہ تھی۔ کدوہ ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ ایسے میں صرف اپنے لیے سوچنا انہیں خود غرض محسوس ہوتی تھی۔ لیکن وہ اپنے دل کا کیا کر سکتے تو کبھی بار علیحدگی کے لیے دھڑکا تھا۔ وہ تو اس جذبے سے آشنا تھے۔ علیحدگی ہی انہیں اپنی محبتوں کا احساس دلایا تھا اور اب خود ہی دور ہوتی رہی تھی۔

”کچھ دن آٹھ سے چھٹی کر لیں۔“  
 ”مگر نے ان کے کچھ کچھ خود پر نظر ڈالیں۔“  
 ”نہن میں داریاں کی آپ کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ بولے سے ہنسنے۔  
 ”غزالہ کہاں سے ایسی جان کے کمرے میں۔“  
 ”میں اپنے کمرے میں ہی ہوتی۔“ ہنر کے لیے اسے سنی تھی۔  
 ”مجھے سمجھ سیتے اس کو کہ کوئی بھی فریڈ نہیں ہے۔“  
 ”چپے آپ کو تو مت شامل کرو۔“

”یہ ہویا ایسی ہی ہوتی ہیں اکثر انہیں شوہر کے عزیز رشتہ دار اچھے نہیں لگتے۔ تم مت چڑا کرو۔ ہوئے ہوئے اسے خودی احساس ہو جائے گا کہ اسے ان رشتوں کا احترام کرنا ہے۔ یہاں سبھی اس سے محبت کرتے ہیں۔“ اس کا تازہ ہنسمانہ لڑا تھا۔

”ہو چکا ہے اس اس۔“ وہ بڑبڑایا۔

”رمضان نکلتا ہے ہوئے اندر داخل ہو اور پھر مڑو کہاں بیٹھے کچھ کر ٹھیک گیا۔

”نہی۔“ جیسی بھائی جی یہاں ہیں لیکن میں تو صرف ایک ہی کپ چائے لایا ہوں۔“

”گوئی بات نہیں میں چائے نہیں پیوں گا۔“

”کیا بات ہے مزاج مبارک سا زک رہے ہیں۔“

”مفضل مت بولا کرو۔“

”آپ کو ملاوہی ڈانٹ رہے ہیں۔ میں نے مزاج مبارک ہی تو پوچھا تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔

”آج کل رمضان ڈرامے بہت کچھ لگا ہے۔“ سفر نے چائے کا کپ اٹھایا۔

”بے شعبی صاحب کو تو نظری لگ ہی ہے صاحب۔“ وہ بولے سے اکتا ہوا ہر گل گیا۔

”اس سے تو اچھا خاصی صاحب کی شادی نہ ہوتی۔“ وہ بچن کی طرف جاتے ہوئے کہہ رہا لیکن اس کی آواز

کلے روڑاڑے سے اندر تک آ رہی تھی۔

”پکاش ایسا ہی ہو۔“ ہمیشہ زب کا ماسور اس طرف متوجہ ہو گیا۔

”معزز خالد اور قادی اگلے آج آتا تھا آگے ہوں گے آپ کتنے گئے دھر۔“

”نہیں میں بہت دنوں سے نہیں گیا۔ بلند بہت کچھی ٹھہرا ہوا تھا کھلی ہی آیا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ سب گھر پر نہیں ہیں۔“

”آپ کو تواس نے کافی بے تکلف ہیں۔“

”ہاں گھل گیا کھلو اتارے۔“

”وہ بات کرتے کرتے جھجک گیا۔

یہ خیال آیا چاک سی اس کے کڈن میں آیا تھا۔ زل سے بات ہونے کے بعد اس کے کڈن میں خیال آیا تھا کہ وہ اچھا اور بہتر من شخص شجاع ٹھہرے ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر خودی اس نے اس خیال کو کڈن سے جھٹکنا تھا بھلا اک دفعہ انکار کے بعد حمنہ خالد پھر کھل آئی کے لیے کسی اور اگر کہیں تو کیا نہیں آیا جان۔ لیکن نہیں آیا جان اب انکار نہیں کریں گے لیکن حمنہ خالد شاید۔

اور اب یہ خیال اچھا کھلی اس فرے ہا میں کرتے ہوئے کڈن میں آیا تھا کہ اگر وہ حمنہ خالد سے کہیں تو شاید وہ ”کو ناٹھی جھجک کھل رہے ہو۔“ سفر نے ایک شفقت بھری نظر اس پر ڈالی۔

”وہ اچھا بھائی اگر حمنہ خالد پھر شجعی بھائی کے لیے بات کریں تو شاید کیا جان اب انکار نہ کریں۔ ابھی شجعی بھائی کی تو کہیں بھی بات نہ نہیں ہوئی۔“

”ہاں۔“ سفر نے ایک گہری سانس لی۔

”شجعی کی بات نہیں گئے۔“

”اس نے بھائی آپ بات تو کریں حمنہ خالد سے میں آیا جان کو مانوں گا۔“ اس نے ملتی نظر اس سے انہیں دیکھا۔

”شجعی۔“ انہوں نے غالی کپ پھیل پر رکھا۔

”شجاع میرا بہت اچھا دوست ہے۔ بہت خوش ہے فیڈوں میں ہمارے درمیان بہت کرا تعلق نہ گیا ہے۔ میں بلند بہت سے ملنے جاتا تو کئی بار اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ پھر میں ہو گیا پلڑ پر بطور خاص اس سے ملنے جانے

گاہ شاعر بلند بہت میں اور اب شجاع ہم چاہوں نے کبھی ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کبھی نہیں چھپائی۔

میشر بہت خوش ہے ان کی بات نہ رہا تھا۔

”شجاع! آج کن میں اس طرف سے اور بہت جلد اگل قادی اس کا پوئلے کر حو لی جانے والے ہیں۔ ایسے میں میرا بہت کرنا فطری مناسب نہیں جب کہ مجھے شجاع کے دل کی کبھی خبر ہے۔ ہماری آنی کے لیے تو کوئی بہت خاص بندہ ہونا چاہیے جس کے دل پر آنی سے پہلے کوئی نام نہ لکھا ہو۔“

میشر خاموش بیٹھا تھا اس کی آنکھیں بجھ چکی تھیں اور دل پر اس فکری کی چیتنی جاری تھی۔

”اس کی بھٹی شاعری اس کی طرف لکھا۔“

”ہاں کیا بات ہے۔“ سیدہ اس شاعر نے چونک کر نظر اس اٹھائیں۔

”کچھ سوچ رہی ہو۔“

”کچھ نہیں۔“

”مجھوت میں بہت دیر سے تمہیں دیکھ رہی ہوں تم نے کتاب تو کھول رکھی ہے لیکن پڑھ نہیں رہی ہو۔

مسئل ایک کھنڈے سے تم نے یہ صفحہ کھول رکھا ہے۔“

”اس پر تم ایک کھنڈے سے میرا شاہدہ کر رہی ہو۔ جب کہ بقل تمہارے صبح تمہارا میٹ ہے اور تمہیں بہت

سارا رہتا ہے۔“

”میں پڑھنے کوئی نہیں چاہ رہا۔“ بھٹی شاعر نے کتاب بند کی اور اسے بند سے اٹھ کر اس کے بند پر آ بیٹھی۔

”میری بات ہے کھلی یہاں پڑھانی کے لیے آئے ہیں اور شاعر کھلی پر ہیٹ کے متعلق پوچھتے ہیں۔“ نمبر

کم آئے تو ناراض ہوں گے۔“ میں صبح اٹھ کر ایک نظریہ کھلوں گی۔ میرے سبجیکٹ مشکل نہیں ہیں کہ تمہاری

طرح پر ناگنا کرے۔“ بھٹی نے خوش گوار لیے میں کہا۔

”ہاں میڈیکل کی پڑھانی بہت مشکل ہے پڑا دویان بہت جانتے تو ہے۔“

”لیکن یہ دویان کیل نہا ہے یہی تو پوچھ رہی ہوں۔“ سیدہ اس شاعر کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ چکی۔ اب وہ اسے کیا بتائی کہ دویان کیل نہا ہے جب سے قائم علی شاعر نے اپنی خواہش کا اظہار شاعر سے کیا تھا تب سے ہی وہ پڑھانی کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا رہی تھی۔ دویان بار بار شجاع شادی طرف چلا گیا۔ شجاع شاعر نے پہلی نظر سے ہی اپنے بندہ کی کی سند سے دیکھی تھی لیکن وہ خود سے بھی اپنے بندہ کی کا اظہار کر کے ڈرتی تھی۔ شجاع کی راجھتی اس کی چاہت اس کی نظروں میں ہا کچھ کہ ظاہر نہیں تھی لیکن وہ انجان نہ جانتی تھی۔ وہ دویان سے جانتے تھے کہ یہ راستے آسان نہیں ہیں۔ تب ہی تو شجاع نے کبھی اظہار کیا نہ اس شاعر نے خود کو یہ یاد کر لیا کہ وہ شجاع کے لیے کسی جذبے کو اپنے دل میں محسوس کرتی ہے۔ لیکن ایک اچانک جیسے سارے بندہ ٹوٹ گئے تھے اور سب دویان سے ڈرے گئے تھے۔ قادی پچانے تو صرف اپنی خواہش کا اظہار شاعر سے کیا تھا لیکن اس نے جو اپنے دل کے گرد دویان پر کھڑی کر رکھی تھی ڈرے گئیں اور سیدہ شجاع علی شاہ سیدہ دویان سے دل میں رہا بن گیا۔ وہ خوفزدہ ہوئی۔

اس نے خود کو کتنا سمجھا لیکن دل تو اب شاید کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھا۔ لاکھ اس کے ہاتھ میں امید کا کوئی تار نہ تھا نہ ہی اس کا کوئی جتنو اس کی پھٹیل پر چکا تھا شاعر نے اتنی باتوں سے تھے۔

”میں چاہے آپ ایسا سوچے ہیں۔“

”لیکن کیل شاعر نے اتنے باتوں میں کیوں ہو۔“ یار میں شاعر کے پاؤں تمام لوں کا کسی طرح تو یہ برف پگھلے

گی۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ شاعری کی بات مائیں سے آپ تو نہیں سمجھ سے زیادہ جانتے ہیں چاہو۔“ اور لاؤنچ کے

باہر کھڑے کھڑے اس نے سید قائم علی شاہ کو کہنے لگا۔

”ہاں لیکن تم تو مجھے ابوسید کہنا شروع کر رہے ہو۔ تم کو تو میرے قصور سے خوش ہونے دیجھے۔“  
ان کے کھڑے سے ادا سی جھلکتی نگاہیں اور اس کا دل بڑھنے لگا تھا۔

”چلو چلو میں نہیں چاہتا کہ آپ خوش رنگ امیدوں سے اپنا دامن دل بھر لیں اور آپ کے ہاتھ میں سوائے  
یادیں سے کچھ نہ آئے مجھے ذرا ہے چاہو کہ میں ہم اس ملاقات سے بھی نہ جائیں۔“

شاہ رخ نے گدگداتی سی کھانسی سے کہا تھا۔ لیکن اس کے ڈوبنے میں دل نہ جانے کہاں سے غرا تھا۔ ہونے لگا تھا۔  
کہا کہ شاہ رخ کی زبان میں اور عجیب شاہ رخ اپنی تمام تر وجوہات کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔  
وارفتگی سے اسے تنگاسی خیز پختہ ہونا۔

اندر قائم علی شاہ افسردگی سے کہہ رہے تھے۔

”مجھے بھی کبھی خواہش ہے۔ کو اس نے کہا میں لیکن میں اور دل دھڑھڑ کر رہا تھا۔ وہ وہیں سے واپس  
پلٹ آئی تھی اور تب سے اب تک اندر مجھ پر اجال ہوا تھا۔ ابھی یکدم سارے چراغ بجھ جاتے وہ گھبرا کر اپنے  
دل پر ہاتھ رکھ لیتی، یہ سب کیا ہو رہا ہے اور عجیب شاہ کو شاید بڑی بھی نہ ہو کہ دل میں زندگی نہ کر دھڑکنے لگا  
ہے۔“

”جیسا تو اسی! دھیان کہاں رہتا ہے تمہارا۔“ اسے خاموشی دیکر عظمیٰ شاہ نے پھر پوچھا۔  
”یہ میری دولت ہے تاہم اس کی سرکھڑا کیورس ہو گئی۔ رخصتی سے پہلے ہی میں نے چھاری بہت پریشان  
تھی میں دھیان اور صبر چلا جاتا ہے۔“

”وہی لیکن تاجو اس پر بھائی کی بہن سے وہی اس پر بھائی جو شاہ رخ بھائی کے دوست ہیں۔“  
”ہاں لیکن تم کہتے جاتی ہو انہیں۔“  
”بلند بخت! لڑکی ذکر کرتا ہے ان کا اور پھر شاہ رخ بھائی بھی بتاتے رہتے ہیں نا۔“  
”وہاں! تمہاری اس پر بھائی اور میں حسنہ چچی کے بھی عزیز ہیں نا۔ غالباً۔“ بہن کے پیچھے ہیں۔“ اس نے بے خیالی  
سے کہا۔

”کہاں ہے اسی! یہ سب تو تمہیں بتا ہے۔ بہت شروع میں جب ہم یہاں آئے تھے تو شاہ رخ بھائی نے بتایا تھا  
اور شاہ رخ انہیں کے ساتھ تو جلی کیا تھا۔ لہذا آپ کا دھیان دعا تھی کیس انہما ہو رہا ہے۔“  
وہ ہلے سے ہنسی اور غور اس کا ہو گیا تھا۔

”اسی ایک بخت تاجو تمہارے نزدیک بہت محبت کا جذبہ کیا ہے۔“  
انہا شاہ نے غمگینا کر اسے دیکھا۔ وہ انہوں میں بے تحاشا چمک لے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا عظمیٰ نے میرے  
دل میں جھانک لیا ہے اس نے پیشانی پر غور کر رہا ہونے والے اپنے کے فکر سے انہوں کی پشت سے صاف کیے۔  
”محبت کا جذبہ! لائق تھے ہمارے دل پر کھا ہے والدین کو والدین سے گولا دو گولا والدین۔“  
”اے نہیں۔“ عظمیٰ نے یکدم اس کی بات کاٹ دی۔  
”میں اس محبت کی بات نہیں کر رہی۔ میں اس محبت کی بات کر رہی ہوں جو ہم کسی انہی کے لیے اپنے دل میں  
محسوس کرتے ہیں۔“

”میں کیا بتا سکتی ہوں۔“ اس کی نظرس جھک گئی۔  
”یہ محبت بہت خوب صورت جذبہ ہے اس شاہ۔ بہت دلچسپ دل چاہتا ہے کہ ہم اس ایک شخص کو سونے  
رہیں۔ یہ محبت تو کون میں امیوں کے ڈونڈنے لگتی ہے۔ کچھ تو سمجھتی انہیں۔ یہ محبت بڑی عجیب چیز ہے پاگل کر  
دیتی ہے بندے کو۔“

”عظمیٰ تمہیں سبب۔“ اس شاہ کی انہوں میں حیرت تھی۔

”ہاں میں یہ سب اس لیے کہہ رہی ہوں کہ مجھے بھی محبت ہو گئی ہے کسی سے۔“ عظمیٰ شاہ نے بہت آرام سے  
جوابت کہا اس نے اس شاہ کو دیکھ کر کہا۔

”نہیں کیا کہہ رہی ہو عظمیٰ! شاہ کون کون ہے۔“  
”میں نہیں کہہ رہی۔“ عظمیٰ نے اس کی انہوں میں بے تحاشا چمک تھی اور رخسار کی اندر دلی احساس سے گلے گول  
ہو رہے تھے۔

”میں نہیں کہتے کسی کون۔“ اس شاہ پر اٹھ بیٹا ہوا تھا۔ مسرت تھی۔ شاید عجیب شاہ پر اس نے سوچا۔  
”تمہارا کیا کہہ رہی ہو اب۔“ عظمیٰ نے اس کے انہوں کی حرکت کو دیکھا۔  
”میں گھبراؤ نہیں رہی لیکن تم عظمیٰ مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آ رہا۔“  
”اس میں شک نہ کرو۔ اس نے کہا۔ اس بات سے اس کا مجھے محبت نہیں ہو سکتی کسی سے۔“  
”ہو سکتی ہے۔“ اس شاہ نے اسے سنبھلے سے کہا۔  
”تو نہیں سمجھتے کسی ہو گئی ہے خود بخود یہ بلند بخت ہے۔“

”بلند بخت ہے۔“ اس کا بعد حیرت ہوئی۔  
”ہاں بلند بخت ہے سچ! اس شخص اتنا چارہ ہے اتنا خوب صورت کہ جب سے مجھے احساس ہوا ہے کہ میں بلند  
بخت سے محبت کرتے ہیں تو میری یاد چاہتا ہے ہر آن رہ رہ کر دیکھتی ہوں۔“ وہ انہیں بندے کے جذبہ

پر دلی تھی اور اس حیرت سے اسے کہہ رہی تھی۔  
”کہاؤ مجھے! میرے اس مطلب سے بلند بخت ہے۔“ اس نے رک رک کر پوچھا۔  
”نہیں۔“ عظمیٰ نے انہیں کھل کر اس کی طرف دیکھا۔  
”میں تو شاید معلوم نہیں کیس کہ میں ان کے لیے اس طرح سوچتی ہوں۔ وہ تو میرے ساتھ بچوں کی طرح  
نہیں کرتے ہیں۔“

”وہ۔“ اس شاہ نے مری سانس لی۔  
”میں بھی پاگل ہو عظمیٰ! انہیں انہوں میں دل میں آجائی کہیں۔ شاہ رخ بھائی کو خبر ہو گیا ہو جنہیں گے اور  
چھوڑا کیا کہیں گی۔ وہ شاہ رخ بھائی کے لئے اچھے دوست ہیں۔ تمہارے متعلق ان کا کیا نہ ہو گا اور پھر ان کی  
دوستی۔“

”یہ فضول خیال میں ہے بڑے سسر۔“ عظمیٰ نے اسے اطمینان سے کہا۔  
”محبت ہے اور محبت سوچ سمجھ کر نہیں ہوتی خود بخود ہوتی ہے۔ آج آپ بتا ہی نہیں چلا۔ میرے ساتھ  
بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ اس اور بلند بخت۔“ اور شاہ رخ بھائی نے مجھے کہا میں نے چاہنے کے کڑی بھی۔ بلند  
بخت نہیں ہے کہ اس کی والدہ نے ان کے لیے کوئی لڑکی دیکھ کر بھی لے لیا ہے۔ اب کے نہیں بڑی جا میں لی

گھر گھر والے بہت عجیب ہو رہے ہیں۔ میں نے چاہے میں بل پر رکھ کر ان کی طرف دیکھا تو مجھے لگا جیسے کوئی جینی  
میں میرے انہوں سے نکلی جا رہی ہو۔ میرا دل بچے کیسے بال میں کہنے لگا۔ میں چاہنے کے کڑی ہا ہر جلی  
آئی جلا کہ بلند بخت نے مجھے بلایا بھی تھا کہ میں اس میں اس کا کہنے لگا۔ میں چاہنے کے کڑی ہا ہر جلی  
لڑکی کے لیے اپنے دل میں ہے حد حد محسوس کیا اور اسی بتا ہے اس وقت مجھے اور کہ ہوا کہ میں بلند بخت سے  
محبت کرنے لگی ہو۔ بتا کہ میرے کہہ رہی ہوں۔ وہ شخص تو میرے دل میں چھپا بیٹا ہے۔“  
”لیکن عظمیٰ اس کا جواب۔“ اس شاہ کے لیے میں تشویش تھی۔

”بہت ہے کہ ابھی اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دو۔ ہم سب کے لیے اسی میں بہتری ہے۔“  
”یہ ممکن نہیں ہے اسی۔ میں نے کہا کہ وہ تو میرے دل میں زندگی نہ کر دھڑکنے لگا ہے۔“ وہ اس کے بیٹے  
انہ کر اپنے بیٹے پر انہی کی اور تکیے پر بڑی ڈانڑی کو کھولا۔



”سنو اسامیہ اسلام امجد کی ترقی و صورت نظم ہے  
تمہارا نام کچھ ایسے تیرے وہ نول پہ کھلے ہے

اندھیری رات میں جسے  
اجانک جانیدیل کے کسی کو نے سے جھاگے  
اور سارے نطوں میں روشنی بچل جاتی ہے  
کلی جیسے لڑتی اوس کے قطرے ہن کے سحرانی ہے  
بدی رت کی مائوس سے آہستہ کی ڈنڈی کے پتلی ہے  
تو خیر و باغ کی دیوار سے روکے نہیں رکتی  
اسی خوشبو کے دھاگے سے میرا ہر چاک ملتا ہے  
”عظمیٰ عظمیٰ“ میں سے صبح میں سے باہر۔ ”سیدہ اساتشاہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اس

کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔  
”اچھی! مجھ میں بڑا عظمیٰ ابھی وقت ہے اپنے آپ کو دیکھیں روک روک لوسہاں۔“  
”اب کچھ بھی اختیار میں نہیں رہا اساتشاہ۔“ اس نے بڑے جذب سے کہا۔  
”تم سے بات کرنے سے پہلے میں نے ہر طرح خود کو سمجھا کر دیکھا تھا۔ میں نے سوچا تھا ابھی یہ کوئی پھولی

ہے اس سے پہلے کہ یہ تن اور درد خست نہ جائے۔ میں اس سے آگے نہ بڑھا کر دیکھ چکا ہوں لیکن اسامیہ تو تن اور  
درد خست نہ چکی اس کی اور اس کی جڑیں اندر گمراہیوں تک پہنچ چکی تھیں۔“  
”لیکن عظمیٰ تم جانتی ہو لیکن نہیں کہ کبھی شادی۔“  
”محبت صرف حاصل کر لینے کا نام تو نہیں ہے اساتشاہ۔ محبت تو محبت ہی ہے نہ کیا کر شاید اور ٹھہر جاتی ہے۔“

”یہ انسانی باتیں مت کہ عظمیٰ۔“ اساتشاہ نے  
”محبت ہوئی ہے تو بٹانے کی خواہش اور طلب بھی ہوتی ہے۔“  
”کیسے جانتی ہو تم نے تو کسی کسی سے محبت نہیں کی۔“ اس نے اساتشاہ کی طرف دیکھا جس نے نظریں پرانی

تھی اور نگاہیں پھٹکی اس کی اور کمرہ رہی تھی۔  
”کیسے کیسے روکی اس کے بغیر عظمیٰ اپنے آپ کو روک دے نہیں۔“  
”تم نہیں سمجھ سکتی اساتشاہ۔“ اس نے محبت سے کہیں کہا۔  
”میں جانتی ہوں تمہارا خوف تمہارا درد لیکن اسامیہ معاملے میں ہے اس وہ بھی ہوں جب سے بلند بخت

نہلنے کی مسند پر قہر غالب ہے تب سے اختیار میرے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔“  
”لیکن یہ ایک طرف محبت ہے بلند بخت تو تم۔“  
”مجھے بلند بخت ہے محبت نہ کرں میرے لیے اتنے کافی ہے کہ میں ان سے محبت کرتی ہوں۔ محبت کرنے

والے یہ سب نہیں سوچتے اساتشاہ۔ جیسے تجھ پر بھائی تم سے محبت کرتے ہیں لیکن کیا بھی انہوں نے تم سے کہا کہ  
”تم بھی ان سے محبت کرو۔“  
”عظمیٰ۔“ اساتشاہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا شاعر نے تم سے ایسا کچھ کہا۔“ دل جیسے تیری دیوار میں توڑ کر کہا ہے کہ اب بونے لگا۔  
”نہیں لیکن محبت کرنے والے دوسرے محبت کرنے والے کو بچان لیتے ہیں اساتشاہ نے بھی محسوس نہیں کیا  
کہ جب بھی ہمارے ہاں آئے ہیں یا ہم ان کی موجودگی میں اور جہاں ہیں تو وہ کتنی وارفتگی سے ہمیں سمجھتے

ہیں۔ تمہاری طرف اٹھنے والی ان کی نطوں میں ہزاروں جلیو چمک رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اساتشاہ تم خود کو اس  
روک سے بچا لینا روک لے لے تاخورو۔“

ہے اختیار ایک ٹھنڈی سانس اساتشاہ کے لبوں سے نکلی اساتشاہ اپنی اس پھولی میں کو کیا کہتی کہ اس کا دل توند  
جائے کہ اس نے چلے گا۔

”اگر کوئی راست مجھے بخت کی طرف نہیں لے جاتا اساتشاہ تو شاعر شاہ کا بھی کوئی راست تم تک نہیں آتا۔“  
”عظمیٰ کی خوب بخت آنگھوں میں بارے سے مجھے سمجھے روز اول ہی بلند بخت اچھے لگے تھے۔ ہنس کھ بانٹیں  
زمرہ میں لیکن مجھے ہر مظلوم نہیں تھا کہ ابھی میں ان سے محبت کرنے لگوں گی۔“

”اس سے محبت کرنے کی ہے عظمیٰ۔“ اس کی طرف آتی زینت فاطمہ ٹھٹھک کر رک گئیں لیکن اس اندر  
خاموشی کی عظمیٰ اور اساتشاہ نے اپنی اپنی جگہ سوچ رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر کو بیٹھی اور دانے پر ہاتھ رکھے گڑھی  
رہیں۔ ”راہت سے درد اٹھ کھولا۔“ عظمیٰ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور ہاتھوں کی پشت سے لیے خیرا دل کو

پوچھا۔  
”آج کچھ پیچھے۔“ اساتشاہ نے فوراً پیڑ سے کتابیں ہٹا کر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔  
”تم لوگ بڑھ رہی تھیں یا کچھ گاری تھیں۔“ زینت فاطمہ نے کوئی نطوں سے عظمیٰ شاہ کو دیکھا۔  
”دونوں ہی کام اساتشاہ ساتھ چل رہے تھے۔“ عظمیٰ شاہ نے خود کو فوراً ہی کیوڑ کر لیا تھا جبکہ اساتشاہ گھبراہٹ کی

ہاتھوں کو پسلی پر رکھی۔  
”کیا باتیں ہو رہی تھیں۔“ انہوں نے مسکراتے کی کوشش کی۔ لیکن اندر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی  
”یہ عظمیٰ کی بات کہ رہی کی گلاں کہ نہ وہ ذرا یا شادی تو ہم سب کو نہیں سمجھو میں کے اگر ایسی کسی کوئی بات ہو  
گئی تو۔“ انہوں نے سوچا۔

”کچھ نہیں سمجھتا ہر راجت کے موضوع پر بات کر رہے تھے۔“ عظمیٰ کے انداز میں لاپرواہی تھی۔  
”یہ تم کیسی فطرت باتیں کرتی لگتی ہو میں نے کہا بھی تھا شاہ رخ سے کہ یہاں بی بی وی وی کی ضرورت نہیں  
ہے۔ بڑھتے آئے تو ہم لوگ لیکن وہ شاہ میرے اس کے لیے میں نکلی تھی۔“

”پچھو۔“ اساتشاہ بوجھ کی تک لڑی تھی ہر کاراں کی کسب ہی بیٹھی تھی۔  
”اب کہتا ہے میں تو بالکل بی بی وی میں دیکھتی۔ وقت ہی میں ملتا ہی تلف پڑھائی ہے اب یہ آخری سال  
ہے۔“

”اب یہ چارے بی بی کو مورد الزام نہ فرمائیں پچھو میں کہ بی بی دیکھتی ہوں۔“  
”تو کیا پوچھو بی بی سے کچھ کرانی ہو ابھی فطرت میں۔“ زینت فاطمہ بدستور خفا گہ رہی تھیں۔  
”پچھو یہ فطرت باتیں نہیں ہیں زندگی کی باتیں ہیں۔“ عظمیٰ شاہ بیٹھ سے بولنے لگی اور زینت فاطمہ سے تو

خاصی بے تکلف تھی۔ اساتشاہ نے انھوں کی آنکھوں میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لیکن عظمیٰ اس کے  
اشارے کو نظر انداز کر کے اس پر دیکھ رہی تھی۔  
”اب نے اپنی عمر گزار دی کیا اس اتنی ہی عمر میں آپ کا دل کسی کے لیے نہیں دھڑکا بھی بھی آپ کا دل نہیں

چلا اگر آپ۔“  
”عظمیٰ۔“ اساتشاہ نے صبر نہ ہوا اس سے تنبیہ کی۔  
”کیا فطرت باتیں کر رہی ہو۔“  
”میں میں فطرت بات کیا ہے ابھی۔“ عظمیٰ کو ارکا۔

”دیر انسانی فطرت ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے کشش محسوس کرتے ہیں تو پچھو سے یہ پوچھ  
رہی تھی کہ کیا بھی انہوں نے کسی کے لیے۔“ عظمیٰ نے نہیں کیا کہہ رہی تھی زینت فاطمہ نے غلطی غلطی  
سے اسے دیکھا۔

”ایک مسکراتی فطرت ہرگز نہ کھانا۔“ سانس بھری فطرت ایک فطرت سے دل میں نیزے کی بائی کی طرح گڑھی تھی

کہ برسوں گزر جانے کے بعد بھی وہ اسی طرح کسک دیتی تھی۔ وہ سناٹا سلونا دولا پٹا لاچار چروہی کے معن میں چاہانی پر داس کا ساکتہ خود بند آگھیں کی کمی انہوں نے کہ یہ بند آگھیں ایک بار نکلیں اور یو بھی سکرانی نظروں سے انہیں دیکھیں۔ انہوں نے ایک گھر جھری کی۔

”موری پچھو۔“ ساشادان کے گھسے شہ پائیں والے کہہ رہی تھی۔  
”عطفی کو بھی فضول باتیں کرتی رہتی ہے اور یہ ہے کہ تو انہیں ہے پچھو یہ۔“ نذوق اور غالب کو رٹ رٹ کر اس کا داغ خراب ہو گیا ہے۔

”میں کوئی بات نہیں۔“ وہ شعوری کو کش سے سکرانیں۔  
”بچھوئے۔“  
”یہ ساشادان بچھے یو پانی روتی ہے۔“ عطفی نے منہ بسورا۔  
”میں تو بس یو پانی پوچھ رہی تھی آپ کو اور انکو تو سوری نا۔“

”بچھے رہیں لگ۔“ وہ پھر سکرانیں اور سچا۔  
”کہا کا وہ حصہ بدل میں اٹھانے بیڑوں کی کلیاں کھلتی اور چپکتی ہیں دل کی دشتن تو اسی عمر میں بچھے بخور اور دیران ہو گئی تھی۔ وہ ایک نظروں میں یوں ترانہ ہوتی تھی کہ پھولیں کوئی کی نہیں کھلی کوئی بیڑا نہیں۔“

”کھلنا پچھو بارش نہیں ہیں۔“ اس نے سکرانے کا سونو کھلا۔  
”ہاں بیڑا ہے جذبہ فطری تو ہوتے ہیں لیکن انسان کو انہیں بے کام نہیں کرنا چاہیے۔“ ہمیں اپنی عدلی کو کراس نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں سکرانے میں ہونا چاہیے کہ ہمارا خلق کی خاندان سے ہے اور ہمارا ایک خلط قدم ہمیں ہی میں پورے خاندان کو کھلی میں گرا سنا ہے عزت و وقار بھیتوں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی چیز ان کا غم ابدل نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی چیز کے عوض کوئی ہوئی عزت حاصل نہیں ہو سکتی۔“

زینت قاطر ہوئے ہوئے دل رہی تھیں اور اس شاہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی جب کہ عطفی ایک ہی بات سوچ رہی تھی کیا پچھوئے اس کا ہمیں سہل ہیں۔



”ماہ نور۔“ وہ دُور کراس کر کے اپنی لگی کی طرف مزید تھی ”جب ہمارے اسے پیچھے سے آواز دی۔“  
”جی۔“ وہ رکت گئی۔  
”آج آپ کو ہمارے ساتھ ہی چھٹی مل گئی۔“

”ہاں۔“  
”ہمارے بچھے۔“ کہا۔ مس ہا کو بھٹا اسکول ٹائم کے بعد کچھ دیر گھر کر کلیہ کلک ٹائم کا پڑا تھا۔ انہں میں کوئی ٹھکر نہیں تھا۔ ایک لڑکا چندا پیلے رکھا تھا وہ نہیں دیکھو لے لیتا تھا اور اسکول ٹائم کے بعد سب حساب لے کر ان کا اندراج وغیرہ کرتا اس کا ہاتھ کام تھا۔ بلکہ جب تک اس رقم جمع کرنا اور کم کو سب کی تھوکانا بھی ان کے لئے تھا۔ اپنی بیڑے کے متعلقے میں ان کی خواہ کچھ زیادہ تھی۔

”ماہ نور انہیں نے تم سے کہا تھا تم جاب چھوڑو۔“ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے تیزی سے بات مکمل کی۔ سادہ اور ٹھکر کر رک کی۔

”آپ نے مجھے اس کی وجہ بتائی میں وہاں سے سوچ رہی تھی کہ آپ سے پچھوں لیکن پھر اسکول میں آپ نظری نہیں آئیں گھر میں اپنی طبیعت پتھر خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے آپ کی طرف آئیں سکی۔“  
”رین جانا کیا ضروری ہے ماہ نور۔ تم میرے لئے جاب بھی ہو میں میں غلط خود تھوہ میں ہوں نا۔“

”وہ تو ٹھکر ہے ماہابی! لیکن آپ جاتی ہیں ان حالات میں میرے لیے جاب چھوڑنا کتنا مشکل ہے۔“ خودوا بہت سی تھی لیکن کتنا آسرا ہو جانا ہے۔ جس کی آواز بھر گئی۔

”گور پچھو اور کہاں جاب مل سکتی ہے اتنی جلدی۔“ میرے پاس تو کوئی اور رات نہیں ہے میں کیا کروں۔“  
”گور جاب نہ چھوڑنے کی صورت میں زندگی کی طرف جانے والا ہر رات تمہارے لیے بند ہو جائے گا۔ پھر کیا کرو گی ماہ؟“

”ماہابی! اٹھو۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“  
”ہا اپنی جگہ داخل ہو چکی تھیں۔ گلی کے شروع میں ہی ہا کا گھر تھا۔  
”آج شام سب کے سرال جا رہے ہیں میں میں رکت جاؤں گی۔ تم آنا گھر بیٹا میں جسیں سمجھا سکو۔“

اس نے سر ہلا دیا لیکن جاب چھوڑ دینے کے قصور سے ہی اس کا دل ڈبڈبا جا رہا تھا۔ ایسے وقت میں جب تو شخص یہاں تھا۔ رات ہی انکل افضل اولیہ اگرچہ خیال تو رکھ رہا تھا اس شام کو بھی وہ آیا تھا۔  
”موری مجھے خیال ہی نہیں رہا ابھی عطلے بنا دولا یا۔“ آپ فون کی کر تھیں۔“

”میں نے فون کیا تھا تم گھر نہیں تھے۔“  
”میں گھر پوری رہا ہوں سارا دن اور ابھی بھی گھر سے آیا ہوں۔“  
”لیکن آئی نے تو۔“ اور وہ لہو سے کہہ کر سیدی آئی نے میرا ہی کام کہہ کر نہیں ہے۔ سولیدر مومنوں کے ہرچیز کو دل سے کس اس لیے تھا اور وہ سرے روز عزت تھی چلا گیا تھا۔ تاریخ پر مبنی کسی اور منوں سے مل کر گھر میں بتا سکی کیا تھا لیکن پھر میں ماہ نور کا دل بھیما سوں سا ہو گیا تھا۔ آئی نے ایسا کیوں کیا۔ اس بات میں اتنی اچھی ہوئی تھی کہ کوئی طور پر ہا کی بات بھی اس کے ذہن سے نکل گئی۔ پھر ابا کا بندہ پتھر کسک ہی خوش کر گیا۔ شکر ہے اس کے سب کسان کچھ رقم بھی ”دھورا“ کو لائو کر لے گئے۔ ان کا ٹھکانہ نزدیک ہی تھا۔ آئی نے نصیر خان کی بیوی کو خیال کر کے گھر آجائے تھے۔ لیکن اس نے دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ اگلی رات پر ولید کو فون نہیں کرے گی۔ بلکہ ٹیلی فانی کو ساتھ لے کر خود ہی مل جائے گی۔ اور اب یہ ماہابی بتائیں یہاں اس طرح کہہ رہی ہیں۔ ڈاکر صاحب کو بڑے ختم مزاج کے تھے۔ ان کی گھبراہٹ عزی کر دیتے تھے۔ کچھ بے ایک سے بھی تھے لیکن خود تھوہ برل جاتی تھی۔ چوں کہ تعداد بھی مناسب ہی تھی پھر سب سے ہی بات اسکول گھر سے نزدیک تھا۔ وہ اکثر یہی آ جاتی تھی۔

”ہیر پشان کی گھر میں داخل ہوئی تو طیبہ خاتون نے بتایا کہ دلالی کو بخار ہو رہا ہے۔  
”کیا ایسے ہیں۔“ وہ چادر تحت پر رکھ کر دیکھ بیٹھ گئی۔  
”وہ تو اٹھتے ہیں۔“

”دلالی کی اسکول میں طبیعت خراب ہو گئی تھی نون آیا تھا اسکول سے۔“  
”تو آپ مجھے نون کو بتائیں میں نے آئی اسکول سے جا کر۔“  
”لے آئے تھے۔ میں اب اس اور تمہاری دادی۔“  
”آپ گئی تھیں۔“ اس نے حیرت سے طیبہ خاتون کو دیکھا۔  
”میں نے سوچا تمہاری تو کڑی مسئلہ ہے۔“

اور اہاں کو کیا جاب تھا۔ شیعہ خودی نوکری چھوڑنا پڑا۔ لیکن اگر کوئی ٹھوس رین نہ بتایا ماہابی نے تو میں ہرگز نوکری نہیں چھوڑوں گی۔“

اس نے دل میں طیبہ خاتون کو بتے طیبہ خاتون کی طرف دیکھا۔  
”دلالی کی دوا؟“  
”لے آئے تھے۔ تم تیز بخار تھا۔“

”آپ کہاں چلے۔“  
”میں بخار کم ہو گیا ہے تمہاری دوا کی سر پٹیاں رکھ رہی ہیں کچھ دیر پہلے ہی سوا ہے۔“ وہ بے حد سخی سخی

ی نگہ داری تھیں۔

”ہاں۔“ ماہور نے ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔  
”پریشان نہ ہوں بچوں کو خوار نہ ہوؤ جو اب جاتا ہے۔“

”کیا کروں پریشان ہے مجھے کمرہ راستہ پر دیکھ لیا ہے۔ گوشے میں آتے ہی جیسے پریشان کر دیا ہے، پہلو کپڑے بدل کر آؤ تو کھانا کھا لو مگر دل بالائی ہے۔ صلیبی میں اسکل سے واپس آئے آتے رہو کیسی تھی۔“  
”ہاں مجھے بھوک نہیں ہے بلکہ پیاز جا کر آرام کریں۔ میں ذرا الباسپاس بیٹھوں گی۔ کیا کر رہے ہیں وہ۔“

”سہارے بار دانی کس پاس ہی بیٹھے ہیں۔“

”اور آپ بیٹھ کر ٹھوڑی دیر جا کر نیت جائیں۔ سستی تھی جسکی نگہ داری ہیں۔“  
”میں بیٹھنا رادل گھبرا رہا ہے میں یہاں ہی بیٹھوں گی ابھی۔“ آنکھوں کو بھیجی نہیں جا رہا۔ ایک سوٹ آیا

پڑا ہے بیٹے کو۔

”تو مت سٹیشن تا میں تو مع کر لی ہوں رُود آپ کو۔“ ماہور اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔

”ہاں کوئی اور بات بھی ہے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے۔“

”میں اور کیا بات ہوتی ہے۔ یہ سہرا بھائی سے مت فوں سے نہیں کیا۔ تیری طرف بھینا ابرج کا فون آیا کیسے جس سے میں نے آن فون کیا تھا۔ زمرہ نے اٹھا لیا تھا کہ رہی کسی سب نہیں گئے ہوتے ہیں۔“  
”جی ہاں سب ٹھیک ہیں۔ عرصہ بہت ہوئی رہتی ہے۔“ اس نے نہیں لکھی دی۔ تب ہی اندر کمرے سے

نصیر احمد خان کی آواز گئی۔

”ماہ آگئی ہے کیا؟“

”جی ہاں میں آ رہی ہوں۔“

ماہور ایک بار پھر طرے خاتون کو پریشان نہ ہونے کی تاکید کر کے اندر کمرے کی طرف چلی گئی۔ دادی، دانی کی چاہانی پر ہی بیٹھی تھیں۔ جب کہ اپنی اپنی ذیل چتر کو دانی کی چاہانی کس کس بیٹھے تھے۔ موموار زہلی بھی ایک طرف خاموشی سے اپنی کتابیں کھولے بیٹھے تھے۔ دادی اور نصیر احمد خان کو سلام کر کے اس نے دانی کی پیشانی پر

ہاتھ رکھا۔

”اب نہ بھار کر لگتا ہے۔“

”ہاں اللہ کا شکر ہے۔“ سلسلی خان نے جواب دیا۔

”ہاں آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ علی بی تو نہ دیکھ میں محسوس ہو رہا۔“

”میں خیاب کچھ ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے بالکل ہے پھر چھپیں گے ٹھہرائی کے لیے۔ میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی تھی کہ ہم شام کو آیا کریں گے۔“

”جی تو ٹھیک ہیں۔“

”میں نے معاف کیا تھا۔ میں تمہاری اہل پرورد زینوں کے تلک کی تلاش تو کر رہی ہیں۔“ اللہ نے چھا ہاتھ۔“

”تو ٹھیک ہے لیکن ٹھہرائی بھی بہت ضروری ہے۔ یہ میری کو لیک ہیں نامسروران کس پاس اپنی گاڑی ہے۔“

”خود ہی ڈرائنگ کرتی ہیں۔“ وہ چھٹی سکوت میرے ساتھ ہی آئیں گی۔“

”تو پھر ان کے ساتھ ہی ان کی گاڑی میں چلیں گے گا۔ انکڑا دھکے کے ٹیکنگ میں۔“

”جی تمہاری کو لیک وہ ایک عہد کار لگی ہیں۔“ انہوں نے پوچھا۔

”جی۔“

”بہت اچھی جگہ ہے۔ اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔“

ماہور نے دل ہی دل میں مسرورہ کے لیے جہد کھوس کیا، یاب جو میک اپ کے اسے ان کا چہرہ جلد

اجڑا اجڑا اور پورے لگتا تھا۔ حالہ کہ پچھلے دست فیشل اور خوش رہتی تھیں لیکن جب سے وہ انہیں دیکھتی تھیں

قہر سے ماہور کو لگتا تھا جیسے ایک مستقل دیرانی نے ان کی آنکھوں میں ڈھال لیا ہو۔

”مٹا مٹے کام نہیں کر، تکلیف ہوگی خواہ خواہ سے۔“ نصیر احمد خان نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

”کما تھا میں لیکن انہوں نے کما کوئی تکلیف نہیں ہو گئی تھی۔ کمرہ کاش سے کون سا بچوں کو کھانا دیتا ہوا

ہے۔“

”تو نہیں ہیں۔“ نصیر احمد خان اس سے مسرورہ کے متعلق پوچھتے رہے۔ وہ مختصراً ”جیہا کر نماز کے لیے اٹھ

کھڑی ہوئی لیکن نماز پڑھتے ہوئے بھی اس کا ذہن ماہیں الجھا رہا۔ شام تک کا وقت کاٹنا اسے مشکل لگ رہا تھا۔

”کی جتن کئے کے آؤ لے بچوں کو اس نے جلدی پھینکی دے دی اور عسکری نماز پڑھ کر ماہیں کو تیار کرتا کے کھر

کی طرف چلی۔

”ہاں ذرا سنا سے ملے جا رہی ہوں بہت دنوں سے بلارہی ہے۔“

اس نے بتایا تو انہوں نے حسب عادت جلد واپس آنے کی تاکید کی اور وہ جلد آنے کا کہہ کر کھر سے باہر نکلے۔

اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

”آج وہاں ہمیں سہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“

”حق سنا نہیں آ رہی؟ کیا وہاں بھی اسے سرال بھی ہوئی ہے۔“

”میں لاہ تو آج سے ہی ایک دوست کی طرف چلی ہے۔ رات میں آنے کا کہہ گئی ہے۔ اس کی دوست کی

بہن کی شادی ہے عابا، یابوں کا کھینچنے ہے آج۔“ ماہانی نے اسے بتایا اور کھڑی ہو گئیں۔ ”تم بیٹھو میں

سہارے کے لیے کچھ خوش ہو ڈیو لے آؤں۔“

”میں ماہانی آپ تمہیں مجھے کوئی خوش دینو نہیں لگتا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”تو پھر چائے پکائی ہوں۔“

”بلکہ ماہانی! میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے بتائیں آپ نے کیا کیا ہوں۔ میں چاہے کچھ نہیں بیویں گی کوئی کو

بھارے، آپ کی طبیعت بھی خراب تھی، آج کچھ بہتر ہے، مجھے جلدی جا رہی ہے میں صرف آپ کی بات سننے آتی

ہوں۔“ اس نے ہاتھ پکڑا کر اسیں بھلا۔

”مجھ میں آج بات کیسے شروع کروں۔“ ماہانی نے ہی سے اسے دیکھا۔

”ہاں! ہمیں ہمارے گھروں پر حالات کا تو بتا رہی ہے۔ میں کھر میں سب سے بدی ہوں۔ مجھے سے چھوٹا بھائی بھائی اور

کام چور ہے۔ سوائے کے پڑے اور گھول میں آوارہ پھرنے کے کوئی کام نہیں کرنا اس کے بعد تارا تارا کیا

اور سب سے چھوٹا بہن۔ اپنی وفات کے بعد ان سب کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اہل سدا کی دے کی

میں صوف پوری سرواں ساری ساری رات جاگ کر اور کھاس کھاس کر گزرتی ہے۔ یہ ان کی۔ جب اہل اشتغال ہوا تو

میں اپنے اسے گزرتی تھی۔ اپنے اسے کے بعد میں نے کئی جگہوں پر نوکری کی۔ خود کو معنی اور بیا کر عورت کو

پڑا کرنے کے لیے بہن پرانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ ماہور کیا بتاؤں! گھاس میں میں نے خود کو چھپا لیا لیکن جب

آکر صاحب کے اہل نوکری کو خود کو نہ بچا سکی۔ تب میں نے تصحیر دال دیے میں نے سوا کیا اپنی زندگی تیار کر

کے قہر سے کی زندگیوں چھوٹیں۔“

”ہاں! مجھوں میں آؤ تو میرے گئے۔“

”ڈاکٹر صاحب مجھ پر بہت مہمان تھے اور میں بھی تو کیا ہوں تھوڑے چھوڑے ٹھیک چکی تھی۔ میں نے

راہ سب سے ملنے کے لیے کھراہم لے بھی کر لیا۔“ خود کو جی میں صحتی اور ڈاکٹر صاحب کو ”تو تو“ کچھ نہ کچھ بھلبھ

چکی روکتے تھے۔“ ماہور وہ سارے میں ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”تم سستی ہو گئی میں نے نوکری پر لا تے کیل نہ ماری اور میں دوسری نوکری کیل نہ تلاش کی۔ لیکن میں نے

جتنا یا تمہیں میں بھانجے بھانجے ٹھیک کی تھی۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ اب مجھے ہی اپنے بہنوں اور بھائی کا



دانی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے اور بار بار خود ضبط کے اس کی پلکیں میلی ہو گئیں۔ وہ چلا ہونٹا ہوا، تلے بجاتے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

”بگو نہیں“ اور تیز چلو۔ میڈم کی کلاس شروع ہونے والی ہے، اور تمہیں علم ہو گا کہ میڈم میرے آئے والوں کو کلاس میں گھسنے ہی نہیں دیتیں۔“ پہلی والی لڑکی نے اس کا بازو کھینچا اور وہ تیزیوں باہر آگئی۔ اگلے بڑھ گئیں

”میرا بھی موڈ نہیں ہے۔“

”چھان۔ اس نے اب بھی سر نہیں اٹھایا۔“

”تو تمہارے ساتھ کیا سیکلہ ہے سب لوگ محسوس کر رہے ہیں۔“

”سب لوگ کون۔“

”میںے کلاس ٹیلوز۔“

”کیا ان کلاس ٹیلوز میں تم بھی ہو نزل؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑی گھاس کی پتی پیچھے پیچھکی اور اس کے ہونٹوں پر

محسوس کی سکرابٹ ابھر کر محسوس ہو گئی۔

”تم نے مجھے دوست کہا ہے۔“

”اگر میں نے بتایا تو تم دوست سے دشمن ہو جاؤ گی۔“ وہ بولے۔

”ملاقات میں پیشتر میں سمجھ رہا ہوں۔“ نزل اس کے انداز گفتگو اور رویے سے الجھ رہی تھی۔

”مجیدہ تو میں بھی ہوں۔“

”لو کہ تم مجھ سے جتنا ناچا چاہتے تو۔“ وہ اٹھنے لگی تو پیشتر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھادیا۔

”سب بھاگ کہاں رہی ہو پوچھا ہے تو سنو بھی۔“

”تم جانتا تو۔“

”پہلے تم سے بتا دو کہ تم مجھ سے کیوں چھپ رہی ہو۔“

”میں نہیں تو۔“ نزل نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

”مجھ تو مت بولو نزل تم مجھ سے تو چھپ جاؤ گی لیکن خود سے کیسے چھپاؤ گی اس احساس کو جس سے سذر کرتی

مجھ سے کڑوائی پھرتی ہو۔“

پیشتر آٹھوں میں یکدم چمک سی پڑی اور ان میں ایسی تپش اور درد تھی کہ نزل کو اپنی دھڑکنیں

بے ترتیب سی محسوس ہونے لگیں۔ ”میں جس احساس کے خوف سے چھپ چکی ہوں میں بھی ایسی احساس کی آگہی پر

حیران ہوں پریشان ہوں۔“ احساس جو بھی تو میرے اندر دو غنیاں بھر رہا ہے اور بھی یکدم پیاس کے سیال بدل ان

روشنیوں کو دم کر دیتے ہیں۔“

نزل نے اس کی طرف سے بہت اندازہ نہ کیا کہ اس کی آگہی کے کرب میں جھلا ہوں۔ بتاؤ کیا کروں۔ میں

اس احساس کو کسی سے بھی شری نہیں کر سکتا شاید تم سے بھی نہیں۔“

”جی کبھی ایسا کیل ہو اسے نزل نے جسے جہاں ہوتا ہے وہاں نہیں ہوتا اور جسے نہیں ہوتا وہاں ہوتا۔“

”ہاں کاش یہ جہاں اپنی تقدیر سے بے وقار ہو تے۔“

”وہ ایک گہری اور طویل سانس کے خاموشی ہو گیا نزل کو لگتا ہوا تھا جیسے اندر دھڑکنوں نے اودھ مچا رکھا ہو

دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔“

”وہ جسے ہمارا نہیں ہوتا ہوا اس کے ہونے کے احساس سے ہمارا دل کیل جاتا ہے نزل۔“ اتنی کہتی ہیں ہم

تقدیر سے لڑ نہیں سکتے۔ تقدیر نے ہمارے ساتھ یہ کیا کیا ہے۔ رونا یا اوروں کے ساتھ بھی ایسی بات چیت ہوا

”ہے۔“

اس نے سر جھکا کر بیٹھی نزل کی طرف دیکھا۔

اس کی غصہ کی گھنٹوں سے لگی اس کی اور وہ گھاس کی پتیاں بالکل اسی کے انداز میں کوچ کو پیچ کر دیکھ رہی تھی۔

”یہ احساس بہت خوش کن ہے بہت دلفریب لیکن اس کے ساتھ یہ بہت الٹا بات بھی جیسے خوشی کے دامن

میں گہرا ہاتھ دو جا جائے اپنا پھر خود نہیں کے لباس پر دیکھوں کہ پھول ٹانگ دیے جائیں کیا تم بھی ایسی محسوس

کرتی ہو نزل؟ کیا تم نے جان لیا ہے کہ تم میرے لیے پریشان نہیں؟ اگر کہ نہیں جانتا تو جان لو کی جلدی۔۔۔“

لیکن نہیں میں شاید غلط کہ رہا ہوں ہمسارا گریز بتاتا ہے کہ تم جان چکی ہو۔ تم نے اس احساس کو کیا ہاتھ رہا ہے؟

”میں نے؟“ اس کو کھارک ہوش کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

”ہاں! اتنے شایدا اس احساس کو کوئی نام نہ نہ دیا ہو لیکن میں نے اپنے اندر یہی اہونے والے اس احساس کو محبت

کا نام دیا ہے۔“

وہ بات آجئے شایدا میں سائلوں نہ کہ بتاتا آج بے اختیار ری اس کے کیوں سے نکل گئی تھی۔

”فحشی! اس نے ایک بڑی زبان نظر اس پر ڈالی۔“

”میں اسے نزل میں تمہارے لیے محبت مجھے نہ دیکھتا ہوں۔“

”یہ یہ بیچ نہیں ہے۔“ اس کی آواز گہمی گہمی کی تھی اور اس نے یوں گہرا کر چاروں طرف دیکھا جیسے اس

پاس سب ہی اس کی طرف کان لگا گئے جیسے وہ خلا تک اس وقت لان میں بہت دور آگیا کر کے پیچھے پڑھ رہے

تھے۔

”ہاں نہیں مجھے بے اعلیٰ لیکن میں نے پوری ایمان داری سے تمہیں بتا دیا جو میں نے محسوس کیا۔“

”محبت غلط بیچ نہیں ہوتی اس کا اور اس کا ادا رانہ عا کرنا ہے نزل۔“ میرے دماغ نے بھی مجھے اور اس کے

اور میں نے دماغ کی بات کو سمجھا جسے اور خود کو بھی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن شاید یہ ایسا ہے کہ اس

دینے والا جذبہ ہے کہ کوئی بے بس ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی کوشش کر رہا ہوں۔ تب ہی تو تم سے چھپتا پھر رہا ہوں

اور گہمی۔“ اس نے سر اٹھا کر نزل پر ایک نئی نظر ڈالی۔

”انوار! نہ مانو بھی کوشش کر رہی ہو۔“ اس نے نگاہیں نزل کے چہرے سے ہٹائیں۔ نزل کچھ دیر تو یہی

خاموشی سے اپنی فائل کو کھولتی رہ کر رہی پھر جیسے ہمت کیلے ہوئے۔

”غور! کہی ہے؟“ اس نے پیشتر کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ پیشتر کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ چمکی۔

”شہو! وہ میں اپنے والد محترم کے گھر ہے۔“

”کیوں؟“ نزل نے گہرا کر پوچھا۔ ”کیا پھر لڑائی ہوئی؟“

”دک نہیں ہوئی۔“

پیشتر کے لیے میں تھکن اڑ گئی۔ ابھی نزل کی طرف دیکھتے ہوئے جو جگہ اس کی آنکھوں میں چمکتے تھے مجھ

مجھے

”میں نے تمہیں کہا تھا کہ اس کی باتوں کو انور کر دیا کہ وہ اگر نا سمجھ ہے تو مجھ کو سمجھ رہا ہوتا۔“

”وہی تو کرنا ہوں نزل لیکن میری خاموشی سے وہ عاجز رہنا تھا۔ میری بے معمولی معمولی باتوں پر محرک اٹھتی

ہے اور میرے جانے کے لیے بیک تار کر لیتی ہے۔ ایک جہت سے زیادہ شہو! وہ رہنے کے بعد وہ اسی روز آئی تھی۔

میں خود اس کی خواہش پر اسے چھوڑنے لگا تھا۔ راستے میں اس کی فرمائش پر آنسو کیم میں کھلائی۔ پھر لڑائی کی

اطلاق کے بعد زائگے اس نے ایک بار بھی فون کر کے کہہ دیا افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے ایک لفظ تک

نہیں کہا۔ بہت خوشی ملی ہے بہت گرم جوش ہے اس کو دیکھو کیا لیکن نزل اس نے اتنے ہی ڈنر پر چلے کی

فرمائش کر دی۔ ان حالات میں جب گھر پر افسردہ طاری تھا جس سے اسے گھر نہ چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔“

”گھر پر ساتھ چلنے کی خواہش میوہ تو نہیں ہے شہبی لیکن وہ بے خوف ہے۔“ اس نے موقع محل میں دیکھا

تم نزل سے سمجھا دیتے۔“ نزل نے اسے شخص سے دیکھتے ہیں کہا۔

”ہمسارا کا خیال ہے میں نے اسے سمجھا دیا ہو گا۔“ پیشتر سوالیہ نظر اس کی طرف اٹھیں۔

”لیکن وہ جانتے سمجھتے تو دیکھ کر بھی سچ ہو سکتی ہیں میں نا سنا کر کے کا بج کر گیا تو اپنی جان نے

بتایا کہ شہو! وہ اس کا کوئی خال زاد وہاں لایا تھا اسے لینے کو وہ اس کے ساتھ بھی گئی۔ میں نے کہا نہیں کہ ابھی

ہل ہی ہوئی تو خیریت ہے تاہم توای جان سے کہا کہ میری خالہ آئی ہوئی ہیں کہ راجی سے ان سے ملنے جارہی ہوں۔ لیکن وہ نہیں بھروسہ میں نہ ہوں کیا اور پوچھا کہ کب کہنے کو آؤ گا کہ وہ کہہ کر بھی نہیں مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہتا۔ اگر میرے ساتھ رہتا چاہتے ہو تو الگ گھر میں میری زندگی تمہاری ماں بہنوں کا غر خود بخاری کر کے اپنی زندگی کی خوشیاں خرام نہیں کر سکتی۔ یہی نہیں چاہتے کیا کیا کل کھلا میں کی۔ میں نے فون بند کر دیا اب تباہ زل میں کیا کروں کہاں جاؤں؟ یہی چاہتا ہے کہ تم کروں خود کو۔“

اس نے بے بسی سے اپنی مٹھیاں بند کر لیں اور کھولیں۔ زل کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے کس طرح اسے ریلیکس کرے کہ وہ فون نہ لگتا خود کر لے کر اس کی پیش گوئی کرے۔

”پلیز نہیں۔“ اس نے غیر ارادی طور پر کہا کہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا یہ اس کے ہاتھوں کا لمس تھا۔ یاس کی نگاہوں کا انکار کہ کسی کے ہونے سے ان کے ہاتھوں میں ہونے والے۔ اس کی آنکھوں میں ایک نرم نرم کی کیفیت لکھائی دینے لگی۔ سخت بات چہرے پر نہایت بھری۔

”اے کاش کاش“ دل نے بے اختیار خواہش کی۔

”یہ باتہ جیسے میرے ہاتھوں میں رہے“ میں ہوش اس کی نہایت اور گرمی کو محسوس کر رہا ہوں“ اور یہ نہایت اور گرمی میرے ہاتھ سے ہوتے ہوئے میرے رگد پھیل اتر چائے۔ میرے اندر جو سردی اور دکھ کی برف جمی ہے وہ اس گرمی سے پگھل جائے گی کیا یہ بھر دینا ہے جو جاؤں جیسا کہ تھا۔ صاف شفاف دل الاہیت مسکرا کر زندگی کو انجوائے کرنا میرے کندھوں پر کسی غزال کا بوجھ نہ ہو اور میں اپنے خیالی دل میں اس نگاہ آنکھوں نرم نرم کو ازاد لیا میری لڑکی کو بسا لیں اور پھر چل کر دھڑا دھڑا سے بند کر دوں۔

اس نے اپنا بیباں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ پر رکھے اس کے ہاتھ پر رکھنا اور آنکھیں موند لیں۔ اسے لگا جیسے وہ کسی سر پر بٹھنے اور ہر سکون گشتاں میں صفائی رست پر کسی گھٹنے کے قریب ہو اور سکون آمیز بھونکے بہت ہی سونہری اور اونچی مٹک ہے اس کے بالوں کو منتشر کر رہے ہوں۔ انجینیت سے مست ہے اپنا نیت کی ایک لہر سی اسے اپنے بدن میں اتر رہی ہوئی محسوس ہوئی۔

”زل۔“ اس نے آنکھیں کھول کر زل کو دیکھا جس کی لائی چلیکسی جھکی ہوئی تھیں اور چہرے کا لہلہا گیا پلن اور محدود سی شرمیلی مسکراہٹ تھی کہ وہ کسی ایسا ہی شخص محسوس کر رہی تھی۔

”زل۔“ اس نے پھر کہا کہ اتنا اس نے چونک کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑایا اور محجب سی ہو کر زمین کو دیکھنے لگی۔

”جیسے بہت سارے دن ہو گئے ہیں تم نے پھر فون کیا غزال کو۔“ اس نے ایک ذخی نظر زل پر ڈالا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کے تصور میں کتنا خوب صورت منتظر تھا اور زل نے اس کو محروم کر دیا تھا۔

”ایسا کچھ دیر لو۔“

”نہیں۔“ اس نے ایک گرمی سانس لی۔

”فون کرنے کا مطلب ہے کہ میں نے اس کا مطالبہ کر لیا۔“

”مگر وہ کیا یہ خواہش بہت شدید رکھتی ہیں کہ ان کا اپنا گھر ہو؟ جہاں سرسرا دالوں کا عمل دخل نہ ہو غزال بھی۔“

”تم جانتی ہو زل۔“ میرے اس کی بات کہ نہدی۔

”ہاں جی ہاں۔“ کتنی جی کہ اباجان نے بھی کبھی اس کے معاملات میں دخل نہ دیا۔ اپنی زندگی میں یہ وہ جب تک دل چاہتا ہے سولی سے بیدار چاہتا ہے۔ اس نے اپنے دالوں میں اس کے ایک کپ چائے تک نہیں بٹائی اور اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں ملانے دوں۔ پھر اسے کیا تکلیف ہے۔“

”تو لیں کو خوش ہو تا ہے الگ گھر میں رہنے کا۔“

”تم اس کی کوالیت کرتے۔“ میرے چڑ گیا۔

”جانتا ہوں“ میں نے کہا۔ لیکن ہر خوش اس نے مقروض وقت پر ہی پورا ہو آتا ہے۔ میں ابھی بڑھ رہا ہوں مناسب وقت ہے اس کی خوشی میں پورا ہو جانا نہیں اس وقت ہرگز نہیں اگر وہ صرف اسی شرط پر کہ واپس آنا چاہتی ہے تو میں اسے ساری زندگی گھر میں رکھتا ہوں۔ میں اس کے سبب سے اپنی اصرار کی مل کر لیں گا۔ وہ کل کھلا کر تھا ہو گیا۔

”میں کم کا بیڑہ تو سہو کیا کہ جاؤ گا اور انصاری کا بیڑہ لے لو۔“

”اور کہ۔“ زل بھی کھڑی ہو گئی تھی۔

”میں گھر جا رہا ہوں۔“

”بھئی چلنا مارنا گا۔ کیا اپنی اصرار کی حاجت نہ کر دے؟ فائل اسے ہمارا اتنا بہت سادہ گھر ہے، خود اس عرصہ اپنی بے پایزہ اصرار کے حقیقی حقیقہ ہو جانا۔ تمہارا بیچلا ریکارڈ اتنا چھاپے تو اب بھی تمہاری پوزیشن برقرار رہتی چاہیے۔“

”تمہاری نصیحتیں کرتی ہو کہ تمہاری چاہتا ہے تمہارا نام۔ زل کے بجائے مس نصیحت خامی رکھ دوں۔“

اس نے اپنی بیچلاہٹ کو مسکراہٹ میں بچھایا۔

”میرا نام تم جو بھی رکھ دو۔“ زل نے لیں پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”لیکن ان وقت ضابطہ کرتے کہ تمہارے کھل تمہارا میں نہیں تھے تو انصاری نے تمہاری بڑی تحریف کی وہ کہہ رہے تھے کہ اگر تم سر جری کی طرف گئے تو بہترین سر جرن بنو گے۔“

”اور یہ تو میرا بھی کیا تھا کیا اب کچھ کہ نہیں سکتا۔“

”اشفاق اللہ! تمہارے ارادوں میں ضرور کامیاب ہو گے۔“ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے زل نے دعا کی۔

یار رنگ کی طرف چائے سے پیوہ کر اور اس نے زل کی طرف کھلا۔

”زل۔“ میں بھی بعض سے ایسے ہوتے ہیں جب آدمی کا اختیار اپنے آپ پر سے اٹھ جاتا ہے۔ وہ بہت بے اختیار رہتے ہوتے ہیں۔ ہمیں احساس ہی نہیں ہو تا کہ ہم کیا کر رہے ہیں لیکن وہ بہت بے اختیار ہے۔ بہت کھڑے۔ یہ جی کہ زل کا گرمی کوئی بات بری کی ہو تو سوری۔“

اپنی بات کہ کدھر کا نہیں لکھتی تھی سارا رنگ میں کھڑی اپنی نیل کی طرف بڑھ گیا۔

زل کچھ دیر وہاں ہی کھڑی رہی۔ اسے بھونکی کوئی بات بری نہیں لگی تھی اسے خود بھی تو یوں ہی محسوس ہوا تھا۔ وہ کسی تحریف جھکی ہوئی اور اس کا اور زمانہ اور منظر کا حصہ نہ تھی ہو یا جیسے وہ کسی خواب کے عالم میں تھی اور۔

”نہیں۔“ اس نے ہولے سے سر کو جھکا۔

”جی نہیں مجھے مجھے سے دور رہنا چاہیے۔ وہ تو پہلے ہی اذیت میں ہے اور میری ذات اسے خوشی تو کیا دے گی ہاں اس کی بھولی میں ہمارا کیا کادھ کی ڈال دے گی۔ یا اللہ یہ چندے کیوں ہوا ہے میں دل میں۔“

اس نے پلکوں تک آجائے والے آنسو کو انگلی کی پوس سے چھٹا اور ڈاکٹر انصاری کے روم کی طرف بڑھ گئی۔

”کہاں کی تیار ہی ہے۔“ میڈم سفید بغیر دستک سے ندا کے کمرے میں داخل ہوئیں تو فون پر نیو ٹیکس لگاتی ندا سے ٹاکواری سے اس میں دیکھا۔

”ماما! تم کو دوبارہ ہسپتال سے کر آیا کریں۔“

”میں ان ساس کی خبر کے کمرے میں تھی ہوں اور پھر اس وقت تمہارے ساتھ کون تھا جھکا کہ میں دستک دیتی۔“

”بہتر ہے۔“

”تمہارے تھیں کہ تم کہاں جارہی ہو۔“ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

ایک چھکا بچہ لکھتا ہوا ایک اپ، ہلکے گرس رنگ کا چارٹ کا سوٹ جس کے گلے اور بازوؤں پر بیہون کٹ رہے اور موتوں کا کام تھا۔ وہ بے حد دلکش، بلکہ حسین لک رہی تھی۔ میڈم سفینہ نے اپنی بہن بیٹی کی ماں ہونے پر دل ہی دل میں بعد خود فرح ہو گیا۔ یہ بھی سوئے بارگرم ہے ورنہ زینہ کی چھوٹی بہن تھی حسین بھی وہ اس کے مقابلے میں بد خود فرح ہو گیا۔ اور زینہ کی بیٹی بھدی کی گلابی سی۔

آج اگر زینہ زندہ ہوتی تو وہ اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی۔ وہ دھڑک رہا آئے ہوئے اسے مشنری کے پاس ہی پھونو آئی تھیں۔ ورنہ زرا خوج ہی کروائی۔ وہ زینہ کی طرح خوب صورت تھیں۔ لیکن وہ تو بہت بچھا تھا بہت خوب صورت آنکھوں والا۔ دھڑکی آنکھیں بالکل اسی پر تھیں گہری سیاہ جن کی گرائیوں میں ڈوب جاتے کوئل چاہے۔

”علینہ! طرف جاری ہوں۔“ ندائے ڈورنگ ٹیبل پر نکل پاش رکھ کر نشو کے ڈبے سے نشو نکالا۔

”علینہ! میڈم سفینہ نے برا سامنے بتایا۔“

”فح کرنا اسے بھی یہ کانچ پور دوش کی تکیہ سی بھلی تھیں! آپ کی ساری عراس کے پیچھے باقی رہیں۔ پول کو اس کی طرف پھر کھینچ لی جاتا آج شام شادی کے ساتھ کارا لو۔“

”ایسا شاہ زب کا فون کیا تھا۔“

”بہن! کافی دنوں سے نہیں آیا تو جانم تیری کر لو اسے فون۔ ایسا بندہ ہو سنے کی کان ہوا اسے کتنا ہے۔ میں نے کہیں سمجھا تھا کہ تمہیں بند کر لو گرفت اپنی مضبوط دھوکو کے نکل ہی نہ سکے۔ تمہارے ہمارے مٹی سے تم نے اپنا کھلی ہی ہوئی۔ دل کی پوری میڈم سفینہ کی طرف کھوکھ کر۔“

”تم نے کہا تھا کہ شاہ زب سے کسی طرح کھٹن پر ایک بچہ حاصل کر لو۔ وہ بچہ مل گیا۔ بھورن کا ابا رنٹ وہاں قیام کے دنوں میں اس نے میرے نام کر دیا اس کے علاوہ سیکڑوں قیمتی گنٹ! بیوری دیکھو میرے چکا ہے۔“

اب اور کیا چاہے؟

”اے! ابھی کچھ بھی نہیں دیا تمہیں اس نے۔ سیکڑوں ایکڑ اراضی کا مالک ہے۔ زمین جائیداد بڑی اس تمہیں تو وہ میری بھی نہیں دیا اس نے۔“

”مہمان نے مجھ سے کہا تھا کہ بس شاہ زب سے کسی طرح کھٹن والا بچہ اپنے نام کر دو اور اس کے لیے میں اس کے ساتھ چند ہتھ بھر بھورن میں ہی۔ صرف اور صرف تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے۔ تم نے کہا تھا اس کے بعد بے شک تم شاہ زب سے ملنا۔“

”کہا تھا! کہا تھا جانو! شاہ زب خود تیار ہوا نہ ہو کیا تھا۔ میں نے تو کتنی دفعہ اٹھا اسے پر وہ فون پر فون کیے جاتا اور پکڑ پکڑا، قہا میں تو سمجھی تھی تو خود بھی اس کے پکڑ میں پڑتی ہے اور اسی لیے میں نے سیدھ صاحب کو کتنی بار نکالا ورنہ وہ عمر سے سے میرے پیچھے پڑے تھے میں ہی ٹال دیتی تھی کہ بڑھ رہی ہے۔ بڑھ چکی تو یہ شاہ زب آگیا۔ میں نے سوچا ہوتا مڑا ہے تیار اور پھر نہ لگا۔ پھر دولت جانو کی بھی کی میں تیری بیٹی شادی کر کے گھر بسائے کی حسرت پوری ہو جائے گی۔ جب تک اس کا دل میرے کا تھا ہے تب تک تیرے پاس اپنی دولت اس کے گھر میری فکر نہیں رہے گی۔“

”دولت تو اب بھی تمہارے پاس اپنی ہے کہ ساری عمر تیرے کھلواؤ تو کم ہو۔“

”اے! پھونو جا تم کہاں ہے اپنی دولت ذرا فون اٹھاؤ اور شاہ زب کو فون کر دو اگر لاگت سے بات کرنا دیکھنا کیسے مجھ کے سامنے ہے۔ تم نے آج اس کے سرکار طے۔“

”لیکن ام میں تمہیں بات چکی ہوں کہ میں علینہ کی طرف جاری ہوں۔“ وہ صغیر پھر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔

”آج تم نہ جاؤ علینہ کی طرف تو کون سی قیامت آجائے گی۔“

میڈم سفینہ کی پیشانی پر نکلیں نمودار ہوئیں۔ ”اور اگر میں شاہ زب کو آج وقت نہ دوں تو کون سی قیامت آجائے گی! کیا ڈراک تو بھی میری بھتیجی ہوتی جاتی ہے۔ جانو میں نے کل پر جس بیوری پر ایک بہت خوب صورت ڈائمنڈ کاسٹ رکھا ہے۔ تیرے گلے میں تو ایسے بچے کا گہرا کوئل وہ تو مجھے تیرے لیے ہی بنایا گیا ہے۔“

”اوپر ہی نہ بھٹک رہی ہے۔“

”لیکن! پر ام! آپ کہتا ہوں اب ان کوئل میں تل نہیں ہے۔“

”اے! بہت سے تل ہے میری جان! میں سمجھے تھا کہ انہیں آج تیری مت تو دھانی نے ماری ہے! اچھی خاصی تھی تو میں بھی زینہ کی باتوں میں آئی کہ ان کل پر دھانی کی قدر ہے۔ پڑھ لکھ کرو دھاری ہو جائے گی پر مجھے تو لگا ہے تو اور بھی کند ہو گئی ہے۔“

”ماں! کل دھار فون۔“ ”ہاں! بے پائے اسٹائل میں بولی۔ ورنہ اگرچی آنے کے بعد تو وہ مایام تھیں۔“

”میری جان! میڈم سفینہ نے اٹھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کارڈ میں فون اٹھا کر اسے دیا۔“

”تھوڑا لمبہ۔“

”ہلو شاہ زب! کیسے ہیں آپ؟“ ”میں یہ میڈم سفینہ کی شکل مٹی تھی۔“

”میں کتنا اس کر رہی ہوں آپ کو! آج تھوڑے ہو گئے! لگاتے آپ مجھے تو بھول ہی گئے۔“

”اے! میں نے تو انڈیا کوئی کھولنے والا بیڑہ ہوں۔“ ”دوسری طرف سے شاہ زب نے کہا تھا۔“

”ان دنوں یا آفس میں کیا ہے اس کی مصروفیت ہے جیسے ہی فافس ہوا آؤں گا۔“

”آفس کی مصروفیت ہے یا کسی کیریئر میں سنا ہے۔ بری خوب صورت لڑی رہی ہے تم نے۔“

”اے! کہیں۔“ ”معلومات کہاں سے میں۔“

”عبت کرتے ہیں جناب آپ سے اس لیے آپ کے حعلق باخبر بھی رہتے ہیں۔“ میڈم سفینہ نے ستا سنا

سے پوچھا۔

”اے! میں فیئر ڈو تو حالات کی ستائی ہوئی لوکی ہے، کسی بے حد شریف گھرانے کی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“

”نہا کے قلع میں دور تک کراوٹ کھل گئی۔“

”شرف گھرانہ۔“

”نہا راض ہو گئی ہو ڈیڑھ۔“ اس کی خاموشی پر شاہ زب نے کہا۔

”لیکن میری جان! تمہاری باتا سنی ہم اور تو نہیں کر سکتے۔ میرے مل حاضر ہوں گے لیکن ابھی مصروف ہوں چلو ذرا اٹھا کر اس کے اب تو تیار اسکی تیس۔“

”میں۔“

”تو تیار رہنا۔“ ”اے! کہ نہ کرنا اسے فون بند کر دیا۔“

”کہا کہا صاحب کے۔“ میڈم سفینہ نے بے چینی سے پوچھا۔

”بہن! بے چینی کے۔“

”جی۔“ میڈم سفینہ کی آنکھیں جھپکے لگیں۔

”اس ڈائمنڈ کی بات میں ضرور کرنا جانو۔ لیکن یہ کیا تم نے روکا سا اوکے کہ کرو فون بند کر دیا۔ او! میں نہیں آئیں تھی۔ ذرا ابھی تو خڑ نہیں کرتی۔ سوچتی ہوں کہ فون کے لیے مجھے مشنری کے پاس پھونو آؤں۔ کیا ناز و انداز آئے تھے اسے کہ بند ایک بار اس کے شکے میں آجنا تو پھر نہ بھی نہیں دیتی گی۔“

”شاہ زب! تو بات کو آگے گا نہیں جاؤں کھٹن تو نہ کھٹے گی جانو! کی۔“

”اس علینہ کی بیٹی نے مجھے ایک گھول کر دیا ہے کہ تو آج اس کی طرف باخبر رہتی ہے۔“





اور نہ کہ دل میں امید کی ایک کرن بھی نہ تھی۔ سفینہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں اور گریڈ میڈم نے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ خضر کو کچھ لے گی تو پھر وہ اس کے قدموں پر جھکا کر ہی دم لے گی۔

”مہم تیرا چاہو کر سکتی ہو۔“  
وہ سکرانی اور پرے سے تیار ہوئے گئے۔ خضر کی محبت بٹانے کے لیے اس نے علینہ سے تعلق برحیاب تھا اور اب یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد بھی یہی تعلق نہیں ٹوٹا تھا۔ بلکہ اب وہ پینل کی نسبت اس سے زیادہ قریب ہو گئی تھی اور اس کی ایک جد عارف بھی تھا۔ عارف لاہور کے زمانے میں بھی ان کے یہاں آیا کرتا تھا۔  
گریڈ میڈم سفینہ کے ساتھ اس کی واقفیت تھی ہی تھی۔ وہ ایک دولت مند گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے والد کی کڑے کی دولت تھی اور ان کا بیٹا ہوا سوئی کڑا کچر ممالک میں بھی بھیجا کرتا تھا۔ لاہور میں جب وہ گھر والی کو بھی کس شفت ہوئے تھے تب نہ ان کی عروس سال کی اور عارف بارہ تو سال کا ہو گا۔ ان کی کوئی گریڈ میڈم سفینہ کی کوئی بھی کے ساتھ ہی تھی۔ گریڈ میڈم نے اس پر دس میں بھی بتایا تھا کہ ان کے میاں اکثر ہی جنگ میں جھاکا میں شہید ہو گئے تھے۔ اس بھوت کی وجہ سے ملے والے ان کی عزت کرتے تھے۔ عارف اکثر ان کے گھر آتا تھا۔ گوان کے گھر میں کوئی لڑکیاں نہیں تھا لیکن وہ نہ اس کے ساتھ ہی کھلتا رہتا تھا۔ پھر اس کے بیڑا کرنے کے بعد گریڈ میڈم نے ان کی ایک سی کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”یہاں بہت مدد ہے ان دنوں پھر بہت دھڑکا رہا ہے۔ کوئی بچکان نہ لے۔“  
پھر کچھ دیر اور وہ لاہور جانا ہوا تھا لیکن یونیورسٹی میں فاسل ایکسچارج سے بہت دن پہلے ایک ہی ایک دن وہ اسے مل گیا تھا۔ دو کسٹ خونی ہوئی تھی۔ اس نے علینہ سے بھی اس کے تعارف کر کے کہہ کر دیا تھا۔ وہ کسی بار اس کے گھر بھی آچکا تھا لیکن اس پر ان کی حقیقت ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں کراچی میں جا رہا تھا۔ گریڈ میڈم سفینہ کی دل چسپی بڑی تھی لیکن علینہ سے منع کر دیا۔

”ہاں عارف بچکان سے ہی مجھے بھائیوں کی طرح لگتا ہے۔ پلیر آپ اسے کسی اور اور پر مت لگائیے گا۔“  
لیکن اس نے خواہ اس علینہ کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور اپنی بے تکلف فطرت کی وجہ سے وہ بہت جلد علینہ سے فری ہو گیا تھا اور شاید وہ اسے بہت دیر ہی کہنے لگا تھا۔ اس نے وہ سنی چلتے اس کی نظریں اور وہ اسے سمجھے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے کوششیں کرتی رہتی تھیں۔ اس کے ذہن میں ابھی کچھ واضح نہیں تھا لیکن دوسرے کسی کوشش میں ہی احساس تھا کہ شاید اس سے اسے کچھ فائدہ حاصل ہو اور وہ علینہ کے ذریعے خضر کے قریب ہو جائے۔ کبھی بھی اس کے ذہن میں خیال آتا تھا کہ وہ علینہ کو عارف کے قریب لے آئے علینہ کے لیے اس سے پھر بڑا نا مین ہو جائے اور پھر وہ عارف کے بدلے علینہ سے خضر کو مانگ لے۔ وہ جانتی تھی کہ خضر کی جتنی ہو چکی ہے۔ وہ ماہور ہے۔ کبھی ایک بار بھی چلی تھی۔ ماہور کچھ نہیں لیا تھا کہ نگاہیں ایک بار اس کی طرف اٹھتی تھیں تو پھر کچھ دیر کے لیے ٹھکانا بھولی جاتی تھیں۔ ماہور کو وہ بے خضر کے دل میں کیسے اترے وہ سوچتی رہتی تھی اور علینہ سے عارف کی بے قراریاں دیکھتا چڑھا کر بیان کرتی رہتی تھی اور علینہ کی آنکھوں میں پختے ترغیوں اور گالوں پر کھلنے والوں کو دیکھتی رہتی۔

عارف ایک پیڑ پر لڑکا تھا اور اسے بائیں کمرے لے آتا تھا۔ پچھلے دریا میں کہ تا اور خطاب کہل بھر میں اس پر کھلتا تھا اور علینہ کو بھی جیتوں کی شہنائی۔  
جیتوں میں شہنشاہ اسے بہت بھائی تھیں اور عارف کی محبت میں پھر وہ دیاؤں کی ہی شدت تھی جب کہ اس کی محبت میں سبک دینے کا بارگاہ میں تھا اور اس سے بھی بے سے زاہد کو وہ عارف کی طرف سے کہہ سکتی تھی وہی جا رہی تھی اور ان کی انداز اپنی ہی تھیں۔ اس لیے اسے کیا کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔  
عارف نے وہ تاب کھل کر علینہ سے اظہار محبت کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ان کی علینہ کے ساتھ اس کے گھر چلی جاتی تھی۔ وہ یہاں آگیا رہتا تھا ایک ٹیلیٹ میں اور ایک امریکن فرم میں جا رہا تھا۔ وہ تین سال چار سال تک

میں رہ کر آیا تھا اور اب یہاں کے آفس میں کام کر رہا تھا۔ لیکن وہ کسی بھی وقت اگر چاہتا تو دوبارہ دنیا راک آفس میں اپنا تھلا کر لیتا۔  
”راول میں علینہ کی وجہ سے یہاں رہ گیا ہوں۔ یہ لڑکی میرے دل و دماغ پر سوار ہو گئی ہے۔ اسے حاصل کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔“ اس نے لڑکی کا ہاتھ لے لیا۔  
”گروہ خیلز اور عارف کی شادی کراچی میں ہی ہے۔ تو اس سے اسے کیا فائدہ ہو گا؟“  
ساڑھی کا پلنگہ دھیرے دھیرے ہٹاتے ہوئے اس نے تنقیدی نظروں سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔  
”کم از کم شادی کے زمانے تک بچان تو عارف کی کزن ہونے کے ناتے خضر سے اس کا واسطہ رہے گا اور پھر مہمان بھی تو ہیں۔ ماہور ضرور لڑکی کو رتبہ سوچیں گی۔“  
ایک دلکش مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔

”گریڈ میڈم یہ ہیں کہ آپ کرا تیار ہو گئی ہوں تو پھر بھی آجائیں۔“ ملازم لڑکی نے آکر کہا تو اس نے پوچھا۔  
”کیا شاہ زبیب شاہ آگئے۔“  
”ہاں بی ابھی آئے ہیں۔“

”چھو چھو میں آئی ہوں۔“ اس نے کٹکٹ لپٹس آنکھوں میں لگائے وہ جب بھی کسی کے ساتھ جاہر جاتی تھی تو دس ضرور لگاتی تھی۔ لیکن جاتی تھی کہ خضر یا علینہ سے کوئی اسے کسی اور کے ساتھ دیکھ کر بیان لے اور اس لیے اس نے ماہور کا تعارف ایک کزن کی حیثیت سے کر لیا تھا۔ شاہ زبیب کے علاوہ سب سے ماہور کے نام سے ہی جانتے تھے۔ اس نے جانے سے پہلے ایک تنقیدی نظر آئینے میں خود پر ڈالی، بھلے بھلے کے وہ اس سرخ ساڑھی میں واقعی قیامت ڈھاری تھی۔

کھڑے سے پلو کوڑھلکا دی وہ بڑی اداؤں سے لاؤنج کی بیڑھیاں اندر ہی تھی۔ لاؤنج میں کارنر والے صوفے پر گریڈ میڈم سفینہ کے ساتھ بیٹھے شاہ زبیب نے ایک انچھی سی نظریں پر ڈالی اور پھر گریڈ میڈم سفینہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
”تھو بھر کے لیے وہ دوسرے ٹھکانے کر کر گئی۔ شاہ زبیب کی نظروں میں نہ پہلے والی وارننگ کی نہ اشتیاق۔ ورنہ تو وہ اس کے بیڑھوں پر کودا رہتے ہی کودا ہو جاتا تھا۔“

اور اس کی آنکھیں اندر سے جلیوں کی چشم سے کودنے لگی تھیں۔ تو کیا مہم سچ کہی ہیں کہ شاہ زبیب اس کی مہم سے نکل گیا کیا بارانی کی اظہار درست ہے کہ شاہ زبیب اپنی بی بی بیکری کی بھول میں اور مہم سے بہر مٹا ہے۔

”اب اس کو بھی روکنا پڑے گا کیا پھر یہ وہ۔“ گریڈ میڈم سفینہ نے اسے بیڑھوں پر غصہ دیکھا تو مسکرائیں۔  
”رے شاہ زبیب! کیل کھڑی ہو تو شاہ زبیب صاحب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“  
اس نے گریڈ میڈم سفینہ پر ایک نظریں ڈالی اور اپنی جواب دہی کے ہونے کے بیڑھیاں اترنے لگی۔  
”شکر! اس سے بہتر جواب تو ان کی کا۔“ بیکلے سے خضر نے بھی کچھ اظہار اس کے سامنے پیش کیا۔  
”ہاں ابھی تک تمہارا اصلی ہے۔“ شاہ زبیب اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”کیا ناراض ہیں ہو نا چاہیے مجھے۔“  
”خضر! حضور! ناراضگی تمہارا حق ہے۔“

شاہ زبیب کی نظریں کچھ دیر کو اس کے حسین سراپے میں الجھ گئیں اندر ہی اندر بے حد طمانیت محسوس کرتے ہوئے اس نے شہر بھر کی نظروں سے دیکھا۔  
”کسی قابل نظروں سے تو مت دیکھو، بہر تو پہلے ہی کھال ہو چکے ہیں۔“ گریڈ میڈم سفینہ طمانیت سے مسکراتے ہوئے تھیں۔

”تمہاں کس میں چاہے عورتی ہوں۔“



428

کچھ دیر کا خاموشی کے بعد شاہ خاں نے ایک گرمی سانس لی۔  
 ”داوی تمھیک کتنی ہیں ماں۔ زورا سے یہ وقت میں کام آئے۔“  
 نصیر احمد خان کی بیماری میں طبع نے کافی زور لیا تھا اور اب جو بھی پچا کچھ تھا وہی آسرا تھا۔ نصیر احمد خان  
 جیسے ان کی گفتگو سے بے نیاز سر جھانکے بیٹھے تھے۔  
 ”اور یا اگر آپ نے قاعدی کے دولائی نہ کھائی تو پھر کی ہو جائے گی۔“ دوز روئی ہنس۔  
 ”تمھک ہے نا۔“

نصیر احمد خان نے ایک نظر اس پر ڈالی تب ہی ہولے سے کھڑکاتے ہوئے سرمراد اندر داخل ہوئیں۔ اور  
 سب کو سلام کر کے دائوری کی طرف بھاگا۔  
 ”ہا تم نے اجازت لے لی۔ پھر تمہیں واپس بھی تو جوڑنا ہے دیر ہو جائے گی۔“  
 ”کمال جانا ہے۔“ سہلی خانم نے بے پوچھا۔  
 ”داوی جان میری ایک فریضہ ہے۔ میں اپنے کام میں جھلپ لے لے کسی لڑکی اور کسی ضرورت تھی بس انہیں

کسیاں جا رہے ہیں۔“  
 ”تمھانہ روک دینے لڑکی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔“ سرمراد کے ہونٹوں پر دم مسمیٰ مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی  
 انہیں داوی کی احتیاط پسندی اچھی لگی۔ شاہ نواز سے دوستی کا قائل بننے اتنا عرصہ ہو گیا تھا اور سال بھر سے دولہا اس  
 کے کمر میں آ رہی تھیں۔ لیکن۔۔۔  
 ”دوسرا سال اعتبار کسی کس پر کیا جا سکتا ہے ہر مذہب ہر فرقہ ہر مذہب۔ کون جانتا ہے اس عقاب

کے پیچھے کیا ہے۔ ان کی نگاہوں کے سامنے میڈم سفید کا چہرہ اور کون جانتا ہے کہ اتنی چٹھی منتھن کرنے والی  
 میڈم سفید کا اصل رول کتنا غلط ہے۔ ان کے اندر دو رنگ کچھ جھیل گئی، لیکن اظہار مسکراتے ہوئے انہوں  
 نے داوی سے کہا۔  
 ”دعا مانجی گا داوی جان کام نہ ہو جائے۔“

اور اب تا نہیں داوی جان نے دعا کی یا قدرت کو کہ دور ترس آئی تھا کہ نہ صرف بیگم شہناز اب گھر مل  
 گئیں بلکہ انہوں نے فوری کی نوید بھی دی جب سرمراد نے بیگم شہناز سے ہالواز کا تعارف کروایا اور کہا  
 کہ آپ نے ایک روز لڑکی اور کسے لیے ایک قادیانہ اور میری عزیز ہے اسے جاب کی تلاش تھی تو میں نے سوچا  
 آپ کس اس کے آؤں۔“  
 ”وہ تو تمھک ہے سرمراد لیکن آپ کچھ لٹ ہو گئی ہیں۔ میں نے ہفتہ بھر پہلے ہی ایک لڑکی رکھ لی ہے۔ اچھی

منفعلی لڑکی ہے۔“  
 اور اس وقت شاہ نواز کی آنکھوں میں ماوسی کے جو رنگ اچھا دکھائی آتے تھے اور امید کی لودیا چمک رہی تھی۔  
 کیا تھا کہ بیگم شہناز نے بھی چونک کر اس کے پیچھے پڑنے چہرے کو دیکھا اور سوچا شاید بہت ضرورت مند ہے۔  
 اور اچھا کہ انہیں یاد آ گیا کہ چند دن پہلے ان کے میاں نے ذکر کیا تھا کہ ان کے ایک دوست کو اپنے آئین کے  
 لیے ایک کیکری چاہیے۔  
 ”سرمراد ایک اور دوستی ہے تو سہی لیکن شاہ نواز آئین جاب کر لیں گی۔“

”میں ہی کر لوں گی۔“ شاہ نواز کا چہرہ نکلا تھا۔  
 ”آئین میں بیکری کی جاب ہے کوئی تجربہ ہے؟“  
 ”نہیں تجربہ نہیں۔“ شاہ نواز کی بے حد خوب صورت آنکھوں میں امید و اُمیدی کے رنگ گہرے ہو رہے  
 تھے۔ ”کچھ نہیں۔“

”کی باتیں سی۔“ شاہ نواز نے خشک لبوں پر زبان بھیری۔

”تمھک بول رہی ہیں۔“  
 ”ہمت! کچھ طرح سے بہت مت افسرانہ ہے۔“ سرمراد نے جواب دیا۔  
 ”وہ کسے شاہ نواز سے تو چھٹی ہوں۔“ بیگم شہناز ادا تھ کر بیڈ روم میں چلی گئیں۔  
 ”ہا کیا تم بیکری کی جاب کر لو گی۔“ سرمراد نے ان کے جانے کے بعد پوچھا۔  
 ”کر لوں گی سرمراد۔“

”بہت مضبوط ہو نا بڑے گاموں کے ساتھ جاب کرنا اتنا آسان نہیں ہو گا تمہارے لیے۔ ہم کہیں اور  
 کو پیش کرتے ہیں۔ یہاں دیش میں ایک پرائیویٹ ایکٹیویٹس کمپنی ہے کل ہی میں نے کڑے سے سونے کھادیاں بنا  
 کرتے ہیں شاید یہی نیچی ضرورت ہو انہیں۔“  
 ”ہاں مشکل تو ہو گا لیکن نا ممکن نہیں آخر آئی ساری خاتونیں کمپنوں میں کام کرتی ہیں۔“ اس نے اٹھ کھڑی

کہا۔  
 ”چلو دیکھتے ہیں اگر کوئی مسئلہ ہو تو فوراً“ جاب چھوڑ دیتا۔ کوئی ایک میٹنگ وغیرہ کرنا اور کبھی آئین میں  
 ایکے مت رہنا۔ وقت پر کام کرنا۔ عورت مضبوط ہو تو پھر کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن بد قسمتی سے  
 عورت بہت کمزور ہوتی ہے اور کبھی کبھی یہ کمزوری اسے کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ ”دل کے اندر روئی ایک بھری  
 اٹھی تھی اور پورے وجود میں جھیل چکی تھی۔“  
 ”آپ صبح جی ہیں سرمراد اور کبھی ذرا بھی محسوس ہوا کہ میں کمزور پڑنے لگی ہوں تو میں جاب چھوڑوں

گی۔“  
 ”جی نہیں، سہلی کی طرح اسے صحت کرتی ہوئی سرمراد اسے سستی اپنی اپنی لگ رہی تھیں۔  
 ”دعا متے اچھے لوگوں سے بھری ہوئی ہے پھر تا میں دنیا میں اٹھتے دکھ نہیں ہیں۔“  
 سرمراد کی باتیں غور سے سنتے ہوئے اس نے سوچا تب ہی بیگم شہناز مسکراتی ہوئی بیڈ روم سے برآمد

ہوئیں۔  
 ”آپ کا کام ہو گا سرمراد شاہ نواز نے ابھی فون پر بات کر لی ہے شاہ صاحب سے، ”میں شاہ نواز کے آئین پہلی  
 جائیں۔ یہاں کا وزٹنگ کارڈ۔“  
 انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اور شاہ نواز کی طرف بھاگیا۔

”کچھ کچھ شاہ صاحب کو چند سال ہی ہوئے ہیں کراچی آئے ہوئے۔ پہلے تو اپنے بارنر کے ساتھ ہی کام کر  
 رہے تھے۔ آج کل انہوں نے اپنا ایک الگ آئین بھی بنایا ہے۔ آئیے پورٹ اسٹورٹ کا کام شروع کیا ہے۔ بڑا دل  
 کوئی۔۔۔ میں بھی آئی تھی۔“ تو شاہ نواز جانی ہے۔ آئین سے پورے آئین سے پورے پورے ہیں۔  
 اٹھال دس ہزار تنخواہ ہوئی اور جب تک سب کا انڈر ڈاک کی سہولت نہ ہوئی تو بیس الاؤنس بھی ملے گا۔“  
 ”شہری بیگم شہناز ان۔۔۔ شاہ نواز کی گفتگو میں ممنونیت تھی۔

”شہر کے یہ کیا بات ہے انہیں ضرورت تھی۔ لیکن یہ بار۔۔۔“ انہوں نے اس کی چادری کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”میرے خیال میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ سب کے شاہ نواز کے لیے میں احمق تھا۔  
 ”میں نہیں سمجھتی کہ میرا چادر اور دھنا میرے کام میں بگاڑ دے گا۔“

”تمھک ہے جی تم آئین جانا جو بھی بات ہوئی شاہ صاحب سے سرمراد کو بتا دے تو سہی تمہاے گھر ہو میں  
 ایک بار پھر شاہ نواز سے کہہ دوں گی کہ ہر صورت تمہیں ہی جاب ملنا چاہیے۔ سرمراد نے پہلی بار مجھ سے کوئی کام  
 کہا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر شہر کے آدیا۔ اور سرمراد کے ساتھ باہر نکلے تو اسے اس نے وزٹنگ کارڈ پر نظر  
 ڈالا۔  
 ”شاہ نواز سب کی شاہ۔“ سرمراد نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لے کر اٹھ کر لیں پڑھا۔  
 ”تمہارے گھر سے تو خاصا دور ہے آئیں۔“ میں صبح چھٹی کر لوں گی اور تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔ تم میرا انتظار



”کیا بات ناراض یا رعبنا لیکن یا میرا تصور دوتاؤ۔“

”میں سب کھیل ناراض ہوں گی۔“ اس نے گاہیں جھکا لیں۔

”مجھ پر سب کیا ہے تمہارا یہ انداز یہ دیکھو تو جانتا علیحدہ تاکہ میں وضاحت کر سکوں بخدا میں اپنے تصور سے قطعی لاعلم ہوں۔ تم میرے خون میں شیش، خود بھی نہیں کرتی ہو کیوں۔“ وہ سر ہٹا کے ناخن کرید رہی۔

”وہ تو خود اسلحہ بن گئے۔“ اس نے یوں سراپا دیا کہ وہ کران کی طرف دیکھا کہ

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی اور سر کرائے۔

”ڈیوٹ ناموں جان امریکہ سے آجائیں تو ای ان سے بات کرنے آئیں گی کراچی امریکہ میں ای کی بات ہوئی ہے ان سے۔“

”کیا کیا بات ہوئی ہے۔۔۔۔۔“ برٹن لنگ رہی تھی۔

”یہی کہ وہ تک آ رہے ہیں واپس اپنی جان سے۔ کوئی بات کرنے آتا ہے۔“

”پات تو نہیں کی بات۔“ وہ اسٹرو کھڑی رہی تھی۔

”پیران کو منع کر دوں گے میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ اس نے یکدم جیسے بھلا اُتار دیا تھا ان کے دل میں۔

”میں۔۔۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”آپ سو رہی اسٹرو۔ میں نے غلط سمجھا تھا کہ میں آپ کو۔۔۔“

”تو صبح کیا ہے وہ بھجھا دیتے۔“ اسٹرو کا بوجھ تھا۔

”فراصل وہ عاقل ہے تا میری فریڈ کاگز، وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ میں اس کے ساتھ زیادہ خوش رہوں گی۔ آپ کے اور میرے مزاج میں بہت فرق ہے۔“

”اور یہ بات آپ کو کیلئے معلوم نہیں تھی علیحدہ۔ جب آپ میری طرف پیش قدمی کر رہی تھیں۔ جب آپ میرے دل میں اپنی محبت کا بیج بوری تھیں اب جب کہ وہ تیار درخت بن چکا ہے تو آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں سواؤ۔“ وہ سخی سے ہنسنے لگی۔

”میرا دل کھلوتا تھا جس سے آپ کھینچ رہی ہیں اور جس پر میرا کھلونا پڑ کر لیا اور جس سے جی بھر جائے گا۔ علیحدہ افضال حیرتوں سے آپ کو کتنا غلط سمجھا تھا۔ آپ تو سچی تھیں۔ آپ میرے بغیر مجھ میں کی بات تو۔۔۔ خیر ظہرت کرنا شاید آپ کی بالی ہے میں ہی باتاؤں تھا۔ جان کلا۔“ وہ کھڑے ہو گئے تو علیحدہ نے ایک آنکھ کی نظر اٹھائی تھی۔

”میں غلط نہیں ہوں لیکن جب میں آپ سے محبت کرتی تھی تو مجھے ایسا ہی لگتا تھا۔ جس میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں آپ کے بغیر ناقابل اور ادھوری ہیں لیکن اب جب مجھے عاقل ملا تو میں نے جانا کہ آپ میری منزل نہیں تھے میں تو آپ کو جیسے بھاگ رہی تھی۔ میری منزل تو عاقل ہے۔ پیلا کے آئے ہی عاقل کے والدین آئیں گے ماما کو بھی وہ پتہ ہے۔“

”بہت خوب۔“ اس کی صاف کوئی پرانی نہیں تھی لیکن مزید وہ نہیں رکے تھے اور ایک اٹھا کر ہونٹ میں چلے آئے جس کا مہرے گئے تھے وہ اب ان کے بس کا نہیں رہا تھا اور تب سے اب تک وہ یہی سوچے جارہے تھے کہ علیحدہ نے ان کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ ان کے منہ یوں میں تو کھوٹ نہیں تھا انہوں نے تو پورے غلوں کے ساتھ اس کی رفاقت کی تھی۔ اس کے تنگ زندگی گزارنے کے خواب تھے۔

”میں نے اپنی جان اور روح سب اس کے نام کر دی ہے تھے علیحدہ نے مجھے یہ کس جرم کی سزا دی کیا محبت کوئی کھیل ہے خدائی ہے یا جہنم کا کھیل۔“

انہیں لگا جیسے کوئی تیز دھار آلے سے ان کے دل کو کھوے کھوے کر رہا ہو۔ کراچی میں وہ دن کیسے گزرتے تھے انہیں پتہ نہ تھا۔ وہ تو وہ دنوں میں ہونے کے کمرے میں بڑے خار سے جھکے رہے اپنے اس خون کر کے انہوں نے اپنی بیماری کی اطلاع دے دی تھی جس پر اس نے کسی اور کو بھیج دیا تھا۔

یہ وہ دن تھے ان وقت تک تھے۔ کیا کہ بات تھیں ان وقت بھی خودی وہ جان کو چیر رہی تھی کھوے کھوے کر رہی تھی۔ ہونٹ کے فیچر سے برائی ملاقات تھی جب وہ اہل جان کیسپاس کراچی رہتے تھے تب سے وہی ڈاکٹر کولیا تھا وہی ضرورت تھیں کہ اور کر سکا تو تیل میں منور سے بھی لگنے کی کوشش کریں گے لیکن سب کچھ ہی کڑوا ہوا گیا تھا۔ وہ یوں واپس چلے آئے تھے۔ علیحدہ نے ان کے جذبات سے کھلوا ڈیا تھا۔ انہیں بے وقوف بنایا تھا یہ احساس ان کا ذاتیت تک تھا کہ وہ رے دل میں نہیں لہسے اٹھتی تھیں۔

”یا اللہ میری اس ذات کو کم کرے۔“ انہوں نے بے بسی سے دعا کی تھی جب رمضان نے روزہ ناک کیا۔

”آجائو۔“ انہوں نے خود کو پکڑ کر لے کر کوشش کی۔

”اسٹیج بھائی یہ آپ کو میاں صاحب اور بیکہ صاحب بلا رہی ہیں۔ میاں صاحب کے کمرے میں ہیں سب۔“

”چھا۔“ وہ ایک گھر سراسر لے کر اٹھے ہاتھوں کو انہوں کی انگلیوں سے سنوارا۔ کچھ دیر کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر کیلے بے سانس لیے اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پھر وہ بولے چلے گئے وہ نے میاں صاحب الدین کے کمرے کیسپاس آ کر کے۔

روزانہ کھانا ہوا تھا۔ سامنے ہی مشرف بیٹھا تھا اور اس کیسپاس عذرا انجم تھیں کیلے سے نیک لگائے میاں صاحب الدین بیدار ہوا تھا۔ صبح تھوڑا تھوڑا صبحہ سلام کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔

”خیر تیرے؟“

”جیسے کے بعد انہوں نے عذرا انجم کی طرف دیکھا تو وہ میاں صاحب الدین کی طرف دیکھنے لگیں تو وہ کھار کر بولے۔“

”خیر ہے میاں۔“ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ مشرفانی بیوی کے ساتھ الگ ہو جائیں گی اہل میں نے اقبال ٹاؤن والے گھر کھرا دو والا پورن خالی کر لیا ہے۔ نیچے والوں کو بھی نوٹس دے دیا ہے بعد میں خالی ہو جائے گا۔ لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ یہی سمجھا رہے۔“

”مشرف نے گھر کا رخمی نظموں سے انہیں دیکھا اس کی آنکھیں یوں سرخ ہو رہی تھیں جیسے ابھی ان سے خون نہک پڑے گا۔“

”ابھان پلیر میں سب سے الگ نہیں رہ سکتا میں ابی جان، میں مضمون دنا نہ کر سکی کو چھوڑ نہیں سکتا دم گھٹنے جانے گا میرا۔“

”تمہارے لیے کچھ قرینا بنائی ہے برائی ہیں۔“ میاں صاحب الدین کا بوجھ غلاف معمول ہوا جیسا تھا۔

”آپ نے حاجی صاحب کو سمجھا ہے کہ مجھے اللہ ان کا بیٹا چاہتا ہے۔“ میاں صاحب الدین کی بیٹی کی بیخود سراسر غافل ہے۔

”بات غلط اور صحیح کی نہیں ہے مشرف میاں بات غزالہ بیٹی کی ہے وہ وہ کھ کر سیکے بیٹھ گئی ہے اور لوگ باتیں کر رہے ہیں۔“

”ابن لوگ۔“ مشرف نے تیرے میں بے پوچھا۔

”تمہارا کوئی عزیز ایسا نہیں ہے جہاں بیٹے ایسی باتیں کرنے کی عادت ہو۔“

”حاجی صاحب کے عزیز دا کا قب پوچھتے ہیں ان سے کہ غزالہ کیوں کھر بیٹھی ہے۔“ عذرا انجم نے اہستگی سے کہا۔

”تو۔۔۔۔۔“ مشرف نے ہنسنیوں اچکا نہیں۔

رہے مجھے نہیں معلوم تھا کہ حاجی صاحب جیسے سادہ مزاج شخص کی بیٹی ایسی ضدی ہوگی۔“

اسفر خاموش ہی رہے اور ایک نظر آنسو بہاتی عذرا بیگم پر ڈالی۔

”میں جان پلیر روئے مت سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں۔

ان پر عیاں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کچھ دیر وہاں

صلاح الدین کو شہید کر لیتے تھے۔

”م جاؤ۔“ عذرا بیلم نے آنسو پونچھ کر ان سے کہا۔

”وہ لٹھو شہی کیا کر رہا ہے۔ ابھی شاک میں ہے۔“

فیصلہ نہیں لیا مجبوری ہے اور پھر ایک دن اس نے الگ

”جی ای جان آپ لکرنہ لریں میں بھالوں گا۔“ وہ

اے۔ مجسٹریٹ کے سامنے اس نے اپنا بیان دیا۔

”شبی مے کے بیچ میں لیا۔“

”ہیک ہوں اعلیٰ بھائی۔“

منہ ہا کہ دعوئے یا پھر ہا کہ کے

”میں نے اس زمانہ کو گزشتہ زمانہ کہا  
لیا منہ ہاتھ دھوئے اور باہر کے لیے نکلا۔“

عربی۔ انہوں نے اس کے بعد پہلا خط لکھا۔

میں نے اسے کہا: "اے جان و غلط! میں تجھ پر اس سے کہیں زیادہ غصہ کرتا ہوں۔"

”جیسا“

"مقتدر کی سر سے خنجر کو نکال کر دیا۔

”ہکومت۔“ ”نہاں۔“ ”نہاں۔“ ”نہاں۔“

”میں نے فضائلِ انہماک نہیں کرتے۔“

”یہ بھڑا تو سہارا، عمر میرے گلے میں بیٹھنا لگا کھنکھاتی ہے۔“

کچھ دیر اکر رہا ہو گیا۔

”والد صاحب نے بتایا آپ کو کہ کیا آج ہی مجھے دیکھ

اسفر نے اس کا ہاتھ تھاما۔

”طیس اب“

”علیٰ سر تسلیم خم ہے۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات۔“<sup>۳۴</sup>

”وہیے یہ فریضہ والدِ محترم نے خود انجام کیوں نہیں

آنے سے انکار کر دیا اور یہ بھی شرط رکھ دی کہ مہشر آئے

اسفرنجیدگی سے اسے دیکھ رہے تھے کہ کمن اپنے

رہی تھیں اور چہرہ سوجا ہوا تھا جیسے بہت زیادہ روٹی ہو۔

روٹی روٹی لک رہی تھیں۔

”شیعی ہم جارہے ہو ابال ٹاؤن والے لہریں۔“

”میں نے یہی حال دیکھا ہے۔“ اس نے

”شیبے۔ شیبے پلیر مت جاؤ میں عزالہ کی منت لروا



”ہاں۔“ ہمیشہ بخیر رہا۔  
 ”الگ گھر میں رہنے پر۔“  
 ”شعبی۔“ سمن روئے نکلے۔

اسے چاہئے پلاؤ اور اب رونا نہیں بالکل تم دونوں نے جب بھائیوں کی شانیاں بوقی ہیں تو انہیں اگے رکھ بیٹا نے ہوئے ہیں۔ جیسے تم دونوں ایک دن لگ لگ کر ہلاک ہو گئے۔ وہ شعوری کوشش سے مسکرائے اور میٹر کو

”نہیں حاجی صاحب! کا تو تون نہیں آیا اب تک لیکن تمہاری ہی امانت ہے لے جاؤ۔ بس بچی ہے ناسخہ پڑاڑ

”اچھا اچھا۔“ بیگم حاجی عبدالستار کے ہونٹ خوشی سے کھل گئے۔  
 ”عم، بتاؤ، ہمارا غلام کو حاکم اسے ملتا تو نہ دیتا؟“ حاکم نے سنا سنہ، یہ تو کراہی ہے۔“

”جی جی دو لوں بھالی آئے ہوئے ہیں۔ بالکل میں غزالہ کو پہنچ رہی ہوں۔“  
وہ فون پر بائیں کر رہی تھیں کہ اسفرنے بشرو کا اشارہ کیا۔ لیکن بمشراہنی جگہ سے ملنا نہیں۔  
”یار جاؤ تا مٹانا توڑے گا مٹی تا۔“ انہوں نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ نے دلی سے ایتھام تھیک حاجی

”سب کچھ کچھ حاصل ہوئے میں ہی نہیں ہے۔ محبت محبت ہی رہی ہے۔ کسی کو اگر حاصل کچھ ہی نہ ہو۔ سیدہ عظمیٰ شاہ میں نے نہ تو آپ کی محبت deny کیا ہے نہ آپ کو۔ میرے دل میں آپ کی بہت قدر ہے۔ آج میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں اگر میں کسی دروازے پر دستک نہ دے چاہوں تو وہ آپ کا یہی ہوگا لیکن یہاں مسائل

اپنی کویتن۔

438

”میری بے باکی مت سمجھیے گا بلکہ میں صرف آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی تالیفات میں انمول ہیں کہ کسی بھی دل کی Entire desire ہو سکتی ہیں۔ اس میں کوئی جھول نہیں میرے جیسے شخص کے لیے آپ کی

یہ سب میں آپ نے کہنا نہیں چاہتا تھا اسی لیے پچھلے چند ماہ سے میں آپ سے بھاگ رہا ہوں۔ لیکن آپ نے مجھے مجبور کر دیا اب پتہ نہیں چاک کرنے کو مجھے خود کو تو تیار کرنا۔ صرف اس لیے کہ آپ سب بار خود کو مسودہ الزام تھمواتی ہیں خود کو، اگر نہ کرتے ہیں۔ اس سب سے آپ بہت افسوس میں جاتے ہیں۔

دی۔ میں نے یہاں سے چلا جاؤں گا آپ کے لیے اور خود اپنے لیے مرید اناس میں ہوں گا۔  
وہ کچھ دیر فون کانوں سے لگے رہا۔  
پولیسر عظمیٰ شاہ نے اپنے مت آپ کا رونا تکلیف دے۔ میں آپ کی آوازوں محسوس کر سکتا ہوں جیسے پہل میں

اس کے لئے میں ایک دہائی تیزی آئی۔

اس کی آواز دہی ہو گئی۔  
 ”میں محبت کی افادیت کو بھی مانتا ہوں لیکن جو آپ چاہتی ہیں ویسا نہیں ہو سکتا۔ سب جو میں نے آپ سے

بلند بخت نے فون آف کر کے بیڈ پر پھینکا اور مڑا لیکن اپنے پیچھے کھڑے حجاج کو دیکھ کر ایک لمحہ کو حیران رہ گیا۔

440

سناک کی سی کیفیت میں بیٹھا رہ گیا تھا۔

اس کی طرف دیکھا تب نہ تھا حالانکہ وہ گھٹنوں اس کے پاس بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہتا تھا وہ کیسی بھی اس کی باتیں اس کے ہونٹ اس کی مسکراہٹ اسے تو کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ حزن کے آنے پر یہ وہ اس شاک سے باہر نکلتا تھا۔

”تم نے ناشتا کیا بخت“ حمنہ نے تشویش سے پوچھا۔

”جی... وہ معذرت کرتا ہوا اپنی انکیسی میں اگیا تھا۔“

۲) حق اور بے وقوف لڑکر۔ اُس نے غصے سے تکیے پر مکا مارا تھا۔

”لڑکوں! فطیس دیکھو کہ کمان کا داغ خراب ہو گیا ہے لیکن غصے کی بجائے قلم نہیں دیکھی ہے۔“  
 پھر تیرے ایدن وہاں بیٹ رہا۔ شاہنشاہ کی طرف تو کیا ہی نہیں۔ سبھی اسے غصے آتا ہی خود کیا سوچے  
 کا شاہنشاہ کے دوست ہو کر اس کے کمرے میں سیندھ لگاتی ہے اسی وہ اس شاک سے بے نیل نہیں ہو پاتا کہ غصے کی  
 فون کیا۔

”آپ مجھ سے خفا ہیں ناراض ہیں۔“ وہ رورہی تھی بے تحاشا۔

”نہیں میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔“ اس کی روٹی آواز سن کر جیسے سارا غصہ ختم ہو گیا تھا۔

”لیکن میں آپ کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا۔“

”محبت بے قوف نہیں ہوتی۔ یہ تو خود بخود اچانک دل میں آگے آنے والا جذبہ ہے۔“

”اللہ کے لیے عظمیٰ شاہ افسانوں کی دنیا سے باہر نکل آئیں۔ حقیقت افسانوں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔“

اسے پھر غصہ آنے لگا تھا۔

”میں نے آپ سے تو نہیں کہا کہ آپ بھی مجھ سے محبت کریں۔ آپ نے میرا مسئلہ پوچھا تھا میں نے بتا دیا۔ میں نے آپ سے کچھ طلب تو نہیں کیا نا، آپ مجھ سے محبت نہ کریں لیکن مجھے آپ خود سے محبت کرنے سے نہیں روک سکتے۔“

”تمہارا داغ خراب ہو گیا۔ عظمیٰ اور بس۔“ بلند بخت نے غصے سے فون بند کر دیا تھا۔

اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیسے اس احمق لڑکی کو سمجھائے اپنے دل نوچنے کوئی چاہ رہا تھا۔ اس کے بعد بھی کتنی ہی بار عظمیٰ نے فون کیا۔

”آپ میری وجہ سے کھر نہیں آ رہے پھوپھو پوچھ رہی ہیں شاہ رخ بھائی سے پزیر آپ میری عطی کی سزا  
 کو سزا دل دیں۔“

بھی وہ التجاری کہہ بھی عظمیٰ کو سوچنے لگا۔ وہ بہت خوب صورت دل کی مالک تھی۔ بہت حساس ہر ایک کی اور پھر نہایت کبھی بھی عظمیٰ کو سوچنے لگا۔ وہ بہت خوب صورت دل کی مالک تھی۔ بہت حساس ہر ایک کی

تیسرا نمبر: اس کے بعد کہ وہ اپنے اس اساتذہ سے کوئی بات نہ کہے، یہ غلط ہے، اس غلطی کو سب سے پہلے وہ خود اپنے لیے کر لے۔

”میں آپ کی محبت کے قابل نہیں، جانی ہوں میں بہت سبب یہ ہوں بہت معمولی لڑکی ہوں۔“

”اللہ کے لیے عظمیٰ شاہ خود کو ڈی کر مہمت کرے۔ آپ نہ بے پایہ ہیں نہ معمولی۔ نہ آپ کی محبت چپ

اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن پھر خود سے خوفزدہ ہو کر اس نے جاب چھوڑنے اور واپس

”میں نے آپ کو ڈسٹرغ کیا۔ میں خود کو معاف نہیں کر سکتی۔“

تب بے اختیار وہ سب کچھ اس سے کہہ گیا تھا۔ جو نہیں کہنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ ساری عمر خود کو دُکھی لکھنے لکھی رہے۔ اس نے اسے محبت کا کان بولے دیا تھا لیکن ساتھ ہی بھی بھڑکا دیا تھا کہ اس کا کوئی راستہ اس کی طرف میں جانا اور یہی قسمت کا لکھا ہے۔ شجاع اے بول کہ تم کہہ کر اس کی طرف بڑھا۔

”میں کچھ دیر پہلے ہی آیا ہوں ممانے بتایا ہے کہ تمہارا پس جا رہے ہو۔“

"ہاں۔" بلند بخت نے اس کے چہرے سے کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

”میں نے ریزائن دے دیا تھا اون سمجھ لی فور۔“

”لیکن تمہاری جاب تو بہت اچھی تھی۔“ شجاع کا لہجہ نارمل تھا۔

”ہاں بس ابل اچاٹ ہو گیا ہے یہاں سے اور پھر ممّا کی بھی خواہش ہے کہ میں ان سب کے ساتھ ہوں۔“

بلند بخت نے خود کو کمپوز کر لیا تھا اور اسے بیٹھے کا اشارہ کیا۔

”کیا وہاں جاب مل گئی ہے۔“ شجاع نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں میرا ارادہ جا ب کا نہیں ہے شاید میں باہر چلا جاؤں ہائر اسٹڈی کے لیے۔“

”مہاراجت! اس میں اور کیا بھی؟“ تم انہیں بے حد عزیز ہو گئے تھے۔ ”شجاع نے اسے بنو روہ کہا۔ اس کی ہر دم کتنی شمع! آنکھوں میں اداسی کے رنگ تھے۔

”میں انہیں اور ہم سب کو بہت مس کروں گا یقین۔“ اس نے سسکراتے کی کوشش کی۔

”جب تک میں رہا  
”وہاں رہتا رہتا“

”یا بلند بخت۔“ کچھ بھری خاموشی کے بعد تجماع نے بلند بخت کی طرف دیکھا۔

”ہمارے درمیان دوستی کا تعلق ہے زیادہ عرصہ میں ہوا عین یار، ہم دوست تو ہیں نہ کیا مجھے یوں اچانک بچھوڑ کر ادھیں جانے کی اصل وجہ نہیں بتاؤ گے۔“

”آہم سور“ میں انے تمہارے کچھ گفتگو کرنا ہے۔ میں تمہارے احساسات کو قدر کرتا ہوں۔ تمہارا

[illegible]

بلند بخت نام سا ہو گیا۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”یاریہ محبت آوی کو بڑا خوار کرتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تم اس بے وقوف لڑکی کی محبت کو نظر انداز کر کے خوش رہو“

”ہتا نہیں لیکن کوشش تو کی جاسکتی ہے نا۔“

اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا وہ عیاں ہو چکا تھا سارے اوراق شجاع کے سامنے کھلے پڑے تھے۔

”بخت آج رات شاہجی اور بی بی جان آرہے ہیں کراچی سے ڈائریکٹ یہاں شاہ رخ گریپس۔“

ابھی کچھ دیر پہلے شاہزادہ کا فون آیا تھا۔ تسمار افرین بڑی تھا اس نے معذرت کی کہ کہ وہ رات تم سے ملنے نہ آ سکے گا کیونکہ کراچی سے شاہزادہ کا فون آیا تھا کہ شاہجی اور بی بی جان کراچی سے لاہور آ رہے ہیں سیدھے۔ وہ

صبح آنے کی کوشش کرے گا۔“

”بابا جان نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ شادی اور بی بی جان سے ملنے جائیں گے اور سیدہ اسما شاہ کو نکلیں گے۔“ اس نے ذرا سوچتے ہوئے کہا۔

”اور میں نے سوچا ہے کہ بابا جان سے کہوں کہ وہ ایک بیٹے کے لیے نہیں دوں جنہوں کے لیے بھولی بی بی امیر سیدہ کا علی شاہ اور سیدہ بنت شاہ کے لیے۔“ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔  
”لیکن بابا وہ یہ۔ کیسے ممکن ہے یہ اور میرے مایلیا تو کسی اور کو پسند کیے بیٹھے ہیں۔“ بلند بخت نے گہرا کہنا۔

”میں آجی سے بات کر لوں گا تم پر فکر رہو۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جب میں سوچتا ہوں کہ سیدہ اسما شاہ زندگی کے سفر میں میری رفیق نہ ہو سکی تو اس تصور سے ہی میرا دل ڈوبنے لگتا ہے مجھے لگتا ہے جیسے کوئی نام سے نہیں یاد رکھتا بابا ہو۔“  
”لیکن بابا۔“ بلند بخت نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں یار۔“ سیدہ شجائ علی شاہ نے نظریں جمائیں۔  
”اسا سارے پر اور بات نہیں لیکن علی تو بہت نازک دل ہے۔ بہت کمزور وہ تو کسی زخمی کو دیکھ کر ترپا اٹھتی ہے۔ وہی کسی کو مرتے یا زخمی ہوتے دیکھتی ہے تو ہفتوں سوئی ہے۔ بلند بخت وہ وقت ٹھٹھ کر مریاٹ کی گلی پر بیٹھے ایک گوشہ ٹوکسٹو لے کر بیٹھا۔

بلند بخت مجھ نہ کہہ سکا بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا لیکن دل اندر نہیں مچل مچل کر غلغلہ مچا رہا کہ بخت لی تنہا کر رہا تھا اس نے کسی سے سر نہ کیا اور شجائ علی خواجہ کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی قسمی شادی کے آسمانوں کی زمین جھگو ڈالتے تھے اور وہ ان آنسوؤں سے نہیں بچ سکتا تھا۔

”عینا یہ تم کیا کر رہی ہو۔“

”ہاں فورے بے حد حیرت سے علیہ کی طرف دیکھا۔

”میں لاہور میں نے خود کو سمجھا نہیں تھا۔ اسطور میرے مزاج میں بہت فرق ہے۔ جب عاقل مجھے مانتا ہے میں نے جانا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔“  
”اور اسلی بھائی امان کا کیا ہو گا۔“ ہاں فورے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔  
”بے نیچل جائیں گے خودی اور ان میں بھی اپنی بہن مزاج کی لپٹی لپٹ جائے گی۔“ علیہ نے لا پرواہی سے کہا۔  
”مجھے یقین نہیں آیا ابھنا کہ تم۔“ ہاں فورے نے بیٹی سے بیٹے کے ساتھ۔

”اس میں یقین نہ کرنے کی کیا بات ہے ہاں فورہ نے عاقل سے مجھے پوچھا کہ اس نے مامے سے بھی بات کی ہے یا اس پر پندرہ دن تک آبا میں گئے تو کسی بات ہو جائے گی۔“ علیہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اس کی آنکھیں بے تحاشہ چمک رہی تھیں۔

”یہ عاقل کرتے کیا ہیں۔“

”عاقل ایک امریکن فرم میں جاب کرتا ہے لیکن یہ جاب ماضی ہی سمجھو اس کے والد اور نرین یار۔“  
”پوچھو اسے جاب کی کیا ضرورت ہے وہ کوئی دھوکا تو نہیں۔“ ہاں فورے نے شکاری سے کہا۔  
”میں لاہور آیا نہیں ہے۔ اس نے تو ایک بار بھی مجھ سے اپنے والد کی بڑا ذکر نہیں کیا۔ مجھے علیہ نے بتایا تھا۔ دراصل وہ اپنے والد سے ناراض ہے آج کل۔ لیکن والدین تک نہ کہنا اس درمیان سے آخر میں سب کچھ اسی کا تو ہے۔ اٹھو اسے بھوتے ناراض تو ہیں رہے گاؤں کا تاجیہ وہاں نہیں ہے اس کے گھر کی تصویریں دیکھو جن خوابوں میں گھر ہے اس کا اور اس پر اس کے پاس۔ ایک پرانا ۱۹۵۰ء کا گاڑی پرانے اسٹائل کا اور وہ جی اس کا اپنا نہیں اور اس کے والد۔“ مجھ پر امید نہیں کہ اسے گھر میں کتنے بھی دیں۔“

”ہاں فورہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے علیہ کو کبھی Matrilist نہیں سمجھا تھا۔ اس کے تصور میں اسی نہیں تھا کہ وہ دولت کو اس بھائی کی محبت پر ترجیح دے گی۔

”کیا سوچ رہی ہو۔“ علیہ نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔  
”مجھ میں کیا ہوا میں جاننا اور آجی جان کا بیٹی۔“  
”مما کو کبھی صرف یہ اعتراض ہے کہ عاقل تھوڑا زکا پٹا ہو کر جاب کیوں کر رہا ہے انہوں نے بھی تمہاری طرح لی بات کی تھی اور کہا تھا عاقل ہے کہ سیکلے والدین کو راضی کر لے لیکن یا عاقل کی مجبوری ہے وہ ابھی ایسا میں کر سکتا اس نے مامے کا تھا ابھی ممکن نہیں میں شادی تک وہ انہیں راضی کر لے گا۔ ماما تم مضامین۔“  
”تو پھر ہوا میں کیا اس کے پیچھے کاوش کرتے کیے۔“

”شاید عاقل ای کی لیکن میں نہ کہہ رہی تھی اس کی کمی تو جاری ہیں باہر شاید وہ اپنے کسی اور عزیز کو بھیجے۔ اطف کے ایک، رکن کی شعلی بھی ہے یہاں۔“  
”چھو لیکن عینا مجھے اس پر بھی کیا خیال آ رہا ہے وہ نہیں گئے تو انہیں بہت دکھ ہو گا۔“  
”مجھ کو ذرا یہ محسوس ہزار لڑکیوں سے کیونکر کر لیتے ہیں۔ جی اس دیکھ نہیں سکتا۔“  
”لیکن اس پر بھی کیا تو ایسے میں نہیں عینا۔“ ہاں فورہ بہت دکھ ہو رہا تھا۔  
”چلو جیسے بھی ہیں تم اپنا بتاؤ اسے اس کی شکل میں جاب کی لے۔“

”یہاں اسکول کی جاب پر مجھ کوئی قسم نہیں اس میں اس شخص جو اس کا نہا ہے۔“  
”کیسا ہے اسٹوٹ گک ہے جسے؟“ علیہ نے پوچھا۔  
”جی نہیں اسٹوٹ لینے والے تو ایک صاحب تھے وہاں سے منقول لگ رہے تھے۔“  
”میں ان کا کیا حال ہے کچھ پیش رفت ہوئی۔“

”میں ان کا حال تو کچھ نہیں دیکھتا رہا تھا کیا ان کے لڑکا کو ای کے لیے تیار ہوا تو ہے لیکن ابھی تہذیب میں ہے۔“  
علیہ بہت دیر بعد اور اتنی کمی اور خود ہاں فورہ کی توانائی پر شائد میں نہیں جا سکتی تھی اور ہاں فورہ پر شائد ان حالات میں وہ جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اللہ کا شکر تھا کہ جاب مل گئی تھی۔ مسز مراد کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ اسٹوٹ لینے والا شخص اور عہد تھا اس نے ایک سرسری سی نظروں پر ڈالی تھی ہاں فورہ سے تین بائیں پر بھی نہیں اور وہاں موجود لڑکی سے کہا تھا کہ اسے اپنا منٹن لے کر دو۔

”جیسا کہ ہے جاب پر آج اس کی کچھولی پرانی سکرٹری اس ماہ کے ایڈ تک لاہور ہی ہیں۔“  
”انہوں نے کیوں جاب چھوڑی۔“ مسز مراد نے بے اختیار پوچھا اور عہد غرض کے یوں پر مسکراہٹ موڈار ہو گئی۔  
”تب ان کی کن ہیں۔“

”جی یمن۔“ مسز مراد نے جواب دیا تھا۔  
”دراصل اسے جاب کا شوق ہے اور میں یمنان کرنا چاہتی تھی کہ آفس کال۔“  
”یہ فکر میں میں آفس کا داخل اور عملہ بہت اچھا ہے اور پرانی سکرٹری کو ہم نے صرف ایک ماہ کے لیے ماضی طور پر رکھا تھا۔ لیکن کچھل وہ میرے آفس میں ٹائپسٹ ہے۔ شاہ صاحب کے لئے پر وہ ایک ماہ کے لیے اس آفس میں کام کر رہی تھی۔“ اور عہد غرض نے وضاحت کی تھی۔

”اور یہ نہیں ہے شاہ صاحب کس طرح کے کہوں گے ماہ مختار رہا تو زیادہ فریج نہ ہوتا۔“ مسز مراد بی بی ہنوں کی لہجہ اس کے لیے گھر نہ ہو رہی تھیں۔  
”ہاں فورہ تمہیں بتا ہے آج اپنے گاہر بھٹہ ڈے ہے۔“  
”ہاں فورہ میں بھول بیٹی کی تھی۔“ ہاں فورہ نے چونک کر علیہ کو دیکھا۔

”پہلی فون کر کے کوش کرتی ہوں۔“

”نہیں مختصر صرف فون کر کے کوش کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ ایرج نے کہا تھا کہ تمہیں لے کر آؤں۔“

”لیکن علیحدہ میں اس وقت۔“ ماہ نور جانا میں چاہتی تھی اس لیے ہمانہ کیا۔  
”مجھے تو اپا کو لے کر تھراپی کے لیے جانا ہے مسز مراد تو آتی ہی ہوں گی۔ مجھے علم ہوتا تو میں انہیں منع کر دیتی۔“

”در اصل یار امیرج نے اچانک ہی پروگرام بنایا تھا کہ کچھ فرزند کو انوائٹ کر لیتے ہیں۔ بلکہ امیرج سے زیادہ پروگرام تھا۔ ایک دو امیرج کی فرزند ہیں۔ میں نے ندا کو بلایا ہے اور بس تم ہو۔ ندانے مجھے کتنا تھیں خدا

”تو تم ندائے کہنے پر آئی ہو۔“ بے اختیار ہی ماہ نور کے لبوں سے نکلا۔

”میں بھی کہوں آج اتنے دنوں بعد علیہما افضل حیدر کو میرا خیال کیسے اچھا لیا۔“

پروگرام بن گیا اور تم نے خود کتنے چکر لگائے ذرا کتنا تو۔" علی نے اسے گھورا۔  
 "میرے بہت سارے مسئلے ہیں عینا۔" ماہ نور افسردہ ہو گئی۔

”منوں تھا تو اس کے ساتھ آجانی بھی اور سچ تو یہ ہے کہ اب کہیں آنے جانے کو جی ہی نہیں چاہتا پچھلے دنوں زہلی بیمار یا پھر وادی کی طبیعت خراب ہونے سے پہلے وادی کو بخار ہو گیا۔“

”اوکے“ علمت نے اپنی بے زاری کو مسکراہٹ میں چھپایا اور کھڑی ہو گئی۔

جائے گا۔“

اسے ماہ نور کے آنے کی کوئی ایسی خاص تمنا بھی نہ تھی یہ تو ندانے بار بار اصرار کیا تھا اور اب پتا نہیں نہ اُن کو کیا

وچھپی ہے، ماہ نور سے اس کا کوئی بھائی تو ہے میں اس نے سوچا اور ماہ نور کی طرف دیکھا۔ سارے کپڑوں میں ہمیشہ کی طرح وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ بھلا کی جانی پت تھی اس میں جب سے اس کی ندا کے ساتھ دوستی بڑھی تھی

”ماہ نور سے ملنا تمہارا ہو گیا تھا۔ حالانکہ پہلے وہی ماہ نور تھی جس سے روز بات کیے بنا اسے چین نہیں آتا تھا۔“

یہی ”علیہ خاتون نے اسے جاتے دیکھا تو بچن سے نکل آئیں۔“  
”ابھی تو آئی ہو۔“

”جائے تو۔“

”اُسی چائے پھر سہی اس وقت دیر ہو جائے گی۔“ اس نے کلابی موڑ کر وقت دیکھا۔  
 ”نہانے چار بجے تک پہنچنے کو کہا تھا آنے والی ہی ہوگی۔“

”بڑا حشر کون امارتا ہے ایسا ہے کب تک، ایسی ہے۔“ ماہ نور نے بے اختیار ایک ممنون سی نظریہ خاتون پر ڈالی۔ یہ وہ سوال تھا جوہ خود بھی بہت دیر سے پوچھنا چاہ رہی تھی، لیکن پوچھ نہیں پائی تھی۔

”حضرت بھالی تو ان دونوں خیواریک میں ہیں مٹی کی ہیڈ آفس میں کئے ہوئے ہیں اور آنے کا کچھ پتا نہیں ہو سکتا ہے یہاں کے ساتھ ہی آجائیں۔“

”مفتے دوہتے تک آنے کو کہا ہے۔“

”خدا حیرت سے لائے۔“ انہوں نے دعا کی۔ ”اچھا میں چلتی ہوں اور ماہِ تم آجانا پھر۔“

”کوشش کروں گی اب دیکھو کب فارغ ہوتی ہوں۔“

”آج خدا سے پوچھوں گی عاتق کیسے باقاعدہ پرپوزل لائے  
 علیہذا سے خدا حافظ کہہ کر ہرنگی اور ڈرائیور کو حسن پر

ایک بار اور مما سے مل لے ممرضی ہو گئیں تو پھر یہاں کورا لیے کہا تو۔۔۔“

ایک لمحے کو اس نے سوچا لیکن پھر خود ہی اس خیال کو زائل کر دیا۔

صورت ایجو کمپنڈ اور دولت مند ہے ہر طرح سے اس کا پلہ صاف کہہ دوں گی کہ مجھے صرف عاطف سے ہی شادی کرنا

نور کے لیے نہ کی ہوتی تو خضر کی شادی نہ اسے ہو جاتی نہ اے  
لیکن اب تو ہوا انکل نصیر سے بات کر چکے وہ کبھی نہیں مانیں

ان دونوں علیحدہ کے دل و دماغ پر صرف ندامت چھائی ہوئی تھی۔  
کوہنہ نہ کرتے۔۔۔ تو نہ اکوہ ضرور اپنی بھالی بتاتی۔

”اور ولید بھی تو ہے نا۔“ اے اچانک سی ولید کا خیال خضر نے سہی ولید سے بھی تو ند اکی شاوی ہو سکتی ہے۔

مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ لیکن پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ  
کیک خرید کر وہ گھر پہنچی تو نندا آچکی تھی۔

”میں تو سمجھ رہی تھی کہ میں لیٹ ہو چکی ہوں لیکن یہاں  
”سوری ماروہ میں ماہ نور کو لینے چلی گئی تھی ولید گھر پر نہیں

”تو کہاں ہے وہ۔“ ندانے ادھر ادھر دیکھا۔ سیاہ لباس میں  
”وہ نہیں آئی۔“ ندانے کو مایوسی ہوئی۔

”تمہاری یہ کزن انتہائی مغرور ہے۔“  
 ”اے نہیں غرور تو بالکل نہیں ہے اس میں دراصل

”اگر جلدی فارغ ہو گئی تو آجائے گی۔“

”میریج تمہاری دوست آجائے تو بلا لیتا۔“ میرج کو کہتی  
 ”تم آئی کو بھی لے آئیں۔ ماما سے بھی ملاقات ہو جائی

”وہاں پھر کسی روز لے آؤں گی آج تو مہما ہے حد مصروف  
علینہ کی طرف بغور دیکھتے ہوئے ندا کے ہونٹوں پر تلخ

”تمہیں میری ماما کی حقیقت معلوم ہو تو تم جو اس وقت بھی نہ سمجھتے ہو۔“ اس نے سوچا۔

”ابھی کل رات ہی تو اس نے میڈم سفینہ سے کہا تھا کہ وہ  
”اے تو اس کے ماں باپ کیا مر کھ گئے جو مٹے۔“

”مما وہ اس سے ناراض ہیں۔“

”ارے تو کیا اس نے تمہیں بتایا نہیں کیوں مٹا راض ہر

”میں نے پوچھا نہیں۔“ وہ کبھی بھی ان کی جرح کرنے والی عادت سے بھلا جاتی تھی۔  
”تو تو مجھ سے تھا نا بلالی۔“

”ایک بار وہ کہہ تو رہا تھا کہ وہ اس کی شادی اس کی چچا زادوں سے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہاں وہاں نہیں کیا۔ چاہتا سی بات پر ناراض ہو کر وہ امریکہ چلا گیا تھا۔ اب پتہ نہیں اس کی تک سی بات کی عمارت کی چل رہی ہے یا کوئی اور بات ہے۔“

”تو راضی کر لے جا کر۔“ میڈم سفید رست ریڈس موزیٹن بیٹھی تھیں۔

”میں کرنا چاہتا تھا نا اس لیے تو آپ کی منت کر رہی ہوں۔“

”میں نے کوئی عمل جانوں گا تم کہیں میرے جانے سے معاملہ بڑی نہ جائے۔ جانی پہچانی شخصیت ہوں۔ بہت لوگ جانتے ہیں مجھے وہاں کی کوئی جاننے والا نکل آیا تو۔“ میڈم نے ایک آنکھ کھچ کر دیکھ لیا۔

”یہ تو بھلا۔۔۔ اور متوسط طبقے کے لوگ ہوتے ہیں تالی بی بی ذرا زیادہ ہی غیرت و حسیت رکھتے ہیں۔“

”اور نہ ان کی کبھی بھی میڈم سفید کی بات آتی تھی اس لیے عاقل کا تعارف ہیجیت کرن۔“ بی بی کو یاد تھا۔

”تو پھر میں نے تو عاقل سے کہہ دیا تھا کہ مایا چلی جائیں گی۔“

”تو پھر جس کے کسی معزز ہستی کو بہت سارے معزز اور بے بندے ہیں تمہاری سبیل کے پلانا تو ان

آجاس میں اور تم کوئی بارو عاقل کو یہ بتاؤ شاہ زیب سے ملنے کی ہیں اس کے آفس۔“ دیکھی تھی اس کی بیکرنی

کمال کی جو بری ہے۔۔۔

”یہ ما۔۔۔ اسے بھی آتی۔“

”فکرو ماہر لکھا جواب۔ ایک سڑی ہوئی شکل کی لڑکی بی تھی شاہ صاحب کے آفس میں اور وہ بھی چند دنوں تک

جانے والی تھی۔ یہ رہائی بھی ہے پر کیا اڑا تا ہے شاہ صاحب واقعی معصوف تھے نئے آفس اور نیا کاروبار چلنے میں۔“

اس نے میڈم سفید کو دیکھی۔

”یہ چل جانے کی توئی آجائے گی تو بس شاہ صاحب کو بھٹلے نہ دیتا۔ اللہ جانے غور کیا ہی تھی ہوگی۔“ میڈم

سفید کو کوئی بیکرنی کی فکر نہ تھی۔

”تو پھر کسی روز پرورام بیٹا اور آئی کو ضرور لانا۔“

اسے خاموش دیکھ کر علیحدہ سے نکلی۔

”ہاں ضرور ہی خود بھی آتا جاو رہی تھیں عاقل سے۔ زور دے رہا ہے کہ می اس کے رشتے کے لیے آئیں۔

شاہ باہر جانے سے پہلہ وہ ایک چکر لگا کر۔۔۔“ روایات کرتے کرتے کہہ دیا تھا کہ وہ علیحدہ سے چلے جاتی ہے کہ

عاقل کے رشتے کے لیے شاید اس کی نہ آسکیں انہیں باہر جانا ہے۔ علیحدہ کے یوں پر ایک پر غریب سی

مسکراتا بکھر گئی۔ عاقل سے منسوب ہوئے کا ضروری اتنا دلچسپ تھا کہ اندر تک مسکراتا نہیں بکھر گئی تھیں۔

”اسی دن تمہاری کنز کیا نام ہے اس کا نوٹ روٹو بھی کی نہیں لگی۔“ ندانے اچانک پوچھا وہ پوچھی۔

”شاہید ہسپتال میں دی رہی ہو سوئیے اس کا کوئی خاص ارادہ بھی نہیں تھا۔“ ندانے کا دراصل ان دونوں کے گھر

میں کچھ پریشانی ہے۔“

”وہ تمہارا بھائی خیر تھا کہ بہت محبت کرتا ہے اس سے۔“

”جی نہیں۔“ اس نے حیرت سے ندانے کی طرف دیکھا۔

”لیکن اس رشتے میں اس کی رہنمائی بھی شامل تھی۔“

”اور اگر اس کی شادی کسی وجہ سے ہاؤس نہ ہو سکی تو۔“ ندانے پر خیال نظروں سے علیحدہ کو دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

”خیر کیا بارو مل ہوگا۔“ معلوم نہیں۔“ علیحدہ بھی تک حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے خیر کو بہت دکھ ہو گا۔ بہت پسند کرتا ہے ماہ نور کو اور ہم سب ہی اسے پسند کرتے ہیں بلکہ یہ ہم سب کی ہی خواہش تھی۔“

”میں نہیں کسی کو بھی ہوں عینا۔“ ندانے اور اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کیا تم نہیں جانتیں کہ تم میری سب سے عزیز دوست ہو۔“

”تو کیا تمہارا بھی جی نہیں چاہا کہ تم مجھے اپنی بھائی بنالو۔“ ندانے پوچھ رہی تھی اور علیحدہ حیرت سے اسے دیکھ رہی

تھی وہ آج ہر دن سے مختلف لگ رہی تھی کچھ عجیبہ سی۔

”یہ بھی خیال آیا ہوا بلکہ انداز بھی میرے ذہن میں آیا تھا لیکن تم نے بتایا تھا کہ تمہاری ممکن ہو چکی ہے۔“

”میں نے سمجھ بولا تھا۔“ ندانے کا گہن اس کے چہرے سے پھیلان۔

”میں نے اس کے ایک بار اپنی فریڈنڈس سے نہیں کسی نے بتایا تھا کہ مجھے یعنی ندانے تمہارے بھائی خیر سے

محبت ہو گئی ہے تو یہ سچ تھا۔“

ندانے علیحدہ کی آنکھوں میں حیرت کو واضح دیکھا اور دھیمے سے مسکرائی۔

”یہ سچ ہے عینا۔ پہلی نظر کی محبت کے متعلق تم نے ساہو کار دیکھا ہو گا میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا اس روز

جب تم نے مجھے فساد کی بھی میری نظروں سے لکھی تھی بلکہ ارادہ اور پھر میں خیر کے چہرے سے نظروں نہ ہٹا سکی

تھی۔ لیکن میں نے یہ سچ اپنے دل میں چھپایا تھا اور شاید میں کبھی بھی ظاہر نہ کرتی لیکن آج نہیں لیں ہے

اقتدار ہو گئی ہوں عینا تم بھی بخوبی جانتے ہو سب جو میں نے کہا۔“ علیحدہ نے ہاتھ کے اس کتھ پر اپنا ہاتھ رکھ

کر اسے اپنا بہت کا احساس دلایا۔

”یہ یقین نہیں ہے اپنی اقتدار ہوئی ہیں عینا تم تو خود عاقل سے محبت کرتی ہو۔ سچ بتاؤ پہلی ملاقات میں ہی

عاقل اچھا لگا تھا نہیں۔“

”میں اچھا چھو۔“ وہ ہاتھ جھپکی۔

”میں جب باہر عاقل سے بی تھی تب میں سمجھتی کہ مجھے اس سے محبت ہے اس سے میری پچھو کے بیٹے ہیں

لیکن پھر عاقل کی کرم جو اس کا اظہار کبھی نہیں کی تھی سب مجھے ہونے والے ساڑھ لگنے لگے۔ لیکن میں

شعب میں سمجھتے تھے بھائی ہیں اور اس پر اظہار کے معاملے میں بڑے نکوس تھے اور پھر میں نے جس زندگی کا خواب

دیکھا تھا اس پر شاہید عاقل کی زندگی مجھے نہ دے پاتے یا شاید عاقل کی محبت زیادہ ہو کر تھی کہ ایک دن مجھے برا چانک

اکشاف ہو کر اس تو عاقل کی محبت میں مبتلا ہو چلی ہوں اور اس پر اپنے پیچھے پس منظر میں چلے گئے لیکن یہ پہلی

نظر کی محبت تھی بہت ساری ملاقاتوں کے بعد میں نے جانا کہ میں۔“

”لیکن میں نے تو پہلی ملاقات میں ہی مان آیا تھا کہ میرا دل کب میرے سینے میں دھرتا ہے تو صرف خیر کے لیے۔“

ندانے اس کی بات کاغذی تھی۔

”لیکن خیر بھائی تو ہوا دور۔“ علیحدہ نے اس کی طرف دیکھا اور بات ادھوری پھوڑ دی۔

”ہاں میں جانتی ہوں علیحدہ تمہارے خیر بھائی کی بات ہاؤس سے ملے ہو چکی ہے اور محبت صرف اپنے کا نام تو

میں سے محبت تو محبت ہوئی ہے پر غرض ہر طبقہ سے پاک اور میں نے بھی خیر سے بے غرض محبت کی ہے۔“

اس نے آنکھ سے کہا تو علیحدہ کا دل اس کے لیے تڑپ اٹھا۔

”کاش تم مجھے ملے جانتی ہو شاید۔“

”شاید کیا۔“ ندانے پوچھا۔

”میں کو مشکل کی ممتا تو ہوا۔“ بی قائل ہو جائیں بس بھیا اور خیر کو قائل کرنا پڑتا۔ بلکہ صرف بھیا کو خیر کو تو بھیا

قائل کر رہی تھیں۔“

ایک لمحہ کو ندانے آنکھیں پتک نہ تھیں۔ لیکن لا سرے سے نارمل انداز میں علیحدہ کو دیکھنے لگی۔

”ہوری کی تم بھی کیا کوئی کہ میں یہ کیا کر کے بیٹھی۔“ اس نے عرصہ سے یہ راز دل میں چھپا رکھا تھا آج عیاں کر بیٹھی بلدی کر کے مت کہتا اور اب انھوں پر دیکھو ایرج کی فرزند آگئی ہے تو باہری چلتے ہیں وہ بھی کیا کے گی کہ اندر ہی گھر کی بیٹھ گئی ہیں۔“

”وہاں۔“ کچھ سوچتی ہوئی علیحدہ چوگی۔

”میں خدا کا بن میں ہوں لیکن سب تار ہے۔“ اس نے لڑکی رکھی ہے سب گائیڈ کرنا پڑا ہے۔ تم ایرج کیسے بیٹھو۔“

خدا لکھی ہوئی تھی کہ اس کے سب لون کی مثل ہوگی۔

”شاید کب کا ہو گا۔“ اس نے فون اٹھایا۔

”اے کوئی تمہارے کہے پر آجاتا۔“ علیحدہ ہر شکل گئی۔

خدا نے دیکھا شاہ زیب کا فون تھا یکدم ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”اس شاہ صاحب آپ کو ہماری یاد دے آگئی۔“

”ہم بھولے ہی کہتے تھے آپ کو۔“ شاہ زیب نے جواب دیا۔

”ہنس ذرا مصروفیت رہی ہے لیکن آج سید کر رہا تھا پھر ملی جان اور شاہجی آگئے تھیں تو بتا ہے اب وہ واپس

گئے ہیں تو فارغ ہوئے ہی تھیں فون کر رہا ہوں تمہارا ایک ڈنڈہ بھی ہے مجھ پر تو آج رات چل رہی ہو۔“

”تھیں آج تو میں ایک فریڈ کی طرف آئی ہوئی ہوں۔“ وہ دھڑکے پاسی ہے۔ واپس آتے آتے رہو جا کے گی۔“

”کیسے کیا میں رہنے سے بہت نہیں ہے کہ تو خود کٹی کر لے۔“ نزل نے ڈاکٹر زینونی دوم سے باہر نکلے ہوئے

چھپے اپنے آپ سے کہا۔ لیکن میٹر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا تم نے مجھے کچھ کہا۔“

”نہیں میں اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔“ وہ باتیں کیوں ہی تھی تو تھی۔

”مجھے یہ بتا دینا کہ اسے کیا ہے۔“ میٹر نے لاق ہوئی ہے۔ مجھے کہے ہو توں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”میں تم اس طرح کیوں کر رہے ہو۔“ کیوں میں نہیں لیکن میں نے اس وقت تمہارے ہاتھ میں ہے

کل رکھا۔“

”وقت کبھی بھی میرے ہاتھ میں نہیں تھا نزل بی بی میں، بیش وقت کے ہاتھوں میں رہا۔“ چلتے چلتے اس نے نزل

پر ایک کمری گھر ڈالی۔

”میں چلتے ہو وہی تمہارے اس روئے کی وجہ سے تھی باتیں ہو رہی ہیں۔“ میرے اور تمہارے متعلق غزالہ

نے کتنی فضول باتیں کی ہیں غزالہ کو خال سے اور اگر یہ باتیں ماحول جان تک پہنچ کر تھیں اور انہوں نے لالچا لیا ہے

کچھ کر دیا اور ان کا نہیں رہا ہے تاہم یہ ضرور کریں گے تو ان باتیں ماحول میں سے انہوں کی وجہ سے وہ کچھ کیسی

فہم ہو رہے ہیں۔“ وہ دھڑکی ہو رہی تھی۔

”یہ کتنی عجیب ہے۔“ چلتے چلتے میٹر زور دیر کو راداس کے کاندھ پر ہاتھ رکھا۔

”کون کون میں چل کر بیٹھتی ہیں اور آرام سے بات کرتے ہیں۔“ نزل خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلتے

گئی۔ وہ وہاں اس پہچان میں ہاؤس جاب کر رہے تھے قاتی شکل وجہ سے انہیں فوراً ہی ہاؤس جاب مل گیا تھا

ورنہ تو ان کے چنے کی کوئی لڑکیاں انھی ہاؤس جاب کے انتظار میں تھیں۔ انھی ہاؤس جاب اشارت ہوئے نہاد

ان میں ہونے تھے۔ میٹر نے دیکھتے سات آٹھ گھنٹہ کا عرصہ رہا۔ انھوں اور بیٹھائیں میں انرا تھا۔ تاہم اس نے

نزل کی باتیں انہیں کیلئے کھڑا کیا تھا ورنہ اسے تو پورا ہر تھا کہ ایک دو میں دوسری پہلے آگئے۔ کئی اوقات اس نے

ہوئی ہے کہ کسی سے سوجھا تھا کہ شاید وہ بھی ایم بی بی میں نہیں کرے گا۔ اس روز اس کے اندر یکدم بہت ساری

تہمتیں پڑا دی گئیں۔ وہ اس کے لئے غزالہ کو مانتا ہے کہ اس کے لئے اس کے لئے میں اٹھا غزالہ کا پتہ پر

بیٹھی تھی اور چچیر اس کا خالہ زاد بھائی بیٹھا تھا ان کے غزالہ کا سر اس کے ہاتھوں پر تھا وہ اور اس کے کھلے ہاتھوں

میں اٹھائیں پھر ہر تھا۔ آہستہ پر یکدم ہی غزالہ سیدھی وہ لڑکے کی قیامت کر داس کا دکھ دیکھ رہا تھا لیکن

دوسرے لئے نہاد مل ہوئی تھی۔

”میں یہاں سے آگئے۔“ اس کا بوجھ وہی تھا قسط سے لہرز۔

”اگر کچھ لینے آئے ہو تو میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے اس گھر میں نہیں جانا بہانہ تمہاری۔“ اس نے واپس دل

کو دے دیا۔“

”نہیں۔“ اس کے لیوں پر ایک زور خند پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”میں نہیں ہے جتنا ہے کیا ہوں کہ اس ساری زندگی یہاں ہی گھر میں رہو بہت شوق سے۔“ وہ تیزی سے

واپس بلاتا تھا غزالہ کے خالہ زاد کو شاید صورت حال کی نرا تھا کہ فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ فوراً ہی اس کے پیچھے

لیکا اور وضاحت کرنے لگا۔

”غزالہ کے سر میں درد تھا میں اس کا مساج کر رہا تھا آپ شاید ہی غلط تھی۔“ اس نے میٹر کے بازو پر ہاتھ

رکھا تو میٹر نے آگے اسے اپنا ہاتھ پڑا لیا اور لاؤنج میں لگا لیا۔

”چلیے اس گھر میں۔“ اس نے ایک کمری میں لگا لیا۔

”غزالہ غزالہ میں جاری ہمارے ساتھ۔“ انہوں نے کمر پر پوچھا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے کئی میں سر لایا۔

”کیوں تم نے جانا نہیں کیا۔“

”غزالہ اس گھر میں ایک وقت کے چلیں۔“ اس نے انتہائی قہمی یکدم سے حد ضرب ہو گیا تھا۔ خود غزالہ تنگ اپنے

کزن سے اتنی بے تکلف ہیں اور مجھے ضرور اور میرا ہی میں خواہ خواہ اور۔“

اس انٹاشن میں غزالہ کی والدہ فون سے فارغ ہو چکی تھیں۔ انہوں نے اسٹور اور مشر کو کھڑے دیکھا تو وہیں کھڑے

کھڑے تھا میں بھی ہی موجود اپنے بھانے کو آواز دی۔

”اے کمر میں ہاں ہو زور غزالہ کو کہتا تھا ہر کر آجاتا ہے میٹر میں اسے لینے آئے ہیں۔“ پھر انہیں اچانک

خیال آیا کہ انہوں نے اپنے بھانے کا تعارف نہیں کروایا۔

”تم کمر پر میرا بھانہ اور میرا بیٹا ہے۔“ میٹر غزالہ سے راسخ رہا۔

چائے کوئی ہوں تب تک غزالہ بھی تیار ہو جاتی ہے۔

”غزالہ۔“ انہوں نے آواز بلند کرنا اور غزالہ اپنے کمر سے باہر نکل کر لاؤنج میں آگئی۔

”غزالہ اس میں نہیں لینے آئے ہیں۔“

”مگر مجھے نہیں بتانا۔“ وہ کمر بھلا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

”میں چنداں ہے۔“ اس نے کتنے خیال تو اپنے کمر میں ہی رہتی اچھی لگتی ہیں۔ اپنے گھر میں اپنے شوہر کے

ساتھ بوسہ چاہتا تھا اپنا ایک لے آ جا کر۔“

”آپ نے ان سے بھی پوچھا ہے کہ یہ مجھے بتانا چاہتی تھی یا نہیں۔“

”اے بی بی۔“ میں نے لی لی تو آئے ہیں گھر کے لیے اسے اور اگر گھر کا بھی انتظام کر دیا ہے میں ہی ہے۔“

تیمر جانی خدا التبار سے حد خوش ہو رہی تھیں۔

”میں نے کئی تھی کہ میں اس صاحب گھر میں بیٹھ جائیں گے۔ پھر سمجھ دار تو ہی ہیں جانتے ہیں کہ لڑکی کو

اگر گھر میں رہنے کا شوق ہے۔“

”جی جی جی آپ نے۔“ میٹر نے کہا اور غزالہ کی طرف دیکھا۔

”تو اب کیا ارادہ ہے غزالہ آپ کا۔“ غزالہ نے کچھ میٹر کی طرف دیکھا اس وقت خود برج کے کمر تھا۔

”میرا خیال ہے یہ ابھی کچھ دن اور دو میں ابھی ان کے خالہ زاد آئے ہوئے ہیں جب یہ چلے جائیں گے اور ان

کا بھی میرا ہے گا۔“

میں اس کے لئے تیار رہے۔  
میں اس کے لئے تیار رہے۔  
میں اس کے لئے تیار رہے۔

وہ اپنی ہی تو ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کی اس سستی کو معاف کر دے۔ البتہ وہ حاوی صاحب پر ہی بے استمانا راس ہوئے تھے۔



”عائے کو عدالت میں لے جانے کی کیا ضرورت تھی حاجی صاحب شرفا کا یہ طریقہ نہیں۔“ حاجی عبدالستار شرمندہ ہو گئے۔

”مجھے اس کا علم نہیں ہے غزالہ اپنے والدہ اپنے بھانجے کے ساتھ مل کر یہ سب کر رہی ہیں۔“

”میرا خیال ہے میں اسے طلاق ببجوا دوں۔“

”ہرگز نہیں۔“ عیاس صلاح الدین نے سختی سے کہا۔

”تم کیا بھی نہیں کرو گے۔ میں نے اس لیے تمہاری شادی نہیں کی تھی کہ تم طلاق دیتے پھر وہ حاجی صاحب نے کہا ہے کہ وہ یس واپس لے رہے ہیں اور جلد ہی سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

اور میسرے بات کر کے انہوں نے غزالہ تکمیر اور اسکو حراقتہ قائم حاجی عبدالستار اور غزالہ کی طرف۔ غزالہ اور تکمیر عبدالستار نے کیا تھا اس کا علم میسرے کو تھا مگر غزالہ تکمیر کا فیصلہ نہیں اور انہوں نے نیال صلاح

الدین سے سوا کسی اور کا کہ غزالہ امید ہے جان جائے گی۔

”یہ سنیں اس طرف ہے۔“ سے دائیں طرف مڑتے دیکھ کر نزل نے کہا تو وہ چونکا اور نزل کے ساتھ ساتھ

چلا گئیں میں اس کی طرف۔

”کیا بونگی کالی چلا گیا حفظہ۔“

”چلا گیا کالی تو تمہاری چاہے۔“ میسرے پر انا بیکار کھتے ہوئے وہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

”ہاں اس بات کو دیکھو اس کی طرف دیکھو۔“

”کیا بتاؤں تو بتا دوں کہ تمہارے خاندان میں کب جب غزالہ خالہ شہوور گئیں تو غزالہ نے کہا کہ چونکہ تم

اس کے بھانجے تھے مجھ کو دیکھیں گے ہواں لے اور اس کی بی بی غزالہ کے پاس گئیں مگر غزالہ نے اسے اطمینان

دلا یا کہ اس کی کو بات سے نہ نزل اس سے نہ شہوور۔ پھر بھی میسرے بات کوئی اور سننے دیا کیا گے۔“

”کیا گے۔“ میسرے نے سوالیہ نغوں سے اسے دیکھا۔

”اور کتنے دوڑ گئے کچھ بھی کہتا ہے تم کہیں برو کر گئی ہو۔“

”کے لیے پروانہ کروں مگر شہوور خالہ نے مجھے بتایا یہ سب تو کس قدر شرمندگی ہوئی مجھے تم غزالہ کو مانتا کیوں

نہیں لیتے۔“

”کیوں شرمندگی ہوئی جس کی بات تم نے غزالہ کے حق پر ڈاکا ڈالا ہے کیا تمہاری وجہ سے غزالہ دوشہ کر گئی ہے۔“

میسرے کا یہ تیز تھا۔

”پھر بھی یہ بات عقلی غلطی کی ہی ہوں مگر۔“

”کہہ رہے ہیں نہ بات کریں تو کیا ہو جانے کا غزالہ لوٹ کر آجائے گی۔“ میسرے نے اس کی بات کاٹ کر کہا وہ

جیسے جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے والی ہے۔

”ایسا کچھ نہیں ہو گا نزل بی بی اس لیے تمہارے منہ سے یہ خیال نکال دو تمہاری وجہ سے کچھ نہیں ہوا لہذا

تمہیں خوف ہوئے کی ضرورت نہیں۔“

”تم مت بدل گئے ہو میسرے تو تمہارے نہ تھے۔“ نزل نے ابھرتی سے کہا۔

”ہاں میں پہلے ایسا نہ تھا۔ میں تو یہ نزل تھا روایت نہ نزل مت بازک احساس رکھنے والا ہنسنا جانتا اور

خوش رہتا لیکن اب میں اب یہ ہو گیا ہوں میرا بی چاہتا ہے میں اس ساری دنیا کو ڈھونڈ دوں اور وہی کہ خود کو

بھی جتھرا کر لوں۔“

اس میں تمہارا میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ بخدا وہاں میں تم سے بالکل بچ کر رہا ہوں کہ تمہارے لیے میرے ذہن میں بھی ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا پہلی بار میں نے تمہیں اپنی شادی پر ہی دیکھا تھا۔ سن نے بیوہ کیا تھا کہ کیا

جان کو اگر میری شادی یہ کرنا بھی تو ان کا خیال بیچو کی فیملی کی طرف نہیں گیا تھا بھی میرے ذہن میں اس

طرف کا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں تمہارا احترام کرتا تھا لیکن یہ غزالہ بھی نزل جس نے بار بار

تمہارا نام لے کر مجھے تمہاری طرف متوجہ کیا میں پہلی بار تمہیں بتا رہا ہوں کہ وہ جب تک بی بی بار تم سے مت نہ خال

کے کہ کوئی عیب ہے یہ وہ اس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔“

”تیب سے۔“ نزل کو جرت ہوئی۔

”ہاں تیب سے لیکن پھر بھی میں اس کی باتوں کو نظر انداز کرنا ہوا۔ اب میرے دل میں ایک چیز خیال ضرور پیدا

ہو گیا تھا۔ نزل اللہ کو ہے جب مجھ پر اس حقیقت کا آشوب ہوا تو میں تم سے بھانجے کا دور رہنے کے

حالا کو کبھی بھی جب غزالہ بہتر نظر کرتی تو میرا دل باغی ہو گئے لگتا میرا بی چاہتا کہ میں ایسا ہی کروں جیسا وہ کہ

رہی ہے لیکن مجھے تمہارا بھی خیال تھا۔ اب اس مقام بھی آیا کہ مجھے گا جیسے میں تم سے شدید محبت کرنے لگا ہوں پھر

بھی میں نے ہوش ہے وہ کہہ کر کہ میں جانتا تھا کہ تم میری نزل نہیں ہو پھر میں تمہارے راستے کیوں سوئے

کروں مجھے بہر حال غزالہ کے ساتھ ہی زندگی کا سفر لے کرنا ہے خوشی سے ناخوشی سے مجھے کبھی طور پر اس پر غصہ

ضرور آتا تھا لیکن میں نے بھی طبعی کا نہیں سوجھا تھا۔

اس روز میں پہلے ہی اسفندہ کھانا کھا کر سر کے دیکھ کر مجھے غصہ آتا فطری تھا۔ لیکن بعد میں

ہوئے ہوئے غصہ کم ہوا تو میں نے سوجھا ہے وہ وقفہ اور اس حق کی لڑی ہے اتنی بار کیوں میں نہیں جانی۔ اب جان

کے اور حاجی صاحب کے نوکرات ہو رہے تھے میں انگوٹھا میں مصروف ہو گیا۔ میں نے سوجھا تھا میں انگوٹھا کے

بعد جا کر کسی روز اسے آؤں گا۔ مجھے اسی جان اور اب جان کی پریشانی کا بھی احساس تھا مجھے تمہاری کمر بھی تھی

میں نے ان دونوں میں بھی بہت تنگ کیا۔ جو کچھ منہ میں آتا کہہ دیتا تھا۔ لیکن میں غزالہ کے ساتھ پھر بھی غصے

تھا وہی بات میں صرف نہیں بتا رہا ہوں کہ میں کی سے میں نے ذکر نہیں کیا کہ میں نے غزالہ کو فون کیا تھا کہ

میں اسے لینے آ رہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے ڈر گئے کہ تھا نزل کہ میں میں تمہاری محبت کے سامنے بے بس نہ

ہو جاؤں۔ میں جانتا تھا کہ غزالہ جلد آجائے اور۔“

وہ اس لیے کہو کہ اور اس کی طرف سے کھانا کھاؤں سے میری سچ پھر رہی تھی۔

”نہیں نے اس سے کہا جو ہوا اسے بھلا دو ہم اپنی ہی زندگی کا تھاؤ کرتے ہیں۔“ یا پھر تمہارا اپنا گھر جہاں میرے

اور تمہارے سوا کوئی نہیں ہو گا تمہارا منتظر ہے۔

اس نے کہا کہ یہاں آنے کی تکلف نہ کر اس لیے کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا پسند ہے۔ کچھ۔“

میں سمجھنے سے ہی بہت پریشان ہوئی لیکن خالہ نے فری شادی میں اس اور کردی تھی۔ اب نہ چنک فری ہوئی میری ہے کہ

مجھے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے طلاق دے دو۔“ نزل ساکت بیٹھی اس نے رہی تھی۔

”میں نے کہا تھا کچھ ہے نہیں طلاق دے دوں گا میں تمہاری بات نہ والد اور میرے اب جان سے کہہ دو کہ

تمہیں میرے ساتھ نہیں رہنا اور تمہارے شادی کرنا چاہتی ہو۔ میں ایک لڑکی دیر نہیں لگاؤں گا۔ مگر اس نے

اس بات کے دوہرتے بعد خلع کی درخواست دے دی۔ وہ میرے کدھے پر رکھ کر بدلتی چلا جاتی تھی نزل۔

لیکن میں کیوں مجرم ہوں سب کے سامنے۔“

”خدا اس کا انجام کیا ہو گا میسرے میں نے تو سن رکھا ہے عدالتوں میں کسی سالوں پہلے رہتے ہیں۔ وہ خلع لینے

کے لیے عدالت میں آتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں اس طرح تو بہت سے عزتی ہوئی۔“ وہ پریشان ہوئی تھی۔

”کیا خیر عدالت میں بھی وہ سب کچھ کہہ کر اس نے غزالہ سے کہا تھا اور میں۔“

”راہ تم کیوں فکر کرتی ہو میں تو تمہاری زلف آسنو لی کر مڑاؤ کہ راستے میں بھی دیوانہ بن کر کھڑا ہوا جوں گا۔“



”لیکن اسامیٰ نے کہہ دیا تھا کہ میری شادی بلند بخت سے ہو جائے۔ میں نے اپنی ہر طلب کا گنا گھونٹ دیا ہے اسامیٰ کو اس بات پر یقین تھا کہ میرے حال پر چھوڑ دیا جائے گا شادی کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔“

”اسو اس کی آنکھوں سے برکت۔“

”لیکن اس میری بات کو سمجھ ہی نہیں رہی اور شاید تم سمجھ بھی نہیں کہو۔ میں پچھو سے بات کروں گی وہ میری بات سمجھ نہیں لی۔ ان کا دل بے تحاشی ہے۔ انہوں نے شاید مجھی کسی سے محبت کی ہے اس محبت کا سوز ان کی آنکھوں سے جھانکتا ہے اور اس محبت کی روشنی سے مجھی کبھی ان کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے جب وہ خاموش بیٹھی ہوں تو مجھی غور سے انہیں دیکھتا ہوں کیا نہیں ایسا نہیں لگتا کہ انہوں نے کسی سے محبت کی ہے۔ میری کھوئی گم شدہ محبت، بیش ان کی آنکھوں میں دیکھی ہے اور وہ محبت کرنے والے محبت کرنے والوں کے درد کو سمجھ نہیں ہیں۔ پچھو ضرور میرے رب کو محسوس کریں گی اور پھر میں صرف اتنا ہی تو چاہتی ہوں کہ ساری زندگی جو ملی میں گزار دوں پچھو کی طرح۔ اور یہ کوئی جرم تو نہیں ہے غلطی۔“

وہ پھر رونے لگی تھی۔ سیدہ اسامیٰ نے اسے ساتھ لگا لیا اور ہولے ہولے جھٹکتے لگیں اور اتنی دیر سے رو رو کر کے باہر کھڑے کھڑے سیدہ زینت فاطمہ کے کپڑوں کیلے جھلے ہو گئے تھے وہ لڑکھڑا کر قدموں سے مڑیں اور قریبی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

انہوں نے سیدہ اسامیٰ اور عقیلی شادی کے متعلق ایک ایک لفظ سنا تھا وہ دیر پہلے ہی اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی تھیں۔ اسامیٰ اور عقیلی دونوں میں سے کوئی بھی لاؤنج میں نہیں تھا تب وہ ان کے کمرے کی طرف بڑی تھیں اور پھر ٹھنک کر رک گئی تھیں۔

”محبت۔“ انہوں نے اپنے خشک لہجے پر زبان بھیری۔

”یہ بہت سنگین اور خوفناک لفظ ہے۔ بہت بے اعتبار اور دیر ان کر دینے والا اس کے پرملوش صرف آنسو ہیں اور دوسرا ناپ۔“

سیدہ عقیلی کیا کہہ رہی تھی کہ میری آنکھوں سے کسی گم شدہ محبت کا رعب جھلکتا ہے کیا میں نے عباس مرزا سے محبت کی تھی؟ ایک لمحہ ہی میں سمجھ کر اسی کے لبوں کو پچھوٹاؤں میں تو صرف ایک نظر کی جرم تھی سیدہ عقیلی شادی پھر بھی میں نے ایک حرکت دی اس کا رعب سمجھتے۔

”لیکن۔“ وہ پھر کھنکھری۔

”نہ کیا ہو کیا تھا یہ کسی کہ بلند بخت کو چاہیے تھی کہ اب اس نے بلند بخت کو یوں۔ نہیں یہ کتنا غلط ہوا ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کیا بلند بخت بھی لیکن میں سیدہ اسامیٰ کا کہہ رہی تھی۔ وہ اسی لے لاہور سے چلا آیا ہے یہ اچھا کیا اس نے سو دن۔“ انہوں نے ایک جھنجھری سی۔

”لی لی جان اور شادی نے اچانک ہی کر لی ہے کہ آج وہ اپنا ہوتا تھا وہ چیلے ہی ان کے اچانک کا پرانی جانتے پریشان ہو رہی تھیں۔ لاہور آنے کا نیا اور بھی پریشان ہو گئی تھیں۔

”شادی وہ سب ٹھیک تو ہے تاہم راز تو ٹھیک ہے کوئی مسئلہ تو نہیں ہو شادی کیا کہہ رہے تھے۔“

”سب ٹھیک ہے پچھو۔“ شادی نے انہیں گدی دی تھی۔

”شادی کا سوڈا بہت اچھا تھا وہ ہم سے ملنے کے لیے لاہور آ رہے ہیں اور پھر وہ دو دن رہیں کہ اس سے بچاؤ چاہتا ہے جاس کس۔“

”عملیہ پہلے ان کے پاؤں پر گر ان سے معافی مانگوں گا۔ ان سے کہوں گا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بے شک وہ ساری زندگی مجھے جو ملی میں نہ دھنسنے دیں لیکن مجھے گناہیں معاف کریں اور اسامیٰ کو میری بیٹی بنائیں۔“

”وہ ایسا نہیں کریں گی۔“ وہ وہاں کی ہو رہی تھیں۔

”چھوٹی آپ آج مجھے بیش باؤس کر دیتی ہیں۔“ انہوں نے گھر کیا۔

”مجھے ایک کو شش تو کرنے دیں اور مجھے صرف شادی کے لیے ہی نہیں بلند بخت کے لیے بھی تو واس پھیلا نا ہے۔“ تب انہوں نے زبان ہو کر سیدہ کا قلم علی شاہ اور کھانچا۔

”ہاں چھوٹی کیا بلند بخت، بہت نہیں اور دیر پا رہے۔ شادی کی شادی جتنی اپنی جتنی یا بھاٹی ہے کرنا باقی ہے اور بلند بخت بھی میرا بیانی ہے۔ میں اس کے لیے کتنی ہی کوشش کروں گی۔ مجھے تو وہ لوں ہی بہت عزیز ہیں چھوٹی کیا وہ سیدہ ہے۔ زینن وہ چاندیہ اور کمالک شریف اپنا کچھ ہمارے غلطی بہت خوش رہے گی۔ آپ کیا وہ ہے چھوٹی کیا۔“ انہوں نے اپنا کمالک بچہ لگا کر دے ہوئے کمال۔

”کمالک بار بار اسامیٰ سے ملنے ان کا ایک دوست اونچی جو ملی آیا تھا۔ عباس مرزا۔“ چھوٹی آپ کمالک زور سے دھڑکا تھا۔ کمالا وہ ہے بھولی ہی کہ تھیں۔

”واپسی پر کسی نے اسے قتل کر دیا تھا۔ وہ اپنے والدین کا قتل کیا تھا۔ ایک بری بیٹی تھی اس کی بس مسامت بھانجیوں میں سے صرف ایک بھائی کی اولاد تھی۔ یوں کچھ نہیں مسامت خاندانوں کا واحد وارث۔“ اسل کا واحد امین یاد دے تا آپ کو قتل کا واقعہ۔“

”انہوں نے صرف اثبات میں سر ہلایا تھا۔ زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔

”یہ بلند بخت عباس مرزا کا بھائی ہے۔“

”تب یہ تھی تب ہی تو وہ عباس مرزا سے اتنا ملتا جلتا ہے جب وہ اپنی سہ ماہی انہیں اٹھا کر دیکھتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے عباس مرزا آکر ظاہر ہوتا ہے۔“ وہ سوچ رہی تھی اور سیدہ کا قلم علی شاہ کہہ رہے تھے۔

”مجھے اتفاقاً ہی پتا چلا ایک روز عباس مرزا کے چھوٹے بھائی بلند بخت سے ملنے آئے تو بلند بخت نے مجھے ملوایا ان سے اظہارِ اہلا کا ذکر ہوا تو انہوں نے عباس مرزا کا ذکر کیا۔“ پھر مجھے پہچان گیا۔

”بلند بخت کی والدہ کی شادی سپروں میں ہوئی ہے۔ شادی کو اعتراض نہیں ہو گا چھوٹی کیا۔“

”نہیں۔“ انہوں نے۔

”نہیں۔“ وہ جیسے پرکھی تھی اور ان کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

”تم عباس مت اتنا بے قیاس نہیں شادی کو کو دو بیوہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی کہ جان جائیں گے کہ تم یہاں آتے رہے ہو اور اس کی اسامیٰ شادی کا باؤس بنائی ہے۔ غلطی کا سامنا نہیں ہو سکتا وہ قسم ہو جائے گا شادی کو نہیں جانتے قاتی پائل نہیں ہیں۔“ اور خود۔“ ان کی آواز بہت سی تھی۔

”تم ایک کو شش کا چاہتے ہو تا تو کروں میں روکوں گی نہیں شاید۔ لیکن اللہ کے لیے قاتی بلند بخت کی بات مت کرنا پائل کر بھی مت اتنا بے قیاس نہ بنو۔ شادی کو ہرگز مت بتانا کہ بلند بخت اس عباس مرزا کا بھائی ہے جو قتل کر دیا گیا تھا اور جس کی میت بہت دیر ہو چلی ہے کہ میں پڑی رہی تھی اگر شادی اسے بتا دے تو اس کو بھی منع کر دیتا۔“

خوف سے ان کا درد ہوئے ہولے لڑنے لگا تھا تب سیدہ کا قلم علی شاہ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے ان کے ہاتھ تھپتھپاتے تھے۔

”پائیس چھوٹی کیا میں ایسا ہی کروں گا جیسا آپ نے کہا ہے لیکن کیا آپ جانتی ہیں کہ عباس مرزا کو کس نے قتل کیا تھا۔“

”نہیں۔“ انہوں نے۔

”انہوں نے سو دنوں پہلے انہوں سے منہ پھرایا تھا۔

”مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔“ وہ کچھ تو پچھو۔“ اور تب سیدہ کا قلم علی شاہ خاموش ہو گئے تھے۔ لیکن وہ سنی راہیں سو سنی کس بھی سوئے تھے جو کچھ گراہے جاتے۔ شادی نے بھی پوچھا تھا۔

”زندہ فاطمہ کی ٹھکانہ ہونا کچھ کڑم کڑم رہی ہو۔“

”نہیں ٹھیک ہو۔“

شاہی اور بی بی جن دن لاہور میں رہے تھے انہوں نے زینت فاطمہ کو بتایا تھا کہ وہ کراچی میں عبدالغفار شاہ کے بیٹوں کے لئے گئے تھے۔ چند روز بعد وہ دن پہلے سرد عبدالغفار شاہ کو جلی آئے تھے اور انہوں نے شاہی سے اپنے بیٹوں کے رشتے کی بات کی تھی وہ رشتے میں شاہی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ وہ انہوں نے سوچا کہ وہ کراچی شاہ زینت اور زارا سے ملنے کے بہانے جاس اور لڑکوں سے ملنا قات ہو جائے لڑکے انہیں پسند آئے تھے۔ انہوں نے شاہ رخ سے بھی بات کی تھی اور زینت فاطمہ سے بھی۔

”تمہارے شاہی لڑکے اچھے ہیں انہو کو کھلے ہیں تو پھر کیا اعتراض ہو سکتا ہے ہاں شاہی ایک سال تک آکر اسامہ شاہ کا کاپس چاہ اور عظمیٰ کا بیٹا بھول ہو جائے۔“

”نیزہ تو بعد کی بات ہے۔ انہی لوگ عظمیٰ اسامہ کو کہنے کے لئے آتا جا رہے ہیں۔ باقاعدہ رشتے کی بات والیں گے تو پھر تم بھی لڑکوں کو دیکھ لیتا ہر بڑے نے ایے کیا ہے۔ باپ کے ساتھ کراویار کر رہا ہے پھونسے کے لیے اپنی اس کے رکھا ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنا خاندان ہے۔“

نیزہ زینت فاطمہ کو لگا تھا جیسے انہوں نے دل میں ملے کر کہا ہے کہ عظمیٰ اور اسامہ کے رشتے اور ہری کرنے ہیں۔ کیا یہ لوگ خراج اور زینت بخت سے اچھے ہوں گے ایک کھو کو ان کے دل میں خیال آتا تھا۔

”ان کا بروہا رام اگلے ہفتے کو جلی آئے گا ہے۔ وہاں سے جب فون آیا تو کیا میں آپ کو بتا دوں گا آپ سب کو جلی آجائے گا۔“

اور ابھی کچھ دیر پہلے کو جلی سے فون آیا تھا بی بی جان کہہ رہی تھیں کہ اٹوار کو وہ لوگ کراچی سے آ رہے ہیں لہذا وہ جلد تک آجائیں تو اچھا ہے۔

اور وہ بہت تازے اس کے کہنے میں جا رہی تھیں۔

”عظمیٰ کی قبر پر کیا روگ لگا گیا؟“ انہوں نے وہ دن باقیوں سے سہرا کیا۔

”شاہی تو فیصلہ کر لیں بھلا کوئی انہیں اس فیصلے سے ہٹا سکتے ہیں۔ کاش بلند بخت میں ان آنا انہوں نے شاہ رخ کو اس کی اجازت نہ دی ہو تو یہ سب کچھ ہو نہ تو نہ۔ عظمیٰ بلند بخت سے ملتی نہ مٹاڑ ہوئی۔ سارا قصور میرا ہے۔ شاہی نے مجھے اس لیے ہی تو بھیجا تھا کہ اپنی روایات و واقعات کی حفاظت کروں اور اگر شاہی کو چاہا گیا کہ بلند بخت نہ صرف اس کو کہیں آنا چاہیے بلکہ ہم سب کے ساتھ ایک ہی ٹیبل پر اس نے کھانا بھی کھایا ہے۔ عظمیٰ شاہ سے گھنٹیں بیٹھ کر کھاتی ہیں تو وہ تو کھانے کریں گے اور کدو۔“

”پھولی تاپ۔“ سید قاسم علی شاہ جانا کہ باندھ آئے تھے۔

”اسامہ زینت ہی ہیں آپ۔“

”ہم۔“ انہوں نے چونک کر سہرا کیا۔

”عمرک آئے۔“

”مجھے بھی شاہ رخ کے ساتھ کیا ہوں۔“

”شاہو کہاں ہیں۔“ انہوں نے زور دیا کہ وہ کھلا۔

”باہر ہے۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھ گئے۔

”تپا میں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ میں اور حسنہ کو جلی جا رہے ہیں۔ زینت فاطمہ تاکہ کے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہیں۔“

”مجھے شاہ رخ نے بتایا ہے کہ عید کی کراچی سے غفار بھائی کے گھر سے لوگ عظمیٰ اور اسامہ کے رشتے کے لیے آ رہے ہیں۔ میں اب زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتا۔ میرے امیہ سے میں شاہی کو مٹاؤں گا کیلئے کہ ابھی تو جلی جائیں گے۔“

”وہاں سے ابراہن شاہ کو ساتھ لے لوں گا اپنی سفارش کے لیے میری اس سے فون پر بات ہو چکی ہے۔“ وہ بہت خوش اور پرامید لگ رہے تھے۔

”شاہ رخ بھی میں نے بات کی ہے وہ بھی خوش ہے۔ لیکن برقیوں نہیں ہے بہر حال مجھے تو یقین ہے پھولی تاپ۔ اور ہاں میں نے بھی سوچا کیا ہے کہ فی الحال بلند بخت کی بات نہیں کروں گا۔ شاہی نے مجھے صاف کر دیا اور شعری کی بات ملے ہوئی اسامہ سے تو بعد میں پھر بلند بخت کے والدین کے ساتھ جاؤں گا عظمیٰ بی بی کے لیے۔ میری بات ہوئی گی اس کے والدین سے وہ بہت بہت بہت ہیں ہو رہے ہیں عظمیٰ کو دیکھنے کے لیے لیکن میں نے ابھی منع کر دیا ہے۔“

وہ بہت خوش اور خوشی سے باتیں کر رہے تھے لیکن زینت فاطمہ ساکت بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے جو جلی کے کھن میں بڑی چاہانی آ رہی تھی جس پر بڑے شخص کے پاؤں چاہانی سے لنگ رہے تھے اور نے سید ابراہن شاہ نے پھولوں سے لادیا تھا اور جو صرف ایک نظر کا مجرم تھا۔

”تو پھولی تاپ کیا ہے ہاتھ ہے!“

میزبانہ فیض نے ندائے سامنے جلی جلی۔ ندائے جو کہ میں دھنسی کسی گری میں جس میں ذہنی تپتی چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”نما! اتم ابھی تک کبھی ہو جائے کچھ آئے گی جس میں کب جان پاؤ گی زندگی کے گر۔ ایک دزارے لڑکے کو قابو نہیں نہ کر سکتیں تم اور وہ پھولی کی طرح تمہارا ساتھ ہے پھولی کیا۔“

”اسامہ نہیں ہے ہاں شاہ صاحب کو جلی گئے ہیں کسی کام سے وہاں سے آگئے۔“

”اے بھو پھولی۔“ میزبانہ فیض نے ہاتھ فٹا نہیں چاہئے۔

”اے بھو بھو بھو ہیں بھائی وہ کیا تیرے ہاتھ سے۔“

”تو کیا گلے میں ری ڈال کر دو روزے سے باندھ دوں۔“ نما بھلائی۔

”اے تیرے جیسا حسن اور خوبصورتی ہوئی میرے پاس تو شاہ جیسے سیکڑوں قدموں میں بڑے ہوتے پھر میری۔“

انہوں نے اس کی آنکھ دلائی۔

”ایک بار صبح میں آجنا تو پھر مجھے بھی نہیں دیتی تھی میری طرح مٹھی دھلی نہیں کرتی تھی کہ موقع ملے ہی اڑ جائے۔“

”اس میں آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ ندائے ہتھیار پھینک دیے۔

”خواب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“ میزبانہ فیض نے گویا اس کا دل کھلا۔

”تو نے اپنی اس اوڑھے بے نیازی سے بھی تمہیں سوں کو کھال کیا ہے۔ خبر میں اس لیے آئی تھی کہ وہ خواب تصدیق کیے چکر لگا چکا ہے کچھ وقت سے بھی بے دور خاک والوں اس شاہ کے بچے پر اور کو ان شام کو طاعون خواب کو۔“

”تمہیں ملاں مجھے شام کو کہیں جانا ہے۔“

”اگر شاہ زینت آگیا ہے واپس۔“ میزبانہ فیض ایک دم خوش ہو گئیں۔

”مجھے طرح طرح ڈروا ہے جو نکلتا ہے اس کی جیب سے نکلتا ابراہن باریاں خدو اگر بھاگ جاتا ہے۔“

”میں ملاں شاہ زینت کا فون آیا تھا وہ دن ابھی تو جلی میں ہی رہے گا۔ مجھے تو۔“

”میں اس کا فون آیا تھا اور تو نے مجھے بتایا میں نہیں دیتی تھی کہ رات ہی تھی کہ وہ تیرے ہاتھ سے نکل گیا۔“

بھلا تیری ان قاتل آنکھوں کے حیرے کو کن پتہ لگا ہے۔“

انہوں نے اس کی بات دیکھنی نہ کی۔

”میں ابھی خواب کو غلط دیتی ہوں۔ ارے ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں۔“ انہیں یاد آیا کہ انہوں نے ندائے کو بات مکمل نہیں کر سکتی تھی۔

”تمہیں کہاں جانا ہے۔“ نما غامض رہی رہی۔

”یہاں ہی جانا ہو گا یا کسی سیٹیلی کے گھرارے میں کبھی ہوں زیادہ مرام نہ بڑھان میں نے ساتھ دیکھ میں نے تیرے لئے روزانی صاحب اور سیکرڈری کو بھیج دیا عارف کے رستے کے لیے۔ اب ان کی مرضی رشتہ دینے ہیں یا نہیں لیکن تو اس اب اور وہ دو ڈر جاننا کر دے میں تیرا عارف ہے چاہے“  
 ”نارے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میڈم سفینہ نے کسی گری نظر اس پر ڈالی۔“  
 ”ان سے پوچھنا کچھ سببوں کے لئے روزانی کو ادھر سے دے داتے ہیں بڑی جگہ کی اور بے وقف۔ ایسی مرنی آسانی یوں آسانی سے سیٹیلی کی جھولی میں ڈال دیں۔ کب تک روٹھا رہتا ہوں باپ سے اٹھو تاکہ۔ آخر کو ایک دن اس کی بلانا ہے۔“

”اماں بھی کسی کو تو چھوڑ دیا کہ مجھے بہن کتاب ہے اور سمجھتا بھی ہے۔“  
 ”ارے چل۔“ انہوں نے کچھ ہاتھ ہوا میں لرایا۔  
 ”ہمت دیکھو ایسے بہن کہنے والے اور چل اچھا بارہو سے آؤ شام کو سیدھے انچاز بھائی کے ہاں ڈر میں چلنا ہے۔“  
 ”اماں پہلی جاؤ مجھے نہیں جانا۔ زمینہ کو ساتھ لے جانا۔“ دیا نہیں کیوں اتنی بے زار ہو رہی تھی۔  
 ”زمینہ نہ جانا ہے ہی آخر اسے شرافت بھی تو کرنا ہے۔“  
 ”اماں لوگ پوچھتے ہیں تجھ سے کہ تیری اتنی بھانجھیاں، بھتیجیاں کہاں سے آجاتی ہیں۔“ دنا بے حد سنجیدہ تھی۔

”تو کون کو آم کھانے سے مطلب ہے پیر گھنٹے سے نہیں۔“  
 ”لیکن اماں۔“

”مجھ سے بحث نہ کیا کرنا۔“ میڈم سفینہ نے اسے ٹوک دیا۔  
 ”جو کھانے والے مجھے ایک آٹھ میں کھاتے ہیں بتاؤ یہ بھی کھل کیوں بنائے بیٹھی ہے۔ شاہ زیب نہیں تو کیا ہوا اتنے بڑے ہیں تیرے ڈر میں نہیں جانا تو شام میں کھیں اور کھوم آ۔“  
 ”مجھے شام کو جانا ہے نہیں بتاؤ تھا۔“

”جھاس کے ساتھ۔“ میڈم سفینہ کی آنکھیں پچکنے لگیں۔  
 ”کسی کے ساتھ نہیں اماں اپنی پوتھور کی کسی سیٹیلی کے ساتھ کھانے لگیں۔“

اس نے دانستہ عارف کا نام نہیں لیا تھا۔ کیونکہ جب سے میڈم سفینہ کو بتا چلا تھا کہ وہ عارف کے بھائی میں پونجی اسے رہی ہے بلکہ بھل اس کے عجب کرے لگی ہے اس سے تیرے پاس کے در سے چرنے لگی تھیں۔ کوکہ انہوں نے صاف طور پر اسے عارف کے گھر جانے سے منع تو نہیں کیا تھا لیکن باگواڑی کا اظہار ضرور کرتی تھیں۔

”یہ عورت جیت نہیں کچھ نہیں پڑتی۔“ انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔  
 ”وہ لڑکا خضر بھی اپنی نیک سارا سچتھ کے پھوڑ کر تجھ سے شادی نہیں کرے گا۔“ انہوں نے اس کے دل سے خضر کا خیال نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

”ممکن ہے وہ تیرے ساتھ کچھ مدت گزارے لیکن شادی ناممکن۔“

میڈم سفینہ کا بھر پور ترین تھا۔  
 ”کچھ لوگ کہتی ہیں تو میں شادی۔“ اس نے بے دوبے لفظوں میں کہا تھا۔  
 ”ہاں ہوتے ہیں ایسے بھی کچھ کہ کچھ کے الٹوں کی پوتھور کی امید ملے کہ نہ باندھ لیا۔“  
 ”وہ میڈم سفینہ کو اپنی پہلی بیٹیاں سمجھا نہیں سکتی تھیں اس لیے خاموش ہو گئی تھیں۔  
 ”اب ان پوتھور کی کسی بیٹیوں کو کبھی بھی جانا۔“ میڈم سفینہ کو کبھی ہو نہیں۔  
 ”دوڑا کر جلدی دانیس آؤ تو میرے ساتھ چلنا ڈر میں۔ بڑے لوگ ہوں گے وہاں۔“  
 دنا کچھ نہیں بولی تھی۔ میڈم سفینہ کے جانے کے بعد اس نے سرکری کی پشت سے نیک کر آنکھیں موند لی

”تھیں اسے عارف کی طرف جانا تھا۔ دو تین بار عارف کا فون آچکا تھا۔ وہ ریشاں تھی اور مغرب بھی۔  
 ”درا کر پلانا نہ مانے تو۔ میں عارف کے بغیر کسی زندہ رہوں گی۔ یا رتم اگر تم کو قاتل کرنا۔ ماما بھی کچھ خندہ زب نہیں ہیں۔“ انیس اعتراض عارف کے والدین کے نہ آنے پر ہے۔  
 ”تو تم بتاؤ گا کہ ماما کی تم عارف کو پندرہ گئی ہو۔“ نارے نے اسے سمجھایا تھا۔

”میں نے اسے پلایا۔ پھر آج آجوتا نہ تھا تو ماما کو۔ اگلے ہفتے بھی ماما واپس آ رہے ہیں اور میں جانتی ہوں اس سے پہلے ماما کو معلوم ہو جائے کہ میں کیا جانتی ہوں۔“  
 ”لیکن عارف اپنی جنگ تو ہمیں خود ہی لڑنا ہے کیونکہ عارف نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس کے والدین اس شادی میں شریک نہیں ہوں گے۔“

”تو عارف کی بات ہے ایک بار تم سے بات تو کرو۔“  
 ”اوکے میں آج آؤں گی۔“

اسے وعدہ کرنا ہی پڑا تھا لیکن اس پر کل سے بے زاری طاری تھی۔ عارف نے اس کے اظہار کے بعد ایک بار بھی خضر کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ایک بار بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ وہ کوئی امید باندھ لیتی۔  
 ”تو مجھے خود ہی تو کھش کرنا ہوگی۔“ اس نے زرب کا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔  
 ”لیکن خضر وہ چلے گیا ہے آگے۔“

”اور اگر میں باہر کوئی منظر سے ہٹاؤں تو پھر خضر کو اپنی طرف مائل کرنا کیا مشکل ہو گا اماں بھی تو کہتی ہیں کہ میرے حسن میں بڑی طاقت ہے۔“  
 ”ایک دم کسی سکرماٹے اس کے کیوں کو پھوڑا اور وہ کڑی ہو گئی اور پھر کچھ دیر ڈر تک کے آئینے میں خود کو دیکھا۔

”دور میں ہوں۔ یہ آنکھیں یہ ہونٹ یہ پیشانی یہ چہرہ یہ جسم کیا اس میں کچھ بھی ایسا نہیں جو خضر کو خیر کر سکے۔“

اس نے ایک ایک قسمی کو ہر پر زانو سے دیکھا۔

”دور ہے کچھ ناممکن بھی تو نہیں۔“ اس کی سکرماٹہ گہری ہو گئی۔

”دور میں ہے کچھ ناممکن ہی نہیں کی۔ صرف آجکوں کو اپنی بیٹی تھا اور۔ تو اب طے ہو کہ قدم آگے بھی بڑھانا ہے صرف دو دور ہے۔ پھر کہ نظروں کی پاس میں نہیں بھول جائے کہ دل کو بھی کبھی بھی نہیں لیتا ہے۔“

سکرماٹہ مزید گہری ہو گئی وہ سر شیل ہول کر خود کو آئینے میں جانچنے لگی۔ تھی اس کا سبیل فون لیا تھا۔  
 ”ایسا بھار امانو تھا شام میں آؤں گی لیکن جہن نہیں۔“ اس نے تیل پر عارف کا نمبر دیکھ لیا تھا۔  
 ”میں نے صرف کسٹرم کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ دنا اگر واقعی تم آری ہو تو میں باہر کو روک لوں تمہارے آگے تک۔“

دوسری طرف سے عارف نے جواب دیا۔

”دیا۔“ عارف نے آنکھیں بند کر چکی تھیں۔ ”وہ تمہاری طرف آئی ہوئی ہے۔“

”ہاں وہ دلیر کے ساتھ دیکھ لی طرف گئی تھی کچھ دیر پہلے ہی ولید اسے ہر چھوڑ کر گیا ہے کہہ رہا تھا اسے کسی کام سے جانا ہے۔“ دنا نے اسے پکارتے ہوئے اسے کہا تھا۔ اس نے روک لوں تمہاری اس روز ملاقات نہیں ہو سکتی تھی تاہم اس سے ملنا جانتی تھیں۔ عارف نے عارف کے مطابق تفصیل سبب کی تھی۔

”اوکے میں کچھ دور میں نکل رہی تھی۔ چلو تمہاری پیادری سی بھابی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ایسا ضروری بھی نہیں تھا ملاقات کرنا۔ بس پوچھ کر کہہ دیا تھا۔“  
 اس نے بظاہر پروا نہ لی سے جواب دیا لیکن اس کا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ وہ خود نہیں جانتی تھی

[illegible]

”میں نے تباہ تو کیا نہیں۔“  
 ”دیکھ عینا۔ وہ سڑک چالیس ایکس ایم پر چڑھ چکا ہے۔ تو اس سڑک پر چلی۔“  
 ”Leave نا، میں نہیں سمجھ سکتی۔“  
 ”اور اس سڑک پر نہیں دیکھو گا اور شاید اس میں کوئی گاڑی ہو۔“  
 ”ہاں، تو اس سڑک پر چلی۔“  
 ”تو اس سڑک پر چلی۔“  
 ”تو اس سڑک پر چلی۔“  
 ”تو اس سڑک پر چلی۔“

بھائی بھئی ہے۔  
اندر میں اگ بھڑکی تھی لیکن یوں پر مسکراٹ تھی۔  
”میں نہیں میں نہیں۔“ ماہور کے کہیں۔ بے اختیار نکلا تھا۔  
”میں آئی ہے اس طرح کی بات نہیں کر سکتی۔“  
”تو اس طرح تو میری ہو جیسے تھیں ان بات کرنا ہو۔“ ندائے قہر لگا۔  
”وہ تو کسی آئین میں جا کر رہی ہو۔“ عروہ نے بتایا تھا میرے بہنوں کے کام کرتی ہوگی۔ ذرا سی بات پر  
اتنا بھڑکی ہو۔“

”ہاں ایک چوٹی۔“ مجھے اس جانب کر کے ہوئے دو تین پانچ ہوئے ہیں۔ چاروں دریا جہاں جہاں پہنچے۔  
 ”ہاں“ بات کرتے ہوئے اس کی انٹی خروا عمامہ کی لوٹ آتی تھی۔  
 ”لیکن آئی سے اس طرح کی بات میں کیسے کر سکتی ہوں۔“  
 ”تو یہ مرحلہ مجھے ہی ملے گا نہ توڑے گا۔“ مذاکحہ کھڑی ہوئی۔

”چلو تیار ہو تمہاری ماماں ہیں۔“  
 ”مے کرے میں۔“ علینہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”ہاں تم بیٹھو میں نے انکو ماما کے پاس جھوڑ کر آئی ہوں۔“

”کوئی بے محبت کا انجامہا۔ اس نے میری ساسی کی۔“  
 کلیری علیحدگی کے لمحہ میں کھڑی ہو کر اس کے پاس سے گزری اور آج کل  
 آج میں نے تھکا ہوا ہوا تھا۔  
 اس نے اٹھ کر حساب لگایا۔ کوئی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزر رہا تھا اور محبت سچے رخصت ہو گئی تھی۔ اسے

کہ وہ کیل اور نور سے ملتا جاتی تھی اور وہ نور سے مل کر اسے کافا ملتا ہو گا۔ کیا کرے گی ابھی کچھ بھی اس نے ذہن میں واضح نہیں تھا لیکن اندر میں کمر لگاتی تھی یہ باحساس تھا کہ اسے اور نور سے ملنا چاہیے۔ اس لڑکی سے وہ اس کے محبوب سے وابستہ ہے۔ وہ اسے کیا لے گی اس کے ساتھ اس کا رشتہ کیا ہو گا یہ وہ ابھی متین نہیں کہہ پاتی تھی۔ بہر حال اس نے سرگرم کار اور وارڈ روپ سے بڑے سے نکالے گی۔ کچھ روز بعد وہ تیار ہو کر یہیڈاں اتر دی تھی۔ میڈم سفینہ لاؤن میں صوفے پر بیٹھی تھیں اور زمین پر بیٹھ کر کچھ دیکھ رہی تھیں۔

زیر زمین کی کماں سے اٹھ گئی تھی ہڈاں کی جانے کی کو شش فیملی کی لڑکیاں آتی اور جاتی رہتی تھیں۔ اس نے اس سے بھی زیادہ پتہ نہیں لگ سکی تھی۔ سفینہ کی بیٹی بھی اور خوجوان سے بہتر اور اعلیٰ سمجھتی تھی۔ میڈم سفینہ نے بھی بیٹھ اس کے کے تماشاً لاؤن گھانے تھے اور وہ جاتی تھی کہ اگر وہ خدہ پر آتی تو میڈم سفینہ اس کی بات سامان لی لیکن غصہ! اصل مسئلہ تو خیر تھا۔

”ظہیر لدو“  
 ”میںمغنیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے اختیار کہا تو ان کے سامنے بیٹھی زہینہ اور رخسانہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ ایک بار کہہ کر دوپٹے کو اوڑھ لے کر گئی۔ وہ نے آخری بیڑی کی کھاس کی۔  
 ”ناممیں علیحدگی کی طرف جا رہی ہوں۔“ ”میںمغنیہ نے برا سانس دینا یا اوچھ کر تھوڑا کواوری سے پوچھ لیا۔  
 ”میںمغنیہ کی بات سنا کر مجھے ست جایا کر اور مجھ کا تھاک کر۔“  
 ”جلدی کیا کھانا لیں گے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا اور علیحدگی کی بات پر رکھا جواب پسندنے لگی۔  
 ”یہ زہینہ واری کب تک جواب تو میری پوچھائی ختم ہو جی۔ یہ تو اسے بھی تیرا یاد کر دے۔“ ”میرا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔“

”ڈراما اور سوانحہ کے جانا“ میٹم خیر نے کہا۔  
 زمیندار اور شہانہ اسے دیکھ کر کھنکھار اٹھیں لیکن دلا پر دلائی سے ان کی طرف دیکھتی لالچ سے باہر نکل گئی۔  
 میٹم خیر نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے گئیں۔  
 جب علی نے کمر کھینچ کر میٹم خیر کو دلا پر دلائی میں بیٹھ بیٹھ کر دیکھا۔  
 ”ناترا“ علی نے یکدم کھڑی ہو کر میٹم خیر کی نظر سے دلا پر دلائی پر تھیں۔ ہلا کی محسوس اور جاہلیت تھی اس  
 لڑکی میں۔ یکساں ہے۔ نانا زاد سادہ سا چوہا لیکن ہلا کی کش۔  
 ”تیرا دلا پر ہے۔ شاید پہلے بھی تمہاری ایک ملاقات ہوئی ہے اس سے میری کزن ہے اور۔“  
 ”ہاں شاید۔“ اس کے کاندھے میں دلا پر دلائی تھی۔  
 ”اور ہمارے کمرے میں جاتی ہو جاتا ہے تو اسے میری دوست۔“

ماہ نور نے اُٹھتے میں سر ملاتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ مگھراتے ہوئے اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی اور علمین کی طرف مگھلا۔

”تمہاری کزن کو دیکھ کر کزن میں پہلا خیال تو آیا ہے وہ ہے سادگی میں پر کاری نہایت خوب صورت ہے تمہاری کزن۔“

”یہ آپ جناب کیا اندیشہ میری دوست بھی ہے۔“

”برائی اطلاع کیا ہے“ علیہ نے پوچھا۔  
 نداشت خہروری تھی۔

علینہ کے اتنے واضح اظہار کے باوجود یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کو بھلا کر عاقل سے محبت کرنے لگی ہے۔  
 ”اور کیا محبت اتنی کمزور ہوتی ہے؟“

اس نے جسے خود سے پوچھا تھا اور اسے لگا تھا جیسے اس کے اندر خضر کے لیے موجود محبت جتنی ہی ہوا تھا اور ہمنوا ہے جتنی پہلے بھی ملکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اور بچش کی آگئی تھی۔ پہلے اگر وہ یہ یقین بھی ہو جاتی تھی تو اب خضر کی پہنائی ہوئی آنکھوں کی اسے ایک لمحہ کے لیے بھی بے یقین نہیں ہونے دیتی تھی۔ اس کی محبت کی خوشبو جیسے اس پر ہر لمحہ صا رہا ہے رکھتی تھی اور کتنے سارے دن وہ ہونگے تھے اس نے خضر کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہاں تھا اور ان کو لکھ چلا آتا تھا تو اسے بھی محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ خضر اس کے لیے کتنا اہم ہے اور اب جب کہ وہ یہاں نہیں تھا وہ پھر اس کی کمی محسوس کرتی تھی۔

پچھلے دو ماہ سے وہ باقاعدگی سے فون کرنے لگا تھا ہفتے میں ایک بار۔ وہ منصور کے لیے بہت پریشان تھا اسے اس کی بھی فکر تھی سعید احمد کا بھی خیال تھا۔ دانی نسل سب کا خیال رہتا تھا۔ اسے ”کیا اس خیال کوئی خصوصی سامی ہو“

اس نے سوچا اور یوں سرگرا ہوا ہونے لگا۔ وہ کتنی خوش قسمت ہے کہ خضر جیسا شخص اس کا ہم سفر بنے گا۔  
 ”یہ اس کے لیے کیوں سرگرا جا رہا ہے۔“ لکھا کھاتی ہوئی ایرج اپنے سر سے برآمد ہوئی۔  
 ”نہی۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”اور یہ بہت عرصہ تھا رہی ہو مینل ہو جاؤ گی۔“

”میں تو نہیں ہوتی۔“ اس نے اپنا ہاتھ لیا اور چمک ساٹنے نیل پر رکھی ٹرے میں پیچیدہ کر بیٹھ گئی۔  
 ”وہاں کوئی آنا چاہتا ہے اسے اسے لاہور کے ساتھ ہی بٹھا دیا ہے۔“

”اس کا پاس جاب بس مکمل ہونے ہی والا ہے۔ شاید ایک دو ماہ تک آجائے کر آجی۔“

”چلو اس کا خواب تو برا ہو جی ان کی اور یہ منوں کا کیا ہوا۔“ آج آپ کی ٹھیں ولید کے ساتھ۔“

”ہاں آج کو ابوں کو پیش ہونا تھا لیکن ان کا مکمل حاضر نہیں ہوا تھا سو ناگزیر ہو گئی۔“

ماہ نور، منصور کے ذکر پر افسردہ ہو گئی تھی۔ منصور کے ایک کلاس فیلو نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جگہ بولے گا لیکن یہ وعدہ سچا رہا تھی جب کو الٹا وہ جا کر اس کے پاس پہنچے۔ جس ایک موم ہمیں امید تھی کہ شاید اس لڑکے کی کوای کس کو کمزور کر دے۔ شاید کوئی صورت منصور کے باہر آنے کی نکل اڑے گا۔ وہ لڑکا بھی کب تک یہاں رہے گا۔ اسے یو ای ای میں جاب مل گئی تھی اور اسے جانا تھا شاید ایک ماہ تک پھر موم ہمیں امید کی موم تو ڈوسے کی اور۔  
 ”اسے یہاں روانے آپ کو بتایا۔“ ایرج کو اچانک یاد آیا تو ہنسی۔

”جیسے اپنا ہوا فک و ڈائریس دے دی ہے۔“ ایرج نے بتایا تو دھیران اسے دیکھنے لگی۔

”میں نے مل نے تو نہیں بتایا یا ان کے جھگڑے کے بعد اور راضی کا کام تو تھا جسے۔“

”آج کل ہندو پچھو کالون کیا تھا انہوں نے بتایا ہے۔“

”سیر افسر کی بات ہے پہلے کئی کی طلاق اور اب یہ۔“ ہاں جان تو بہت ماضی ہوں گے شعی۔“ ماہ نور کو دکھ ہوا۔  
 ”جی نہیں۔“ ایرج نے دندھے اچکائے۔ ”مما سے بات ہوئی تھی ان کی دویسے ہو لڑکی سمجھتی تھی نہیں کرتی تھی کسی کو۔“

”میں نے تو پہلے سوچنے کی بات تھی اب جب کہ گریس گیا تھا تو سہر حال اچھا نہیں ہوا۔ پچھوں گی نزل سے تفصیل۔“

”نہا نہیں کہتی۔“ علینہ زانی حقیقت ہوئی لاؤں جس داخل ہوئی۔

”میں۔“ ماہ نور نے نفی میں سر ہلایا۔

”لگتا ہے ڈاکٹر ابورہ ہیں ماما۔“ وہ ہنسی اور ایرج کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”کے سیر افسر۔“ ایرج نے پوچھا۔

”کچھ کچھ بات چل جائے گا خود ہی۔“ علینہ نے اندر آتی دیکھا اور اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کیا کہا ماما۔“

”کیا کہا تھا۔“

”نہا نے بیٹ سے بسکٹ اٹھایا۔“

”میں نے تمہارا مفتون ان تک پہنچا دیا ہے اور ٹھیک ٹھاک وکالت کر دی ہے انہوں نے تمہارے چہا پر بات۔“

”اور خزان کا خیال ہے کچھ اندازہ ہوا۔“ علینہ نے بے چینی سے پوچھا۔

”میں نہیں کہتی کچھ۔“

”آخر بات کیا ہے۔“

ایرج کو جس ہوا تب علینہ نے خضر ”ساری بات اسے بتائی تو اس کی آنکھوں میں حریت اتر آئی۔“

”لیکن میں تو کچھ دیر ہی کہی کہ تم سفر بھائی۔“ اس نے بات اور حوری پھوڑ دی۔

”خلطہ بھی تھی تمہاری۔“ علینہ نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے ٹرائی باجی طرف پھٹی اور بیٹ اٹھا کر ڈاکو دی۔

”یہ کیا بات لدا حضرت۔“ وہ رہے ہیں۔“

”ولید ابھی تک نہیں آیا سیر خیال ہے میں چلتی ہوں۔“ ماہ نور کھڑی ہو گئی۔

”آجائے گا میں دیر ہی کہی کہ تم سفر بھائی۔“ اس نے بات اور حوری پھوڑ دی۔

”اگر تمہیں جلدی ہے تو میں تمہیں ڈراپ کروں گی۔“ بس یہ کباب کیسے کھم کھم لوٹو چلتے ہیں۔“ ندانے آؤ گی۔

”تم۔“ تم ابھی بیٹھو گی ابھی تو کہتی ہو۔“ علینہ نے ندانے کی طرف دیکھا۔

”میں میں ماما صرف تمہاری دیر کے لیے اجازت لے کر آئی تھی نہیں کہیں کام سے جانا تھا۔“

”اچھا تو پھر چائے تو پیو آرام سے۔“ اور ماہ نور بھی دونا کچھ۔“

ماہ نور نے خاموشی سے بیٹھ پڑی۔ چائے کے بعد ندانے ایک بار پھر ماہ نور کو ڈراپ کرنے کی آفر کی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تجائیں ولید کہ آئے گا لدا اور دانی پریشان ہوں گے۔“ ماہ نور نے علینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ولید کہ تو رہا تھا کہ شاید کچھ دیر ہو جائے لیکن اس نے کہا تھا وہ جی کیا نہیں سمجھو آگے۔“

”میں سیر خیال ہے کہ میں چلتی ہوں۔“ ایرج جس وقت تو ہو گی لیکن۔“

”بالکل جیت نہیں ہو گی۔“ ندانے خوش دلی سے کہا۔

”اور تمہارے لطف سے بات نہ کر علینہ کی کزن ہو تمہارا دنا سے مجھے بھی بہت عزیز ہو۔“

اس نے ایک لمحہ کی طرف سہارا دیا اور اس کی ماہ نور بڑوائی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ماہ نور سے کیا فائدہ اٹھائے گی لیکن اس کے ذہن میں نہیں تھا کہ اسے ماہ نور سے کتنی کرنا چاہیے۔ ابھی اس کے ذہن میں کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ اس طرح ماہ نور کے قریب ہو جائے اس کے بعد اسے کیا کرنا تھا ابھی اس نے سوچا نہیں تھا۔

ماہ نور طے یل میں اس کے اخلاق سے متاثر ہوئی تھی اور اس نے دل میں اعتراف کیا تھا کہ علینہ ندانے کی تعریف بچ کر کرتی ہے۔

راستے میں وہ اسے اور حوری کا ہاتھیں کرتی رہی۔ اور بس دلچسپی سے اس کے لمباں یا مین بھائیوں اور دانی کے متعلق پوچھتی رہی۔

”تم کو اتنی دین ماما سے کھر علینہ کے ساتھ تمہیں سب سے ملو گاں گی۔“

ماہور نے اسے بوسہ دیا۔

”مخلصانہ سزا دیکھ لی گئی تھی۔ آج بھی تمہارے خوش ہل سے جواب دیا۔  
”کیوں نہیں۔“ ماہور نے کیوں پر بھی مسکراہٹ دوڑائی۔

گاؤںی اشارے پر رکی ہوئی تھی اور وہ اسٹریٹنگ پر ہاتھ رکھ کر ماہور کی طرف دیکھ رہی تھی جب اس کے ساتھ کھڑی گاؤںی بھی بیٹھے شاہ زیب نے ندائی گاؤںی کو دیکھا۔ چاہے بے لاشہ ندائی بھی چوڑا راتہ کر رہی تھی جبکہ فرنت میٹر چارو اور اسی شہی ماہور کو اس نے جرت سے دیکھا اور پھر ایک اس کی آنکھیں پچھنے لگیں اور ندائی بلا نے کہے وہ کھڑی پر بیٹھنے پچھنے بیٹھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں سے تماشا چمک چمکی اور ہونٹوں پر ایک مٹی خیزی مسکراہٹ وہ اسٹریٹنگ پر ہاتھ رکھے رکھے گری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اشارہ ملے پر جب پیچھے والی گاؤںوں نے ہان بھایا تو اس نے چونک کر دیکھا ندائی گاؤںی ابھی بڑھے چلی تھی۔ اس نے بھی گاؤںی کے بھائی لیکن اس کا ذہن مسلسل ماہور اور ندائی کے تعلق کو سوچ رہا تھا۔



”شہی بلیز اس طرح مت جاؤ۔ مت کر ایسا۔“

”اچھے نہ اس کا ہاتھ پکڑا لیکن اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چمڑا لیا۔

”آئی بلیز تمہارے مت دو میں بیٹھے جا رہی ہوں۔“

”لیکن تم اس وقت کہاں جاؤ گے۔“ اچھے نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

”اب جان اس اس وقت خفے میں ہیں۔ انہوں نے خفے میں کہا ہے سب کچھ۔“

”میں آئی آپ نہیں جانتی۔ نہ انہیں نہ ان کے خفے کو۔ لیکن میں ابھی طرح جان جا ہوں۔ ان کا کیا مطلب ہے۔“

”مگر تم۔۔۔ ہم تمہارے بغیر کیسے رہیں گے شہی۔“ کو نے میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی سمن کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔

”میں تم کو سب سے تمہاروں کا۔ مگر تم سب کا چہرہ مجھ سے ملے آتا ہے۔ مگر تمہارے میں تمہیں بتا دوں گا۔“

وہ مگر کڑبڑ بکھڑی ہوئی کہ میں بیک کر رہے گا۔۔۔ نہ آئیگر ٹھہرائی ہوئی کرے میں داخل ہو نہیں۔

”شہی شہی بیوہ اور دارو کا کیا کر رہے ہیں۔ مگر چھوڑ کر جا رہے ہو کیوں۔“

”مئی جان بلیز اور شہی نہیں۔“ اس نے گتائی کی طرف کرتے ہوئے ان کے بیٹھے کے لیے جگہ بنائی اور

بہت محبت سے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”اب جان نے خفے گھر سے نکال دیا ہے انہوں نے کہا ہے میں ابھی اسی وقت ان کا گھر چھوڑ دوں اور یہ کہ اب

ان کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا۔“

اس کے لیے میں بلا کا سکون تھا۔ اچھے نے جرت سے اسے دیکھا۔ اتار پر سکون تو پچھلے کئی سالوں میں ایک بار

بھی نظر نہیں آیا تھا۔ عذرا اب تک یہی پہلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”لیکن میں شہی میں اس صاحبہ نے ایسا کیوں کیا؟“

وہ بے حد مضطرب سی لائقہ نظر آئے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”آپ جانتی ہیں ای جان میں نے غزالہ کو۔“

”لیکن تمہارے اب جان کہ رہے تھے کہ خفے میں ٹھیک ہے تم نے اسے ایک طلاق دے دی ہے لیکن رجوع

کر لو گے تم۔“

”میں ایسا نہیں چاہتا۔“ اس نے اسی سکون سے کہا۔

”وہ میرے ساتھ رہتا میں چاہتی تو پھر زبردستی کے بندھن کا کیا فائدہ۔ میں اسے طلاق نہیں دیتا چاہتا تھا میں جانتا تھا میں جب بھی ایسا کروں گا اب جان مجھے محاف میں کریں گے۔ وہ مجھیں جس میں نے ان کے لیے کیے ہوئے

رشتے کو بھٹکتا کیا ہے اس لیے میں نے غزالہ سے کہا تھا کہ وہ اگر خود جانی صاحب سے کہہ دے کہ اسے میرے ساتھ نہیں رہنا تو میں اسے طلاق دے دوں گا پھر اس نے خلع کا نوٹس بھجوایا۔ چلو ٹھیک تھا میں کم از کم اب جان کی نظر میں مجرم تھا۔ لیکن پھر اب جان اور جانی صاحب نے کس قسم کر دیا۔ اب جان چاہا کہ مجھے کہ میں جا کر غزالہ کو لے آؤں جب کہ مجھے یہ کہتے تھے کہ میں اسے فارغ کروں۔ اب آپ بتائیں ای جان میں کیا کرتا۔“

عذرا اب تک کے ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھے اور وہ ہولے ہولے بول رہا تھا۔

”وہ میرے ساتھ رہتا میں جانتی تھیں کہ میرے نزدیک اسے اپنے ساتھ رکھ لوں لیکن اب جان یہ بات نہیں سمجھتے۔

انہوں نے مارا الزام پھر ڈال دیا ہے کہ میں نے شروع سے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا کیونکہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں شریعت کے مطابق کہ بعد دیکرے طلاق بھجوا دوں گا اور پھر ایسا جان آپ پریشان نہ ہوں

ایک دن اس کا جواب اب جان کو اس کا سوا ہے گا کہ غلط میں نہیں تھا۔“

اس نے ان کے ہاتھ چھوڑ دیے اور دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی سمن کیسپاس جا کر اپنی انگلیوں سے اس کے

رخساروں پر بے آنسو صاف کیے۔

”مگر کیوں دہری ہو اچھا۔“

”ایک ماہ اس کے گرد مائل کرتے ہوئے اسے بیک تکیہ کیا۔

”بھجووا رہے اس نے اسے عذرا اب تک کیسپاس بٹھا دیا۔

”میں یہاں ہی رہتی ہوں گا اور تم یوں دہری ہو جیسے میں بیک سے کیے۔“

”نہ نہ کرے۔“ عذرا اب تک نے بے اختیار کہا۔

”اچھی بہن کی طرح میری سبک کرنے میں میری مدد کرو۔“

وہ مسکرایا لیکن اندر جیسے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

”میں بات کر رہی ہوں میاں صاحب۔“

عذرا اب تک نے اٹھنا چاہا تو اس نے ان کے کندھے پر اپنے ہاتھوں سے دبا ڈالے ہوئے بٹھا دیا۔

”میں آج ان کے کچھ نہیں سیں گی یوں ہی کہی نہ آئیگی۔ تاکہ کر جائیے ہیں اور میں ان کے گھر آنے سے پہلے

جانا چاہتا ہوں تو یہ کہ انہوں نے کہا تھا کہ جب وہ گھر واپس آئیں تو میں انہیں نظر نہ آؤں۔“

بہت حد تک یہاں جو اس کی قواؤں میں لرزتی تھی۔ اچھے نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”نہ نہ جانتی تو کہنے پہنچے تھیں ڈراپ کر دیتے۔“

اچھے نے جیسے جان اپنا تھا کہ وہ اب نہیں رکے گا۔

”میں جانتی تھی تو آج کل کی سبب آتے ہیں۔ اللہ جانے آفس کے بعد کہاں کہاں مجھے جتے پھرتے ہیں۔ کئی آپ

نے پوچھا ہے کہ کیا مسئلہ ہے۔“

چند دن میں اس کی اس نے اچھے سے کہا تھا کہ اسٹریٹنگ سے پوچھ لے کہ کیوں پریشان ہیں اسے تو انہوں نے ٹال

دیا تھا۔ ”میں موقع ہی نہیں ملا۔“

”تم جاؤ گے کہاں شہی۔“

سمن کی آنکھوں کی پشت سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

”کیوں تو شہی۔“

”ہاں آج تو میرا کچھ سول ہوئی میں ہی جاؤں گا۔ بلکہ ڈاکٹر زوہر شہی میں میرا ایک دوست رہتا ہے فاضل امیر میں

بے آج رات وہاں جاؤں گا۔“

”تم ختم خاتمہ کہیں چلے جاؤں گی ان کیسے خالی سے بلند تخت تو اسلام آباد واپس چلے گئے ہیں۔“

اچھے کو اچانک خیال آیا تھا۔



”ہاں میں بات کرتی ہوں منہ سے۔“  
عذرا تیکم نے فوراً کہا تو میشر نے غوراً اس کے منہ خالہ کے ہاں رہنے کے خیال سے ان کے  
اضطراب میں کچھ کی سی ہلکی سی۔  
”تھیک ہے۔“

اے ان پر ترس مانتا۔  
”لیکن صرف مجھ دن میں زیادہ دن ہاں میں رہوں گا۔ میں نہیں چاہتا اباجان جو پہلے ہی ان سے خفا ہے ہیں  
مزید ناراض ہوں۔“

”میں کون سا ہاں چلے گا۔“  
سکے کے آنسو بھی ہاتھ رو کر قہقہے گئے تھے وہ مرکز پرچرائی چڑیں پہلے گا۔  
کتابوں کا ایک ڈھیر تھا۔ انعام کی مدد کرنے کی لیکن آنسو اس کی آنکھوں میں چل رہے تھے۔  
”بھئی بیٹا۔“

عذرا تیکم نے بھرائی توازن میں کہا۔  
”کیا تیرے دل میں کوئی گنجائش نہیں رہی غزالہ کے لیے ایک بار۔“  
”ہی جان۔“

میشر نے تپ کر انہیں دیکھا۔  
”ہاں صرف میرے دل کی نہیں ہے ابی جان وہ۔“  
”بھئی بیٹا ایک بار میں بات کر کے دیکھوں غزالہ سے۔ وہ اگر راضی ہو تو ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔“

میشر جانتا تھا یہ شخص ان کی اپنی سوچ ہے غزالہ بھی نہیں لے گی۔ اس نے غزالہ کی آنکھوں میں اس لئے جو  
خوشی دیکھی تھی اور جس طرح اس نے ایک فلاح کی طرح اپنے نزن کو دیکھا تھا اور میشر جس طرح سرور نچا لے دیا  
کے ہاتھ میں ہاتھ دے۔ وہاں سے کی گئی اور جس طرح جاتے جاتے اس نے ایک بھری گھڑیاں پر ڈالی تھی۔  
”اب میں طلاق دے کر نہ جانا گا کہ میرے ابا کہتے ہیں ہمارے اکثر گھرانوں میں جہلی نہ طلاق دینے کے  
بعد مکر جاتے ہیں اور بیویوں کو گھر میں بسا لے رکھتے ہیں۔“

”شباب۔“  
اس نے زرب کا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کا گھانا بندہ۔  
لیکن اس نے یہ سب عذرا تیکم سے نہیں کہا اور خاموشی سے کتابیں ایک جگہ میں رکھتا رہا۔

”میں ابی جون کروں گی غزالہ کو۔“  
اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے پھر کہا وہ تب بھی خاموش رہا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ اسے اعتراض نہیں ہے  
اور ان کے چہرے پر اطمینان چمک گیا۔ نزل واپس لے کر تو اس نے غزالہ کے متعلق اس سے ذکر نہیں کیا تھا چاہے  
بی کہ وہ اس پہل سے لگے تو نزل کو کافی اکل کا ڈرا کر پورے لے آیا تھا۔ وہ اسے اللہ حافظ کہہ کر سیدھا میاں صلاح  
الدین کے پاس گیا تھا اور ساری بات انہیں بتادی تھی۔ میاں صلاح الدین نے خاموشی سے اس کی بات سنی تھی  
اور پھر کہا تھا۔

”میں اس طرح منہ سے طلاق کا لفظ نہیں لگاتا چاہیے تھا بھئی۔“  
ان کے لہجے میں اسف تھا۔  
”حاجی صاحب سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ ہر حال میں ان سے بات کرتا ہوں۔“

”اس کا کوئی قاعدہ نہیں اباجان غزالہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“ دراصل وہ اپنے خالہ زادے شادی کرنا  
چاہتی ہے۔

اس نے جھجکے ہوئے بالا غروب ہاتھ انہیں بتادی تھی جواب کھدول میں چھپائے ہوئے تھا۔  
”تھکومت۔“

میاں صلاح الدین نے اسے ڈانڈا دیا۔  
”خدا ہر خواہ مخواہ فرمے مت قائم کر۔ اکلوتی بیٹی ہے لاڈلی ہے بس خد میں آگئی ہے۔ آخر کچھ کو نامی تم سے بھی  
تو ہوگی ہوگی۔“

ان کی جھلک نظر نے اسے اندر تک بھسم کر ڈالا تھا۔  
”اباجان۔“ اس نے احتجاج کرنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔  
”تھیک ہے تم گھر جاؤ میں دیکھا ہوں کیا ہو سکتا ہے۔“

اور وہ مزید بکے کے بغیر کہہ گیا تھا اسے یقین تھا کہ اب سمجھوتے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ لیکن آج میاں  
صلاح الدین نے اسے یاد کرنا تھا کہ نہ صرف یہ کہ خلع کا کس انہوں نے ڈانڈے سے لیا ہے بلکہ وہ چاہتے ہیں۔  
مقررہ مدت کے اندر غزالہ واپس چلی جائے تاکہ طلاق واقع نہ ہو چنانچہ کل کی وقت حاجی صاحب اور ان کی تنیم  
صاحبہ غزالہ کو چھوڑ چکی تھیں۔

”ہرگز نہیں۔“  
وہ عید پر کھڑا تھا تھا۔  
”اب ہرگز نہیں۔“

اس کی آنکھوں کے سامنے فلاح نظروں سے اسے دیکھتے غزالہ کا چہرہ دیا۔ غور سے گردن اٹانے مسخروا ذاتی  
نظروں سے اسے دیکھتی اپنے خالہ زادے کا ہاتھ میں اپنے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔  
”مجھے اب غزالہ قبول نہیں ہے اور میں اسے گھر میں نہیں رہنا چاہتا۔“

”موت۔“  
میاں صلاح الدین زور سے چیخے تھے۔  
”میں حاجی صاحب سے بات کر چکا ہوں اور۔“

”میں آپ کو ساری بات بتا چکا تھا اس کے باوجود آپ نے بات کی میں اس کا ذمہ دار نہیں۔“  
”یہ سچ ہے جو اس صبح میرے ہوا میں اس نے بھئی۔“ انہوں نے بوجہ نرم کر لیا۔  
”میں نے کہا تھا کہ اسے کہہ کر یو نہی خد میں آئی ہوئی ہے۔ حاجی صاحب خود شرمندہ ہیں۔ دیکھو بیٹا یوں لے  
بہانے کہہ نہیں آیا اڑا کر۔“

”لیکن میں اسے طلاق دے چکا۔“ میشر کا لہجہ حتی تھا۔  
”تم نے جیسا کہ مجھے بتایا ہے ایک طلاق ہی ہے تو گنجائش ہے۔“

”میں اسے نہیں۔“  
”تھکومت میشر۔“ میاں صلاح الدین پھر غصے میں آ گئے تھے۔  
”دیکھ جاؤ میرے گھر سے۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ آج کے بعد میرا تم سے ہر تعلق ختم۔“  
وہ غصے کی زبانی سے کہہ رہے تھے۔ ”تم نے مجھے حاجی صاحب کے سامنے سرائے کے قابل نہیں چھوڑا۔  
میری نظروں سے دور ہو جاؤ تم۔“ وہ حائل۔

”تھک ہے چل جاؤں گا لیکن اباجان میں سے فیرت نہیں ہوں کہ اس کے واضح اقرار کے باوجود اسے بیوی  
بنائے رکھوں۔“ غصے میں اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔  
”دیکھ کر چل جاؤ میرے گھر سے۔“ میاں صلاح الدین ایک دم اس کی طرف بڑھے تھے۔

”میں کہہ رہا ہوں میں تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ایک بار بھی نہیں۔“ اور وہ مزید کچھ کے بغیر ان کے  
کمرے سے نکل آیا تھا۔

انہیں اس کی مدد کر دی تھی۔ بلا کاغذ تھا اس میں جبکہ سمن اور عذر نامہ غامض پیش کیے اور دیکھ رہی تھیں۔  
 ایک کی زب چد کرتے ہوئے اس نے عذر نامہ ایک کی طرف دیکھا۔  
 ”میں اپنی کتابوں اور دستوں کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں لے جا رہا ہتا نتیجہ کا قیلا والد صاحب کو۔“  
 ”شعبی۔“ عذر نامہ ایک کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔  
 ”نہ جاؤ بیٹا۔ انہوں نے پھر التجائی۔“  
 ”مجبوری ہے اسی جان گیا جان مجھے اس گھر سے نکال دیے ہیں۔“  
 ”وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں بیٹا مجھے سن کر دیا ہو گا۔“  
 وہ ایک اور اپنی اٹھا کر کھڑا ہوا۔

”شعبی۔“  
 انہیں کاغذ جواب دے گیا وہ ایک سمن سے لٹ کر روئے گی۔ مشعر نے بیگ اور اپنی بیٹے رکھا اور اسے اپنے  
 ساتھ لاکر کھینٹنے کاغذ پر کی کو کھول میں آنکھیں سرخ لگا رہی تھیں۔ سمن جو ہوشدار میں تھا جانے  
 سکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یکدم سمن کی طرح کھڑے ہوئے۔  
 ”اے ارے میں زندہ ہوں ابھی۔“ اس نے بیٹنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ان کے آنسو اور تیزی سے بنے  
 چشمہ ہمارے بغیر کیے وہیں شعبی۔ ”عذر نامہ ایک کے آنسو رک میں رہے تھے۔“  
 ”آخر۔“ پہلے بھی تو آپ لوگ مجھے الگ کرنے تھے مجھے لاکر آپ نے مجھے الگ کر دیا ہے۔“  
 اس کی سرخ آنکھوں میں شگہ نظر آیا۔

”صرف تیری خوشی اور سکون کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا ہم نے۔“ عذر نامہ ایک نے روٹی آنکھوں سے اس کی طرف  
 دیکھا تو وہ دم کھڑا ایک کرنا ہوا آنکھوں کے لٹ ان کے سامنے بیٹھا گیا اور اپنے ہاتھ ان کے آنکھوں پر رکھے۔  
 ”اسی جان میں بھی آپ سب سے الگ ہو کر خوش میں رہوں گا۔ جانے کیسے ہوں گا آپ سب کے بغیر لیکن  
 مجبوری ہے۔ میں بتا رہوں گا۔ پلیز آپ روٹیں مجھے دعا دے کر رخصت کیجیے۔ ہر آن پر جو آپ سب میری  
 یادوں میں رہیں گے۔ میں نہیں جانتا میں خود میں جانتا کہ میں کیسے سچاؤں گا۔ وہی کی سکون گا نہیں۔“  
 اس کی آواز بھراؤنی اور پھر وہ ان کے آنکھوں پر سر رکھے روئے گا۔ عذر نامہ ایک کے ہاتھ اس کے ہاتھ بائیں میں  
 تھے اور وہ اسے غامض اور ادبی تھیں۔  
 ”نہ دوشی میرے دل کو کچھ ہوا ہے۔ ڈوب جائے گا میرا دل شعبی ہمارے آنسو میرے دل کو چیرے جاتے  
 ہیں۔“

کچھ دیر بعد وہ سنبھلا اور چوہو پختہ ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ سمن کے سر ہاتھ رکھا جو بونی ملک ملک کر رو رہی تھی۔  
 ”اور تم سونا بنا فاضل امتحان اچھی طرح سے دیا میرے لیے پریشان نہ ہوا۔ میں خوش ہوں بہت ایک مسلسل  
 عذاب سے نجات کی اور دیکھو اس کا جواب ضرور کرنا۔“  
 سمن اسی طرح روٹی رہی۔ میں کسے بھی کسی سے متاثر نہیں ہوں گا۔ اتنی اور۔ سمن کے لیے آپ فکر مند  
 مت ہونیے گا میرے سنا میں سن ہے کہ مجھے ان کے لیے کیا کرنا ہے۔  
 اس نے جھک کر بیگ اٹھایا تو اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں۔ دروازے میں کھڑا تھا۔ دولا پتلا  
 سا نوا سا دروازہ۔ ان چند سالوں میں کتنا کھلا تھا اس نے کالج میں اس کی دیکھی اور انتہائی سنجیدہ اور کم گو تھا۔ اس کے  
 ساتوں چہرے پر اس کی بے حد سادہ آنکھوں میں ہلکی سی چمک تھی لیکن اس وقت یہ آنکھیں کبھی بھی کسی الگ  
 رہی تھیں۔ سمن نے دیکھا کہ آگے بڑھ کر اس کا اپنی اٹھایا۔  
 ”مومن کی طرف جاؤ گے نا۔“  
 عذر نامہ ایک نے کڑا ہوا کراہ کر کہی ہوئی۔

”میں اس وقت اپنے دوست کی طرف جا رہا ہوں۔“  
 ”میں صحت سے بہت کر کے نہیں ہوں کرہوں گی۔ تم پھر اور صبر جانا۔ مجھے تسلی ہے کہ۔“  
 ان کی آنکھوں میں التجائی تھی اس نے انابت میں سر ہلایا اور ان کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے ہار کھل گیا۔  
 اسے ڈر ہو کر اگر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتہ نہ چلے گا کہ اس کے پیچھے اپنی اٹھاے چل رہا تھا۔  
 اور سمن کو یوں لگا رہا تھا جیسے اب وہ کبھی نہیں آئے گا یہ یکدم سمن کی اور سمن کے گنگ کر روئے گی۔  
 ”جانتی ہو سیدہ زینت فاطمہ وہ یہاں گیا تھا۔ چلی میں۔“  
 شادی کے پہلے پہلے کڑ کر سر جھکائے تھی سیدہ زینت فاطمہ کو دیکھا۔  
 ”وہ کتنا حسین اسے محاف کرہوں اور جرات دیکھو اس کی وہا سے بھی ساتھ لے آیا اپنی بیوی کو۔“  
 سر جھکائے تھی زینت فاطمہ پر انہوں نے ایک نظر اور ڈالی اور پھر سنبھلے گئے۔

زینت فاطمہ نے اپنے خشک لبوں پر دیاں پھیری۔ انہوں نے سر اٹھا کر شاہ کی طرف نہیں دیکھا تھا انہیں  
 چلی کی آنسو سران کاغذ شاہ کی کے ہاتھ سے سب کے ساتھ لے گئی تھیں۔ اوار کو کراہی سے سیدہ زینت فاطمہ  
 شاہ کی لبوں کی کوشش کر رہی تھی کہ یکدم سمن کی طرح کھڑے ہوئے۔  
 ”عظمتی کو تو کتنی مشکل سے لائی تھیں۔ وہی جانتی تھیں۔“  
 کتنی ہی رہا نے تھے اس نے لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح منائی یا تھا اور جب سے وہ چلی تکی تھیں غلطی  
 اپنے کمرے سے نہیں اٹھی تھی۔ ہر جناح اس کی دلی دلی آنکھیں دیکھ کر ہوا جانتی تھیں۔ وہ اس کے لیے کچھ  
 نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں انہوں نے کتنا سنجیدہ یا تھا سیدہ فاطمہ کی شاہ کو التجائی  
 تھی۔

”کتنی مت جاؤ شاہی نہیں ہا میں گے۔“  
 ”مجھے ایک بار کوشش تو کر لینے دیں پھولی کیا۔ میں تو مجھے ساری زندگی ملا رہے گا کہ میں نے بغیر کوشش  
 کیے بھٹا دروازہ لے دیے تھے۔ آخر وہ میرے بھائی ہیں۔ ہماری رگوں میں ایک ہی خون ہے۔ وہ اتنے پھول تو نہیں  
 ہوں گے پھولی میں۔“  
 لیکن وہ ان کی توقع سے کہیں زیادہ پھول تھے۔ انہوں نے بے حد حقارت سے انہیں دیکھا تھا۔  
 ”مگر تم پر اصرار کیا کہ شاہی ہمارے ساتھ نہ لائے تو میں گٹ سے اندر بھی نہیں نہ مجھے نہتا۔ جس دروازے  
 کو دیا ہے تمہارے لیے یہ دیکھا تھا وہاں میں کسے کھول سکتا ہوں۔“  
 ”دوایا اگر زندہ ہوئے تو مجھے محاف کر دیتے تھے لیکن ہے۔ ابھی میری اس غلطی کو محاف کریں۔“  
 سیدہ فاطمہ کی شاہ نے التجائی تھی اور پھر اپنے ہاتھ ان کے پاؤں پر رکھ دیے تھے لیکن انہوں نے پاؤں جھٹک  
 دیے۔ تب حمنہ نے درخواست کی تھی۔

”شاہی ہم نے رشتے استوار کرنے لائے ہیں۔ میں اپنے بیٹے سیدہ شجاع علی شاہ کے لیے آپ کی بیٹی کا رشتہ  
 مانگتی ہوں۔“  
 لیکن شاہی نے انہیں باتیں ہی نہ کھل کر نہیں دی تھی۔  
 ”آپ کی جرات ہے کہ کوئی بے بات اپنے منہ سے نکالے گی اور جو رشتے ٹوٹ جائیں وہ دوبارہ استوار نہیں ہو  
 سکتے۔“

”پلیز شاہی۔“  
 سیدہ فاطمہ نے پھر درخواست کی تھی۔  
 ”غلطی ان انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ مجھ سے بھی غلطی ہوئی۔ آپ بڑے ہیں محاف کریں۔“  
 تب سیدہ ابراہیم نے شاہی سے التجائی۔  
 ”شاہی کتنی لالا کو گھٹے گائیں۔ بہت آس لے کر آئے ہیں۔“





زینت فاطمہ کانپ جائیں۔ زندگی جیسے اس کی آنکھوں میں مرگئی تھی۔ کیا بلند جست کے بغیر یہ ذبحہ رہے گی۔ انہیں اس روز کی نئی ساری شکوہ و آگاہی انہوں نے بھرا اور اس کے چہرے سے نظرس ہٹائیں اور کسی قدر آنکلی سے کہا۔

”یہ کیا سر جھاڑتا ہے؟ ہوا بھاڑتے ہو اور فریض ہو جاؤ۔ اس کی ہنسی کے کپڑے نکال کے دو اسے۔“  
عقلی نے دکائی نظروں سے انہیں دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”زینت فاطمہ تم ابھر ہو۔“ لیلی جان نے دروازہ کھول کر اندر بھاڑا۔  
”لیلی جان۔“

”شادی کی خبر ہے جن کے تر شاہ رخ کو ساتھ لے کر شہر چلی جاؤ اور کچھ ضروری شاپنگ کر آؤ۔ ان کی بات ہو گئی ہے کہ راجی انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ التور کو صرف — رکی بات کرنے کے بجائے نکاح کر دیا جائے۔ عبد الغفار بھائی اور بھالی کو کوئی اعتراض نہیں ہے اس لیے التور کو اساتھ عقلی کا نکاح ہے۔ تم میرے کمرے میں آ جاؤ وہاں اس سبب بتاؤ کہ کیا کیا ہو گاتا ہے۔“ وہ بات کر کے دروازے سے بیٹھ گئیں۔  
زینت فاطمہ نے مڑ کر اس اور پھر عقلی کی طرف دیکھا۔ عقلی کی رنگ بگ بگ سفید ہو رہا تھا اور ہونٹ ہلے ہوئے۔ وہ لے لے کر زب سے تھوڑے لڑکائی۔  
”عقلی۔“ زینت فاطمہ نے اسے پکارا لیکن وہ یکدم لہرا کر نیچے مرگئی تھی۔ شاہ رخ اور اساتھ ایک ساتھ اس کی طرف لپکے۔



”ماہ تم تیار نہیں ہو رہی۔“  
”نزل لے کر آؤ۔“ انہیں منہ نہ لینے دیکھ کر پوچھا تو ماہ نور اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
”مجھے نہیں جانا تو ماہ تم سب ملے جانا میں آیا اور دادی کے ساتھ کھڑی رہی۔“  
”اور عینا تھا میں نے تم سے دوست ہے تمہاری۔“ تم اس کی ہنسی میں شریک نہیں ہو گئی۔  
”وہ تھا نہیں ہو گئی۔“  
”ماہ کیا بات ہے تم اداس لگ رہی ہو۔ بلکہ جب سے میں لاہور سے آئی ہوں تم بہت اداس اور پریشان دیکھتی ہو۔“

”ہاں نہیں تو وہ ہم سے تمہارا۔“ ماہ نور نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔  
”کیا خضر بھائی تم سے ناراض ہیں۔ میں کبھی ذرا کی دیر کو آئے اور چلے گئے ان کا موڈ خراب تھا۔ بلکہ کلک مایوں کے فکشن میں بھی ان کا موڈ سچ نہیں لگ رہا تھا۔“  
”میں وہ سمجھ سے ناراض نہیں ہیں۔“ ماہ نور نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔  
”ہاں عینا۔ عینا نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ اس کی بھائی نکلتی آگے ہیں۔“ نزل اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔  
”جب انہیں اس کی بھائی سے شادی نہیں کرنا پڑے گی تو ان کی خوب کیوں دکھائے تھے۔ کیوں اپنی خیریت کا یقین دلا تھا کہ کیا یہ خیریت ایسی ہی ہوتی ہیں اتنی ہی ٹھیک۔“  
”چائیں نزل محبت ہر مل میں اس دل کے حساب سے ہی ہوتی ہے۔ کی دل کے لیے محبت ایک کھیل ہے۔ اور کی دل کے لیے زندگی۔“

”عاطف بھائی کو آپ نے دیکھا ہے۔“ یہ ہے نہ۔“ نزل ماہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
”نو کچھ میں خوب صورت اور اسارت سے ہیں۔ میں نے عینا کی عقلی کے فکشن پڑھ دیکھا تھا اور۔“ ماہ نور نے بتایا۔

”ہاں اسنو بھائی سے بھی آگے ہیں۔“  
”نہا نہیں میں نے موازنہ نہیں کیا۔ اسنو بھائی کی اپنی شخصیت ہے عاطف بھائی کی اپنی۔“

”اسنو بھائی ہر گز نہیں گلے ہیں۔ بہت شاندار۔ ایک سار ہسپتال آئے تھے ناشی کو لینے تو انکو کمرہ عینا کے رہی تھیں شبی سے کہ تمہارے بھائی کی شخصیت میں کتنا گریں ہے۔“  
”ہاں لیکن بات عینا کے دل کی ہے نہ۔“ ماہ نور بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔  
”اور دادی تو کسی کو بھی پسند نہیں آتی تھان۔ انہیں افضال مایوں کو نہ خضر ہو۔“  
”جس رشتے میں لڑکے اور لڑکی کے والدین شامل نہ ہوں ان کی رضامندی نہ ہو وہ بہت سارے پائیدار ہو آئے۔ عینا نے خضر نے عینا کو بھجایا تھا۔“

”عاطف میں بظاہر کوئی خالی نہیں لیکن اس کے کوہو اپنے والدین کو راضی کرے۔“  
”یہ ممکن نہیں ہے لیکن — عاطف نے پہلے یہ بات کہا تو دادی تھی۔“  
اور سب کو عینا کی خدمت کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور تھے۔ افضال مایوں کو بہت دکھ تھا۔ انہوں نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ وہ اسنو اور عینا کا رشتہ کریں گے اسنو کے بات کرنے سے بھی پہلے جب اہل جان زندہ تھے۔ تب سے عینا کے لیے یہ بھجایا تھا۔

”وہ خضر پر اڑی ہوئی ہے اس کی بات میں دل مان چاہیے ہیں۔“ ماہ نور ان کا بھی خیال تھا کہ جب اہل اور خضر پر اتر آئے تو بہت سی باتیں ہوں گی کہ اس کی بات میں اہل جانے۔  
وہ نصیر احمد خان سے ملے آئے تھے تو بہت ریت تک کہ کا اظہار کرتے رہے تھے۔ خضر بھی ان کے آنے کے چند دن بعد آیا تھا۔ خضر کے آنے سے وہ بہت خوش ہوئی تھی ایک دم چلی چلتی۔ کتنے بہت مارے مسائل تھے جو اسے خضر سے ڈسکس کرنے تھے۔

کتنی بہت ساری باتیں خضر کو اسے تھکائے جاری تھیں اب خضر آیا تھا تو اس سے سب کچھ کہہ سکتی تھی لیکن آئے ہی پہلے تو وہ عینا کے مسئلے میں اٹھ گیا اور پھر عینا کی عقلی اور سادگی کی شادی کی تیاری۔ اس روز وہ بہت بھیجی ہوئی تھی ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے اس لیے جلدی لیٹ گئی تھی۔ دادی نے دوبار آکر اس سے پوچھا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک ہے یا کیوں جلدی لیٹ گئی ہے۔ تو اس نے انہیں سلی دی تھی۔  
”ہاں دادی ان آٹس میں بہت کم زیادہ قیامت تھک گئی ہوں جلد ہو جاؤ گی۔“ اس نے انہیں تسلی دی لیکن نیکو اس کی آنکھوں سے سدر تھی۔

آٹس میں کام تو مشکل نہ تھا اس نے بہت جلد سب سمجھ لیا تھا لیکن پچھلے دو تین ماہ سے شاہ زیب شاہ کا رویہ اسے الجھا رہا تھا۔ کبھی تو وہ وہی ہے یہ مقتدر اسے آٹس میں ملا لیتے اور یہ کار کی باتیں کرتے رہتے۔ ایک دو بار اسوں نے اسے باہر لھانے کی دعوت دی تھی وہاں بھی اس نے مندرت کر لی تھی۔ لیکن شاہ زیب شاہ کی مصیبتاں بدلتی جا رہی تھیں اور آج جب انہوں نے اپنے نفس میں ملایا تو وہ سداور تسلی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”مس غلام۔“  
”جی۔“  
”کون کی فائل دلو۔“

کل انہوں نے اسے کچھ فائل لائے کہ کہا تھا ان کو کے ملائے پوچھا مگر اپنے ساتھ ہی لیتی آئی تھی۔  
”مس خان آپ کے بھائی کا کیس مل گیا۔“

”جی۔“ اس نے حیران ہو کر انہیں دیکھا تھا۔  
”آپ نے تو نہیں بتایا مس لیکن ہمیں اپنے دور کر کے ہر معاملے کی خبر رکھنا ہوتی ہے ہر حال میں نے آپ کو اس لیے ملا دیا تھا کہ اس سلسلے میں اگر کسی بدی ضرورت ہو تو بتائیے گا مجھے۔“  
”جی جی نہیں کسی چلی رہا ہے۔“  
”بہر حال مجھے آپ کے ہر لمحہ حالات جان کر افسوس ہوا آپ کو کسی بدی ضرورت ہو میرا مطلب ہے اہل بدو۔“

اس نے دروازہ کھول کر چیک بک لگائی۔  
 ”نوبت تو سیرایا کچھ مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ گہرا کرکھی ہو گئی تھی۔

”رودھ فائل۔“  
 ”ہاں وہ حاملہ انٹرنیٹ زری فائل میں رکھ جائیں اور۔۔۔ اس نے بات نامکمل چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔  
 ”مس خان آپ ریٹائرنگ لگ رہی ہیں۔ ہم آپ کے اپنے ہیں۔ سیرا مطلب ہے کہ یہاں سب دور کر رہا ہے۔  
 لیے ایک خاندان کی طرح ہیں اور ان کے مسائل کی شہر کرنا ان کی ریٹائرنگ دور کرنا ہمارا فرض ہے۔“  
 ”جی جیٹک پورس۔“ اس نے تھوکر نکل کر بھٹک جیٹک جواب دیا تھا۔  
 ”کیونکہ مجھے ایسی کوئی پریشانی نہیں۔“

”وہ کہ آپ جا سکتی ہیں۔“  
 وہ اپنے بزمین میں آگئی تھی۔ اس کے بعد شاہ زب نے اسے نہیں بلایا تھا بلکہ وہ جلد ہی آتش سے اٹھ گیا تھا۔  
 ”آپ چلنے کے نہیں گئے۔ میں چلنے کے لیے جا رہا ہوں۔ آئیے آپ بھی آجئیں۔“

”سوری مرہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ اس نے معذرت لگائی تھی۔  
 شاہ زب نے بھی دوبارہ نہیں کہا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی لمحے بعد شاہ زب نے ریٹائرنگ کرنا کہا تھا۔ اسے یہ جاب چھوڑ  
 دینا چاہیے۔ اس کا دل بار بار کہہ رہا تھا۔ اسے شاہ زب کی نظروں سے خوف لینے کا تھا۔ اسکول میں کمریوں کی  
 چٹھیاں تھیں اور مسز مراد ان دونوں اپنے بھائی کے پاس لگی ہوئی تھیں۔ ان کی شادی بھی ورنہ وہ ان سے  
 اجناس مسئلہ ضرور ڈسکس کر لیتی۔ اسے مسز مراد پر بہت حسرت تھی۔ ان دونوں خود بھی کتنی ضروری ہو گئی تھیں اور  
 کس قدر پریشان رہنے لگی تھیں۔

”آج چھاپے سے مسز مراد آپ بھائی کے پاس جا رہی ہیں تو کچھ دن وہاں رہ لیں۔ اسکول میں بھی چٹھیاں ہیں اور آپ  
 کی طبیعت بھی بہل جائے گی۔ سنا دل لے لے۔“

”مجھے جاب چھوڑ دینا چاہیے۔“ سب نے لے لے لے لے اسے سوچا تھا لیکن اس سے پہلے کوئی ہی جاب تلاش  
 کر لیں وہ ڈسکس جس آئیڈیہ کا بتایا تھا مسز مراد نے وہاں بتا دی تھی۔ لیکن میرے پاس تو مسز مراد کے بھائی کا  
 فون نمبر بھی نہیں ہے۔ حالانکہ جانے سے پہلے وہ اس نے اپنے فون اور انہوں نے بتایا تھا کہ شاید وہ یہ بھائی  
 وہاں ہی گزار لیں۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ اس سے وہاں کا نمبر لے لے۔ لیکن وہ نمبر لینا ہی نہیں لے۔ وہ  
 منوں کے متعلق باتیں کرتے ہوئے چلی گئی تھیں۔

”گھوڑیاں وہ تو تھیں۔ منوں کے جن میں صرف ایک لڑکا تھا جس نے گواہی دی تھی کہ بھگوا منصور کا نہیں ہوا  
 تھا بلکہ وہ سرے سے لڑکوں کے درمیان تھا اور منصور نے تو انہیں چھوڑنے کی کو خوش کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ  
 جھگڑے سے پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔ لیکن وہ بات پورے سچ سے نہیں بتا تھا کہ کون کون سے لڑکے لڑکیاں  
 تھی خاص طور پر کون سے لڑکے پڑھ کر دیا تھا۔ ولید باپو اس سے پوچھ رہے تھے۔“

”اور سچی بھی ہے کہ لڑکا لوگ بھی مارے جاتے ہیں ماہ۔ لیکن کیوں؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“  
 ”اسے سمجھ کر مٹاؤرنہ لانا۔“ اس نے ولید سے انتظار کی بھی جب ولید نے اسے کھڑا کر دیا تھا۔  
 اور پورے لوگ کیسے غیب اور کمزور لوگوں کا اکتھال کرتے ہیں۔ وہ کتنی تک پریشان رہی تھی لیکن وہ کچھ کر  
 بھی تو نہیں سکتے تھے اور منوں وہ تو جیسے ہر خوف سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

”کہہ لانا کہ میری رہائی ضرور ہوگی تو میں رہا ہو جاؤں گا۔ گناہ اور اگر نہیں تو ابالہاں اور وادی سے کہنا وہ اللہ کی رضا  
 سمجھ کر قبول کر لیں ہر فیصلہ۔“  
 وہ جاب کے متعلق سوچتے سوچتے منصور کے متعلق سوچنے لگی تھی اور بات نہیں منوں کا کیا ہو گا۔ خضر بھی تو  
 یہاں نہیں ہے اور ولید آج کی چٹھی سے اتنا باپو اس تھا۔ کیا وہ لیں گے بھی باپو کا اظہار کر دیا ہے۔ وہ خضر کے

معلق سوچنے لگی تھی۔ اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے خضر کو کچھ صدیاں بیت کی ہوں۔ پتا نہیں خضر بھی مجھے اتنا ہی  
 یاد کر رہا ہے جتنا میں۔ اس نے بھی فون پر بتایا تو نہیں تھا۔ جس کی سب سے پہلی بے باکی کا اظہار میں کیا تھا۔ تب ہی  
 دروازے پر دستک ہوئی تھی اور پھر زبلی اور وادی کی آواز آئی۔  
 ”خضر بھائی آئے ہیں۔“

وہ یکدم مٹا کر کھینچ لگی تھی۔ وہ دھڑ دھڑ کرتے لگا تھا۔  
 ”آئی، اور خضر ہیں۔“ وادی بتا رہا تھا۔  
 ”ہاں اور وادی اور شاہ زب بھی نماز پڑھ رہے ہیں۔“ وادی نے اطلاع دی تھی۔  
 ”آج صبح۔“ خضر کی تواضع میں چکار مچا رہا تھا۔  
 ”تو پہلے چل کر ہمسایہ آئی کی طرف چلتے ہیں۔ جاگ رہی ہیں نا۔“ خضر پوچھ رہا تھا۔  
 ”ہاں وہ اور خضر اس کمرے میں باہر چل دیں۔ وہ دنائے کرینے سے اتنی آڑ تھی۔ تب ہی خضر نے اندر قدم  
 رکھا۔“

”السلام علیکم۔“ خضر کی نظروں اس کے چہرے کی طرف اٹھیں تو پھر پلٹنا بھول گئیں۔  
 ”کیسی بھولہ۔“ اس کی تواضع کو بوجھ لے لگی۔  
 ”مجھے کچھ کمزور نہیں ہوئی ہو۔“ وہ قریب آیا تو وادی کی چلیں کر لے لیں۔  
 ”آپ نہیں ہیں۔“ وادی کو کھینچا نہیں لیکن آج کچھ محسوس ہو رہی تھی۔  
 ”میں آج بھلا ہوں۔ لیکن یہ بلکہ بہت سہل آئی ہے۔ یہی ہوا کہ کچھ لے لے لے لے ہمارا قصور نہیں ہوا۔“  
 وہ بیٹھا ہوا بلا تو وادی اور بھی پڑ پڑ لگی۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتا رہا لیکن خضر اس پر چلی شغف۔  
 ”آج یہ میرا کب بجے گا ہوں۔“ اس نے اس سے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔  
 ”پہلے سوچا کل آؤں گا لیکن یہاں اس شہر میں ہو کر رہا تھا کچھ آج حالانکہ ماما کہہ رہی تھیں کہ

انہیں ضروری بات کر رہے۔“ وہ وادی سے اسے تک رہا تھا۔  
 اس میں خضر کی شہرت سے مجھے احساس ہوا کہ یہاں کم نمبر لے لے سکتی ضروری ہے۔ یا رتم تو میری دگ رنگ  
 میں لوہن کر دیتی ہو۔ سوچ رہا ہوں اب جانا پڑا تو تمہیں رخصت کروا کے ساتھ ہی لے جاؤں گا کیوں ٹھیک ہے  
 وہ کچھ نہ کہہ سکی تھی ابھی اس وقت وہ بھلا اس کے کہتی بھی تو کیا وہ جانتا تو تھا سب کچھ ابھی کہاں۔ ابھی تو  
 منوں کا کچھ باتیں تھا منں کا کوساں سب کچھ نہیں ہوا تھا وہ یہاں آجانی تو دور وہ تو جیسے بیش کی طرح اس کے  
 دل میں آکر کچھ رہا تھا۔

”خضر پریشان کیوں ہو گئی ہو وہاں کیا میں نہیں جانتا سب تھوڑی دیر کو خوش تو ہو لینے دیوار ویسے صرف کچھ گ  
 متعلق خضر خیال سے۔“ خضر اس سے اسے دیکھ رہا تھا۔  
 ”خضر جی جب تم کو سب تکم کر دھڑلے سے اپنے جذبات کا اظہار تو کر سکوں گا کیوں ٹھیک ہے نا۔“

اور جب بے اختیار ہی وہ دم کی مسکراہٹ اس کے لبوں ابھری تھی۔  
 ”خضر بے اختیار میں چلی بارم مسکراہٹ میں تو۔ منوں کے تیس کے متعلق ولید سے سب تفصیل معلوم ہوئی  
 رہتی ہے خضر جانتا تھا کچھ لہجہ میں ہمارا اسکول۔“  
 ”اسکول کی جانب تو میں نے چھوڑ دی تھی۔“ لہجہ میں یکدم ہی اس کی طرف دیکھا تھا۔  
 ”کہہ۔“ خضر نے مجھے بتایا کہ میں اور کیا کر رہی ہو آج کل۔“

اس کے چہرے پر پریشانی کی نظر آئی۔  
 ”جیسے جہل میں سب۔“ خضر نے اتنا خبر کیا تھا اور۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ میرے دور چلے جانے سے  
 ہمارے درمیان کیا فیصلہ ہوا ہے۔“ اس نے گلہ کیا۔



کل رات باؤں کے گفتگو میں اس کا مودتاً خراب تھا وہ دعا کے ساتھ کھڑی تھی جب حضور کو اس نے انتہائی خراب موڈ میں دیاں سے گزرتے دیکھا تھا اور پھر بے اختیار اس کے پیچھے نہ گئی۔  
”خضر کیا بات ہے۔“

”کچھ نہیں جاؤ گے۔“ اس نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی تھی۔ اور آگے بڑھ گیا تھا۔  
وہ دیاں بڑی لمبی ہو گئی تھی۔ اپنی پوری زندگی میں اس طرح اس کے لیے تو یہ بات نہیں کی تھی خضر نے پھر اور رات کو جب ولید اس میں چھوڑنے آیا تھا تو اس نے خضر کی ہر نائی گازی کی بات نہیں کی تھی خضر نے وہاں کے دروازے پر ہاتھ رکھے مگر ان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی وہ کچھ کہہ بھی رہی تھی لیکن ماہ نور نے سنائیں خضر کی پیٹھ اس کی طرف تھی وہ جلدی سے گازی میں بیٹھ گئی۔  
”ولید مینا آپ جاؤں گا اور یہ کور کے ساتھ چلے جائیں گے۔“ طیبہ خاتون نے ولید کو منع کیا تھا۔  
”تھک جائے۔“

”لیکن بھلائے کیا تھا کہ میں خود جاؤں آپ کے ساتھ۔“  
دو تین گانیاں سن کر ماہ نور کے انہوں نے بڑا کر رکھی تھیں لیکن مسمانوں کے آنے جانے میں پرالہم نہ ہو۔  
خضر نے ولید کی آواز میں کمر کرنا دیکھا لیکن ان کی گازی کی طرف نہیں آیا تھا۔  
”تھک ہے ولید مینا آپ جاؤ۔“

”خضر خدا سے۔ اور خدا خوب صورت بھی تو مت ہے۔ اور پھر کتنی دولت مند ہے۔ سعیدہ آئی اور علینہ کو گئے۔“ جب اس کی آنکھوں میں نمی کی گھل گئی۔  
صرف وہ بتیں میں خضر خدا سے متاثر ہو گیا۔ خدا ان دنوں علینہ کی شادی کے سلسلے میں تقریباً روزی علینہ کیسے آ رہی تھی۔  
”روا میں جاؤ پھر نہ دیکھو استری کرلو۔ میرا خیال ہے آج ماہ نور سے بھی مسمان آجائیں گے۔ تم کو گول کو دیر نہ ہو جائے۔“

ماہ نور نے اپنے خیالات سے باہر آتے ہوئے نزل سے کہا۔  
”اب اربع گانوں آیا تھا۔ حسنہ خالہ شام اور قادی انگل آرہے ہیں۔ ماسوں جان کے گھر سے عذرا خالہ، ماہ نور اور انتم آئی آ رہی ہیں۔“  
”میں اور سعیدہ نہیں آ رہے کیا۔“  
”سعیدہ تو گھر پر نہیں تو آتا بیٹا تو تھا میں نے آپ کو اور اسٹری بھی ان کا دل نہیں چاہتا ہو گا۔“  
نزل افسردہ ہو گئی تب ہی باہر سے سادی نے کواڑی دھونے کھڑی ہوئی۔  
”تو پھر آپ کو نہیں جانا۔“  
”میں۔“

\*\*\*

دونوں انڈوں کا ٹکے بنائے سر کے نیچے رکھے میسر آ گئیں بند کیے کچھ سوچ رہا تھا جب دروازے پر بتل ہوئی۔  
میسر نے آنکھیں کھول کر پہلے گائی موڑ کر وقت دیکھا پانچ بج رہے تھے وہ باہر سے تین بجے گھر آیا تھا اور تب سے پوئی لیٹا ہوا تھا۔  
دو گئے گھر گئے تھے اور اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا اور اپنی روز سے ہوا تھا وہ پوئی بیٹھے بیٹھے کھانا کھا رہا تھا۔  
ماہ نور نے زندگی نے اس کے ساتھ خوفناک کیا تھا اس کی کچھ نہیں آتی تھی۔ پہلے اباجان نے غزالہ کو زندہ تو اس کی زندگی میں شامل کیا اور پھر بتیں دیا وہ ہوتی دوا بھی کھڑا ہو گیا ہر اسٹری سے کچھ کچھ اور بھلا سے۔ اندر آ کر انہوں نے اپنا بیٹا پاپ۔  
پاپ کیل پڑا رکھا اور گرنے کے سے انداز میں صوبے پر بیٹھ گئے وہ سیدھے آگے سے اڑ رہی آ رہے تھے۔  
”کیسے ہیں آپ اور گھر میں بے نیابت ہے۔“

”ہاں۔“ مسر نے رات کی ڈرنگا میں اٹھا کر اسے دیکھا۔  
”ہاں گھر میں اباجان، مسمان اور سادی میں باقی سب تو کل کراچی چلے گئے۔“  
”کیوں تو میرے۔“ میسر نے ان کی دواں سے نہ تو گھر فون کیا تھا اور نہ ہی اس کی اسٹری ماہ نور سے ملاقات ہوئی تھی۔  
پاپ نے بت پروردہ اپنے دوست ڈاکٹروں کے ساتھ مری اور تھیا کی ویڈیو کیا ہوا تھا۔ وہاں سے آیا تو بخار نے گھر کیا آج وہ گھر فون کرنے کا سوچ رہا تھا۔  
”کس کی۔“ میسر نے پوچھا۔  
”علینہ۔“  
”کیا۔“ میسر چونکا۔

”کہاں ہو رہی ہے۔“ بے اختیار اس کی دواں سے نکلا۔  
”ہاں نہیں شاید علینہ کی دوست سے۔“ ان کے لیے میں یکدم ہی حشکن اتر آئی تھی۔ میسر نے بغور انہیں دیکھا۔ پاپ نہیں کیوں ایک دو بار اسے گمان نہ کر تھا کہ اسٹری بھی علینہ کو پسند کرتے ہیں۔ اسٹری گاہیں پیچھے کیے پاپ نہیں کیا سوچ رہے تھے۔ باوجود بے تکلفی کے وہ اسٹری سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ کیا وہ علینہ کو پسند کرتے تھے۔ کچھ پھر ولید اسٹری سے تھا کہ وہ اسٹری لایا۔  
”مگر کس نے میری سے میں نے ایک چکر لگایا تھا تمہارا فٹن لاک تھا۔“  
”دو تین روزہ ہوئے ہیں۔ اتنے ہی بکلا ہو گیا تھا شاید تھکات کی وجہ سے۔“  
”تو تم مجھے توں کر رہے۔“ مسر یکدم پریشان سے ہو گئے تھے۔  
”اب یہی طبیعت ہے۔“  
”اب تو تھک ہی ہو۔“ وہ مسکرایا۔  
”میں ان کی تھک میں شام کے ساتھ چلے رہے اور بتایا تک نہیں کہنے کیا اپنی سمجھے ہوا بھی تھی۔“

اسٹری کو اس پر بڑا تھا۔  
”دو تین نہیں اسٹی بھائی کی بات نہیں سے معمولی مگر پچاس لے آپ کو پریشان نہیں کیا۔“ وہ شرمندہ ہو گیا تھا اسٹری بھی لگتا تھا لیکن سمجھنے سے اس کا دور بھی عبت کرتے تھے اس سے جب وہ گھر سے نکلا تھا تو سب سے بڑا گھر تھا۔  
ہو رہا تھا کبھی تو جی پچھتا کہ جس زندگی میں گھر لے لیا اباجان نے اس کی بات کو سمجھنے کی زمت نہ کی تھی۔ کتنا کچھ وہ ان کے ساتھ اس نے غزالہ کے ساتھ۔ انہوں نے غزالہ کی ہر قسم کی موہاف کر دیا تھا اور اسے۔ اسٹری بھی تب گھر پر نہ تھے۔ لیکن جون ہی وہ آئی سے گھر آئے تھے اور انہوں نے انہیں اس کے جانے کا پتا چلا تھا وہ انہیں قدموں اس کیس آئے تھے۔  
”گھر سے نہیں چلے آئے تھے۔“  
”اباجان کا حکم تھا۔“

”دو چار دن میں اباجان کا قہر آ جاتا تھا۔ جس میں اباجان سے پچھتا ہوا میرے ساتھ گھر چلو۔“  
”اباجان نے آگے آگے انداز میں اپنی شکل نہ دکھائی۔“  
”سعیدہ! چلو کہو دن وہ لوگ ہیں اس طرح اپنی گھر نہیں چھوڑتے۔ مجھے بھی تو اباجان نے کتنی بار کہا کہ یہاں نہیں رہنا چاہتے تو چلے جاؤں والدین کے قہر سے گھر کو چھوڑنا ہے۔“ لیکن اس نے تو سوچ لیا تھا کہ اب وہ گھر میں جائے گا۔ مگر اسٹری نے اسے قائل کر لیا تھا۔  
”میں جان کی خاطر میں اسٹری کے لیے کہہ رہا ہوں۔ یہ معافی مانگ لینا لیکن ابھی نہیں۔ دو چار روز میں تمہیں لے جاؤں گا میں اسٹری تب تک ان کا قہر نہ چکا ہو گا۔“  
اور تب وہ خاموش ہو گیا تھا اسے بھی جب سے وہ آیا تھا ہی، مسمان اور انہوں نے اسے سب سے بڑا کہہ رہے تھے حتیٰ



کہ خاموش طبع سادہ فطرتی جو کم بولتا تھا۔ بس اپنے آپ میں مگن رہتا تھا۔ بڑھاپی اور کپیڑہوئی پچیسپاس تھیں اس کی ہر جگہ جب گہٹ پر اسے اللہ حافظ کہہ رہا تھا تو اس کی آنکھیں ہمہ دوری تھیں تب مہر نے پرے اختیار اسے لگے گا تھا کیا۔

”مڑ جھٹے سے ملے رہتا یا۔“ کوہد مڑنے سے پہلا بڑا تھا۔

وہ اباجان سے بہت فٹا تھا انہوں نے اس کا ٹوٹف کچھائی نہ تھا لیکن میاں صلاح الدین اس سے زیادہ اس سے فٹا تھے اسفر نے جب ان سے درخواست کی کہ وہ میشر کی غلطی کو معاف کر دیں اور اسے گھر آنے کی اجازت دیں تو وہ بیٹے سے چلا گئے تھے۔

”ہرگز نہیں اسفر میاں یہ غلطی معمولی سی نہیں ہے گھر آسانی سے نہیں ہستے اور نہ ہی شادی بیاہ کی مکمل ہوتا ہے کہ یوں خوں میں نہ مرنے تو ڈیرا جائے۔“

حاجی صاحب نے اور ان کی تنبیہ نہ کی تھی طرح ان کے کان بھر دیے تھے۔

اسفر نے اپنی سی۔ کو شش کی تھی۔ لیکن میاں صلاح الدین کے فیصلوں میں چلک نہیں ہوتی تھی کبھی بھی نہیں۔

”آپ یونی اباجان عظیمہ لگے بیٹے ہیں اسفر بھائی۔ میں انہیں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔“ ایک روز جب اسفر نے اباجان کے متعلق بتایا تو مہر نے اسفر کی طرف سے کہا تھا۔

”آپ پیرا پیرا بار بار اباجان سے نہ میرے متعلق رو نہ وہ آپ سے بھی ناراض ہو سکتے ہیں۔“

اور اسفر نے اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ ہر گھر اس کے ساتھ ہی تھے۔ اگر طلاق کو قانونی شکل دینے میں ان کی مدد شامل بھی تو حنہ خالہ کے گھر بھی وہ اسے زبردستی لے گئے تھے اور وہاں ہی اس کے جانے کے بعد وہ ای جان اور

انہم سمن کو ملانے لائے تھے اسے لیکن اس نے وہاں حنہ خالہ کی انکس میں رہنا مناسب نہیں سمجھا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے معاملے سے نزل کے لیے کوئی مسئلہ بنے اور پھر قلیٹ لینے میں بھی اسفر نے یہ مدد کی تھی اس کی اس تو اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ ایڈوائس دے سکتا کہ وہ کچھ لینے کی طرح ہی اس کا خیال

رکھتے تھے۔ فون تو روزی کرتے تھے اور ہر دوسرے تیرے دن خود بھی پھر لگاتے تھے اگر اس طرح اسفر بھائی اس کا خیال نہ رکھتے تو وہ تو شاید کبھی ہی ہو جاتا۔ یہاں اس فلیٹ میں بھی کئی بار وہ سمن انہم اور ای جان کو اسے

ملوانے کے لیے لائے تھے۔ مڈر بھی مینے میں ایک دن پھر لگایا تھا لیکن پھر بھی رات کو جب وہ ستر لیتا تو انہیں پھر آتش نہیں سے لے کر اب تک زندگی کے واقعات انھوں کے سامنے کی طرح ملنے پڑے۔

اباجان بھی اسے بھڑا دیتے تھے اپنی تمام تر سخت مزاحی اور ڈیٹیر شپ کے باوجود انہوں نے کبھی کسی مقام پر کسی چیز کی ہی نہیں ہونے دی تھی اسے۔

”جیرا پ جو ہو سو ہو اپاری میں انسان کو اکیلا نہیں رہنا چاہیے۔ طبیعت زیادہ بھی خراب ہو سکتی ہے۔ اسے خاموش دیکھ کر اسفر نے کہا تو وہ چلا۔

”کوڑی بھی کسی قدر ہو رہے تھے رات کو تھیں سمن سے سوپ اور تنخی بنوا کر دے جاؤں گا۔ وہ شفیق و نظروں سے اسے دور رکھے تھے۔

”میں اسے پہلی اپنی کئی غلطی کوری نہیں ہے۔ اور آپ انہیں سے سیدھے اصرار ہی آپ سے ہوتا۔“

”ہاں سمن نے بھی تاکید کی تھی کہ تمہارا پکا کر انہوں تم قیل قول بھی ایڈیڈ نہیں کر رہے تھے۔“

”وہ تو میری ہی باتیں ہیں کہ گیتا تھا۔ اس نے بتایا۔“

”ہاں تب ہی تو۔ مہریشان ہو رہے تھے۔“

”اسفر بھائی آپ فریض ہو جائیں تو میں کھانا کھا گیا ہوں۔“

”میں یار بھوک نہیں ہے۔“ انہوں نے صوفیہ کی پشت سے سر کاڑا

”مجھے تو بھوک لگ رہی ہے اور میں نے بہت زبردست چنچر چکھنا بتایا ہے۔“

”کیا۔ تم نے۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے سیدھے کمرے میں گئے۔

”یہ کچھ دھول سے لگتا شروع کر دی ہے۔ ہو ملوں کے کھانے کھا کھا کر ادب گیا ہے۔“

”لیکن تم کہیں بھلا کہاں پوچھ لگایا آتا ہے۔“ مزار بھی کئی دن ان سے ہو رہے تھے۔

”سر پرے تو کچھ ہی جاتا ہے بندہ سب پکاچھ اور پھر ہی کچھ زندہ ہوا۔“ وہ مسکرایا۔

”چائیں آٹھیں آپ بلکہ ہاتھ لے لیں اتنے میں کھانا کھا گیا ہوں۔“ میرا کوئی سوٹ لے لیں۔“ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسفر بہت بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک حزن سا مہر ہوا تھا۔

”میں یار مڑو میں اب اس کا سنا ہوا تھا کہ وہ ملتا ہوں۔“

”آئی کر دی ہے ہر فریض ہو جائیں گے۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا اور دارو دے ایک سفید کائن کا بیگ لے کر اس میں نکال کر اس میں دیا۔

”بڑے کھو ہو گئے ہو بھی۔“ وہ زبردستی مسکرائے۔

”جب زندگی یوں گرا رہا ہے تو پھر کھو تو ہوتا ہی بڑے گا۔“ بل کے اندر درود اٹھا تھا۔

”زندگی بیش ہی یوں تو نہیں گزر سکتی تھی۔ زندگی کو کسین نہ کہیں سے تو پھر شروع کرنا ہی پڑتا ہے۔ تم نے جاب تو دی لی ہے۔“ دراز اس جاب میں سیٹ ہو جاؤ تو میں ای جان سے بات کرنا ہوں۔ کہ وہ نزل کے لیے بات کر سیں خالہ جان سے۔“

”آپ کو کھو کے میرے کھول دیے زور سے دھڑکا۔“

”نہیں۔“ اسے اختیار اس کے یوں سے نکلا تھا۔

”کیوں۔“ مزار کو اس کے رد عمل سے حیرت ہوئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید مہر نزل کو لیند کرنا ہے۔

”میں جتنا نزل کو جانتا ہوں میرے خیال میں وہ تمہارے لیے اچھی رفیق زندگی ثابت ہوگی۔ حنہ خالہ بھی بہت تحریف کرتی ہیں پھر تمہاری ہمیشہ میں ہے۔ مہر حال اگر تمہیں کوئی اور لیند ہو تو۔“

انہوں نے ایک کمری نظر اس پر ڈال دیا کہ یہ بات سے کچھ نظر آئے گا تھا۔

”میں ایسا نہیں ہے۔“ ایک بار پھر اس نے اسے اختیار کرنا تھا۔ ”نص کسی کو لیند نہیں کرنا۔“

”تو ٹھیک ہے ای جان کر کہی ہے۔“ آج میں تو میں ایک بار پھر اباجان سے بات کرنا ہوں اور وہاں جاتے ہیں تو ٹھیک نہیں تو میں تو انہیں نا۔ اس سے کہہ کر اپنی بات کی جانتی ہے ساری صورت حال تیار کر۔“ اب کے مشرے بے حد جھجکی سے جواب دیا۔

”مجھے ایسا خیال شادی نہیں ان کے سے بھی نہیں۔ آپ کسی سے بھی بات مت کریں اور نزل کو ہم ہم

مت بھیجے گا۔ یہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ جس طرح خوالہ نے اس کا نام لیا ہے۔“

نزل نے جانے سے پہلے صاف کہہ دیا تھا۔

”نصی بھی اپنی عزت اور وقار میرے عزت ہے۔ تمہارے دل میں میرے لیے جو کچھ ہے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے اور میرے دل میں تمہارا جو مقام ہے وہ بھی تم جانتے ہو لیکن کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا کہ لوگ انگلیاں اٹھائیں اور خوالہ کو کامیاب جو جائے اس سارے معاملے میں خوالہ کوئی قصور وار بھی اور تم کہتے یہ صرف تم جانتے ہو۔ لوگ نہیں اور اگر ماموں جان نے میرے اور تمہارے حوالے سے ایسا اور مال سے کوئی بھی بات کی تو میں تو اس روز مہر جاؤں گی کبھی۔ میرے والدین پہلے ہی بہت ہی ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ انہیں مزید دکھ پہنچے۔“

اور وہ اب کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے نزل کو زور ای بھی انگلیف پہنچے۔ وہ نزل سے کتنی محنت کرنا تھا اسے نقص میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن وہ جب بھی اس کے متعلق سوچتا تو ذہن میں ایک بڑا بھرا ہوا یہ کہ

اور نزل بھی الگ تھے نہیں وہ عرصہ پہلے سے اس کے ساتھ ساتھ ہے وہ اسے اتنا جانتا ہے جتنا خود کو۔  
جب سے اسے آگئی ہوئی تھی کہ وہ نزل کی محبت میں ڈوب چکا ہے اسے محسوس ہوتا تھا یہ وہ ہر لوہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ مگر کوئی اور صورت کو نیند میں ہستے ہوئے ہوتے وہ اس میں خوشی میں گین وہ نہ تو اس کے حالات کی چیزیں پر کوئی غصہ نہ دیکھتا جانتا تھا وہ نہ ہی اس کے ذہن میں کیوں نہ ملتا رہا جانتا تھا۔ سو اس نے جانتے سے نزل سے کہا۔

”وہا آج مجھے اعتراف کرنے دو کہ تم میری جان اور دھن میں ڈھل چکی ہو تمہارا دل بہت خوب صورت ہے تم میرا سہارا بن چکا ہے۔ مجھے غم نہیں کہ تمہاری رفاقت میرا مقدر نہیں۔ میرے احساسات صرف تمہاری محبت کے احساس سے ہی شمار آؤ گے۔ وہ دور یہ کہ مجھے یہ سب احساس ہوئی وہاں میرا دل تمہارے وجدان کی مقدس دیوار سے ہر وقت لپٹا تھا رگڑتا رہے گا۔ ہماری یہ کیفیتیں بھی غم نہیں ہو گی لیکن میں اپنے سارے جذباتوں کو یوں چھپاؤں گا کہ اس کی آج تک نہ دیکھیں میں ایک ایسے گداور کی سزا دیکھتا ہوں جس نے نہیں کیا۔ لیکن وہاں تم مجھے خود سے محبت کرنے سے منع نہیں کر سکتیں۔ میں تجسب ہوئی ساری زندگی اسے دل کی تکلیف لفظ لفظ لکھتا رہا۔ تم شاید ایک خوب صورت لڑکی تھیں صاف بکلا سا جھوٹا کسی ستارے کی ابھری ہوئی۔ تم نے جو کیا ہے وہی صبح سے میں تم کھانا ہوں کہ تمہارے لیے میرے دل میں ذرا سماجی ملاں نہیں ہے۔ میں تو تمہارا میون ہوں تم نے اس وقت میرے دل پر اپنے لفظوں سے مرہم رکھا جب میرے چاروں طرف اندیرا اور ٹھنڈی تھی مگر تم اس وقت اپنے نرم اور مرہم لفظوں کے پھانے میرے دل پر نہ رکھیں تو شاید یہ اندیرا مجھے بھی نظر جانتا۔“

نزل نے تب بھی کچھ نہیں کیا تھا وہ اسی طرح خاموشی سے اس کو ہاتھی رہی تھی۔  
”کیوں میری جان! زندگی یوں کیسے کر دے گی تم تمام کیلئے۔ الگ اس قلیت میں جہاں کوئی بھی اپنا نہیں کوئی تو ہوسکتی تھی۔“ انہوں نے اسے یوں ہی خاموشی کوئے دیکھ کر پھر کہا۔  
”سنا ہے غزالہ کی شادی ہو گئی ہے اپنے اسی خالہ زاد بھائی سے تو پھر تم کیوں سرا جھکتو۔“

”سرا میں نے خود اپنے لیے بھجوری سے اسے بھائی۔“  
ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے یوں پر نمودار ہوئی۔  
”کیوں میں ہی اس کی بھائی بنی نہیں پہلے اب جان نے میرے لیے جو فیصلہ کیا تھا۔ وہ ایک الگ بات تھی لیکن اب تو یقیناً۔“ پہلے آپ کی شادی ہو چکا ہے۔“  
”میری۔“ سرخروں چوٹے جیسے میشرے کوئی انمولی بات کہ دی۔  
”میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ انہوں نے بے حد تنہائی سے کہا۔  
”شاید کبھی نہیں۔“ ان کا انداز تھا جتنا۔

”کیوں اسے بھائی۔“ میشرے کو اس کے حتی انداز پر حیرت ہوئی تھی۔  
ایک دوسرے کو کیا جانتا ہے کہ ان کی اوکھ میں محبت نے انہیں بڑا ڈالا تھا۔ ابھی تو جہان کے بے غم کے کانٹوں کے دل میں جھیسے تھے۔ کاش وہ اسے دل و دماغ سے نکال سکتے۔ لیکن انہیں لگتا تھا یہ ممکن نہیں اور علیحدگی محبت دل میں باکسر کی اور کو زندگی میں شامل کر لینا۔ یہ منافقت نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کوئی نہ تو نشان ان کے دل پر ڈالے تھے وہ بہت کم سے اور در در آتے تھے۔

”بس یوں۔“ والیہ لفظوں سے اپنی طرف کھینچنے مشرقی طرف انہوں نے دیکھا۔  
”میں سمجھا ہوں کہ میں شادی شدہ زندگی کے تقاضے سمجھتا ہوں۔“  
”لیکن بھائی۔“ میشرے نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے ٹوک دیا۔  
”اس وقت تو میں تمہاری بات کر رہا تھا مگر غور کرنا سوچنا۔ میں سوچتا ہوں اب ہر جانے سے پہلے تمہیں یہ کہ دوں تم اور احم تمہو کو۔“

”اتنی کے لیے جو شرت کیا تھا اس کا کیا بنا۔“ میشرے نے سب کچھ بھول کر پوچھا۔

”وہ لوگ دوبارہ نہیں آئے ابھی تک انہیں پسند تو بہت آتی تھی۔ اور وہ لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ لڑکا وہ اکثر ہے جنہ خالہ کے پاس مل میں ہی کام کرتا ہے۔ میں نے جنہ خالہ سے کہا ہے کہ وہ انہیں کسی کے نکاح اور طلاق کا تاویس کر دے کہ انہیں کوئی پر اہم نہ ہو لیکن یا میں چھپاتی تو جانیں سکتیں جب کہ اباجان کا اصرار ہے کہ انہیں کچھ نہ بتایا جائے۔“

”اباجان تو۔“ میشرے وہی منہ میں پڑا۔

”وہ چاہتے ہیں کہ ہم سب ان کی ڈیٹس کی ہوئی زندگی جنہیں اور اگر انکا کر کے تو جہان سے ملو کہ شروع ہو جائے۔“ میشرے انہوں نے کہن کے ساتھ کیا تھا۔ میشرے کے ساتھ۔  
”ہاں لیکن اس معاملے میں اباجان نے انہیں قائل کر لیا ہے اور جنہ خالہ نے شاید انہیں بتایا ہے سب۔“ وہاں دوسری طرف بڑے۔

”اؤ کھیں تم کھانا کھاؤ میں بات کر کے آتا ہوں۔“

\*\*\*

”چیسو۔“ سیدہ ان کے پاس بیٹھنے ہوئے آگئی سے انہیں بلایا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔  
”تم آج کان نہیں گھنیں اسی۔“  
”میں،“ سیدہ ان کے لیے کسی ایک ہشت بولدا پہلے بھڑو رہے ہیں۔“  
”اور غلطی۔“ کیا وہ بھی نہیں کی تو غور کی۔“ انہوں نے پوچھا۔ رات دور تک جاگتی رہی تھیں طبیعت پر بہت توجہ تھا اور نیند انہوں سے کوسوں دور تھی صبح کے قریب انہیں آگے کی جھلی اس لیے ابھی کچھ دیر سہلی تھی اور ابھی اپنے کمرے میں ہی تھیں۔ روز نہ ناشاد سب اٹھائی کر گئے تھے اور وہ اپنے سامنے جھکی اور اس کو پوچھ کر بیٹھا تھا۔

”ہاں میں نے تو بہت کم لیکن اس کاموزی نہیں رہا۔“

”میرا اور شمار چلے گئے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”ہی،“ چیسو شاہرہ بھائی نے بھی کیا تھا اب بھی منع کیا تھا اب بھی نہ چوگان ہے۔“

”وہ کہہ رہے ہیں شادیات کی طبیعت کچھ خراب تھی اور تک آپ کے کمرے کی لائٹ چلتی رہی تھی۔“  
”ہاں رات نیند نہیں آ رہی تھی۔“ انہوں نے ہنسی سے کہا۔

اور یہ ایک رات ہی نہیں بلکہ راتوں سے وہ صحیح طرح سے سو نہیں سکتی تھیں۔ جب سے چوٹی سے آئی تھیں تب سے یہ چین تھیں اور اپنی بے چین کا جب خوب ہی انہیں سمجھ میں آ رہا تھا۔ کس کچھ بھی تو کیا نہیں تھا۔ وہی سب جو برسوں سے وہ بچتی چلی آ رہی تھیں۔

شادی کی غلطی۔

لیلیٰ کی گداہی غور اور غلطی۔

یہاں پہلے کب کسی کو حسب آرزو ملا تھا۔ اب عظمیٰ ۴ ماہ کو ہی مل جاتا جس کی انہیں چاہ تھی۔ عظمیٰ پر نکاح کی خبر نے جس طرح اثر کیا تھا اس کے ایک لمحہ کے لیے تو جہان کا ہنر کر دیا تھا پھر وہ بھی بے قرار ہو کر اس کی طرف بڑھی تھیں۔ شاہرہ نے اسے آگے بڑھنے پر ڈالا تھا اور گھر کا رزق نہ خاطر کی طرف دیکھا تھا۔

رزق نہ خاطر۔ تو وہ بڑے بڑے پلے سے اس کی ہتھیلیوں کو رگڑ رہی تھیں سیدہ اسامہ نے ذرا کی ذرا پگھلی اٹھائی تھیں۔

”ابھی آپ کو بتایا تو ہے کہ دونوں سے بخار ہو رہا تھا شاید وہ یک ہو گئی ہے۔“

”ہاں ملا ہو میں آپ نے مجھے بتایا میں نہیں سیدہ اسامہ۔“ شاہرہ نے گھر کیا۔

”وہاں ہی کی دکان سے مشورہ کر لیتے۔“  
 میں نے مضمین دے دی تھیں۔ معمولی پیڑیچ تھا۔ اب تو جس کزوری تھی وہاں تو صرف فلکی و جے  
 ہی تھا۔ ان کوئی ضرورت نہ تھی۔“  
 ”میں نے غلطی کی۔“ اس کی بات کا جواب میرے بغیر شاہ رخ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارنے لگے۔  
 اس شاہ رخ کی اسے ہولے ہولے پکار رہی تھی۔  
 ”عظمیٰ عظمیٰ آنکھیں کھولیں۔ میں ڈاکٹر کو بلا رہا ہوں۔“ شاہ رخ اٹھ کھڑے ہوئے۔  
 تپ سی اس نے آنکھیں کھول دیں اور غالی غالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔  
 ”عظمیٰ کیا ہوا تھا کرنا۔“ شاہ رخ کھٹ کھٹ۔  
 ”شاید پکڑا تھا۔“ اس نے آنکھیں سے جواب دیا۔  
 ”کیس ڈاکٹر کو دیکھو گا پکڑو تو میں چل رہا تھا۔“ وہ مسکراتے تو فلفلی میں سر ملاتے ہوئے اس نے اٹھ کر بیٹھنے  
 کی کوشش کی۔

”نہ بٹھیں رہو۔“ شاہ رخ نے منع کیا اور سیدھا اسے پوچھا۔  
 ”کیا ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“  
 ”میرا خیال ہے نہیں۔ میں نے بتایا ہے کہ آپ کو کہ صرف ایک دیک ہے۔ بخار تھا اور اس نے کچھ کھایا پیا بھی  
 نہیں۔“  
 ”خیر تو جی بلکہ ہونی ڈاکٹر تو تم ہی ہوں ان کے لیے سوچو غیر وہاں۔“  
 ”جی شاہ رخ کھالی میں نے منع کیا میں جتنی کے لیے کھانا دیا تھا۔“  
 ”لو گد۔“ وہ زینت فاطمہ کی طرف مڑے۔

”پچھو آپ لی جان سے تفصیل پوچھ لیں۔“ کھانا بڑھ کھنا تک لگتے ہیں۔ ”اور انہوں نے سر ملاتے ہوئے  
 عظمیٰ کی طرف کھینچا جس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور سیدووری سے کھانا ہونٹ چل رہی تھی۔  
 ”پچھو۔“ پچھو پائیز۔ ”شاہ رخ کے جانتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور زینت فاطمہ کے ہاتھ پکڑتے ہوئے التجا کی۔  
 ”آپ کب منع نہیں کر سکتیں کیا لی جان کو شادی کو کہ وہ میرا نکاح نہ کریں۔“  
 ”اگال ہوئی ہو غلطی۔“ اس نے اسے لگا۔  
 ”اگال نہیں ہوئی ہیں۔ جو جاؤں گی۔“ اس نے آسو بھری آنکھوں سے سیدھا اس کی طرف دیکھا۔  
 ”میں تمہاری طرح نہیں ہوں اور تمہاری طرح نہیں ہو سکتی۔“ جی بھی نہیں۔ میں مل بڑھ کر کے ساری  
 زندگی سہاقت نہیں کر سکتی۔ میں۔“

”چپ کرو عظمیٰ۔“ زینت فاطمہ نے خوفزدہ ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔  
 ”کیوں سارے دروازے بند کر دیا جاتی ہو۔“ لیان نے دروازہ کھلی ہو خود کو اور سب کو۔ شاہ رخ کے کان میں  
 جبکہ بھی پڑی کہ تم نکاح سے انکار کر رہی ہو تو جانتی ہو اس حویلی سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی اس کے لئے کہ بعد  
 ”تو اب کون سے دروازے کھلے ہیں پچھو۔“ اس کے کچھ میں ہی تھی۔  
 ”بڑھکت رہا ہے میرا۔“ مرزا کا لیان میں پوچھو کہ وہی ہوں مرزا کا لیان میں۔  
 ”اسواں کے رخساروں پر برسر آئے تو زینت فاطمہ نے یکدم اسے کھلے گایا۔ وہ ان کے گلے گئی تھی ہی دیر  
 تک دوتی ہی اور سیدھا شاہ رخ نہ کھل کر اس نے آسو پھونکی کی کوشش کرتی رہیں۔  
 ”نمت کرو ایسا غلطی کرتا رہا پکڑو کہ ہر قسم کے جینا مشکل ہو جائے اپنے آپ کو سنبھالو۔“

”یہ شاہ رخ کیا کہہ رہا ہے۔“ عظمیٰ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔  
 اور زینت فاطمہ نے شکر کیا کہ وہ عظمیٰ کے دواں دوم جانے کے بعد آئیں۔

”ہاں وہ کھانا تو بھلی سی حرارت ہو گئی تھی۔“ اس نے کہا۔  
 ”اب ٹھیک ہے نہ اسے کئی بے طبیعت فریش ہو جائے گی۔“  
 ”حرارت میں نہانے بھجوا دیا۔ زینت فاطمہ نے بھی منع نہیں کیا۔“  
 ”لیان جان باندھ لینے کے کچھ نہیں ہو گا اسے کھلے اور قوسے پیر پیر کھا۔“ اس نے وضاحت کی  
 ”خیر نے نہ اسے کیا تھا۔“ وہ زینت فاطمہ کی طرف مڑے۔  
 ”زینت فاطمہ تم تیار نہیں ہو میں اور۔“  
 ”جی وہ شاہ رخ نے دیکھنے کو جانے کے لیے کہا ہے اسے شاید کسی سے کام تھا۔ کوئی۔ اونچی ہو چکی کیا ہے اور  
 میں آنکھیں دہی تھی آپ کی طرف کیا کرنا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”میں کھادری جو کچھ نکاح کا فکسنگ ہے تو جو لوگ اسے ہیں کر رہی ہیں اسے ان سب کے جوڑے ہو جائیں۔  
 اچھے۔“

”کون کون آئے گا۔“ زینت فاطمہ نے پوچھا۔  
 ”ان کے گھر کے اقوامی ہوں گے صرف۔ دونوں لڑکے، عمدا، انعام، بھائی۔ ان کی بیگم، دونوں بیٹیاں اور  
 داماد اور اگر اس کے علاوہ کوئی اور وقت کے وقت کچھ جوڑے تو گھر سے بھی نکالے جا سکتے ہیں۔“

”اور میں چاہ رہی تھی دونوں لڑکوں کے لیے گھر لیاں بھی لے لی جائیں اور دو جوڑے ان کے وہ تو خیر شاہ رخ  
 اپنی پسند سے لے لے گا۔ اس کی پسند بہ اچھی ہے۔ میں شادی سے پوچھتی ہوں اگر وہ اجازت دیں تو اس کا بھی  
 ساتھ لے جاؤ۔“ اس نے نہانے اور نے فلفلی کے پڑوں کی سمجھ ہو گئی۔  
 ”جی بہتر۔“

”اور میں چاہ رہی تھی دونوں لڑکوں کے لیے گھر لیاں بھی لے لی جائیں اور دو جوڑے ان کے وہ تو خیر شاہ رخ  
 اپنی پسند سے لے لے گا۔ اس کی پسند بہ اچھی ہے۔ میں شادی سے پوچھتی ہوں اگر وہ اجازت دیں تو اس کا بھی  
 ساتھ لے جاؤ۔“ اس نے نہانے اور نے فلفلی کے پڑوں کی سمجھ ہو گئی۔  
 ”جی بہتر۔“

”اور میں چاہ رہی تھی دونوں لڑکوں کے لیے گھر لیاں بھی لے لی جائیں اور دو جوڑے ان کے وہ تو خیر شاہ رخ  
 اپنی پسند سے لے لے گا۔ اس کی پسند بہ اچھی ہے۔ میں شادی سے پوچھتی ہوں اگر وہ اجازت دیں تو اس کا بھی  
 ساتھ لے جاؤ۔“ اس نے نہانے اور نے فلفلی کے پڑوں کی سمجھ ہو گئی۔  
 ”جی بہتر۔“

”اور میں چاہ رہی تھی دونوں لڑکوں کے لیے گھر لیاں بھی لے لی جائیں اور دو جوڑے ان کے وہ تو خیر شاہ رخ  
 اپنی پسند سے لے لے گا۔ اس کی پسند بہ اچھی ہے۔ میں شادی سے پوچھتی ہوں اگر وہ اجازت دیں تو اس کا بھی  
 ساتھ لے جاؤ۔“ اس نے نہانے اور نے فلفلی کے پڑوں کی سمجھ ہو گئی۔  
 ”جی بہتر۔“

”اور میں چاہ رہی تھی دونوں لڑکوں کے لیے گھر لیاں بھی لے لی جائیں اور دو جوڑے ان کے وہ تو خیر شاہ رخ  
 اپنی پسند سے لے لے گا۔ اس کی پسند بہ اچھی ہے۔ میں شادی سے پوچھتی ہوں اگر وہ اجازت دیں تو اس کا بھی  
 ساتھ لے جاؤ۔“ اس نے نہانے اور نے فلفلی کے پڑوں کی سمجھ ہو گئی۔  
 ”جی بہتر۔“

”اور میں چاہ رہی تھی دونوں لڑکوں کے لیے گھر لیاں بھی لے لی جائیں اور دو جوڑے ان کے وہ تو خیر شاہ رخ  
 اپنی پسند سے لے لے گا۔ اس کی پسند بہ اچھی ہے۔ میں شادی سے پوچھتی ہوں اگر وہ اجازت دیں تو اس کا بھی  
 ساتھ لے جاؤ۔“ اس نے نہانے اور نے فلفلی کے پڑوں کی سمجھ ہو گئی۔  
 ”جی بہتر۔“



”میلو“  
خضر نے بی لاؤنچ سے گزرتے ہوئے ٹھٹھی کی آواز سنی تو ریور اٹھا دو سری طرف کسی نے گرمی سانس لی تھی۔

”میلو“ اس نے دوبارہ کہا۔  
”میلو“ دو سری طرف سے گرمی آواز بھاری تھی۔

”جی کون“ خضر نے پوچھا۔

”آپ نے پچانا نہیں؟“ پوچھا گیا۔

”آپ نام بتائیں گی تو پچاؤں گا۔“

”نہا سٹین نہا ہوں علیحدگی دوست۔“

”وہ آپ! خضر نے طویل سانس لی۔“

”علیحدہ تو عمر نہیں آئی۔“

”مجھے معلوم ہے دراصل مجھے آپ بات کرنا ہے۔“

”خیریت کوئی کام ہے آپ کو۔“

”میں ایک بلڈ کام کے آپ کو فون نہیں کر سکتی۔“

”جی کیسے کیا کرتا ہے۔“ کوئی بات نہ ہوئی تھی لیکن وہ صوتا ”بولنا نہ علیحدگی دوست تھی۔ اور پھر علیحدگی شادی میں کئی بار نہ صرف یہ کہ ان کا سامنا ہوا تھا بلکہ درحقیقت میں بھی ہوئی تھی۔ کئی بار اس نے محسوس کیا تھا وہ جان بوجھ کر اس کے راستے میں آتی اور اسے مخاطب کرتی ہے۔

”خضر علیحدگی دوست، ہونے سے پہلے اس کو پہنچتا تھا پھر وہ عافیت کی کنج تھی اور علیحدگی سے سرائی رشتہ سے بھی وہ اس کا احترام کرتا تھا لیکن پتا نہیں کوئی بات تھی جو اس کے ذہن میں ٹھٹھکی تھی اس کا انداز ٹھٹھکو اس کا ٹیکس کا انداز لیکن وہ خود ان دنوں اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس کے انداز پر زیادہ غور نہیں کر سکتا تھا اسے علیحدگی خود سری ابھی نہیں گئی تھی اور نہ ہی اسے یہ بات پسند آتی تھی کہ عافیت کے والدین اس شادی میں شرکت نہیں کریں گے۔ اسے اس کا بھی خیال تھا جس کے متعلق اس کی افضال حیدر سے قطعیت بات ہوئی تھی اور افضال حیدر کا ادا تھا کہ وہ اس خیر علیحدگی کا رشتہ اس بار طے کریں گے لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔ اس نے افضال حیدر سے بحث کی تھی لیکن پھر افضال حیدر نے اسے قائل کر لیا تھا۔

جب اولاد یوں خدہ باز آئے تو والدین کو جبک جانا چاہیے ورنہ پھر بدنامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ وہ خود اس شادی سے خوش نہ تھے لیکن علیحدگی خد کے سامنے مجبور ہو گئے تھے اور وہ سب سے معذور کی وجہ سے بھی پریشان تھا۔ اس کے دوکیل کا خیال تھا کہ اگلی شادی پر شاید فیصلہ سنا دیا جائے اور یہ فیصلہ کیا ہو گا یہ وہ جانتا تھا وہکیل سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کل ثابت ہے پچاسی بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے عہدہ ہو جائے وہ یہ نہیں سمجھا رہا تھا کہ یہ کتنا وہ ہونے لگا ہے ورنہ کیا جائے اور وہ سب کچھ نہیں کر سکتیں گے اور اس کی انجمن میں وہاں نور سے بھی کڑا رہا تھا اس نے کئی بار اس کی آنکھوں میں سوال دیکھے تھے۔ وہ شاید معذور کے سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہتی تھی پوچھنا چاہتی تھی۔

علیحدگی ہندی سے چند دن پہلے ہی تو اس نے ادا نور سے کہا تھا کہ وہکیل سے مل کر صورت حال معلوم کرنا ہے اور اس کے پاس ادا نور کو بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا اور جو تھا اسے بتانے کی اسے بہت نصیحت ہو رہی تھی۔ اسی لیے وہ اس کا سامنا کرنے سے بچ رہا تھا لیکن ادا نور شاید کچھ اور بھی تھا جس کی ادا نور کی آنکھوں میں اداسی دیکھی تھی وہ ایک بار جب وہ نرا سے بات کر رہا تھا تو فاصلے پر کڑی ماہ نور سے اس کی نظریں ملی تھیں ان نظروں میں شکوہ تھا نہ راضی تھی بے یقینی اور فراق تھی۔ آج ابھی وہ اسی ارادے سے باہر نکلا تھا کہ ادا نور کی

طرف جانے لگا۔ اسے معذور کے دوکیل سے بھی ملنا تھا ”ماہ نور کو بھی ملنا تھا وہ یقیناً“ بہت ناراض ہوئی۔ علیحدگی شادی کی مصروفیات میں الجھ کر وہ اسے جاب کے متعلق بھی نہیں پوچھ سکا تھا کہ کیا اس نے جاب چھوڑی ہے یا ابھی تک جاری رکھے ہوئے ہے۔ پھر اس نے ابھی تک اس کی جاب گے لیے کسی سے بات بھی نہیں کی تھی۔ ”اس نے مجھے سے یقیناً بہت خفت ناراض ہونا چاہیے۔ لیکن خیر مائلوں گا۔“

بلکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔

”آپ سے علیحدگی شادی کے بعد ملاقات نہیں ہوئی جو چاہوں کر کے خیریت معلوم کر لوں۔“

انہی میں میں اس کی آواز اب بھی تو وہ چو نکا۔

”جی خیر۔“

”کیسے ہیں آپ۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”کیا خیر نہ ملاقات حاصل ہو سکتا ہے۔“ ایک ادا کے ناز سے اس نے پوچھا۔

”جی۔“

خضر اس انداز ٹھٹھکو پر چو نکا تو اس نے بھی فوراً ”جی“ بولا۔

”میری خضر مجھے آپ سے ایک ریکورڈ کرنا بھی کیا آپ اس وقت میرے گھر آسکتے ہیں۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“

”کیا۔ کیا کہنا ہے۔“ خضر حیران ہوا۔

”میں فون پر نہیں کہہ سکتی پلیر ٹھٹھوئی در کے لیے آجائیں۔“ اس نے التجائی۔

”لیکن اس نہا۔“

”پلیر خضر۔“ اس کی آواز میں جیسے آنسو گھل گئے تھے۔

”کیا آپ میرا مطلب ہے کیا آپ گھر نہیں آسکتیں۔“ خضر نے کسی قدر سے جھجکتے ہوئے کہا۔

”میں کو تشنگی کہوں گا کہ آپ کا جو بھی مسئلہ ہے حل کر سوں۔“

”اور آپ کے گھر والے۔“

”میری کام ٹھٹھک سے باہر گئی ہوئی ہے اور صرف ملازم ہیں۔ خضر پلیر انکار کرت کریں۔ آپ نہیں جانتے ہیں

میں بہت مشکل میں ہوں۔ آپ صرف ایک بار میری بات سن لیں۔“

”جی آپ ایڈریس بتا دیں۔“ خضر نے پوچھ کر سامنا کر لیا تھا۔

پتا نہیں اس لڑکی نے ادا کے ساتھ کیا مسئلہ ہے اور پھر یہ اپنا یہ اہم مجھ سے یہ کیوں ڈسکس کرنا چاہتی ہے۔

علیحدگی شادی کے دوران خاص بات چیت نہ ہوئی تھی لیکن اتنی ہی بے تکلفی بھی نہ تھی کہ وہ

وہ الجھا الجھا ایڈریس نوٹ کرنے لگا۔

”کیا مجھے جانا چاہیے۔“ ایڈریس نوٹ کرتے ہوئے ایک لمحہ کو اس نے سوچا۔

”اس نے کہا ہے کہ وہ مشکل میں ہے تو اظنا قہا پھٹھا اس کی بددردنا چاہیے بہر حال وہ علیحدگی دوست ہے۔“

”آپ کب آ رہے ہیں خضر۔“ اس نے بے قرار سے پوچھا۔

”میرے خیال میں اس ایڈریس تک پہنچنے میں تقریباً ”تو آجھا ٹھٹھٹھا کچھ زیادہ لگ جائے گا۔“

”میں تک تو خضر نہیں سکتا۔“

”وکیل۔“ خضر نے ریور کی کیبل پر ڈال دیا اور کچھ دیر یوں الجھا الجھا سائیلی فون اسٹینڈ کے پاس کھڑا رہا پھر

دروازہ کی طرف بڑھ کر علیحدگی کے انداز کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”نہا بات کر کے سیدھا ماہ نور کی طرف جاؤں گا۔“ گاڑی روڈ پر نکلتے ہوئے اس نے سوچا اور ٹھٹھک

آدھے گھنٹے بعد وہ نڈا کے بے حد شادمانہ سے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

”بی بی آروی ہیں آپ بیٹھیں۔“ ملازمہ لڑکی اسے بٹھا کر سولی گئی تھی۔

اس نے ڈرانگ روم کی سیاحت کو سائنسی نظموں سے دکھا۔ فرخ پیر نے کہہ رکھا تھا اور ڈیوٹر کیو پر جیڑنا تھا۔ سب بہت تیزی اور شاندار تھا۔ وہ ایک تازہ کے کرسل کے گلڈان کو لیے اور پھر تھکا کر ڈرانے ڈرانے روم میں قدم رکھا۔ سفید ساڑھی میں لپکے لپکے میک اپ کے ساتھ وہ قیامت ڈھاری تھی ایک لمبے کوٹھڑی کی نظریں اس نے چہرے پر کھینچیں۔ ماشاء اللہ وہ بعد حسین تھی اسی سیاہ مختلطہ طبی آنکھوں میں بعد چھٹی تھی۔ لیکن وہ سر سے لے کر پاؤں تک کھلیا۔

”تھنک یو خضر“ ”ایک اواسے ساڑھی کاپلورست کرتے ہوئے وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔  
 ”یہ تو کیسی ہے ابھی پریشان نہیں لگ رہی۔“ خضر نے نگاہیں جھکائے جھکائے سوچا بے حد مطمئن ہے حد  
 سکون کی وہ بڑے والہانہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”جی آپ کی کوئی بات کرنا بھی مجھے ہے“ خضر نے اس کی نظروں کی وارانہ کلی سے الجھ کر پوچھا۔

[illegible]

”گگ کہتے ہیں میں بہت حسین ہوں لیکن تمہاری نگاہ مجھ پر کیوں نہیں ٹھہرتی۔ تم اتنے پتھر کیوں ہو۔ میری محبت کی حد تک تم تک کیوں نہیں پہنچتی خضر۔“

”آپ“ آپ کا کہہ رہی ہیں نذا۔“ خضر کے لبوں سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز نکلی تھی۔

”وہ سب جو تم نے سنا خضر وہ سب جو میرے دل میں چھپا تھا میں تمہیں سب بتا چکا ہوں خضر بہت زیادہ۔“  
وہ یکدم اپنی جگہ سے اٹھی اور خضر کے پاؤں کے نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔  
”مجھے انا بتاؤ خضر میں ساری عمر۔“

”مثلاً آپ“ فخر بکرم کھڑا ہو گیا۔  
 ”آپ کو کچھ احساس نہیں ہے اپنے نسوانی وقار اور عزت کا اور نہ۔“  
 ”محنت مگر کچھ بادیہاں رہتا ہے اعلیٰ عزت و وقار۔“

اس نے سٹارٹ کر خضر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس سے جانے کیا تھا کہ خضر کو اپنا دل چلتا ہوا سا محسوس ہوا اور خضر کو اس پر ترس آگیا۔ اسے یاد آیا کہ پہلی بار جب اس نے نیوٹرلٹی تک اسے نقدی تھی تو سیاہ حجاب میں اُن آنکھوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا اور وہ کچھ سخت لیتے گتے رک گیا۔

”مذاہلہ خود کو سنبھالیں میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن اہم سواری میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں آپ کے لیے اپنے دل میں اس طرح کا کوئی جذبہ محسوس نہیں کرتا۔ آپ اپنے دل کو سنبھالیں۔“

”میری طرف دیکھو خضر! اب یاد نظر بھر کر دیکھو تو۔“ اس نے خضر کا ہاتھ پکڑ لیا جسے خضر نے آنکھیں سے چھڑا

لایا۔ ”کیا میں خوبصورت نہیں ہوں۔“  
 ”آپ یقیناً بہت خوبصورت ہیں اور کوئی بھی شخص آپ کو رفیقِ زندگی بنا کر فخر محسوس کر سکتا ہے، لیکن۔“  
 ”تم توہ شخص کیوں نہیں ہو سکتے خضر۔“ اس نے خضر کی بات کاٹ دی۔

”میں مجبور ہوں۔“

خضر نے لگا میں جھکاں تھیں۔ وہ اس کے اوس چہرے کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔  
 ”اس لیے کہ تمہاری مکتبی ہو چکی ہے اور تم مانی مستگیر راہ نور سے محبت کرتے ہو۔“  
 تشریحی نظر آیا تھا پھر اس کے لمحے سے طبی جھلک رہی تھی۔

”آپ جانتی ہیں پھر بھی۔“ خضر کو حیرت ہوئی۔  
 ”پھر بھی آپ نے ایسا کیا تاہم کیوں۔“  
 ”اس لیے خضر کو محبت نے اختیار ہوتا ہے میں تمہیں ماہ نور سے زیادہ چاہوں گی خضر“

”میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی ہوں۔ مجھے مت ٹھکراؤ۔ ماہِ نور بھلا تمہیں کب سنا ہے جاڑے جاڑے کی لڑکی جو تھریں میں دوڑے کھاتی پھرتی ہے۔ اس میں ایسا کیا ہے

”ہاں اور کیا ہے اور کیا نہیں ہے میں اس کی طرح جانتا ہوں اور آپ۔“ اس نے ایک  
”میں نے جو کہنا تھا کہ رہا ہے اب سمجھنے کی کوشش کر رہا۔“ اور مجھے اجازت دے۔

”پیزر کچھ دیر رک جاؤ یہ بل کتنے سالوں کی خواہش اور آرزو کے بعد میرے ہاتھ آ گیا۔“ (سوری مجھے ایک ضروری کام ہے۔) ”اس نذا کی اس بے باب گفتگو سے انتہائی گھٹیا محسوس ہو رہی تھی اور وہ اب یہاں مزید رکنا پسند نہ کرتا تھا۔“

”ہا نہیں کیسے والدین ہوتے ہیں جو بچوں کا خاص طور پر بیٹیوں کو کوئی اخلاقی اقدار نہیں  
طور پر اس نے وہاں میں کھڑے کھڑے انور اور ندا کا مقابلہ کیا اور اسے اپنی خوش قسمتی پر  
دائے اصرار کے باوجود ضمیر، ضمیر اور اللہ حافظ کے کامیاب نکل گیا۔

دروازہ کھول ہی ہوا تھا کہ ساتھ والے گھر کے گیٹ سے کوئی باہر نکلا اور اس کی نظر خضر عباس کی طرف آئی۔

”اے خضر تم۔ یہ تم ہوتا۔“ آنے والے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ خضر اس کے گلے لگ گیا۔ یہ اس کا یونیورسٹی فیلو اسد تھا۔

”تم یہاں کمال۔“ خضر نے پوچھا۔

”میں اپنے ایک عزیز سے ملنے آیا تھا۔ ساتھ والا گھر ہے اور تم۔“  
اس نے سفید جلیں کے گیٹ کی طرف دکھا اور پھر اس کی لیں پر معنی خیزی مسکرا کر  
”یہاں۔۔۔ بار تم تو ایسے نہ تھے“

”جھوٹ گئی۔“ اسد نے برا سامنا دیا تھا۔

”تم تیار کرو مجھے جوائن کر لو۔ مجھے یوں بھی کسی اہم کام کی ضرورت تھی۔ یہاں کے انس کے لیے مجھے ڈوکیٹر پارکسٹ کے سلسلے میں اکثر بار بار جانا پڑا ہے۔“

”اُس کے فینکس تم زراعی میں بدے ہو لیکن تمہارا سفینہ تیس میں آتا مجھے ہم نہیں ہو رہا۔“

”کیوں۔“ خضر نے پوچھا۔

”یہاں ایسا کیا ہے۔ میں کسی سے ملنے آیا تھا۔“

”کیا واقعی۔“ اسد نے پوچھا۔

”ہاں۔“ خضر کو اس کے انداز سے ابھن ہو رہی تھی۔

”تم کل کر کو اسد کیا کرنا چاہتے ہو۔“

”میں نے تمہارا سفینہ اس کے سلسلے میں آئے تھے۔“

اسد کو کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ خضر میڈم سفینہ کی خدمت سے لاعلم ہے۔

”میں نے بتایا تو ہے کہ کسی سے ملے آیا تھا۔ نہ اسے نام ہے اس کا اپنی بہن کی شادی میں اس سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے آج کسی کام کے سلسلے میں فون کر کے بلایا تھا۔“ خضر نے عقائد انداز میں بتایا۔

”وہ نہ اسے عرف نام ہے۔“ اسد بولے نہ سنا۔

”تمہارا اس کے جانے بہت آواز نہ عمر بھر روتے رہ گئے۔ حسین تو بہت ہے لیکن اس کے کانے کا علاج نہیں۔“

”فان کا ڈاکٹر اسد ابھی موت مجھے۔“ خضر جھجکا گیا۔

”کمال ہے بار تم میڈم سفینہ کے حقیقی نہیں چاہتے۔“ وہ اسے تفصیل بتانے لگا۔

”اور یہ۔“ اس طرح کی لڑکی علیحدگی دوست تھی اور اس کے گھر آتی رہتی تھی۔ اندر ہی اندر وہ فیسے سے مل کھا رہا تھا۔ ایسی ہی لڑکیاں اس طرح جتنی بچی کے اپنے چند یوں کا اظہار کر سکتی ہیں۔ وہ بھی حیران ہو رہا تھا کہ

وہ کیسے وہ سب کچھ کر رہی تھی۔

”میڈم سفینہ یہاں خاص حلقوں میں بہت مقبول ہے۔ اور بڑے بڑے لوگوں کو لڑکیاں سلائی کرتی ہے۔“

”وہ کا ڈاکٹر کا غائب رہا تھا۔“

اور وہ اس کے دھوکے میں آکر اس کی مدد کو بھاگا چلا آیا تھا اب اسے یاد آیا تھا کہ اس نے ان کی ہم شکل لڑکی کو ایک

دوبار کی کے ساتھ دیکھا تھا۔ شاید اس نے تب نہیں لگائے ہوئے تھے۔

”جو ایک بار میڈم کے حال میں تھیں اسے میڈم کی لڑکیاں اسے دیوالیہ کر دیتی ہیں۔“

اسد نے اس کی حکولت میں اضافہ کیا۔ خضر کا دل بھول رہا تھا۔

اسے اس کے گھر آنا کر اور اسے صبح نہیں آئے کی یاد کرنا ہوا وہ گھر واپس آیا اس نے اس وقت اندر کی

طرف جانے کا ارادہ ہوتی کر دیا تھا۔ گھر آکر اس نے علیحدگی کو فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ اور عاقل شمل علاقہ جات کی یہ کو

نکل گئی ہے۔ کچھ دیر اس نے لوہے سے کپ شمل لگائی کچھ دیر یو پی بیٹھے کی کوشش کی۔ لیکن ذہن ابھرا ہوا تھا

کیوں نہ ہو۔ مجھے نہیں بار بار تھا۔ یہ تو ملے تھا کہ اس نے اندازہ نہیں سے کوئی سوکار نہ تھا اب۔ ”مجھے وہ اس سے

بات کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ پھر شاید وہ علیحدگی کی وجہ سے پریشان تھا۔

عاقل نے لڑکا نہ لڑکا کر ان کو تھا اسے بھی بتایا گیا تھا۔ تو کیا۔

”میرے۔“ اس نے یو پی بیٹھے بیٹھے اسے آواز دی تھی۔

”عاقل اور علیحدگی دوست نہ کیا کہ فری رشتہ دار ہیں۔“

”میں پہلے تو علیحدگی ہی بتایا تھا کہ وہ کرن ہیں لیکن شادی کے وقت پتا چلا کہ بس فیملی فریڈ ہیں لاہور میں پڑوسی تھے ان کے۔“ ”وہاں۔“ خضر کو اطمینان سامعوس ہوا۔

”خضر افضل حیدر میں بیٹھ لا حاصل نہیں رہوں گی اور ایک دن آئے گا جب تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو گا۔“ ”نہ اسے نہیں پتا کہ اپنا کیا رکھا اور بولے مسکرائی۔

”اور ایک دن آئے گا جب تم میری محبت کے سامنے کھٹے ٹیک دو گے۔ آج تک میں نے صرف انتظار کیا تھا اور اب۔“ اس نے لڑکیاں نظر آئیں پڑ والی۔

”بھلا وہ ہے جو زیادہ عرصہ تک اس حسن سے آنکھیں بند کر کے۔“

میڈم سفینہ نے فنی بار بار اٹھا تھا اور خضر وہ بھی کب تک اس چہرے کا مجھ سے۔

”لیکن وہاں دور سے محبت کر آئے۔“

دل میں اس خیال نے جنگی بھری تھی۔

نیل کے گاڑی کی چٹائیاں اٹھائیں۔ وہ اس وقت خضر سے ملے اس کے آنس میں جاری تھی ایک بار وہ علیحدگی کے ساتھ اس کے آنس کے پاس سے گزری تھی اور علیحدگی ہی بتایا تھا کہ اسے روڈ کر اس کر کے سامنے والی

بلڈنگ میں فرسٹ فلور پر خضر کا آنس ہے۔

”وہ یقیناً ان دنوں وہاں ہے گا کچھ دیر کہ نہ وہ مجھے سے مسکرائی۔

لاؤن میں بیٹھی میڈم سفینہ نے ایک تنہائی نظر اس پڑ والی۔

”کیا میں جاری ہو چکا۔“

”یو پی ایک کام ہے جاری تھی۔“

”جلدی آجانا کچھ شازب کا فون آیا تھا وہ شام میں آئے گا۔“

”اے۔“ اس نے ہونٹ مسکائے۔

”ماں یہ تمہارے شادی کی مجھے نہیں آتی۔

”بھی تو لگتا ہے مجھ اب بھی ادھر کا نہیں کریں گے اور کبھی پھر یکدم مہمان ہو جائے ہیں۔“

”ایا اپنی پڑاں میں لیکن ایک سب سے جالو کچھ پڑا ہیں۔“ میڈم سفینہ کی نظر اس پر تھیں۔

”آجانا ابھی وقت ہے۔“

”ماں کی باتیں۔“ اس نے اپنی بے زاری کو چھپانے کی کوشش کی اور لاؤن میں مزید کر کے بغیر کھٹ کھٹ

کرتی آیا پر فلکی کی۔

”یہ محبت کا نظارہ بھی آج اسے گامیری جان سفینہ نے کئی گایاں نہیں کھیلیں سب جاتی ہے۔“

نہ اسے بار بار ملے جاتے میڈم سفینہ کی پروا نہ تھی اور کدے اچانک سے اور سوجھنے سے بھی تمہاری بیٹی ہوں

اماں اور مجھے میرا نہیں آنا اور آج وہ خضر کو حیران کر دے گی اور واقعی خضر اسے دیکھ کر حیران ہو گیا۔

”آپ یہاں۔“

”یہاں سے گزرتی رہی سو جا تمہیں ایک فون کیجی جاؤں۔“

وہ بے تکلفی سے کہنی ہوئی کہ پری بیٹھ گئی۔ خضر جڑ بہہ کر رہا ایک کچھ دیر پہلے جب پڑا ہی نے آکر کہا تھا کہ کوئی

خاتون ملے آئی ہیں تو اس کے کدو مکھان میں بھی نہیں ملے گا نہ ہوگی۔

”میں تو شاید یاد نہ رہا کہ کوئی تمہاری محبت میں ترپ رہا ہے۔“

”میں نہیں اس نے سو دھبی آپ سے کہا تھا کہ۔“

”میں تم سے کچھ طلب تو نہیں کر رہی خضر۔“ اس نے خضر کی بات کاٹ دی۔

”لیکن خدا کا راجھے خود سے محبت کرنے سے مت روک دو میرے اقتدار میں نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں میں مجھے سے بہت بند نہیں ہے اور پھر اس سے بلیر آپ جانے۔“

خضر نے ہنسنے کا غمزہ کر دیا کہ کتنے سے روکا۔ ”تم کتنے ہو پھر چل۔“

اس کی کو آواز میں جیسے نئی مٹل کی تھی۔

”اور میں تم ایسے پھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔“

”تو مت پھوڑیں سر۔“ خضر نے لہو لایا۔

اس نے اس کی حقیقت جان لینے کے بعد وہ خود کو اس کا احترام نہ کرنے پر مجبور یا ہوا تھا۔

”خضر۔“ اس کی ٹپکس جھجک گئیں۔

”ایسا مت کرو میرے ساتھ میں تو تمہاری محبت میں پاگل ہو رہی ہوں اور تمہاری یہ بے اعتنائی مجھے مار ڈالے گی۔“

تم کیا جانو میں تمہاری محبت کی آگ میں جل کر رہا ہوں جاتی ہوں تمہاری ایک نظر اتفاقات کے لیے

کتنی راتیں جاگ کر گھٹنے نہ دغا میں کی ہیں۔“

”یہ لڑکی کتنی ہیڑی ایک بھر۔“ خضر نے اس کی جھجکی ٹپکس دیکھیں۔

”اور کیوں نہ ہو اس کی سب کچھ تو کھلایا جا رہا ہے۔“

”خضر ملے صرف ایک محبت بھری نظر ڈال لو مجھ پر مجھ سے محبت نہ کرو لیکن میری محبت کا اعتراف تو کرو۔“

”دیکھیں مگر میرے پاس ان فصول پاؤں کے یہ وقت نہیں ہے میں تم کو معصوم آدمی ہوں اور وہ بھی میں

آفس سے یہاں کوئی نہ کوئی آتا جا رہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی آپ کو میرے آفس میں دیکھ کر میرے متعلق

غلط سوچے۔“

”ایسا مطلب۔“ اندکے چہرے کا رنگ یکدم بدلا تھا۔

”مطلب آپ ابھی طرح جاتی ہیں۔“

خضر نے میز پر ڈی فائل اپنی طرف کھٹکائی اس کا رویہ واضح ہے زاری کا اظہار کر رہا تھا۔

”عورت کا اعتراف محبت اور بار بار اعتراف ایک روز مڑو کہ بھجنا پڑتا ہے عورت کے منہ سے اپنے لیے محبت کا

اعتراف سن کر مرد مت خوش ہو رہا ہے۔“

”تمہارا من مت ہو پلے میں جاری ہوں۔ اپنی بے اعتنائی پر شرمندہ ہوں۔ لیکن محبت تو پیش بے اعتنائی ہی

ہوتی ہے۔ تم بھی تو محبت کرتے ہو۔ پھر میری آنکھوں میں ہمیشہ وہ محبت نہیں لکھیں آئی جو مجھے راتوں کو

بے چین رہتی ہے۔“

”فراڈ کاؤسک کہہ رہا کہ میں محبت کرتا ہوں۔“

خضر کے لیے کی تھی نہ تو اس کو مطلب کیا۔

”ایسا مجھ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے خضر جو ماہ نوکس ہے۔“

”تمہارے خدو کو کچھ شرم نہ کرو نہ اچھلا وہ کہاں اور تم کہاں۔“ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ خضر کے یوں پر

نمودار ہوئی۔ اور اس نے ایک عجیب سی نظریہ اپنا ڈالی۔ ”دراے چین ہو کر سیدھی ہو گئی۔“

”ایسا مجھ میں ایسا زور اور باتا لڑکی ہے تمہاری طرح کیا ہے۔“ اندکے کاٹک میں ہے وہ تو ایک کہی نظر سے چھوٹی موٹی ہو

جاتی ہے۔ اس نے اس کو بھی اچھا دیکھنا وہ اس کے سامنے بیٹھا مہذرت کر رہا تھا۔ وہ راضی ہوئی تھی

ان کی تھی تھی۔

”میں نے اپنے جذباتوں کا اظہار کیا ہے۔ اور اگر یہ سبب اور کتنی تم سے تو شاید تمہیں اچھا لگتا۔“

”شباب دا میں نے تمہیں کہا ہے کہ اس کا نام تو لوسہ۔ تمہاری طرح میں ہے وہ ایک شریف

گھر کے لڑکی ہے۔“

”اور کیا میں شریف گھر کے لڑکی نہیں ہوں۔“ اندا خود ہی سوال کر کے جھجک گئی۔ خضر نے اعتبار نہیں دیا۔

”یہ تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔“ مجھے تانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میڈم سینئر کی بیٹی جاب پرنس کبھی میڈم

سینئر کی بیٹی بن رہی ہے۔“ اندا کو اپنے پورے وجود میں آگ بے دلکشی محسوس ہوئی۔ یہ یکدم کھڑی ہو گئی۔

”مگر میں میڈم سینئر کی بیٹی ہوں تو میں اپنی مرضی سے میڈم سینئر کے گھر پیدا نہیں ہوئی تھی خضر افضال

حیدر۔“ اس کی آواز میں جھجک گئی۔

”اور محبت کی بھی دل میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ یہ دل میڈم سینئر کی بیٹی کا ہے یا تمہاری

اس معزز شریف محبتیہ گھر کا۔“

خضر کی بیٹیانی حسن آباد ہوئی۔

”میں نے آپ کو منع کیا ہے اس کا نام مت لیں۔“

وہ تم سے پھر آپ پر اتر آئی۔

”یوں کیا میرے نام لینے سے اس کی شرافت پر ضرب پڑتی ہے۔ میں ابھی طرح جانتی ہوں ان نام نماؤ شریف

زادوں کو وہ فخر میں جس جاب کر کے کس سروا کاٹک لکھتی ہیں آپ سے شرافت کا چلانا پرنس کبھی میرے مڑوں کو بے

دقت نہ جانتے رہے ہیں۔“

”تم۔“ خضر کا خطبہ جواب دے گیا اور اس کا ہاتھ بے اعتبار اس پر اٹھ گیا۔

”ایک لفظ بھی منہ نہ لکھو میں نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہر لفظوں کا۔“ دائیں رخسار پر ہاتھ رکھے دھ

پھر خضر کو ٹپکے برساتی نظروں سے دیکھتی رہی۔

”یہ پتھر جسے تمس دیکھ دے گا خضر افضال۔“

اس نے دل میں دل میں کہا اور اس کی تیزی سے آفس کا دروازہ ہنسنے لگی ہر پاگل لڑکی اور پھر تقریباً ”بھائی ہوئی اپنی

گاڑی کے آگے۔“ اندر بار پھر سے آگ لگی تھی اور اس آگ میں سب کچھ بسم ہو رہا تھا جس کی خضر کی محبت بھی اور

وہاں صرف انتظام تھا خضر افضال حیدر سے انتقام اور اس انتقام کی زد میں کون آئے والا تھا یہ اس وقت وہ نہیں

جانتی تھی اور نہ ہی اسے یہ خبر تھی کہ کچھ ہی دیر بعد قدرت خود اس کے لیے موقع فراہم کر دے گی۔ وہ غصے میں

کھوئی ہوئی گھبراہٹ میں داخل ہوئی تھی۔ اس کی شبانی رنگت غصے کی شدت سے دھبہ دھبہ رہی تھی۔ وہ میڈم سینئر کی

طرف جو لڑائی میں موصوفے پر شبیہ رخسانہ نامی لڑکی سے سرگوشیاں کر رہی تھیں دیکھے بغیر کھٹ کھٹ کرتی

بیڑیاں چڑھ گئی۔ میڈم سینئر نے آفس سے اس کا۔

”لگتا ہے کام ہوئی ہیں برت غصے میں لگی ہیں یا پھر طبیعت ٹھیک نہیں۔“

لڑکی نے میڈم سینئر کی طرف دیکھا۔

”جا کر پوچھ لو۔“

”غصے سے۔“ خود ہی ٹھک ہو جانے کی کچھ دیر تک میں نے تو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ یہ شریف زادے

تمہارے جیسی لڑکیوں کے گھر نہیں بناتے۔ اور اگر بنا بھی میں تو پھر میرے جیسا ہی خدو ہو رہا ہے۔ میں نے بھی

اپنی اس بات کو ثابت کیا تھا کہ وہ دن میں کر کے چلا گیا پھر کر لیکن وہ مڑوں کی بات کاٹک میں نہیں آتا اب تجربہ

کر لیا ہے۔ کچھ آجائے کی خودی چھل ڈاٹھ تیار ہی پڑے۔ مجھے آج شام جانا ہے کرل عمران کے پاس۔

آخر میں پھر کچھ دیر تک اس نے میڈم سینئر کی بات سن لی اور پھر اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر گر گئی۔ کیسے

کس طرح خضر افضال حیدر سے اپنی ٹھک کا بدلہ لے۔

”علیحدہ کو طلاق دلو اور اس کا عطف ہے۔ کمرہ کر کسی طرح خوب تر ہے گا۔“ لیکن طلاق تو ہی جاسنے کی ایک

دان آخر خیر نہ تھی تو عطف کے کام ڈھکوتا ہے گا اور اس کی بیوی کو کہ وہ یہاں شادی کر بیٹھا ہے اور یہ کام تو میں

مجھ ہی کر دوں گی بس عطف ہے کسی طرح اس کے گھر کا کمرہ لے لوں گی۔

اس نے مٹھیاں پیچ کر دروازے کی بجلی پر ماریں۔ لیکن کوئی سوچ کوئی خیال بھی اس کے اندر طاقی آگ کو

دھم نہیں کھاتا تھا۔ وہ جو بیڈ پر اوڑھ لی تھی سوچتی رہی نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کچھ کھانا کھانے کے لیے کبھی

نہیں گئی تھی۔ کچھ کھانا کر رخسانہ لکھی تھی اسے بالائے دروازے ایک بار پھر رخسانہ دستک دے کر اس کے کمرے

میں آگئی تھی۔



”وہ شاہ صاحب آئے ہیں میڈم نے کہا ہے آپ کو تیار ہوں۔“

”کہہ دو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میڈم نے کہا تھا لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ بس تھوڑی دیر کے لیے۔“

”جہاں جاؤں اسی ہوں۔“

اس نے داخلہ ہوم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور دونوں ہاتھوں سے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے پٹے لگے۔ شاہ زنبب لاؤنج میں ایلا بیٹھا تھا۔ بیٹھ کر اسے آواز دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”صاحب! تمناں طبیعت خراب ہے کچھ۔“ اس کی مشتاق نظریں انداز کے چہرے پر تھیں۔

”اے کچھ۔“ آپ نے بڑے دونوں اعضاء پر مہرہ فرمایا آج کیسے یاد آئی۔ ”وہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

”اب یاد نہیں آتی تمہاری اس باجی! تمہیں اور پریشان ہیں۔“ کہتے ہوئے شاہ زنبب میٹھ گیا۔

”آپ جیسے لوگوں کو کھانا کوئی پریشانی کیسے ہو سکتی ہے۔“ کہنے میں جتنی تھی۔

”خیر بہت ہے جان! جتنی تک میں ہو رہی ہوں۔“ شاہ زنبب مسکرایا۔

”سوئی ٹی۔“

”تیار ہوا۔“

”نہیں۔“ جواب مختصر تھا۔ شاہ زنبب کچھ دیر تو بنی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”موری ڈیڑھ انہوں نے تمہیں فون کیا کہ نہ کرنا کچھ مصروفیت کی رہی کہ تمہاری بارگاہی کیسے دلا دوں۔“

”میں نے کہا تھا ناراض نہیں ہوئی کسی سستی ہو رہی ہوں۔“

”تو چھوٹا ہر پلٹے ہیں۔ ڈنر بھی باہر ہی کریں گے تمہارا ایک ڈنر تو ہی بھی ہے نہ۔“ شاہ زنبب نے خوش ہلکی سے کہا۔

”وہ تو آپ کو یاد ہے۔“

”آپ سے وابستہ کوئی بات بھی بھولے بھی ہیں ہم۔“

نہا کچھ دیر تو بنی باجی لگائیں ایک دوسرے میں بھڑکاتے کچھ سوچتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوکے پلے۔“

”میڈم کو تیار ہیں۔“ شاہ زنبب بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”رخسانہ۔“

اس نے لاؤنج میں کھڑے کھڑے ہی آواز دی۔

”ہم! کو تیار ہیں شاہ زنبب کے ساتھ ڈنر کے لیے جا رہی ہوں۔“ شاہ زنبب کو آج اس کے انداز نے کچھ حیران تو کیا لیکن اس نے زیادہ کیر نہیں کی وہ جس مقصد کے لیے آیا تھا وہ مسئلہ اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ماہ نور نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ عام سی لڑکی کس بری طرح اسے مسترد کر کے چلی گئی تھی۔ حالانکہ اسے بھڑکانے کے لیے آخری روز اس نے شاید تک کی چٹائی ڈال دی تھی اور اس کی بالائی حشاکت میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ بھر کے حیرت اتاری تھی اور پھر ایک طغیانی مسکراہٹ سے اسے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

”موری سر میں پکے ہی انکجہ جلد ہوں۔“

اور تب شام کے اس وقت جب آتش میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا تو وہاں پر اس کا راز دار اپنے کیمین میں موجود تھا اس نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑا لیا تھا اور وہ بے حد معمولی سی لڑکی کا چھڑا کر جواب اسے چھڑاتے ہوئے تقریباً بھاگتی ہوئی آتش سے باہر نکل گئی تھی۔ کاش وہ اس کے پیچھے بھاگ کر اسے پکڑ لیتا۔ لیکن وہ داس کیسے رد عمل پر شدید سارا کھڑا کیا تھا اور جب وہ سنبھل کر باہر لگا تھا تو وہ روڈ کو اس کے رکتا شام بیٹھ چکی تھی۔

اور تب سے وہ زنبب کو تھا شک رہا تھا اس سے انتقام لینے کے لیے۔ وہ معمولی ملازم لڑکی۔ لیکن وہ معمولی کب تھی اس میں کچھ تو خاص تھا جس نے نہ اچھی خوب صورت لڑکی کو پیچھے کر لیا تھا۔

عثمانیہ میں کھانا کھاتے ہوئے اس نے بغور نہا کو دیکھا آج اس نے ٹیسن نہیں لگا رکھے تھے اور اس کا سیاہ

آنکھوں میں ایک ماحول معلوم ہی اداسی اسے بہت حسین بنا رہی تھی وہ عام دونوں سے کہیں زیادہ اچھی لگ رہی تھی شاید اس لیے کہ آج اس نے کوئی میک اپ نہیں کر رکھا تھا۔

”اکیلو بوز! شاہ زنبب نے بے اعتبار اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”نہا! اچھی بھیجی میں خبریں بہت سن کر تباہ ہو چکی لیکن سب سے خفا موش ہو گیا۔

”چلیں جی ہم اسی پر خوش ہو جاتے ہیں کہ آپ نے ہمیں بس کیا۔“

”نیکل! بلا میں بے کمر رہا ہوں۔“

اس کے لیے میں نہا کو کتنی محسوس ہوئی تھی اور وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی تب باتوں کے دوران شاہ زنبب نے اچانک کہا۔

”نہا! ایک روز اشارے پر تمہاری گاڑی رکی تھی میں نے تمہارے ساتھ ایک لڑکی کو بیٹھے دیکھا تھا۔ ماہ نور کو

وہ لڑکی میرے آتش میں کام کرتی ہے کہ تمہیں جانتی ہو اسے۔“

”ماہ نور! آپ کے آتش میں کام کرتی ہے۔“ نہا کی آنکھوں میں بے تحاشا شک پیدا ہوئی۔

”وہ میری فریڈ کی نرکن ہے۔“

”میرے آتش میں کام کرتی تھی لیکن اب نہیں میں نے اسے نکال دیا ہے۔“ آتش نے لیکن اس نے میری توہین کی ہے۔“

شاہ زنبب کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

”وہ۔“ نہا نے بوٹ سنبھلے اور اس کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔

”مجھ خضر کے آتش کا منظر تیار ادائی طور پر لگا ہوں کے سامنے آیا اور احساس توہین سے اس کے رخسار دیکھنے لگے۔

”نہا! آرمائی فریڈ پر ایک کام کر گئی۔“

شاہ زنبب نے صاف صاف بات کرنے کا سوچا۔

”تمہارے۔“ اس لڑکی کو وہ زنبب سے کہا اس کا سنی ہو۔“

”کہاں۔“ نہا نے پوچھا۔

”جہاں میں کھوں۔“

”پہلے میں سمجھے کیا ملے گا۔“

”جو تم کو۔“

”یاد رکھنا شاہ صاحب۔“ نہا کی آنکھیں بے تحاشا چمک رہی تھیں۔

”دینے کی حاجت ہو گئی ہے اس سے۔“

”تو نور۔“ شاہ زنبب کی پیشانی پر تل بڑھ گئے۔

”مجھے صرف اس سے بد لیتا ہے اپنی توہین کا۔“

”اور بد لے تو مجھے بھی لینا ہے اپنی توہین کا۔“ خضر افضل حیدر تم سے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور مسکرائی۔

”اوکے کب۔“

”کل کل ہی لے آؤ۔“

شاہ زنبب کے لیے میں ہاں دیا باوجود تھا۔

”مجھے فون کر دینا چاہیں تمہیں تیاروں گا کہ کہاں لانا ہے۔“ نہا نے سر ہلا دیا۔

”اور اب تمہیں جانیے گا خضر افضل حیدر جب وہ تمہاری شریف اور پاکیزہ مکتبہ غائب ہو جائے گی پھر میں تم سے پوچھوں گی کہ کیا اب میں باجی زبائن اس کا نام۔“ لاکھتی ہوں۔“

وہ دل ہی دل میں خضر سے مخاطب بھی اور اس کے یوں بے حد ہر پٹی سی مسکراہٹ تھی اور اپنی بیانیٹ

میں فریڈر بران ڈالے ہوئے شاہ زیب شاہ سوچ رہا تھا۔

”ہاؤوریٹی باب تمہیں بتا چکے گا کہ سید شاہ زیب شاہ پتا تھا اٹھائے گی کیا سزا ہے صرف میں ہی نہیں اور اب بھی تم سے مستفید ہوں گے تم موت مانگو اور موت تم سے دور بھاگے گی۔“ ایک ”دونوں اپنی اپنی سوچوں میں کم ایک دوسرے سے بے فکر تھا کہ اٹھائے میں مصروف تھے۔ جب خضر افضل نے کچھ دوستوں کے ساتھ چٹانہ میں قدم رکھا۔ پھر اسی وقت داکا نظر آئی۔ خضر اسے ہی دیکھ رہا تھا اس کے بولوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ تھی نظریں لٹے رہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ داکا رنگ سرخ ہوا اور اس کے اندر جلتی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے اپنے ٹیبلے پر گویا مرگادی۔ کل صرف کل تک یہ مسکراہٹ کسماہٹ کے لیے ہوں یہ خضر افضل حیدر کل کے بعد تراس طرح نہیں ہنس سکو گے۔ کل تم اس وقت اپنے بال فرج پر ہونے والے ہو گے اور۔“

”چلیں۔“ اس نے شاہ زیب شاہ کے ہاتھ پر اپنا سر مرزا دیا تھا۔

”ہاں۔“ شاہ زیب چلا نکلا۔  
”مٹے ہیں کیا خیال ہے کچھ شایک بھی نہ کر لی جائے۔ میں نے کل جیولر کے پاس ایک بڑا خوب صورت سیٹ دیکھا تھا۔“



”ختم خداس اس رہے گا کیا نہا۔“

پھر آج بہت دنوں بعد ان کے گھر آیا تھا۔

”اسٹریٹ بھی ایک سہ سے پہلی کے کام کے سلسلے میں کوئی نہ ہوئے ہیں ساقاقت نہیں ہوئی۔“

”وہ رشتہ۔“ ڈاکٹر حمنہ کے چہرے پر افسردگی تھی۔

”ان لوگوں نے طلاق کا کتنے کے بعد انکار کر دیا۔ حالانکہ ابھی کھٹ لوگ ہیں۔ میں نے خود لوگوں کو ساری تفصیل بتائی کہ لڑکی کا کافی قصور نہیں ہے لیکن۔“ خیر اللہ بستر کر گئے۔ تمہیں ان سے نہیں ملے تو میں نے دین لوگوں سے کہہ رکھا ہے۔“

پھر کابھی جا کر وہ ختم خداس سے کہے کہ ایک ایک بڑا پر اگر وہ خیال بھائی کے لیے بات کریں تو شاید! جان مان جائیں لیکن پھر وہ جھجک جائیں بھی اسٹریٹ سے اس خیال کی پینڈی کی خاطر ہو چکا تھا اور پھر وہ بھی جانتا تھا کہ قادی اٹکل خیال کے لیے اپنی جتنی کو پوز کر رہے ہیں اور اسکی بھی پر امید ہیں کہ شاید۔

”خیر اپنی میں سن ٹھیک تھے۔ ماموں جان علیہ خاتمہ اور سب۔“ اس نے ایک گہری سانس لے کر ان کی طرف

دیکھ کر انہیں سن ٹھیک تھے نصیر بھائی اور طبع کو تو منصور کا دکھ کا کیا ہے۔ دونوں بے حد کمزور ہو رہے تھے وہی کیا یہ نور کا نہ بھی یہ زرا سوا ہوا تھا۔ انہوں نے تفصیل بتائی۔

”ساری شادی میں اور اس افسردہ کی رہی۔“

”شادی تو ابھی طرح سے ہوئی علیحدہ اپنی کے سرال والے کیسے تھے۔“

”عینا کسرال کیا صرف لڑکا ہی تھا اور۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

”افضل بھائی تو بہت ریشاں تھے اور ان کی پریشانی سے جا بھی نہیں تھی ابھی شادی کو تین ماہ بھی نہیں ہوئے اور عینا ناراض ہو کر گھر آئی ہے۔ کل ہی میری افضل بھائی سے بات ہوئی ہے۔“

”کیوں۔“

”اسے پتا چل گیا ہے کہ عاقلہ کیلے نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ ایک بچہ کا بھی ہے۔ اس کی بیوی اس کی بچاؤ دے والدین کے مجبور کرنے پر شادی کی لیکن پھر بیوی سے نہ نہن کی اور پھر دیکھا ہوا گیا اسی والدین سے ناراضگی چل رہی تھی وہ کہتے تھے کہ اگر اس نے بیوی کو پھر دیا تو وہ تمام پر اپنی اس کے بیٹے اور بیوی کے ہم کوس گئے۔ انہیں میں سے پتا چل گیا عاقلہ کی شادی کا تو وہاں چاکا کین کرچی آئے اور انہوں نے عاقلہ کو پکے تو پھر دیکھا کہ وہ علیحدہ طلاق دے دے اور پھر معاملہ سامں ختم ہوا کہ عاقلہ دونوں بیویوں کو گھر

فی الحال تو علیحدہ گھر آئی ہے افضل بھائی کو شش کر رہے ہیں کہ معاملہ کسی طرح سیٹ ہو جائے۔“

پھر کو سارے حالات سن کر بے حد افسوس ہوا۔

”افضل بھائی کا خیال تو اسٹرک کے لیے تھا۔ بہت محنت کرتے ہیں وہ اسٹرک۔“ حمنہ نے بتایا۔

”اور شاہزادہ اسٹریٹ بھی جی جی جاتا ہے۔“ پھر کو سوجا اس کی نگاہوں کے سامنے اسٹریٹ کا سرورہ چہرہ آیا۔

”اور نرمل۔“ اس نے جھجکے ہوئے نہ بوجھا۔

”اس کی جاب کیا نہا۔“

”میں بھی جاب تو نہیں لی۔“ ہفت بھر پہلے اس کا فون آیا تھا لیکن وہ کہہ رہی تھی خضر نے کسی سے بات کی ہے جلد ہی مل جائے گی۔ بلکہ جھول ہی کی ہے۔“ پھر کو اطمینان ہوا۔ نرمل جاب کے لیے کتنی پریشان تھی

”شاہزادہ اور قادی اٹکل جانے تک آئیں میں چلا ہوں۔“ وہ حمنہ لگا تو حمنہ نے اسے بھجایا۔

”میں نے جاؤ بھی اسی عذر اور اور اٹکل نے کچھ کے ساتھ آ رہے ہیں۔ ان سے مل کر جانا۔“ حمنہ اس کا دل زور سے دھکا دے کتنے سارے دن ہونے لگے ان سے ملے۔

”کب تک آئیں گے۔“ اس نے دلی جذبول کو چھپانے کی کوشش کی لیکن پھر بھی تو آوازیں بھکی کر لزش

تھی۔

”گھر سے تو کچھ ہوئے ہیں رات میں کچھ شایک بھی کرنا تھی انہیں آتے ہی ہوں گے۔“

”اور کمن۔“

”وہ تو باسٹل میں ہوگی اس وقت۔“

”ایمان نے اس کے باؤں جاب کرنے پر کچھ کہا نہیں۔“

”میں جانتے تو ہو کہ وہ اس کے معاملے میں بالکل نہیں لیتے ہیں اور پھر اسٹریٹ سے پاسپورٹ کرنے کے لیے۔“

”لیکن کمن ایمان کی ناراضگی کی وجہ سے بہت پاسپورٹ راتی ہے۔“

”لیکن بھائی صاحب کو کون بھجائے بیٹھ سے اپنے ہی ہیں۔ آج تک اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی وہ مجھ سے ٹھیک طرح سے نہیں کرتے صرف اس لیے کہ ایمان جان اور افضل بھائی نے ان کا لایا پر پونل قیل

کرنے کے بجائے کای پونل قیل کیا تھا۔“

”وہ تو اب سے ناراضگی کی وجہ سے۔“ پھر کو پہلی بار علم ہوا۔

”ہاں اور ایک اور وجہ بھی ہے جس کا افضل اور افضل بھائی کے انکار کے بعد وہ بہت کرنے لگے تھے حالانکہ اس

سے پہلے انہوں نے بھی اسے اہمیت نہیں دی تھی۔“ حمنہ کے کچھ میں افسردگی تھی۔

”ڈاکٹر۔“ حمنہ نے پوچھا۔

”میں ایمان جان کی سگی بیٹی نہیں تھی۔“

”میں۔“ پھر کو بہت ہوئی آج سے پہلے کبھی کسی نے اشارہ نہیں کیا تھا۔

”ہاں یہ سچ ہے فقیہ میں نہیں جاتی میرے والدین کون ہیں۔ اس خیال میں بھی کیا نہیں۔ میں نے کبھی کرید

نہیں کی۔“ پھر کو سوجا نہیں ایمان جان اور ایمان جان نے بہت محنت دی تھی عذر اور وہ جس فرق میں رکھا تھے

ایمان کی زندگی تک اس کاظم میں تھا کہ میں ایمان جان اور ایمان کی بیٹی نہیں ہوں وہ حیدر اور افضل میرے گئے

بھائی نہیں میں عذر میری سگی نہیں ہے۔ وہ سب مجھ سے بہت جا کر کرتے تھے اور میں بھی ایمان جان اور حیدر

کی چاکا کین کتے کے بعد ایک دن بھائی صاحب نے بے اعتراف کیا تھا۔ میں بہت اب سیٹ کی بہت خراب تھ

کر رہی تھی جب افضل بھائی نے بے اختیار مجھ سے اپنے ساتھ لگا لیا اور پھر کھٹے۔ تو حوصلہ نہ گئے۔ تب

بھائی صاحب نے ایمان جان سے کہا۔

”پچھو جان پچھو کیا جو سگی معلومت تھی ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہوئی افضل اور حمنہ کو معلوم ہونا چاہیے

کردہ دونوں گئے، بس بھائی نہیں ہیں اور ان کی یہ بے تکلفی شرعاً جائز نہیں ہے۔“

مجھ پر ایک ساتھ دو عذاب ٹوٹ پڑے تھے وحید اور اباجان کی جدائی۔  
اور وہ سارے رشتے جو میرے لیے تھے ایک ان کا میرے لیے انہی بنائے گئے تھے اماں جان کی ذہنی حالت بہت اچھڑ ہوئی تھی ان سے انتہائی پتا چلا کہ۔ جب وحید ایک سال کا تھا اور افضل چھ سات سال کے تو اباجان اسلام آباد کسی کام سے گئے تھے وہاں آئے تو میں ان کے ساتھ تھی۔ ان کے ایک ڈاکٹر دوست نے مجھے ان کے حوالے کیا تھا کیونکہ وہ ملک سے باہر جا رہے تھے۔

میں ڈاکٹر صاحب کی اولاد نہ تھی میں ان کے پاس کہاں سے لگتی تھی۔ میرے والدین کون تھے اماں جان تفصیل نہ بتا سکی تھیں۔ دو بیٹے تھے، ایک بیٹی کی کہیں سے پوری کڑی مہم اماں جان اباجان سب شے چاہتے تھے میں دو سال کی بھی تب لیکن اپنا نام تک نہیں بیٹا سکتی تھی۔  
اماں جان نے بتایا تھا کہ میں اپنی طرف اشارہ کر کے کہتی تھی مایا ہوں دو سال بعد عذر راہیہ ہوئی تب بھی میرے لیے سب کی قیمتیں ایسی ہی تھیں۔ میں ان دنوں بہت اچھڑ رہی تھی۔ قافی نے ان دنوں بہت سارا دیا مجھے اماں جان کی ذہنی حالت ٹھیک نہ تھی۔ بھائی صاحب کا اصرار تھا کہ میری شادی کر دی جائے فوراً قافی نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ مانگ لیا۔

بہر حیرت سے سن رہا تھا جب یہ گاڑی کہاں رہا۔

”تو تمہارا مایا جان کون سی؟“

”جسے مسکرا کر میں تمہارے حق سے انکار کر رہا ہوں کیونکہ یہ میرا بعد اور بی بی دووانہ نکلا۔“

”ماں جان۔“ بہر حیرت اختیار کران کی طرف لپکا۔ اور کئی ہی دیر تک انہیں اپنے ہاتھوں میں لیے کھڑا رہا۔

”مہم تھی۔“

مدرش نے آہستہ سے کہا تو عذرا بیگم کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے وہ دھڑا اور انہم سے ملے لگا۔ ان سے مل کر عذرا بیگم کیس پی بیٹھ گیا۔

”ماں جان آپ ٹھیک تو ہیں یا بہت کمزور لگ رہی ہیں۔“

اس نے ان کا ہاتھ اپنے گھونٹوں میں لے لیا۔

”ماں میں ٹھیک ہوں لیکن تمہارے اباجان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ان دنوں۔“

”کیا ہوا انہیں۔“ بیکرم جیسے اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”سنو بھائی سے کہیں کی ڈاکٹر کیسپال نے جانیں انہیں۔“

”کچھ جانتے نہیں کیا تکلیف ہے۔ اور ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔“ عذرا بیگم کی آنکھوں میں نمی تھی۔

”میں نے کل رات پوچھا کہ طبیی کو ملاؤں تو جتنی سے منع کر دیا۔“

بہر حیرت کے چہرے کا رنگ بدلا اور اس نے ایک کمری سانس لے کر عذرا بیگم کا ہاتھ پھونکا۔ اسے ایک پرانی بات یاد آئی تھی جب غرا کو ہسپتال کے کمرانا پڑا تھا تو انہوں نے ڈاکٹر سے فرما دیا تھا۔

”انڈہ کرے میں تو ہسپتال تب ہی جاؤں۔ جب میرا بھی ڈاکٹر بن جائے۔“ ہسپتال میں کوئی اپنا ڈاکٹر نہ ہوتا ڈاکٹر پوچھتے تک نہیں مریض کو۔

اور اس پر ڈاکٹر بن چکا تھا۔

اس نے بھائی آجاسی تو وہ ایک بار ان کے ساتھ ضرور اباجان سے ملے جائے گا جیسے وہ دھکا رہی کیوں نہ دیں۔“

اس نے وہاں ہی بیٹھ بیٹھ بیٹھ لے لیا کہ ایک دم سے بچے بن ہو گیا تھا۔

”تکلیف کیا بتاتے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”خند سے تو کچھ بولتے نہیں بیٹے کو سنے رہے ہیں۔ کل رات تو سانس بھی اکڑا کر آیا تھا اور مجھے تو یوں لگا تھا جیسے ہتھیلیاں بھی نہیں ہو رہی ہوں۔“ اسنو تھا تو میں اودھ شری بات انہوں نے سنی ہی نہیں۔ ہاں اسنو اس حالت میں زبردستی کہیں بھی جانے لگا ہوا تھا۔

عذرا بیگم پریشان تھیں۔ وہ میری پریشان ہو گیا۔

”میں چپک چپک گئی اندازہ تو ہو جا کہ میں خدا خواست۔“

”آئی تو تھی وہ کمرے میں لیکن وہ کوہ بدل کر لٹ کے اور مجھ سے کہا کہ لائٹ آف کر دو میں سونا چاہتا ہوں

”تم کماز کچھ بھی کھان کھان کر دو میں بخیر ہو جاتی گی۔“

”میں اور قافی فوراً آجاتے۔“

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ نہیں منع کر دیتے۔“

”بہن خیال ہی نہیں کیا۔“

”خند رات کو میں اور قافی پھر لگا گئیں گے تو چپک کریں گے بھائی صاحب کو قافی۔“

”خند خال ضرور جائے گا آپ جھگڑا کر رہے کہ کہیں انجمن کا تکیف تو میں ہو گی اباجان کو۔“

”میں نے منتظر نظروں سے حزن کو دیکھا۔“

”تم فکرت کر دو۔ جس جاتی ہوں کہ بھائی صاحب کو کیسے منڈل کرنا ہے یہ تمہاری امی جان ہی جانتے سالوں میں

نہیں جان سکیں انہیں۔“ بے غمرا اس وقت میری بات پر عمل کر تیں تاہم۔ یاد ہے میں نے انہیں کتنا روغایا تھا کہ اس واڑھی والے بابے سے شادی کرنے سے انکار کرو۔“

خند نے موضوع بدلنا چاہا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئیں۔

عذرا کے پونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”جھوٹ دھماکے تو نہیں لگتے تھے ان کے چہرے پر واڑھی خوب جیتی تھی۔“

بلکی چھلکی گفتگو کے دوران سب نے چائے پی اور پھر عذرا بیگم اودھ شری کمرے ہوئے۔

”ماں جی ملدی۔“

بہر حیرت کا ہاتھ ہوا تھا کہ وہ ابھی اور بیٹھیں۔

”میں ان انتظار کر رہی ہو گی اسے بھی پک کرنا ہے۔ باتوں میں تھوڑی دیر ہو گی ہے۔ اسنو نہیں ہے تاور نہ

وہی پک کر آتا۔“

”میں بھی چلا ہوں اب۔“

”شہر پر کا انتظار نہیں کرو گے۔“ خند نے پوچھا۔

”میں مدھر مجھے راستے میں ڈراپ کر دے گا۔“ وہ لاؤنچ میں کھڑے تھے جب شاہ رخ نے اندر قدم رکھا۔

”اسلام بیگم۔“ وہ چپک کرک گیا۔

”اے شاہ رخ بیٹا آؤ۔“ خند نے آگے دھتے ہوئے کہا۔

”کوپا ہے جی میں سب۔ یہ اسٹری والا دھبہ اور پھر جوتا بھائی۔ طبیی کو تو تم جانتے ہی ہو۔“ انہوں نے تعارف کر دیا۔

”عذرا بیگم شاہ رخ سے ہمارا بھتیجا۔ قافی کا سوتلا بھائی۔ اپنے اسٹی کا دوست بھی ہے۔“

”ہاں اسنو کرنا رہتا ہے جیسے ہو بیٹا۔“ عذرا بیگم نے دعاوی شاہ رخ کو عذرا بیگم بہت اچھی لگیں۔ چہرے پر نرم نرم تازگیوں میں دیکھ رہی تھیں۔ ”وہ میرا ختم ہے اسٹی کی بہن ہے۔“

”خسرنے پھر اسٹنڈ جانے کا چانس مس کر دیا۔ جسے کبھی نے جن دلائلوں کو ابھار کر پیش کے لیے باہر بھجوا کر دے لیکن اس کا تھان میں اس کا نام بھی تھا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔“

”ہاں وہ تو کئی وجہ سے پریشان رہتا ہے۔ ابھی چلی ڈی کے کہ لاکھوں میں نہ ملے لیکن اس شخص کی بلکہ اس کی بھانجی کی کیٹکی کی وجہ سے خواہ مخواہ طلاق کا داغ لگ گیا اور شادی بھی آئے آپ طلاق کا سن کر لپٹ جا رہے۔“

”خسرنے کو حقیقتاً کدھ تھا۔“

”بھئی تو کسی صورت اس شادی کے لیے تیار نہیں ہو رہا، شام ۴ بجے سے چھوٹا ہے پھر بھی سوچ جائے ہوں شادی سے پوچھ کر ایک بار پھر بھائی صاحب سے بات کروں۔ جس شخص کا نصیب بنی ہماری کئی اس کی زندگی تو سنور جائے گی۔“

شادی کے آنکھوں کے سامنے سیاہ چادر کے بالے میں چھپا افسردہ سا چہرہ دکھایا اور پھر ساتھ ہی اس کا خیال آیا۔ کتنا پریشان تھا وہ کیے کے لیے اور وہ کیے کی بات تھی اس کے لیے اس پریشانی میں اس کی مدد کر سکتے تھے۔

”کی جان میرے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔“ اس نے باخفا یاری ان کے لبوں سے نکلا۔

”اگر اس کے لیے میں صاحبہ مجھے قبول کر لیں گے۔“

”کیا۔ کیا کہہ رہے ہو تم شادی۔“ خسرنے کو از حد حیرت ہوئی۔

”سفر پر بہت اچھا دوست ہے۔ کئی جان اور وہ بہت پریشان رہتا ہے۔“

”لیکن شادی رو پھا جاتے ہو جیسا کہ ممکن نہیں ہے شادی بھی نہیں ہائیں گے۔“

”میں کو شش کروں گا انہیں منانے کی۔“ شادی نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔

”اور اگر وہ نہ مانے تو؟“

”تو میرا بھی فیصلہ اگلے ہے۔“



”میں پھر سوچنے کے بعد شادی نے خسرنے کو جواب دیا۔“

”میں شادی۔“ خسرنے نے جین کو ہنسنے سے روک دیا۔

”شادی کئی کئی سالوں سے کہہ رہی تھی کہ میری شادی خاندان میں شادی کروا دو ایسی صورت میں۔“

”میں یہ آسمان میں سے شادی نہیں لے سکتی تھی۔“ خسرنے نے کہا اور وہ جواب دے کہ وہ کبھی بھی کھل کر خوش نہیں ہو سکے ہیں۔ کئی کئی بار انہیں جانے دیکھا ہے۔ وہ راتوں کو کٹھ کر رہا کرتے تھے۔

”ابنوں کے بغیر ہر خوشی اور مصروفی ہوتی ہے۔“

شادی نے خیال دل سے نکال دیا میری جان کتنی بار میں شرمندہ ہوئی کتنی بار میں نے گھٹی لپٹ لپٹ کر آنے تک کرتی ہوں کہ میں نے کبھی اسے شادی کے لیے شادی کے خاندان اور لوگوں سے بچھڑنے کے بعد دلی موت ہوئے۔

”جسب لالاجی بچھڑے تو قادی خون کے آنسو رو تھے۔“

شادی نے خاموشی سے ان کی بات سنی۔ کئی قہور تھا اس بے حد دلکش اور معصوم لڑکی کا۔ انہیں کس نہ کہیں تو شادی کرتا تھی تو پھر اس سے کیل نہیں۔

”وہ اس پریشانی اور کتنے سے پھر کچھ شادی کو مانیں گے۔ یہ تو سچ ہے اس کا بڑا اجر ہے۔“

”انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔“

”بچی جان آپ فکر نہ کریں میں شادی کو مانوں گا۔“

”ان کے لیے میں یقین تھا میں خسرنے کا جس کی کہیں قادی کے لیے میں بھی تھا۔ بعد اسے اس کے باپ اور بھائی کی موت کا پھر سہے کر حویلی جا رہے تھے لیکن ان کے پاس ان کے چچا کی ان کے پورے وجود میں چھپی ہوئی تھیں۔“

”ابعد خالہ سے بات کر لیجئے گا کہ وہ اب احم کے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں حویلی سے آکر پچھو کو آپ کے ساتھ بیٹھوں گا۔“ ان کا بھائی تھا۔

خسرنے کو اچانک ہی احم کا خیال آیا تھا جو درے جیسے ہٹ کر کھڑی تھی۔ چادر میں اسے بندھ کر چھپائے وہ بھی کسی طرف دیکھ رہی تھی۔ شادی کے نظریں اس کے ہاتھ کے لیے اس کی طرف اٹھی تھیں لیکن اس نے اسے فوراً ہی نظریں جھکا لیں اور دھڑکی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”تو آپ یہ دھڑکاؤ شادی آپ کی ذہانت اور کامیابیوں کا ذکر ہے۔ بہت۔“

”مگر شادی کا اور ایک دھڑکاؤ بھی تھا۔ احم اس کے لبوں پر آکر معدوم ہو گئی۔“

”شادی شاید بیٹھیں ہی آف کر کے آئی ہوں۔“

خسرنے غور کیا اور بچوں کے ساتھ باہر پورے تک آئیں۔ شادی نے لاؤنچ میں ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔

”کیسے وہ شادی کی شادی روزی کیا کسی چیز سے تلوں سے ملاکتی ہیں۔“

”نہیں۔ وہ کبھی بھی جان اور پچھو بھی ٹھیک ہی ہیں۔“ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

”میرے اس کا ہاؤس جاب شروع ہو گیا ہے۔“ کئی کے پیڑز بھی ہو رہے ہیں۔ میرے خیال میں عقلی کے پیڑز کے بعد سب واپس حویلی چلے جائیں گے۔“ خسرنے خیال ظاہر کیا۔

”ہاں۔“ شادی نے فرماتے ہوئے کہا۔

”شادی کی کہہ تو رہے تھے کہ ہاؤس جاب کو ضروری نہیں۔ میں نے ہی مذکور ہے کہ اس کا ہاؤس جاب کر لے۔“

”مگر اچھا ہے پھر نہیں آئے کیا۔ کب تک ارادہ ہے ان کا۔“

”معدوم نہیں اب جان کہہ رہے تھے عبدالغفار صاحب اپنی والدہ کی بری کے بعد ہی آئے کو کہہ رہے ہیں۔“

شادی نے بتایا۔

”اور وہ بلند بخت کے والدین آئے تھے پچھلے دنوں میری عقلی تھی میں نے ان کے دل میں بات ڈالی تھی کہ بلند بخت کے لیے عقلی اور پھر کراچی والے رشتے کی بات تھانے کا خیال ہی نہ رہا اور وہ لوگ اچانک آگئے لاہور میں نے تو منع کیا تھا کہ اس سلسلے میں بات نہ کریں۔ ہاں اب لوگ رتی و کوسو سے ملنا چاہتے ہیں تو ضرور ہیں لیکن رتی و کوسو سے عقلیوں میں انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔“

”ہاں پچھو نے بتایا تھا مجھے۔“

”شادی نے ثابت میں سر ہلایا۔“

”بلند بخت کی والدہ نے خواہش ظاہر کی تھی۔“ اسے اچھے لوگ ہیں وہ بلند بخت بھی بہترین انسان ہے اپنی عقلی بہت خوش رہے لیکن شادی زبان سے کہتے ہیں۔ پچھو نے بتا دیا تھا انہیں کہ یہ ممکن نہیں۔ وہ حویلی جانا چاہ رہے تھے لیکن رتی و کوسو نے انہیں منع کر دیا۔“

”شادی نے ایک گہری سانس لی۔“

”ابا جان نے ان زبان نہ دی ہوئی تو میں کم از کم عقلی کے لیے اس پر عمل کر سکتا تھا کیونکہ وہ لوگ سید ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے لیکن ابا کیا کیا سکتا ہے۔“

”مجھے لگتا ہے جیسے عقلی کو شادی کا فیصلہ نہیں آیا۔ آپ نے محسوس نہیں کیا چچی جان وہ بہت خاموش رہتے تھے۔ بہت افسردہ اور پسے کے مقابلے میں کدور بھی ہو گئی ہے۔“

”شادی نے بات اور پچھو کی۔“ وہ خسرنے کے سامنے اپنے اس گمان کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے انہیں لگتا ہے جیسے عقلی بلند بخت کو پسند کر رہی ہے۔

”ہاں اسٹریک آپ کہہ رہے ہیں پچھو شادی نے۔“

”انہوں نے فوراً بات بدل دی تھی۔“

”میں نہیں کو تو علم نہ تھا اور مدد سے پوچھا ہی نہیں میں نے۔“

”مکان پہلی جگہ جانا بھی ساتھ ہوئے۔“  
 حزن کو خاموش دیکھ کر وہ ہلے سے سگڑائے۔

”تم جی جا رہے ہو۔“

”ہاں بیٹے کو جاب میں سب اور منڈے کو واپس آجائیں گے۔ زارا نکلی ہوئی ہے جو لی زینی پچھو اس سے  
 ملنا چاہو رہی ہیں۔ اور اس کا غلطی بھی۔“

اشتیاق ہے اس سے ملنے کا شاہد زب بھی ساتھ ہے کیا۔“

”میں زب ساتھ نہیں کیا۔ شادی کے تھے کہ اپنی بیٹی ملانے ہیں ساتھ۔“

شاہد سے بتایا۔ اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اوپر کے چینی میں چلا ہوں اب قادی چاچو اور شام کو خیر اسلام دینے گا واپس آکر اشاء اللہ ملاقات ہوگی۔  
 شعی کب آ رہا ہے لاہور دیکھا بی بی آئے گا۔ میری ملاقات تو نہ ہو سکی۔“

”فحشی کا لڑا سفر ہو گیا ہے ساہو اگلے سڑے کو آئے گا جو ان کرنے کے بعد ہفتہ بھر رہے گا۔“ ہمنہ نے  
 بتایا۔ ”بچہ تو ملاقات رہے گی اشاء اللہ۔“

”شاہد بیٹے زنگ رہا ہے۔“ نیا کلا بھر سوچ کر شاہد سے بات مت کرنا کوئی بھی وہ کبھی نہیں مائیں گے اور  
 یوں ہی خواہ مخواہ نکلی ہوگی۔

”کب پریشان نہ ہوں بیٹی کچھ نہیں ہوگا۔“

شاہد آج انہیں لی دے چکے تھے لیکن وہ ایک مہی بہت پریشان ہو گئی تھیں انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کا  
 کیا انجام ہو گا ابھی تو شاہد کی کو ان کے اور قادی کے جوئی جانے کا ہی بہت قصہ تھا اور کبھی ہی شاہد اس کا اظہار زینی  
 آیا اور ابرار شاہ کے سامنے کر چکے تھے۔ لیکن شاہد غمی آنکھوں میں وہی عزم تھا جو برسوں پہلے قائم علی شاہ کی  
 آنکھوں میں تھا۔

”اللہ اشاء کی مدد کرے کہ کوئی عطا کرنا اشاء شاہد شاہ کو اس دکھ سے نہ گزارنا جس سے قائم علی شاہ گذرے  
 ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بے اختیار دھما گئے تھیں۔



”پچھو میں ہسپتال جاری ہوں۔“  
 اس نے زینت فاطمہ کے بیڑوم کے دروازے سے اندر جھانکا۔ زینت فاطمہ نے قرآن پڑھتے پڑھتے نظر اٹھا کر

اسے دیکھا۔

”عظمیٰ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ساری ساری رات جاگ کر سوئے گی تو طبیعت کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے اس کی۔“

اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

”آپ سے سمجھا لی ہیں نہیں پچھو۔“ سارا میں باز پر گاؤں لٹکانے اندر کرے میں ہی آئی۔

”کیا تمھارا سہوہہ بھی کئی تو۔“ زینت فاطمہ کے گیسے میں سے کسی بھی۔

”اور آپ کو بتا ہے پچھو اپنے ساتھ ساتھ اس نے بلند بخت کو بھی پریشان کر رکھا ہے۔ انہیں فون کرتی ہے  
 مرنے اور مرنے کی بات کرتی ہے۔ یہ سچ تو نہیں ہے تا پچھو اور پچھو سے زب نہیں دیتا اس طرح بلند بخت

کو بار بار فون کرتا۔ کل ازل بلند بخت نے مجھ سے کہا کہ اسے سمجھا میں مجھے کیوں بار بار مرنے کا گیتا کر دندہ  
 دو گوا کر رہی ہے۔ اس سے کہیں کہ مجھے بتانے میں کیا کہوں کہ اسے تسلی ہو جائے مجھ سے اس کا اس طرح رونما

نزدیک کھا میں جاتا۔ نہیں میں چاہتا ہوں کہ میری کھانہ کھائے پچھو سے وہ جا میں۔“

اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”پچھو غلطی ہے ان سے کہا ہے کہ وہ ایک بار لی بی بی جان اور شاہد کے پاس جو لی جا کر ان کو پچھو میں  
 کو خوش تو کرں اور بلند بخت نے وعدہ کر لیا ہے غلطی ہے کہ وہ جلد ہی اپنے والدین کے ساتھ جو لی جائے گا اور  
 اگر وہاں سے نکلا ہو کیا پچھو چھوڑے انہیں فون کرے گی اور نہ مرنے کی باتیں کرے گی۔“

”میں منع نہیں کیا کیا بلند بخت کو۔ شاہد زب ان سے ملے گا۔ میں مائیں۔“

”کہا تھا پچھو۔ سمجھا تھا غلطی کو بھی اور بلند بخت کو بھی۔ غلطی تھی ہے کہ اسے بہت حسرت نہیں رہے گی کہ  
 اس نے کو خوش کیے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیے تھے وہ جتنی ہے پچھو میں موت سے پہلے پہنچنے کے ہر امکان کو اوہل  
 کرنا چاہتی ہوں اور بلند بخت کہتا ہے کہ وہ میں چاہتا کہ غلطی مجھے کہ اس کے آسورا یگان گئے۔ وہ ایک بار تو

خود مارنے پندالہ دین کو جو لی بیٹھے گا۔“

”ناہل ہو گئی ہے۔“ زینت فاطمہ پریشان ہو گئیں۔

”تم سمجھا کر واسے۔“

”یہ میری بات نہیں سمجھتی پچھو اب سمجھاں اسے کہ بلند بخت کو منع کر دے جو لی جانے سے مجھے چتا  
 نہیں کیوں بہت زنگ رہا ہے اور وہ غلطی اس نے کی تو میرا ایجنڈا تو رکھا ہی نہیں بلند بخت کا ساتھ یا موت چتا  
 نہیں کیا سوچ کر رکھا ہے اس نے اور بتا نہیں کیا کرے گا۔“

پچھو بہت پریشان تھیں جو لی۔ غلطی کے بچے ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی کیوں جاب کرے۔ شاہد بھی صبح تو کہتے ہیں  
 کہ کیا کرنا ہے مجھے ہاں جاب کر کے یہ تو شاہد جھانکی ضد ہے کہ اب قتل کر گیا ہے تو ہاں جاب کر لی اول؟

”ہاں تو صبح اتنے شاہد نے کر لو اور لی بی بی جان کا فون کیا تھا کہ غلطی ظاہر ہو گئی ہے تو جو لی واپس بھجوا دیں ایک  
 دو روز میں شاہد شاہد خود آ رہے ہیں کسی کام سے غلطی کو ساتھ ہی لے جائیں گے۔“

زینت فاطمہ نے بتایا۔

”تو پچھو پچھو ہم بھی ساتھ ہی چلیں گے غلطی وہاں آئیگی پچھو وہ تو۔ نہیں پچھو مجھے ہاں جاب نہیں کرنا۔  
 ہم اٹھنے جائیں گے جو لی۔“

”تم سمجھاؤ شہد سے قیامت کرں گے اس سے ہم بھی تو مہر جاؤ اور شاہد میری کیا چلا گیا ہے۔“

”میں شہد میرا سو رہا ہے۔ کل ہے اس کا انٹرویو شاہد سے بھائی نے بتایا ہے۔ بہت اچھی پوسٹ ہے۔ پچھو  
 آپ غلطی سے ضرورت پچھتے ہیں۔“

جائے جاتے اس نے پھر کہا۔ تو زینت فاطمہ نے سر ہلا دیا اور قرآن شریف کو جڑوں میں لپیٹ کر کارپس پر رکھا۔

”اب سمجھ کتنی ہیں میں غریبوں میں زیادتی ہوئی ہے۔ ہمیں آئے ہیں کچھ دیر ہو گئی۔ ہر حال اللہ غلطی بیٹی  
 کو خوش کرے۔“

بلند بخت کے والد نے بہت شائستگی سے کہا تھا۔

زینت فاطمہ کو وہ دونوں بہت اچھے تھے طہور اور نرم مزاج۔ پچھلے دنوں جب وہ سب زارا سے ملنے جو لی  
 گئے تھے تو ایک بار ان کا کسی چلا تھا کہ وہ لی بی بی جان سے کہیں کہ بلند بخت کے والدین آئے تھے لیکن پچھو دوری  
 کی تھیں کہ کہیں لی بی بی جان بخائی نہ ہو جائیں اور پھر زارا کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھیں انہیں زارا تو پیشہ سے

بہت عزیز تھی۔ بہت محبت تھی انہیں اس سے۔

”تم کہنے کا کیا حالت بار کبھی ہے اپنی زارا۔“ اس سے ملے ہوئے انہوں نے دکھ سے اسے دیکھا تھا۔

”ٹھیک تو ہوں پچھو۔“ وہ ادا سے مسکرا دی تھی۔

”میں تم ٹھیک نہیں ہوں زارا کیا بات ہے شاہد زب تو ٹھیک ہے تا تمہارے ساتھ۔“

خانی میں اسی روز انہوں نے پوچھا تھا۔ زارا نے نظریں جھکا لی تھیں۔

”ٹھیک ہیں پچھو۔“



دیکھ کر پتا نشان بھی نہ ملتا اور آپ جانتی ہیں تاہم ایسا کر سکتے ہیں اور یہ لڑکا زینت فاطمہ پر لڑکا آج جاتی ہوں گی  
 ضرور یہ اس عباس مرزا کا بیٹا ہے جسے سید پور سے واپس آنا غیب میں ہوا تھا۔ کہیں یہ سب آپ کا بیٹا اور  
 نہیں ہے سیدہ زینت فاطمہ۔ انہوں نے اسے پتا نہ کیا زینت فاطمہ کے کندھوں پر رکھ کر دیکھا ڈالا۔  
 ”وہ لڑکا اپنے والدین کے ساتھ اونچی ہوئی جھمرا ہوا تھا اور ابرار شاہ اس کے والدین کو لے کر رہی ہوئی آئے  
 تھے یہ ابرار شاہ کو بھی دست خن ہو چلا ہے لوگوں کو پوری جوئی مانے کا بھی قلم علی شاہ کو ساتھ لے کر آج آج ہے اور  
 کبھی اپنے مقتول دوست کی بہن اور بہنوئی کو۔“  
 زینت فاطمہ ساکت بیٹھی تھیں اور انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کے کندھے شادی کے کپڑوں کے پلوے ڈھٹ  
 رہے ہوں۔

”اور آپ کو یاد ہو گا زینت فاطمہ وہ ابرار علی شاہ کا دوست جس نے اونچی ہوئی کے گٹ پر رک کر پیچھے مڑ کر  
 دیکھنے کی اجازت کی تھی۔ وہ اور اس کا اٹھاس۔“ انہوں نے زینت فاطمہ کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا لیا۔  
 اور وہ کبھی نہیں اسے اور اس کے کونجہ مرنہ جسم جو علی کے منہ میں رہا تھا۔  
 ”سمجھاؤ شاہوں غم شاہ کو اسے کدوے کے آئندہ وہاں کا رخ نہ کرے نہیں تو اس کے کسے کی طرح اسے بھی  
 اس کے کمال باپ ساری زندگی روئے پھرے گئے۔“  
 زینت فاطمہ کے دل میں چھپی نفرت یکدم بھڑک کر چھپے پورے وجود میں پھیل گئی۔  
 عباس مرزا اور بلند بخت کے چہرے ان کی نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔  
 ”نہیں۔“ انہوں نے کہا تھا میں ان کے ہونٹ بند تھے۔  
 ”اور سامان وغیرہ چاندھ لوکل کچھ واپس جوئی جانا ہے آپ کو سیدہ اماں اور سیدہ عظمیٰ کو اب بھی میں آگے فیصل آباد  
 جا رہا ہوں کل رات واپس آؤں گا۔ نہیں کا سودا کرنا ہے تم کو کتنا تار مٹا۔“  
 وہ پھر صوفے پر بیٹھے اور پھر زینت فاطمہ کو دیکھا۔ جن کا رنگ جلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔  
 ”سیدہ زینت فاطمہ۔“

اب کے ان کا لہجہ اور نواز آہستہ تھی لیکن اس میں ہلکی ٹھنڈک اور عینیت تھی۔  
 ”ابرار علی شاہ کا دوست بہت دنوں سے جوئی میں جھمرا ہوا تھا۔ اور اب لڑکا اونچی ہوئی جاتی تھیں اور ہمیں  
 یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ نہیں گئی تھی کہ اسے پیچھے خزانہ دیکھنے اور سرکار نے کی جرات آپ نے منطقی تھی۔“  
 زینت فاطمہ نے بے اختیار سر اٹھا کر شادی کو دیکھا جو عجیب نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔  
 ”تسک دینے ایک نظر کا مجرم سمجھتی رہیں ساری زندگی وہ صرف ایک نظر کا مجرم تھے حالانکہ شادی انہیں بھی  
 مجرم سمجھتے رہے ساری زندگی اور اس لیے کہ انھیں کبھی کسی جرم کی سزا دی گئی تھی وہ تو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔“  
 ”اور اب کبھی ہم نادان نہیں ہیں زینت فاطمہ ہمیں اندازہ لگاتے ہیں کہ چھ دنوں سے ہمیں لگا تھا کہ بلند بخت  
 کے والدین کو جوئی تک آنے کی جرات کیسے اور کیوں ہوئی۔ اور اس طرح کا دم عورت کے سامنے یہ اٹھنا  
 ہے۔ بلند بخت کی پشت پر آپ ہیں عظمیٰ شاہ ہمیں اس پر بحث نہیں کریں۔ قصور اگر عظمیٰ شاہ کا بھی ہے تو آپ  
 برابر کی قصور وار ہیں کہ آپ کو یہاں عمرانی کے لیے بھجوا دیا تھا نہ یہ کہ اسے کسی پرانے جند بے کی لکھن کے  
 لیے۔“

”ہم نے جو نہیں بھی کہا سیدہ زینت فاطمہ یقیناً آپ نے بھی یہی جان لیا ہو گا۔  
 عیضاً۔“ انہوں نے کہا بات بڑھ کر کے عیضاً کو آواز دی۔  
 ”جی شادی۔“ وہ ہنسی ہوئی تھی۔  
 ”زینت فاطمہ نے نظروں اٹھائی تھیں اور عیضاً پر سے ہوئی ان کی نظروں شاہ میرا اور عظمیٰ پر  
 پڑی تھیں وہ اپنے آپ کے گرد و آسپاس پر گھومے تھے۔  
 تو کیا دونوں نے وہ بے کھ شاہ شادی نہ کیا تھا نہیں وہ کب سے وہاں کھڑے تھے انہوں نے نظروں جھکا لیں

اور گوشہ دھرے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگیں۔ عمر بھر کی ریاضت چند لمحوں میں مٹی میں مل گئی تھی۔

”اپنی اور رکھ دو۔“  
 انہیں شادی کی آواز آئی اور اسے آتی محسوس ہوئی۔  
 ”السلام علیکم شادی۔“ شاہ میرے کمرے سے باہر نکل آیا۔  
 ”اسے سیدہ زینت فاطمہ۔“  
 شادی ہاتھ کر اس سے مل گئے اور انہوں نے پھر نظروں اٹھا کر عظمیٰ کو دیکھا جو ایک ہاتھ کا زبردھرے انہیں  
 دیکھ رہی تھی نظروں میں قیود تھے آہستہ آہستہ چلی ہوئی لاؤنچ میں ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔  
 ”السلام علیکم شادی۔“

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔  
 ”بھائی بھائی بھائی خیر ہوئی ہے تم لوگوں کی تواب جو علی علی کی تیار کی کرو۔“  
 وہ خاموشی سے زینت فاطمہ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ بائیں ٹھیرا دایں طور پر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ شادی شاہ  
 میری طرف متوجہ ہو گئے۔  
 ”تو شاہ میرے ہاتھ پر اپنی ہوئی۔“  
 ”رات کو ہی کیا ہوں شادی۔“  
 ”غیب سید پر کی کہاں کہاں گئے تھے۔“

”جی شادی میری بھیمون تھی اگلے غیب۔“  
 ”اور اب کیا ارادہ ہے میں کل سب واپس جوئی جا رہے ہیں تم بھی چلو کیا کرنا ہے تو کبھی کر کے۔“  
 ”جی شادی ابھی تو کچھ سوچا نہیں خاص اگلے جگہ انٹرویو دینے جانا ہے۔“  
 ”چلو شوق ہے تو کچھ دن کو روڑ نہ لکھی کوئی ضرورت نہیں۔“  
 شاہ میرے خاموش ہی رہا۔

”یہ سیدہ اماں شاہ تک آجاتی ہیں، پتال سے۔“ انہوں نے عظمیٰ کی طرف دیکھا۔  
 ”دو بجے تک آجائیں گی آج۔“  
 ”نیک ہے کل ملاقات ہوئی اسے فون کر کے بتا دو کہ کل جوئی واپس جا رہے ہیں سب کچھ قانون شنوں ہو گا  
 تانے کا توتا دے گی۔“  
 عظمیٰ نے انہیں میں سر ملادیا۔  
 ”اور شاہوں بھی اس کس میں ہو گا جاتے ہوئے مل لوں گا۔“  
 وہ کھٹکھٹے ہوئے۔

شادی آپ انہیں جارہے ہیں۔ شاہ میرے پوچھا۔  
 ”ہاں یہ فیصل آباد جانا ہے کچھ نہیں کا سودا کیا ہے۔“  
 ”کیا فیصل آباد میں۔“

”نہیں اپنے ہی علاقے میں سے نہیں چوہری صابر کی وہ فیصل آباد میں رہتا ہے دو تیس سے اسی کے کپا دادا کی  
 نہیں ہے۔ بڑے عرصے سے جات رہی تھی اب آکر وہ راضی ہوا ہے۔“  
 ”اور باہر یہ شاہ کو کس کی بددردی کا بھڑکا ہے ہمارا بی بی جان کدو رہی تھیں فون کیا ہے اس کا۔“  
 ”جی کیا سب میں سمجھا نہیں آپ کی بات۔“  
 شاہ میرے حیرت سے پوچھا تو انہوں نے سوالیہ نظروں سے زینت فاطمہ کی طرف دیکھا۔ زینت فاطمہ کا سر بے  
 اختصار تنہا میں مل گیا وہ کچھ سمجھ جاتی تھیں کہ کیا بات ہے۔

تو ہر شخص جا رہا ہوں بات کروں گا۔

بات کر کے انہوں نے جھٹھل کو آواز دی۔

”یہ گھڑا کو گویا ہر گاڑی میں جا کر بیٹھ لیصل آباد جانا ہے میرے ساتھ۔“

گھڑا اور کے کام کے لیے تھا اور گاؤں سے یہ شاہ جی نے اسے ساتھ بھیجا تھا ہاں تیرہ سال کا لڑکا تھا اور

عجسٹاں کا بچا تھا۔

زینت فاطمہ کے دو میں لکھ بھر کے لیے ارتعاش سایہ ہوا۔

”یہ شاہی گھڑا کو اسے ساتھ کیوں لے جا رہے ہیں۔“

شاہی اور شاہ میرے کپارے کے بعد انہوں نے زینت فاطمہ کے انداز میں عظمیٰ کا ہونڈ بھجھوا دیا۔

”وہ پوچھ میں کے گھڑا سے کچھ پوچھ جان لیں گے۔ سب قادی منہ ڈھنجھی شاہو ب آتے ہیں یہاں۔

وہ اسے لے توڑ کر لے کر جا رہے ہیں۔ عظمیٰ عظمیٰ قادی کو فون کر چل دی تباہ سو کچھ چھپ جانے چلا جائے

ہیں گاؤں کے شاہی اسے۔“

”چھپو چھپو کیا ہوا ہے آپ کو کچھ نہیں ہو گا کیوں اتنی گھبراہٹ ہیں آپ۔“

عظمیٰ نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تسلی دی۔

”اور پھر گھڑا کب جاتا ہے قادی چاہو کاوڑ۔“

”تو میں جانتی۔“ نہیں جانتی تھی۔ انہوں نے اس کی بات کاٹی۔

”وہ سب اگلا میں کے گھڑا سے۔ وہ اسے قادی سے ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔ انہیں اندازہ لگانے میں کتنی

ذریعے کی عظمیٰ کہ گھر آئے والے ڈاکٹر اور لڈی ڈاکٹر۔“

”تو جان میں سب آپ کیوں ڈر رہی ہیں۔“ وہ آپ کے بھائی ہیں اسے ہی جیسے شاہی۔“

عظمیٰ نے اپنا ہاتھ ان کے گرد مائل کرتے ہوئے انہیں ساتھ لگا لیا۔ وہ کسی سے بچنے کی طس اس کے ساتھ

لگ گئیں۔

”چھپو۔ شاہی کیا کہہ رہے تھے اور یہیں میں نے سب سنا ہے۔ وہ بلند بخت کے ای ابو کے وہاں جانے پر

ناراض ہو رہے تھے تاہم اس میں کیا حرج تھا۔ ایک بار موت سے پلٹے جینے کی کوشش تو کرنا چاہیے نا چھپو۔“

وہ بولے بولے بول رہی تھی۔

”وہ وہ کیا کہہ رہے تھے کہ انہوں نے کسی کو مرادیا تھا۔“

وہ قہوڑا سا بھجھی۔

وہ بلند بخت کے جو کاموں ہمارے گاؤں میں مارے گئے تھے کیا انہیں شاہی نے مرادیا تھا اور کیا آپ آپ ان

سے محبت کرتی تھیں چھپو اور کیا۔“

”نہیں۔“ زینت فاطمہ زینت کے سید میں ہو گئیں۔

”میں نے تو پہلی بار سے تب دیکھا تھا جب لوہی حویلی جاری تھی۔ پہلی اور آخری بار۔“

انہوں نے عظمیٰ شاہ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

عظمیٰ نے سب بڑبڑ سے سنا اور بھی دیر ہوئی خاموش بیٹھی رہی۔

”بلند بخت کے کاموں کو شاہی نے قتل کروایا ہے۔“ اس نے جیسے خود سے مرگوئی کی۔

”تو چھپو لوگ قتل کے سب میں اپنی بیٹیاں بھی تو نہ دیا کرتے ہیں نا۔ میں شاہی کا قصاص ادا

کروں گی۔ چھپو میں کسی ہون بلند بخت کو نہ لکھنے لے جائے اپنے کاموں کے قتل کے قصاص میں۔“

”عظمیٰ کیا کہہ رہی ہو۔“ زینت فاطمہ جیسے ہوش میں آئی تھی۔

”میں چھپو میں کچھ کہہ رہی ہوں بلند بخت نہ کیا تو میں خوب جانوں کی اس کے ہاتھ کے گھر۔“

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پورے دو دے جیسے آگ نکل رہی تھی۔

زینت فاطمہ زینت سے آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھیں۔

وہ تو بہت حساس تھی بہت نرم ہونہ وہ کسی چیز کا بچے کو مرے تو دیکھ نہ سکتی تھی ایک جوان جیتے جاگتے بچے

سے پھر پورے تھیں کی موت اور وہ بھی اپنے آپ کے ہاتھوں اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”وہ وہ کہتے تھے چھپو عباس مراد۔“

اس نے بولے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو زینت فاطمہ کے پھر وہیں جھنپ ہوئی۔

”بالکل بلند بخت کے جیسا ایسا ہی سالوار رنگ اور خال ہاتھ اور ایسی ہی مسکرائی آنکھیں۔“

شاہ میر شاہی کو چھوڑ کر ابھٹا اس کا لڑکچہ بیٹہ گیا تھا اور وہاں نظروں سے زینت فاطمہ کو دیکھ رہا تھا جو

ایک بار پھر ارد گرد سے گذر رہی تھیں۔ ان کی نظروں کے سامنے مسکرائی آنکھوں سے انہیں دیکھتا عباس

مرزا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے شاہ میر کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کا پورا وجود جیسے پھر وہاں تھیں اندر آگ دیک

رہی تھی۔ شعلے بھڑک رہے تھے۔ اندر میں سے آواز اٹھ رہی تھی کہ وہ ایسا ہی کریں جیسا سید عظمیٰ کہہ رہی

ہے۔ وہ بلند بخت کیوں اس پر اور سید عظمیٰ شاہ کا کلاں باندھ بلند بخت سے اور پھر شاہی کی کیفیات دیکھیں اور ان

سے پوچھیں کہ کیا انہیں اندازہ تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔ اور کتنے سارے تاکہ وہاں کا بوجھ ڈال دیا تھا شاہ

کی نے ان کے ہاتھوں میں۔

یکدم انہیں اپنا سانس سینے میں گھٹا ہوا احساس ہوا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا اور بند ہوئی آنکھوں

سے شاہ میر کی طرف دیکھا۔ ان کی ہاتھوں سے شاہ میر اور عظمیٰ کی آواز سن سکتی تھی۔

”چھپو۔ چھپو۔“ وہ دونوں انہیں سے قہرانی سے پکار رہے تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ وہ آنکھیں کھول کر

ان کی پکار کا جواب دیں لیکن ان کے ہونٹ چڑک رہے تھے اور آنکھیں بند ہوئی تھیں اور پھر نہ جانے کتنی دیر

بعد انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں۔

”زینت کیا۔ زینت کیا۔“

انہیں آنکھیں کھولتے دیکھ کر سید قائم علی شاہ یکدم ان کی طرف جھکے تھے۔

انہوں نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ اپنے بندہ موم میں تھیں سید قائم علی شاہ منہ شاہی سے اسما شاہ میر سی

ان کے کہتے میں تھے۔

”کیا ہوا تھا۔“ انہوں نے اپنے شکل پر زبان بھیری۔

”آپ اچانک بے ہوش ہوئی تھیں چھپو۔“ شاہ میر نے جو حمد کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا بتایا۔

”اور میں نے قادی چاہو فون کر کے بلایا تھا۔“

”دھم دھار دالیں گے تمہیں تہہ کو بچوں کو۔“ انہیں اب تک جاہل دھماکا گھبراہٹ۔“

”زینت کیا بلے تو صلہ کریں کچھ میں ہو گا۔ اگر میری زندگی ہے تو قادی مارا بل بھی لیں گے کس کس کا رگزار اگر زندگی

میں کو پھر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

زینت فاطمہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں پھر جیسے اچانک انہیں کچھ یاد آیا۔

”دھم دھار دالیں گے۔“

انہوں نے ارد گرد عظمیٰ شاہ کو کھوجا۔

”شاہو دو کو اسے روک لو کیا بات آجائے گی۔ وہ ایک ایک کو جن کر مار دالیں گے بلند بخت کو اس کے

خاندان۔“ علی شاہ فزوک۔

سید قائم علی شاہ تیشہ سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ شاہی اور شاہ میر کی آنکھوں میں ابھن تھی۔

”یہ۔“



تہ: اب ان کی نظر کمرے میں داخل ہوئی عظمیٰ شاہ پر پڑی تو انہوں نے چاہا کہ وہ لڑکھڑکھ کر عظمیٰ شاہ کی طرف باتیں لگیں انہیں سچا سچا لایا سید کا قائم علی شاہ نے انہیں قہار کر نری سے بہتر لڑا لیا اور مزنی کی طرف دیکھا۔  
 ”خمنے آگے بڑھ کر ان کے بازوؤں کا جھنسن لگا دیا۔“  
 ”فکری کوئی بات نہیں شاہ سر۔“  
 انہوں نے شاہ سر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔  
 ”ابھی سوچا میں گی اور انہیں کی تو بہت حد تک ریلیکس ہو چکی ہوں گی اور اب تم آؤ میرے ساتھ اور ساری بات سمجھتے بتاؤ۔“

وہ شاہ سر کو لے کر ہر گھل گئے۔  
 اور شاہ سر کو شاہ سر سے جو کچھ معلوم ہوا تھا اس نے سید کا قائم علی شاہ کو بتا دیا۔  
 ”کسی کے گھر رشتے کے راجا کا تانا بڑا جرم تو نہیں ہے شاہ۔“  
 سید کا قائم علی شاہ کے کمرے میں افسر کی تھی۔

”اور مجھے افسس ہے کہ بلند بخت کی والدہ نے مجھ سے ہی عظمیٰ کا بتایا تھا۔ وہ انہیں تلاش کر رہی تھیں بیٹے کے لیے تو مجھ نے عظمیٰ کا کمرہ دیا۔ اچھا لڑکا ہے بلند بخت بلکہ بہت اچھا اور پھر سید ہے جس نے مجھے یہی طرح بتائی اس سے محبت کرنے لگی ہے اس نے سوچا کہ ایک بیٹے کی نہ کسی دوسرے بیٹے کی ولن وہ اس کے گھر سے لے آئیں عظمیٰ اسی دونوں ہی اسے بہت پیاری ہیں۔ میں خرم ہوں بہت خرم مجھ نے بڑی عقلی کی۔“  
 ”میں چاہتا ہوں کہ کوئی بات نہیں۔“  
 شاہ سر کی سوچ میں تھی۔

”کوئی راستہ کوئی تدبیر۔“ وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

شاہ سر بھی خاموش تھیں جیسے تھے دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے کوئی راستہ کوئی تدبیر لیکن تقدیر کی اپنی پلاننگ اور اسے نبھانے تھے۔

سید اس شاہ عیضاً کو ساتھ لگائے اپنا سامان بیک کر رہی تھی۔ زینت فاطمہ لاؤنج میں صوفے پر خاموش بیٹھی اس سامان بیک کر رہی تھیں۔ ان کے ذہن میں یہاں بار خیاں آ رہا تھا وہ بلند بخت کو لپوکر عظمیٰ کا نکاح پر حوا میں اور شاہ سر سے اس ساری اذیت کا پورے لیں جو کل ان کی آمد سے لے کر اب تک ان کی رہیں کو کاٹ رہی تھی۔ وہ بار بار اس خیاں کو جھنکتیں اور بار بار یہ خیال ان کے ذہن میں آجاتے سامنے والے صوفے پر دونوں پاؤں صوفے پر رکھے عظمیٰ بیٹھی تھی چاہیں اس کے ذہن میں کیا تھا۔ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ زینت فاطمہ نے کی بار بار اسراغھا کر بغور اسے دیکھا اور اس کے چہرے سے اس کے کھل کا حال کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن اس کا چہرہ بالکل سیاہ تھا اور آنکھیں ابھی دیر ان جیسے ان میں وصل اور مٹی اور وہ دونوں ہاتھوں کے درمیان کیے بہت دیر سے ایسی کیفیت میں بیٹھی تھی۔

”عظمیٰ تم نے سب سامان رکھ لیا کیا۔“

اسانے اپنا اچھا بندہ کر کے ہوئے عظمیٰ کی طرف دیکھا۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بدستور کسی غیر مٹی نظر رکھیں بجائے سامنے دیواری کی طرف دیکھتی رہی۔

”تمی الحال اپنے کمرے و مجبور کہ لوہیں نے شاہ میرے کہہ دیا ہے وہ دھم میں ہماری سب کتابیں کارٹن میں بیک کروا کے لے آئے۔“

عظمیٰ نے اب بھی جواب دیا تو وہ زینت فاطمہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”چھوٹا شاہ سر نے کب تک آئے گا کیا تھا۔“

”فیصل آباد سے لاہور تک کا فاصلہ یہی کتابہ ہا شاکر کے بھی چلے ہوں تو اب پہنچنے والے ہوں گے۔“

زینت فاطمہ نے ہلکا سا نظر ڈالی کیا یہ جیتنے والے تھے۔  
 ”عیضاً ابھی ساتھ جائے گی۔“ اسانے پھر پوچھا۔  
 ”چاہ نہیں۔“

زینت فاطمہ کے دل کو جیسے کھجکے ہوئے تھے تھے قہر دل کسی سوکے ہے کی طرح کانپ رہا تھا۔ آج اگر شاہی نہ آئیں تو آج ہی وہ بلند بخت کو لپوکر تب ہی شاہ میر گھر لیا ہو سا اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اس کا ہاتھ میں تل فون تھا۔

”چھو۔“ چھو۔ اسی شاہ سر بھائی کہاں ہیں چلے گئے کیا۔“

”نہیں۔“ آج نہیں لے آئیں اپنے کمرے میں ہوں گے شاید ہمارے ساتھ ہی چلی جائیں۔“

اسانے جواب دیا زینت فاطمہ اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”کیا بیات ہے سو۔“

ان کا دل پہلے سے زیادہ تر زاری سے دھڑک اٹھا۔

”وہ چھو ہمارے گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ شاہی نے زنی ہیں ڈرائیور نے فون کیا ہے وہ خود بھی زخمی ہے لیکن زیادہ نہیں اورد۔ اور گھڑا شدید زخمی ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا اور پھر تیزی سے شاہ سر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ زینت فاطمہ جیسے بیٹھے بیٹھے سو گئی تھیں پھر کمرے کے سید اس شاہ سر بیٹھی اس کی طرف اور اس نے عظمیٰ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”عظمیٰ تم مجھے نہ شاہی۔“

اسا کی آواز بھر اٹھی اور وضو کے باجہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”ہاں۔“ عظمیٰ چو گی۔

”شاہی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔“

اس نے خالی خالی نظروں سے اس کا کچھ نہ دیکھا لیکن اس بات کے رکے نہیں تھیں وہ تیزی سے شاہ میر کے پیچھے

شاہ سر کے کمرے کی طرف چلی۔ وہ دونوں گھٹ میں کمرے سے نکل رہے تھے۔

”میں۔ میں بھی جاؤں گی آپ کے ساتھ کس ہسپتال میں ہیں شاہی۔“

اس نے شاہ سر کو کھانچ کر شاہ سر کے مڑ کر نہ دیکھا اور باتیں میں سر ہلایا وہ صوفے پر پڑی چادر اٹھا لی ان کے پیچھے ہی لاؤنج سے نکل گئی۔ لاؤنج میں صرف زینت فاطمہ اور سید عظمیٰ رہ گئیں۔

”میں نے۔ میں نے اس طرح تو نہیں۔ نہیں۔ زینت فاطمہ نے تھڑکھڑکی۔

”اللہ شاہی کو زندہ کرے۔“

ان کے تھوڑے دھڑکے جھنسن ہوئی اور انہوں نے ساکت بیٹھی عظمیٰ کو آواز دی۔

”عظمیٰ۔ سید عظمیٰ شاہی۔“ ان کی آواز قدرے بلند ہوئی۔

”اس طرح بہت مجبور۔ تم مجھ اس طرح اور قاتی۔ ہاں قاتی کو فون کرو۔ مجھ کو بتاؤ۔“ انہیں انہیں خبر

بھی نہیں آتی تھی۔

”شاہی شاہی بلند آنکھیں کھولیں۔“

سید کا قائم علی شاہ آئی۔ آئی کی یو میں سید عظمیٰ علی شاہ کے بیٹے کی پاس کمرے ان کے بازو پر ہاتھ رکھے

یہ فراموشی انہیں پکارا ہے تھے سید عظمیٰ علی شاہ نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور کی گئے پوچھی انہیں کہتے

رہے۔ کتنے دن ہو گئے تھے جب میں ان کی آنکھ کھلی وہ سید کا قائم علی شاہ کو اپنے بیٹے کی پاس بیٹھے تھے۔

جین اور بے قرار سے۔ وہ تو بے قرار سے انہیں پکارا کرتے ہوئے۔

یہ سید کا قائم علی شاہ تھا۔ جب وہ یہاں تھا تو شاید انہیں یہ سب سے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ اگلا ہمارا بڑے تھے

عجیبہ اور بڑھا کو سے وہ ان کے بے تکلف تھے بہرہمت چھوٹی عمر میں ہی دانی نے انہیں مری ہو ش میں بھجوا دیا تھا۔ ان میں ان سے چھوٹی دو بیٹیاں تھیں جن کے ساتھ دو سنی کا سوالی بیٹا انہیں ہوا تھا۔ اسی لیے جب سید قائم علی شاہ پیدا ہوئے تو انہوں نے سوچ لیا کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ رکھیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا بھی میرٹک سید کو قائم علی شاہ کے ساتھ ان کی دو سنی اور محبت بہت تھی بھی پھر وہ لاہور چلے گئے رات کے لیے تب بھی یہ محبت کم نہ ہوئی گی وہاں بی بی بائیں ان سے تیز کرنے کے لیے بڑی بے چینی سے ان کی چھٹیوں کا انتظار کرتے تھیں لیکن پہلی بی بی جان آگئیں۔ جنہوں نے ان کے دل میں نفرت کانچ بویا تھا۔

”دانی قادی کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں دانی آپ سے اپنی محبت نہیں کرتے بھٹی لالائی اور قادی سے۔“ حالانکہ قریب رہنے کی وجہ سے وہ دانی سے زیادہ قریب تھے۔ پھر بھی ان کے اندر زہر پھیل گیا کہ پہلی بی بی جان کی بہن سے شادی سے انکار دانی نے سید شادی ان کا پورا وجود ہی بڑھاپا ہو گیا تھا۔

پھر دانی کا انتقال ہو گیا۔ وہ چاہتے تھے قادی کو تہہ کر دیں۔ دانی نے مرے سے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ قادی کے لیے حویلی کے دروازے کھول دیں گے۔ اسے سینے سے لگا لیں گے۔

”عالمیا وہ تیرا بڑا بے کولی یوں خود سے پاپا نو کاٹ کر پھینکا ہے۔ پھر اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کب کہا ہے کہ سید خاندان سے باہر شادی نہ کر۔“

لیکن بی بی جان۔۔۔ ہاں بی بی جان نے انہیں یہ عہد بھانے نہ دیا اور پتا نہیں کہاں سے ان کے اندر لالچ کا درخشاں کیا جس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تھوٹی گئیں۔

یہ اپنی زمینیں یہ حویلی اس کی سب کے وہ تھا کیا تھے۔ قادی آجاتا اس میں سب میں اس کا بھی حصہ ہوتا ہمارے تین بیٹے ہیں جائیداد تو وہی تھیں کہ مجھے کیا پائے گا کھلا۔“

بی بی جان نے ان کے کان میں ڈالا تھا اور وہ عورت پر حکمرانی کرنے والے مرد کی سوچ رکھنے والے شاہی بیٹہ بی بی جان کی مرضی پر ہی چلتے رہے تھے۔ وہ سید قائم علی شاہ کے جرم تھے۔

اس وقت جب سامنے سے آنے والے ڈاکر نے ان کی گاڑی کو ٹھکرا دی تھی تو انہیں بند ہونے سے پہلے ایک لمحہ کے لیے ان کے دل میں خیال آیا تھا۔ انہوں نے کیا کیا تھا۔ انہوں نے اللہ کے خواص کو تار کیے تھے لیکن حق تعالیٰ انہوں نے تھے لوگوں کی حق تلفی کی تھی۔

قادی باہا۔۔۔

”اور کیا اللہ مجھے معاف کر دے گا۔“

”شاید نہیں ان کے دل پر پاموسی طاری ہو گئی تھی اور اب اللہ نے انہیں زندگی دے کر موقع دیا تھا کہ وہ سب کا حق ادا کر کے اپنے لیے معافی طلب کریں۔“

شاہی بی بی اپنے طرف خاموشی سے دیکھتے کہ ایک گھبراہٹ سے سید قائم علی شاہ نے ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا جس کی طرف دیکھا۔

”انہیں کسے میں شغف کروا رہا۔“

ان کے لیے میں بے انتہا متھن تھی اور جیسے پر ایک ماہم علم سی اداسی کا غبار پھیلا ہوا تھا۔

”قاتل قادی۔“

شاہی نے انہیں بائیں ہاتھ اٹھا کر سید قائم علی شاہ کو روکنے کی کوشش کی وہ ٹھیک سے بول نہیں سکتے تھے کیونکہ حادثے کے وقت ان کی زبان کٹ گئی تھی اور وہاں استعجز نہ ہوئے تھے سر میں بھی زخم کیا تھا اور انہیں بائیں ہاتھ میں بھی تھک چکا تھا۔

سید قائم علی شاہ نے بند مڑ کر ان کا ہاتھ اپنا ہاتھ قائم لیا اور جیسے ہوئے انہوں سے لگایا۔

”شاہی مجھے کچھ نہیں چاہیے نہ جائیداد نہ نیک میرے پاس اللہ کا وہاں سب کچھ ہے مجھے صرف آپ کی

شفقت و محبت کا کہ ہے یہ دوریاں یہ ناراضگی حال اندر سے کھولھا کر رہی ہیں مجھے۔“

شاہی کی کچلیں کم ہوئیں اور ہونہر کر زنے کے انہوں نے مضبوطی سے سید قائم علی شاہ کے اس ہاتھ کو قوام لیا جس میں ان کا ہاتھ تھا

”شاہی۔“

جنابت کی شدت سے قائم علی شاہ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ انہوں نے سختی سے ان کا ہاتھ قوام لیا۔ شاہی نے اپنے بائیں ہاتھ سے ان کے رخساروں پر پتے آنسو پونچھے کی کوشش کی اور سر جھکا کر پیشانی چومی۔ دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور حزن ساز پڑ پڑ کر کھڑی کھڑی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔

”شاہی۔“ زینت فاطمہ نے ان کے پیچھے کھینے رکھے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”آپ کو پتا ہے شہی شاہم اور قادی نے آپ کو ملو دیا ہے بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا اور پتا ہے حزنہ قادی شہی سب چاروں سے مسلسل بے پناہ مل رہی تھے۔“

زینت فاطمہ ابھی کچھ پر پکے ہی اسپتال آئی تھیں۔ شاہ رخ نے فون کر کے انہیں بتا دیا تھا کہ شاہی کو کمرے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

”کون؟“

”قادی تو صغیر میں سے شاید اور حزن۔۔۔ اپنے کمرے میں مریض چیک کر رہی ہیں۔ باقی لوگ کینٹین کی طرف گئے ہیں چائے پیتے۔“

زینت فاطمہ نے بتایا۔ تب ہی شاہ رخ ۱۴ سالہ اور شجاع ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”اگلا ملے گا شاہی کتنی طبعیت ہے اب۔“ شجاع ان کی کپاس کی کوشش کے بند پر بیٹھ گیا۔

وہ مسکرائے اور شجاع کے جبرے کو محبت سے اپنے ہاتھوں میں قوام کر اس کی بیہوشی چومی۔

”مذہب یہ ہاتھ نہ ہلا میں شاہی۔“

شاہ رخ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ اس شاہ بھی بے اختیار آگے بڑھی تھیں انہوں نے اس کا ہاتھ کے اشارے سے دایا اور پھر زینت فاطمہ کی طرف دیکھا اور صغیر کمرے کو لے گئے۔

”قادی کہاں ہے؟ کو میں نے بی بی بائیں کے حوالے لے لی۔“

حزنہ جو اسی وقت کمرے میں داخل ہوئی تھیں ہاتھ سے شاہ رخ کو پیچھے کرتے تیزی سے آگے بڑھیں۔ خوشی سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور انہوں میں آنسو چسک رہے تھے انہوں نے شاہی کے بند کے پاس کھڑی سیدہ ہاتھوں سے انتظار کرتے لگایا۔

”شاہی کیا ہماری بیٹی ہے ہمیں جان سے بھی پیار ہی ہو گی۔ شاہی آپ نے ہمیں معاف کر دیا۔ اپنے قدموں میں جگہ دی۔“ شہزادہ جنابت سے ان کی آواز بھر رہی تھی اور لفظ نوٹ نوٹ کر ان کے لبوں سے نکل رہے تھے۔

”بلیکس چچی جان۔“

شاہ رخ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور انہیں اس جنابت کی کیفیت سے نکالنے کے لیے مسکرائے۔

”چچی جان آپ کا ایک اور بیٹا بھی ہے مگر بولا اس وقت شاہی مہمان ہیں تو اس کے لیے بھی دامن پھیلا دیں۔“

”ہاں۔۔۔“ انہوں کی بھٹی سے آنسو پونچھتے اور اس کا الگ کرتے ہوئے انہوں نے چچا کا ہاتھ پھیلایا دیا۔

”شاہی تیرا وہ بھائی اس وقت ہے بھی اچھا اس وقت بہت محبت کرنے والا اس کا نام بلند بخت ہے اور اس کے باپ کا نام سید ہماوں بخت ہے۔“ شاہی جو گئے۔

”اس کے لیے عظمیٰ کو دے دیجیے بلو۔ بہت محبت کرنے والے اور قدر دان لوگ ہیں۔“ شاہی مسکرایا۔

تھے۔ ”میرا انخوار سے ایک بیٹے کے لیے مہذرت کروں گا تو دوسرے بیٹے کے لیے بھی انکار ہی ہو جائے گا۔ سیدہ

عظمتی آپ کی ہی بنی ہے جو مناسب نہیں۔

شجاع اور ادا شاہ کے چہرے چمک رہے تھے۔ زینت فاطمہ اور حسنی آنکھیں نم تھیں اور شاہ رخ سوچ رہے تھے کہ اب وہ بھی اس رخ کے سامنے سرخ ہو سکیں گے۔ کتنا خوش رہا تھا اس زمانہ کی خواہش جان کر کہ وہ جلد ہی اہم کے لیے پیچھو اور چکی جان کو بھجوانے والے ہیں۔ جو ملی سے بعد میں لوگ آجیا میں گئے اور اللہ نے ان کی امان رکھی تھی اور ان کی تکلیف بھی گہرا ہو گیا تھا۔ شادی کے دن بڑا تھا تو پھر ان میں متانوں کا مشکل ہو گا۔  
”شاہزاد اب تو شاہ کی محکم ہیں اب تو جو ملی میں فن کر کے تاناہلی بی جان پریشان ہو رہی تھیں کہ شادی اتنے دنوں کے لیے کیوں ٹھہر گئے ہیں لاہور۔“

زینت فاطمہ نے شاہ رخ کی طرف دیکھا تو وہ چمک کر شادی کو دیکھنے لگے۔

”ہاں تاناہ۔“

انہوں نے ثابت میں سر ہلادیا۔

شاہ رخ اور زینت فاطمہ نے جو ملی میں شادی کے معاملے کی خبر نہیں کی تھی اس اعتبار سے تاناہ کا شادی ابھی کچھ دن لاہور میں ہی ٹھہرے گئے لیکن کابڈ پریشاں رہتا تھا اور شاہ رخ کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیوی اور اس طرح معاملے کا سن کر پریشان ہو جائے گی۔ شاہ زینب کو انہوں نے فن کرنے کی ہمت کو کشش کی تھی۔ لیکن نہ صرف اس کا خیال تک تھا بلکہ وہ اپنے اس میں بھی نہیں تھا اور زارا کو انہوں نے تاناہ مناسب نہ سمجھا تھا جب بھی کہوں فاطمہ زہرا سے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔  
”میرے خیال میں فن پر تاناہ مناسب نہیں۔ سب بی بی جان کو قلعہ نہیں آئے گا کہ اب سب ٹھیک ہے میں خود جا کر تاناہ بتا ہوں۔“

”اے یہ ٹھیک ہے۔“ زینت فاطمہ نے تانیہ کی۔

”تم خود ہی چلے جاؤ شاہ رخ اور بی بی جان کو بھی ساتھ ہی لے آؤ۔“

شاہ رخ فوراً بھی کر کے سہا پہر نکل گئے۔ ان کا دل خوشی سے سرشار تھا وہ سب جو ناممکن تھا ہو گیا تھا اور دل جیسے یقین کرنے کو تیار ہی تھا۔ لیکن یہی وجہ تھا کہ شادی نے نہ صرف ان کا چہرہ کو گنگے لگا دیا تھا نہ کہ قبیل کر لیا تھا بلکہ بدخت اور شجاع کا رشتہ بھی قبول کر لیا تھا۔  
وہ خوشی میں جیسے ہو میں اڑتے ہوئے پکار نکلی طرف بڑھنے لگے۔

بی بی جان کی آواز تیز سے نکلی تھی۔ کچھ دیر وہ بی بی بستر پہلی غور کرتی رہیں کہ یہ آواز کہاں سے نکلی تھی۔ کایا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ انہوں نے سوچا اور اٹھ کر بیٹھ گئیں اور چاہا کہ میز پر بڑے جگہ سے پانی گھاس میں ڈال کر پیتیں کہ اچانک انہیں باہر دو دستے آدمیوں کی آواز سنائی دی پھر لپٹا کاشور۔  
یکدم گھر کا انہوں نے دروازہ کھولا کہ شاہ زینب کو گدا میں شاہ زینب آج بھی کراچی لے آیا تھا۔ شاہ زینب کو اس طرح اچانک دیکھ کر وہ سخت خوش ہوئی تھیں۔ پول بھی دو تین دنوں سے ان کا دل بے دم گھبرا ہوا تھا شاید اس لیے کہ وہ گھر آگئی تھیں شادی بھی لاہور میں ہی رہ گئی تھی۔ بھتیجیوں کے لیے۔  
”ابھا ہوا شاہ زینب تم آگے بڑھ کر اب بہت گھبرا ہوا تھا بتائیں کہیں میرے آتا ہوا نہ۔“

”جی۔“

”کوہنہ، آ زارا کو بھی لے آتے ہو اکیلے ہو گئے تھے ان کے۔“

”ستے ملازم تو ہیں اور اب تو گھایاں کو بھی ساتھ لے کر گئی ہوئی ہے کچھ اچھا نہ۔“

شاہ زینب کا مڈا انہیں خراب تھا تھا انہیں وہاں کے آگے نہ خوش تھیں اور اس وقت انہوں نے بی بی ہل میں شکر ادا کیا تھا کہ شاہ زینب آج رات گھر پر ہی ہے۔ اور دروازے کے آگے وہ فیما بے گھر تھا اور پھر ٹھک کر رک گئیں۔

وہ قہقہے ”شاہ زینب یہ تھا جس نے آہستہ بہ آہستہ مرکز انہیں دیکھا تھا۔ اس نے لڑکی کو کابڈ تو کام رکھا تھا جب کہ لڑکی کا ہونڈ چھڑانے کی کوشش کرتی تھی وہی چارہ چلنے والے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔  
”شاہ زینب یہ کیوں ہے؟“ بی بی فاطمہ ان کے پیس سے نکلا۔  
شاہ زینب نے مرکز کے پاس بیٹھ کر آنکھیں میس ہو رہی تھیں۔  
”بی بی جان آپ اندر جائیں۔“  
لیکن بی بی جان نے قدم اڑھانے سے نہ تھے۔  
”شاہ زینب۔“

ان کے کمرے میں تیسرے تھی۔ شاہ زینب ان کی طرف متوجہ ہوا اور لڑکی کے اندر پر اس کی گرفت کمزور ہو گئی۔ تب ہی لڑکی نے اپنا ہونڈ چھڑایا اور چکی کی سی تیزی کے ساتھ دروازے کی کنڈی کھول کر باہر نکلی۔  
شاہ زینب میں اس کے پیچھے لگا۔ بی بی جان بھی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔ باہر چوتھے پر بیٹھے شاہد بابا نے چوتھے سے چھوٹا بھائی۔ انہیں انہوں کو فینر میں آئی تھی انہوں کو کہہ رہے تھے اس وقت رات کے بارے میں بھی وہاں گھر میں کھلتے کھلتے کچھ دیر کو چوتھے پر بیٹھے تھے۔  
”مسلکی۔ مسلی خانم۔“

محسن میں بیٹے لب کی خوشی میں انہوں نے اندر بی بی جان کو کھول کر باہر آئی لڑکی کو کھلا اور پھر اس کے پیچھے شاہ زینب کو باہر نکلتے دیکھا اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔  
”چھوڑو۔ چھوڑو مسلی کو۔“

انہوں نے آگے بڑھ کر شاہ زینب کو کھلا دیا اور لڑکی کو اپنے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔  
”شاہد بابا ہٹ جائے آگے۔“

شاہ زینب نے شاہد بابا کو ایک ساتھ سے پیچھے کیا یہی تھا کہ بی بی جان نے اس کا ہونڈ تھام لیا۔  
”شاہ زینب تم اسے کھینچ کر لے کر لڑکیوں کو۔“

بی بی جان کی جلیب ٹوٹ کر نکلا تھا۔ شاہ زینب نے ان سے ہونڈ چھڑاتا ہوا لڑکی کو ہٹا کر بی بی جان اس جھگڑے کی دم سے پیچھے کی طرف کس اور ان کا سر دروازے سے گرایا۔ دروازے سے کوئی ابھرا ہوا لڑکی تھا شاید جس نے سر میں زخم کر دیا اور سر سے بہا خون دیکھ کر شاہ زینب گھبرا کر لڑکی سے کھاتے ہوئے بے چینی سے پکارنے لگا۔  
”بی بی جان بی بی جان۔“

بی بی جان کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ شاہ زینب کا کاشہ ہر دن ہو چکا تھا۔  
شاہد بابا لڑکی کے گرد اپنی عمائل کے اسے اپنی کوٹھری کی طرف لے جا رہے تھے۔ لیکن شاہ زینب کا سارا دھیان اب بی بی جان کی طرف تھا جو شاید بے ہوش ہو چکی تھی۔  
”مسلکی مسلی یہاں کیے آگئیں۔“

اپنی کوٹھری کا دروازہ بند کر کے ہوئے شاہد بابا کو چہرے تھے۔  
”مسلکی نہیں ہوں۔“ لڑکی بدست بھرتی گھڑوں کے انہیں دیکھ رہی تھی۔  
”میرا نام مسلی نہیں ہے۔“ اس نے پھر بولایا۔  
”دیکھیں تمہاں بالکل مسلی کی طرح لگ رہی ہو۔“

”ہاں میں بھی اکیس ہوں مسلی کی تو میری طرح چھوٹی ہو چکی ہوگی۔“  
وہ غور سے لڑکی کو دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں کے سامنے کی منظر آ رہے تھے۔ یہ منظر کی ماہ سے ان کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ یہی انہیں یاد آتا تھا کہ وہ اپنے گھر میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رستے سے پھر اور یاد کرنے پر بھی یاد نہ آتا تھا پھر کیا ہوا تھا۔ بھی وہ تصور میں جھگڑے کر رہی تھیں آ رہے ہیں ان۔ بہت تھیں

رہیہ کا تھ ہے رجبہ کون تھی انہیں یاد نہ آتا اور پھر رجبہ کا تھ ان کے ساتھ سے بھٹو جاتا۔  
 مختلف دوس مختلف مناظر بھر بھر کر ان کے سامنے آئے تھے جس ان وقت سامنے بیٹھی لڑکی دیکھتے ہوئے  
 ان سارے بھڑے مناظر میں رہا پیدا ہو گیا بار بار تھا۔  
 سلی خانم ان کی بیوی ہیں رجبہ بٹی تھی۔ وہ ایک مسکون زندگی گزار رہے تھے کہ انہیں خیال آیا کہ وہ سلی  
 خانم کو اٹھارہ دس دو تالیفیں پڑھائی جو شریا تیں تھیں سچی سے اور سر جھکا گئی ہے اسے جتا میں کہ ان کا بھی  
 ایک خاندان ہے۔ بہت اور بخار اور نام والا خاندان اور وہ اپنی شناخت ڈھونڈنے لگے تھے۔ رجبہ بھی ان کے ساتھ  
 تھی ضد کرتی تھی دوسری تھی کوئی تو انہوں نے اسے بھی ساتھ لے لیا تھا۔ کراچی سے وہ فرینچ راولپنڈی  
 آئے تھے۔ ایک رات ہوئی میں گزار کر انہوں نے سلی خانم کو فون کیا تھا کہ وہ خیریت سے پنڈی پہنچ گئے ہیں اور  
 اب راولپنڈی وہاں سے آگے جا رہے ہیں۔  
 ان کے علاج میں دوشنی کے جھماکے سے تھے۔  
 اس دن کا حادثہ ہو گیا تھا۔ مسافر سوچ ہی ہلاک ہو گئے تھے صرف وہ اور رجبہ۔ مجموعہ طور پر بچ گئے تھے  
 اور انہیں معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ رجبہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ جانے حادثہ کیسے سے زور سے والے ایک  
 ڈاکٹر نے انہیں اپنی گاڑی میں لٹائی تھی اور وہ ان کے ساتھ ہی وہاں راولپنڈی آ گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اپنے ہی  
 کلینک میں ان کی مرہم لگی تھی چوٹیں کو معمولی تھیں پھر بھی جو ذرا ت خوں تو ضائع ہو گیا تھا پیٹانی پر ایک ہی  
 انسٹیجوٹ کی لگائی ڈے گئے تھے۔  
 ”پڑے کھڑا اطلاع دے دیں۔“  
 ڈاکٹر نے کہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔  
 ”نہیں میں کراچی سے آیا تھا اور مجھے کسی سے بہت ضروری ملنے کے لیے آگے جانا تھا۔ کراچی میں میری بیوی  
 پریشان ہو جانے کی سن کر اور پھر ان دونوں اس کی حالت بھی ایسی نہیں ہے۔“  
 ”تمہیکے لیکن میرا مشورہ ہے کہ ابھی وہ دن تک آپ سفر نہ کریں۔ یہاں یہیں میرے کلینک میں۔“  
 ”ہاں تمہیکے ہے۔“ ڈاکٹر معافی مانگ رہا تھا۔  
 ”اس حالت میں ہی کو کہاں لے کر جائیں گے۔ وہاں کلینک میں ہی رہے یوں بھی ابھی اسے تکلیف ہے۔  
 رات بھی اسے شدید Pain ہوا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جس کے ایک دو افسرے اور کروالوں۔“  
 اور وہ ڈاکٹر معافی کے بعد منہ ہونے سے تھوڑا بچا۔  
 وہ بے چین ہو کر کوئی گھر میں ملنے لگے۔ لڑکی دونوں ہاتھ دوں میں رکھ کر سائے بیٹھی تھی اور پھر تانہ نہیں میرے  
 ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ ڈوبے شادی سے ملے آئے تھے انہیں کسی چیز کا بچو تو نہیں تھا وہ چاہتے تھے کہ میری شادی  
 انہیں اپنا بیٹا تسلیم کر لیں اور۔  
 انہوں نے پھر میری سیلی۔ وہ کال کو خیریت وہ انتہہ۔ ”نہیں نہیں۔“ بے اختیار ان کے لیوں سے نکلا۔  
 ”مت مارو مجھے۔“  
 انہوں نے دونوں ہاتھ یوں آگے کی جیسے کسی کی مار سے بچنا چاہتے ہوں۔  
 ”کیا ہوا ہے آپ کو۔“

”مجھے کچھ مت کہو۔“ انہوں نے زور لیا تو لڑکی نے پھر اسی جڑی سے پوچھا آپ کو کیا ہوا ہے۔  
 شاہ بابا ہاتھ دے اسے کھینچے رہے۔  
 ”مگر وہ کھینچا پھر مجھے نہیں پڑی تھیں۔  
 یہ کون سا دن اور کس وقت ہے۔  
 انہوں نے پوچھا تو لڑکی نے اسی حیرت میں جواب دیا تو بزرگ کی آنکھیں دھندلا گئیں۔  
 ”آؤ تکتو گزرا کیا اس قیدیں۔“ بڑے شام کی دہائی سب کہاں ہیں اور میں۔“ وہ سوچ میں ڈوب گئے۔  
 اتنا وقت گزر گیا اور رجبہ۔  
 سلی۔ انہوں نے نظر بھر کر سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ وہ سلی نہیں تھی لیکن سلی سے ملتی جلتی تھی بہت  
 زیادہ لڑکی بند ہی گھر آ کر تھی ہو گئی۔  
 ”مجھے جانا ہے۔ لیکن میرے گھر کو پناہ نہیں۔ میرے ابا اباں تو عمر میں سے بلکہ بچے میں کتنی قیامت آچکی ہوگی  
 وہاں کتنے دن ہو گئے ہیں میں۔ میں چارہ روزہ رو گئی۔ بلکہ بگ رو گئی تھی۔ شاہ بابا نے بے اختیار رنجہ کر کے  
 اپنے ساتھ لگایا۔  
 ”میں رو سو میں سے لے جاؤں گا جس۔“ میں نے دی والی ہے۔ وہ پوچھنے سے نکل جائیں گے ادھر پیچھے سے  
 اور راستہ سے مجھے پتا ہے کہاں جانا ہے۔“  
 ”کراچی۔“  
 لڑکی نے کہنے سے جواب دیا۔  
 ”مجھے کراچی تو جانا چاہیے۔ لیکن پہلے سلی میں راولپنڈی جاؤں گا وہاں سے رجبہ کو لیتا ہے۔ مگر میں پہلے  
 جس میں ہمارے گھر چھوڑا تو ان پھر رجبہ کو لے جانے کا۔“  
 ”لیکن نہیں۔ میں جا کر اب کیا کروں یا بیٹا کیا جان میرا گھر کھوٹ دیں مار ڈالیں مجھے میں جی کر کیا کروں  
 گی میں نہیں جینا چاہا۔“  
 وہ بے قرار ہے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی گردن پر رکھنے لگی تو بہت شفقت و محبت سے شاہ بابا اس کے  
 ہاتھ قائم کر کے بڑھانے لگے۔  
 ”کتنی معصوم لڑکی ہے تھی پاری۔“ اور خود بڑے شامی نے اسے بھی قید کر لیا ہو گا۔  
 ”بڑے شادی ہمارے کیا گئے ہیں۔“ انہوں نے پوچھا۔  
 ”میں تو کسی بڑے شادی کو نہیں جانتی۔ پہلے میرا گھر کھوٹ دیں مجھے مرے دیں۔“  
 وہ ابھی کسی دور ہی تھی۔  
 ”قدیر نے اس کے ساتھ کتنا سنگین مذاق کیا تھا کاش اسے کاش اس روز وہ ندا کی گاڑی میں نہ بیٹھتی۔ اس روز وہ  
 سب گئے خوش تھے۔ وہ لا کاش کی گولی سے دوسرا الزاکر تھا اس نے اعتراف کر لیا تھا کہ معصوم ہے کتا ہے اور  
 مرے والا اس کی گولی سے مر تھا۔ اسے جگر کا کینسر ہو گیا تھا اور مرض کا تب علم ہوا تھا جب مرض لاعلان ہو گیا تھا۔  
 اس کے کپا پتے ہاتھ جو ڈر نصیر احمد خان سے معافی مانگی تھی۔  
 ”میرے بچے کی انتہہ مت کہو جو جانے بہت سے خاں صاحب سے معاف کروں۔“  
 ”آپ کی یہ معافی میرے بچے کے مشہور ماہو سال واپس نہیں لا سکتی۔ اس کا میرے اس کے ضائع شدہ سال۔  
 لیکن پھر بھی میں نے آپ کے بچے کو معافی کی اللہ بھی اسے معاف کرے۔“  
 موت کی انتہہ میں جلاسا لڑکے نے اپنا بیان ریکارڈ کروا دیا تھا۔ خضر نے بتایا تھا کہ قانونی کارروائی میں شاید  
 ایک دو دن لگ جائیں۔ وہ کھر سے روکیں کی طرف کیا تھا۔ پورے گھر میں خوشی کی ایک کھار دی ہوئی تھی۔  
 یوں لگتا تھا جیسے برسوں سے جو اداسی اس گھر پر مسلط تھی انہوں میں وہ اداسی ختم ہو گئی تھی۔ اباں باہر آؤ  
 پوچھتی تھیں۔

داوی شکرانے کے نفل پڑھ رہی تھیں اور وہ اس کا دل چاہتا تھا وقت کو برنگ جاسیں ساری کالونی کا روادانی  
لوگوں میں ہو جائے اور منصور ابھی اس وقت خضر کے ساتھ آئے اس کی ہلکی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ یہی  
مدنے کوئی چاہتا بھی آپوں آپ نہیں پڑتی۔  
”آپنی آپ آج یوشن سینٹر جاسیں کی کیا۔“  
نڈی نے اگرچہ چھانڈو اس کیفیت سے بارہنگی۔  
”ہاں جانا تو ہے۔“

”نیم سے میں بھی تو چارہ ہی ہوں ہسپتال تو بھر تم۔“  
”ناراض بیٹھے سے ہرے اور پھر میں فوریت ضرورت ہے بیویوں کی زندگی ملتی ہوئی سب کو پریشان ہے ہاتھ  
میں کچھ زیادہ پیسے آجائیں تو برا ہے کیل۔“  
”اماں کہہ رہی ہیں واپسی پر داوی کے لیے تک سیرپ لیتے آئیے گا۔“  
”نڈی نے کہا تو سرہلا کھڑکی ہو گئی۔“  
”نہیں رہا ہی کی جا ہے ابھی ایک ہفتہ ہی تو وہاں کے جوان کیے ہوئے اور پھر آج وہ مشکل ہے منوں کا آنا  
بہت جلدی بھی ہوئی تو کل تک ہی آئے گا۔ ہمارے ہاں عثمان کی کوئی ایسا کماں اتنی جلدی ہوئی ہیں۔“  
”اس تو ہے۔“ نڈی نے ہانڈ کی۔  
”لیکن آپ یہ وقت کاٹنا کس قدر مشکل ہو رہا ہے۔ چلو اچھا ہے تمہارا کچھ وقت پریشانے میں کٹ جائے گا۔“

ورنہ ایک ایک کھو ایک ایک صدی بن گیا ہے۔  
نڈی نے بات عمل کی تو وہ تیار ہونے لگی کہ چاہتی رہی والے تھے چند ہی منوں میں تیار ہو کر وہ نصیر احمد  
خان، وادی اور اماں کو اٹھ حافظہ ہونے لگے کہ ہر کھل گئی۔ دروازے سے قدم ہار رہے ہوئے ایک کھو کو  
اس کا دل نڈر سے دھڑکا تھا۔ آپوں ہیں، ہم گھٹے گئے اور اس کا پیچھا کر دھاویں پلٹ جائے لیکن پھر اس  
نے خود کو سمجھا لیا۔ سب اس ہڈیا کی کیفیت کو دیکھ سے جو مصوری کی راہی کی اچانک خبرن کرب پر طاری ہو  
گئی تھی۔  
وہ حیرت خیز منوں سے اسناپ کی طرف جاری تھی جب کہ بالکل اس کے قریب گاڑی کے بریک چرچے آئے اس  
نے سر اٹھا کر دیکھا اور گاڑی کا دروازہ کھولے تھا کہ دہری گئی۔

”بیولواہ فور کسی ہو۔“  
”کرے تم نہ دیا یہاں۔“ دھاویں غور سے ہو گئی۔  
”ہاں اس دور سے گزری تھی سوچا تم سے مل لوں۔ لیکن تم ڈشیا یہ کیس جارہی ہو۔“  
”ہاں یوشن سینٹر جارہی ہوں نہیں بتاؤ تو اس روز کہ میں نے سینٹر چوانا لیا ہے۔“  
”اے ہاں بیٹھے خیال ہی نہیں آ رہا۔ چلو ایسا کرو بیٹھ جاؤ میں تمیں ڈراپ کروں گی راستے میں تھوڑی گپ  
شبی بھی ہو جائے گی۔“  
”کیا بات ہے بہت خوش نظر آ رہی ہو۔“  
نڈا نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے غور اس کا چہرہ دیکھا۔ تھوڑے منوں کے متعلق بتانے لگی۔  
”ارے ارے نڈا یہ تم میرے یوشن سینٹر سے آگے نکل آئی ہو باتوں میں مجھے دھیان میں نہیں رہا اس تھوڑا سا  
روپوس کر کے مجھے انا رو۔“  
”بائیں کر کے کر کے اچانک ہی اس کی نظر اپنے یوشن سینٹر کے بورڈ پر پڑی تھی لیکن بات کرتے کرتے وہ کافی  
آگے نکل گئی تھی۔“  
”تمیں یوشن سینٹر لے جا رہا ہے ڈر۔“ نڈا نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”دیکھا مطلب۔“ وہ حیران ہوئی۔  
”کچھ نہیں یاد۔“ نڈا نے ہی۔  
”میں نے سوچا تمیں اپنے کھلے چلوں گا میں گے یوں بھی ممانا تو گھر نہیں ہیں۔“  
”لیکن نڈا۔“ نڈا غور پریشان نظر آنے لگی۔  
”تمیں بتا رہے تھی کی جا ہے سرخا ہوں گے کہ ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا اور چھیاں شروع کردیں پھر یوشن  
سینٹر کا معاملہ اسکول کی طرح تو تمیں سے تا پلے زاپس چلو۔“  
”کچھ نہیں ہو گا زور اور تمہارے سر کو میں خون کروں گی ہمارے قبیلہ فرینڈ ہیں۔“ نڈا کا انداز لا پر وائی لیے  
ہو۔ ”تمہارا۔“

ماہور کو ایمان ہوا لیکن اس نے نڈا سے وعدہ لیا کہ وہ اسے گھنٹے بڑھ گھنٹے بعد واپس ڈراپ کرے گی۔  
”اے کیار کروں گی اب تم سے دو سنی کی ہے تو بھگتا بھی پڑے گا۔ وہ بولے سے نڈی گئی۔  
”نڈا کا کہ بہت خوب صورت تھا وہ اس کے لیے کسی اس کے گھر نہیں آئی تھی۔ نڈا نے بھی کماں میں تھا۔  
وہ غوری آجائی تھی اس کے گھر نڈا نے اسے سارا کھو کھایا۔  
”چلو تمیں میں مصدقہ ہواں۔“ ممانے لگا اچھا پوچھ کر لیا ہوا ہے۔ حصہ۔“  
وہ نڈا کے ساتھ بیڑیاں اتر کر بیٹھے۔ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ دروازوں کے ساتھ صوفے گتے تھے پھرت پر  
چینی قالین۔ کیس کیس بیٹھے کے سینٹر فیملی صوفوں کے سامنے بڑے تھے۔  
”ماما پچاریاں اتر آج نہ کات شوق ہے۔ بڑا کڑیاں یوں جلی ذریعہ نڈا سب کا انتظام یہاں ہی کیا جاتا  
ہے۔“ وہ سر ہانڈ روہم بے گرمیوں میں اکثر میں یہاں آجائی ہوں۔“  
نڈا نے ایک کھو سے دروازہ کھولا اسے کہ میں نے کھو سے ہال میں ہی کھلتے ہیں۔“ نڈا نے بتایا۔  
وہ اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ بڑے دم بھی دیکھو وہ تھا وہ سامنے کی دیوار پر لگی پینٹنگ دیکھ رہی  
تھی جب نڈا نے کہا۔ ”تم کو میں ابھی آئی۔“

پینٹنگ دیکھ کر وہ مری انداز چکی تھی۔ پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور منصور کے متعلق سوچنے لگی۔  
”بھلا بدو ہے خبر سے گا تو اس نے کیا تاثرات ہوں گے۔ وہ اچھا تھا کہ اس نے اچھا مینا اللہ پر چھوڑ دیا ہے اور  
اللہ سب سے بڑا مسطف ہے۔“ ممانی جب تک نہ دواویں نہ ہی تو وہ کھڑا کھڑی ہو گئی۔  
”یہ نہ کہاں رہی ہے اسے واپس کیس جانا ہے۔“ وہ بھی اور نڈی والی اس کا پتہ کرنے سینٹر آئے تو۔ اس  
کا بیچ کتنا خراب ہو جائے گا کہ کھڑے یوشن سینٹر نے کہا کہ کھڑا کھڑا پل گئی تھی۔ مجھے چھ بچے سے پہلے کی کھ  
پتچ جانا چاہیے یا پھر کھوں کرو چاہیے کہ میں نڈا کے گھر ہوں۔“  
اس نے اچھے کردروازے کا ہنڈل اٹھایا۔ ”خدا! یہی اسے احساس ہو گیا کہ دروازہ ہاں سے بند ہے لیکن کیوں؟  
اس پر یکدم ہی کھڑا ہٹ طاری ہو گئی کیس میں غلط ہو گیا ہے بل میں کسی خوف نے پھٹی تو اس نے بے چینی  
سے دروازہ کھولا۔ اسے بڑا سناں فلن پر کسی کیس سے بات کر رہی تھی۔  
”مجھے شواہد صاحب آپ کا کام ہو گیا۔ ایک کھٹنا اسناپ پر اس کا انتظار کیا ہے۔“  
پھر ممانی کی تھی۔  
”نڈا!۔“

اس نے نڈر تو دوسرے آواز میں دیکھا اس کی اس آواز میں کرنے میں ہی کوئی گھر رہی تھیں۔  
”یہ نڈا نے ایسا کیوں کیا ہے اس نے مجھے یہاں کیوں نہ کر دیا۔ وہ تو علیحدگی دوست ہے بہت مری پھر۔“  
اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بھی اچھے بیٹھ جاتی تھیں۔ بھی کھٹنے لگی بھی بے چینی سے دروازہ کھٹکھٹانے لگی  
اور جب تھک جاتی تو صوفے پر بیٹھ کر روئے لگی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ مگر توقیات آگئی ہوگی۔ اماں باا داری  
 نزل اللہ میں کیا کروں یہ نہ اسے کیوں کیا میرے ساتھ۔  
 دعا میں مانگتے مانگتے اس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ روتے روتے اس کا گلا چبھ گیا تھا جب سے باہر آہٹ  
 محسوس ہوئی۔ اس نے بے چینی سے دروازہ کھینچ ڈالا۔  
 ”نہا۔ نہا مجھے یہاں سے نکالو۔ نہا پلیر تیس اللہ کا واسطہ۔“

پھر کوئی دروازے کی اس آواز کا تھا۔ پھر کسی نے دروازہ دھکیلا اور پھر قدموں کی آہٹ آہٹ آہٹ دور ہو گئی وہ کوئی  
 عجم آواز میں حیرت تھی۔ پھر کسی نے دروازہ دھکیلا اور پھر قدموں کی آہٹ آہٹ آہٹ دور ہو گئی وہ کوئی  
 بھی تھا چلا گیا تھا۔ اب ہونا ک خاموشی تھی وہ بے کسی سے روئے کی جانے لگی دیر ہوئی رہی اسے وقت کا  
 احساس نہ تھا جب دروازے میں چلائی ہوئی آواز کی اور دروازہ کھلنے کے ساتھ نہا کا چہرہ اٹھل چلا۔

”نہا۔ نہا یہ کیا مذاق تھا تم جانتی ہو میرے گھر میں قیامت۔“  
 وہ تیری طرح اس کی طرف لپکی گئی تاکہ اسے پیچھے شاہ زیب کھڑا تھا۔ نفرت برساتی آنکھیں۔  
 ”نہا۔“

لفظ اس کے ہونٹوں پر ہی جم رہا ہو گئے۔ نہا اس کی بات کا جواب دے بغیر ایک طرف ہو گئی۔ شاہ زیب آگے  
 بڑھا۔  
 ”نہیں۔“ وہ پیچھے ہٹی۔

لیکن شاہ زیب نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اس کی انگلیاں اس کے بازوؤں میں کبھی جاری تھیں وہ بھی  
 پہنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔  
 ”یا اللہ مجھے موت۔“

شاہ زیب نے خاموشی میں موجود وہاں اس کے چہرے پر رکھا۔ بند ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس نے کسی  
 خاتون کی آواز سنی تھی۔ وہاں کو فاروق نام میں بیٹھا ہوا تھا۔  
 ”بہت زبردست شاہ صاحب۔ جب مل بھر جائے تو غریب خانے پر پھینک جائیے گا کچھ دن ہم بھی دکان چکا لیں

اے اس چاندی روٹی سے۔“  
 دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک گاؤں میں سڑک پر تھی۔ اس کے ساتھ چھیلی فیسٹ برکولی اور بھی  
 بیٹھا تھا اس کا سرینٹ کی پشت سے لگا تھا وہ عید کی ہوئی تھی نہایت بیٹھا شخص جو کتا ہو گیا۔ ڈرائیو کر نے والے  
 نے مڑا کر دیکھا۔

”سلاد پھر کوئی مصیبت ہی کوئی نہ کرے۔“  
 پھر ساتھ ہی اسے بازوؤں میں لپیٹے گا احساس ہوا تھا۔ سڑکے اختتام پر اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔  
 وہ سوئی جاگتی کیفیت میں رہی۔ کھانا کمرے میں پرانا کین اس نے ایک لقمہ کھینک لیا۔ پھر سفر شروع ہوا تھا اور

سفر سے پہلے آنکھیں لگ لگایا گیا تھا۔ یہ لوگ کتنے تھے۔ وہ انہیں نہیں پہچانتی تھی کیا شاہ زیب اور نہا اسے  
 فروخت کر دیا سوئے جاتے ہیں ان کے ساتھ اس نے سوچا تھا۔ آج کچھ دن جگہ پہنچی تھی اور اسے کوٹھی میں بند  
 کر دیا گیا تھا۔ ہادی دونوں شخص پر اسے رہے تھے۔

”چلو شاہ صاحب آگئے ہیں۔“  
 باہر دوسرا شخص بھی خاتونوں کی باتوں سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ اسے ان دونوں کے ساتھ گاؤں پر بھجوا کر شاہ  
 صاحب خود اپنے اندر آئے تھے۔

ایک بیلا سا عجم بیورو کر کے انہوں نے اندر گھر کی طرف کھلنے والے دروازے پر ہوئے سے دستک دی تھی  
 دروازہ کھل گیا تھا۔ شاہ زیب دروازے کے اس طرف کھڑا تھا۔ اس نے نہ دیکھا یہاں بھی ایک کھلا

عجم اور پھر آگے تھا اور کمرے میں مختلف کمروں کے دروازے کھل رہے تھے۔  
 ”خاموشی سے چلو۔“ مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لے گا۔ وہ شہ رسی چل رہی تھی۔  
 اپنے بندروں میں لپکرا کر اسے روئے سے بندر دھکا دیا۔

”تم کیا سمجھتی تھیں ماں اور بیٹی کہ تم مجھے پھینکا کر زندہ رہو گی۔ میں تمہارے لیے زندگی کو موت سے بھی بدتر  
 بنا دلوں گا۔“ وہ ہنس رہا تھا۔

”نہیں۔ نہیں بلکہ مجھے معاف کر دو اور مجھے جانے دو ایسے گھر۔“  
 اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ سامنے کھاک پر رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور آواز سن۔ وہ بچہ کی تھی آن چو تھا  
 دن تھا اسے کمرے سے آنسوؤں سے لپک پٹا لڑی۔

شاہ زیب ہنسنا ہوا اس کی طرف بڑھا تھا وہ تیزی سے اٹھی تھی اور دروازہ کھول کر باہر کی طرف بھاگ گئی تھی  
 شاہ زیب نے آکر اسے بازو سے پکڑ لیا تھا جب وہ اندرونی دروازے کی اس پہنچی تھی۔  
 ”نہا۔“ شاہ زیب نے سر کوئی۔

”چلو اٹھو نکل چلیں۔“  
 وہ پیشانی انداز میں کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ شاہ زیب کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں کے عجب میں چل رہی  
 تھی اور شاہ زیب ادا دھر ادا ہو کر کئی گھنٹوں سے دیکھتے آگے بڑھ رہے تھے۔

پورے گھر موت کی سی خاموشی طاری تھی کبھی کبھی طبلہ خاتون کی سسکی سنائی دیتی اور پھر وہی خاموشی جما  
 جاتی۔  
 ”چھ دن پورے چھ دن گزر گئے۔“

اس خاموشی کو سسکی خاموشی آواز نہ توڑا۔  
 ”کیا اندر صبر ہے اسے کوئی تجربہ اس کی آڑ میں نہیں گئی یا آسمان کھا گیا۔“  
 وہ مسلسل چھ دن سے جانے نماز پر بیٹھی نظر پر نظر پڑے جا رہی تھی۔ ضروریات کے لیے آنکھیں اور پھر

جانے نماز پر آکر بیٹھ جاتی۔ ایک قیامت تھی جو اس کے گھر کے لیے بدلتی رہی تھی۔ خضر بدلتی ہوئی سی  
 کڑھیا خضر خان کے گھر آتا تھا۔ عجم میں وہیل پیڑر مندر سے بیٹھے تھے نزل کی آنکھیں دھڑک رہی تھیں اور وہی  
 تھیں۔ زبلی اور دالی گھر نہیں تھے۔

”کیا باوجود قیامت ہے۔“ خضر بٹان ہو گیا۔  
 ”ہائینوشن بڑھانے کی ضرورت نہیں تھی۔“ ایک لہو کو خضر شہر سا کھڑا ہو گیا۔  
 ”اس کی دوستیوں سے تپا گیا۔“ خضر کا دل ڈوب رہا تھا۔

”اس کی کوئی ایسی خاص دست نہیں ہے۔ ایک سسر اور اس کی کل بند اسے اس کی دوستی ہے۔“  
 ”نہا نہا۔“ خضر کا ک۔  
 ”وہ عینا آئی کی فریڈ۔“ آکر آتی تھی خود ہی۔

”ہاں نہا تو تین دن سے لٹکان کی ہوئی ہے اس کے ملازم نے بتایا ہے۔ اور سسر ادھر گھر نہیں ہیں شاید فون اسٹینڈ  
 نہیں کر رہیں۔“ ”تو کیا کر سکاں وہ صوبہ میں رات کے آٹھ بجتے والے ہیں۔“  
 خضر نے سر دونوں ہاتھوں میں قیام لیا اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل ٹپچے ٹپچے خود ہوتا جا رہا ہو۔

”میں ہتھال دو ٹپو میں بنا کر دیکھ رہی ہوں۔“ عجم میں شاید کوئی مارٹ۔  
 نصیر احمد خان نے لڑائی آواز میں کہا تو خضر یکدم کھڑا ہو گیا۔  
 ”یہ بیٹو سن کر کاکا کاک کیا کہی ہے۔“ اس نے بغیر کسی مخاطب کیے پوچھا۔

”بہت نیک رشتہ بڑا بیڑا منظر ہے اور اس منظر پر صرف تین میل نیچر ہیں اور صرف گڑو کے لیے ہے۔“

زہل نے بتایا۔  
وہ خاموشی سے ہار کھل گیا اس بات سے بلکہ قدرے فاصلے پر موجود پتلا دل میں بھی کوئی حادثہ میں زخمی ہو کر نہیں آیا تھا۔ وہاں اس ہو کر کھڑا آیا تو سسرور اے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔  
”مجھ پر پہلے زہل کا فون ملا تو میں کئی خضر مجھے تم سے ختمی میں بیات کرتا ہے۔“  
اور پھر سسرور اے میں بتایا کہ مجھے شک ہے کہ ماہور میڈم سفینہ کے قریب ہے۔

”میڈم سفینہ یہ نام۔“  
خضر کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ نہ کیا دلدادہ۔  
”میں آج شام مغرب کے بعد میڈم سفینہ کے گھر گئی تھی۔“ سسرور اے سر جھکا لیا۔  
”ایک روز پہلے میں وہاں اپنا پر سبھل آئی تھی وہی نے کئی تھی۔“ دراصل میڈم سفینہ نے گھر کے میں منٹ میں ایک کلب بنا رکھا ہے۔ بظاہر وہاں خواتین اپنی پریشانیوں دور کرنے جاتی ہیں۔ لیکن وہ پردہ ہے۔ انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔  
”فرسٹیشن اور فیشن دور کرنے کے لیے میڈم سفینہ نے کیا انتظام کر رکھا تھا۔ تب تک سسرور اے نہیں جانتی تھیں۔“  
”چیز سسرور اے۔“

خضر چاہا تھا کہ وہ لوگوں میں سب جان لے۔  
”میں نے وہاں ایک کار نے کس پاس اپنا پر رکھا تھا وہ ویسے ہی پراختہ وہاں بیٹرس کم نہیں ہوتی۔“ انہوں نے ایک کبھی سانس لے کر خضر کی طرف دیکھا۔  
”فرانی ڈے ہے اور فرانی ڈے کو کلب بند ہوتا ہے۔ اس لیے وہاں کوئی نہیں تھا۔ کلب صرف دیکھا۔ کیا اینڈ ہی کھلتا ہے۔ میں وہاں مڑ رہی تھی کہ مجھے لگا کہ بائیں طرف ہال کے آخری سرے پر جو کرا تھا کوئی اس کا دروازہ بنا رہا تھا۔ میں وہاں کئی دروازہ کھولنا چاہا تھا وہ لگا تھا اور کوئی تھا کوئی ٹکس میں نے پوچھا تھا اور کوئی سے تو ایک روٹی ہوئی کی آواز آئی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے اس نے کہا ہوں ماہور ہوں۔ میں نے پوچھیں سے نہیں کہ سکتی لیکن مجھے ایسا ہی لگا تھا میں شاید رک کو کھنسی کے میڈم سفینہ میں منٹ میں آگئیں اور مجھے ان کے ساتھ واپس جانا پڑا لیکن میں اب جانتی ہوں کہ آئی اور نرل نے بتایا تو مجھے حین ہو گیا کہ وہاں وہی تھی اور کمرے میں بند وہاں ایسے چچی میں نہیں جانتی لیکن خضر مجھ کو نہیں تو۔“  
ان کی آواز بھر آئی تھی۔

”میڈم سفینہ تو لڑکیاں باہر عرب ریاستوں میں بھی بھجواتی ہیں۔ جانے کہاں کہاں سے کیسے کیسے انکشاف کرتی ہیں وہ لڑکیوں کو۔“

”یہاں میں منٹ کے اس بل میں کبھی کبھار میں کوئی پانی درج کر لیتی ہوں۔“ ان کا ہاتھ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا ساری ہانک دوڑے کار کئی کئی ماہور کا پتہ نہیں چلا تھا انھیں حیدر کے علاوہ کسی کماہور کی اکثری کے متعلق نہیں بتایا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی کب تک چھپایا جا سکتا تھا۔  
”ہمارا کیا قصور ہے کیا سبک دہی ہے۔ ہم سے کسی کی صفائی نہیں مل رہی ہمیں۔“

ایک ایک خاموشی کو طیبہ خاتون کی آواز نے توڑا۔  
”منٹوں آیا تو وہ پہلی کی۔ یا اللہ اب تو کمر مہر نہ جانے میری بچی کس حال میں ہے زندہ بھی ہے یا نہیں۔“ وہ زور زور سے لگیں۔  
انھیں حیدر نے ان کے کراہیں لٹی دی۔  
”طیبہ تم تو بڑے حوصلے اور مہربانی ہو اللہ سے دعا کرو وہی بہتر کرے والا ہے۔“

”کیسے حوصلہ رکھو۔“ انھیں بھائی کے لیے مگر کہیں۔ میں ہوا سیر جھ سے۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔“  
منصور اپنی جگہ سے اٹھ اور اٹھائیں اپنے ساتھ لگا لگا کر وہ بعد کھڑو ہوا رہا تھا اس کی اندی رکت سانیوں اور تھی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس ان کے گرد اپنا بازو حائل کیے چپ بیٹھا تھا۔ طیبہ خاتون نے اس کی طرف دیکھا۔ کتنی کئی حیدر کی تھی انہوں نے اور انہوں نے ٹیکہ طرح سے اے دیکھا بھی نہیں تھا۔ آنسو بھری آنکھوں سے وہ اے دیکھ رہی تھیں جب بتل ہوئی یوں لگا تھا جیسے دروازے پر جو بھی موجود تھا وہ بتل سے ہاتھ اٹھاتا بھول گیا تھا۔ انھیں حیدر جو کمرے سے دروازے کی طرف بڑھ کے برآمدے سے کھن تک کا فاصلہ ہی لگتا تھا۔ انھوں میں وہ دروازہ کھول چکے تھے۔

”ماہیلا۔“ اے خضر ان کے بیوں سے نکلا تھا۔  
اور پھر سوائے خضر کے سب ہی کمرے ہو گئے تھے۔ سلی خام جودے میں گرم تھی۔  
”ابا ہوا تھا کماں بلی تھی۔“ سبھی بچی میری ماہ۔“  
گھر میں مختلف آوازوں کو ج رہی تھیں سب ماہ کی طرف خوج تھے اور کسی نے ماہور کے ساتھ آنے والے سفید پائل والے بزرگ کو نہیں دیکھا تھا۔ سفید پائل والے بزرگ کی طرف خوج تھے ان کا ہاتھ تمام کر تھ پھینچے ان اشارہ کیا۔ اتنا تو انہوں نے اندازہ نہ لگایا تھا کہ یہ بزرگ سی ماہور اور حائل بھی تھی وہاں سے بچا کر لائے ہیں۔ کچھ دیر بعد آوازیں مدھم مدھم ہو گئیں۔

”تم ٹھیک ہو نا۔ کچھ نقصان تو نہیں ہوا۔“  
طیبہ خاتون سے سمر میں ہو رہا تھا۔  
ماہور نے کئی میں سر ہلایا۔ اس کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔  
”ماہیلا کچھ تھوڑا۔“

انھیں حیدر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو ماہور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس کی بچکیاں بندھ گئی تھیں۔  
بشکل اس نے ساری بیات بتائی۔  
”کون ہے وہ لڑکی نہاں میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“  
منصور نے کچھ سے مضامین کہیں۔  
”یہ شاہد ہیں۔“  
ماہور کوئی ان کا خیال آیا تھا۔

”اور یہ اگر نہ ہوتے تو شاید میں پھر زندگی میں کبھی آپ سب کو نہ دیکھ پاتی۔“  
سوچنے لگیں وہ اور تھا جب وہ شاہد کے ساتھ گاؤں سے باہر ایک درختوں کے جھنڈ میں آرام کرنے کے لیے ٹھہری تھی۔ خوف سے سہمی ہوئی۔ تاہم یہ وہاں سے نکل چکے تھے انہیں کیا خبر شاہد نے اس کی تلاش میں رہنے سے پہلے ہی ہوں اور وہی یہاں پہنچنے والے ہوں۔ وہ گاؤں سے زیادہ دور تو نہیں آئے تھے لیکن شاہد پائے اسے رکے کو کہا تھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں کس طرف جا رہی ہوں۔“  
وہ ادھر ادھر کی ہوئی نظروں سے دوڑ رہی تھی جب درختوں کے پیچھے سے نکل کر وہ محض ایک جاکھ سامنے آیا تھا۔ اس کا رنگ بڑا دیکھا تھا اور پھر پہلی کپکپاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ جب کہ شاہد بائیں طرف وہ نظروں سے اس شخص کو دیکھ رہے تھے۔  
”شاہد بابا۔“

چند لمحوں کے وقف کے بعد اس شخص کے بیوں سے نکلا تھا اس کی آنکھوں میں خوشی تھی۔  
”شاہد بابا میں آکر ہوں لیکن آپ بھلا کیسے مجھے پہچانیں گے آپ کو تو اپنا ہوش نہیں۔“  
ایک ایک ماہور اس نظر آنے لگا۔

”آپ کو یاد نہیں ہو گا میرا بیلا غلام رسول آپ کا بہت اچھا دوست تھا جب آپ بڑے شاہی کی زندگی میں رہاں رہتے تھے تب پھر آپ نے بیلا کو بہت یاد کرنا تھا پھر ایک دن اچانک آپ آئے بہت سارے سالوں بعد تب وہ بیلا رہاں سے آپ کو دکھا تھا۔ آپ سیدھے ہمارے گھر آئے تھے یاد ہے آپ کو پھر ایک بار بیلا نے بتایا کہ آپ جو جلی میں رہتے ہیں لیکن خدا کی عطا کردہ کمال ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔“

”ایک بار بیلا مجھے جو جلی لے گیا تھا آپ کے پاس لیکن آپ نے بیلا کو نہیں پہچانا تھا۔“

”مشاہد خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے ان کی پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔“

”یادوڑے یکدم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔“

”اگر آپ شاہ بیلا کے خیر خواہ ہیں تو ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”مجھے اب تک اس بے خبر قہارِ ان سارا سے دیکھنے لگا۔“

”تو مجھ کو ملی۔“

اس نے نظریں ہٹا کر ہمیں تب مختصراً ”یادوڑے“ نے بتایا تھا کہ اس وقت انہیں پناہ کی ضرورت ہے۔

”میرا قریبی بی میری قتل کا ڈاڑی ہے اس کا پیڑہ بیچوں بیچ میں گیا تھا میں اور اس لیے کیا تھا کہ میری شخص طے لوں کہ مدد سے گاڑی لیجوں۔“

”اور پھر شاہ بیلا کے ساتھ لڑ کر انہوں نے کچھ بوس پھینکی گاڑی کو باہر نکالا تھا اور دوسرے پہلے وہ ایک قریبی گاڑی میں بیٹھ گئے تھے جہاں ابیر کا سرال تھا اور پھر اکبر کی مدد سے وہ شہر آئے تھے اور وہاں سے اسلام آباد۔“

”اکبر نے انہیں خود جہاز پر بٹھایا تھا۔“

”میں تمہارا یہ احسان بھی نہیں بھولوں گا کہ بہت جلد میں اس بیٹی کو اس کے گھر پہنچا کر واپس آؤں گا اور تمہارے سارے پیسے جو مجھے خرچ کیے ہیں لوٹا دوں گا۔“

”شاہ بیلا آپ شرمندہ نہ کریں۔“

”گھر کا دست بڑا سب ٹھیک ہو گا میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔“

”کیا شاہ بیلا جانتے ہیں کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔“ اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور شاہ بیلا پھر اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے کے نقوش میں الجھ گئے تھے۔

”تم سب سب سے بہت مٹی ہو بہت زیادہ۔“ آہستہ سے بولے تھے۔

”تمہاری شکل اپنے خاندان میں کسی سے ملتی ہے۔“

”بی بی وادی۔“ اور میری داد کا نام سبھی خانم ہے۔“ یکدم وہ مضطرب سے ہو گئے۔

”تمہارے دادا زندہ ہیں۔“ انہوں نے پوچھا تھا۔

”میں بہت سال پہلے میرے والد کی پیدائش سے بھی پہلے وفات پا گئے تھے، یادوڑے نے بتایا۔

”کیسے کہا ہوا انہیں۔“ وہ مضطرب سے ہاتھ مٹا رہے تھے۔

”وادی بتاتی ہیں کہ وہ کسی سے ملنے کے لیے تھے، یادوڑے نے دو سال پہلی کو بھی ملے گئے تھے پھر بہت دن گزر گئے وہ نہ آئے۔ انہوں نے کوئی اطلاع دی تو پریشان ہو کر وادی کے والد راولپنڈی گئے اور اس ہوٹل سے بتایا جہاں راولپنڈی پہنچ کر انہوں نے قیام کیا تھا اور فن کے کئی بہت سے بچے کا بتایا تھا۔ وہ ہوٹل سے خبر ہوئی کہ وہ شخص ایک رات گھر آ گیا لیکن پھر جب ان کا والد آیا تو ایک سوڈہ کر دیا۔“

”یہ وقت شخص میراں سے میرے ساتھ ہو گیا لیکن پھر خیر کرنا شروع کر دیا۔“

”میں باتیں بھی کرتے رہے تھے ہماری منزل ایک سی ٹی تھی۔ مجھے راتیں گئے گاؤں کے پاس آ جانا تھا اور اسے آگے جانا تھا مجھے اس ویگن پر سوٹ نہیں ملی تھی اور وہ چلا گیا تھا مجھے اس لیے بھی یاد ہے کہ ابھی تک میں شہر آوا کرتا ہوں کہ مجھے اس میں سیٹ نہیں ملی تھی نہ وہ ویگن مجھ آگے جا رہا تھا نہ وہ ویگن کی تھی۔“

شاہ بیلا سنا کر بیٹھے گاؤں کو سن رہے تھے۔ ”اپا کے ہاتھ نے چندہ سولہ دن پہلے کا اخبار بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ سن کے حادثے اور سب سافروں کے مرنے کی خبر تھی۔ لاوارث مسافروں کو وہاں لے جانے کے حادثے کے قریبی علاقے میں دفن کر دیا گیا تھا۔“

”لیکن ممکن۔“ انہوں نے لڑتی ہوئی آواز میں کہلا۔

”دوسرے قہارے دادا انہیں مرے تھے کچھ گئے تھے۔“

”آپ کیسے جانتے ہیں۔“ یادوڑے حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”میں نہیں ہوں۔“ انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”اور آپ کی بیٹی۔“ یادوڑے نے غصے سے انہیں دیکھا۔

”مجھے سب سے پہلے یادوڑے کے گھر میں گھر پہنچا کر لے آؤں گا۔“

”بالکل اپنی پوری کی طرح ہو تم میری بیٹی ہو۔“ وہ قہر ڈالنا سنبھ۔

”وہ من ہی من کر کہتا تھا کہ اس کے گھر میں میری بیٹی ہو۔“

”یادوڑے نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ اپنے بیلا کے نام اور ہمارے نام جاتی ہے تب اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔“

”ایک بار یادوڑے نے کہ لڑکیا تین دن میں میں سے اس وقت حقیقی طور پر اپنی پریشانی بھولی گئی تھی اور شاہ بیلا کے متعلق سوچ رہی تھی۔ تب انہیں یہ شاہ بیلا یادوڑے کی بیٹی تھیں۔“

”تمہارے لیے ہیں۔“

”شاہ بیلا نے نفی میں بارگشتی سے پوچھا تھا۔“

”شاہ بیلا۔“

”نصیر احمد خان اپنی پہلی بیٹہ شاہ بیلا کے قریب سیلا کے قریب تھوڑے دن کا کرنا نہیں دیکھنے لگی۔“

”نصیر احمد خان نے حقیقت یہ شاہ بیلا کا ہاتھ قہار کا شکر یہ اور کیا شاہ بیلا والمانہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔“

”یادوڑے شاہ بیلا اور اصل۔“

”یادوڑے نے بھرتے جانے کے لیے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ سبھی خانم نے بچہ سے سر اٹھایا ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھگا ہوا تھا۔ شکر ہے کہ طویل سیدے چہرے پر سرخی گھیر دی تھی۔“

”سبھی۔“ شاہ بیلا یکدم کھڑے ہو گئے تھے۔

”اگر یہ وقت ہے ایک سال باہر طے کر لیا تھا تو وہاں میں خوش رہ سکتی ایک بزرگ خاتون میں بدل چکی تھی پھر بھی دل نہ کوئی نہ تھی۔“

”میں کوئی کام علی شاہ۔“ وہ قدوم آگے بڑھے تھے۔

”یادوڑے میں سب ریجہ کر کے اپنی شناخت دھوونے لگا تھا تمہیں اپنے خاندان کے حوالے سے سب کرنے چلا تھا۔“

”یادوڑے میری بیٹی کہاں سے ہو۔“ سبھی خانم کے لیوں سے سرسرائی ہوئی سی آواز نکلی تھی۔

”میں کہاں سے۔“ وہ بھی دھڑکی ہوئی تھی۔ ”لیکن کہاں ہے۔“ سبھی خانم نے بے چینی سے پوچھا۔

”یادوڑے نے جواب دیا کہ وہ گھر سے ہو گئے۔“ اور جیسے یہ طعن دیکھ رہے تھے نصیر احمد خان کی آنکھوں میں آنسو تھے تو بچوں کے خاموش ہو گئے۔ ایک اونچی سی جھپک اور خوشی تھی۔

”یہ تو بالکل ذرا اپنی اور کبھی بچپن سے ہے۔“ یادوڑے۔“

”یادوڑے نے جواب دیا کہ اسے گھر سے نہیں ڈالیں۔“

”شاہ بیلا نے اپنی دو اسٹان سٹائی میں کھینچ کر خاموش ہو کر سوچنے لگے تھے۔“



”میں نے دلی کو ڈاکٹر صاحب کے پاس بھجوا دیا تھا کہ وہ ایسی پر اسے لکھ کر اچھی چلا جائوں گا لیکن وہابی نے مجھے قید کر دیا تھا اور پھر وہاں مجھے ہر روز آنکھیں لگانے سے روک دیا تھا۔ ہولے ہولے میرا ذہن جواب دہ کیا۔ پھر اسے سال گزر گئے مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ کبھی ابھی اچانک مجھے یاد آتا میرا کچھ قہری بیوی تھی۔ پھر ذہن کی سلیٹ صاف ہو جاتی۔ پچھلے تین سال سے کبھی ماضی کا کوئی منظر یکدم پوری جزئیات کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے یکدم سب بھول جاتا تھا۔ پھر میں نے اسے دکھایا جیسے ہوتے تھے وہ مجھے دکھائی دے گا۔ پھر ان دونوں میں وہ قہقہے سے مجھے سب یاد آئے گا تو وہاں دھواؤں کے“

”وہ ڈاکٹر صاحب کہاں رہتے ہیں ان کا پتہ نہ تھا نہ نام یاد ہے آپ کو۔“

”سلیٹ خاتم کی مانتا تریپ رہی تھی۔“  
”ڈاکٹر کا نام مصطفیٰ تھا مصطفیٰ کا معنی اعران اور ان کا ٹیکہ کا۔“ وہ یاد کرنے لگے۔  
”کیا کیا نام بتایا ہے آپ نے۔“ افضل حیدر نے جو کچھ یاد کیا۔  
”ڈاکٹر مصطفیٰ کا معنی اعران۔ ڈاکٹر کی پیکم بھی ڈاکٹر تھی ڈاکٹر کا یہ مصطفیٰ۔“  
شاہد بابا نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

”وہابی گاؤں جیت انگریز سکی۔ بہت چران کن ہے۔“ افضل حیدر نے سب کی طرف دیکھا۔  
”ڈاکٹر مصطفیٰ ان کے حادے میں رہی ہوئے وہاں دو سال تک کسی کا پاسبان ہے پھر وہاں تو پھر واپس نہیں آیا اور ڈاکٹر مصطفیٰ کو لندن جانا تھا اپنی فیملی کے ساتھ۔“ سب انہوں نے وہابی حیدر کی اپنی پستہ دست کے حوالے کر دی جو ان دنوں کورالینڈ میں ان سے ملے ہوئے تھے۔ وہ اسے کسی اور اسے شے پھر جتنا چاہتے تھے لیکن حیدر علی نے اس کی کوئی یاد نہ تھی۔ اس خیال سے کہ کیا فرقی اس کا پاسبان ہے جو یہ کہ انہوں نے کراچی آنے سے پہلے آس پاس کے دو تین گھروں میں اور ڈاکٹر مصطفیٰ کا گھر خریدے وہاں کو بھی کراچی کا گھر ہے وہاں تھا کہ کوئی اگر ڈاکٹر مصطفیٰ کو پچھنے آئے تو یہ گھر دے دیجیے گا لیکن وقت نہ رہا گیا کوئی اس کی کوئی نہ کر سکتے تھے۔ آقا تھا اور وہابی حیدر علی کے گھر کی ایک فوری بن گئی تھی بلکہ دو دروازے تھے۔ سب نے اسے اپنا جان لیا تھا وہابی حیدر اپنا نام صحیح سے بتانے لگتی تھی بلکہ خود کو اپنی کہتی تھی۔

”ابھی“ وہابی نے اپنی طرف اشارہ کرتی تھی جب مجھے افضل حیدر نے اسے حیدر کا نام یاد کیا تھا۔  
بڑا کچھ اچھول والی تھی سب کی جان تھی۔ شوق میں اس کے ساتھ سب کا تھکا تھکا دیکھ کر حیدر علی اس وقت سے ڈر جاتے تھے جب اس کا پاسبان آ کر اسے لے جاتے گا لیکن پھر گزرنے وقت کے ساتھ وہ بھی بھول گئے کہ حیدر ان کی بیٹی نہیں ہے سہرا کی پیداوار نہیں ہے بعد میں حیدر کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔  
”حیدر انگریز۔“ انہوں نے خوشی سے دہرایا۔

”میں کل ہی دیکھا تھا۔“ مجھے یقین ہے وہ ڈاکٹر مصطفیٰ کا گھر دھوڑوں والے گا۔ شاہد بابا بڑھاپے سے۔  
”کیا آپ کو یقین ہے کہ ڈاکٹر مصطفیٰ اب تک وہاں اس گھر میں ہوں گے وہ اس اور بھی تو جانتے ہیں۔ کسی دو سرے ملک کسی دوسرے شہر میں۔“  
افضل حیدر کا بوجھ عجیب سا تھا۔  
شاہد بابا نے چہرے کے رنگ پچھلے دیکھے۔

”ہاں ہو سکتا ہے لیکن میں وہاں جاؤں گا تو ضرور۔“ ان کی آواز دھیمی تھی۔  
”اگر مقدمہ میں ملے لکھ ہو تو جس طرح اسے سائلے ساتھ بعد باپ لگے ہیں اس طرح میں بھی مل جائے گا۔“  
نصیر احمد خان کے کہنے میں یقین بھی تھا اور توکل بھی۔ شاہد بابا نے ایک منظر کبھی نظر ان پر ڈالی۔ یہ ان کا بیٹا تھا لیکن جیسے انہوں نے آپن چلیا ہوا دکھا تھا۔ عمر کے اس تھے جس جسد کو بھی بچوں کا پاسبان تھا۔ اس کا تھکا کر تھیں کرنا تو کچھ کچھ جانا پہلی بار اس کو مل جاتا ہے سب خوب صورت دن ان کی زندگی سے نکلیں گے۔

”کاش آدمی اتنا حریف نہ ہوتا۔“ ان کی نظروں ان کو مکمل چھپ کر تھیں۔  
”میں کل سبھی کورالینڈ ہی جاؤں گی۔“  
”میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔“ منصور بلی بلیا۔

”یہ منوں سے نامیرا تھا۔“  
باہور کی آنکھوں میں نلکے سے پھر رہے تھے منصور کے مجھے ہوئے افسردہ چہرے کو دیکھ رہی تھی نفی اذیت تھی کسی ایک نامہ کر جرم میں اس نے۔  
”کسی کورالینڈ کی جانے کی ضرورت نہیں۔“ افضل حیدر نے اعکشاف کیا اور سب نے افضل حیدر کی باتوں کو بہت دیکھی اور حیرت سے سنا۔

”یعنی حیدر غالب۔“ نزل کے کیوں سے نکلا تھا۔  
”جنت۔“ سلیٹ خاتم نے بھی حیرت سے دیکھا۔  
”رحیم کی آنکھیں بالکل سبز تھیں اور حیدر کی آنکھیں دیکھ کر وہ مجھے یاد آ جاتی تھی اور اس کی بیٹی کی طرف میرا دل ڈھونڈتا تھا۔“

”وہ حیدر غالب کہتا تھا۔“ نزل کو سب سے پہلے خیال آیا تھا۔  
”نہیں۔“ افضل حیدر نے منع کیا۔  
”میں خوب بات کروں گا جنت سے اور جو سب طرح اب تک کسی کو یاد ہوئے اور لے کر کاظم میں بھی بھی نہ ہو۔“ انہوں نے تاکید کر اور پھر اسے سلیٹ فون سے حیدر کا نمبر لے لگے۔  
”جنت جیسے میں ممکن ہو کل پہلی ٹیلیفون سے تم سب آ جاؤ۔“  
”خیریت ہے نا۔“ حیدر غلامین۔ ”مجھے پاس ایک سرسرا ہے۔“

”افضل بھائی آج میری پاس بھی ایک زبردست سرسرا ہے بس تم آ جاؤ فوراً“ اور کیمو بیو می طبع کے ہاں آنا۔“  
”ہاں۔“  
حیدر پھر کچھ کتا جاتی تھیں لیکن انہوں نے فون بند کر دیا۔

”اس جگہ سے تم میری ایک ساتھ جیسے خوشیوں کی بات از کل تھی تیار۔“ حضور نے ابھی۔ جس کا ایک لفظ بھی نہ کیا تھا وہ ایک طرف کر ہی پر خاموش بیٹھا تھا۔

”ہاں۔“  
حضر نے بالکل آگے آ کر کہا تو وہ جو کچھ اسے دیکھنے لگی۔  
”تم میری طرف سے اعتبار مت ہو۔“ میں صرف پریشان ہوں اور مجھے میں ہوں۔ غصہ مجھے ان پر ہے جنہوں نے یہ سب کیا اور میں یہ فعل نہیں کیا ہوا کیسے اس طرح ان سے اس ظلم کا سباباں۔ میں جیسے حیدر کے ساتھ ہوں تم میرے لیے پستہ لایا ہوا ہے۔“

اپنی بات کر کے وہ رکائیں تھا یہ حیدر کا من میں لگے ہیں کی طرف چلا گیا تھا اور ہاتھ دھو کر واپس کر کے میں چلا گیا لیکن یاد ہو کر کے بل پر ڈاؤں پڑا تو یہ کیا اس نے سوجھا کہ اللہ کا شکر ادا کرے جس نے عزت و آبرو کے ساتھ کھر واپس پھیلایا تھا۔  
وہاں کھر کو غور سے چل دی۔

رات میرے سوئی تھی اس لیے صبح بھی میرے اٹھی تھی۔ نزل نے اسے نماز کے لیے دیکھا تو مزہ کچھ کچھ بستر پر تھی میں ادب یاد وہ نزل کے دھکے پر ہی اٹھی تھی۔ حلاک بستر سے اٹھنے کو میں چلا رہا تھا۔ پتہ نہیں تھی۔ باتوں کی بے آراہی اور نشیمن تھی۔

”ماہ سمراد نکلی ہوئی ہیں۔ ہمارے ساتھ ہماری طرحی پریشان رہیں اور، صبح ان کافوں کا تیسرا نمونہ تمہارے آگے لگانا اور تھوڑے دنوں میں آگے آگے نہ آگیا۔“

”ماہ سمراد! کو دو دنوں کا تھوڑے سے پیچھے کرتی ہوئی ڈرائیونگ دم میں آگئی۔ سمراد اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”شکر ہے اللہ کا کہ اس نے سب کی دعا میں نہ لیں۔“  
ان کی آنکھیں نم ہوئی، میری پیشگی طرح ماہ دوران کے غلوں سے بہت متاثر ہوئی۔  
”اللہ نے ہمیں بچایا، ہاں کہ تمہارے ساتھ بہت سارے لوگوں کی دعا میں تھیں۔“

”انہیں نزل سے سب تقسیم کرنا چاہی جلی گئی۔“  
”اور ہمیں منوں کی اور اپنے ڈاؤن ایا اور اپنی پیچیدگی واپسی مبارک ہو۔ کبھی بھی ہوتا ہے نا ایسا، ہاں کہ آدمی پر ایک وقت بہت ساری آنا نہیں آجاتی ہیں اور پھر اللہ ہی ہے جو ان مشکلات سے آدمی کو نکالنا ہے۔ ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں ہر آنا میں سرخوش کیا۔“

ماہور کو سمراد بہت سب اور اپ سیٹ سی لگیں۔  
”سمراد آپ ٹھیک تو ہیں نا۔“

”ہاں لاہور جاری ہوں اپنے بھائیوں کیس کا۔ یہاں والا گھر فروخت کر دیا ہے میں نے اور بھائی کے گھر میں ہی ایک نوک پورن لے لیا ہے میں نے جو انہوں نے پہلے کرانے پر دیا تھا۔ اڈا کم میں وہاں محفوظ تو رہوں گی۔ سنا ہوا تو ہو گا سنا سنا کاپی عورت کا نہایت مشکل ہو تا ہے۔“

”آپ کے ساتھ کیا ہوا سمراد۔“ ماہور کھرا کھی۔  
”میرے ساتھ۔“ سمراد کے یوں پر ایک آدمی کی سکرانٹ بکھری۔  
”ماہ بہت بار میں نے سوچا کہ تم سے اتنا بڑا شیر کوں لیکن پھر مت نہ ہوئی کہ کہیں تم مجھ سے نفرت نہ کرنے لگو۔ کہیں میرا بی بی اف کوئی دوست سے بھی عورت نہ ہو جائے۔“

”یہ ان کوئی بات کی ہے جب سمراد نے طلاق بھجوا دی تھی۔ ایک شخص میں سے ایک لڑکی مجھے ملی اور میں اس کے ذریعے میڈم سفینہ کیس کی پیچ کی۔ میڈم سفینہ نے اپنے گھر کے میں منہ میں ایک گلاب کھول کر رکھا تھا جس ویک اینڈ پر مجھے جیسی فرسٹ پلٹ عورتیں انہی ہوتی ہیں۔ وہاں سب کچھ تھا، ہوا رنگ بونا، فلیش سب کچھ میں نے بڑی بڑی دولت مند عورتوں کو دیکھا وہاں آتے ہوئے سکرٹ کے سرخوئے اڑاتے شراب پیتے ہوئے یہ مسلمان عورتیں تھیں مجھے یہ یاد نہیں کچھ گرجت ہوئی تھی۔“

”یہ بے چاری عورتیں یہاں اپنی ٹیفن دور کرنے آتی ہیں۔“  
میڈم سفینہ نے سمجھنے لگا۔

”یہ یہاں نہ آئیں تو پاگل خانے پہنچ جائیں شہر میں کی سٹائی ہوئی ہے چاری عورتیں۔ اب تم سوچو تمہارا شوہر کتنے سالوں سے باہر ہے۔ وہاں دور مڑے میں ہو گا اور تمہارے لیے تنہائی کاغذ اس کیچا تیار راتوں کو بے چین نہیں ہوتی ہو اس کے بغیر۔“

اور پھر ان باتوں میں وہ مجھے ہمال کے دو سرے جھٹے میں لے گئیں۔ جہاں کچھ میڈم سے خنجر کر رہے تھے۔  
”سمراد سب کچھ خاں ہیں۔“

میڈم سفینہ نے میرا رخ کر دیا۔  
”ان کی سڑکی تمہارے میاں کی طرح ٹھک سے باہر ہیں۔“  
میڈم بھی گئیں۔ سمراد خوب صورت بائیں کرتے تھے رات کا نہ جانے کون سا پر تھا جب میں سڑ

مستاب کے ساتھ ایک کمرے میں جاری تھی۔ وہ فٹنائل گل کردی گئی تھیں اور سب۔  
پھر وہ کچھ ہو گیا جو میں ہوتا تھا۔ میں نے چاہا کہ پھر اس ایک غلطی کے بعد وہاں نہ جاؤں میڈم سفینہ کے کلب میں۔ لیکن میڈم کیس کی فیکس کمرے سے پہنچی ہوئی تھیں۔ میں نے کمرے میں نہ جانے کہاں کمرے فٹ تھے میں اس جال میں پھنسی چلی گئی۔ پتا نہیں میرا اللہ مجھے معاف نہیں کرے گا یا نہیں۔“

”اللہ تو یہ دے والوں کی تو بہ قبول کرنا ہے۔“  
”تم میرے لیے بیٹھ کر رونا نہ دینا۔ میں نے اسی لیے لاہور بھائی کیس کا جانے کا فیصلہ کیا ہے کہ اس گناہ

آلود زندگی کے چال سے نکل جاؤں یہاں رہ کر یہ ممکن نہیں اور تمہارے لیے بھی میرا مشورہ ہے اب بھی نہ اسے تعلق نہ رکھنا۔ بہتر یہ ہے کہ یہ شہر چھوڑ دو۔ میں کل یا پھر سولہ بجے جاؤں گی آج شاید یہ میرا بھائی آجائے گا مجھے لینے۔“ ماہور نے کچھ نہیں کہا۔ میں حیران اور غمزہ سی بیٹھی تھی۔

”اور سوچو مجھے اپنی شادی پر ضرور ملانا۔“ وہ مسکراتی تھی۔  
”تم سے رابطہ تو رہے گا نا۔“

ماہور نے سمراد کو۔ خیر نے رات مختصر ”استہار کرے کو کہتا تھا لیکن ہل اب بھی بے یقین سا سوکھے چنکی طرح کانپتا تھا تھا۔“

”خیر بہت اچھا ہے کچھ اور دارا بشور۔“ سمراد نے اسے تسلی دی۔  
”وہ حالات کو کنج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور پھر وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ ماہان تین چار دنوں میں اس کی وجوہات میں سے کچھ تو خفی ہے کچھ تو وہی ہے کہ تم اس بات کے نوا افغنی تمہارا میرے بنے گا۔“

وہ اسے تسلی دے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔  
”ابھی ساری ہی ٹینگ کرتا ہے ماہ جانے سے پہلے کچھ دیر کے لیے آؤں گی۔“ ماہور۔ سمراد کو گریٹ تنک چھوڑ کر آئی تو نزل نزل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

”کس کافوں تھا۔“ نزل جب بات کر چکی تو اس نے پوچھا۔  
”شعبی کافوں تھا۔ جتنا رہا تھا کہ تم نے اسے سرال والوں سے صلہ ہو گئی ہے اور شعبی کی بات اپنی بچا زاد سے اور اس کے بچا زاد بھائی کی بات اقم سے ہوئی ہے۔“

”تم نے بتایا تم خالہ اور شادی کا۔“ ماہور نے پوچھا۔  
”ہاں بہت حیران ہو رہا تھا اور میں نہیں آ رہا تھا۔“

”اور ماہوں جان کے گھر میں سب خیریت ہے عذر خالہ! آفرم بھائی سب۔“  
”اں لیکن ماہوں جان کی طبیعت ٹھک نہیں ہے۔ شعبی بہت پریشان ہو رہا تھا کہ کچھ دنوں انہیں باکس ملارٹا ٹھیک ہوا ہے۔ سب آپ سیٹ تھا۔“

”اللہ ماہوں جان کو صحت مند زندگی دے۔“ ماہور نے دعا کی۔  
اسفر بھائی کے بہت اچھے دوست تھے۔ کئی کو شاد رخ بھائی سے اچھا میر سخر نہیں مل سکتا تھا۔ اور شجاع بھائی کی شادی جن سے ہوئی ہے تاہم کئی ڈائریکٹ اور سب تیار اور ابھی نیکی ہیں۔“

نزل ان سب کے حلقہ تفصیل بتانے لگی۔ ماہور خاموشی سے سنتی رہی۔  
”اے تم نے تو ابھی بتا رہی تھیں کیا۔“ بات کرتے کرتے نزل کو اچھا خیال آیا۔  
”میں سوچ رہی تھی کہ ابھی چائے بھجوائی ہوں لیکن سمراد اٹھ کر چل دیں۔ خیراب میں تمہارے لیے ناشائستگی ہوں۔“ نزل اٹھی۔  
”دعا۔“ ماہور نے اس کا ہاتھ قلم لیا۔  
”دعا۔ اس سبب میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ جس کی تواؤ بھرا کئی۔“

”تو بیکس ہو جاؤ تم بھی۔“  
 کہی تھے بچے کی طرح اس کا رخسار چھپتا ہے ہونے نہ لیں ہر نگاہ کی اور باؤ ایک بار پھر گزرے وہ نکلتا  
 سوچنے لگی کہ اس کے اس طرح چلے آئے تھے شہزادہ پر کیا کڑی ہوگی۔ صبح جب وہ اور شاہیابیہ میر سے ملے  
 گئے تو۔

”اللہ تبارک ہے۔“  
 اس نے ایک جھڑکی سی ملی اور ملی ہی مل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگی۔

شاہزادی جی جی چلے کوئی بی بی جان کی بیماری کی جڑن کر رہا ہے۔  
 ”کب ہے۔“ وہ پریشان سے نورانی بی بی سے پوچھ رہے تھے۔  
 ”راستی کا چانک سی بی بی جان کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ وہ شاید کبیس گھنٹی تھیں اندھیرے میں چوٹ  
 بھی آئی تھی اور بی بی کی زیادہ ہو گیا تھا۔ چھوٹے شاہی لے کر انہیں ہاسپتال گئے ہیں آج صبح۔“  
 ”شاہزادہ کب آیا۔“  
 ”تیس بجے حیرت ہوئی۔“  
 ”کل صبح آئے تھے اچانک۔“ نوران نے چونک کر کاہم کرتی تھی بتایا۔  
 ”راہ راہی ہی آئی آپ۔“  
 ”سچ ہے تو بھلا۔“  
 ”میں بی بی اچھوٹے شاہی اکیلے ہی تھے۔“  
 ”سہ تو کون کیا ہے؟“ وہ بے حد پریشان ہو گئے تھے۔  
 ”دھکا ہلاہلا دھول راد گئے تھے فضل راد تو ابھی کچھ پر پسلے ہی آیا ہے بتا رہا تھا انہوں نے بی بی جان کو داخل کر لیا  
 ہے۔ شاہی اور گھان اور دھری ہو گئے ہیں۔“

اس نے فقہانہ انداز میں شاہزادے فضل راد سے معلوم کر کے کہ وہ نوزکی جیسے کے ہسپتال میں ہیں ہسپتال روانہ  
 ہو گئے۔ شاہزادہ بہت پریشان سا ہسپتال کے کوریدور میں مل گیا تھا۔ ”دوب کیا ہو بی بی جان کو۔“  
 شاہزادہ نہیں دیکھ کر سہی آئی ہے ان کی طرف بڑھے۔  
 ”کس اچانک رات کو انہیں ڈر کر کہیں۔“ جٹ تو معمولی آئی ہے۔ رات تو بڑھ دیکھے کا وقت تھا۔ میری آنکھ  
 کھل گئی تھی۔ رات میں ہی ڈر پھرتے آ کر میری بی بی کی بی بی تھی۔“  
 شاہزادہ نے نظریں چڑا دیں۔

”ٹھیک ہے بڑا اکر سے بات کرنا ہوں اگر راولپنڈی لے جانا بہتر ہے تو لے جاتے ہیں۔“  
 شاہزادہ نے سہلا دیا وہ بے حد اچھا سوٹ لگ رہا تھا۔

وہ انداز کوہا نور کے کمرے اپنے آپس کے کورے کمرے میں لے گیا تھا اور لا کر کے گیا تھا اس کا خیال تھا  
 کہ صبح سویرے ہی وہاں سے کس اور داخل کر کے گا لکھ اس نے سوجھا تھا وہ راکوین بھی بھانویے گا۔ یوں ہی اس  
 کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اور پھر پھر نور کو کمرے لے جانے کے آپس کے اس کمرے میں بے کار سلمان رہا تھا جو خود کام  
 کچھ زیادہ ہی تھا اس کا خیال تھا کہ وہ صبح کو یوں ہی بے ہوش رہے گی۔ پھر بھی اس کا خیال تھا کہ اس نے نیند کا کچھ نہیں  
 بھی گلوایا تھا۔ کچھ بے رنگ نہ کرے۔ لیکن یہ صداقت کہ وہ بی بی نور کو لے گیا تھا۔

”شاہزادہ صاحب لڑکی کو کہیں آگے پیچھے کریں۔ میرے تجربے سے ظاہر ہے کہ صبح سویرے ہی میرے کمرے لڑکی کی تلاش  
 میں چھاپے پڑنے والا ہے۔ تجربے میں ایسے چھاپوں سے کس ڈر نہیں کریں۔ کس وہ آپ کتنے ہیچ جائیں۔“  
 شاہزادہ نے وہی گھر کیا تھا اور صبح نہ اندھیرے ہی اس نے اپنے خاص بندوں کے ساتھ اسے گاڑی میں  
 چڑھ کر چھاپوں کی غمت میں اٹھایا طوں کے ساتھ۔ راستے میں انہوں نے مکان میں قیام کرنا تھا۔ اور خود وہ دونوں بند  
 یا نہ تیر گیا تھا۔

وہ جانتا تھا جتنا وہاں محفوظ ہے اور کس نہیں۔ شاہی اور سب لاہور میں تھے۔ گھر میں صرف بی بی جان  
 تھیں۔ اس کے بندوں نے اسے مزار شریف کی طرف ہی کو گھر میں سے ایک میں بند کر دیا تھا ایک رات کی  
 یاد۔ کچھ اس نے سوجھا تھا صبح سویرے وہ اسے شکار گاہ میں منتقل کر دے گا وہ۔ لیکن اسے مکان بھی نہیں تھا  
 کہ وہ اس طرح کرے ہے باہر نکل جائے گی اور پھر۔

”اف بی بی جان کی وہ نظریں۔“  
 اگرچہ کچھ بچے تھے جسے تھیں لیکن بی بی جان کی وہ نظریں اسے اندر سے پیانی کر گئی تھیں۔  
 ”نور اور ان کا گھر۔“

بی بی جان نے بہت جلد ہی آواز میں کہا تھا جب وہ انہیں اٹھانے کے لیے پتہ کیا تھا۔

”تمہاری ساری من پائیاں اور شوق قہل لیکن یہ۔ اس لڑکی کو جو کسی شریف گھرانے کی لگی ہے کھلا لے  
 ہوئے تھیں ہی اور کھلی کا خیال نہ آیا شاہزادہ کی طرف اس کے بیٹیوں کی بیوی لاش سے خوفزدہ۔“  
 ان کی بات اور دھری ہوئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گئی تھیں لیکن وہ جیسے شرم سے نظریں بھی نہیں اٹھا رہا تھا  
 ۔ اور بی بی جان کی حالت کے پیش نظر صبح تک اس نے ایک بار بھی یاد دہانہ کر کے حلق میں سوجھا تھا۔ شاہیابیہ  
 کے ساتھ ہی تھی لہذا اس نے کس پاس ہو گئی شاہیابیہ کو کہاں کو بھوس تھا پھر اور بھلا ان میں اتنی جرات تھی۔ اور بی بی  
 کوہ۔ بی بی سے باہر نکل سکیں اور پھر اسے سارے چوک۔ اس کا کہنے نامہ بی بی جان کو چھاپا،  
 اذیت نہ دلائے کہ بعد اس کے فضل راد کو وہاں صبح کو بھی بھجوا دیا تھا کہ وہ شاہیابیہ کی دھری ہوئی دھری کو جس  
 سے کراہی سے لائی جائے والی لڑکی کو تلاش کر کے شکار گاہ میں بند کر دے اور وہاں غلامیہ وہ خود غلامی کرے۔  
 بی بی جان کی حالت ٹھیک نہ تھی اور ابھی وہ مزید یاد دہانہ کر کے حلق میں سوجھا تھا۔  
 اللہ جانے لیا ہوئے اور وہاں تھا بی بی جان بے ہوش تھیں ابھی تک اور پھر دیر پہلے ان کی ناک سے خون کے  
 قطرے بھی نکلے تھے۔

”نہیں بی بی جان کو ہر صورت کسی ایسے ہسپتال میں منتقل کرنا پڑے گا اور راولپنڈی ہی نوزیک ہے۔ لاہور تو  
 بہت دور ہے۔“  
 ”تو ٹھیک ہے لے جاتے ہیں۔“  
 شاہزادہ بہت پریشان ہو رہا تھا۔  
 ”کیونکہ۔“ اس نے زہنی کچھو کھتا ہے اس میں فون کر کے بتا دے کہ بی بی جان کو راولپنڈی لے جا رہے ہیں۔  
 شاہزادہ نے شاہزادہ کو بتا دے کہ کچھ اور کوزہ دم کی طرف بڑھے گئے۔

”قاری کبھی کبھی آتے ہاں۔ ایک ایک کرتے ہیں اور پچھتے ہوئے جانی نہیں بڑی ہے وہاں ایک چھوٹا ہوسٹلر لیک  
 ہوتا ہے وہاں پہنچتے ہیں ایک کونہ وہاں دھری بھی آکر بیٹھ گیا کر دے۔ اپنے گاؤں کا بھی تو ہے۔ بہت پر۔“  
 سید شعیب نے شاہزادہ کو ایک ایک کر کے بتا دے کہ تمام لڑکیاں شاہزادہ کے ساتھ۔

وہ پچھلے ایک پتے سے کوئی میں سقیم تھی۔ بی بی جان کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع انہیں نہایت فاطمہ نے دی  
 تھی اور وہ سب کے ساتھ ہی راولپنڈی آئے تھے۔ بی بی جان کی طبیعت کافی خراب تھی اس کے دائیں طرف پیچ  
 کا ایک ہو گیا تھا۔ بہتر بہتر ہسپتال میں بہتر نہ ان کو لے کر زیر غرائی علاج ہو رہا تھا۔ ابھی وہ اپنا دایاں ہاتھ ناگ  
 کسی بھی چیز کو حرکت نہیں دے سکتی تھیں۔

پہلے۔ میں انہیں ساتھ لے کر دھریوں کے ساتھ دیکھ کر بی بی جان کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی تھی۔ شاہی نے  
 ان کی زبانت کو محسوس کیا تھا اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے کچھ قائم لکھ کر اسے  
 میں کمرے میں موجود لکڑی سے بات کرنے لگے تھے۔ بی بی جان کا چھوٹا ہاتھ تھا۔ وہ پول تھیں کس بھی ٹھیک

طرس سے سید قائم علی شاہ کچھ اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ مقبر علی شاہ کی بات سن کر ان کا کردار عمل تھا۔ شاہ رخ فرزند غافلہ اور گلاب کو ہتھال میں بھجوا کر سب کو واپس چلے گئے تھے اور سید قائم علی شاہ واپس لاہور آئے تھے کہ وہ تین روز میں ہتھال سے چلے گئے کہ وہ حزن آ کر اس دوران انہیں کراچی جانا پڑا تھا۔ حزن کے والدین کا پتا چل گیا تھا۔ بے خبر حزن کے لیے جہاں خوشی کا باعث تھی وہاں ان کی غیبی سی کیفیت ہو گئی تھی اس کا چاکلہ خیر سے رکھنا غامخ کی والدہ اور نصیر خان ان کے بھائی تھے۔ یہ انکشاف بہت حیران کن تھا اور شاہابا کو کچھ کر سید قائم علی شاہ حیرت زدہ ہو گئے۔

”ایسا دھڑا آجائے میرے پاس میاں سے آپ کو کوئی نہیں لے جا سکتا میں ہوں آپ کا بیٹا اور یہ کوئی غیر نہیں آ سکی رہیہ کا شہر ہے۔“

لیکن شاہابا کی آنکھوں میں خوف تھا وہ مضبوطی سے نصیر خان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ سید قائم علی شاہ کے لیے یہ انکشاف بہت خوش کن بھی تھا اور حیران کر دینے والا بھی کہ حزن شاہابا کی بیٹی ہیں شاہابا یاں اسے عمر کے بچے تھے اس کے متعلق اس میں یقین تھا کہ وہ حلی سے بھاگے ہوئی تھیں خواہ لگ گیا جس کی مدد سے یہاں تک پہنچے تھے ان کی ذہنی حالت میں وقت گزرنے کے ساتھ خود بخود بہتری آ گئی تھی سالوں پہلے انہیں یادداشت ختم کرنے کے لیے جو انکشاف لگوائے گئے تھے ان کا اثر ختم ہو گیا تھا پھر سب قدرت کی طرف سے تھا کہ انہیں باضی یاد آ گیا تھا تاہم انہوں نے یہاں واپس آ کر کسی سے شاہابا کا ذکر نہیں کیا تھا۔ لی بی جان کو ہتھال سے دست خارج کر دیا گیا تھا۔ شاہ رخ سے فلن پر بات ہوئی تو وہ حزن کے ساتھ حلی آئے تھے لی بی جان کی حالت ابھی کی۔

”اس میں وقت لگے گا۔ لیکن مسلسل انکسار مزاحور دیکھ بھال سے ٹھیک ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ۔“

ڈاکٹر نے کہا تھا۔ حلی میں خوب رونق تھی۔ شاہ زب نے کراچی سے زارا کو بھیجا دیا تھا۔ شاہ رخ اور شمع بھی آئے تھے ایک دو دن کے لیے۔ شاہ رخ کی شادی کے ساتھ خوب کچھ شہر ہوئی تھی۔

”اور آپ نے میرے ساتھ خوب چل چلا یا بیٹا اور یہ شاہ رخ بھی آپ کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔“

”اس نے انہیں شادی شاہ رخ بھائی تو لیا تھا جانتے تھے کہ میں اس کا کارڈ نہیں دے رہی ہوں۔ یہ تو بس۔“

وہ ہولے سے ہنس دیا تھا۔ شادی اتنے نرم دل اور نرم مزاج تو بھی تھی تھے جتنے ان دنوں ہو گئے تھے اور ان دنوں انہوں نے سید قائم علی شاہ شاہ رخ کے ساتھ سب سے ڈیڑھ سال کی تھیں۔

”تو سید قائم علی شاہ کیا خیال ہے آپ کا پھر یہاں ٹھیک۔ بونا شروع کریں۔ برا مسئلہ ہوتا ہے کوئی بیمار ہو جائے تو۔“

انہوں نے پھر کہا تو سید قائم علی شاہ جو تک نہ۔

”جی اچھا خیال ہے۔ ایک دو ڈاکٹر کو مشفل اپائنٹ کر لیں گے۔ کچھ رقم ہے میرے اکاؤنٹ میں بھجوا دوں گا۔ ٹھیک ہے۔“

”میرے صحت کو سید قائم علی شاہ۔ یہاں اس حلی میں تین سب میں ہمارا احتہر ہے۔ زمینوں سے لاکھوں کی آمدنی ہوتی ہے۔“

”میں نے کہا تھا شادی اللہ کا واسطہ کچھ ہے کچھ نہیں چاہیے مجھے۔“

”سارا حق ہے قائم علی شاہ۔ اللہ مجھے حفاظت کرے۔ میں سارا حق ادا کرنا چاہتا ہوں بہت قرض ہے مجھ پر تمہاری لی بی جان کی طبیعت ذرا ہی برہم ہو جائے تو تمہارا سارا صاحب کتاب کر لو۔ میں نے شاہابا کے ساتھ بھی بہت زیادتی کی۔ کاش وہ مل جاتے تو میں ان سے معافی مانگ کر ان کا حزن ان کے حوالے کر دیتا۔ اللہ جانے کہاں چلے گئے۔“

ان کے پاس یہ بیضا شاہ زب یکدم مضطرب ہو گیا تھا۔ فضل داؤد نے ۱۲ ہتھال میں ہی اطلاع دی تھی کہ

شاہابا غائب ہیں اور لوکی بہت سی تلاش کے بعد بھی وہ نہیں ملے تھے۔ پتا نہیں زمین کھائی تھی یا نہیں یا آسمان۔ اس ذہنی کیفیت کے ساتھ اللہ جانے دہا نور کے ساتھ کھائے تھے وہ ان سارے دنوں میں سے حد پریشان رہا تھا۔ اس کا ایک نام قناعت تھی وہ اس کی کا بھر کا کردہ لڑکی ماہور کی اخبار کے فرائض پہنچ گئی یا کسی ان کی اور کے ساتھ لگے تھے تو اس نے آگے کا تصور ہی بول دیا تھا۔ وہ بھلے کچھ بھی ثابت نہ کر سکتی تھیں تاہم نام چھل جاتے تھے۔ ”شاہی مجھے معلوم ہے کہ شاہابا کہاں ہیں۔“

سید قائم علی شاہ نے اس کے فیصلے کی کہ وہ شاہابا کے متعلق بتا دیں۔ شادی سے زیادہ بے قرار ہو کر شاہ زب نے پوچھا۔

”کراچی میں اپنی فیملی کے پاس۔“

سید قائم علی شاہ نے حزن کی طرف دیکھے ہوئے آہستہ سے کہا۔ حزن کے چہرے پر اضطراب نظر آیا۔

”اور یہ حزن ہیں شاہابا کی بیٹی۔“

”نہیں۔“

ایک ٹھنڈی کو بھی یقین نہیں آیا تھا۔

شاہابا ہولے ہولے مہر ہو رہے تھے انہیں باضی یاد آ رہا تھا اور بس ان کی کیفیت میں وہ یہاں سے نکل کر گھر پہنچ گئے اور کراچی سے افضل بھائی کا کون ان سے رہی کراچی گئے تھے ان سے ملنے۔“

”یا اللہ تیرا شہر ہے۔“ شاہابا نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

”میں نے بہت دعا مانگی تھی کہ شاہابا جلیں جس میں ان کا حق انہیں دے دوں ان سے معافی مانگا ہوں اور اللہ نے میری دعا سن لی۔ شاید اللہ نے مجھے یہ زندگی دے کر موقع دیا ہے کہ میں سب کے حقوق ادا کر دوں بڑے شاہی سے موت سے پہلے ان کی درخواست کی کہ وہ اپنے بھائی کو اس کا حق دے دیں جو شرعاً قانوناً

بننا ہے۔ سید قائم علی شاہ مجھے لے چلو شاہابا کی پاس جو کام دانی نہیں کر سکتے تھے مجھے بھی کرنا ہے اور شاہابا سے معافی بھی مانگنی ہے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں شادی جلدی شاہابا کی فیملی لاہور شفٹ ہونے والی ہے۔ میں لے چلوں گا ان کے پاس آپ کو۔“

شاہ زب نے جی سے ساتھ مسل رہا تھا۔ شاہابا تو اپنی فیملی کے پاس چلے گئے تھے لیکن وہ بھلا وہ کہاں تھی عام نور۔ لیکن یہ بات سید قائم علی شاہ سے نہیں ہو سکتی تھی لی بی جان اسے دیکھتے ہی منہ پھیر کر تھیں۔ تب ان کے پاس بیٹھ کر اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ لوکی آ کر اسے لے گئی تو وہ اس کے والدین کے پاس پہنچا کرے گا۔

”نقصی بیٹا آج ہم کمر جا سکتے ہیں۔“

عذر دیکھنے سے ہنسنے پر چھٹا وہ میاں صلاح الدین کے سہانے کی طرف کھڑا ان کی فائل دیکھ رہا تھا۔

”ہاں ہاں شاہ۔“ وہ چو کا۔

”ابھی ڈاکٹر ممدی آئے ذرا ملے ہوں گے تو ان سے پوچھ لیتا ہوں یا جان ان کے پینڈنٹ ہیں تو ظاہر ہے ان سے پوچھنا ضروری ہے۔“

میاں صلاح الدین کو شہید کر کاہات انکب وہ تھا۔ اس نے انہیں فوراً ہی ہتھال لے گئے تھے۔ لی بی جان تک انہیں ہتھال میں رہنا پڑا تھا۔ مشرور سن تو سارا وقت ہتھال میں ہی رہتے تھے جالار۔ مشرور رہا تھا کہ کہیں وہ باضی نہ ہوں لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا کہ اس کے کوئی بات بھی نہیں کی تھی پہلے وہ دونوں آگئی یا تو میں تھے لیکن بعد کے دنوں میں بھی وہ مشر سے مخاطب نہیں ہوئے تھے حرجانے کے چند دن بعد پھر طبیعت کافی خراب ہو گئی انھیں کرائی سے یہ تیرا چلی چکا تھا کہ دو ہفتے ہیں۔

اب کے ڈاکٹر انکب پاس بجز کیا۔ میاں صلاح الدین اس کے لیے رضامند نہیں ہو رہے تھے لیکن جب

مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر محمدی نے بھی کہا کہ ایسا بچہ لازمی ہے جو پورے ہو گئے یوں تقریباً "دس سو بار دن چلے ایکسے ایس ہسپتال میں جس میں مشرباب رکھا تھا ڈاکٹر محمدی نے ان کے دل کی اوپن سرجری کی گی ان کا آپریشن کامیاب رہا تھا۔"

"اور میں نے صحیح کہا تھا کہ ہسپتال میں کوئی نہ کوئی اپنا ڈاکٹر ہونا چاہیے ورنہ یہ ڈاکٹر نگاہیں بھی نہیں دئے۔"

میاں صلاح الدین کے لیے میں خلاف معمول زماہت تھی۔  
 "ایا جان مجھے معاف کریں پلے میں نے بھی آپ کی کیمٹ کو نہیں والا ہے جو کام میں نے وہی کیا مجھ سے۔  
 میں معذور بننا چاہتا تھا آپ نے کہا یہ گناہ ہے میں نے سر نہ کیا۔ آپ نے اپنی عمر میں میری شادی کر دی میں نے انکار نہیں کیا حالانکہ مجھے بھی کئی تھی کہ آپ نے مجھ پر راجہ نہیں کیا لیکن غزالہ! ایا جان وہ خود میرے ساتھ کبھی رہنا چاہتی تھی۔ میں نے بہت کچھ ہوا کرتا تھا۔" میوہی کو آواز پھر گئی۔  
 "وہ اپنے خالہ سے شادی کرنا چاہتی تھی اور اس نے کر لیا۔ ایا جان وہ خود۔"

میاں صلاح الدین نے اپنا بیان بدلتے ہی آپ کے ساتھ پر رکھا اور ذرا سا سسکرائے۔  
 "چلو کم عمری میں شادی کا کچھ ہے تمہیں تو آپ اس عمر میں تمہاری شادی کروادیں یہیں کیل بعد زرا بیگم۔" ان کا لہجہ خوش گو اور تھوڑے سسکرائی نظروں سے اسے چھو رہے تھے۔

"تو اب کوئی تلاش کریں آپ بھی کیلے۔"  
 "ایا جان آپ نے آپ نے مجھے معاف کر دیا۔" میوہی کہہ کر دوبارہ۔  
 "ایا جان میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں بہت زیادہ۔ آپ سے جدا ہو کر میں ایک رات بھی سکون کی نیند نہیں سوا۔"

"ایا جان۔"  
 "میں جتنے چاہئے جب اندر آئی تھی اس نے اپنے ساتھ میاں صلاح الدین کے پاؤں پر رکھے انہوں نے اپنے پاؤں مجھے لیکن میں نے مضبوطی سے دھڑلے پاؤں تھام لیے۔  
 "مجھے بھی معاف کریں ایا جان بہت اذیت کسی سے ہیں بہت تکلیف اٹھائی ہے ان سارے سالوں میں۔"

روستے روستے اس نے اپنا سزا سن کے پاؤں پر رکھ دیا۔  
 "ایا جان مجھ سے غلطی ہوئی تھی میں باقی نہیں لیکن تو مجھ کو وار نہیں تھی ایک جذباتی کم عمر لڑکی تھی لیکن آپ تو بڑے تھے مجھ کو وار تھے آپ نے مجھے اس غلطی کی اس معمولی غلطی کی اتنی بڑی سزا دی کہ مجھے اپنی جی کی میں سے نکال دیا۔ اگر میں جھگ جاتی اگر میں بھڑ۔"

"تو بہت۔" میاں صلاح الدین کی یہ شالی پریشانی پڑ گئی۔  
 "وہ معمولی غلطی تھی۔ ہوں یوں تو معمولی غلطی تھی۔ ڈاکٹر کا کام ہو جاتے مرجاش میں تو۔"  
 ان کی آنکھوں میں آنسو چھلنے لگے اور انہوں نے بہت اذیت اور پوری معذرتوں پر ہر گھر کے توقف کے بعد عذر ایتیم کی طرف دیکھا۔

"میں نے تو کہا تھا کہ کوئی ایک ڈاکٹر اپنا ہونا چاہیے لیکن ان میں ایک نہیں ۵۵۵ ڈاکٹر گھر کے ہو گئے۔"  
 "وہ بولے بہتے تو میں نے انتظار ان کی طرف بڑھی اور روکے تھے ان کے ساتھ چوتھے گئی۔  
 "ایا جان ایا جان۔" اس سے حلق سے کھنکھائی آواز سننے لگے گی تھیں۔  
 "اس وقت اس کے ساتھ ہی گھر سے آئے تھے انہوں نے سب اوروں سے پکارا تھا تھے ہوئے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور بولے ہوئے تھکنے لگے۔"

"ہوئے ایا جان ایک گھر میں تین ڈاکٹروں کے حقیق کیا خیال ہے۔"  
 "کیا خراب! ایچنگنگ چھوڑ کر ڈاکٹر بدھنے لگے۔"  
 میاں صلاح الدین نے آنچ پکلی بار سسک کر کہہ کر لیا تھا تو اس نے بعد خوش ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"نہیں ایا جان۔ میں۔" مہج ہا ہوں ڈاکٹر نے کے لیے ڈاکٹر بولے آئیے۔"  
 "یہ ڈاکٹر ہوں کہاں سے ڈھونڈ لی تھی۔" انہوں نے اس کو گھورا۔

"ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے آپ نے گھر میں ہی موجود ہے۔" فر کے یوں پر مسکراہٹ تھی۔  
 "طریقہ پچھو کی جی زہل۔"

"ماشا اللہ طریقی کی پچیاں بہت سلیقہ مندا یہ شعور اور سمجھ دار ہیں۔"  
 عذرا بیگم کے کہنے پر بڑی حماہمیت تھی یہ حماہمیت ہی سکون اس نے پہلی بار ان کے چہرے پر دیکھا تھا ورنہ وہ بیجا شپ سیدہ ہوتی تھیں۔

"تو ٹھیک ہے ذرا ڈاکٹر صاحب سگری اجازت دیں تو پھر چلے ہیں کراچی۔ کیوں ڈاکٹر صاحب کتب اجازت ملے گی۔" "خیر ابھی آپ فون پر طریقی سے بات کر لیجئے گا۔ چھی کو کیا ان انتظار میں بیٹھی ہیں ریش۔"  
 "میرا خیال ہے اگر عمر اور بھی کئی دفعہ شادی کر دیتے ہیں۔" اس نے خیال ظاہر کیا۔  
 "فیر وہ تو کریں گے کہ صاحبزادے آپ نے اپنے حقیق کیا سوچا ہے؟"  
 "میں کئی کئی شادی کے بعد بچا رہا ہوں مجھے اس کا شپ مل گیا ہے۔" اس نے قہر کم سمجھہ ہو گئے تھے۔  
 "واپس آکر سوچیں گے۔"

ایک سال بعد اس نے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ مشر اور زہل نے انہیں رہنے کا کہا۔ مشر کے گھر گئے ہوتے وہ خود پر کاؤ بیٹھے تھے اس میں اس وقت اپنا ذخا خوشی کی عید اور بڑا کھانا تھا ڈر بہت شہر سے آیا تھا قاضی کے سائے اور رک اور کھن نقوش میں ہادی اجازت اور کھن تھیں۔  
 "آتم اور بھی کی شادی کے بعد وہ بہت مدد ملے ہوں کہ امریکہ چلے گئے تھے۔ شادی کے دنوں میں ہی حشر خال نے شاہرہ کے کہنے کی کار شپ مانگ لیا تھا۔"

ایک رات پر میاں صلاح الدین نے گلے لگائے کہ بعد تم آگھوں سے ان کی یہ شالی پوری تھی تو اس نے لگا تھا بیٹے عمر میری یاد تھوڑا کھل گیا ہوا نہیں۔  
 "واپس ضرور آتے ہیں کسی دہائی میں بدل نہ لگنا تھا۔"

میاں صلاح الدین نے بولی بار انہیں بلانے کہہ لیا۔ اپنا قاتل بھیسائی ہوئے لگا تھا یہ چاہتا تھا ایا جان سے بہت چاہیں اور کھن کھن چکے دیں۔ لیکن انہوں نے خط سے کام لیا تھا اور پھر تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی وہ واپس آنے کے لیے تیار نہ تھے۔

دل کا ایک کونا ویران تھا۔ وہاں حلیہ کی یادیں تھیں۔ اس کی جذباتی باتیں اور محبت سے بہرہ خطوط اب اب سوائے زندگی تھے۔ لوگ بچے ہیں بچے ایک محبت کے بعد دوسری محبت کے لیے زندگی گزار لیتے ہیں۔ انہیں تو اس ایک محبت نے اپنا زنجیر لگا تھا کہ کسی کی طرف بھاگ نہ ہو سکے۔ اور نہ ہی پاکستان واپس آئے تھے۔

میں اور شادی۔  
 ابرین اور معصوم کی شادی سب ہی بلادو آ گیا تھا لیکن چاہنے کے باوجود وہ خود کو تیار نہ کر سکتے تھے۔ جب مشر نے فون پر انہیں روئے ہوئے خود کے حوالے کی خبر پائی تو وہ خود پر کاؤ نہ لگائے اور ساری محبتیں بھلا کر پاکستان آگئے تھے۔  
 "مڈ کی گاڑی ایک ڈرائر سے گرا گئی تھی اور نہ ہی شپ میں لگا تھا۔"  
 "تو سن سال۔" اس سال میں مشر نے شادی کر لی۔ انہوں نے ہشوا کال کرتے ہوئے پوچھا۔  
 "وہ بالکل دیکھا ہی تھا خوشی اور کم کو۔" میوہی کو آواز پھر گئی۔  
 "ایک سال لگا گیا تھا۔" انہیں سب کچھ دینا پڑ گیا کہ میں لیکن ایک ماہ بعد بھی یہ غم یوں ہی تازہ تھا۔ "میں سب ٹھیک ہے" کی خبر انہیں پر سکون رکھتی تھی۔ لیکن وہ نہ۔

کراچی سے افعال حیدر اور سعید اتنی بھی آئی تھیں ولید نے بھی فون کیا۔ شادی کے فوراً بعد حیدر اور سعید اور بوظہی مصلح ہو گئے تھے۔

آج دس سال بعد بھی میڈم سفینہ کراچی کے بعض حلقوں میں بہت مشہور تھیں اور ان کی خوب صورت بیٹی مداعرف نادیدہ کی زلفوں کے دیوانے بے شمار تھا۔

شاہ بابا اور مسلمی خانم مزید بوڑھے ہو گئے تھے۔ شاہ بابا کا علاج لاہور میں حسنہ نے بہترین ڈاکٹروں سے کروایا لیکن پھر بھی کبھی کبھی یکایک ان کے ذہن کی سلیٹ صاف ہو جاتی تھی۔ عمر کے اس حصے میں یوں بھی یادداشت کمزور ہو جاتی ہے اور شاہ بابا کے ساتھ تشدد کیا گیا تھا۔

شاہ زیب نے دو جزواں بیٹیوں کا باب بن کر اپنی ساری سرگرمیوں سے توبہ کر لی تھی واقعی بیٹیوں کی پیدائش نے اس کی نئی ہونی کرلوں جھکا دی تھی زارا کے ساتھ وہ اب بالکل صحیح تھا۔

عظمیٰ مسما اپنے اپنے گھروں میں بہت خوش تھیں۔ بی بی جان اور زینت فاطمہ انعم اور شادیں گ کے ساتھ رہتی تھیں۔ انعم نے بی بی جان کے بے حد خدمت کی تھی اور اتنی دیکھ بھال کی تھی ان کی کہ اب وہ اٹھ کر چلتی پھرتی تھیں اور ہر وقت ان سے دعائیں دیتی تھیں۔

ایرج کی منصور کے ساتھ شادی ہو گئی تھی اور ایرج منصور کے ساتھ بہت خوش تھی دونوں گھر میں ہر وقت رونق لگائے رکھتے تھے ہاں علیحدہ کا دکھ سب کو تھا۔

اس کی ازواجی زندگی ایک مسلسل امتحان تھی اس کے لیے ناطفہ مینے میں دو تین چکر کراچی کے لگاتا تھا۔ دس سالوں بعد علیحدہ کے متعلق جان کر اسے کادل بے قرار ہو گیا تھا۔ وہ خوش نہیں تھی۔ دودھ کی تھی اور اگر وہ عاطف سے طلاق لے لے تو وہ اب بھی اسے اپنانے کے لیے تیار تھے۔

انہوں نے سوچا تھا کچھ دنوں تک وہ کراچی جا کر علیحدہ سے بات کریں گے لیکن صلاح الدین نے ایک روز کہا۔ ”چاہو تو قبول کر لو چاہو تو انکار کرو زبردستی نہیں ہے۔“

”مڈر کے سسرانی بیٹی کو گھر لے جانا چاہتے ہیں۔ کم عمر ہے جوان ہے۔ ظاہر ہے کہیں نہ کہیں شادی کریں گے اس کی مڈر کی بیٹی اور بیٹا مل جائیں گے اسفی۔“ ان کی آواز بھرائی تھی۔

”ماں بچوں کو چھوڑ نہیں سکتی اور بچوں کو اس سے جدا کرنا دونوں پر ظلم ہے۔ اگر تم۔“ وہ جھجکے۔

”میں نہیں جانتا تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی احسان سمجھ کر ہی کر لو مڈر کی بیوہ سے شادی بیچے اپنے گھر میں بیٹا جائیں گے۔ ہم بھی توجہ انہیں ہو سکتے ان سے تمہاری ماں تو رو رو کر مر جائے گی۔ لیکن زبردستی نہیں ہے اسفر۔ اگر دل نہیں مانتا تو۔“

”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“ اسفر کو فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اباجان نے پہلی بار ان سے کچھ کہا تھا۔ یکدم میاں صلاح الدین نے انہیں گلے لگایا۔

”تم نے مجھے سزا دے کر دیا اسفر تمہارا بے حد شکریہ۔ میں۔“

”پلیز اباجان۔“ اسفر نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

”مجھے شرمندہ مت کریں۔“ وہ جھکے اور عذر انیکم کی گود میں لیٹے مڈر کے دو سالہ بیٹے کو اٹھالیا اور اپنے ہونٹ اس کے رخسار پر رکھتے ہوئے سوچا۔

وہ جو نہیں ملا تو کیا راہ جنوں تو مل گئی

اک دیا بجھا دیا اک نیا جلا دیا